تاریخ آغازِ تالیف

داستانِ تاریخِ اُردو

۱۹۳۸ء

نثر کے متعلق
ابتدا سے بیسویں صدی کے شروع تک اُردو زبان و ادب کے نشو و نما کی تاریخ
مصنفین نثر اُردو کے حالات اور تصنیفات کے نمونے

تاریخ اختتامِ تالیف

بوستانِ تاریخِ اردو

۱۹۴۱ء

مؤلفہ: حامد حسن قادری

عاکف بکڈپو۔ مٹیا محل۔ دہلی ۶

پہلا ایڈیشن ۱۹۴۱ء
دوسرا ایڈیشن ۱۹۵۷ء
تیسرا ایڈیشن ۱۹۶۶ء
چوتھا ایڈیشن ۱۹۸۸ء
۱۹۹۵ء

کتابت

ابتدائی صفحات و فہرست : شفاعت احمد چغتائی

متن

منشی محمد رفیق و منشی محمد نبی خاں

ناشر عاکف بکڈپو ۴۳۷ مٹیا محل دہلی ۶

1996
Rs 360 /-
AAKIF BOOK DEPOT
437, MATIA MAHAL
DELHI - 110006
(Ph : 3265480)
PRINTED AT :
Calcutta Offset Printers
New Delhi - 110002

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست مضامین داستان تاریخ اردو

نثر کا چوتھا دور

نثر کا پانچواں دور (۱۸۷۱ء تا ۱۹۰۰ء)

۷۸۶
۹۲

بِسمِ اللهِ العَلِیِّ العَظِیم

۱۳۶۰ھ
"بذکرِ خدائے بیاں آفریں"
۱۹۴۱ء

دیباچہ

اُردو کی خدمت "تذکرہ نویسی" کی صورت میں دو سو برس سے ہو رہی ہے۔ سب سے قدیم تین تذکرے ہیں جو ایک ہی سال (۱۱۶۵ھ) میں مرتب ہوئے یعنی "گلشن گفتار" (خواجہ خان حمید اورنگ آبادی) "نکات الشعراء" (میر تقی) اور "تذکرہ ریختہ گویاں" (فتح علی گردیزی) پھر اسی بارھویں صدی کے آخر تک تین تذکرے "مخزن نکات" (قائم چاند پوری) ۱۱۶۸ھ میں "چمنستان شعرا" (لچھمی نراین شفیق) ۱۱۷۵ھ میں اور "گلزار ابراہیم" (نواب علی ابراہیم خاں خلیل) ۱۱۹۸ھ میں لکھے گئے۔ اس کے بعد تیرھویں صدی ہجری میں دہلی، دکن، گجرات وغیرہ مقامات پر آزاد کے "آبِ حیات" سے پہلے ایک درجن کے قریب تذکرے تالیف کیے گئے (یورپین مصنفوں کے لکھے ہوئے تذکرے ان پر مزید اضافہ ہیں) لیکن یہ سب (مع آبِ حیات) **شاعری اور شاعروں** کے تذکرے تھے۔ کسی نے **مصنّفین نثر** کی طرف توجہ نہ کی۔

انیسویں صدی عیسوی میں غدر (۱۸۵۷ء) سے پہلے اردو نثر اتنی اور ایسی نہ لکھی گئی تھی کہ مفصل اور مسلسل تاریخ و تذکرے کے قابل سمجھی جاتی، اور ایسے تذکرہ سے عام دلچسپی کی بھی امید مشکل تھی۔ لیکن آخری صدی تک **تصانیف نثر** اور **انشا پردازی** نے اتنے مدارجِ ارتقا طے کر لیے تھے کہ کسی تاریخ کا مرتب نہ ہونا اہلِ قلم کے "تغافلِ علمی" کا ثبوت تھا۔

اس طرف غالباً سب سے پہلے مولوی محمد یحییٰ تنہا (بی اے، ایل ایل بی، وکیل غازی آبادی) کو توجہ ہوئی اور انھوں نے ۱۹۱۴ء میں "سیر المصنفین" کی پہلی جلد اور ۱۹۲۴ء میں دوسری جلد شائع کی۔ دونوں میں مصنّفوں کے حالات اور طرزِ تحریر کے ساتھ تصانیف کے نمونے بھی درج کیے۔ لیکن پہلی جلد میں اُردوئے قدیم کو روا روی میں لکھا اور تشنہ چھوڑ دیا، اور دوسری جلد کے لیے صرف چوٹی کے سات آٹھ مشہور مصنّفوں کو چن لیا، اور سرشار و شرر

پر کتاب کو ختم کر دیا۔ بہر حال تقدم کی فضیلت میں وہ "تنہا" ہیں۔ تنہا سے پہلے کسی نے نثر اُردو کا تذکرہ نہیں لکھا تھا۔

اس کے بعد اُردو نثر و نظم دونوں کی یکجا تاریخیں متعدد لکھی گئیں، جن میں سب سے بڑی اور اچھی مسٹر رام بابو سکسینہ کی انگریزی تالیف اور اس سے بڑا اور اچھا اس کا اردو ترجمہ **تاریخ ادب اُردو** (ترجمہ مرزا محمد عسکری بی اے لکھنوی) ہے۔ اس عرصے میں ڈاکٹر گراہم بیلی (پروفیسر اردو لندن یونیورسٹی) نے انگریزی میں مختصر تاریخ ادب اردو مرتب کی اس کا تذکرہ "داستان تاریخ اُردو" میں آچکا ہے۔ پروفیسر اعجاز حسین (الہ آباد یونیورسٹی) کی تالیف مختصر تاریخوں میں بہتر ہے۔

لیکن یہ سب صرف زبان و ادب کی تاریخیں اور مصنفوں کے حالات ہیں۔ تصانیف و تحریرات کے نمونے کسی میں نہیں۔ گویا "زبانی باتیں" ہیں۔ اس کمی کو ایک فاضل بزرگ مولانا احسن مارہروی مرحوم (متوفی ۱۹۴۰ء) نے ایک اور صورت سے پورا کیا یعنی **نمونۂ منثورات** کے نام سے ایک ضخیم کتاب شائع کی جس میں نثر اُردو کے صنف وار نمونہ تحریریں مثلاً تصنیف و تالیف، تقریظ، عدالتی تحریر، اخبار، خطوط وغیرہ۔ چونکہ نمونے صدی وار مرتب کیے گئے ہیں، اس لیے گویا "تاریخ نثر اردو" بھی ہے اور اپنی نوع کی منفرد تالیف بھی ہے۔ ان دونوں کے درمیان میں مولوی سید محمد ایم اے حیدرآبادی نے "فورٹ ولیم کالج" کے مصنفوں کے حالات اور نمونے "ارباب نثر اردو" کے نام سے مرتب کیے اور حق یہ ہے کہ تاریخ اردو کے اس دور کا حق ادا کر دیا۔ ان کے علاوہ کوئی قابل ذکر کتاب ایسی نہیں ہے جس میں تاریخ کے ساتھ نمونے بھی ہوں۔

کسی مصنف کے طرز تحریر اور اسکے تجزیہ و خصوصیات کا بیان تشنہ رہتا ہے جب تک ہر قسم کی تحریر کے نمونے اور مثالیں پیش نظر نہ ہوں اور ان کا تبصرہ و انتقاد مطالعہ کی رہنمائی کرنیکے لئے ساتھ نہ ہو۔ میں اس ضرورت کو ایک مدت سے محسوس کر رہا تھا جس وقت میں نے مرزا محمد عسکری صاحب کا ترجمہ دیکھا جو حسن ظاہر میں بھی مطبع نولکشور کی مشاطگی کا دلفریب نمونہ تھا، بے اختیار جی چاہا کہ مرزا صاحب نے جہاں اتنی محنت کی کہ ۹۰۰ صفحہ کا ترجمہ کر دیا اتنی زحمت اور

گوارا فرماتے کہ ہر مصنف و شاعر کے جملہ تصنیفات و کلام کے نمونے بھی اضافہ کردیتے۔ کتاب دو ہزار تین ہزار صفحے کی ہوجاتی اور اچھا ہوتا، مرزا صاحب اس کے اہل تھے، اور مطبع نولکشور کے لیے پانچ ہزار صفحے شائع کردینا بھی کوئی بات نہ تھی۔

بہر حال میں نے "داستانِ تاریخ اردو" میں اس کمی کو پورا کرنا چاہا ہے تاریخِ وار ارتقائے اردو کے ساتھ ہر دور کے تمام مشاہیر ادب اور بعض غیر مشہور لیکن ممتاز مصنفوں کے حالات اور انکی تحریروں کے نمونے درج کیے ہیں، اور ان پر تبصرہ بھی کیا ہے۔

بے لاگ اور بے باک تنقید کرنا نہ صرف تصنیف پر بلکہ ذاتِ مصنف پر بھی (مصنف کی حیثیت سے) ابتک "پل صراط" پر گزرنے سے کم نہیں ہے لیکن میں نے اسکی "جسارت" کی ہے میں نے تصنیفوں اور مصنفوں پر اعتراضات کیے ہیں، دوسروں کے اعتراضات نقل کر کے حسب موقع ان کی تائید یا تردید کی ہے۔ میری تنقیدیں شاید تلخ و بیباک نظر آئیں لیکن بے لاگ اور بے لوث بھی ثابت ہونگی میں نے صحیح تعریف اور جائز حمایت بھی ایسی کی ہے کہ کسی دوسرے مؤرخ و تذکرہ نویس نے نہیں کی۔ میرے نزدیک یہ سب ایک تاریخ و تذکرے کے ضروری اجزا تھے، بغیر اس روشنی کے کسی تصنیف و مصنف کے مطالعہ کا صحیح راستہ نظر نہیں آتا۔

مجھے اس تالیف کے مکمل ہونیکا دعویٰ نہیں ہے، بلکہ اس کے بعض حصوں کے نامکمل رہ جانیکا اعتراف ہے جس وقت ۱۹۳۸ء میں اسکی تالیف و طباعت ساتھ ساتھ شروع ہوئی تھی، یہ ارادہ نہ تھا کہ اس قدر طویل و مفصل لکھی جائے۔ یہ ارادہ بعد کو مواقع تفصیل پیش آنے پر قائم ہوا اس لیے ابتدائی حصہ مختصر رہ گیا۔ پہلے سے پوری تاریخ نثر کے لیے ۵۰۰ صفحے تجویز ہوئے ہوتے تو ابتدائی حالات اور پہلے دو دور بھی زیادہ تفصیل سے لکھے جاسکتے تھے۔ اور حصوں میں بھی باوجود تحقیق و تفصیل کے، ترقی و اضافہ کی گنجایش باقی ہے۔

میں نے اس کتاب میں بیشمار تصانیف اور دوسری مطبوعات سے مدد لی ہے اور متن یا حواشی میں ان کا حوالہ دیدیا ہے۔ اگر کہیں حوالہ رہ گیا ہے تو وہ میری عجلت یا غفلت کا نتیجہ ہے قصد و ارادہ شامل نہیں ہے۔ اردو کی ابتدائی تاریخ کے متعلق فاضل مصنفین حیدرآباد نے بہترین معلومات فراہم کردی ہیں۔ ہر مولف کے لیے ان کی تصانیف سے استفادہ ناگزیر ہے۔ میں نے

بھی "اُردوے قدیم" (مولفہ حکیم شمس اللہ قادری) "دکن میں اُردو" (مولفہ مولوی نصیر الدین ہاشمی) "اُردو شہپارے" (مولفہ ڈاکٹر محی الدین زور) "ارباب نثر اُردو" (مولفہ مولوی سید محمد ایم اے) سے اپنی تالیف میں جابجا مدد لی ہے۔ انکے علاوہ جن مفصّل و مختصر تاریخوں کا ذکر کیا گیا ہے، وہ سب میرے پیش نظر تھیں۔ "سیر المصنفین" سب سے زیادہ کام کی تالیف ہے جس سے میں نے بہت کام لیا ہے اور ہر جگہ حوالے دیئے ہیں۔ مولوی عبدالحق صاحب کی بعض تالیفات مثلاً "چند ہم عصر" اور مجلہ "اُردو" سے بھی میں نے بہت فائدہ حاصل کیا ہے اور بہت سے رسالے خصوصاً "مخزن" اور "زمانہ" کے قدیم و جدید فائل بہت کام آئے۔ اہلِ دکن کی سی "علیہیات" لکھوں تو بہت طولِ امل ہو جائے۔

احباب میں اتفاق سے مجھے ایک ہی صاحب کا ممنون ہونیکا موقع ملا یعنی مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی صدیقی گوپاموی ثمّ اکبرآبادی کا۔ آگرہ میں مفتی صاحب اپنے علمی و تصنیفی ذوق و شوق میں انفرادی مرتبہ رکھتے ہیں۔ انھوں نے اپنے کتب خانہ سے مجھے مطبوعہ و قلمی کتابیں اور مصنفوں کے حالات اور نمونے مرحمت فرمائے اور سب کے ساتھ مفتی صاحب کا بھی شکر گزار ہوں۔

اس "داستان تاریخ اُردو" کی تعریف (مدح نہیں، صورتِ حال) اگر ایک لفظ میں بیان کی جائے تو اس کو "عجیب" کہہ سکتے ہیں۔ اصل میں تاریخ و تذکرہ کی کتاب عجیب نہیں ہونی چاہیئے۔ لیکن یہ تالیف اپنی "ہیئت کذائی" میں کچھ ایسی ہی بن گئی ہے۔ بہر حال میں اس نوعیّت کے لیے کوئی معذرت پیش کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ اپنی اس کوشش کو میں کوئی "کارنامہ" نہیں سمجھتا۔ اس لیے یہ نہیں کہہ سکتا کہ "کارے کردم"۔ ہاں، کام کرنے کی ایک نئی راہ نکال دی ہے۔

دیگراں آیندو "کارے" ہم کنند

حامد حسن قادری
پروفیسر سینٹ جانس کالج
آگرہ

علی پور سیداں (ضلع سیالکوٹ)
یکم رمضان المبارک ۱۳۶۰ھ
۲۳ ستمبر ۱۹۴۱ء

۸۶
۹۲

بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْم
۱۳۷۶ھ

(سورۃ الحاقہ۔ پارہ ۲۹)

دوسرا دیباچہ

"بِنِعْمَتِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ"
۱۳۷۶ھ

"داستانِ تاریخِ اردو" پہلی مرتبہ نومبر ۱۹۴۱ء میں شائع ہوئی تھی چھپتے ہی میں نے بہت سے ادیبوں، نقادوں، پروفیسروں، ایڈیٹروں کو کتاب بھجوائی۔ سب سے پہلے ۱۲ دسمبر ۱۹۴۱ء کو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب نے، دہلی سے ریڈیو پر اس کے متعلق تقریر نشر کی۔ پھر دہلی، لکھنؤ، حیدرآباد دکن سے دوسرے نقادوں نے بھی ریڈیو پر تبصرہ کیا۔ بعض نے مجھے خطوط میں رائیں لکھیں بعض نے رسائل میں ریویو شائع کرائے۔ چند مہینوں میں کتاب کی اتنی شہرت اور اتنی قدر ہوئی کہ مجھے اس کا تصور بھی نہ تھا۔

بات صرف اتنی تھی کہ کسی نے اردو زبان و ادب کی تاریخ اس تفصیل، اس تجزیہ، اس موازنہ، اس محاکمہ کے ساتھ نہ لکھی تھی۔ اسی کی ضرورت تھی، اور اسی کو لوگوں نے سراہا۔ ورنہ یہ کتاب تمام پہلوؤں سے مکمل نہ تھی، بلکہ خود میری نظر میں اس کے اندر خامیاں اور کوتاہیاں موجود تھیں، اور بعد کو تبصروں سے

اندازہ ہوا کہ غلطیاں بھی واقع ہو گئی تھیں جن کا مجھے لکھتے وقت علم نہ تھا۔
مجھے بڑا اطمینان اس بات سے ہوا کہ تبصرہ نگاروں نے میری رعایت و مروت سے کام نہ لیا تھا۔ اور میں انہی حضرات کا شکر گزار ہوں جنھوں نے میرے "ہنر" کے ساتھ میرے "عیب" بھی گنائے۔ اِس مُعاملے میں سب سے زیادہ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی (الہ آباد یونی ورسٹی) نے میرے لئے زحمت گوارا فرمائی اور تبصرے میں کتاب کی کتاب لکھکر روانہ فرمائی جس میں اغلاط کتابت سے لیکر زبان و محاورہ، موضوع و مضمون، بحث و تنقید، مواد و معلومات سب ہی پر نظر ڈالی، مشورے دیئے، تلافی مافات کی راہ بتائی، معلومات فراہم کیں، اسی طرح دوسروں نے بھی میرے بعض اغلاط و نقائص بتلائے۔ میں سب کا ممنون ہوں۔ سب کی ہدایات پر میں نے نظر ثانی میں عمل کیا ہے۔
لیکن، "پسند اپنی اپنی" کا عجیب معاملہ ہے۔ بعض متضاد رائیں بڑی دل چسپ تھیں۔ بعض حضرات میرے سخت تبصروں پر ناراض ہو گئے۔ بعض نے میری تنقیدوں کو ناپسند کیا۔ ایک نے غیر مشہور مصنفوں کو شامل کرنے پر اعتراض کیا۔ دُوسرے نے اسی کو کتاب کی بڑی خوبی بتایا۔ کسی نے نمونوں کے طویل ہونے کی شکایت کی۔ کسی نے اسی بات کی تعریف کی اور لکھا کہ ــــــ

> "مصنفین کی کتابوں سے کافی اقتباسات دیئے گئے ہیں۔ اور ان کا انتخاب اس سلیقہ سے کیا گیا ہے کہ مصنف کے طرزِ تحریر کی کل خصوصیات واضح ہو جاتی ہیں۔ اور اکثر ایک ٹکڑے سے پُوری کتاب کا مضمون ذہن میں آجاتا ہے۔"

بعض نے طویل حاشیوں اور ان کے مختلف علمی و ادبی معلومات کو غیر ضروری قرار دیا۔ بعض نے ان کی بنا پر کتاب کو زیادہ مفید و قابلِ قدر بتایا۔

ایک نقاد نے فرمایا :

"انداز بیان بھی سادہ اور بے مزہ ہے"۔

دوسرے نے ریویو کیا کہ :

"ساری کتاب کی عبارت شگفتہ اور دلکش ہے"۔

میں نے ان تمام تبصروں کو اپنے پاس محفوظ رکھا اور اب سولہ سال کے بعد دوسرے اڈیشن کو مرتب کرتے وقت ان سے کام لیا۔ چنانچہ میں نے اپنی بعض رائیں بدل دیں، بعض غیر مشہور مصنفوں کو حذف کر دیا۔ بعض اقتباسات گھٹا دیا، بعض غیر ضروری حواشی کو حذف کر دیا۔

میں چاہتا تھا کہ دوسرے اڈیشن میں صرف نظر ثانی اور ترمیم و درستی ہی نہ ہو بلکہ کتاب کو دوبارہ لکھ دوں، لیکن یہ بڑا کام تھا۔ سوچتا اور ارادہ ہی کرتا رہا۔ حتیٰ کہ پاکستان چلا آیا، اور کراچی میں آکر بس گیا۔ یہاں آکر اس کتاب کی اس قدر مانگ دیکھی کہ میں حیران رہ گیا۔ میرے آنے کی خبر سن کر طلبا و اساتذہ نے طلب کیا "مطالبہ" کا ہنگامہ شروع کر دیا۔ میرے پاس جو کتاب تھی اس پر حملے رہے اساتذہ نے کتاب کی مانگ اور مقبولیت کے قصے سنائے کہ پچیس روپے تک ایک کتاب فروخت ہوئی ہے۔ اور آخری نسخہ تو ایک دوکاندار نے ۲۸ روپے کو دیا اور لینے والے نے لیا۔ اس وقت بھی جن داموں کو مل جائے لوگ خریدنے کو تیار ہیں۔

بہرحال، اُدھر آگرہ کے پبلشر کا اصرار، اِدھر یہ مانگ۔ میرے ارادے کتاب کو ازسرِ نو لکھنے کے متعلق سب رہ گئے اور عافیت اسی میں نظر آئی کہ کتاب جیسی کچھ ہے دوبارہ چھپوا دی جائے۔ چنانچہ نظر ثانی میں درستی و ترمیم اور حذف و اضافہ کرتا گیا اور پچاس پچاس سو سو صفحے چھپنے کے لئے بھیجتا گیا۔ آخر کتاب دوبارہ چھپ گئی۔ الحمد للہ۔

کتاب کا نام "داستان تاریخ اُردو" (۱۹۳۸ء) میں نے تاریخگوئی کے شوق میں رکھ دیا تھا۔ بعضوں نے اس پر اعتراض کیا اور سوال اُٹھایا کہ یہ "داستان" زیادہ ہے یا "تاریخ" زیادہ۔ لیکن اب اشاعت ثانی میں نام بدل دیا جائے تو کتاب پہچانی نہ جائے گی۔ نام بہت مشہور ہو چکا ہے اس لئے اس "چیستان" کو باقی ہی رہنے دیا۔

تاریخگوئی کے شوق کا "مظاہرہ" میں نے کتاب کے اندر بھی جابجا اور "جا و بیجا" کیا ہے اور اس پر بھی نقادوں نے رائے زنی کی تھی۔ ایک صاحب کا مشورہ تھا کہ

"یہ اگر ایک چھوٹی سی کتاب میں الگ اکٹھا ہوتیں تو بہتر تھا۔"

دوسرے کی رائے تھی کہ:

"تاہم اس سے کتاب کی خوبی پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔"

میرا بھی کچھ ایسا ہی خیال ہے۔ اس لئے کسی معذرت کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ اور اس دوسرے ایڈیشن کی تاریخ پیش کرتا ہوں۔

سالِ طبع جدید نشرِ کتاب
"شیشے میں اب دو آتشہ ہے شراب"

۱۹۵۷ء

یکم رمضان المبارک ۱۳۷۶ھ
۲ اپریل ۱۹۵۷ء

حامد حسن قادری
کراچی۔ ناظم آباد۔ بڑا میدان

۷۸۶
۹۲

بِسْمِ اللّٰہِ الْعَلِیِّ الْوَھَّابُ الْحَفِیْظ

۱۳۸۳ھ

دیباچہ داستان تاریخ اردو

۱۹۶۳ء

اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن بھی آگرہ ہی سے ۱۹۵۷ء میں شائع ہوا تھا۔ اس وقت سے برابر ارادہ رہا کہ اگر دوسرے ایڈیشن میں ترمیم یا اصلاح پوری طرح نہ ہو سکی تھی تو اب ہو جاتی۔ لیکن میرا یہ حال ہے کہ کسل و اضمحلال تو آٹھ دس سال سے روزمرہ بن چکا تھا، اب تو کئی سال سے ہمت بھی جواب دے گئی ہے اور تصنیف و تالیف مطلقاً چھوٹ گئی ہے۔ گزشتہ سال اپنے اس حال کی تاریخ بھی کہدی تھی۔

اب ایسا بڑھا ضعف پیری کا ہولؔ
نُنَکِّسْهُ فِی الْخَلْقِ صادق ہے قولؔ

۱۳۸۲ھ

قیام پاکستان کے بعد سے یہاں کے کئی ادارے اس کتاب کو شائع کرنا چاہتے تھے، مگر میں بابو لکشمی نرائن آنجہانی سے دوسرے ایڈیشن کا وعدہ کر چکا تھا۔ اس لئے یہاں کسی سے معاملہ نہ کیا۔ اب پھر وہی صورت ہے جو پہلے اڈیشن کے خاتمے پر تھی۔ کتاب کی مانگ زیادہ سے زیادہ ہے۔ ہندوستان سے کتابیں لاکر فروخت کرنے میں بے شمار دشواریاں ہیں۔ پھر دوسرا ایڈیشن تقریباً ختم ہو چکا ہے۔ چند روز میں یہ نسخے بھی نہ

رہیں گے۔ اس کتاب کی زیادہ سے زیادہ ضرورت اور مانگ بھی پاکستان میں ہے اس لئے یہی مشورہ ہوا کہ کتاب اب یہیں چھپنی چاہیئے۔ کئی ناشر چھاپنے پر آمادہ تھے۔ لیکن اَلْفَضْلُ لِلْمُتَقَدِّم۔ برادرِ عم زاد پروفیسر محمد طاہر فاروقی پشاور سے گزشتہ جولائی میں کراچی آئے تو میں نے ان کو اجازت دیدی کہ عزیزی راشد حسن قادری کی جانب سے مکرمی علاء الدین خالد صاحب سے معاہدہ کرلیں اور اردو اکیڈمی سندھ کراچی، اس کتاب کا تیسرا ایڈیشن شائع کرے۔ چُنانچہ

پاک شیشے میں رنگ افشاں ہے شراب

۱۹۶۲ء

خالد صاحب نے ابھی کتابت بھی شروع نہیں کرائی اور مجھ پر سخت تقاضا ہے کہ تیسرے ایڈیشن کے لئے نیا دیباچہ لکھدوں۔ اب لکھنے کو کونسی نئی بات ہے کہ لکھوں، اتنا پھر بھی کہنا ضروری ہے کہ میں نے اس ایڈیشن کے لیئے اور بہت کچھ حک و اصلاح و ترمیم و اضافہ کردیا ہے۔ اس تالیف کے مکمل ہونے کا مجھے پہلے بھی دعویٰ نہ تھا اب بھی اپنی کوتاہیوں کا اعتراف ہے لیکن یہ توقع بھی بے جا نہیں کہ شائقین و طلباء اس تیسرے ایڈیشن کو پہلی دونوں اشاعتوں سے ہر طرح زیادہ کارآمد اور مفید پائیں گے۔

خطا نمودہ ام و چشم آفریں دارم

حامد حسن قادری

کراچی۔ ناظم آباد
۱۔ ڈی۔ ۲/۲
۱۴؍ دسمبر ۱۹۶۲ء
مطابق ۲۷؍ رجب ۱۳۸۲ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"بذکرِ خدائے زباں آفریں"

۱۹۳۸ء

داستانِ تاریخ اردو

۱۹۳۸ء

آغازِ اردو سے پہلے

حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے صدہا سال قبل گوتم بدھ بانی مذہب بدھ اور مہابیر بانی جین مذہب سے سیکڑوں برس پہلے، آریا قوم کے ورودِ ہندوستان کے وقت ہندوستان کے قدیم اور اصلی باشندے مختلف صوبوں میں مختلف زبانیں بولتے تھے۔ آریا لوگوں نے اپنی زبان سنسکرت کو رواج دیا۔ سنسکرت میں وسعت و تکمیل کے جوہر تھے۔ ہندوستان میں اس زبان کو اس قدر ترقی ہوئی کہ لسانی وادبی وعلمی حیثیت سے دنیا کی بہترین زبانوں میں اس کا شمار ہے۔ لیکن گردش زمانہ سے صدہا سال حکومت کرنے کے بعد سنسکرت کو زوال شروع ہوا اور مختلف صوبہ دار زبانیں جن کو پراکرت کہتے ہیں، سنسکرت کی جگہ لینے لگیں۔

ان پراکرت زبانوں میں ایک سورسینی پراکرت تھی جو برج یعنی متھرا کے علاقے

سے شروع ہو کر پنجاب، سندھ، بہار، مالوہ تک شائع و عام تھی۔ اسی کی ایک شاخ کو برج بھاشا کہتے ہیں یعنی متھرا کی زبان یہ سب سے زیادہ وسیع تھی اور حضرت عیسیٰ کے زمانے سے قبل علمی زبان بن چکی تھی یعنی اس زبان میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔

حضرت عیسیٰ سے نصف صدی قبل اُجین کا مشہور راجہ وکرماجیت گزرا ہے۔ جس کے دربار کا جوہر بے بہا کالی داس شاعر تھا۔ اسی راجہ کے دربار کے ایک پنڈت درار وچی نے برج بھاشا کے قواعد صرف و نحو مرتب کئے تھے۔ یہ کتاب ابتک موجود ہے۔ اور پراکرت پرکاش کے نام سے ۱۸۶۸ء میں لندن میں شائع ہوئی ہے۔ اس دو ہزار سال قبل کی کتاب میں برج بھاشا کے ایسے بہت سے الفاظ موجود ہیں جو ہماری موجودہ اردو زبان میں شامل ہیں۔

سکندر اعظم نے حضرت عیسیٰ سے ۳۲۵ سال قبل ہندوستان پر حملہ کیا تھا اس وقت بھی برج بھاشا اور دیگر پراکرتیں ہندوستان میں رائج تھیں۔ راجہ اشوک حضرت عیسیٰ سے تقریباً ڈھائی سو برس پہلے تھا۔ اس کی زبان بھی یہی برج بھاشا تھی اور اس کے مشہور کتبوں پر یہی زبان پتھر کی لکیر بنی ہوئی ہے۔

عرب و ہندوستان کے درمیان سلسلہ تجارت اسلام ۵۶۹ء میں شروع ہوا ہے۔ زمانۂ اسلام سے بہت پہلے عرب و ہندوستان کے درمیان سلسلۂ تجارت قائم تھا۔ عرب سواحل ہند پر تجارت کی غرض سے آتے تھے، اپنا مال فروخت کر کے ہندوستان کا مال خرید کر لیجاتے تھے۔ لیکن یہ لین دین صرف مال و متاع تک محدود نہ تھا بلکہ الفاظ کا ادل بدل بھی ہوتا تھا، یعنی اشیاء خرید و فروخت کے عربی نام ہندوستان میں رہ کر ہندی تاجروں کی زبان میں مل جاتے تھے، اور ہندوستانی نام عرب میں پہنچکر عربی زبان میں شامل ہوتے تھے۔

مسلمانوں کے ابتدائی حملے ہندوستان پر

۱۶ھ ہجری (مطابق ۶۳۷ء) میں جس سال حضرت عمر فاروق رضؓ نے بیت المقدس کو فتح کیا، اسی سال مسلمانوں نے ہندوستان کے ساحل سندھ پر حملہ کیا، لیکن ملک کو فتح نہ کر سکے۔ اس کے بعد دو مرتبہ پھر حملہ آور ہوتے اور پھر ناکام رہے۔ آخر خلافت بنی اُمیّہ کے آغاز میں ۴۴ھ (۶۶۴ء) میں کابل کی طرف سے ہندوستان پر حملہ کیا اور کابل سے ملتان تک قبضے میں کر لیا۔ اب حملوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ سواحل و سرحد کا بہت سا حصہ مسلمانوں کے قبضے میں آ گیا۔ سندھ پر بھی چند بار حملے کیے، اور ناکام رہے۔ پھر ۸۹ھ (۷۰۵ء) میں محمد بن قاسم کی سرکردگی میں سندھ پر حملہ کامیاب ہوا اس کے بعد ۹۶ھ (۷۱۴ء) تک مسلسل فتوحات کر کے ملتان تک قبضہ کر لیا اس وقت سے مسلمانوں کی سلطنت سندھ پر صدیوں قائم رہی۔ اسلامی سلطنت بنی اُمیّہ سے بنی عباس میں منتقل ہو گئی تو سندھ کی اسلامی حکومت بھی خلافت عباسیہ کے زیر اثر آ گئی اور خلیفہ واثق باللہ (زمانہ خلافت ۲۲۷ھ (۸۴۱ء) تا ۲۳۳ھ (۸۴۷ء)) کے زمانے تک دربار خلافت سے سندھ کے حاکم و والی (گورنر) مقرر ہو کر آتے رہے۔ لیکن اسکے بعد خلافت بغداد کے ضعف کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی حکومت ہند و سندھ بھی کمزور ہوتی رہی۔ اسکے علاوہ مسلمان اپنے مفتوحہ ممالک سے باہر نہ پھیل سکے۔ اگرچہ سندھ میں ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کی تہذیب و معاشرت اور رسوم و زبان سے متاثر ہوئے۔ چنانچہ ابن حوقل اور مسعودی جو دسویں صدی عیسوی (مطابق چوتھی صدی ہجری) میں ہندوستان آئے۔ اپنے سفر نامے میں لکھتے ہیں کہ سندھ میں مسلمانوں اور ہندوؤں کی وضع اور معاشرت اس قدر یکساں ہے کہ تمیز کرنا مشکل ہے۔ دونوں قوموں میں نہایت اتفاق و ارتباط قائم ہے۔ عربی و سندھی دو تو زبانیں رائج ہیں۔ اور ملتان میں ملتانی کے ساتھ فارسی زبان بولی جاتی ہے۔

تاہم اس زمانے تک دیسی اور بدیسی زبانوں کی ایسی آمیزش نہ ہوئی تھی جو

ایک مخلوط زبان کا سنگ بنیاد ہو سکتی۔

سبکتگین کا پنجاب پر حملہ ۹۸۶ء / ۳۷۶ھ سبکتگین غزنی کا بادشاہ تھا اس نے پنجاب کے راجہ جیپال پر فوج کشی کی، راجہ صلح کرنے پر مجبور ہوا، لیکن صلح توڑ دی۔ اس لئے سبکتگین نے دوبارہ حملہ کیا اور پنجاب سے پشاور تک اسکے قبضے میں آگیا، مسلمان ان ممالک مفتوحہ میں رہنے لگے۔

محمود غزنوی کے حملے ۱۰۰۱ء تا ۱۰۲۷ء / ۳۹۲ھ تا ۴۱۸ھ سبکتگین کے بعد اس کے جانشین سلطان محمود غزنوی نے ۲۷ سال میں، ۱۷ حملے کر کے پشاور، ملتان، کانگڑا، قنوج، متھرا گجرات پر قبضہ کر لیا۔

خاندان غزنوی کی حکومت ۱۰۰۱ء تا ۱۱۸۷ء / ۳۹۲ھ تا ۵۸۳ھ محمود کے بعد سب ممالک مفتوحہ ہاتھ سے نکل گئے، لیکن پنجاب پر قبضہ رہا اور دو سو برس کے قریب خاندان غزنوی نے پنجاب میں حکومت کی، لاہور دارالحکومت رہا۔ مختلف اقوام و ممالک کے مسلمان (عرب ترک، مغل، ایرانی، افغانی) پنجاب میں مقیم رہے اور اہل ہند کے ساتھ تمدن و معاشرت، لین دین، شادی بیاہ، ہر قسم کے تعلقات پیدا کئے۔ اس کا لازمی نتیجہ تھا کہ مسلمانوں نے مقامی الفاظ اپنی زبانوں میں ملانے شروع کئے۔ اور اہل ہند نے عربی، فارسی، ترکی زبانوں کے الفاظ اپنی زبان میں شامل کئے۔

اردو زبان

لفظ اردو کی تحقیق یہ بات تحقیق طلب ہے کہ اس زبان کے لئے اردو کا لفظ کب سے اختیار کیا گیا۔ یہ قیاس درست نظر آتا ہے کہ مغلوں کے زمانے سے ہندوستان میں اردو کا لفظ لشکر و لشکر گاہ کے معنوں میں استعمال ہونا شروع ہوا۔ بابر، اکبر، جہانگیر کے فرمانوں اور سکوں میں اردو کا لفظ لشکر کے معنی میں درج ہے

بابر اپنے لشکر کو اردوے نصرت شعار کہتا ہے۔ جہانگیر نے سفر کشمیر کے راستے میں جو سکہ بنوایا ہے اس پر یہ شعر کندہ ہے۔

باد رواں تا کہ بود مہر و ماہ سکہ اردوے جہانگیر شاہ

شاہانِ مغلیہ کے زمانے میں شاہی لشکر و لشکر گاہ کو اردوے معلیٰ کہتے تھے اور بازار لشکر کو بازار اردو یا اردو بازار۔

اردو زبان کا نام "زبان ہندی"

لیکن اس زمانے تک زبان لشکر کے لئے اردو کا لفظ مستعمل نہ ہوا تھا۔ سب سے قدیم تحریر حضرت امیر خسرو دہلوی (۱۲۵۵ء/۶۵۲ھ تا ۱۳۲۵ء/۷۲۵ھ) کی ملتی ہے۔ وہ اپنے دیباچۂ دیوان میں اپنے اردو کلام کو کلام ہندوی فرماتے ہیں دوسری قدیم کتاب سیر الاولیا ہے جو سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیا کے ایک خاص مرید حضرت سید مبارک معروف بہ میر خورد کی تالیف ہے۔ اس میں حضرت بابا فرید شکر گنج کے ایک قول کے متعلق لکھا ہے فرمود بزبان ہندی اور بھی بعض قدیم تحریروں میں اردو زبان کو زبان ہندی کہا گیا ہے۔

یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ امیر خسرو کی تصانیف سے اکبر و جہانگیر کے زمانے کی تصانیف تک یعنی تیرھویں صدی عیسوی سے سولہویں صدی عیسوی تک جہاں جہاں ہندوستانی زبان کا ذکر آیا ہے اس کی شان یہ ہے کہ پنجاب کے کسی بزرگ کے قول کو زبان پنجابی و زبان ملتانی کہا گیا ہے۔ اہل گجرات کی زبان کو زبان گجراتی اہل دکن کی زبان کو دکنی، نیز بلا امتیاز ان زبانوں کو زبان ہندی بھی کہدیا گیا ہے۔ لیکن اہل دہلی و نواح دہلی کی زبان کو زبانِ ہندی ہی کہا گیا ہے۔ سورسینی پراکرتوں نے قدیم زمانے ہی سے مختلف علاقوں میں مختلف شکلیں پیدا کرلی تھیں جو امتیاز کیلئے مقامی ناموں سے معروف تھیں، اردو زبان اگرچہ ان سب بولیوں سے ملکر بنی ہے پھر بھی اسکا اصلی سانچا دہلی اور نواح دہلی کی زبان ہے۔ اس کا ثبوت یہ بھی ہے کہ دوسرے صوبوں کی مخصوص

زبانیں اب بھی الگ الگ رائج ہیں، لیکن موجودہ صوبجات متحدہ کی زبان وہی زبان ہندی ہے جس نے اب اردو کی شکل اختیار کرلی ہے۔

اردو زبان کا نام "زبان ریختہ"

بہر حال شہنشاہ جہانگیر کے زمانے تک زبان کے لئے اردو کے لفظ کا رواج ثابت نہیں ہوتا لیکن زبان ہندی کے ساتھ ساتھ زبان ریختہ کا استعمال پایا جاتا ہے خصوصاً نظم اردو کو نظم ریختہ کہتے تھے ریختہ کے معنی گری پڑی چیز کے ہیں۔ اور فارسی شعرا اس نظم کو بھی ریختہ کہتے تھے جو مختلف زبانوں سے مرکب ہو۔ قدیم شعرائے اردو کے کلام میں فارسی و ہندی ملی جلی ہوتی تھیں اس لئے اس کو ریختہ کہنے لگے۔ نیز اس لئے کہ اردو زبان فارسی عربی، ترکی، ہندی وغیرہ سب زبانوں سے ملکر بنی ہے۔

شیخ مخدوم سعدی کاکوردی (متوفی ۱۵۹۳ء / ۱۰۰۲ھ) اکبر بادشاہ کے زمانے میں تھے ان کی ایک مخلوط غزل ملتی ہے۔ انہوں نے مقطع میں غزل کی زبان کو ریختہ فرمایا ہے:

سعدی کہ گفتہ ریختہ در ریختہ دُر ریختہ شیر و شکر آمیختہ، ہم شعر ہے ہم گیت ہے

اس کے بعد عام نظم اردو کو ریختہ کہنے لگے۔ اور یہ نام انیسویں صدی عیسوی تک مستعمل رہا۔ مثلاً

(۱) قائم میں غزل طور کیا ریختہ ورنہ
اک بات لچر سی بزبانِ دکنی تھی (قائم چاند پوری)

(۲) خوگر نہیں کچھ یوں ہی ہم ریختہ گوئی کے
معشوق جو تھا اپنا باشندہ دکن کا تھا (میر تقی میر دہلوی)

میر کے شعر سے ضمناً یہ بات بھی نکلتی ہے کہ ریختہ گوئی کا عام رواج دہلی سے پہلے دکن میں ہوا تھا۔

(۳) مرزا قتیل چار شربت میں فرماتے ہیں: "مرزا محمد رفیع سودا در ریختہ

پایۂ ملا ظہوری دارد"

(۴) مرزا غالب دہلوی تک ریختہ کا لفظ مستعمل ہے۔

ریختے کے تمہیں استاد نہیں ہو غالب (غالب) کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

زبان کے لئے لفظ اردو کا استعمال | غالباً شاہجہاں بادشاہ کے زمانے میں یعنی سترھویں صدی سے اردو کا لفظ زبان کے لئے استعمال ہوا لیکن شاہجہان و

اورنگ زیب کے زمانے تک اسکا استعمال بہت محدود تھا خود شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر اپنے ایک رقعہ میں زبان ہندی ہی لکھتے ہیں۔ شاہجہاں نے کوئی تحریر اپنے زمانے کی اردو زبان میں اپنے قلم سے لکھی ہے اسکے متعلق عالمگیر شاہجہاں کو لکھتے ہیں

"آں فرمان عالی کہ در زبان ہندی از دستخط خاص رقم فرمودہ شاہد ایں معانی است"

عالمگیر کے بعد اٹھارہویں صدی میں جتنے تذکرے شعراے اردو کے لکھے گئے، ان میں اردو کو ہندی یا ریختہ کہا گیا ہے تاہم اس زمانے میں اس نام کا استعمال ثبوت سے خالی نہیں ہے۔ ۱۷۹۱ء ۱۲۰۶ھ میں مولانا محمد باقر آگاہ ویلوری دکنی نے چند اخلاقی و مذہبی نظمیں دکنی اردو میں لکھی ہیں۔ ان کی وجہ تصنیف نثر میں بیان کی ہے اس میں لکھتے ہیں:۔

ان سب رسالوں میں شاعری نیں کیا ہوں بلکہ صاف اور سادہ کہا ہوں اور اردو کے بھاکے میں نیں کہا ہوں۔ کیا واسطے کہ رہنے والے یہاں کے اس بھاکے سے واقف نہیں ہیں۔ اے بھائی یہ رسالے دکھنی زبان میں ہیں"

اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ اس زمانے میں غیر صوبوں کے لوگ اردو دہلی کی زبان کو کہتے تھے۔ اس کی تصدیق اور شہادتوں سے بھی ہوتی ہے۔ جب ولی دکھنی دہلی آئے اور شاہ سعد اللہ گلشن سے ملے اور اپنی دکھنی زبان کی غزلیں سنائیں تو بقول

ے منقول از آب حیات

قدرت اللہ صاحب تذکرۃ الشعراء کے شاہ صاحب نے ولی کو یہ مشورہ دیا:۔

"شما زبان دکھنی را گذاشتہ موافق اردوے معلٰی شاہ جہاں آباد موزوں

بکنید کہ تا موجب شہرت در دواج قبول خاطر صاحب طبعان عالی مزاج گردد"

شاہجہاں نے دہلی کا لال قلعہ بنایا، دہلی کا نام شاہجہاں آباد رکھا۔ قلعہ کو قلعۂ معلّٰی اور شاہی لشکر گاہ کو اردوے معلّٰی کہتے تھے۔ جب اردو زبان قلعہ معلّٰی میں داخل ہوئی تو اردوئے معلّٰی کا خطاب پایا۔

آغاز اُردُو

پنجاب میں مسلمانوں کے مستقل قیام، مختلف ممالک اسلامیہ کے مسلمانوں اور ان کی زبانوں کے اجتماع اہل ہند سے تعلقات نے ایک مخلوط زبان کی ضرورت اور صورت پیدا کردی، اہل ہند دوسری زبانیں بولتے تھے، مسلمانوں کی زبان فارسی تھی۔ ضرورت پیدا ہوتے ہی ایک نے دوسرے کی زبان سیکھنی شروع کردی ہوگی۔ لیکن گیارہویں صدی عیسوی کی یہ بول چال کتب تاریخ میں محفوظ نہیں ہے۔ البتہ اُس زمانے کی نظم سے تصدیق ہوتی ہے۔

فارسی شاعری میں ہندی الفاظ بزمانۂ مسعود غزنوی ۱۰۳۰ء تا ۱۰۴۲ء ۴۲۱ھ تا ۴۳۲ھ

سلطان محمود غزنوی کے فرزند و جانشین سلطان مسعود غزنوی کے زمانہ میں ایران کا مشہور شاعر منوچہری ہندوستان آیا، اس نے اپنے فارسی کلام میں ہندی زبان کے بعض الفاظ بجنسہٖ نظم کئے ہیں۔ مثلاً

الا تا موسمان وارند دزہ　　　الا تا ہندوان گیرند لنگھن

اس سے زیادہ دلچسپ مثال یہ ہے کہ ایران کے ممتاز صوفی شاعر حکیم سنائی

(جن کا انتقال بارھویں صدی کے وسط میں ہوا ہے) کبھی ہندوستان نہیں آئے لیکن بعض ہندی الفاظ کو اپنی نظم میں لکھا ہے۔ مثلاً

نہ دراں معدہ جز حسد زند؟ نہ دراں دیدہ قطرۂ پانی

فارسی شاعروں کا ہندی کلام بزمانۂ ابراہیم غزنوی سنہ ۱۰۵۹ء ۴۵۱ھ تا سنہ ۱۰۹۸ء ۴۹۲ھ

مسعود سعد سلمان اور ابو عبداللہ النکتی ہندوستان میں پیدا ہوئے، فارسی کے شاعر تھے لیکن ہندی زبان میں بھی شعر کہے اور اپنے ہندی دیوان مرتب کئے۔ یہ کلام اب موجود نہیں ہے لیکن محمد عوفی اور امیر خسرو دونوں اس کی تصدیق کرتے ہیں۔

ہندی شاعری میں عربی الفاظ بزمانۂ پرتھی راج

ولادت سنہ ۱۱۵۹ء ۵۵۴ھ تا وفات سنہ ۱۱۹۲ء ۵۸۸ھ

پرتھی راج راجہ اجمیر و دہلی کے وزیر و درباری شاعر چاند بردائی نے ایک طویل ہندی نظم پرتھی راج راسو۔ کے نام سے لکھی ہے۔ جس میں پرتھی راج اور اسکے زمانے کے تمام حالات تاریخ و معاشرت (رسم و رواج، رزم، بزم) وغیرہ کے متعلق لکھے ہیں۔ اس نظم میں بہت سے عربی و فارسی الفاظ پائے جاتے ہیں۔ مثلاً سلام، بادشاہ، پروردگار، دنیا، مست، کھلک (خلق) پگام (پیغام) پھرمان (فرمان) ایک شعر یہ ہے ؎

بارہ بانس بنیں میں چار انگل پھرمان اتنے گھر بادشاہ ہے متے چوکے چوہان

محمد غوری کے حملے اور اردو کی وسعت سنہ ۱۱۷۵ء ۵۷۰ھ تا سنہ ۱۱۹۲ء ۵۸۸ھ

(۱) سنہ ۱۱۷۵ء ۵۷۰ھ میں سلطان شہاب الدین محمد غوری نے ملتان اور اوچ فتح کیا (۲) سنہ ۱۱۷۸ء ۵۷۴ھ میں گجرات پر حملہ کیا اور شکست کھائی (۳) سنہ ۱۱۸۶ء ۵۸۲ھ میں خسرو ملک غزنوی حکمران پنجاب پر حملہ کر کے پنجاب پر قبضہ کر لیا (۴) سنہ ۱۱۹۱ء ۵۸۷ھ میں پرتھی راج اور محمد غوری میں بمقام نراین (علاقہ کرنال) جنگ ہوئی۔ مسلمانوں نے شکست پائی (۵) سنہ ۱۱۹۲ء ۵۸۸ھ میں دوبارہ محمد غوری نے راجپوتوں پر حملہ کیا اور پرتھی راج کو شکست دی۔ اس لڑائی میں

پرتھی راج اور اس کا درباری شاعر چاند بردائی دونوں مارے گئے اس جنگ سے
اجمیر، دہلی، کول (علیگڈھ) ہانسی، سرستی سب مسلمانوں کے قبضے میں آگئے۔ محمد غوری
نے پرتھی راج کے بیٹے گوبند راج کو تاج وتخت دیکر اجمیر کا راجہ بنا دیا اور دہلی میں اپنے
سپہ سالار قطب الدین ایبک کو اپنا قائم مقام کر کے غزنی کو واپس چلا گیا۔

مسلمانوں کے ساتھ ان کی مادری زبان بھی ہر جگہ پہنچتی رہی اور نئی مخلوط زبان
(اردو) کو ترقی ہوتی رہی۔ مسلمان اب تک اپنی بول چال، خط وکتابت وغیرہ کے
لئے فارسی زبان ہی سے کام لیتے تھے۔ لیکن بوقت ضرورت اہل ہند کے ساتھ
نئی مخلوط زبان (اردو) میں معاملہ کرتے تھے۔

دہلی میں اردو کا رواج ۱۱۹۳ء ۵۸۸ھ

اب تک پنجاب و گجرات وغیرہ پر مسلمانوں کا تسلط ہوا تھا
اور انہی علاقوں میں اردو کی اشاعت ہوتی رہی۔ دہلی پر سب سے
پہلے ۱۱۹۲ء ۵۸۸ھ میں قبضہ ہوا قطب الدین ایبک ۱۲۰۶ء ۶۰۳ھ میں دہلی کا پہلا بادشاہ بنا
اسی زمانہ سے اہل دہلی فارسی زبان سے مانوس ہوئے۔ محمد غوری کے جس لشکر
نے قطب الدین کی سپہ سالاری میں دہلی پر قبضہ کیا اس میں کثیر تعداد ان مسلمانوں
کی تھی جو سالہا سال سے پنجاب میں رہتے تھے۔ اور پنجاب کی مقامی زبان کا اثر
اپنی زبان پر رکھتے تھے۔ دہلی کی مقامی زبان پنجاب کی زبان سے اسی قدر مختلف
تھی جتنی بُعد مسافت، امتداد زمانہ، اور لب ولہجہ کے اختلاف سے ہر زبان ہوتی
ہے۔ اب دہلی کی فضا میں دہلوی لب ولہجہ کو غلبہ ہوا اور اردو کی ابتدا ہوئی۔

اردو پر اولیاء اللہ کا فیضان

اردو زبان کی ترویج واشاعت میں اولیاء اللہ کے فیض و
کرامت کو بھی بڑا دخل ہے۔ مسلمانوں کے ابتدائے قیام ہند سے ہی صوفیائے کرام
ہندوستان تشریف لائے اور اپنے نور باطن سے اہل ہند کے دل وجان کو روشن
کرنا شروع کیا۔ ان بزرگوں کی نظر میں ملک وقوم، مذہب وملت کی کوئی قید نہ تھی

ان کا فیضان مسلم و ہندو سب پر یکساں تھا، کتنے ہندو مسلمان ہوئے اور اولیاء اللہ سے فیض حاصل کیا۔ اسی فیض یابی کی خاطر اگرچہ اہل ہند نے فارسی کی مشق بہم پہنچائی لیکن فیض رسانی کے لئے اولیاء اللہ کی زبان فیض ترجمان پر بھی اکثر ہندی الفاظ جاری ہوئے۔

۱۔ حضرت داتا گنج بخش ہجویریؒ (متوفی ۴۵۶ھ / ۱۰۶۳ء) حکومت غزنویہ کے زمانے میں لاہور تشریف لائے۔ مزار پاک بھی وہیں ہے۔

۲۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ (۵۳۷ھ / ۱۱۴۲ء تا ۶۳۳ھ / ۱۲۳۵ء) راجہ پرتھی راج کے زمانے میں اجمیر تشریف لائے۔ داتا صاحب اور خواجہ صاحب کا کوئی قول ہندی زبان کا نہیں ملتا۔ تاہم خواجہ اجمیریؒ کے تکلم زبان ہندی کے متعلق شہادت ملتی ہے یعنی ملک محمد جائیسی کی نظم اکھروتی کا شارح تمہید شرح میں لکھتا ہے:[۱]

"گماں نکند کہ ہیچ اولیاء اللہ بزبانِ ہندی تکلم نکردہ۔ زیراکہ اول از جمیع اولیاء اللہ قطب الاقطاب خواجہ بزرگ معین الحق والملۃ والدین قدس اللہ مرو بدیں زبان سخن فرمودہ"

۳۔ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ (۵۸۲ھ / ۱۱۸۶ء تا ۶۳۴ھ / ۱۲۳۶ء) قطب الدین ایبک کے زمانے میں دہلی تشریف لائے۔ خواجہ اجمیریؒ کے خلیفہ اور بابا شکر گنجؒ کے پیر و مرشد تھے۔

---

[۱] "اردو زبان کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام" مؤلفہ مولوی عبدالحق صاحب (اشاعت انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن)

۴۔ حضرت بابا فرید شکر گنج رحمۃ اللہ علیہ[1] (۱۱۸۶ء / ۵۸۲ھ تا ۱۲۶۵ء / ۶۶۴ھ) نے غلام خاندان کی حکومت کے زمانے میں پاک پٹن (پنجاب) میں سکونت اختیار فرمائی، خواجہ بختیار کاکی سے فیض باطن پایا، پنجاب بلکہ تمام ہندوستان کو اپنے نور باطن سے منور فرمایا۔ بابا صاحب کے زمانے میں مسلمانوں کے فتح پنجاب و حکومت ہند کو دو سو برس کے قریب گزر چکے تھے۔ اردو زبان کی تشکیل ہو چکی تھی اور رواج بڑھ رہا تھا پھر خود بابا صاحب کثیر الاولاد تھے، ان کے صدہا خلفا اور ہزارہا مرید پنجاب اور تمام ہندوستان میں پھیلے ہوئے تھے۔ اہل ہند کی تعلیم و تلقین کے لئے بابا صاحب ہندی زبان سے بھی کام لیتے تھے۔ چونکہ نہایت مقبول اور کثیر الفیضان بزرگ تھے اس لئے سب اولیاء اللہ سے زیادہ انکے اقوال و اشعار مشہور ہیں۔ مثلاً

(ا) سیر الاولیاء مؤلفہ مولانا سید مبارک معروف بہ میر خورد میں درج ہے
شیخ شیوخ العالم قدس سرہ العزیز (یعنی بابا گنج شکر) فرمود بزبان ہندی "پونوں کا چاند بھی بالا ہے" یعنی ماہ شب چہاردہم در اول شب خوردمی باشد کہ بتدریج بکمال می رسد۔

(ب) ایک مرتبہ کسی نے آپ سے دریافت کیا کہ جسم میں عقل کا مقام کونسا ہے؟ آپ نے فرمایا "بیچ سر کے"

---

[1] حضرت بابا شکر گنج کی تواریخ ولادت و وفات میں مورخوں کا بڑا اختلاف ہے۔ مولوی عبد الحق صاحب نے سال ولادت ۵۶۹ھ لکھا ہے۔ اور شاہجہاں بادشاہ کے زمانے کے ایک مصنف صاحب سیر الاقطاب نے تاریخ وفات لفظ "مخدوم" سے نکالی ہے جس سے ۶۹۰ھ نکلتا ہے۔ اگر ولادت و وفات کے یہ دونوں سال صحیح مانے جائیں تو بابا صاحب کی عمر ۱۲۱ سال کی ہوتی ہے لیکن کسی تذکرے سے یہ عمر ثابت نہیں ہوتی۔ ہمارے سنہ خزینۃ الاصفیاء سے ماخوذ ہیں۔

اج ا ایک پرانی بیاض میں بابا صاحب کی یہ نظم دستیاب ہوئی۔

تن دھونے سے دل جو ہوتا پاک	پیش رو اصفیا کے ہوتے غوک
ریش سبلت سے گر بڑے ہوتے	بوکڑواں سے نہ کوئی بڑے ہوتے
خاک لانے سے گر خدا پائیں	گائے بیلاں بھی واصلاں ہو جائیں
عشق کا رموز نیارا ہے	جز مدد پیر کے نہ چارہ ہے

(د) بابا فرید شکر گنج کی ایک غزل ریختہ بھی ملی ہے:۔

وقت سحر وقت مناجات ہے	خیز دراں وقت کہ برکات ہے
نفس مبادا کہ بگوید ترا	خسپ چہ خیزی کہ ابھی رات ہے
باتن تنہا چہ روی در زمیں	نیک عمل کن کہ وہی سات ہے

پند شکر گنج بدل جاں شنو
ضائع مکن عمر کہ ہیہات ہے[1]

انکے علاوہ بہت سے پنجابی زبان کے اشعار پنجاب میں زبان زد خلائق ہیں۔ بعض اشعار و اقوال میں ذکر کے طریقے تعلیم فرمائے ہیں۔ بابا صاحب کے بعض اعمال محفوظ ہیں۔ خاکسار راقم بھی بابا شکر گنج کی اولاد میں ہے۔ راقم کے خاندان میں بابا صاحب کا ایک خاص عمل رائج ہے جو اُس زمانے کی اُردو زبان میں ہے۔

۵۔ حضرت شاہ بو علی قلندر پانی پتی (متوفی ۱۳۲۴ء) سلطان علاء الدین خلجی کے زمانے میں تھے۔ ایک مرتبہ حضرت امیر خسرو حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں گئے اور کچھ گانا سنایا۔ شاہ صاحب خوش ہوئے اور اپنا کلام امیر صاحب کو سنایا امیر اس کو سُنکر آبدیدہ ہوئے۔ حضرت نے فرمایا تُرکا کچھ سمجھ دار ہے۔ امیر خسرو نے کہا اسی لئے تو روتا ہوں کہ کچھ نہیں سمجھتا۔

---

[1] ا۔ ج۔ د، مولوی عبدالحق صاحب کی تالیف مذکورہ بالا سے ماخوذ ہیں

حضرت شاہ بوعلی قلندر کی زبان مبارک سے مبارز خاں کے ارادۂ سفر کے موقع پر یہ دوہا نکلا تھا:-

سجن سکارے جائیں گے اور نین مریں گے روے
بدھنا ایسی رین کر بھور کدھی نا ہوے

اسی مضمون کو آپ نے فارسی میں اس طرح ادا کیا ہے:-

من شنیدم یار من فردا رود در راہ شتاب یاالٰہی تا قیامت بر نیاید آفتاب[۱]

۶- حضرت نظام الدین اولیا (۶۳۴ھ ۱۲۳۳ء تا ۷۲۵ھ ۱۳۲۵ء) خلیفہ حضرت بابا فرید شکر گنج و پیر و مرشد حضرت امیر خسرو سے کوئی قول ہندی زبان کا منقول نہیں ہے لیکن ایک مرتبہ آپ نے فرمایا تھا:-

"کلام حق را در روز میثاق بآہنگ پوربی شنیدم"[۲]

۷- حضرت امیر خسرو (۶۵۳ھ ۱۲۵۵ء تا ۷۲۵ھ ۱۳۲۵ء) پٹیالی (ضلع ایٹہ) میں پیدا ہوئے۔ حضرت سلطان الاولیاء نظام الدین محبوب الٰہی سے تربیت باطن حاصل کی۔ سلطان غیاث الدین بلبن (خاندان غلامان) سے سلطان محمد تغلق تک گیارہ شاہان دہلی کا زمانہ دیکھا اور سات بادشاہوں کی ملازمت کی، اس زمانے میں پنجاب و بنگال کا سفر کیا، جنگوں میں شریک ہوئے۔ امیر خسرو ان باکمال و منتخب ہستیوں میں ہیں جن کو اللہ تعالیٰ صدہا سال کے بعد کبھی پیدا کرتا ہے۔ وہ سپاہی بھی تھے اور عالم بھی، دنیادار بھی تھے اور ولی کامل بھی، شاعر بھی تھے اور ماہر موسیقی بھی، عاشق بھی تھے اور زندہ دل بھی۔ ہندوستان کے فن موسیقی میں جدتیں پیدا کیں، فارسی زبان کے تین دیوان مرتب کئے، اور آٹھ مثنویاں لکھیں۔ ہندی زبان میں بہت کچھ کہا جس کا ذکر اپنے دیوان کے

۱؎ یہ اقوال بھی مولوی عبدالحق صاحب کی کتاب مذکور سے ماخوذ ہیں۔

۲؎ از مضمون افتخار عالم صاحب مارہروی مطبوعہ رسالہ اردو بابت اپریل ۱۹۲۱ء

دیباچہ میں کیا ہے لیکن وہ ہندی کلام اب محفوظ نہیں ہے بعض گیت، دوہے، پہیلیاں، انملیاں، کہہ مکرنیاں ان کے نام سے مشہور ہیں لیکن کسی تاریخی سند سے ثابت نہیں ہوتا کہ انہی کی تصنیف ہیں۔ زبان ریختہ کی بعض غزلیں اور قطعے البتہ انہی کے ہیں۔ یہ تو یقینی ہے کہ امیر صاحب ہندی زبان بے تکلف بول سکتے تھے لیکن یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کو ہندی زبان سے خاص محبت تھی اس لئے کہ ہندی الفاظ اپنی فارسی نظموں میں کثرت سے لکھتے ہیں۔ مثلاً

(ا) اے دہلی واے بتانِ سادہ　　پگ بستہ و چیرہ کج نہادہ

(ب) یک گل بیل دہ دیگر دروں　　گل زگل و گل زگل آید بروں

(ج) صفتِ بیڑہ تنبول کہ نزد ہمہ خلق　　بہ ازاں نیست مٹھائی بہمہ ہندستان

(د) تیلی پسرے کہ می فروشد تیلے　　از دست و زبان چرب او واویلے

خالے بلبش دیدم و گفتم کہ تل است　　گفتا کہ برو نیست دریں تل تیلے

(ہ) گجری تو کہ در حسن و لطافت چو مہی　　آں دیگ دہی بر سر تو چتر شہی

از ہر دو لبت شہد و شکر می ریزد　　ہر گاہ بگوئی کہ دہی[1] لیہو دہی

(و) زرگر پسرے چو ماہ پارا　　کچھ گھڑ کے سنوار کے پکارا

نقد دل من گرفت و بشکست　　پھر کچھ نہ گھڑا نہ کچھ سنوارا

(ز) خوار شدم زار شدم لٹ[2] گیا　　در غم ہجر تو کمر ٹو[3]ٹا ہے

یار نہیں دیکھتا ہے سوئے من　　بے گنہ ہم ساتھ عجب رو[4]ٹھا ہے

روئے تو رونق شکن آفتاب　　سرو بہ پیش قد تو بو[5]ٹا ہے

گاہ ز خسرو تو نہ گفتی کہ بیٹھ[6]　　وہ چہ کند بھاگ مرا پھو[7]ٹا ہے

---

[1] دہی لو دہی [2] لٹ گیا۔ [3] ٹوٹا۔ [4] روٹھا [5] بوٹا [6] بیٹھ [7] پھوٹا

(ح) شبانِ ہجراں دراز چوں زلف و روزِ وصلت چو عمر کوتاہ
سکھی! پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں
یکایک از دل دو چشم جادو بصد فریبم ببرد تسکین
کسے پڑی ہے جو جا سناوے پیارے پی کو ہماری بتیاں

(ط) پہیلی :-

بالا تھا جب سب کو بھایا — بڑا ہوا کچھ کام نہ آیا
خسرو کہہ دیا اس کا ناؤں — بوجھو نہیں تو چھوڑ دو گاؤں

یہ پہیلی اس طرح بنائی ہے کہ اسی میں اس کی بوجھ موجود ہے لیکن بظاہر نظر نہیں آتی۔ امیر خسرو نے اس طرح کی بہت سی پہیلیاں کہی ہیں اور ان کو بڑی ذہانت کے ساتھ موزوں کیا ہے۔ اس کے بوجھنے کے لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ چراغ جلانے کو دیا بالنا کہتے ہیں، اور چراغ بجھنے کے لیے دیا بڑا ہونا بولتے ہیں۔ اب پہلے شعر کے یہ معنی ہوتے کہ جب دیا بالا تھا (یعنی چراغ جلایا تھا) تو سب کو بھایا۔ جب دیا بڑا ہوا (یعنی چراغ بجھ گیا) تو کچھ کام نہ آیا۔ تیسرے مصرع کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں "خسرو کہہ کہ اس کا نام دیا ہے" اس طرح بوجھ بھی بتا دی۔

اگرچہ ان پہیلیوں کا امیر خسرو کی تصنیف سے ہونا کسی معتبر ذریعہ سے تحقیق نہیں ہوا لیکن امیر خسرو نے اپنی تصنیف اعجازِ خسروی میں زبان و محاورہ، ادب و بلاغت کے جو لطائف و نوادر پیدا کئے ہیں ان پر قیاس کر کے ان پہیلیوں، کہہ مکرنیوں، انملیوں، دوہوں، گیتوں، نقلوں کو امیر خسرو سے منسوب کیا جا سکتا ہے۔

۸۔ حضرت مخدوم علاء الدین علی احمد صابر (متوفی ۶۹۰ھ / ۱۲۹۱ء) حضرت بابا فرید شکر گنج کے بھانجے اور داماد تھے۔ پیران کلیر شریف میں مزار مبارک ہے۔ "سیر الاقطاب" (مصنفہ ۱۰۵۶ھ / ۱۶۴۶ء بعہد شاہجہاں) سے منقول ہے کہ حضرت مخدوم صابر صاحب کبھی

کبھی شعر بھی کہتے تھے۔ فارسی میں احمد اور ہندی میں صابر تخلص فرماتے تھے مصنف سیر الاقطاب نے "زبان ہندی" کا صرف یہ شعر درج کیا ہے۔

اس طرح اس میں ڈوبئے صابر — کہ بجز ہو کے غیر ہو نہ رہے

اس سات سو برس پہلے کے شعر کی زبان وہی ہے جو آج صحیح و فصیح اردو کی ہے اس لئے اس شعر کا انتساب مشتبہ معلوم ہوتا ہے۔

۹۔ حضرت شیخ سراج الدین عثمان معروف بہ اخی سراج (متوفی ۷۵۸ھ؁ ۱۳۵۷ء) حضرت سلطان الاولیا کے مرید تھے۔ انکے وصال کے بعد بنگالہ سے دہلی آئے اور خواجہ نصیر الدین چراغ دہلویؒ سے خلافت حاصل کی۔ خواجہ صاحب نے حکم دیا "بنگالہ جاؤ"۔ شیخ صاحب نے عذر کیا کہ وہاں شیخ علاء الدین تل پہلے سے موجود ہیں۔ میری کیا ضرورت ہے۔ خواجہ صاحب نے فرمایا "تم اوپر وے تل"۔

۱۰۔ حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیری (متوفی ۷۸۲ھ؁ ۱۳۸۰ء) ملک بہار کا ایک قصبہ منیر آپ کا وطن مبارک ہے۔ پوربی اور ہندی شاعر تھے۔ انکے کچھ منتر دفع زہر و امراض کے لئے مشہور ہیں۔ خاکسار راقم کے خاندان میں ایک منتر رائج ہے جس کی بڑی لمبی عبارت ہے اس کے آخر میں یہ دُہرا ہے:-

کالا ہنسا نرملے بسے سمندر تیر — پنکھ پسارے بس ہرے نرمل کرے سریر[1]

ہمیں تحقیق نہ تھی کہ یہ منتر اور شعر کس کا ہے۔ مولوی عبد الحق صاحب کی کتاب مذکور سے معلوم ہوا کہ یہ شعر حضرت یحییٰ منیری کا ہے۔ مولوی صاحب نے حضرت کا ایک یہ دُہرا بھی نقل کیا ہے:-

شرف حرف مائی کہیں درد کچھ نہ بسائے — گرد چھوئیں دربار کی سو درد دور ہو جائے

---

[1] میں نے یہ شعر اپنے خاندان کی روایت کے مطابق لکھا ہے۔ اس میں مولوی عبد الحق کے منقول شعر سے ایک آدھ لفظ میں اختلاف ہے۔

اردو میں سب سے پہلی تصنیفِ نثر ۷۰۸ھ/۱۳۰۸ء

خواجہ سیّد اشرف جہانگیر سمنانی نے (جن کا مزار کچھوچھا شریف علاقہ اودھ میں ہے) اردو میں ایک رسالہ اخلاق و تصوف پر ۷۰۸ھ/۱۳۰۸ء میں تصنیف کیا۔ میر نذر علی دردؔ کاکوروی رسالہ نگار لکھنؤ بابت دسمبر ۱۹۲۵ء میں لکھتے ہیں کہ ـــــ سید اشرف جہانگیر نے اپنے سلسلے کے ایک بزرگ مولانا وجیہہ الدین کے ارشادات کو اردو زبان میں (جس کو اس زمانے میں "زبانِ ہندی" کہا کرتے تھے) خود جمع کیا ہے۔ میں نے اپنے ایک بزرگ کے پاس خود اس کتاب کو دیکھا ہے۔ یہ قلمی کتاب ۲۰۷ صفحہ کی ہے۔ اس کے صـ۱۱۸ کی ایک عبارت کا ٹکڑا یہ ہے۔

"اے طالب آسمان زمین سب خدا میں ہے۔ ہوا سب خدا میں ہے جو تحقیق جان اگر تجھ میں کچھ سمجھ کا ذرہ ہے تو صفات کے باہر بہتر سب ذات ہی ذات"

نثر اردو میں اس سے پہلے کوئی کتاب ثابت نہیں ہے۔ سید اشرف صاحب ۶۸۸ھ/۱۲۸۹ء میں پیدا ہوئے اور ۱۲۰ سال کی عمر کو (بحساب قمری) پہنچ کر ۸۰۸ھ/۱۴۰۵ء میں وفات پائی۔ ممکن ہے کہ سید صاحبؒ کی کتاب ہی اردو زبان کی تصنیف اوّلین ہو۔

اب تک اربابِ تحقیق متفق الرائے تھے کہ شمالی ہند میں اٹھارویں صدی عیسوی (بارھویں صدی ہجری) سے پہلے تصنیف و تالیف نثر کا کوئی وجود نہ تھا۔ یہ فخر دکن کو حاصل ہے کہ وہاں شمالی ہند سے چار سو برس پہلے اردو کی تصانیف کا آغاز ہوا اب سید اشرف جہانگیر کے رسالہ تصوف کی دریافت سے وہ نظریہ باطل ہو گیا اور ثابت ہو گیا کہ دکن میں اُردو زبان کی بنیاد پڑنے سے پہلے شمالی ہند میں امیر خسرو اور سید اشرف جہانگیر نے نظم و نثر دونوں کی بنیاد ڈال دی تھی۔

فتح دکن (دکن میں اردو کا آغاز) ۷۱۲ھ/۱۳۱۲ء

علاءالدین خلجی بادشاہ دہلی کے غلام سردار

ملک کافور نے ۷۰۶ھ / ۱۳۰۶ء میں دکن پر حملے شروع کئے اور ۶ سال میں ۷۱۲ھ / ۱۳۱۲ء تک تمام مہاراشٹر (ملک دکن) کو سلطنت دہلی میں شامل کرلیا اور مسلمانوں کی حکومت راس کماری تک وسیع ہو گئی۔

یہ اسلامی لشکر جو دہلی سے دکن گیا اُردو زبان ساتھ لیکر گیا۔ ان لوگوں کے دکن میں رہنے کی وجہ سے دکن میں اردو کا آغاز ہوا۔ اسی نے اہل دکن کو اردو سکھائی۔ اس زمانہ سے پہلے دکن میں اردو کا رواج شروع نہ ہوا تھا اور واقعات سے ثابت ہو چکا ہے کہ اس وقت تک شمالی ہند میں اردو کا آغاز ہو چکا تھا۔ اور تصنیف و شاعری بھی شروع ہو چکی تھی۔

گجرات میں اردو کا آغاز ۶۹۷ھ / ۱۲۹۷ء | اس سال میں علاء الدین خلجی نے گجرات کو فتح کیا۔ خلجیوں اور تغلقوں کے عہد حکومت میں گجرات سلطنت دہلی کا صوبہ رہا۔ سلطان محمد تغلق کے زمانے میں ۷۲۴ھ / ۱۳۲۴ء میں بغاوت ہوئی اور بادشاہ سے فرو نہ ہو سکی۔ گجرات میں خود مختاری کی کوشش جاری رہی۔ آخر فیروز تغلق کے بعد ۷۹۳ھ / ۱۳۹۱ء میں ظفر خان حاکم گجرات بنا کر بھیجا گیا۔ وہ کچھ عرصہ کے بعد خود مختار بن بیٹھا اور اس کی اولاد نے تقریباً دو سو برس یعنی ۹۰۸ھ / ۱۵۰۲ء تک حکومت کی۔

مسلم فاتحوں کے ساتھ ہمیشہ ہر ملک میں مسلمان علما۔ وزرا اور اولیاء اللہ بھی پہنچ جاتے تھے۔ اس طرح ہر مقام پر ہر زمانے میں اسلامی تمدن و معاشرت اور اسلامی حکومت و شریعت کے ساتھ ساتھ اسلامی علوم ظاہر و باطن بھی رائج و شائع ہوتے رہتے تھے۔ چنانچہ گجرات میں بھی ابتدائے فتح گجرات سے ہی ارباب علم و اہل دل کا اجتماع شروع ہو گیا تھا۔ جیسا کہ اوپر مذکور ہوا کہ شیخ گنج العلم تحصیل علم کے لئے گجرات گئے تھے۔ گجرات میں مسلمانوں کے سبب سے اردو کی ابتدا ہوئی اور آہستہ آہستہ ترقی ہوتی رہی۔

(۱) ۸۰۲ھ/۱۴۰۰ء میں حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت کے پوتے سید برہان الدین عبداللہ بن محمود آغاز شباب میں پٹن (گجرات) میں تشریف لائے۔ پھر جب سلطان احمد بادشاہ گجرات (۸۱۳ھ/۱۴۱۱ء تا ۸۴۶ھ/۱۴۴۲ء) نے احمد آباد آباد کیا تو سید صاحب پٹن سے احمد آباد آکر سکونت پذیر ہو گئے۔ گجرات میں آپ کا لقب قطب عالم اور آپ کے فرزند اکبر سید سراج الدین محمد بن عبداللہ کا لقب شاہ عالم مشہور ہے۔ حضرت قطب عالم کے متعلق مذکور ہے کہ ایک روز آپ پچھلی رات کو اُٹھ کر باہر نکلے تو کسی چیز سے ٹھوکر لگی آپ نے فرمایا۔ لوہ ہے یا لکڑ یا پتھر یا کیا ہے۔ قطب عالم کا وصال ۸۵۷ھ/۱۴۵۳ء میں ہوا۔

(۲) جب شاہ بارک اللہ چشتی احمد آبادی نے بشارت نبوی کی تعمیل میں قطب عالم کے فرزند اکبر کو "شاہ عالم" کا لقب دیا اور قطب عالم نے بشارت خواب اور لقب کا واقعہ سنا تو فرمایا کہ "چشتیوں نے پکائی اور اُسے بخاریوں نے کھائی" شاہ عالم نے ۸۸۰ھ/۱۴۷۵ء میں وصال فرمایا۔

(۳) شیخ وجیہ الدین گجراتی (عالم درویش کامل) کے چند مقولے بحر الحقائق میں درج ہیں۔ مثلاً (الف) "اس سیں ہور کیا خوب ہے اس دنیا میں کہ دل خدا سوں مشغول ہووے" (ب) "عارف اسے کہیں جو خدا سوں بھریا ہووے"۔

اردو کی اہمیت و مقبولیت ۷۳۳ھ/۱۳۳۲ء (۱) ابن بطوطہ طنجہ (افریقہ) کا رہنے والا تھا اس کی مادری زبان عربی تھی سلطان محمد تغلق کے زمانے میں ۷۳۳ھ/۱۳۳۳ء میں ہندوستان آیا۔ عربی زبان میں اپنا سفر نامہ لکھا۔ اس نے پردہ، پردانہ، بارگہ، سراچہ، ناخدا وغیرہ فارسی الفاظ کے ساتھ بہت سے اردو کے الفاظ بھی استعمال کئے ہیں۔ مثلاً ٹٹو، منڈی، ڈولہ، کہار، کنگھر، ان الفاظ کے ہندی حروف کو عربی حروف سے بدل لیا ہے بعض جگہ الفاظ میں تغیر بھی کر لیا ہے۔ مثلاً کُتنبری (کھچڑی)، جوتری (چودھری)، جوکیہ (جوگی)

قطارہ (کتارہ)

سنہ ۱۴۱۹ء / ۸۲۲ھ | (۱) ملاّ نذر محمد دہلوی معروف بہ "قاضی خاں" نے سنہ ۱۴۱۹ء میں فارسی زبان کی کتاب لغت اداۃ الفضلا لکھی۔

سنہ ۱۴۴۸ء / ۸۵۲ھ | (۲) قوام الدین ابراہیم فاروقی نے بنگال میں سلطان رکن الدین باربک حاکم بنگالہ کے زمانے میں ایک لغت فارسی سنہ ۱۴۴۸ء میں مرتب کیا۔ اور شرف نامہ اس کا نام رکھا۔

سنہ ۱۵۱۸ء / ۹۲۴ھ | (۳) شیخ لاد دہلوی (متوفی سنہ ۱۵۱۹ء / ۹۲۵ھ) نے سلطان ابراہیم لودی کے زمانہ میں موید الفضلاء کے نام سے فارسی لغت مُدوّن کیا۔

ان تینوں لغات میں اور خصوصاً موید الفضلاء میں صدہا فارسی الفاظ کے معانی اردو میں بیان کئے ہیں۔ اس طرح موید الفضلاء میں تقریباً آٹھ سو اُردو کے الفاظ آگئے ہیں۔ اردو زبان کی اہمیت وضرورت کی یہ کچھ کم دلیل نہیں ہے۔

سنہ ۱۴۴۰ء تا سنہ ۱۵۱۸ء / ۸۴۳ھ تا ۹۲۴ھ | (۴) کبیر داس بنارس کے مسلمان جولاہے تھے۔ دوسری روایت یہ ہے کہ کسی برہمن کے لاوارث بچے تھے۔ ایک مسلمان جولاہے اور اس کی بیوی نے بیٹا بنا کر عالم شیر خوارگی سے پرورش کی۔ بڑے ہو کر گرو رامانند کے چیلے ہو گئے اور پھر اپنا الگ مذہب کبیر پنتھ نکالا۔ ان کے پند آمیز دوہے کثرت سے مشہور ہیں جن میں عربی و فارسی الفاظ موجود ہیں۔ مثلاً

کبیر شبد سرائے ہے کیوں سوئے سُکھ چین
کوچ نقارا سانس کا باجت ہے دن رین

کانکر پاتھر جوڑ کے مسجد لئے چنائے
تا چڑھ ملّا بانگ دے، کیا بہرا ہوا خدائے

دین گوا یو دُنی سے، دنی نہ آیو ہاتھ پیر کلہاڑی ماریو گا پھل اپنے ہاتھ (غافل)

کبیر سے چند غزلیں بھی منسوب ہیں لیکن ان کی تاریخی سند مشتبہ ہے۔ اگر یہ غزلیں کبیر داس کی ہیں تو پھر دکن کی اولیت شعر و غزل کے سب نظریے باطل ہیں۔ ایک غزل کا مطلع و مقطع یہ ہے:-

ہمن ہے عشق مستانہ، ہمن کو ہوشیاری کیا
رہیں آزاد یا جگ میں، ہمن دنیا سے یاری کیا

کبیرا عشق کا ماتا، دوئی کو دور کر دل سے
جو چلنا راہ نازک ہے، ہمن کو بوجھ بھاری کیا

۸۷۴ھ تا ۹۴۵ھ / ۱۴۶۹ء تا ۱۵۳۸ء (۵) گرو نانک سکھ مذہب کے بانی کبیر کے ہم عصر تھے کبیر کی تعلیم اور مذہب اور شاعری سے متاثر ہوئے۔ ان کے دوہوں یا ہندی اشعار میں بھی عربی فارسی کی آمیزش اردو کی رفتار و مقبولیت کو ثابت کر رہی ہے۔ مثلاً

سانس مانس سب جیو تمھارا — تو ہے اکھرا پیارا
نانک شاعر یوں کہت ہے — سچے پروردگارا

۹۳۲ھ / ۱۵۲۶ء (۶) تاریخ داؤدی میں منقول ہے کہ جب جنگ پانی پت (۱۵۲۶ء) میں بابر نے سلطان ابراہیم لودی پر فتح پائی اور اس کا سر کاٹ کر بابر کے سامنے لایا گیا تو حاضرین میں سے کسی نے فی البدیہہ یہ شعر پڑھے

نو سے اوپر تھا بتیسا ۳۲ — پانی پت میں بھارت دیسا
اٹھیں رجب سکر وارا — بابر جیتا براہیم ہارا

یعنی ۸ رجب ۹۳۲ھ روز جمعہ

۸۸۸ھ تا ۹۳۷ھ / ۱۴۸۳ء تا ۱۵۳۰ء (۷) سلطنت مغلیہ کے پہلے بادشاہ بابر نے ۹۲۵ھ / ۱۵۱۹ء میں پہلا کامیاب حملہ سندھ پر کیا اور تیسرا حملہ ۹۳۲ھ / ۱۵۲۶ء میں کر کے تخت دہلی پر قبضہ کر لیا۔ بابر صاحب سیف و قلم تھا۔ ترکی اور فارسی زبان کا شاعر تھا۔ دونوں زبانوں کا

دیوان یک جا طبع ہو گیا ہے۔ ترکی زبان میں اپنے سوانح حیات ایک ضخیم کتاب تزک بابری میں مرتب کئے ہیں قیام ہندوستان کے دوران میں اردو زبان سے بھی مناسبت پیدا کی۔ اپنی تصنیف میں کثرت سے اردو الفاظ لایا ہے۔ مثلاً ہاتھی، پان، پنکھا، جامن کمرک، کیوڑا، کرونداِ، چرونجی، گلہری، مور، دوپہر وغیرہ اور اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ ایک ترکی شعر میں بھی اردو الفاظ اور اردو فعل استعمال کیا ہے۔ لکھتا ہے:۔

جھکانہ ہوا کچھ ہوس مانک موتی   نقرا ہلیغہ بس بولغو سیدر پانی درتی

۱۵۳۶ء / ۹۴۲ھ (۸) اس کے رواج اور عام بول چال کا ایک عجیب دلچسپ ثبوت یہ واقعہ ہے کہ ۱۵۳۵ء میں ہمایوں بادشاہ نے بادشاہ مالوہ و گجرات بہادر شاہ پر حملہ کیا۔ اس کا سپہ سالار رومی خاں مغلوں سے خفیہ طور پر مل گیا تھا۔ رومی خاں کی غداری و بیوفائی سے بہادر شاہ کو شکست ہو گئی۔ ہمایوں کو اسباب غارت میں بہادر شاہ کا ایک طوطا بھی ہاتھ آیا۔ طوطا انسانوں کی طرح باتیں کرتا تھا۔ فتح کے بعد ہمایوں کے دربار میں طوطے کا پنجرا رکھا ہوا تھا۔ رومی خاں دربار میں حاضر ہوا تو طوطا اس کو دیکھتے ہی چلا اٹھا:۔

"پھٹ پاپی رومی خاں نمک حرام، پھٹ پاپی نمک حرام"

۱۵۳۲ء تا ۱۶۲۴ء / ۹۳۸ھ تا ۱۰۳۲ھ (۹) تلسی داس مصنف رامائن اکبر و جہانگیر کے زمانے میں تھا۔ رامائن ہندی کی نظم ہے۔ خالص ہندوؤں کے قصص و حکایات، تہذیب و معاشرت رزم و بزم اس کا موضوع ہے لیکن عربی و فارسی الفاظ اس قدر عام و مقبول تھے کہ تلسی داس رامائن میں بھی کہیں کہیں بیساختہ لکھ گیا ہے۔ تلسی داس نے اخلاقی دوہے بھی کہے ہیں ان میں تو کثرت سے عربی فارسی الفاظ موجود ہیں۔ مثلاً

جو مینا میں نا کہے، میٹھی شکر کھائے   جو بکری میں میں کہے سبح ہی ماری جائے

تلسی سیدھی چال سے پیادہ ہوئے وزیر   فرزیں شاہ نہ ہو سکے، گت ٹیڑھی تاثیر

(۱۰) سور داس بھی اسی زمانہ کا شاعر ہے۔ اس کے کلام میں بھی عربی فارسی کی کثرت ہے۔ مثلاً

کھیت بہت کاہے تم تانے، سین سی آواج (آواز)

دلونہ جات پار اتر آوے، چاہت چڑھیں جہاج (جہاز)

اسی میں ایک قافیہ گریب نواج (غریب نواز) ہے۔

(۱۱) سنہ ۱۵۵۶ء / ۹۶۳ھ تا سنہ ۱۶۰۵ء / ۱۰۱۴ھ — ایک مرتبہ اکبر بادشاہ کے سامنے کسی اشتعال طبع پر ادہم خاں نے خان اتکہ کو قتل کر دیا تو اکبر نے بیساختہ ادہم خاں سے کہا

اے ملچھ گانڈی تو کیوں اتکۂ ما را از جان بیجان کردی[۱]

(۱۲) جب اکبر نے جہانگیر کی شادی راجہ بھگوان داس کی لڑکی سے کی اور اکبر و جہانگیر دلہن کی پالکی خود اپنے کندھوں پر اٹھا کر لے چلے تو راجہ نے کہا:-

ہماری بیٹی تمہارے محلوں کی چیری   ہم باندے گلام رہے

اکبر نے برجستہ جواب دیا:-

تمہاری بیٹی ہمارے محلوں کی رانی   تم صاحب سردار رہے[۲]

(۱۳) سنہ ۱۵۶۷ء / ۹۷۵ھ تا سنہ ۱۵۹۳ء / ۱۰۰۱ھ — شیخ عبد الحق محدث دہلوی کی تصنیف زاد المتقین (مصنفہ سنہ ۱۵۹۴ء) میں مذکور ہے کہ ان کے استاد و مرشد شیخ عبد الوہاب متقی متوطن مالوہ دکن سے ہجرت کر کے مکہ معظمہ میں سکونت گزیں ہو گئے تھے۔ وہاں سنہ ۱۵۶۷ء / ۹۷۵ھ سے وقت وفات سنہ ۱۵۹۲ء / ۱۰۰۱ھ تک ۳۶ سال طلبہ کو درس دیتے رہے جن کی صورت یہ تھی کہ عرب طالب علموں کو عربی زبان میں سمجھاتے تھے۔ اہل عجم کو فارسی میں اور ہندوستانیوں

---

[۱] یہ فقرہ شمس العلما مولانا محمد عبد الغنی ایم اے ایم لٹ، سابق پروفیسر ناگپور یونیورسٹی نے تاریخ ہمایونی "قلمی" سے اپنی تصنیف تاریخ ادب فارسی در عہد سلاطین مغلیہ جلد سوم میں درج کیا ہے

[۲] یہ واقعہ بھی پروفیسر محمد عبد الغنی صاحب کی اسی کتاب سے اخذ کیا گیا ہے۔

کو اردو میں۔

یہ سب واقعات اُردو زبان کے رواج عام، کثرتِ اشاعت، مقبولیت و اہمیت کے ثبوت ہیں معلوم ہوتا ہے کہ محمد تغلق (متوفی ۱۳۵۱ء) کے زمانے سے اُردو مستقل زبان بن کر بول چال، لین دین، کا ذریعہ بن گئی تھی۔ اگرچہ شاہی زبان دفتری زبان، کتابی زبان، مدت تک فارسی رہی، لیکن کاروباری زبان اور رعایا کی زبان عام طور پر اردو ہی تھی۔

شمالی ہند میں اردو شاعری کا دورِ قدیم | اب تک جو نمونے درج کئے گئے وہ بول چال کی اردو کے تھے۔ یا ہندی شاعری ایں فارسی و عربی الفاظ کی آمیزش کے۔ کبیر داس گرونانک، تلسی داس، سورداس کے دوہوں میں عربی و فارسی زبانوں کے شامل ہونے سے اُردو زبان کی شان بے شک پیدا ہو گئی اور اس کو یقیناً اردو شاعری کا سنگ بنیاد کہہ سکتے ہیں۔ لیکن اردو شاعری جس چیز سے عبارت ہے اس میں فارسی بحریں بھی شامل ہیں۔ اس اعتبار سے بھی اردو شاعری کا آغاز قدیم زمانہ میں ہو چکا تھا جس کا ثبوت امیر خسرو اور کبیر داس کی غزلیں ہیں۔ اگرچہ ان کی سند تاریخی مشتبہ اور مختلف فیہ ہے۔ تاہم ان کا وجود خارج از قیاس نہیں ہے خاصکر جبکہ کبیر داس ہی کے زمانے میں ایسے شاعر اور بھی موجود تھے جنھوں نے اردو فارسی کی مخلوط غزلیں کہی ہیں اور اس کے بعد سے شاعری و غزل گوئی کا سلسلہ جاری رہا ہے۔

سنہ ۱۵۵۶ء / ۹۶۳ھ | (۱) نوری اعظم پوری اکبر بادشاہ کے زمانے میں تھا فیضی کا دوست تھا اس کا یہ شعر میر حسن نے اپنے تذکرۂ شعرا میں درج کیا ہے۔

ہر کس کہ خیانت کند البتہ بترسد
بیچارۂ نوری نہ کرے ہے نہ ڈرے ہے

سنہ ۱۵۹۳ء / ۱۰۰۲ھ (۲) حضرت کمال الدین مخدوم شیخ سعدی کاکوردی بھی اکبر کے زمانہ کے بزرگ ہیں، اکبر کی زندگی میں ۱۵۹۳ء / ۱۰۰۲ھ میں اُن کی وفات ہوئی ہے۔ ان کی ایک غزل مشہور ہے جس کا ایک شعر یہ ہے۔

ہمنا تمن کو دل دیا، تم دل لیا اور دکھ دیا

ہم یہ کیا، تم وہ کیا، ایسی بھلی یہ پیت ہے

سنہ ۱۶۲۵ء / ۱۰۳۴ھ (۳) محمد افضل ساکن جھنجھانہ ضلع میرٹھ تلسی داس کا ہم عصر ہے۔ اکبر و جہانگیر کا زمانہ دیکھا ہے۔ کسی ہندو عورت پر فریفتہ ہو گیا تھا۔ اپنی داستان محبت عجیب و الہانہ انداز سے نہایت درد انگیز اردو مثنوی میں بیان کی ہے مثنوی کافی طویل ہے۔ ایک نظم بارہ ماسہ بھی لکھی ہے سنہ ۱۶۲۵ء میں انتقال کیا۔

سنہ ۱۶۶۲ء / ۱۰۷۳ھ (۴) پنڈت چندر بھان برہمن تخلص بھی اسی زمانے کے شاعر ہیں۔ اکبر آباد (آگرہ) میں پیدا ہوئے۔ دہلی میں عمر گذاری، شاہجہان بادشاہ کے دربار میں منشی تھے۔ پھر شاہزادہ داراشکوہ کے میر منشی رہے۔ سنہ ۱۶۶۲ء میں انتقال ہوا ان کی ایک غزل کا مطلع یہ ہے:۔

خدا نے کس شہر اندر ہمن کو لائے ڈالا ہے

نہ دلبر ہے، نہ ساقی ہے، نہ شیشہ ہے نہ پیالا ہے

پنڈت چندر بھان برہمن کے انتقال کے بعد ولی اورنگ آبادی پیدا ہوئے ہیں اور تقریباً سنہ ۱۷۰۰ء / ۱۱۱۲ھ میں دہلی آتے ہیں۔ لیکن اس وقت ان کے کلام کی شہرت دہلی میں نہیں ہوئی۔ بلکہ سنہ ۱۷۲۱ء / ۱۱۳۳ھ میں ولی کا دیوان دکن سے دہلی میں آیا ہے۔

سنہ ۱۶۹۰ء / ۱۱۰۱ھ (۵) معز الدین موسوی خاں فطرت مشہد (ایران) کے رہنے والے تھے۔ سنہ ۱۶۷۱ء / ۱۰۸۲ھ میں ہندوستان آئے دربار عالمگیر میں اعزاز پایا۔ فارسی کے شاعر تھے اردو میں شعر گوئی کا چرچا دیکھ کر کبھی کبھی اردو میں بھی کہتے تھے ایک شعر

ان سے یادگار رہ گیا ہے جس میں اردو اور فارسی مخلوط ہیں :-

از زلف سیاہ تو بدل دوم پری ہے[۱]   در گلشن آئینہ گھٹا جوم پری ہے[۲]

اس سے ظاہر ہے کہ اس زمانے میں اردو شاعری کو رواج ہو چلا تھا۔ حالانکہ ولی اورنگ آبادی کا دیوان ابھی دہلی میں نہیں آیا تھا۔

۱۷۲۱ء / ۱۱۳۲ھ (۶) مرزا عبدالقادر بیدل عظیم آباد پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ دہلی میں پرورش پائی۔ شہزادہ محمد اعظم بن شہنشاہ عالمگیر کی سرکار میں نوکر ہوئے۔ کسی نے شاہزادہ کے سامنے میرزا کی تعریف کی۔ شہزادہ نے کہا ہماری شان میں قصیدہ کہہ کر لائیں تو استعداد دیکھ کر اضافۂ منصب و تقرب سے سرفراز کریں گے۔ میرزا نے یہ سنا تو نوکری سے استعفا دیدیا۔ دوستوں نے ہر چند اصرار کیا کہ قصیدہ مدحیہ لکھیں لیکن انھوں نے انکار کیا۔ گوشہ عزلت اختیار کر لیا اور باقی عمر فقر و توکل میں گذار دی۔ سنہ ۱۷۲۱ء / ۱۱۳۲ھ میں انتقال کیا۔ فارسی کے بڑے اعلیٰ شاعر تھے۔ اردو کے دو شعر قائم و میر وغیرہ کے تذکروں میں ملتے ہیں۔

مت پوچھ دل کی باتیں وہ دل کہاں ہے ہم میں
اس تخم بے نشاں کا حاصل کہاں ہے ہم میں
جب دل کے آستاں پر عشق آن کر پکارا
پردے سے یار بولا، بیدل کہاں ہے ہم میں

دیکھو ان اشعار کی زبان کس قدر صاف و صحیح ہے۔ یاد رہے کہ بیدل کے زمانے میں ولی کی شاعری کا چرچا دہلی میں شروع نہ ہوا تھا۔

سنہ ۱۶۵۹ء / ۱۰۶۹ھ تا سنہ ۱۷۱۳ء / ۱۱۲۵ھ (۷) جعفر زٹل شاہجہاں کے زمانے میں سنہ ۱۹۵۹ء / ۱۰۶۹ھ میں پیدا ہوا اور عالمگیر کی وفات کے بعد سنہ ۱۷۱۳ء میں انتقال کیا۔ مشہور مسخرا گزرا ہے۔ بہر حال

---

[۱] یعنی دھوم پڑی ہے   [۲] یعنی گھٹا جھوم پڑی ہے۔

شاعر تھا اور اس حیثیت میں اپنے ہم عصروں سے کم نہ تھا۔ اس کی ہزلیات میں کہیں کہیں مہذب ظرافت بھی موجود ہے۔ ایک مطبوعہ مجموعۂ کلام اس کی طرف منسوب ہے، وہ سب اس کا نہو پھر بھی اس نے بہت کچھ کہا ہے۔ جعفر عمر میں ولی اورنگ آبادی سے بڑا ہے۔ ولی جب دہلی آئے، جعفر کی عمر ۴۰ سال سے زیادہ تھی۔ اس نے ولی کے دہلی آنے سے پہلے شاعری شروع کردی تھی۔

میر جعفر زٹل عالمگیر بادشاہ کے شہزادوں (محمد سلطان۔ محمد اعظم اور محمد معظم) کے درباروں سے توسل رکھتا تھا۔ اعظم و معظم کی لڑائیوں سے پریشان ہوکر عالمگیر کے زمانے کو یاد کرتا ہے اور ان بھائیوں کی خانہ جنگی کا مضحکہ اڑاتا ہے۔

کہاں اب پایئے ایسا شہنشاہ ۔۔۔ مکمل اکمل و کامل دل آگاہ
اگت کے آنجھواں دل رووتا ہے ۔۔۔ نہ میٹھی نیند کوئی سووتا ہے
ددادد ہر طرف بھاگڑ پڑی ہے ۔۔۔ بچہ درگو دسر کھٹیا دھری ہے
ازاں سو اعظم و زیں سو معظم ۔۔۔ زمیں کے واسطے لڑتے ہیں باہم
بیا جعفر زباں کو مختصر کر ۔۔۔ ز دور مختلف دل میں حذر کر

شہر آشوب

گیا اخلاص عالم سے عجب یہ دور آیا ہے
ڈرے سب خلق ظالم سے عجب یہ دور آیا ہے
کہ یاروں میں رہی یاری نہ بھائیوں میں وفاداری
محبت اٹھ گئی ساری عجب یہ دور آیا ہے
کہ بولے راستی کوئی۔ عمر سب جھوٹ میں کھوئی
اتاری شرم کی لوئی عجب یہ دور آیا ہے

خوشامد سب کریں زر کی چہ بیگانہ چہ زن گھر کی
بھلا دی بات سب ہر کی عجیب یہ دور آیا ہے

جعفر زٹل کے ہم عصر سید عبدالجلیل اٹل ہیں۔ نارنول سے دکن کو زٹل کے نام خط لکھتے ہیں۔

پناہ برادئی وجوڑائی میر جعفر بڑے بھائی، ہر روز از یاد حق سکی با : یہ...
زٹل تیری جعفر جہانگیر شد زٹل گفتن اندر توئی میر شد

سید اٹل کی ایک غزل یہ ہے :-

غزل اٹل

رخسار پر بہار ہجن رونق چمن یا گل گلاب کا کہوں یا لالہ یاسمن
یا حقۂ جواہر و یا درج در کہوں یا غنچۂ گلاب کہوں یا کہوں دہن
گیسوئے تابدار ہیں یا ناگ ہے بھونگ یا زلف مشک ناب ہے یا نافۂ ختن
با قد خوش خرام چلے جب لٹک لٹک شمشاد اور صنوبر خم کھا دیں در چمن

بر توسن کرشمہ سوار است نازنین
سید اٹل ز بادۂ دیدار او مگن

سنہ ۱۷۱۲ء / ۱۱۲۴ھ | (۸) میر عبدالجلیل بلگرامی علامہ جلیل و شاعر بے عدیل گزرے ہیں سنہ ۱۶۶۱ء / ۱۰۷۱ھ میں پیدا ہوئے۔ سنہ ۱۷۲۵ء / ۱۱۳۸ھ میں وفات پائی۔ علامہ مرحوم نے سنہ ۱۷۱۲ء / ۱۱۲۴ھ میں نواب نظام الملک آصف جاہ وزیر فرخ سیر بادشاہ دہلی کی شان میں ایک قصیدہ فارسی لکھا ہے۔ اس میں عربی، فارسی، اردو تینوں زبانوں میں تاریخیں کہہ کر شامل کی ہیں۔ اردو کی تاریخ کا شعر یہ ہے :-

---

ہ تعجب ہے کہ سید اٹل بجائے "تو میر شدی" کے "توئی میر شد" لکھتے ہیں۔

اسیس دیکے کہی ہندوی موں یوں سنبت
"رہے جگت موں اچل باس یہ وزیر سدا"

۱۱۳۴ھ

۱۷۲۶ء / ۱۱۳۹ھ | (۹) میرزا عبدالغنی قبول کشمیری دہلی میں سکونت گزیں تھے ۱۷۲۶ء / ۱۱۳۹ھ میں وفات پائی۔ فارسی کے شاعر تھے اردو کا ایک شعر ان سے یادگار ہے۔

دل یوں خیال زلف میں پھرتا ہے نعرہ زن — تاریک شب میں جیسے کوئی پاسباں پھرے

۱۷۴۶ء / ۱۱۵۹ھ | (۱۰) میرزا محمد رضا قزلباش خاں ہمدانی اُمید تخلص شہنشاہ عالمگیر کے زمانے میں ہندوستان آئے۔ سید حسین علی "بادشاہ گر" کے دورِ سیادت میں برہان پور کرناٹک وغیرہ میں ملازم رہے۔ شاہ عالم بادشاہ کے دربار سے قزل باش خاں خطاب پایا۔ آخر دہلی میں اقامت اختیار کی اور وہیں ۱۷۴۶ء / ۱۱۵۹ھ میں رحلت کی۔ ہندوستان آنے کے شروع زمانے میں جو شعر اردو کا کہا ہمیں فارسیت بھی غالب ہے اور دکنیت بھی، کہتے ہیں

بامن کی بیٹی آج مری آنکھ موں پڑی — غصہ کیا دگالی دیا و دگر لڑی

پھر دہلی میں رہ کر یہ شعر کہے

درد دلوار سے اب صحبت — یار بن گھر میں عجب صحبت ہے
تیری آنکھوں کو دیکھ ڈرتا ہوں — الحفیظ الحفیظ کہتا ہوں

نثرِ اُردو کا دورِ اوّل

دکن میں اردو | یہ بات قابل غور ہے کہ دہلی اور تمام شمالی ہند میں اردو زبان کی ابتدا یعنی گیارھویں صدی عیسوی سے اٹھارھویں صدی کے آغاز تک کسی مستقل و مکمل تصنیف نثر یا نظم، مطبوعہ یا غیر مطبوعہ، موجود یا مفقود کا پتہ نہیں ملتا بجز سید اشرف جہانگیر

سمنانی کے رسالۂ نثر اور افضل جھنجھانوی کی مثنوی کے۔ یہ کتابیں تبرکات ادبی سے زیادہ کچھ نہیں ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اردو زبان کی ایجاد اور شاعری و تصنیف کا طرہ شمالی ہند کے سر ہے۔ لیکن یہ کارنامے امتیاز و اعزاز سے بڑھ کر کوئی وقعت نہیں رکھتے۔ برخلاف دکن کے، کہ اردو زبان کے رواج میں دکن شمالی ہند سے بہت پیچھے ہے۔ اس پر بھی دکن نے اردو کی اتنی قدر کی کہ چودھویں صدی عیسوی سے اٹھارہویں صدی تک نظم و نثر کی صدہا کتابیں تیار کر دیں، جن میں شعر و سخن اور علم و فن کی مختلف اصناف شامل ہیں۔

اس کا سبب | ترقی زبان و ادب کے معاملے میں دکن کی تقدیم کا سبب یہ ہے کہ شمالی ہند میں شاہی زبان اور دفتری و عدالتی زبان فارسی رہی۔ مخلوط زبان (اردو) بننے اور بڑھنے لگی تھی لیکن اس کو شاہی سرپرستی حاصل نہ ہوئی۔ اس لئے اس عرصے میں جتنی شاعری اور تصنیف و تالیف ہوئی فارسی زبان میں ہوئی۔ مسلمان اہل قلم نے اردو نوازی کی طرف توجہ نہ کی۔ ہندو اہل ذوق اَلنَّاسُ عَلٰی دِیْنِ مُلُوْکِهِمْ[1] کے اصول پر فارسی علم و ادب حاصل کرتے رہے۔

برخلاف دکن کے کہ فتح دکن (۱۳۱۲ء) کے چند سال بعد حسن[2] بہمنی نے

---

[1] رعایا بادشاہوں کا طریقہ اختیار کر لیتی ہے۔

[2] تاریخ فرشتہ کی غلط بیانی سے عوام میں حسن بہمنی کے متعلق یہ قصہ مشہور ہو گیا ہے کہ وہ گانگو نام برہمن کا ملازم تھا۔ ایک دن کھیت میں کوئی دفینہ نکلا جس نے اپنے آقا برہمن کو اطلاع کی۔ وہ اس دیانت داری سے خوش ہوا اور سلطان محمد تغلق سے حسن کی سفارش کر کے اس کو دربار میں نوکر کرا دیا۔ حسن نے دکن میں سلطنت قائم کی تو شکر احسان کے طور پر برہمن کا نام شامل کر کے سلطنت بہمنیہ نام رکھا۔ فرشتہ کے علاوہ اور کسی ذریعہ سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی۔ حسن ایران کے بہمن شاہ کی نسل سے تھا اس لئے اپنے آپ کو بہمنی کہتا تھا۔

(جو محمد تغلق بادشاہ کا امیر دربار اور دکن میں بادشاہ کی طرف سے متعین تھا) حکومت سے بغاوت کر کے دکن میں شاہی اختیارات غصب کر لئے اور ۱۳۴۷ء ۷۴۸ھ میں سلطنت بہمنیہ قائم کرلی۔ یہ دکن میں پہلی خود مختار سلطنت تھی جو تقریباً دو سو برس (۱۵۲۶ء ۹۳۲ھ) تک قائم رہی۔ اس طویل مدت کے اکثر حصے میں ملک دکن پُرامن رہا حسن بہمنی نے بادشاہ بنتے ہی اہل ملک و ہندوان دکن کو فوج و دربار میں اعلیٰ عہدے دئے۔ ایک برہمن کو وزیر مال بنایا۔ اس کے بعد بھی تمام شاہان بہمنی نے ہندوؤں کے ساتھ ہر طرح کے تعلقات تمدنی و معیشتی قائم رکھے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ حسن بہمنی نے سلطنت کی دفتری و کاروباری زبان کے لئے بجائے فارسی کے ہندی کو پسند کیا۔ اس حسن انتخاب اور سیاسی تدبر نے انتظام سلطنت کی آسانیوں کے ساتھ اردو زبان میں شعر و ادب کی بنیاد بھی ڈال دی۔

منثورات قدیمہ
۱۳۵۶ء

سلطنت بہمنی

۱۳۴۷ء ۷۴۸ھ تا ۱۵۲۶ء ۹۳۲ھ

(دکن کا سب سے پہلا اردو مصنف)
شیخ گنج العلم (وفات ۱۳۹۳ء ۷۹۵ھ)

شیخ عین الدین گنج العلم حکومت علاء الدین خلجی کے زمانے میں بمقام دہلی ۱۳۰۶ء ۷۰۶ھ پیدا ہوئے۔ آغاز شباب میں تحصیل علم کے لئے گجرات کا سفر کیا، اس عرصے میں حکومت دہلی خلجی خاندان سے تغلق خاندان میں منتقل ہو گئی ۱۳۲۵ء ۷۲۵ھ میں محمد تغلق تخت دہلی پر بیٹھا اور ۱۳۲۶ء ۷۲۶ھ میں اس نے مرکز حکومت دکن کو منتقل کر کے دیوگیر (دولت آباد) کو پایۂ تخت بنایا اور ۱۳۵۱ء ۷۵۲ھ تک دکن میں اس کی حکومت رہی۔ اسی زمانے میں شیخ گنج العلم دہلی

سے گجرات ہوتے ہوئے دولت آباد آئے۔ وہاں سے بیجاپور آکر قیام کیا اور بیجاپور ہی میں ۷۹۵ھ/۱۳۹۳ء میں وفات پائی۔ یہ شیخ صاحب کثیر التعداد فارسی کتابوں کے مصنف ہیں۔ دکنی اردو میں بھی چند مختصر رسالے مسائل شرعیہ کے متعلق تصنیف فرمائے۔ دکن میں اردو زبان کی سب سے پہلی کتابیں یہی ہیں لیکن یہ رسائل اب ناپید ہیں

اردو کی سب سے قدیم کتاب جو شائع ہوئی

معراج العاشقین مصنفہ حضرت خواجہ بندہ نواز سید محمد گیسو درازؒ سب سے قدیم کتاب ہے جو حال میں شائع ہوئی ہے۔ خواجہ گیسو دراز ۷۲۰ھ/۱۳۲۰ء میں بمقام دہلی پیدا ہوئے خواجہ نصیر الدین چراغ دہلی سے فیض باطن اور اجازت وخلافت پائی۔ فیروز شاہ بہمنی کے عہد حکومت ۸۱۵ھ/۱۴۱۲ء میں دہلی سے حسن آباد (گلبرگہ) آئے۔ احمد شاہ اول بہمنی کے زمانے میں ۸۲۵ھ/۱۴۲۲ء میں وصال فرمایا۔ عربی وفارسی کے بڑے اعلیٰ پایہ کے مصنف تھے۔ اپنے مریدوں اور عام طلبۂ علم کو درس بھی دیا کرتے تھے اور عوام کی آسانی کے لئے کبھی کبھی دکنی اردو میں بھی سمجھاتے تھے۔ آپ کے چند مقولے اور اشعار کتابوں اور بیاضوں میں پائے گئے ہیں۔ مثلاً

(۱) "بھوکوں موے سوں کچھ اپڑتا ہے، خدا کوں اپڑنے کی استعداد ہور ہے"

(۲) ادمعشوق بے مثال نور نبیؐ نہ پایا — اور نور نبی رسولؐ کا میرے جیو میں بھایا

ایسین اپیں دیکھانے کیسی آرسی لایا

(۳) گھوڑے کوں بھیتر گھوڑ ہے اس کوں نہ حکمت ہور ہے

ہر دم ذکر سوں توڑ ہے غافل نہ ہو ہشیار توں

کرد سکلا دل گیان کا انعام دے خوش دہیان کا

چارا کھلا ایمان کا رکھ باند اپنے دار توں

خوگیر شریعت نعل بند زین ہے طریقت زیر بند
حق ہے حقیقت پیش بند تنگہ معرفت اختیار توں

تب قید گھوڑا آئے گا تجھ لامکاں لے جائے گا
تب عشق جھگڑا پائے گا خدا مارلے تروار توں

شہباز حسینی کھوئے کر ہر دو جہاں دل دھوئے کر
اللہ اپے یک ہوئے کر تب پاوے گا دیدار توں

ان کے علاوہ خواجہ صاحب کے بعض رسائل دکنی اردو کے دستیاب ہوئے ہیں جن میں سے معراج العاشقین کو انجمن ترقی اردو نے شائع کر دیا ہے۔ اس کی عبارت کا نمونہ یہ ہے

"اے عزیز، اللہ بندہ پنایہاں پہچان کو جانا، نیں تو شرع جاتا ہے۔ اول اپنی پہچانت بعد از خدا کی پہچانت کرنا"

"انسان کے بوجنے کوں پانچ تن، ہر ایک تن کو پانچ دروانے ہیں ہور پانچ دربان ہیں۔ پیلا تن واجب الوجود، مقام اس کا شیطانی، نفس اس کا امارہ یعنی واجب الوجود کی آنک سوں غیر نہ دیکھنا سو۔ حرص کے کان سوں غیر نہ سننا۔ حسد تک سوں بدبوئی نہ لینا سو۔ بغض کی زبان سوں بدگوئی نکرنا سو۔ کینا کی شہوت کوں غیر جاگا خرچنا سو۔ پیر طبیب کامل ہونا تبض پہچان دوا دینا"[1]

معراج نامہ اور رسالہ سہ بارہ بھی حضرت خواجہ بندہ نواز کی تصنیف سے دریافت ہوئے ہیں ان کے نمونے یہ ہیں:۔

تحقیق خدا کے مباتے ستر ہزار پردے اوجیالے کے ہور اندھارے کے

---

[1] یہ عبارت اور اشعار مولوی عبدالحق صاحب کی کتاب سے ماخوذ ہیں۔

[2] ماخوذ از اردو شہ پارے مرتبہ ڈاکٹر محی الدین قادری۔

اگر اس میں تے یک پردہ اُٹھ جاوے تو اس کی آنچ تے میں جلوں"۔ (معراج نامہ)

سوال۔ ایمان کے جھاڑاں کیا اور ایمان کی ڈالیاں کیا اور ایمان کے پات کیا

اور ایمان کا وطن کیا اور ایمان کا بیج کیا اور ایمان کا پوست کیا اور ایمان

کا مرکیا اور ایمان کا جیو کیا۔

جواب۔ ایمان کا جیو قرآن۔ ایمان کی جڑ توبہ۔ ایمان کی ڈالیاں سو بندگی

ایمان کی پات پرہیزگاری۔ ایمان کا تخم سو علم۔ ایمان کا پوست سو شرم

ایمان کا وطن سو مومن کا دل ہے۔ (رسالہ سہ بارہ)

سلطنت عادل شاہی

۱۴۹۰ء / ۸۹۵ھ تا ۱۶۸۶ء / ۱۰۹۷ھ

بہمنی سلطنت کے چودھویں حکمراں محمود شاہ کی غفلت و کمزوری سے سلطنت کا زوال شروع ہوا۔ تو بیجاپور (جو سلطنت بہمنیہ کا ایک صوبہ تھا) کے گورنر یوسف عادل شاہ نے ۱۴۹۰ء / ۸۹۵ھ میں خود مختاری کا اعلان کر دیا اور بیجاپور میں عادل شاہی حکومت قائم کردی۔ دو سو سال تک قائم رہی آخر ۱۶۸۶ء / ۱۰۹۷ھ میں شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر نے بیجاپور کی سلطنت پر قبضہ کر لیا۔

اکثر شاہان بیجاپور خود عالم و شاعر اور قدر دان تھے۔ سلاطین بہمنی نے اردو کو دفتری زبان بنا دیا تھا۔ عہد عادل شاہی کے پہلے اور دوسرے بادشاہ نے پھر اردو کی جگہ فارسی کو رواج دیا۔ اور تقریباً پچاس سال تک دفتر پر فارسی کی حکومت رہی لیکن ابراہیم عادل شاہ اول (۱۵۳۴ء / ۹۴۱ھ تا ۱۵۵۸ء / ۹۶۵ھ) نے مصالح ملکی کے لیے اردو ہی کو موزوں سمجھا اور بجائے فارسی کے دوبارہ اردو کو رائج کر دیا۔ اس کے بعد پھر سلطنت کے

ساتھ زبان کی قسمت پلٹی یعنی ابراہیم کے جانشین علی عادل شاہ نے پھر فارسی کو ترجیح دی۔ لیکن پھر اس کے جانشین ابراہیم عادل شاہ ثانی نے اردو کو فارسی کی مسند پر بٹھادیا اس عرصہ میں اردو زبان دکن میں عام ہو گئی تھی۔ لیکن اہل تصانیف میں شعرا کی تعداد زیادہ تھی۔ تاہم مصنفین نثر بھی موجود تھے۔ مثلاً

شمس العشاق شاہ میراں جی | حضرت شاہ میراں جی شمس العشاق مکہ معظمہ میں پیدا ہوئے وہاں سے دکن آکر حضرت خواجہ گیسو دراز کے خلیفہ سے بیعت کی۔ بیجاپور میں ۹۰۲ھ ۱۴۹۶ء میں وفات پائی۔ دکن نے شاہ صاحب سے بڑا فیض پایا ہے۔ دکن کے بڑے علماء و صوفیا میں ان کا شمار ہے۔ ان کی تمام تصانیف اردو نثر یا نظم میں ہیں تصانیف نثر میں سے شرح مرغوب القلوب۔ جل ترنگ اور گل باس قلمی موجود ہیں۔ پہلے رسالہ کا نمونہ یہ ہے:۔

خدا کہیا، تحقیق مال اور بنگر[1] تمہارے دشمن ہیں۔ چھوڑیو دشمناں کوں۔
کیا غفلت ہے جو تجھے اندھلا[2] کیا موت کی یاد تھے[3] تجھے بسرا کر۔[4]

سب رس نام کا ایک رسالہ شاہ میراں جی نے ملا وجہی کی سب رس سے پہلے لکھا ہے۔ اس کا نمونہ یہ ہے:۔

"اول تجھے جو کوئی سکھلاتا ہے اسے پوچھ، توں منجیں سکلاتا سو تجھ پر کھلا ہے۔ اس کا کام اس پر نہیں کھلیا، سو تجھ پر کیا کھلے گا۔ توں کیا بوجھ کر بولیا ہے۔ بوجھ سکیگا تو ادھر ادھر کیاں چار حکایتاں۔ اس حکایتاں سو کیا حاصل؟"

شاہ برہان الدین جانم | شاہ میراں جی کے فرزند ہیں۔ اولیاء کبار میں ہیں ۹۹۰ھ ۱۵۸۲ء کے بعد وفات پائی ہے۔ نثر میں ایک رسالہ کلمۃ الحقائق ان کی تصنیف سے ہے۔ اس میں تصوف کے مسائل سوال و جواب کے طور بیان کئے ہیں۔ نمونہ یہ ہے:۔

---

[1] بنگرے = اولاد [2] اندھلا = اندھا [3] تھے = سے [4] بسرا کر = بھلا کر

"یہ تن الادھا دستا۔ ولیکن جیتا بکار، لوٹنے نہیں بلکہ ستنتر بکار روپ دستاہے۔ یک تل قرار نہیں، جیوں مرکٹ روپ [1]"

شاہ امین الدین اعلیٰ شاہ برہان الدین جانم کے فرزند جانشین ہیں۔ تاریخ وفات "ختم ولی" سے ۱۰۸۶ھ نکلتی ہے (مطابق ۱۶۷۵ء) نثر میں کئی رسالے لکھے ہیں ایک رسالہ گنج مخفی کا نمونہ یہ ہے:۔

"اللہ تعالیٰ گنج مخفی کو عیاں کرنا چاہا تو اول اس میں سوں ایک نظر نکلی، سو اس سے امین دیکھ ہوا، امین شاہد کہتے ہیں، یو دونوں ذات کے دو طور ہیں، ذات نے اپس کو دیکھا، اسے نظر کہتے ہیں۔ دیکھ کر گواہی دیا تو اسے شاہد کہتے ہیں یہ تینوں مرتبے ذات کے ہیں۔"

ان کی عبارت ان کے پدر بزرگوار اور جد امجد کی تصانیف کے مقابلے میں صاف و آسان ہے۔

سلطنت قطب شاہی

۹۱۶ھ / ۱۵۱۰ء تا ۱۰۹۸ھ / ۱۶۸۷ء

گولکنڈہ جو قطب شاہی بادشاہوں کا پایۂ تخت تھا بہمنی سلطنت ہی کا صوبہ تھا مرکزی حکومت کے ضعف و زوال کا نتیجہ تھا کہ سلطان قلی قطب الملک نے اعلان

---

[1] الادھا، علٰحدہ۔ دستا۔ نظر آنا۔ بکار۔ متحرک۔ ستنتر۔ بدلنے والا۔ روپ۔ بھیس۔ حالت۔ مرکٹ۔ بندر۔ اس عبارت کا مطلب یہ ہے "یہ جسم علٰحدہ نظر آتا ہے لیکن زندہ متحرک ہے۔ لوٹتا نہیں بلکہ بدلتا رہتا ہے۔ متحرک حالت میں نظر آتا ہے۔ ذرا سی دیر کو قرار نہیں۔ گویا بندر ہے۔"

خود مختاری کرکے گول کنڈہ کو دارالسلطنت بنایا اور قطب شاہی سلطنت کی بنیاد ڈال دی۔ ڈیڑھ سو برس سے زیادہ قائم رہنے کے بعد اس کی تباہی بھی شہنشاہ اورنگ زیب کے ہاتھوں عمل میں آئی۔

شاہان گولکنڈہ بھی اردو کے بڑے قدردان تھے تین بادشاہ اردو کے شاعر اور صاحب دیوان تھے (ان کا ذکر حصہ نظم میں آئے گا) اس دور میں نثر کی کتابیں بھی لکھی گئیں اور گزشتہ دونوں عہدوں سے بہتر لکھی گئیں۔

شاہ میرانجی خدانما سید میراں حسینی نام ہے۔ حیدرآباد وطن تھا، بیجاپور جاکر شاہ امین الدین اعلی سے بیعت کی بادشاہ گولکنڈہ عبداللہ شاہ (۱۰۳۵ھ/۱۶۲۵ء تا ۱۰۸۳ھ/۱۶۷۲ء) کے زمانے میں تھے گراہم بیلی نے لکھا ہے کہ بادشاہ کے ملازم بھی رہے ہیں۔ انہوں نے "تمہیدات ہمین القضات" مصنفہ عین القضات ہمدانی کا ترجمہ اردو میں کیا ہے جس کا نام شرح تمہید ہمدانی ہے۔ اس ترجمہ کا ایک نسخہ ۱۰۱۲ھ/۱۶۰۳ء میں لکھا گیا ہے۔ مولوی عبدالحق صاحب کے پاس جو نسخہ ہے اس پر سنہ کتابت سنہ ۱۰۶۷ھ درج ہے۔ گراہم بیلی نے سید صاحب کا سال وفات سنہ ۱۶۵۹ء (مطابق سنہ ۱۰۷۰ھ) لکھا ہے اور مولوی عبدالحق صاحب نے سنہ ۱۰۷۴ھ (مطابق سنہ ۱۶۶۳ء) ہر حال یہ کتاب دکن کی قدیم تصانیف اردو میں ضخیم ہونے کے سبب سے خاص اہمیت رکھتی ہے۔ اس کی عبارت کا نمونہ یہ ہے:۔

"اے عزیزان، اے بات نہیں سنیاں۔ بادشاہ گھوڑا مستعد کئے باج[1] نہیں سوار ہوتے۔ ہور گھوڑے میں کچھ[2] کھوڑ[3] اچھے تو بھی نہیں قبول کرتے یعنی پیر کے عشق میں پختا ہوتے باج خدا کے عشق میں نا آسک[4] سی ہو[5] دیکھ تا سک سی۔ اگر عشق خالق نداری بارے عشق مخلوقے ہیاکن۔ اس کا معنا خدا کی پہچان کا بل نہیں تو اول اپنی پہچانت کر۔"

---

[1] بغیر۔ [2] کچھ [3] عیب [4] ہو [5] نہیں آسکتا ہے [6] اور

مولانا عبداللہ | عبداللہ قطب شاہ کے زمانے میں تھے ۱۰۳۲ھ/۱۶۲۲ء میں احکام الصلوٰۃ کے نام سے ایک رسالہ دکنی اردو میں لکھا ہے جس میں فقہ حنفی کے مطابق احکام شریعت بیان کئے ہیں۔ نمونہ یہ ہے :-

"روح قبض ہوا اسی وقت اس کیاں انکھیاں موچنا ہور پاؤں دراز کرنا ہور ہاتھ دراز کرنا دولوں پہلو کی طرف ولیکن سینے پر نا رکھنا۔ ہور اسکی ٹھڈی ہور سر کوں ملا کر بندنا۔ یو سب سنت ہے۔ ہور مرنے تے اول اسکے سر کوں قطب کی طرف سلانا ہور موے بعد از غسل دینا اسی طریق سوں ::"

ملا وجہی | عہد قطب شاہی کا نہایت ممتاز شاعر و مصنف تھا۔ اس نے چار بادشاہوں ابراہیم قلی قطب شاہ، محمد قلی قطب شاہ، محمد قطب شاہ اور عبداللہ قطب شاہ کا زمانہ دیکھا۔ عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں ۱۰۴۵ھ/۱۶۳۵ء میں ایک کتاب سب رس نثر میں لکھی یہ کتاب چند سال ہوئے مولوی عبدالحق صاحب نے اپنے مقدمہ اور فرہنگ لغات قدیم کے ساتھ شائع کردی ہے۔ اصل کتاب ٹائپ کے تین سو صفحوں پر چھپی ہے۔ اس لحاظ سے یہ کتاب دکن کی قدیم اردو کتابوں میں سب سے بڑی ہے۔ سب رس کا دوسرا نام "قصۂ حسن و دل" ہے۔ فرضی قصے کی صورت میں عشق و عقل اور حسن و دل کے معرکے بیان کئے ہیں۔ افراد قصہ کے نام مہر، وفا، ناز، غمزہ ناموس، زہد، توبہ وغیرہ رکھے ہیں اور اس پیرایہ میں ان جذبات و واردات کے حقائق بیان کئے ہیں۔

اگرچہ وجہی نے اس کتاب میں کہیں اس امر کا اظہار نہیں کیا لیکن واقعہ یہ ہے کہ اصل قصہ اس کے دماغ کا نتیجہ نہیں ہے۔ بلکہ سب سے پہلے محمد یحییٰ ابن سیبک فتاحی نیشاپوری (متوفی ۸۵۲ھ/۱۴۴۸ء) نے فارسی نظم میں لکھا تھا۔ اس کا نام دستور عشاق ہے۔ فتاحی نے اسی قصے کو مختصر طور پر فارسی نثر میں بھی لکھا تھا

اور اس کا نام حسن ؑ و دل رکھا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ وجہی کو مثنوی دستور عشاق دستیاب نہیں ہوئی بلکہ قصہ نثر "حسن و دل" مل گیا۔ اس میں ادنیٰ سا تصرف کر کے وجہی نے اردو میں لکھ دیا۔ اس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ حسن و دل کی فارسی نثر مقفیٰ و مسجع ہے وجہی نے بھی سب رس میں ایسی ہی اردو نثر لکھی ہے۔ نمونہ یہ ہے

(آغاز کتاب) "تمام مصحف کا معنی الحمد اللہ میں ہے مستقیم، ہور تمام الحمد للہ کا معنی بسم اللہ میں ہے قدیم، ہور تمام بسم اللہ کا معنی بسم اللہ کے ایک نقطے میں رکھیا ہے کریم۔ سچ دیکھ خاطر لیا آنال، حدیث بھی یوں آئی ہے کہ العلم نقطة و کثرھا الجھال، یعنی علم ایک نقطہ ہے جاہلاں اسے بڑھائے جہالت کو اس حد لگن لیائے[1]"

(آغاز داستان) نقل۔ ایک شہر تھا اس شہر کا ناؤں سیستان۔ اس سیستان کے بادشاہ کے ناوں عقل، دین و دنیا کا تمام اس تے چلتا۔ اس کے حکم باج ذرا کیں نیں ہلتا۔ اسکے فرمائے پر جیتو چلے، ہر دو جہان میں ہوئے بھلے۔ دنیا میں خوب کہوائے، چار لوگوں میں عزت پائے"

(ختم داستان) "الحمد للہ دونوکوں ہوا وصال، اپنا دل خوش تو سب عالم خوش حال دل کوں بلیا جیو کا جانی، یو وصال مبارک یو خوشی ارزانی۔

---

[1] فتاحی کا یہ قصہ نثر بہت مشہور و مقبول ہوا۔ چار ترکی مصنفوں نے اسکو اپنی زبان میں لکھا لامعی اور آہی نے نثر میں۔ اور والی و صدقی نے نظم میں۔ دو انگریزوں اور ایک جرمن ڈاکٹر نے اپنی اپنی زبانوں میں ترجمہ کیا اور اصل کے ساتھ چھاپا۔ ہندوستان میں صلاح الدین صرفی نے اور داؤد ایلچی نے ۱۰۵۴ھ/۱۶۴۴ء میں اسکو فارسی مثنوی میں لکھا۔ پھر شہنشاہ عالمگیر کے زمانے میں ملا جامی بیخود (متوفی ۱۰۸۶ھ/۱۶۷۵ء) نے نظم کیا اور خواجہ محمد بیدل نے ۱۰۹۵ھ/۱۶۸۳ء میں پرتکلف فارسی نثر میں لکھا۔ یہ فتاحی کی تصنیف کی قدر شناسی تھی۔ وجہی کی سب رس کو بھی دکن کے دو شاعروں ذوقی اور مجرمی نے اردو نظم میں لکھا ہے۔

ایتی جفا دل پڑی، تو میسر ہوئی یو وصال کی گھڑی۔ مرداں نے مشقت
سوں امید کے دروازے کھولے ہیں من طلب شیئاً وجد وجد کر
بولے ہیں۔ یعنی جو کوئی جس کام جد دھریا، ان نے وو کام کریا۔"

میراں یعقوب | ایک ضخیم کتاب "شمائل الاتقیا" مصنفہ شیخ برہان الدین اورنگ آبادی کو میراں یعقوب نے ۱۰۶۷ھ کے بعد اردو میں ترجمہ کیا۔ اس کتاب میں تصوف کے مسائل ہیں۔ مضامین کتاب کو چار قسموں میں بیان کیا ہے ان اقسام کی شروع میں تفصیل کر دی ہے، اس طرح

پہلا قسم۔ طریقت کے لوگوں کے افعال ہور سالکاں کے مقاماں ہور مریداں ہور طالباں کے طلباں ہور اسکے عجائبات ہور باریکیاں کی شرح میں بیان کیا گیا ہے۔

سبب ترجمہ۔ اپنی حیات کے وقت منجے[۱] اشارت کئے تھی جوں شمائل الاتقیا کتاب کوں ہندی زبان میں لیا دے تا کہ ہر کسی کو سمجھا جاوے اس وقت منجے بیا نہیں تا کہ یک ہزار ستر پر آٹھوں سال کوں رحلت کئے پر انکے بھلنجے عارف حق رسیدے عارفوں کے نور دیدے مصطفےٰ کے کلیجے ہور مرتضٰی کے نیں شاہ میراں ابن سید حسین سلمہ اللہ تعالیٰ کی خلافت کے زمانے میں کتاب لکھنے کا شروع کیا۔ جی کچھ مشکل آتا تھا سو پیر کی مدد سوں آسان لکھا جاتا تھا۔

ذکر معجزہ و کرامت ہور[۲] ولیاں کوں کرامت ہے کہ اینو[۳] پورا علم دھرتے ہیں ولے مغلوب ہور بیخود ہیں۔ جیکچہ[۴] اینو تھے[۵] ظاہر ہوتا ہے سوائے

---

[۱] منجے = مجھے [۲] ہور = اور [۳] اینو = یہ لوگ [۴] جیکچہ = جو کچھ [۵] تھے = سے

کرامت کہتے ہیں۔ اما معونت اوسےؔ ہے جو بعضے دیوانے جو پورا علم معرفت نہیں دھرتے ہیں انوؔ تھے کچھ خرق عادت یعنی کدھنؔ نہیں ہوتا ہے سو چیز ظاہر ہوتا ہے۔ ہور سندراج اسدراج اسے کہتے ہیں جو بعضے بے ایمان لوگوں کچھ سحر ہور منتر ہور اس وزانؔ کے چیز ظاہر کرتے ہیں۔ؔ

دکن بعہد مغلیہ

۱۶۸۷ء تا ۱۷۳۰ء
۱۰۹۸ھ تا ۱۱۴۲ھ

شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر نے ۱۶۸۶ء میں بیجاپور پر اور ۱۶۸۷ء میں گولکنڈہ پر قبضہ کر کے تمام دکن میں مغلیہ سلطنت قائم کر دی۔ اس زمانے میں بھی دکن میں اردو کی ترقی اور تصانیف نثر و نظم کا سلسلہ جاری رہا لیکن ہر عہد میں نثر کی تصانیف نظم کے مقابلے میں بہت کم ہوتی ہیں۔ اس عہد کا بھی یہی حال ہے تاہم بعض کتابوں کے نام اور بعض کے نمونے ملتے ہیں۔

۱۔ سید شاہ محمد قادری اورنگ زیب کے زمانے میں تھے۔ رائچور کے خاندان "نور دریا" کے بزرگ تھے اور شیخ امین الدین اعلیٰ کے خلیفہ۔ چند رسائل تصوف اردو نثر میں لکھے ہیں۔

۲۔ شاہ ولی اللہ قادری خلف شاہ حبیب اللہ قادری نے ۱۱۱۵ھ/۱۷۰۴ء میں معرفت السلوک (مصنفہ شیخ محمود) کا فارسی سے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ شاہ ولی اللہ کا ۱۱۵۷ھ/۱۷۴۴ء میں انتقال ہوا۔ اس کتاب کا موضوع تصوف ہے۔ نمونہ یہ ہے:۔

لہ ادبے = دہ ہے۔ لہ انو = ان۔ سے کدھن = کبھی۔ سے وزان = وضع

شہ ماخوذ از دکن میں اردو۔

"بوتاب ہے کمترین مرید ہور واپس ترین شاگرد جاروب کش درگاہ عالی ہور بارگاہ
ابالی عاجز فقیر الحقیر محمد ولی اللہ حکم کیے منج کوں حضرت شہباز ولایت معدن ہدایت
آفتاب عالمتاب بزرگ اولیا کے بڑے اتقیا کے، ہور صدر نشین محمد مصطفیٰ کے،
صاحب شریعت ہور طریقت کے، دربار حقیقت اور معرفت کے وارث
محمد رسول اللہ حضرت شاہ حبیب اللہ قادری باقی رکھے اللہ انو کوں ۔"
"من عرف نفسہ فقد عرف ربہ کے بیان میں بیان کروں۔ ہور اس کی
شرطاں کی شرح کوں عیاں کروں۔ کیا واسطا کہ سر من عرف نفسہ فقد عرف
ربہ کے نکتیں کے تحقیق کرنا بہوت مشکل ہے۔ کیا واسطا کہ یو کلام صاحب دل کا ہے
نہ ہر ایک دل کا ہے۔ ہور عارفاں نے اس بات میں بہوت کتاباں کئی ہیں۔"

۳۔ سید شاہ میر بھی اسی زمانے کے بزرگ ہیں۔ قصبہ راجوتی وطن تھا۔ اردو نثر میں
ایک رسالہ "اسرار التوحید" لکھا ہے۔ ایک اور رسالہ حقائق بھی شاہ میر کی تصنیف ہے
ہے جسکا ایک نسخہ ۱۱۹۳ھ کا لکھا ہوا نصیر الدین صاحب ہاشمی نے دیکھا ہے۔ اسکا نمونہ یہ ہے۔
"قل انما انا بشر مثلکم جو خدائے تعالیٰ فرمایا یعنی میں معبود نیں[۱] بلکہ تمہارے سا عبد
ہوں خدا کی نسبت۔ ہور[۲] خدا نیں بلکہ بندہ ہوں خدا کا رسول ہوں تمہیں مج سوں[۳]
ہے۔ ہور میں خدا سوں ہوں۔ یعنی تمیں میرے نور ہیں، ہور میں خدا کا نور ہوں۔ اپس[۴]
سوں مجکوں جدا مت جانو۔ ہور مجھے اپس میں دیکھو۔ ہور مجھو کہ خدائے تعالیٰ منت
رکھیا ہے[۵] تمنا[۶] پر اس بات کا کہ لقد منّ اللہ۔"

۴۔ مترجم طوطی نامہ قادری۔ اس شخص کا نام معلوم نہ ہوسکا۔ طوطی نامہ ان
کتابوں میں ہے جو الف لیلہ اور کلیلہ دمنہ کی طرح نہایت مقبول ہوئیں اور بہت سی

---

[۱] نیں = نہیں [۲] ہور = اور [۳] تہیں مج سوں ہے = تم مجھ سے ہو [۴] اپس = آپ خود
[۵] رکھیا = رکھا۔ رکھی [۶] تمنا = تم۔

زبانوں میں انکے ترجمے اور خلاصے لکھے گئے۔ کلیلہ دمنہ کی طرح طوطی نامہ بھی دراصل سنسکرت میں لکھا گیا تھا جس میں طوطے کی زبانی ستر کہانیاں کہی گئی تھیں۔ مولانا ضیاالدین نخشبی بدایونی (متوفی ۷۵۱ھ/۱۳۵۰ء) نے اُن ستر کہانیوں میں سے باون کہانیوں کا انتخاب کر کے ۷۳۰ھ/۱۳۳۰ء میں فارسی میں لکھا اور طوطی نامہ نام رکھا۔[1] لیکن زبان مشکل تھی۔ عام طور پر اس سے لطف اندوز ہونا دشوار تھا۔ اس لئے ملا سید محمد قادری نے گیارھویں صدی ہجری میں اُن ۵۲ کہانیوں میں سے ۳۵ کہانیوں کو عمدہ بامحاورہ فارسی میں لکھا اور طوطی نامہ ہی نام رکھا۔ ہمارے زیر نظر "محمد قادری" کے اسی طوطی نامہ کا اردو ترجمہ ہے جو ۱۱۴۲ھ/۱۷۲۹ء میں لکھا گیا ہے اور جس کا مترجم اب تک پردۂ خفا میں ہے۔ اس کی عبارت کا نمونہ یہ ہے:-

پیچھے تیس طرح طرح صفت و ثنا پیدا کرنے والے زمین و آسمان کی کیفیت[2]

---

[1] نخشبی کے طوطی نامہ کو یہ قبول عام حاصل ہوا کہ فارسی میں ابوالفضل (عہد شہنشاہ اکبر) نے خلاصہ لکھا پھر سید محمد قادری نے خلاصہ کیا۔ ترکی میں عبداللہ صابری نے ترجمہ کیا۔ دکنی اردو میں غواصی نے ۱۰۴۹ھ/۱۶۳۹ء میں اس کو نظم میں لکھا پھر ابن نشاطی نے ۱۰۷۶ھ/۱۶۶۵ء میں نظم کیا۔ انگریزی میں جیرانس نے ترجمہ کیا مطبوعہ سنہ ۱۷۵۲ء۔ ملا محمد قادری کے فارسی طوطی نامہ کا ایک ترجمہ اردو میں سنہ ۱۷۲۹ء میں ہوا۔ دوسرا ترجمہ اردو حیدر بخش حیدری نے سنہ ۱۸۰۱ء میں کیا اور اس کا نام "طوطا کہانی" رکھا۔ انگریزی میں گلیڈون نے ترجمہ کیا۔ جو فارسی کے ساتھ سنہ ۱۸۰۰ء میں کلکتہ میں چھپا۔ جرمنی زبان میں سنہ ۱۸۲۲ء میں ترجمہ ہوا۔ ہندی میں حیدر بخش کے اردو ترجمہ کا ترجمہ سنہ ۱۸۹۶ء میں ہوا۔

[2] یہ عبارت نہایت عجیب اور دلچسپ ہے جس نے لوگوں کو دھوکا دے رکھا ہے کہ محمد قادری کو اس کا مترجم قرار دیں یا کسی اور کو۔ مولانا احسن مارہروی بالکل درست استدلال کرتے ہیں کہ اول تو پرانے طریقۂ بیان میں اپنے نام کے ساتھ مترجم و مؤلف انکسار آمیز الفاظ ضرور لکھتے تھے۔ دوم یہ کہ اپنے لئے تعظیمی ضمائر جمع کا استعمال نہ ہوتا تھا۔ یہ دونوں پابندیاں اس (باقی صفحہ آئندہ)

حقیقت یوں ہے کہ داستان قصہ ہا و حکایات حضرت نخشبی رحمۃ اللہ علیہ کوں
بیچ طوطی نامے کے ساتھ عبارت سخت و دقیق کے لکھے ہیں اس کے تئیں مفصل و
بیان وار واسطے معلوم ہونے تمام لوگوں کوں محمد قادری نیک کرے اللہ تعالےٰ
مرتبہ اُنو کا بیچ عبارت سلیس اور آسان کے کہ مل ہوئی اور بہ عبارت خطاں کے
ہوے در روزمرہ جواب و سوال کہ دولت منداں کے تئیں لائق ہوے لکھے ہیں"

۵۔ مترجم طوطی نامۂ ابوالفضل۔ مترجم کا نام اور ترجمہ کا سنہ معلوم نہیں نخشبی
کے طوطی نامہ کا خلاصہ ابوالفضل نے بھی اکبر بادشاہ کے حکم سے کیا تھا۔ اس کا خوشخط
قلمی نسخہ برٹش میوزیم میں موجود ہے۔ اور اس کے بین السطور میں اردو ترجمہ لکھا ہوا ہے

(بقیہ صفحہ گذشتہ) ترجمے میں نہیں ہیں"۔ اور اس بنا پر فیصلہ کرتے ہیں کہ "یہ ترجمہ محمد قادری کا نہیں ہے"
تاہم مولانا اس عبارت کے اس طرح واقع ہونے کے متعلق کوئی قیاس قائم نہیں کرتے اور اس کا
مصنف محمد قادری ہی کو مان لیتے ہیں۔ اس عبارت کے مفہوم سے یہ خیال ہوتا ہے کہ طوطی نامے کے
مترجم نے (وہ جو کوئی ہو) یہ عبارت بطور دیباچہ کے اپنی طرف سے لکھی ہے، اسی لئے مصنف
کا نام تعظیم سے لیا ہے: "محمد قادری نیک کرے اللہ تعالیٰ مرتبہ اُنو کا" لیکن جب عبارت کے الفاظ
پر غور کیا جاتا ہے تو وہ فارسی کا لفظی ترجمہ معلوم ہوتے ہیں۔

پچھلے سین طرح طرح صفت وثنا پیدا کرنے والے زمین و آسمان کے کیفیت و حقیقت یوں ہے
بعد از گوناگوں صفت وثنائے خالق زمیں و آسمان کیفیت و حقیقت آں است

اور وہ قیاس باطل ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ اگر لکھنے والا اپنی طرف سے لکھتا تو ایسی عبارت نہ لکھتا۔
اٹھارھویں صدی میں زبان بہت کچھ صاف اور باقاعدہ ہو گئی تھی۔ ترجمہ کی یہ حالت البتہ اسکے
بعد تک رہی ہے۔ اس لئے یہ عبارت ضرور ترجمہ ہے۔ اب ان مشکلات کا حل یہ سمجھ میں آتا ہے
کہ ترجمہ کرتے کرتے جب نام پر پہونچا تو اس کا جی نہ چاہا کہ محمد قادری نے جس طرح اپنا نام لکھا
تھا اس کا بجنسہ ترجمہ کر دیتا اس لئے تعظیمی طریقہ سے نام لکھا۔ نہ یہ کتاب ایسی تھی، نہ یہ مقام
ایسا کہ اپنی طرف سے کوئی تصرف جائز نہ ہو۔

لیکن ترجمہ پوری کتاب کا نہیں ہے۔ اگر مترجم ترجمہ کو ختم کر دیتا تو آخر میں اپنا نام اور سن ضرور لکھتا۔

اب ہم ان معلومات سے محروم ہیں۔ لیکن طرز عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی تقریباً اسی زمانے کا ترجمہ ہے جس کا محمد قادری کے طوطی نامہ کا ترجمہ ہے۔ ڈاکٹر محی الدین قادری اور مولوی نصیر الدین ہاشمی دونوں نے اس کا قلمی نسخہ لندن میں دیکھا ہے۔ ہاشمی صاحب نے اپنی تالیف (یورپ میں دکھنی مخطوطات) میں ابتدائی چند فقرے ابوالفضل اور مترجم اردو کے درج کئے ہیں:۔

اردو	فارسی
پچھے میں تعریف صاحب زمانہ کے اور زمین کے یعنی خدائے کی تعریف کے بعد ازاں پچھے میں تعریف صاحب جان اور تن پیدا کرنے ہارے کے وہ صاحب کہ طوطیان باغ قابلیت کتیں یعنی منشیاں کتیں میٹھا س باتوں کی بخشیا یعنی میٹھے باتاں منشیاں کو خدا نے سکایا۔ اور بلبلان چمن کامل پتے کتیں یعنی شاعراں کتیں عاشق باغ قدرت اپنے کا کیا یعنی اپنی قدرت دکھا کر عاشق کیا۔	بعد سپاس خداوند زمان و زمین و ستایش داور جان و تن آفریں کہ طوطیان باغ قابلیت را شیریں گفتار کرامت فرمودہ و بلبلان چمن کاملیت را عاشق گلشن قدرت خویش گردانیدہ

اس سے آگے یہ مضمون آتا ہے:۔

چلنے ہارے برے راہ بندگی کو یعنی بندگی رکھنے ہارے کو۔ وہ کون' ابوالفضل بیٹا شیخ مبارک کا اسکے تیں پاک حکم جاری ہونے کے پایا یعنی بادشاہ حکم فرمایا کہ یہ کتاب کتیں یعنی طوطی نامہ کو سات عبارت تازی کے سات روشن تھوڑی

عبارت کے نقش ترتیب کا دیوے۔ یعنی مختصر عبارت سیں بنا دے۔

ڈاکٹر محی الدین قادری نے اپنی تالیف (اردو شہ پارے) میں اس طوطی نامہ کی طویل عبارتیں نقل کی ہیں۔ ایک کا مختصر نمونہ یہ ہے :-

بڑائی اور سنار اور درزی اور پرہیزگار مسافری کو نکلے۔ اور ایک اتبیج جنگل دہشت بھرے گئے کہ پتا باگاں کا ڈر سین اس جنگل کے پانی ہوتا تھا یکایک اپنا اس جاگا میں پڑا یعنی ہوا۔ وہ چار و یار مصلحت کرے کہ ہم ہر ایک موافق باری کے یک ایک پہر نگہبانی کرے۔ اول بڑائی جاگتا تھا۔ لکڑی یک بیج نہایت بہتری صورت کے چھلیا یعنی اچھی صورت بنایا۔ اور پھر دوگڑی سنار اس صورت کے تیں زیور سیں سنوارا۔ تیسری پہری میں درزی اسکے تیں سات لباس کے زینت وار کیا۔ چوتھی پہری میں زاہد موں عاجزی کا طرف قبلہ کے لایا۔ دعا کیا اور جان بیچ بدن اس کے پھوکے گیا ہوا۔[1]

دکن میں عہد مغلیہ کے بعد کا دور

۱۔ محمد باقر آگاہ۔ ویلور (صوبہ مدراس) کے رہنے والے تھے۔ ۱۲۲۰ھ / ۱۸۰۵ء میں انتقال کیا۔ انہوں نے ۱۱۸۵ھ / ۱۷۷۱ء میں اور اس کے بعد متعدد کتابیں عقائد و فقہ کے متعلق

فرہنگ[1] پچھے	پیچھے	جاگا	جگہ
سیں	سے	پڑیا	پڑا
کرنے ہارے	کرنے والے	چھلیا	چھیلا
کتیں	کو	موں	مُنہ
بڑائی	بڑھئی	پھوکے گیا	پھونکے گیا
باگاں	باگ (شیر) کی جمع		

اردو میں لکھیں۔ یہ زمانہ دکن میں مغلیہ تسلط کے بعد کا ہے۔ اس زمانہ میں شمالی ہند (دہلی، آگرہ، وغیرہ) میں اردو شاعری اور تصانیف نظم کا سلسلہ جاری ہے لیکن اردو نثر کی کوئی مستقل تصنیف نہیں پائی جاتی فضلی کی دہ مجلس (جس کا ذکر آگے آتا ہے) کا شمالی ہند کی ملکیت ہونا مشتبہ ہے۔ اور مرزا سودا دہلوی کا دیباچہ دیوان متفرقات میں شامل ہے۔ مولانا شاہ رفیع الدین صاحب اور مولانا شاہ عبدالقادر صاحب کے تراجم قرآن مجید بعد کی چیزیں ہیں۔

باقر آگاہ کی مندرجہ ذیل عبارت انکے منظوم رسائل کے دیباچہ کا اقتباس ہے

"بعض علمائے متاخرین خلاصہ عربی کتابوں کا نکال کر فارسی میں لکھے ہیں تا وہ لوگ جو عربی پڑھ نہیں سکتے ان سے فائدہ پاویں لیکن اکثر عورتاں اور تمام اُمیاں فارسی سے بھی آشنا نہیں ہیں۔ اسلئے یہ عاصی مطلب قسم اول کا بہت اختصار کے ساتھ لیکر دکھنی رسالوں میں بولا ہے۔ اور ہر رسالہ کے وزن علیحدہ ہونے سے خواہش و آرزو پڑھنے والوں کی زیادہ ہووے۔ چھ رسالہ اول کے مع رسالہ عقائد سنہ ایک ہزار ایک سو اور اسّی اور پانچ میں اور ایک ہزار و یک سو اور اسّی اور چھ میں (۱۱۸۵ھ و ۱۱۸۶ھ) بنے ہیں۔ اور ان سب رسالوں میں شاعری نیں کیا ہوں بلکہ صاف اور سادہ کہا ہوں اور اردو کے بھاکے میں نہیں کہا۔ کیا واسطے کہ رہنے والے یہاں کے اس بھاکے سے واقف نہیں ہیں اے بھائی یہ رسالے دکھنی زبان میں ہیں"

اس کے بعد دہلی وغیرہ میں تصانیف نثر کا عام رواج شروع ہو جاتا ہے اور تھوڑے عرصہ میں اس کثرت سے اور اس قدر اعلیٰ تصانیف پیدا ہو جاتی ہیں کہ اس کے ساتھ کی دکن کی تصانیف کا پلہ جھک جاتا ہے۔ تاہم دکن میں بھی اردو نثر کی تصانیف جاری رہتی ہیں اور ایسی ہیں کہ تاریخ نثر میں نظر انداز کرنے کے قابل نہیں ہیں۔

سلہ ماخوذ از دکن میں اردو

۲- ارکاٹ کی اسلامی سلطنت کے زمانے میں شرف الملک مولانا محمد غوث ؒ نے جو دربار ارکاٹ کے مدار المہام اور اپنے زمانہ کے بڑے عالم تھے کیدانی فقہ حنفی کا اردو میں ترجمہ کیا۔ ان کا انتقال ۱۸۲۳ء ۱۲۳۸ھ میں ہوا۔ ان کی تحریر[1] کا نمونہ یہ ہے:-

"بوج کے تحقیق بندہ آزمائی جاتی ہے درمیان اس کے کہ بندگی کرے خدا کی اور ثواب پاوے اور درمیان اسکے کہ گناہ کرے خدا کی اور عذاب کیا جاوے۔ اور آزمائش تعلق رکھتی ہے سات شرعی چیزوں کے کہ کرے اوسے وسات خلاف شرع چیزوں کے کہ چھوڑ دیوے اسے۔ اس واسطے ضرور ہوا بیان کرنا شرعی چیزوں کا و خلاف شرع چیزوں کا۔"

اس عبارت کو دیکھ کر اس پر غور کرنا چاہیئے کہ شرف الملک باقر آگاہ کے ہم عصر ہیں لیکن انکی نثر آگاہ کی نثر سے زیادہ بے محاورہ ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ باقر آگاہ کی اپنی اصلی عبارت ہے اس لئے اس زمانہ کے محاورہ و روزمرہ کے مطابق ہے۔ لیکن شرف الملک کی عبارت ترجمہ ہے۔ لفظی ترجمہ کا رواج اس کے بعد تک ہندو دکن دونوں میں رہا ہے۔

۳- قاضی بدر الدولہ خلف شرف الملک ۱۷۹۳ء ۱۲۰۸ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۸۶۳ء ۱۲۸۰ھ میں انتقال کیا۔ دربار ارکاٹ میں قاضی تھے۔ کئی درجن کتابوں کے مصنف ہیں جن میں ۱۳ کتابیں اردو کی ہیں۔ فقہ شافعی، سیرت نبی کریم، سیرت صدیق اکبر، سیرت شیخ عبدالقادر جیلانی، ترجمہ وحواشی حدیث، تفسیر قرآن مجید وغیرہ بڑی ضخیم اور قابل قدر کتابیں لکھی ہیں۔[2] فوائد بدریہ (سیرت النبیؐ) کے دیباچہ کا اقتباس یہ ہے:-

"دیکھا کہ بازار علم کا بہت کاسد ہو گیا ہے اور علم کے جاننے والے دنیا سے گذر گئے۔ اب کوئی کتاب زبان عربی یا فارسی میں تصنیف کئے تو کچھ فائدہ اس پر مترتب نہیں۔ جن کو ان زبانوں کی معرفت حاصل ہے انکے لئے بہت سے کتب موجود ہیں۔

---

[1] ماخوذ از (دکن میں اردو) [2] از دکن میں اردو

اور کسی کو خواہشمند بھی نہیں پایا۔ تب زبان ہندی میں یہ کتاب لکھنا شروع کیا
تا عوام مومنوں کو اس سے فائدہ حاصل ہووے اور اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ و
آلہ وسلم کے احوال سے واقف ہو کہ انکی پیروی خوبی کے ساتھ کریں۔

فیض الکریم (تفسیر قرآن مجید) کا نمونہ یہ ہے:-

"واعتصموا بحبل اللہ جمیعا۔ اور مضبوط پکڑو واللہ کی رسّی سب ملکر اللہ کی
رسّی سے مراد اللہ کا دین ہے یعنی دین اسلام اختیار کرو۔ اسکو رسّی سے تعبیر کیا
کیونکہ باریک تنگ راہ میں گزرنا چاہے اور پیر پھسلنے کا اندیشہ ہووے تو رسّی
جسکی دونوں طرف راہ کے دونو جانب سے باندھے ہوں پکڑلے تو اسکو خوف
نہیں رہتا۔ حق کی راہ بھی بہت باریک تنگ ہے اکثر لوگ ان کے پیر اس پر
لغزش پاتے ہیں جس نے دین اسلام مضبوط پکڑا تو بڑے خوف سے نجات پایا"

دہلی کے علماء کرام شاہ رفیع الدین صاحب اور شاہ عبدالقادر صاحب کے ترجمہ و تفسیر
قرآن بدرالدول کی فیض الکریم سے پہلے کے ہیں۔ انکے نمونے آگے آتے ہیں اسلئے کچھ تعجب
نہیں کہ ان کی عبارتیں فیض الکریم کی عبارت سے زیادہ خلاف محاورہ و قدامت آمیز ہیں
اس زمانے میں اور اس کے بعد دکن کا اردو لٹریچر دہلی و شمالی ہند کے
مقابلے میں زیادہ ممتاز نہیں ہے۔

نثر کا دوسرا دور

شمالی ہند میں

۱۷۳۲ء / ۱۱۴۵ھ تا ۱۷۹۹ء / ۱۲۱۵ھ

شمالی ہند یعنی دہلی اور موجودہ صوبہ یوپی میں تصانیف نثر کا اصلی اور مستقل دور محمد شاہ بادشاہ دہلی (زمانۂ حکومت ۱۷۱۹ء / ۱۱۳۱ھ تا ۱۷۴۸ء / ۱۱۶۱ھ) کے عہد سے شروع ہوتا ہے۔ اس زمانے سے قبل جو رفتار تھی اس کا خاکہ پہلے دکھایا جا چکا ہے اس دوسرے دور کی رفتار یہ تھی۔

فضل علی فضلی | فضلی تخلص کے ایک شخص کی اردو تصنیف دہ مجلس یا کربل کتھا (کربلا کی کہانی) کا نام اور پتہ ملتا ہے۔ جو ملا حسین واعظ کاشفی کی فارسی کتاب (روضۃ الشہدا) کا ترجمہ ہے۔ تذکرہ نویسوں نے اس کے نام و حالات میں بڑا اختلاف کیا ہے۔ مولانا احسن مارہروی نے اپنی بے نظیر تالیف (نمونہ منثورات) میں (جو اپنی قسم کی اردو میں پہلی کتاب ہے) فضلی کے متعلق تحقیقات کا خلاصہ اور نتیجہ بیان کر دیا ہے[1]۔

فضل علی فضلی محمد شاہی عہد میں تھا۔ اس نے یہ کتاب ۱۷۳۱ء / ۱۱۴۵ھ میں لکھی اور

---

[1] ہم کو مولانا سے یہ اختلاف ہے کہ جب مسٹر نیلن یا مولوی کریم الدین اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ "اس کتاب کو تمام میں نے دیکھا وہ میرے پاس موجود تھی" اور انہوں نے فضل علی نام لکھا ہے تو مولانا نے فضل اللہ نام کو کیوں ترجیح دی۔ دوسرے یہ کہ جب اس فضلی کا شیعہ ہونا ظاہر ہے تو مولانا نے اس کو حنفی و نقشبندی کیوں تسلیم کر لیا۔ تذکرہ مجذوب الزمن میں جن بزرگ شاہ فضل اللہ فضلی اورنگ آبادی حنفی نقشبندی کا ذکر ہے۔ وہ یقیناً یہ فضلی نہیں، کوئی اور ہیں۔

پھر ۱۲۴۷ھ/۱۸۳۱ء میں اس کی اصلاح و نظر ثانی کی۔ اس کتاب کا صرف دیباچہ تذکرۂ شعرائے ہند (مولفہ و مترجمہ مسٹر فیلن و مولوی کریم الدین) میں منقول ہے۔ اور کافی طویل، دو نہایت دلچسپ ہے۔ مختلف مقامات سے اس کا اقتباس بطور نمونہ درج کیا جاتا ہے۔

"لیکن معنی اسکے عورتوں کی سمجھ میں نہ آتے تھے اور فقرات پُر سوز و گداز اس کتاب مذکورہ کے تسبب لغات فارسی انکو نہ رُلاتے تھے۔ اکثر اوقات بعد کتاب خوانی سب یہ مذکور کرتیں کہ صد حیف و صد ہزار افسوس جو ہم کم نصیب عبارت فارسی نہیں سمجھتے اور رونے کے ثواب سے بے نصیب رہتے ہیں۔ ایسا کوئی صاحب شعور ہووے کہ کسی طرح من وعن ہمیں سمجھاوے اور ہم سی بے سمجھوں کو سمجھا کر رُلاوے۔ مجھ احقر انفقر کی خاطر میں گزرا کہ اگر ترجمہ اس کتاب کا برنگینی عبارات اور حسن استعارات ہندی قریب الفہم عامہ مومنین و مومنات کیجئے تو بموجب اس کلام بانظام کے من بکیٰ علی الحسین او ابکیٰ وجبت لہ الجنۃ بڑا ثواب لیجے۔..."

"لہذا پیش ازیں کوئی اس صفت کا نہیں ہوا مخترع۔ اور اب تک ترجمہ فارسی بزبان ہندی نثر نہیں ہوا مستمع۔ اس اندیشۂ عمیق میں غوطہ کھایا، اور دریائے تامل و تدبیر میں سرگشتہ ہوا لیکن راہ مقصود کی نہ پائی۔ ناگاہ نسیم عنایت الٰہی گلشن افکار پُر اہتزاز میں آ، یہ بات آئینۂ خاطر میں منھ دکھلائی کہ یہ فکر عظیم بغیر امداد ارواح مقدس حسنین علیہما السلام حسب خواہش محبوں کے سرانجام نہ پاوے۔..."

یہ رسالہ مسعود اور بارہ مجلس اور ایک خاتمہ کے ہے۔ اسکی تصنیف کی تاریخ یوں لکھی ہے

یہ جو نسخہ ہوا ہے اب تصنیف	بہر کسب ثواب و فیض بشر
چاہا تاریخ اسکی بولے سروش	"شیعوں کی نجات کا مظہر" ۱۲۱۵ھ

اور اب نظر ثانی کرا کمیت و کیفیت مضامین ہندی اصطلاحات و استعارات رنگین اصلاح دیا۔ اس تاریخ نے صفحہ دل پر جلوہ دیا۔

ہر کس از من کند بہ نیکی یاد　　　　بجہاں نامش ہم بہ نیکی باد

اس دیباچہ کی تمام عبارت میں صرف دو فقرے قابل غور ہیں ایک فقرہ اوپر منقول دخط کشیدہ ہے۔ دوسرا فقرہ جو نقل نہیں کیا گیا یہ ہے، "تب آپ زبان اعجاز بیان سے فرمائے۔ یہ دونوں محاورے خاص دکن کے ہیں۔ اور اُس زمانے سے دو سو برس بعد آج بھی دکن میں اسی طرح بولتے ہیں۔ دہلی و شمالی ہند میں یہ انداز بیان تو جیب تھا نہ اب ہے۔ یہ محاورے خصوصاً دوسرا محاورہ (آپ فرمائے) اس طرح کا ہے کہ جس کی بول چال میں شامل ہو اس سے چھوٹ نہیں سکتا جیسا کہ حیدر آباد وغیرہ مقامات دکن کے تعلیم یافتہ اصحاب بھی آج تک بولتے ہیں۔ اور جس شخص کا یہ روزمرّہ نہو اس کی زبان و قلم سے کبھی نہ نکلے گا۔ اس سے قریب زمانہ کے مصنفین دہلی حضرت شاہ عبدالقادر صاحب رحمتہ اللہ علیہ وغیرہ کی نثر میں یہ انداز بیان نہیں پایا جاتا اور دکن کی تصانیف میں اس کے بہت بعد تک موجود ہے۔ دکن میں مولوی قادر علیؒ نے ایک کتاب (مصباح الصلوٰۃ) کے نام سے ۱۲۳۲ھ / ۱۸۱۷ء میں ترجمہ کی ہے۔ اس میں لکھتے ہیں:-

"صاحب مفتاح الصلوٰۃ معتبر کتابوں سے لکھا ہے جو شخص کہ فرائض اور واجبات نماز کی نہیں جانتا ہے نماز اسکی روا نہیں۔ شیخ ابو حفص کبیر فرمائے کافر ہووے۔ نعوذ باللہ منہا"

اس بنا پر فضلی کا دکنی الاصل ہونا لازم ہے لیکن اسکے ساتھ ہی یہ بھی ضرور ہے کہ فضلی دکن میں نہیں رہے۔ شمالی ہند میں رہ کر انہوں نے علم حاصل کیا۔ انشاپردازی سیکھی اور تصنیف و تالیف کی۔ انکے دیباچہ کی تمام نثر میں اور کہیں دکنی الفاظ، روزمرہ اور اسلوب بیان نہیں پایا جاتا جبکہ دکن میں انیسویں صدی عیسوی کے وسط تک الفاظ و زبان کی قدامت موجود ہے۔ چنانچہ محمد عثمان مبینؔ کی کتاب (لازم الاسلام) مرتبہ ۱۲۶۱ھ / ۱۸۴۵ء کا ایک فقرہ یہ ہے:-

---

لـہ دکن میں اردو

چیں جان تو پیدا کرنے ہارا سب عالم کا شاید کوئی دوسرا ہے۔"

اور اسی زمانہ کے مصنف مولانا غوثی اپنی تفسیر غوثی میں لکھتے ہیں:۔

"اور بعضے کافراں بولتے ہیں کہ حشر برحق ہے کہ ہمارے بتاں حشر کے روز ہم کو چھوڑائیں گے۔"

اس کے علاوہ فضلی کے دکن میں نہ ہونے کے متعلق مولانا احسن مارہروی کا یہ استدلال بھی بالکل درست ہے کہ فضلی نے اپنے دیباچہ میں لکھا ہے (لہذا پیش ازیں کوئی اس صنعت کا نہیں ہوا مخترع، اور اب تک ترجمہ فارسی بزبان ہندی نثر نہیں ہوا مستمع) حالانکہ دکن میں فضلی کے زمانہ میں اور اس سے پہلے بے شمار ترجمے ہوئے ہیں۔ فضلی دکن میں ہوتے تو ان ترجموں کا ان کو ضرور علم ہوتا اور ایسا نہ لکھتے۔

فضلی کی "کربل کتھا" کا ایک قلمی نسخہ مفتیان گوپامئو کے قدیم کتب خانے میں تھا۔ کتاب نقل در نقل تھی اور ناتمام تھی۔ یہ پتہ نہیں چلتا کہ کس نے کب کہاں سے نقل کی۔ اگرچہ کسی بے نام ونشان نقل پر اعتماد کرنا تصنیف وتحقیق کی ذمہ داری کے خلاف ہے لیکن اسقدر محقق ہے کہ یہ کتاب واعظ کاشفی ہی کی "روضۃ الشہدا" کا اردو ترجمہ ہے۔ اور اس کا کوئی دوسرا قدیم اردو ترجمہ، بجز "کربل کتھا" کے معلوم و مشہور نہیں۔ اسلئے ہم اس امر میں کچھ مضائقہ نہیں سمجھتے کہ اس نسخے کو فضلی کی کربل کتھا مان لیں۔ اور اس کا اقتباس داستان تاریخ اردو میں شامل کردیں اس کتاب کا کوئی ٹکڑا، بجز دیباچۂ کتاب کے، کسی تاریخ وتذکرہ میں نہیں ملتا۔ تو کم ازکم یہی فائدہ ہوگا کہ اگر آئندہ کبھی فضلی کی کتاب دستیاب ہوجائے تو اس انتخاب سے مقابلہ کرکے فیصلہ کیا جاسکتا ہے۔ اس اقتباس کی عبارت، زبان، اسلوب میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جو اس کو فضلی کا ترجمہ سمجھنے سے مانع ہو۔ نمونہ یہ ہے۔

---

[1] دکن میں اردو۔

*جو کہ حضرت امام حسن نے ازبسکہ بیوفائی کوفیوں کی دیکھی بہت ناراض
وناخوش ہوئے۔ لاچار حاکم شام سے صلح کی، اور کئی آدمی ساتھ لیکر مدینہ میں
جانبے۔ پھر بعد مدت کئی برس کے حاکم شام نے ازراہ دشمنی کے مصلحت کی
کہ حضرت امام حسن کو قتل کیا چاہئے۔ تو یہ مطلب حاصل ہو۔ چنانچہ کچھ آدمی
بصرہ میں حضرت امام حسن کے رہتے تھے۔ ازبسکہ آدمیوں کو شب خون مارا
اور جو باقی رہے سب بھاگ کر حضرت امام حسن پاس آئے۔ تب حضرت امام حسن
عبداللہ بن فضل کو ساتھ لیکر حاکم شام پاس پھر آئے جو کہ باتیں کہنا تھیں شام
کے حاکم سے کہہ کر پھر مدینہ کو آتے...... راہ میں ایک شہر تھا، موصل اُس
شہر کے حاکم کا نام تھا کہ اس سے اور حاکم شام سے برادری تھی کہ حضرت امام حسن
اس کے گھر اترے۔ پہلے اُترنے سے حضرت کے، حاکم شام نے موصل کو بہت سا
روپیہ اور مال فریب سے بھیجا تھا۔ اور شیشا زہر ہلاہل کا اس قاتل کے پاس
بھیجدیا تھا کہ وقت فرصت کے حضرت امام حسن کو یہ زہر کھلادینا کہ اس بدبخت نے
لالچ سے روپے کے ظاہر میں حضرت کی بہت سی خدمت کی اور باطن میں تین
دفعہ اس زہر کو کھانے میں حضرت کے دیا۔ تینوں بار حضرت اس بیماری زہر سے
نکج گئے۔ تب اس لعین نے شام کے حاکم کو خط لکھا کہ ہم نے تین بار زہر دیا لیکن
حضرت امام حسن کو کچھ اثر نہ کیا۔ تب اسنے پھر زہر ہلاہل بھیجا اور لکھا کہ ابکے حضرت
امام حسن کو کھلاؤ۔ قاصد حاکم شام کا شیشا اور خط لیکر چلا۔ اور کسی شخص نے
جنگل میں اس قاصد کو مار ڈالا کہ ایک نوکروں سے حضرت امام حسن کے اسی
جاگہ آپہنچا۔ یہ حال دیکھ کر خط اور شیشا زہر ہلاہل کا جناب امام حسن پاس
لے آیا۔ آپ نے خط کو پڑھ کر نیچے جانماز کے رکھ دیا۔ اور کسی سے کچھ کہا
نہیں۔ سعد موصلی کہ چچا مختار دوست حیدر کرار کے تھے، آہستہ ہاتھ

بڑھا کر جانماز کے تلے سے خط کو لے کر بڑھا اور کانپنے وقدم جناب امام حسن کا چوما اور عرض کیا اے فرزند رسولؐ وائے نور چشم مظلوم بتولؓ ہم کو حکم دو اس بے ایمان کے کہ جس کے گھر میں آپ اُترے ہیں اس سے احوال کہیں۔ حضرت امام نے فرمایا۔ ہمارا کام نہیں ہے کہ کسی کو بے حرمت کریں اور نہیں چاہتے ہیں کہ ہماری طرف سے اسکو شرمندگی حاصل ہووے۔ حکم خدا کا جو کہ جاری ہوا ہے وہ ہوگا، سعد موصلی نے بغیر حکم حضرت امام کے اس کو بلا کر کہا کہ اے ملعون تیرے حق میں حضرت پیغمبرؐ نے کیا ظلم کیا ہے۔ جواب دیا کہ کچھ ظلم نہ پہنچا ہے پھر پوچھا کہ حضرت امیر المومنین نے تجھ پر کچھ ظلم کیا ہے؟ کہا کہ خدا کی قسم ہے مدت تک حضرت علیؓ کے نوکر رہے تھے۔ ہم پر ہمیشہ شفقت و کرم کرتے تھے۔ تب سعد موصلی نے کہا کہ پس کس واسطے فرزندوں کے ساتھ مرتضیٰ علی کے دشمنی کرتے ہو۔ خط اور شیشا آگے اس کے رکھ دیا اور کہا۔ لعنت خدا کی تجھ پر ہو جیو! اس نے انکار کیا کہ ہم کو اس خط و زہر سے کچھ خبر نہیں ہے۔ سعد موصلی نے اپنے نوکروں کو حکم دیا کہ خوب سب اس کو مارو۔ چنانچہ اسی وقت مر گیا۔

یہ عبارت "کربل کتھا" کی مجلس چہارم سے کی گئی ہے۔

مرزا رفیع سودا دہلوی | مرزا سودا دہلوی ۱۷۱۳ء/۱۱۲۵ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۷۸۱ء/۱۱۹۵ھ میں وفات پائی۔ انہوں نے اپنے دیوان مرثیہ کا دیباچہ اردو میں لکھا ہے۔ پیچدار مقفیٰ عبارت ہے۔ نمونہ یہ ہے:۔

انسان کہ جس فن سے آپ کو کما ینبغی ماہر نہ کرے، چاہئے کہ اس میں اپنی حد سے سخن باہر نہ کرے گفتگوئے جاہل پہلوئے عالم مورد انفعال۔ بلکہ خموشی ہے اس کی برابر صد فضل و کمال ؎

بات گر آوے تو چپ رہ کہ گماں کے نزدیک
سو طرح کا ہے سخن پردۂ خاموشی میں

اگر ہاکا، جس فن کا، آگاہ سے اس فن کے، بولی بولے۔ گویا ہر دو لب اس کے
دروازۂ رسوائی کے پاٹ ہیں کہ عمداً اپنے منہ پر کھولے۔ بیت

طرفہ میوہ ہے یہ سخن اے دوست مغز شیریں و تلخ جس کا پوست

مخفی نہ رہے کہ عرصہ چالیس برس کا بسر ہوا ہے کہ گوہر سخن، عاصی زیب گوش
اہل ہنر ہوا ہے۔ اس مدت میں مشکل گوئی دقیقہ سنجی کا نام رہا ہے۔ اور سدا
مرغ معنی عرش آشیاں گرفتار دام رہا ہے۔

قافیہ پیمائی اس زمانے کا انداز تھا۔ سودا کی خصوصیت نہیں؛ سو برس بعد تک
مقفی نثریں لکھی گئی ہیں۔ فورٹ ولیم کالج کے سلیس و با محاورہ مصنفین (میرامن وغیرہ) نے
بھی قافیہ آرائی کی ہے، اور لکھنؤ کے اہل تصنیف (مرزا سرور وغیرہ) نے بھی۔ یہاں تک کہ
مرزا غالب دہلوی نے اپنے رقعات کی سہل ممتنع نثر میں بھی جابجا قافیہ آرائی کی ہے اور
منشی امیر مینائی نے اپنی تصنیف انتخاب یادگار (مصنفہ ۱۲۹۰ھ / ۱۸۷۳ء) بھی اسی طرز میں
لکھی ہے۔ اسکے برخلاف دکن کی تصانیف میں اس زمانہ میں اور اس سے پہلے اور بعد مقفی
نثریں شاذ و نادر ہیں۔ طرز نگارش کے اس اختلاف کا سبب اصل میں کتابوں کے
مضامین و مقاصد کی نوعیت ہے۔ دکن میں سب رس اور طوطی نامہ وغیرہ چند
داستانوں کے علاوہ سب کتابیں فقہ، سیرت، تفسیر، اخلاق، تصوف پر لکھی گئی ہیں۔
علوم و فنون کے بیان میں قافیہ پیمائی اور خیال آرائی کا کیا موقع تھا۔ وجہی کی ضخیم
داستان سب رس تمام و کمال مقفی ہے۔ فقہ و تصوف کی کوئی کتاب ایسی نہیں ہے
اسی طرح شمالی ہند میں بھی تفریح طبع کی کتابیں مقفی لکھی گئی ہیں۔ علوم و فنون
کی تصانیف سادہ ہیں۔

مولانا شاہ رفیع الدین رح (ترجمۂ قرآن)	سودا کے دیباچہ تک شمالی ہند کی کوئی مستقل و مکمل تصنیف نثر معلوم و متعارف نہیں ہے۔ اس حساب سے سب سے پہلی

نثر کی کتاب مولانا شاہ رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا اردو ترجمۂ قرآن ہے۔ شاہ
صاحب حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے دوسرے صاحبزادہ
تھے۔ ان سے بڑے شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ تھے اور ان سے چھوٹے دو بھائی
تھے۔ شاہ عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور شاہ عبدالغنی صاحب رحمۃ اللہ علیہ
شاہ ولی اللہ صاحب ان خاص الخاص علماء میں تھے جو صدیوں بعد کہیں پیدا ہوتے
ہیں۔ انہوں نے اپنی تصنیف حجۃ اللہ البالغہ میں احکام و اعمال شریعت کے جو اسرار
و معارف بیان کئے ہیں وہ دنیائے اسلام میں ان سے پہلے کسی نے نہیں بیان کئے
تھے۔ اس اعتبار سے ان کا مرتبہ امام رازی اور امام غزالی سے بڑھا ہوا ہے۔ شاہ
صاحب کے سب صاحبزادے خصوصاً پہلے تین صاحبزادے بھی ایسے ہی عالم
فاضل اور ولی کامل تھے۔ شاہ ولی اللہ صاحب نے علاوہ اور تصانیف کے
قرآن مجید کا فارسی میں ترجمہ سنہ ۱۱۵۰ھ/۱۷۳۷ء میں کیا تھا۔ ان کے دوسرے صاحبزادہ شاہ
رفیع الدین صاحب نے اردو کا ترجمہ سنہ ۱۲۰۰ھ/۱۷۸۶ء کے قریب کیا۔ ترجمہ اس قدر
لفظی اور بے محاورہ اور دشوار فہم ہے کہ ہمارے زمانے میں کیا اس زمانے میں بھی
بول چال کی زبان ایسی نہ تھی۔ لیکن اصل یہ ہے کہ عربی زبان کی وسعت و بلاغت اور
قرآن مجید کی معجز نما عبارت ترجمہ کی گرفت میں نہیں آسکتی۔ اور شاہ صاحب جیسے
محتاط بزرگ کو آیت آیت اور لفظ لفظ پر یہ خیال تھا کہ ہماری طرف سے کوئی
ایسی کمی و بیشی نہ ہو جائے جس سے مطلب کچھ سے کچھ ہو جائے۔ اس لئے انکے
نزدیک بہترین صورت یہ تھی کہ ہر لفظ اور ہر حرف کا ترجمہ عربی کی ترتیب کے
مطابق اسی موقع پر لکھ دیا جائے۔ خواہ اردو عبارت محاورہ کے خلاف ہو جائے
ہم دو مقام سے مختصر نمونے درج کرتے ہیں ۔

"اے رب ہمارے مت پکڑ ہم کو اگر بھول گئے ہم یا خطا کی ہم نے اے رب ہمارے

اور مت رکھ اوپر ہمارے بوجھ جیسا رکھا تو نے اس کو اوپر اُن لوگوں کے کہ پہلے ہم سے تھے اے رب ہمارے اور مت اُٹھوا ہم سے وہ چیز کہ نہیں طاقت واسطے ہمارے ساتھ اسکے اور معاف کر ہم سے اور بخش ہم کو اور رحم کر ہم کو۔ تو ہے دوستدار ہمارا پس مدد دے ہم کو اوپر قوم کافروں کے۔" (سورۂ بقرہ کی آخری آیت دعا)

"اے جماعت جنوں کی اور آدمیوں کی کیا نہ آئے تھے تمہارے پاس پیغمبر تم میں سے بیان کرتے تھے اوپر تمہارے نشانیاں میری، اور ڈراتے تھے تم کو ملاقات اس دن تمہارے کی سے۔ کہا انہوں نے گواہی دی ہم نے اوپر جانوں اپنی کے، اور فریب دیا انکو زندگانی دنیا کی نے۔ اور گواہی دی انہوں نے اوپر جانوں اپنی کے یہ کہ وہ تھے کافر۔" (پارہ ۸ ولو اننا سورہ انعام رکوع ۱۶)

شاہ عبدالقادر صاحب ترجمۂ قرآن	اُسی زمانہ میں دو تین سال بعد ۱۲۰۵ھ ۱۷۹۰ء میں شاہ عبدالقادر صاحب نے ترجمہ کیا۔ یہ ترجمہ بھی سلیس و با محاورہ نہیں ہے۔ تاہم شاہ صاحب

نے لفظ لفظ اور حرف حرف کا ترجمہ کرنے کے مقابلے میں ادائے مفہوم اور وضاحت مطلب کو زیادہ پیشِ نظر رکھا ہے۔ اس لئے ان کا ترجمہ پہلے ترجمہ کی نسبت مختصر اور صاف ہو گیا ہے۔ اسی لئے نہایت مقبول ہوا اور کثرت سے چھاپا اور پڑھا گیا۔ ہم انکے ترجمہ میں سے بھی سورۂ انعام کی اُنہی آیتوں کا ترجمہ درج کرتے ہیں۔

"اے جماعت جنوں اور انسانوں کی کیا تم کو نہیں پہنچے تھے رسول تمہارے اندر کے سناتے تم کو میرے ظلم اور ڈراتے اس دن کے سامنے آنے سے۔ بولے ہم نے مانے اپنے گناہ۔ اور انکو بہکایا دنیا کی زندگانی نے اور قائل ہوئے اپنے گناہ پر کہ وہ تھے منکر"

دیکھو ترجمہ پہلے ترجمہ سے بقدر ایک سطر کے مختصر ہے اور زیادہ صاف و سلیس ہے۔

لیکن دونوں ترجموں کے الفاظ خط کشیدہ کو دیکھو۔ پہلا ترجمہ دوسرے سے زیادہ صاف ہے حالانکہ عربی الفاظ کا لفظی ترجمہ ہے۔ نہیں پہنچتے تھے کی ضرورت نہ تھی۔ نہ آئے تھے۔ بالکل صاف تھا۔ منکم کا ترجمہ (تمہارے اندر کے) اس قدر واضح نہیں ہے جتنا (تم میں سے) لیکن اس سے آگے پہلے ترجمہ میں (ملاقات اس دن تمھارے کی سے) بالکل لفظی ترجمہ ہے اور بول چال کے خلاف۔ اسکے مقابلہ میں شاہ عبدالقادر صاحب کا ترجمہ (اس دن کے سامنے آنے سے) ایسا صحیح، با محاورہ اور خوبصورت ہے کہ مولوی نذیر احمد صاحب بھی اس سے بہتر اسلوب پیدا نہ کر سکے۔ صرف (دن) کی جگہ (روز) اور سامنے) کی جگہ (پیش) رکھدیا۔ یعنی (اس روز کے پیش آنے سے)

شاہ عبدالقادر صاحب نے اپنے ترجمہ پر تفسیری حاشیے بھی لکھے اور اس کا نام موضح القرآن رکھا۔ یہ ان کی اپنی عبارت ہے۔ اگرچہ الفاظ کی بے ترتیبی اس میں بھی ہے جیسا کہ مولوی نذیر احمد صاحب نے دیباچہ کی عبارت سے ثابت کیا ہے مثلاً ان فقروں میں:۔

"الٰہی شکر تیرے احسان کا ادا کروں زبان سے کہ ہماری زبان کو گویائی اپنے نام کر اور دل کو روشنی دی اپنے کلام کر"

لیکن اکثر جگہ اس سے زیادہ صاف بھی ہے۔ مثلاً پارہ ۲۴ سورہ حم سجدہ کے دوسرے رکوع کی تفسیر میں فرماتے ہیں:۔

دو دن میں زمین بنائی اور دو دن میں پہاڑ اور درخت سبزہ جو خلق کی خوراک ہے پھر آسمان سا بنایا ایک تھا دھواں سا۔ اس کو بانٹ کر سات کئے اور ہر ایک کا کارخانہ جدا ٹھہرایا۔ پھر آسمان زمین کو ملایا خوشی سے آؤ یا زور سے یعنی ارادہ کیا کہ ان کے ملاپ سے دنیا بسائے اپنی طبیعت سے [illegible] تو اور زور سے ملیں تو تو وہ دونوں آملے طبیعت سے آسمان کی شعاع سے گرمی پڑے تو بادیں اٹھیں، ان سے گرد اور بھاپ اوپر چڑھے

پانی ہو کر برسے، چار عنصر زمین پر جمع ہوں، مخلوقات پیدا ہوں۔ اور پہلے زمین میں رکھیں تھیں خوراکیں یعنی اس میں قابلیت تھی ان چیزوں کے نکلنے کی۔ اور ہر آسمان کا حکم جدا۔ یہ رب کو معلوم ہے کہ وہاں کون خلق بستے ہیں، ان کا کیا اسلوب ہے۔ اتنی زمین میں ہزاراں ہزار کارخانے ہیں، اس قدر آسمان کب خالی پڑے ہوں گے۔"

شاہ عبدالقادر صاحب کا انتقال ۱۲۳۰ھ/۱۸۱۵ء میں ہوا۔ شاہ رفیع الدین صاحب کا ۱۲۳۳ھ/۱۸۱۸ء میں۔ اور شاہ عبدالعزیز صاحب کا ۱۲۳۹ھ/۱۸۲۴ء میں، یعنی ترتیب ولادت کے برعکس۔

میر عطا حسین تحسین (نو طرز مرصع)

ان مقدس ترجموں کے بعد اس زمانے کی مستقل تصنیف نو طرز مرصع ہے، جس میں میر محمد عطا حسین خاں تحسین ساکن اٹاوہ نے قصہ چہار درویش کو رنگین و دقیق اردو میں لکھا ہے۔ مشہور ہے کہ چار درویش کا قصہ حضرت امیر خسرو نے اپنے پیر و مرشد حضرت خواجہ نظام الدین دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں سنانے کے لئے لکھا تھا، لیکن اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ امیر صاحب کی فہرست تصانیف میں اس کا ذکر نہیں ہے۔ میر تحسین محمد باقر خاں شوق کے بیٹے تھے۔ جنرل اسمتھ سالار فوج انگریزی کے میر منشی ہو کر ان کے ساتھ کلکتہ گئے۔ جب جنرل صاحب ولایت چلے گئے تو تحسین پٹنہ آ گئے اور پھر وہاں سے فیض آباد آ کر نواب شجاع الدولہ کے دربار سے متعلق ہو گئے۔ نو طرز مرصع کی تصنیف جنرل اسمتھ کی ملازمت کے زمانے میں شروع کر دی تھی لیکن شجاع الدولہ کے دربار میں آ کر ۱۲۱۲ھ/۱۷۹۷ء میں ختم کی۔ تحسین خوشنویس بھی تھے اور مرصع رقم کے لقب سے مشہور تھے۔ اس لئے کتاب کے نام میں مرصع کا لفظ طرز عبارت کے علاوہ مصنف کے نام کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے۔ تحسین نے فارسی میں بھی انشائے تحسین، تواریخ فارسی اور ضوابط انگریزی لکھی ہیں۔ نو طرز مرصع میں عربی و فارسی الفاظ و تراکیب اور تشبیہات و استعارات کی اتنی کثرت ہے کہ بعض فقرے شمار

فہم ہونے کے علاوہ مذاق سلیم کے لئے نہایت ثقیل و مکروہ ہیں۔ مثلاً یہ عبارت۔

"بعد ایک لمحے کے وہ ماہ شب چہاردہم رونق افزا حدیقۂ فردوس نما کے ہو کر اور مسند زربفت نقردی کے جلوہ آرا ہوئی واہ جی واہ جس وقت وہ قمر طلعت داخل باغچہ نمونہ جنت کی ہوئی عطر گلاب رخسارۂ زلیخائے شب مہتاب کا تقویت بخش دماغ تماشائیوں کا ہو کے زینت آرا بزم کامرانی کا ہوا، یوسف عکس بیاض نگینہ ہائے الماس انجم کا اوپر خاتم مینا رنگ سبزہ زمین خلد آئین کے زیب افزا دیدۂ نورانی کا ہوا۔"

آخری دو فقرے فارسی کی مشہور تصنیف شبنم شاداب کو یاد دلاتے ہیں۔ لیکن نوطرز مرصع تمام کی تمام ایسے ہی فقروں سے بھری ہوتی نہیں ہے۔ اس سے کچھ سہل اور بہتر طرز بھی پایا جاتا ہے مثلاً

"بہ سبب ماندگی و کسل اعضا کمین داران خواب کے اوپر قافلہ بیداری کے تاخت لائے اور متاع گراں بہاے ہوشیاری کو لوٹ لے گئے۔ بعد ایک لمحے کے آواز گریہ و زاری کی بیچ گوش میرے کے مسمع ہوئی، آنکھ کھول کر کیا دیکھتا ہوں کہ تن تنہا پلنگ پر لیٹا ہوں و صاحب خانہ سے مکان خالی ہے، آگے دالان کے ایک پردہ پڑا ہے۔"

بعض مقامات اس سے بھی صاف و سلیس ہیں، مثلاً

"اور معتمدان ہمراہ کے تئیں بیچ خدمت گزاری اس نازنیں کے تعین کر کے آپ واسطے تحقیقات مکان جراح کے حویلی سے باہر آیا۔ چنانچہ زبانی ایک شخص کے معلوم ہوا کہ عیسیٰ نامی جراح بکمال کسب طبابت و جراحی کے کہ اگر مردے کو تئیں چاہے تو بمرہمات فضل الٰہی سے زندہ کرے، فلانے محلے میں رہتا ہے۔ فقیر اس گلبانگ بشارت افزا سے بسان گل کے شگفتہ و خنداں ہو کر پوچھتے پوچھتے اوپر دروازے جراح کے کہ مثال دل بیداردلوں کے کشادہ تھا جا پہنچا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ وہ متبرک ذات

خضر صفات یہ دہلیز گھر کے رونق افروز ہے ؎

بہر حال ہر جگہ دو چار فقروں کے بعد عربی و فارسی ترکیبیں اور صنعتیں ضرور آجاتی ہیں محاوروں کے علاوہ کہیں کہیں پرانا غلط املا بھی پایا جاتا ہے مثلاً مرد کے تئیں کی جگہ مردے کو تئیں

یوروپین مصنفین اُردُو

اہل یورپ کے اردو سیکھنے اور اس زبان میں تصنیف و تالیف کرنے کے حالات سے پہلے ان کے ہندوستان میں آنے اور حکومت کرنے کے اسباب و واقعات کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔

قدیم اہل یورپ اور ہندوستان یورپ اور ہندوستان کے درمیان تجارتی تعلقات بہت قدیم زمانے سے قائم تھے۔ ۳۲۷ سال قبل مسیح سکندر اعظم نے ہندوستان پر حملہ کیا لیکن یہاں اپنی حکومت قائم نہ کرسکا۔ صرف کبھی کبھی تجارت کا سلسلہ جاری رہا۔ یہ تجارتی آمد و رفت بحر احمر کے راستے سے ہوتی تھی۔ ساتویں صدی عیسوی میں عرب سے اسلام کا آغاز ہوا اور مسلمانوں نے پہلی ہی صدی میں مصر کو فتح کرلیا۔ اس وقت سے بحر احمر کا راستہ یورپ والوں کیلئے بند ہوگیا۔ اور پندرھویں صدی عیسوی کے آخر تک اہل یورپ ہندوستان میں نہ آسکے۔ بلکہ اس عرصے میں مسلمانوں کے ہندوستان پر حملے ہوتے رہے اور سلطنتیں قائم ہوتی رہیں۔

اہل یورپ کی آمد (پرتگالی) ۱۴۹۸ء / ۹۰۳ھ میں اسپین کے ایک شخص کولمبس نے امریکہ کا ملک دریافت کیا۔ اور اسی سال جب دہلی میں سکندر لودی کی حکومت تھی، پرتگال کا ایک سیاح واسکوڈی گاما ایک نئے اور لمبے راستے سے ہندوستان کے مغربی ساحل پر کالی کٹ میں پہنچا یہ شخص تمام افریقہ کا چکر لگاتا ہوا راس امید (کیپ گڈ ہوپ) کی طرف سے ہوکر موجودہ شہر میسور سے تقریباً ایک سو میل دور

ساحل پر لنگر انداز ہوا تھا۔

پرتگالیوں نے ہندوستان میں تجارتی حقوق حاصل کرنے کے لئے بندر کے ساحلوں پر قلعے بنائے، اور چند سال میں ۱۵۱۵ء تک مشرقی ساحل کے تمام بندرگاہوں پر قبضہ کرلیا لیکن ۱۵۶۵ء سے ان کی تجارت میں زوال شروع ہوا۔ یورپ میں ہالینڈ اور انگلستان ان لوگوں کے دشمن ہوگئے اور اہل پرتگال کی تجارت کو نقصان پہنچانے اور اپنی تجارت قائم کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ ۱۵۸۰ء میں اسپین نے پرتگال کو زیر کرکے اپنا ماتحت بنالیا۔ اس کے بعد تھوڑے عرصہ میں بجز دو تین مقامات کے سب مقبوضات اہل پرتگال کے ہاتھ سے نکل گئے۔

انگریز ہندوستان میں

اسپین کا زور توڑنے کیلئے انگریزوں نے یورپ میں اسپین والوں سے جنگ چھیڑ دی۔ ۱۵۸۸ء میں جنگ عظیم برپا ہوئی جس میں اہل اسپین کو شکست اٹھانی پڑی۔ لڑائی سے نمٹ کر انگلستان کے تاجروں نے ۱۶۰۰ء میں ملکہ الزبیتھ سے ہندوستان میں تجارت کرنے کا فرمان حاصل کیا اور ایسٹ انڈیا کمپنی قائم کردی۔

اہل ہالینڈ ہندوستان میں

لیکن یورپ میں انگلستان کا سب سے بڑا مدِمقابل ہالینڈ تھا اس نے بھی ۱۶۰۱ء میں تجارتی کمپنی بنائی اور ڈچ قوم (ہالینڈ کے لوگ) نے بھی انگریزوں کے پہلو بہ پہلو تجارت کرنی شروع کردی۔ اس زمانے میں ہالینڈ والے یورپ کے سب ممالک کے مقابلے میں فن جہاز رانی و جہاز سازی میں بڑے ماہر تھے؛ اس لئے انگریزوں کے لئے ان کا مغلوب کرنا آسان نہ تھا۔ ان لوگوں نے چند سال میں اکثر جزیروں سے اہل پرتگال کو نکال کر مصالحہ کی تجارت پر قبضہ کرلیا لیکن ہالینڈ والوں کی زیادہ توجہ جزائر کے قبضہ کی جانب اور مصالحہ کی تجارت کی طرف رہی۔ اور مشرقی حصوں میں اپنی نوآبادیاں قائم کرتے رہے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی

ان کے برخلاف انگریزوں نے ہندوستان کی طرف توجہ کی؛ اور اندرون

ملک میں تجارت اور اقتدار پیدا کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ ۱۶۰۸ء میں کپتان ہاکنس بندرگاہ سورت میں آیا۔ اور شہنشاہ جہانگیر کے دربار میں حاضر ہو کر سورت میں تجارتی کوٹھی قائم کرنے کی اجازت حاصل کی۔ پھر ۱۶۱۵ء میں سر ٹامس رو بادشاہ انگلستان کے سفیر کی حیثیت سے دربار جہانگیری میں حاضر ہوا اور تجارتی کوٹھی بنانے کی اجازت لے لی۔ سورت کے علاوہ ایک کوٹھی مچھلی پٹن (موسولی پٹم) میں مشرقی ساحل پر ۱۶۳۳ء میں قائم کی۔ پھر ۱۶۴۰ء میں مدراس آباد کر کے وہاں قلعہ سینٹ جارج تعمیر کیا۔ انگلستان کے بادشاہ چارلس اول کے پھانسی پانے کے بعد اس کے جانشین چارلس دوم نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو نئے فرمان شاہی کے ذریعہ سے اجازت دیدی کہ کمپنی اپنا سکہ جاری کرے۔ حفاظت کے لئے قلعے بنائے، اور غیر عیسائی مذہب والوں سے حسب ضرورت جنگ و صلح جو چاہے کرے۔ ۱۶۶۱ء میں چارلس دوم کی شادی پرتگال کی شہزادی سے ہوئی اور اس کے جہیز میں بمبئی (جو اس وقت گاؤں یا قصبہ سے زیادہ حیثیت نہ رکھتا تھا) انگلستان کو ملا۔ بادشاہ نے ۱۶۶۸ء میں بمبئی کمپنی کو دیدیا۔ اس عرصہ میں نئے فرمان شاہی کے ذریعہ سے ایسٹ انڈیا کمپنی نے مشرقی ساحل پر بالاسور کی کوٹھی اور ہگلی کی نوآبادی قائم کرلی۔ پٹنہ، قاسم بازار، اور وزیگاپٹم میں بھی تجارتی کوٹھیاں بنالیں۔

انگریزوں کے حکم رانی کے منصوبے

شہنشاہ اورنگ زیب کے آخری زمانے میں مغلیہ سلطنت کمزور ہوگئی اور مرہٹوں کا زور بڑھ گیا اسی زمانہ میں ۱۶۸۶ء میں جوشیا چائلڈ سورت کی کوٹھی کا پریسیڈنٹ مقرر ہو کر آیا۔ اس نے ہندوستان کی سیاسی بے چینی صوبجاتی شورش اور مرکزی سلطنت کی کمزوری کا اندازہ کر کے طے کیا کہ اب وقت آگیا ہے کہ کمپنی مغلوں اور مرہٹوں پر قابو پالے اور اپنی حکومت قائم کرے۔ چنانچہ جاب چارنک نے بنگال میں ہگلی کے قریب بغیر شاہی اجازت کے کوٹھی تعمیر کرنے کا

ارادہ کیا۔ بنگال کے صوبہ دار شایستہ خاں نے مزاحمت کی۔ انگریز لڑنے پر آمادہ ہو گئے۔
اورنگ زیب کو اس گستاخی کا علم ہوا۔ انہوں نے کمپنی پر حملہ کرنے کا فرمان صادر کر دیا۔
چنانچہ شایستہ خاں نے انگریزوں سے وزیگاپٹم، مچھلی پٹن، قاسم بازار اور پٹنہ کی کوٹھیاں
چھین لیں اور جوشیا چائلڈ کو بنگال سے نکال دیا۔ وہ مدراس چلا گیا۔ ادھر مغربی ساحل
پر بھی جنگ شروع ہو گئی اور مغلیہ فوج نے بمبئی کا محاصرہ کر لیا۔ انگریزوں نے مغربی
ساحل پر جس قدر مغلیہ جہاز تھے سب پر قبضہ کر لیا۔ اور اس زمانے میں جو مسلمان
حج کے لئے مکہ شریف جا رہے تھے انکو گرفتار کرنا شروع کر دیا۔ یہ بڑا نازک معاملہ تھا۔
شہنشاہ حج اور حاجیوں کی خاطر سے مجبور ہو گئے اور صلح کرنے کی اجازت دیدی۔
سنہ ۱۶۹۰ء میں کمپنی نے بادشاہ سے معافی مانگ لی اور تجارت کے لئے نیا فرمان حاصل
کر لیا۔ اب جاب چارنک بھی مدراس سے ہگلی واپس آ گیا اور وہاں ایک چھوٹی سی بستی
بسائی جو بعد کو کلکتہ بن گئی۔

اہل یورپ کی تجارتی جنگ ہندوستان میں یورپ میں فرانس اور ہالینڈ کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔ اسکا
اثر ان کی ہندوستانی تجارتی کمپنیوں پر بھی پڑا اور ہندوستان
میں ان کی لڑائی شروع ہو گئی۔ سنہ ۱۶۹۳ء میں اہل ہالینڈ نے فرانس والوں سے پانڈی چری کو
چھین لیا لیکن یورپ میں صلح ہو جانے کے بعد پھر فرانسیسیوں کو دیدیا گیا۔ اس کے بعد
پرتگال، ہالینڈ، انگلینڈ اور فرانس میں باہمی مقابلہ شروع ہو گیا۔ ہر ملک کی یہی کوشش
تھی کہ ہندوستان کی تجارت کا تنہا مالک بن جائے۔ یہ مقابلہ سالہا سال جاری رہا اور
آخر انگریزوں کو کامیابی ہوئی۔ اس کا سبب یہ تھا کہ اہل پرتگال اگرچہ حکومت کرنے کی
قابلیت رکھتے تھے لیکن انہوں نے یہ اصولی غلطی کی کہ حکومت کی بنیاد مذہبی تعصب پر
رکھنی چاہی۔ ہندوستان کی سب سے دکھتی رگ مذہب ہے، اس کی ٹھیس بھی انکو
برداشت نہیں ہوتی۔ چنانچہ اہل ہند پرتگیلوں کے دشمن ہو گئے۔ اور وہ ساحل کے

مقبوضات کے علاوہ نہ اندرون ملک میں تجارت کو وسعت دے سکے نہ حکومت میں حصہ لے سکے۔

ڈچ لوگ (اہل ہالینڈ) نہایت دلیر اور باہمت تھے، لیکن انکے پاس جنگی بیڑا انگریزوں کے مقابلے کا نہ تھا۔ اس سبب سے وہ بھی ہمت ہارنے پر مجبور ہو گئے۔ اب ہالینڈ والوں کا ہندوستان کے کسی حصے پر کوئی قبضہ نہیں رہا۔

فرنچ (اہل فرانس) کی ناکامی کا بڑا سبب یہ تھا کہ ان کو اپنی گورنمنٹ سے کچھ مدد نہ ملی بلکہ حکومت کمپنی کی مخالفت کرتی رہی۔ آخر فرانس والے بھی بیٹھ رہے۔ اور میدان تجارت انگریزوں کے ہاتھ رہا۔

فرانس و انگلستان کی جنگ حکومت ہند کے لئے اہل فرانس نے جب اندازہ کر لیا کہ انگریزوں کے مقابلے میں انکی تجارت کامیاب نہیں ہو سکتی تو انہوں نے تجارت کا خیال چھوڑ کر حکمرانی کی طرف توجہ کی ۱۷۳۵ء میں ڈیوما فرانسیسی نو آبادیوں کا گورنر ہو کر آیا۔ اس نے دیکھا کہ ہندوستان میں کوئی مرکزی حکومت باقی نہیں ہے۔ اور جو برائے نام ہے وہ کافی طاقتور نہیں ہے۔ صوبے صوبے اور قوم قوم آپس میں برسرِ پرخاش ہیں۔ اور انگریزوں کی بڑی توجہ تجارت کی طرف ہے۔ ڈیوما نے تہیہ کر لیا کہ فرانسیسی حکومت قائم کر دی جائے۔ ڈیوما کے بعد سنہ ۱۷۴۲ء میں ڈوپلے فرنچ گورنر ہوا۔ یہ شخص بڑا مدبر، باخبر، حوصلہ مند اور شجاع تھا۔ اس نے ہندوستان کے راجاؤں اور نوابوں کے باہمی تنازع اور ملکی شورش میں حصہ لینا شروع کر دیا۔

اتنے میں ۱۷۴۶ء میں فرانس و انگلستان کے درمیان یورپ میں جنگ شروع ہو گئی۔ چنانچہ ہندوستان میں بھی یہ دونوں لڑنے لگے۔ اور وہاں کی صلح کے ساتھ یہاں بھی صلح ہو گئی۔ اس سے دس سال بعد ۱۷۵۶ء میں پھر یورپ میں یہ دونوں ملک باہم جنگ آزما ہوئے۔ پھر ہندوستان میں جنگ کے ساتھ جنگ اور صلح کے ساتھ صلح ہوئی

اب انگریز و فرانسیسی ہندوستان کی حکومت حاصل کرنے کیلئے لڑ رہے تھے۔ ہندو اور مسلمان ریاستوں، اور صوبہ داروں میں باہمی مخالفت اور جنگ و جدال جاری تھی۔ انگریزوں اور فرانسیسیوں نے ان کی حمایت شروع کردی۔ کسی کے طرفدار انگریز ہو گئے کسی کے فرانسیسی۔ اور اس طرح حکومت حاصل کرنے کیلئے اپنے اپنے داؤں لگانے لگے۔ آخر ۱۷۹۹ء میں ٹیپو سلطان کی شہادت نے اہل فرانس کو ہمیشہ کیلئے مایوس اور انگریزوں کو کامیاب بنادیا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت

شہنشاہ اورنگ زیب کی وفات ۱۷۰۷ء کے بعد مغلیہ سلطنت بالکل لڑکھڑانے لگی۔ بارہ برس کے عرصہ میں تین بادشاہ تخت نشین اور معزول ہوئے۔ محمد شاہ (۱۷۱۹ء تا ۱۷۴۸ء) کے عہد میں نادر شاہ (۱۷۳۹ء) اور احمد شاہ ابدالی (۱۷۴۵ء) کے حملے ہوئے۔ مرہٹے زور پکڑ گئے۔ اور پنجاب پر قابض ہو گئے، اودھ، بنگال دکن کے صوبے آزاد ہو گئے۔ انگریزوں کی ایسٹ انڈیا کمپنی نے اس حالت سے فائدہ اٹھایا۔ کمپنی کی خوش قسمتی سے اس کا ایک معمولی کلرک کلائو، جو ۱۷۴۴ء میں ملازم ہو کر آیا تھا، غیر معمولی دل و دماغ کا آدمی نکلا۔ ۲۳ سال کے عرصہ میں وہ خود لارڈ اور گورنر اور سپہ سالار بن گیا اور کمپنی کو دہلی و شمالی ہند کا حکمران بنا دیا۔ اگرچہ شاہانِ مغلیہ کی اولاد کٹ پتلی کی طرح تخت پر بیٹھتی رہی لیکن حکومت دراصل انگریزوں کی تھی۔

چنانچہ ڈھنڈورے کا نعرہ ہی یہ ہو گیا تھا "ملک بادشاہ کا حکم کمپنی بہادر کا"۔

کمپنی کا بڑھتا ہوا اقتدار دیکھ کر انگلینڈ کی حکومت نے کمپنی کی براہ راست نگرانی شروع کردی۔ اور ۱۷۷۳ء میں اس کے متعلق قانون بنا دیا۔ جس کو ریگولیٹنگ ایکٹ کہتے ہیں بنگال پایۂ تخت مقرر ہوا اور وہاں کا گورنر گورنر جنرل بنا دیا گیا۔ پہلا گورنر جنرل وارن ہیسٹنگز تھا۔ اس کی مدد کے لئے ایک کونسل بنائی گئی۔ کلکتہ میں عدالت عالیہ (ہائی کورٹ) قائم ہوئی۔ اور تمام انگریزی مقبوضات کا حاکم اعلیٰ گورنر جنرل ہو گیا۔

اور اس کے ماتحت تین پریسیڈنسیاں قائم ہوگئیں :-

(۱) بنگال پریسیڈنسی۔ بنگال پر انگریزوں کا اثر شروع ہی سے تھا۔ جنگ پلاسی (۱۷۵۷ء) کے بعد تقریباً تمام بنگال انگریزوں کے زیر اثر آگیا تھا۔ کلکتہ کے مشہور قلعہ فورٹ ولیم کی بنیاد اس سے پہلے پڑ گئی تھی، لیکن موجودہ قلعہ ۱۷۵۷ء میں تعمیر ہونا شروع ہوا اور ۱۷۷۳ء میں مکمل ہوگیا۔

(۲) مدراس پریسیڈنسی۔ مدراس کی آبادی بنگال سے بھی پہلے ۱۶۴۰ء میں شروع ہوگئی تھی۔ اور وہاں قلعہ کی بنیاد پڑ گئی تھی۔ اس کے بعد نواب کرناٹک اور نظام حیدرآباد کی ریاستوں کے کچھ اضلاع اس میں شامل کئے گئے۔ پھر ۱۷۹۹ء میں ٹیپو سلطان کی سلطنت شامل ہو جانے سے یہ پریسیڈنسی بہت وسیع ہوگئی۔

(۳) بمبئی پریسیڈنسی۔ ۱۶۶۸ء میں بمبئی کمپنی کی ملکیت میں شامل ہوگیا تھا۔ گورنر جنرل ہیسٹنگز نے (۱۷۷۵ء تا ۱۷۸۴ء) اور گورنر جنرل ویلزلی نے (۱۷۹۸ء تا ۱۸۰۵ء) اور پھر ہیسٹنگز نے (دوبارہ ۱۸۱۳ء تا ۱۸۲۳ء) مرہٹوں سے چار مرتبہ جنگ کرکے اور شکست دیکر ان کا بہت سا ملک بمبئی کے احاطہ میں شامل کرلیا۔ پھر ۱۸۴۳ء میں سندھ اسی خطے میں شامل ہوگیا اور بمبئی پریسیڈنسی میں بہت وسعت پیدا ہوگئی۔

انگریزوں کی شہنشاہی ہندوستان میں یورپ کی متعدد قومیں تجارت کرنے آئیں اور ان میں سے بعض بعض نے حکومت ہند کی باگ بھی ہاتھ میں لینی چاہی لیکن کسی کو انگریزوں کے مقابلے میں کامیابی نہ ہوئی۔ اس کا اصلی سبب یہ تھا کہ انگریزوں کی حکومت انگلستان اور تمام قوم انگریزی کمپنی کی طرفدار، مددگار، مشیر کار اور نگراں تھی۔ یہ بات پرتگال اور ہالینڈ والوں کو کیا فرانس والوں کو بھی نصیب نہ تھی۔ سلطنت برطانیہ حسب موقع روپیہ کی امداد بھی دیتی رہی، اور قابل سے قابل حکم رانوں کو بھی بھیجتی رہی اور نئے نئے فرمان بھی جاری کرتی رہی۔ اس طرح ہندوستان اگرچہ بظاہر کمپنی کے زیر اثر

تھا لیکن حقیقت میں اس کی مالک و مختار خود برٹش گورنمنٹ تھی اس لئے ۱۸۵۷ء کے "غدر عظیم" کے بعد انگلستان کو حکومت ہند کی باگ کمپنی سے اپنے ہاتھ میں لینے میں کوئی دشواری پیش نہ آئی۔ یکم نومبر ۱۸۵۸ء کو گورنر جنرل لارڈ کیننگ نے الہ آباد کے دربار میں ہندستان پر برطانیہ کی شہنشاہی کا اعلان کر دیا۔ یہ کمپنی کا آخری گورنر جنرل وائسرائے (نائب شاہی) بھی بنا دیا گیا۔ اور اب دونوں عہدے ایک ذات میں جمع ہو گئے۔

گورنمنٹ کی طرف سے اشاعت تعلیم ۱۸۱۳ء / ۱۲۲۸ھ سب سے پہلی مرتبہ گورنمنٹ نے ایک لاکھ روپیہ ہندوستانیوں کی تعلیم کے لئے منظور کیا۔ ۱۸۱۶ء میں ڈیوڈ ہیر نے راجہ رام موہن رائے کی مدد سے کلکتہ میں ہندو کالج قائم کیا۔ اسی زمانے میں چند پادریوں نے سیرامپور میں ایک کالج کھولا۔

۱۸۱۸ء میں انہی پادریوں نے سماچار درپن کے نام سے ایک اخبار جاری کیا۔

۱۸۳۰ء میں الگزینڈر ڈف نے کلکتہ میں اعلیٰ تعلیم کے لئے کالج کھولا۔ ان کالجوں میں ذریعہ تعلیم انگریزی زبان تھی۔ انگریزی علم و ادب اور سائنس کی تعلیم دی جاتی تھی لیکن اب تک سرکاری طور پر انگریزی کو ذریعہ تعلیم بنانا طے نہ ہوا تھا۔

۱۸۳۵ء میں انگریزی زبان ذریعہ تعلیم قرار دی گئی۔

۱۸۳۶ء میں سر چارلس مٹکاف (سابق گورنر صوبہ آگرہ) نے گورنر جنرل ہونے کے بعد پریس کو آزادی دیدی یعنی اہل ہند بغیر لائسنس کے اخبارات جاری کرنے لگے اور نامہ نگاروں کو آزادانہ واقعات نگاری و رائے زنی کا اختیار مل گیا۔

۱۸۵۴ء / ۱۲۷۰ھ میں سر چارلس وڈ نے ولایت سے ہندوستان اپنی تعلیمی رپورٹ بھیجی۔ جس میں حکومت ہند کو مشورہ دیا تھا کہ تمام رعایا کیلئے تعلیم کو عام کر دینا چاہئے۔ چنانچہ گورنر جنرل لارڈ ڈلہوزی نے محکمہ تعلیم قائم کر دیا اور دیہاتی مدرسے جاری کر دئے۔

۱۸۶۱ء میں اعلیٰ تعلیم کو عام کرنے کی غرض سے کلکتہ، بمبئی اور مدراس میں

یونیورسٹیاں قائم کی گئیں۔

۱۸۷۷ء میں سر سید احمد خاں نے علیگڈھ میں محمڈن اینگلو اورنیٹل کالج قائم کیا اور وائسرائے لارڈ لٹن نے خود اس کی رسم افتتاح ادا کی۔

۱۸۸۲ء میں پنجاب یونیورسٹی قائم ہوئی۔

۱۸۸۷ء میں الہ آباد یونیورسٹی کا افتتاح ہوا۔

۱۹۰۴ء (۱۳۲۲ھ) میں لارڈ کرزن نے یونیورسٹیز ایکٹ کے نام سے اعلیٰ تعلیم کی اصلاح کے لئے ایک قانون پاس کیا۔ اس کے ذریعے نظام تعلیم میں حکومت کا عنصر بڑھایا گیا اسی بنا پر اہل ہند نے اس قانون کی مخالفت کی۔

اس کے بعد بنارس، علی گڑھ، لکھنؤ، دہلی، آگرہ، ڈھاکہ، پٹنہ، ناگپور، رنگون وغیرہ مقامات پر الگ الگ یونیورسٹیاں قائم ہوگئیں۔ ابتدائی و درمیانی تعلیم کے لئے محکمے قائم ہوئے۔ مکاتب و مدارس جاری ہوئے۔ ذات پات کا فرق مٹ کر تعلیم سب کے لئے عام ہوگئی۔

اہل یورپ اور اردو | اس تاریخ کے بیان کرنے سے مقصد یہ ہے کہ ہندوستان میں یورپ کی جو جو قومیں آئیں ان کے رسوخ و اثر کا اندازہ ذہن نشین کرایا جائے۔ اور اردو سے ان کا تعلق بیان کیا جائے۔ خصوصاً انگریزوں اور انگریزی کا اثر اردو پر دکھایا جائے۔

(۱) پرتگال والے سب سے پہلے آئے۔ تجارت سے ترقی کر کے حکومت میں حصہ لیا، ساحلوں پر قبضہ جمایا، تجارتی کوٹھیاں بنائیں، جائدادیں خریدیں، اپنا مذہب پھیلایا، ہندوستانیوں کو عیسائی بنایا۔ ان سب مشاغل اور مصروفیتوں کے لئے اہل ہند سے میل جول کی ضرورت تھی۔ چنانچہ اہل پرتگال نے سواحل ہند کی زبانیں سیکھیں اور اپنی زبان سکھائی۔

(۲) اہل پرتگال بہت سی چیزیں اپنے ساتھ لائے جو ہندوستان میں نہ تھیں ان کے نام ہندوستان میں باقی رہ گئے۔ مثلاً الماری، بالٹی، پیپا، پستول، صابون، کارتوس، میز، تولیا وغیرہ

(۳) پرتگالیوں کا اثر سب سے پہلے اور سب سے زیادہ جنوبی ہند کی زبانوں پر پڑا مرہٹی، بنگالی، اُڑیا وغیرہ زبانوں میں صدہا پرتگالی لفظ مل گئے، اور پھر اندرون ملک میں یہ پہنچ کر اردو میں شامل ہوتے

(۴) اہل پرتگال کے بعد جب ہالینڈ، فرانس اور انگلستان والے آئے تو انھوں نے دیکھا کہ تمام بندرگاہوں اور ساحلی مقامات پر پرتگالی تما ہندوستانی یا ہندوستانی نما پرتگالی زبان پھیلی ہوئی ہے، اور اہل ہند سے میل جول کے لئے یہ زبان سیکھنا آسان اور مفید ہے۔ اس لئے ان لوگوں نے اسی زبان کو حاصل کیا۔

(۵) کپتان ہملٹن اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ ہندوستان کے ساحلوں پر اہل پرتگال کی زبان کا اس قدر اثر موجود ہے کہ اہل یورپ باہمی گفتگو اور اہل ہند سے میل جول کیلئے یہی زبان حاصل کرتے ہیں۔ لاکیر اپنی کتاب (اشاعت ۱۷۱۱ء) میں ذکر کرتا ہے کہ اہل پرتگال کو یہ فخر حاصل ہے کہ ان کی زبان نے سواحل ہند پر ایک مشترک زبان پیدا کر دی ہے جو تمام اہل یورپ کے لئے مفید ثابت ہوتی ہے۔

(۶) ہالینڈ اور فرانس والے بھی ہندوستان میں آئے۔ تجارت و حکومت کی کوشش کرتے رہے۔ اہل ہالینڈ کو ہند میں رہنا اور اپنے مقبوضات قائم رکھنا نصیب نہ ہوا ہندوستان سے جلد واپس جانا پڑا۔ اہل فرانس برسوں رہے۔ بعض مقامات پر قبضہ کیا اور اب تک قابض رہے۔ لیکن ان دونوں قوموں کی زبانوں کا کوئی اثر ہندوستان میں نہ ہوا اور ان کی کوئی نمایاں یادگار باقی نہیں ہے۔ یورپ سے جو نئی چیزیں اور انکے نام آتے اور رائج ہوتے وہ اکثر پرتگیز کے لائے ہوتے تھے۔ ہالینڈ اور فرانس سے

کچھ اور نئی چیزیں نہیں آئیں جن کی یادگار باقی رہتی۔ صرف بعض الفاظ ہندوستان میں موجود ہیں۔

(۷) پرتگال، ہالینڈ اور فرانس کا جو کچھ اثر اردو پر ہوا وہ صرف الفاظ کی شکل میں ہوا۔ اردو انشا پردازی پر کوئی اثر نہ پڑا۔ بلکہ خود ان لوگوں نے ہندوستانی زبانیں سیکھیں، اردو حاصل کی، اردو میں کتابیں لکھیں۔ اردو میں شاعری کی۔

(۸) خصوصاً اہل فرانس میں سے بعض بعض پرائیویٹ طور پر ہندوستان میں اقامت پذیر ہو گئے۔ مختلف شہروں میں جاگیریں لیں، مکانات بنائے ہندوستانی لباس و معاشرت اختیار کی، چنانچہ آگرہ میں ایک فرانسیسی مسٹر مارٹن کے یادگار مکانات اب تک موجود ہیں اور مارٹن محل کے نام سے مشہور ہیں۔ فرانسیسی اردو شاعروں کی یادگاریں بھی تذکروں میں باقی ہیں۔

(۹) انگریز پرتگالیوں سے سو برس بعد تجارت کرنے آئے لیکن ایسا سودا کیا کہ ہندوستان ہی کو مول لے لیا۔ انگریزوں کی حکومت ہندوستان میں تقریباً تین سو برس قایم رہی انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کو دو سو برس کے قریب ہوئے (از عہد لارڈ کلایو) اور انگریزوں کی شہنشاہی کو نوّے سال ہوئے۔ انگریزوں نے اردو زبان کی رفتار ترقی اور قبول عام کو دیکھ کر اس کی طرف توجہ کی۔ ان سے پہلے ہالینڈ اور پرتگال والے اردو کی قواعد صرف و نحو پر کتابیں لکھ چکے تھے۔ انگریزوں نے بھی اٹھارہویں صدی میں گرامر اور لغت کی متعدد کتابیں لکھیں۔ انیسویں صدی میں مشن کے پادریوں نے مذہبی کتابیں اردو زبان میں شائع کیں۔ اردو اخبار اور رسالے جاری کئے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنے انگریز ملازموں کے لئے اردو زبان کا سیکھنا اور پھر اس میں امتحان پاس کرنا لازم کر دیا۔ ۱۸۳۲ء میں اردو کو سرکاری زبان قرار دیا گیا قانون کی کتابیں انگریزوں نے لکھیں۔ انگریزی حکام عدالت کی کارروائیاں اردو میں

لکھنے لگے۔ کمپنی کے ملازموں کے لئے ہر قسم کا لٹریچر چھپایا گیا۔ مختلف زبانوں سے ترجمے کرائے گئے۔ یہاں تک کہ اعلیٰ انگریز حکام نے درباروں میں اردو زبان میں تقریریں کیں چنانچہ گارسن[1] دتاسی کا بیان ہے کہ

"۷ جنوری ۱۸۶۵ء کو پنجاب کے لفٹنٹ گورنر نے لاہور میں اپنی روانگی سے قبل ایک دربار منعقد کیا۔ لفٹنٹ گورنر نے اس موقع پر انگریزی میں نہیں بلکہ ہندوستانی (اردو) زبان میں حاضرین جلسہ کو مخاطب کیا"۔

"فروری کے مہینے میں لکھنؤ میں چیف کمشنر کے زیر صدارت ایک جلسہ ہوا جس میں اس نے اودھ کے تعلقہ داروں کے روبرو ہندوستانی میں طویل طویل تقریر کی"۔

انگریزوں نے اردو زبان میں شاعری کی۔ اور بعض صاحب دیوان ہوتے، مثلاً الگزنڈر ہیڈلے اور جارج پیش شور پہلے کا تخلص آزاد تھا دوسرے کا شور۔ اردو کے بعض مشہور مصنفوں کو ان کی تصانیف کے صلے میں ڈاکٹر کی ڈگری (ایل ایل ڈی)، دی، مثلاً سر سید احمد خاں اور مولوی نذیر احمد دہلوی کو۔ ملکہ وکٹوریا نے اردو زبان سیکھی اور منشی عبدالکریم کو آگرہ سے تعلیم حاصل کرنے کے لئے لندن بلایا۔ اردو لکھنے پڑھنے لگیں۔ ملکہ کے اردو میں دستخط

---

[1] گارسن دتاسی فرانسیسی عالم مستشرق تھا۔ اس کو اردو زبان سے اس قدر عشق تھا کہ فرانس میں بیٹھا بیٹھا اردو زبان کی رفتار ترقی کا مطالعہ کرتا تھا۔ اپنے دوستوں اور انگریز حکام کی معرفت اردو کے متعلق ہر قسم کی معلومات حاصل کرتا تھا اور ہر سال کے آخر میں اپنی یونیورسٹی میں اردو کی اس سال کی ترقی پر لکچر دیتا جس میں اردو کی ادبیات، شاعری، مصنفین، شعرا، اخبارات وغیرہ سب کا ذکر ہوتا تھا ۱۸۵۰ء سے ۱۸۶۹ء تک ۱۹ لکچر دئے جن کا ترجمہ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد نے ۸۰۰ صفحوں کی مجلد کتاب میں شائع کر دیا ہے اسی سے یہ اقتباسات ماخوذ ہیں۔ ان لکچروں کے علاوہ گارسن دتاسی نے اردو زبان کی تاریخ بھی لکھی ہے اور کتابوں کے ترجمے کئے ہیں اور بعض اردو کتابوں کو اپنی ادارت میں شائع کیا ہے۔

بھی شائع ہوئے۔

(۱۰) انگریزی زبان کا اردو پر بے حد اثر پڑا۔ صدہا انگریزی لفظ اردو میں شامل ہو گئے جن میں سے بعض کے تلفظ ہندوستانی لب و لہجہ کے مطابق کر لئے گئے۔ مثلاً لالٹین، بوتل، رپٹ، سنتری، جرنیل، لاٹ صاحب۔ انگریزی محاورے، انگریزی اسلوب بیان اردو میں ڈھال لئے گئے، انگریزی کہاوتوں مثلوں کا اردو میں ترجمہ کر لیا گیا، انگریزی رموزِ اوقاف (کاما، علامت سوال وغیرہ) کو اردو تحریروں میں استعمال کرنے لگے۔ اور ان میں سے علامت سوال کا رُخ اردو تحریر کی مناسبت سے داہنی طرف کو پھیر دیا۔ یعنی انگریزی علامت (?) اردو میں (؟) لکھنے لگے۔ اردو تحریروں میں پیراگراف قائم ہونے لگے۔ اردو زبان میں بچوں کے قاعدے اور ریڈریں انگریزی کے اصول پر لکھی گئیں۔ مغربی علوم و فنون کے اردو میں ترجمے ہوئے۔ نئی نئی اصطلاحیں بنائی گئیں۔ اخبارات و رسائل جاری ہوئے۔ مقالات علمی و ادبی، مختصر فسانے، ناول، ڈراما، تنقید، سیرت، تذکرہ، تاریخ، وغیرہ ہر قسم کی انشا پردازی انگریزی کے اصول پر اردو میں شروع ہو گئی۔ اردو شاعری پر بھی انگریزی کا بہت بڑا اثر ہوا۔ جدید شاعری کی ایک مستقل صنف اردو میں پیدا ہو گئی جو قدیم اردو شاعری میں خال خال پائی جاتی تھی۔ انگریزی کی تقلید میں مختلف موضوعات، جذبات، مناظر قدرت، معارف و حقائق، اخلاق، سیاست وغیرہ کے متعلق نظمیں لکھی جانے لگیں، نظم کی ظاہری صورتوں میں اضافہ ہو گیا یعنی قدیم مثلث، مخمس وغیرہ کے علاوہ قافیوں اور مصرعوں کی ترتیب انگریزی کے اتباع میں اور اور شکلوں سے بھی ہونے لگی۔ غزل کی روش بدل گئی۔ بلند خیالی، مشکل پسندی، باریک بینی، متانت و شائستگی پہلے سے بڑھ گئی لیکن انگریزی تعلیم اور مغربی تہذیب و معاشرت کے اثر سے قصیدہ مفقود ہو گیا۔ مرثیہ متروک ہو گیا۔ مثنوی ختم ہو گئی۔

ان سب چیزوں کا تفصیلی ذکر تاریخ میں موقع و محل پر کیا جائے گا۔ اس وقت اردو

زبان پر انگریزی اور انگریزوں کے اثر کا خاکہ کھینچا تھا۔

پہلا یورپین مصنف جان جوشوا کیٹلر (ڈچ)

اہل یورپ میں پہلا شخص جس کی اردو زبان کے متعلق کوئی کتاب اور کوئی تحریر ملتی ہے غالباً ہالینڈ کا رہنے والا (ڈچ) جان جوشوا کیٹلر ہے یہ شخص ۱۷۱۱ء میں ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی کا ڈائرکٹر مقرر ہوا اور تین سال سورت میں رہا شاہ عالم بادشاہ (۱۷۰۸ء ۱۱۲۰ھ تا ۱۷۱۲ء ۱۱۲۴ھ) اور جہاندار شاہ (۱۷۱۲ء) کے دربار میں بھی ڈچ سفیر کے طور پر حاضر ہوا۔ لاہور، دہلی، آگرہ کی سیر کی۔ اس زمانے میں آگرہ میں ڈچ تاجروں کا ایک کارخانہ سورت کے ماتحت تھا۔ اس شخص نے صرف و نحو ہندوستانی کے نام سے اردو زبان کی گرامر غالباً ۱۷۱۵ء میں لکھی جس کو ڈیوڈ مل نے ۱۷۴۳ء میں شائع کیا یہ کتاب لیٹن (لاطینی) زبان میں ہے۔ ہندوستانی الفاظ اور عبارتیں رومن حروف میں ہیں۔ اس کتاب میں حضرت عیسیٰ کی مشہور دعا کا اردو ترجمہ بھی درج ہے اس کو بطور نمونہ لکھا جاتا ہے:۔

"ہمارے باپ کہ وہ آسمان میں ہے، پاک ہوئے تیرے نام آوے ہم کوں ملک تیرا، ہوئے راج تیرا جوں آسمان تو جین (زمیں) میں روٹی ہمارے نتھی، ہم کو آس دے اور معاف کر تقصیر اپنی ہم کوں، جو معاف کرتے اپرے (اپنے) قرض داروں کو، نہ ڈال ہم کو اس وسوسے میں، بلکہ ہم کوں گھس کر اس برائی سے، تیری پیچی سواری عالمگیری حمایت میں، آمین۔"

اس کے بعد مختلف اہل یورپ نے اردو زبان کی کتب لغات لکھیں، قواعد صرف و نحو پر کتابیں تالیف کیں، بائبل کے اردو میں ترجمے کئے۔ ان میں سے چند کتابوں کا ذکر کیا جاتا ہے

(۱) پادری بنجمن شلز نے لیٹن زبان میں اردو کی قواعد لکھی جو ۱۷۴۴ء میں طبع ہوئی۔ اس میں اردو کے الفاظ فارسی خط میں لکھے ہیں۔

(۲) اسی شخص نے ۱۷۴۸ء میں بائبل کا اردو میں ترجمہ کیا۔

(۳) مل نے ۱۷۷۲ء میں ہندوستانی حروف تہجی پر ایک مختصر کتاب تصنیف کی۔

(۴) جی اے فرٹز نے ۱۷۴۳ء میں ایک کتاب لکھی جس میں اردو کے حروف تہجی کا دیگر ممالک کے حروف سے مقابلہ کیا

(۵) ملک اٹلی کے ایک پادری کیسیانو بیلی گاٹی نے ۱۷۶۱ء میں حروف تہجی پر ایک رسالہ الفابیٹم برمانکم کے نام سے لکھا۔

(۶) ہیڈلے نے ۱۷۷۲ء میں اردو کی گرامر (صرف و نحو) لکھی

(۷) پرتگالی زبان میں ایک اردو کی قواعد ۱۷۷۸ء میں گریمیٹیکا اندوستانا کے نام سے شائع ہوئی۔

(۸) ڈف نے قیام ہندوستان کے زمانے میں ایک ہندوستانی گرامر لکھی اور لندن میں شائع کی۔ یہ شخص ۱۷۸۰ء میں ہندوستان آیا۔ کلکتہ میں اس نے سنسکرت، بنگالی اور ہندوستانی (اردو) زبانیں سیکھیں۔ مولوی عبدالحق صاحب مرحوم کی رائے ہے کہ اس نے اردو قواعد میں بہت غلطیاں کی ہیں۔

(۹) ڈاکٹر جان گلکرائسٹ نے ۱۷۹۳ء میں انگریزی ہندوستانی ڈکشنری مرتب کی

(۱۰) ہندوستانی گرامر ۱۷۹۶ء

(۱۱) اورینٹل لنگوئسٹ (مشرقی زباندان) مطبوعہ ۱۷۹۸ء

یہ اٹھارویں صدی کی چند کتابیں ہیں۔ انیسویں صدی میں بے شمار اہل یورپ (جرمن فرنچ، انگریزوں) نے علمی و ادبی و قانونی کتابیں اردو زبان میں اور اردو زبان کے متعلق دوسری زبانوں میں لکھیں۔ بعض کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر گلکرائسٹ اہل یورپ میں اردو زبان پر سب سے بڑا احسان ڈاکٹر گلکرائسٹ کا ہے۔ انہوں نے ۱۷۸۲ء سے اردو کی خدمت شروع کی اور بیس برس تک اردو زبان میں اور اردو کے متعلق انگریزی زبان میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری رکھا۔

سنہ ۱۸۰۰ء (۱۲۱۴ھ) میں کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج قائم ہوا۔ اس کے پرنسپل ڈاکٹر گلکرائسٹ مقرر ہوتے۔ یہاں ایک محکمہ اردو کے ترجمہ و تالیف کا انہوں نے قائم کیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریز ملازموں کے لئے ڈاکٹر صاحب نے اردو کی کتابیں لغات، قواعد، تاریخ وغیرہ کے متعلق خود بھی لکھیں اور ہندوستان کے لائق اہل قلم مسلمان، ہندوؤں کو جمع کر کے ان سے کتابیں اردو میں ترجمہ و تالیف کرائیں۔ ان کی سرپرستی اور کوشش سے اس زمانے میں ایسا اردو لٹریچر پیدا ہو گیا جو آج تک اردو میں اپنی نوعیت کا بے نظیر اور یادگار ہے۔ میر امن دہلوی، میر شیر علی افسوس دہلوی، میر بہادر علی حسینی، سید حیدر بخش حیدری، مرزا کاظم علی جوان، نہال چند لاہوری، للو لال جی، بینی نرائن، مظہر علی خاں ولا، مرزا علی لطف وغیرہ اہل فن اور ارباب ادب نے ڈاکٹر گلکرائسٹ ہی کی سرپرستی میں کام کیا۔ اور باغ و بہار، باغ اردو، آرائش محفل، طوطا کہانی، سنگھاسن بتیسی، گلشن ہند وغیرہ اردو کی کتابیں جو ان لوگوں نے لکھیں ڈاکٹر گلکرائسٹ ہی کی اردو نوازی کا نتیجہ ہیں۔ (ان مصنفین و تصانیف کا تذکرہ آگے اپنے موقع پر آئے گا

خود ڈاکٹر گلکرائسٹ کی تصانیف کی فہرست بھی کافی طویل اور نہایت وقیع و قابل قدر ہے۔ مثلاً

(۱) و (۲) و (۳) کا ذکر اوپر اٹھارویں صدی کی کتابوں میں (پچھلے صفحہ پر) آچکا ہے۔

(۴) شرقی زبانداں کا خلاصہ مع اضافہ جدید مطبوعہ کلکتہ سنہ ۱۸۰۰ء

(۵) فارسی فعل کا نظریہ جدید مع مترادفات ہندوستانی مطبوعہ کلکتہ سنہ ۱۸۰۱ء

(۶) قصص مشرقی (انگریزی سے اردو میں ترجمہ) مطبوعہ کلکتہ سنہ ۱۸۰۳ء

(۷) رہنمائے زبان اردو مطبوعہ کلکتہ سنہ ۱۸۰۴ء

(۸) ہندی عربی کا آئینہ (عربی الفاظ کے نقشے جو اردو زبان سے تمام تعلق رکھتے ہیں) مطبوعہ ۱۸۰۲ء

(۹) قواعد اردو مطبوعہ ۱۸۰۹ء

(۱۰) اردو رسالہ گلکرائسٹ مطبوعہ ۱۸۲۰ء۔ یہ کتاب ڈاکٹر صاحب کی قواعد اردو کا خلاصہ ہے۔

(۱۱) انگریزی ہندوستانی بول چال مطبوعہ لندن ۱۸۲۰ء

ڈاکٹر گلکرائسٹ ۱۸۰۴ء میں ہندوستان سے پنشن لیکر ولایت چلے گئے اور ایڈنبرا میں قیام کیا۔ پھر ۱۸۱۶ء میں لندن آ گئے۔ اور انڈین سول سروس کے امیدواروں کو پرائیوٹ طور پر مشرقی زبانوں کی تعلیم دیتے رہے۔ ۱۸۱۸ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے اورینٹل انسٹی ٹیوٹ قائم کیا۔ اس میں ڈاکٹر صاحب اردو کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ ۱۸۲۶ء میں یہ درسگاہ بند کردی گئی۔ لیکن ڈاکٹر صاحب اپنے طور پر لوگوں کو اردو پڑھاتے رہے۔ ۱۸۴۱ء میں بمقام پیرس ڈاکٹر صاحب نے ۸۲ سال کی عمر میں انتقال کیا۔

گلکرائسٹ کی قواعد اردو (مطبوعہ ۱۸۰۹ء) کا نمونہ[1] یہ ہے:۔

"یاد رکھنا چاہئے کہ مصدر دلالت کرتا ہے صادر ہونے پر فعل کے فاعل سے یا قائم ہونے پر فعل کے فاعل میں۔ اور اس صدور اور قیام کے بعد ایک کیفیت حاصل ہوتی ہے۔ اس کیفیت پر جو اسم دلالت کرے وہ حاصل بالمصدر ہے۔ پس اکثر مصادر کی علامت کے حذف کرنے سے جس قدر باقی رہے وہ حاصل بالمصدر ہے۔"

گلکرائسٹ کے علاوہ انیسویں صدی کے یورپین مصنفین اردو اور بھی بہت ہیں مثلاً

(۱) کپتان جوزف ٹیلر نے اردو انگریزی لغت لکھی، جس میں ڈاکٹر ولیم ہنٹر بھی

---

[1] ماخوذ از نمونۂ منثورات مولفہ مولانا احسن مارہروی

شریک کار رہے پہلی بار ۱۸۰۸ء میں کلکتہ سے شائع ہوئی، پھر ۱۸۴۲ء میں ولیم کارمیکائل اسمتھ نے اس پر نظر ثانی کر کے مختصر اڈیشن شائع کیا۔

(۲) گلیڈون نے فارسی ہندوستانی ڈکشنری مرتب کی (مطبوعہ کلکتہ ۱۸۰۹ء)

(۳) کپتان ٹامس روبک نے ڈاکٹر گلکرائسٹ کو "ہندوستانی لغت" تیار کرنے میں مدد دی۔ اور خود لغت جہازرانی لکھی، جس میں جہازرانی کے متعلق اصطلاحات اردو انگریزی میں جمع کیں، اور ایسے الفاظ اور فقرے بھی جمع کر دئے جو میدان جنگ اور فوجی بارکوں میں ہندوستانی سپاہیوں کے ساتھ گفتگو کرنے میں کام آئیں۔ اسی میں اردو قواعد کے متعلق بھی ایک ضمیمہ شامل کر دیا۔ یہ کتاب کلکتہ میں ۱۸۱۱ء میں چھپی۔

(۴) کپتان روبک نے ایک اور کتاب "ترجمان ہندوستانی" کے نام سے لکھی جس میں زبان اردو کے قواعد درج ہیں۔ یہ پہلی بار لندن میں ۱۸۲۴ء میں چھپی، پھر ۱۸۴۱ء میں لندن و پیرس دونوں جگہ شائع ہوئی۔

(۵) جان شیکسپیر نے اردو لغت لکھی (مطبوعہ ۱۸۱۴ء) اور "منتخبات ہندی" دو جلدوں میں مرتب کی۔ لندن میں ۱۸۱۸ء میں چھپی۔ اس کی پہلی جلد میں میر شیر علی افسوس کی تاریخ ہند (آرائش محفل) کے دس باب کا انگریزی ترجمہ شامل ہے۔ اور دوسری جلد میں اردو نثر و نظم کا انتخاب ۲۰۰ صفحہ کا اور ہندی نثر کا انتخاب ۴۸ صفحے کا ہے ہندی انتخاب میں کہانیاں ہیں جو اکثر سنگھاسن بتیسی سے لی گئی ہیں۔ اور اردو انتخاب میں مختلف شہروں کا مفصل حال ہے۔ مثلاً دہلی۔ آگرہ، الہ آباد، اجودھیا، ڈھاکہ، کشمیر کابل وغیرہ۔ نظم میں میر حسن، سودا، میر کی مثنویوں کا انتخاب ہے۔ انگریزوں کی تعلیم کے لئے یہ کتاب لکھی گئی ہے۔

(۶) ولیم ٹیٹ نے ایک کتاب مقدمہ زبان ہندوستانی لکھی جس کے تین حصے ہیں قواعد، لغت، زباندانی (مطبوعہ کلکتہ ۱۸۲۷ء)

(۷) ایس ڈبلیو برمین نے قواعد زبان ہندوستانی لکھی (مطبوعہ لندن ۱۸۳۰ء)

(۸) اسٹیم فورڈ ارناٹ نے ایک کتاب لکھی جس کا نام ہے جدید خود آموز قواعد زبان ہندوستانی جو برٹش انڈیا کی نہایت کارآمد اور عام زبان ہے (مطبوعہ لندن ۱۸۳۱ء) یہ کتاب رومن اور فارسی خط میں لکھی ہے۔ اور اس کے ساتھ بطور ضمیمہ لغت اور اسباق زباندانی بھی شامل کئے گئے ہیں۔

(۹) اسی مصنف (ارناٹ) کی دوسری کتاب قواعد فارسی عربی اور دیوناگری حروف میں ہے۔ اس پر ڈنکن فاربس نے حواشی کا اضافہ کیا ہے (مطبوعہ لندن ۱۸۴۴ء)

(۱۰) جیمس آربالن ٹاٹن نے ہندوستانی گرامر لکھی (مطبوعہ لندن ۱۸۴۴ء)

(۱۱) ڈنکن فاربس نے ہندوستانی لغت لکھی (مطبوعہ لندن ۱۸۴۷ء)

(۱۲) ایف۔ فیلن نے مولوی کریم الدین دہلوی کی شرکت میں شاعروں کا تذکرہ شعرائے ہند کے نام سے مرتب کیا (مطبوعہ ۱۸۴۸ء)

(۱۳) ایک فرانسیسی برٹرینڈ نے اردو لغت لکھی (مطبوعہ پیرس ۱۸۵۸ء)

(۱۴) ریورنڈ جی اسمال نے ہندوستانی گرامر لکھی (مطبوعہ لندن ۱۸۴۷ء)

(۱۵) ایک جرمنی کے عالم جی دت نوپراختو نے ہندوستانی گرامر لکھی (مطبوعہ برلن ۱۸۵۲ء)

(۱۶) ڈاکٹر ایس ڈبلیو فیلن نے چار کتب لغات لکھیں۔ ہندوستانی انگلش ڈکشنری، انگلش ہندوستانی ڈکشنری۔ ہندوستانی انگلش قانونی ڈکشنری۔ انگلش ہندوستانی قانونی ڈکشنری۔ دوسرے نمبر کی کتاب سب سے آخری ہے۔ ۱۸۷۹ء میں اس کو مرتب کرنا شروع کیا۔ ۱۸۸۰ء میں انتقال ہوگیا۔ باقی کام ڈاکٹر صاحب کے مددگاروں (یعنی لالہ فقیر چند۔ لالہ چرنجی لال۔ لالہ ٹھاکر داس۔ لالہ جگن ناتھ اور مسٹر ڈالمنگ) نے پورا کیا اور ۱۸۸۳ء میں شائع ہوئی۔

(۱۷) ان سب سے بڑا اردو زبان کا عاشق اور مصنف و مؤلف فرانسیسی عالم پروفیسر

گارسن دتاسی ہے (جس کا ذکر ہم اس سے پہلے کسی فٹ نوٹ میں کر چکے ہیں) اس نے اپنے وطن پیرس میں بیٹھ کر اردو کے متعلق لکچر بھی دئے اور بہت کتابیں اور مضامین لکھ کر اور مرتب کرکے شائع کئے۔ اس شخص نے فارسی، عربی، سنسکرت، اردو، ہندی کی خدمت کی ہے اور مذہب، فلسفہ، تصوف، تاریخ، سیرت، قصص، شاعری، تذکرۂ شعرا وغیرہ علوم وفنون کے متعلق تصنیفات وتالیفات کی ہیں۔ ہم اسکی صرف اِن کتابوں کے نام گنتے ہیں جو اردو کے متعلق ہیں:۔

(۱) پند آموز حکایات کا ترجمہ (مطبوعہ سنہ ۱۸۲۱ء)

(۲) انتخاب کلام میر تقی میر مع ترجمہ زبان فرنچ۔ مطبوعہ سنہ ۱۸۲۶ء)

(۳) قصہ کامروپ مصنفہ تحسین الدین کا فرنچ ترجمہ (مطبوعہ سنہ ۱۸۲۴ء)

(۴) انتخاب کلام ولی اورنگ آبادی (مطبوعہ سنہ ۱۸۳۶ء)

(۵) کتبہ جات عربی فارسی اردو (مطبوعہ سنہ ۱۸۳۵ء)

(۶) ذکر تذکرہ جات مشتمل بر حالات شعرا مصنفین ہندی اردو (مطبوعہ سنہ ۱۸۳۸ء)

(۷) مسلمانان مشرق کا علم عروض عربی وفارسی واردو (مطبوعہ سنہ ۱۸۳۴ء)

(۸) ہندوؤں کے کھانے جن کا ذکر اردو کتابوں میں ہے (مطبوعہ سنہ ۱۸۳۴ء)

(۹) انتخاب قصہ گل بکاؤلی مع ترجمہ زبان فرانسیسی۔ (مطبوعہ سنہ ۱۸۳۵ء)

(۱۰) اردو زبان کا ابتدائی رسالہ (مطبوعہ سنہ ۱۸۳۳ء)

(۱۱) سعدیؔ[1] دکھنی ہندوستان کا ایک مشہور شاعر (مطبوعہ سنہ ۱۸۴۳ء)

(۱۲) تذکرہ شعرائے اردو (دو جلدوں میں) مطبوعہ سنہ ۱۸۴۶ء

(۱۳) انتخابات اردو ہندی (مطبوعہ سنہ ۱۸۵۴ء)

---

[1] اس سعدی کو دکھنی ماننے میں گارسن دتاسی نے غلطی کی۔ یہ شاعر مخدوم کمال الدین سعدی ہیں اور کاکوری کے رہنے والے ہیں۔ ہم اس کتاب کے ابتدائی حصہ میں ان کا ذکر اور نمونہ کلام درج کر چکے ہیں (قادری)

(۱۴) تذکرہ مصنفین و تصانیف اردو (مطبوعہ ۱۸۶۴ء)

(۱۵) خطبات متعلق زبان اردو ۱۸۵۰ء سے ۱۸۶۹ء تک (مطبوعہ ۱۸۷۴ء)

(۱۶) خطبات متعلق زبان اردو ۱۸۷۰ء سے ۱۸۷۷ء تک

(۱۷) تذکرہ شعرائے اردو (تین جلدوں میں) پہلے تذکرہ مذکورہ ۱۲ کا ترمیم شدہ ایڈیشن مع اضافہ مقدمہ مشتمل بر تاریخ زبان و اصناف شاعری۔ اس میں تین ہزار اردو ہندی شعرا و مصنفین کا تذکرہ ہے (مطبوعہ ۱۸۷۱ء)

اس قسم کے یورپین مصنفین اردو انیسویں صدی میں نہایت کثرت سے ہیں۔ بعض کا تذکرہ اور نمونہ تحریر درج کیا جاتا ہے۔

مسٹر ایف فیلن — طبقات شعرائے ہند

مسٹر فیلن[1] اور مولوی کریم الدین دہلوی نے باہمی شرکت و معاونت سے شعرائے ہند کا تذکرہ طبقات شعرائے ہند کے نام سے مرتب کیا۔ کتاب کے بعض حصے ایک کے لکھے ہوئے ہیں، بعض دوسرے کے۔ ۱۸۴۶ء ۱۲۶۲ھ میں یہ تالیف ختم ہوئی اور ۱۸۴۸ء ۱۲۶۴ھ میں مطبع العلوم دہلی میں طبع ہوئی۔ اسکے بعد اسکے چھپنے کی نوبت نہیں آئی۔ ان مؤلفوں نے اس تذکرہ میں گارسن دتاسی کے تذکرہ سے بھی مدد لی، بلکہ اس کا ترجمہ کر دیا۔ اور دیگر تذکروں سے بھی اس میں اخذ و اقتباس کیا۔ اسلئے یہ فیلن کا تذکرہ ایک نئی تالیف ہے اور زیادہ مفصل و معتبر ہے۔ اس میں فیلن کی عبارت کا نمونہ یہ ہے

"اگرچہ میں نے یہ ارادہ کیا تھا کہ بہت تذکرے جمع کر کے اس تذکرے کو فراہم کروں لیکن مجھ سے پہلے چونکہ ڈی تاسی نے زبان فرینچ میں درمیان ملک فرانس کے ایک تذکرہ ان تذکروں مفصلہ ذیل سے بہت اچھی طرح تالیف کر دیا تھا اس لئے اور دوسرے تذکروں سے جو اس کو دستیاب نہیں ہوئے اور اس تذکرے سے مدد لیکر یہ تذکرہ میں نے فراہم کیا۔"

---

[1] فیلن و میکفرسن کے نمونے مولانا احسن مارہروی کی کتاب "نمونہ منثورات" سے ماخوذ ہیں۔

ولیم میکفرسن
دستور العمل عدالت

سنہ ۱۸۵۱ء/۱۲۶۸ھ میں ولیم میکفرسن نے ایک قانونی کتاب دستورالعمل عدالت دیوانی حکومت فورٹ ولیم کے نام سے مرتب کی۔ اس کی تالیف میں دو اور شخص بھی شریک ہیں یعنی ماسٹر ایکوٹی اور جارج اسمولٹ فیگن مجسٹریٹ کلکتہ۔ مسٹر فیگن نے "مجموعہ قوانین تعزیرات ہند" بھی اردو میں مرتب کیا ہے۔ دستورالعمل کی عبارت کا نمونہ یہ ہے:-

"جس ضلع میں جو زبان مروج ہے اس زبان کے خط و عبارت میں نوشت و خواند و سوال و جواب وہاں کی عدالتوں میں، ان کے سر رشتوں میں کہ جہاں امورات عدالت قلم بند ہوتے ہیں، عمل میں آتے ہیں۔ یعنی دیار مغربی کے اور صوبہ بہار کے محکموں میں بزبان اردو و اضلاع دیار بنگالے کی عدالتوں میں بنگلہ زبان میں اور ضلع کٹک اور اس کے پرگنوں کی کچہریوں میں اڑیا زبان میں نوشت و خواند و سوال و جواب کرنا معمول ہے"

جان ولیم پیل
رسالہ آلات طبعی

مسٹر پیل[1] آگرہ کالج میں اسسٹنٹ پروفیسر تھے۔ علم طبعیات (فزکس) کے ماہر اور فن کیمیا (کیمسٹری) کے عالم تھے۔ مولوی کریم الدین مدرس اول اردو کی مدد سے آلات طبعی کا نقشہ تیار کیا، اور ان کے استعمال کے متعلق سنہ ۱۸۵۰ء/۱۲۶۵ھ میں ایک رسالہ اردو میں تحریر کیا، جو مطبع مصور آگرہ میں سنہ ۱۸۵۴ء/۱۲۷۰ھ میں طبع ہوا۔ دیباچہ کی عبارت کا نمونہ یہ ہے:-

"یہ کتاب واسطے مدد ان طلبا کے جو علم طبعی کے لیکچروں یعنی درسوں میں رہا کرتے ہیں بموجب حکم جناب معلی القاب جیمس طامسن صاحب لفٹننٹ گورنر بہادر ممالک مغربیہ کے طیار کی گئی تھی: اور چونکہ اس حکم نے ان کی وفات تاسفی کے چند روز پیشتر نفاذ پایا تھا اور یہ طلبا کی ترقی کے

[1] ماخوذ از "یوپی میں اردو" مصنفہ مفتی انتظام اللہ الشہابی اکبرآبادی۔

بڑے مشتاق رہتے تھے......

ان کے علاوہ آگرہ ہی میں ایک اور انگریز جان پارکس لیڈلی تھا۔ سرکاری مترجم کا عہدہ اس کے سپرد تھا۔ اس نے ایک اپنا مطبع قائم کیا تھا۔ علمی دلچسپی اور اردو زبان کا شوق رکھتا تھا۔ ایک ۹۰ صفحے کا رسالہ علم المعیشت (اکنامکس) پر انگریزی سے ترجمہ کر کے اردو میں لکھا۔ اور اپنے مطبع میں ۱۸۵۳ء / ۱۲۶۹ھ میں طبع کیا۔

عیسائی مشنری اہل یورپ نے ہندوستان میں تجارت و حکومت کی کوشش کے ساتھ ساتھ عیسائی مذہب کی تبلیغ کا کام بھی بڑے زور شور سے کیا۔ اور ہندوستان کی تمام زبانوں میں انجیل کے ترجمے کئے۔ اس طرح بالواسطہ اردو زبان کی وسعت اور اردو لٹریچر کی کثرت میں سعی کی۔ اٹھارھویں صدی ہی میں چند ترجمے ہو گئے تھے انیسویں صدی میں اردو کے ٹائپ اور لیتھو کے چھاپے خانے جاری ہونے سے بائبل کی اشاعت بڑی کثرت سے ہونے لگی۔ سر سید احمد خاں مرحوم نے اپنی تفسیر انجیل میں اور گارساں دتاسی نے اپنے خطبوں میں انجیل کے ترجموں کا مفصل ذکر کیا ہے۔ ہم انیسویں صدی کے ایک ترجمہ کا مختصر اقتباس بطور نمونہ درج کرتے ہیں۔

اس کا ٹائیٹل پیج یہ ہے "کتاب مقدس یعنی پرانا اور نیا عہد نامہ، پہلی جلد جس میں سب کتابیں پیدائش سے لیکے زبور کی کتاب تک مندرج ہیں۔ نارتھ انڈیا بائبل سوسائٹی کی طرف سے مرزاپور کے آرفن اسکول پریس میں ڈاکٹر میتھر صاحب کے اہتمام سے ۱۸۶۷ء میں چھاپی گئی" نمونہ یہ ہے:۔

"پھر اس نے دوسرا خواب دیکھا، اور اسے اپنے بھائیوں سے بیان کیا اور کہا کہ دیکھو، میں نے ایک خواب دیکھا، کہ سورج، اور چاند اور گیارہ ستاروں نے مجھے سجدہ کیا۔ اور اس نے یہ اپنے باپ اور بھائیوں سے بیان کیا تب اسکے

باپ نے اسے ڈانٹا اور اس سے کہا۔ کہ یہ کیا خواب ہے، جو تو نے دیکھا ہے؟
کیا میں اور تیری ماں اور تیرے بھائی سچ مچ تیرے آگے زمین پر جھک کے تجھے
سجدہ کریں گے؟ اور اس سے بھائیوں کو رشک آیا لیکن اس کے باپ نے
اس بات کو یاد رکھا ؛

انیسویں صدی میں یہ سلسلہ جاری رہا کہ انگریز حکام اور اہل قلم اردو زبان میں تصنیف و تالیف کرتے رہے۔ چونکہ عدالتی زبان اردو ہو گئی تھی اس لئے شمالی ہند کی کچہریوں کی کارروائیاں اردو میں ہوتی تھیں۔ خود انگریز حکام تجویزیں اور فیصلے اردو میں لکھتے لکھواتے تھے لیکن جب انگریزی تعلیم عام ہو گئی اور حکومت کو انگریزی داں ملازم ملنے لگے تو اردو کی ضرورت نہ رہی اور سرکاری زبان انگریزی ہی ہو گئی۔ اس وقت سے انگریزوں نے بھی اردو کی تصانیف سے توجہ ہٹالی۔ انگریز اب بھی اردو سیکھتے تھے لیکن بولنے کے لئے زیادہ، پڑھنے کے لئے کم۔ اور لکھنے کے لئے بہت کم۔ بیسویں صدی میں انگریزوں کی اردو تحریروں کا سلسلہ بالکل ختم ہو گیا لیکن اردو زبان سے دلچسپی اور اس کے متعلق تالیفات اب بھی ہوتی رہتی ہیں۔ مثلاً ۱۹۳۲ء میں گراہم بیلی نے ایک مختصر تذکرہ ہسٹری آف اردو لٹریچر کے نام سے انگریزی میں لکھا ہے اور لندن سے شائع کیا ہے سو صفحے کی کتاب ہے۔ ابتدائے زبان اردو اور دکن کی تصانیف اردو سے لے کر عصر حاضر تک کے مشہور اور خاص خاص شاعروں اور مصنفوں کا مختصر حال اور ذکر تصانیف درج کیا ہے۔ نمونہ نثر و نظم کچھ نہیں ہے۔ بعض جگہ غلطیاں بھی کی ہیں۔ لیکن کتاب کی ترتیب واضح و دلچسپ ہے ..... اردو کی رفتار و ترقی کا مجمل اندازہ کرنے کے لئے کافی ہے۔ مصنف نے اپنی تصنیف کے زمانہ (۱۹۳۲ء) کے زندہ موجود مصنفین نثر میں سے کسی کا ذکر نہیں کیا۔ راشد الخیری اور پریم چند تک کو چھوڑ دیا ہے۔ شاعروں میں سے صرف

ڈاکٹر اقبال کو لیا ہے۔ حسرت موہانی اور عزیز لکھنوی کا بھی نام نہیں لیا مگر اہم چلی کے مطالعۂ شاعری اور نقد و نظر کی ایک دلچسپ مثال درج کی جاتی ہے۔

اس نے اپنی کتاب کے دیباچہ میں مختلف صورتوں سے اردو شاعروں کے درجے قائم کئے ہیں اور بہتری و برتری کے اعتبار سے ان کے ناموں کو مرتب کیا ہے۔ لکھتا ہے:۔

(۱) سب سے بڑے شاعر۔ ان مجموعوں کی ترتیب مرتبہ کے لحاظ سے ہے اور مجموعوں کے اندر ناموں کی ترتیب زمانے کے اعتبار سے۔

(الف) میر۔ غالب۔ انیس

(ب) ولی۔ سودا۔ نظیر اکبرآبادی۔ اقبال

(ج) درد۔ میرحسن۔ داغ۔ حالی۔ اکبر

(۲) بہترین غزل گو شعرا۔ (مرتبہ کے لحاظ سے) میر۔ ولی۔ درد۔ غالب مصحفی۔ آتش۔ داغ۔ امیر مینائی۔

(۳) بہترین قصیدہ نویس شعرا۔ (مرتبہ کے لحاظ سے) سودا۔ ذوق نصرتی دکنی

(۴) بہترین مرثیہ گو شعرا۔ (مرتبہ کے لحاظ سے) انیس۔ دبیر۔ مونس۔ خلیق ضمیر اور دکن کے شعرائے مرثیہ ہاشم علی۔ مرزا

(۵) بہترین مثنوی گو شعرا (مرتبہ کے لحاظ سے) میرحسن۔ اثر۔ میر۔ نسیم مومن اور دکن کے شعرا۔ غواصی۔ نصرتی۔ طبعی۔ مہجی۔

(۶) عام شاعری کے اعلیٰ شعرا۔ (بہ ترتیب زمانہ) قلی قطب شاہ بادشاہ گولکنڈہ۔ نظیر اکبرآبادی۔ حالی۔ اکبر۔ کیفی حیدرآبادی۔ اقبال

(۷) گزشتہ ۵۰ برس کے بہترین شعرا (علاوہ مذکورۂ بالا شعرا کے) آزاد

جلالؔ تسلیم۔ اسمٰعیل۔ شاد۔

(۸) گزشتہ ۱۰ برس میں بہترین نظم مسدس حالی ہے، بشرطیکہ انیسؔ کے مرثیوں کو ایک نظم نہ مانا جائے۔

ہم کو ان ترتیبوں سے بعض جگہ اختلاف ہے، لیکن یہ رائے گرامؔ بیلی کے وسیع مطالعہ اور غائر نگاہ کا ثبوت ہے۔ چونکہ اہل یورپ کی اردو زبان میں انشا پردازی کا سلسلہ ختم ہے۔ اس لئے ہم نے یوروپین مصنفین نثر کا ذکر یہیں ختم کر دیا ہے۔ کہ نثر کے متعلق ان کی کارگزاریاں ایک جگہ نظر آجائیں۔

نثر کا تیسرا دور

(۱) مصنفین فورٹ ولیم کالج

۱۸۰۰ء تا ۱۸۲۰ء

۴ مئی ۱۸۰۰ء (۷ ذی الحجہ ۱۲۱۴ھ) کو لارڈ ویلزلی گورنر جنرل ایسٹ انڈیا کمپنی نے کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج کا افتتاح کیا۔ اس سے پہلے کمپنی کے انگریز ملازموں کے لئے اردو کی تعلیم کا کوئی باقاعدہ بندوبست نہ تھا وارن ہیسٹنگز گورنر جنرل اول نے دیسی کالج کے نام سے ایک مدرسہ جاری کیا تھا جس میں انگریز ملازم اور ہندوستانی طلبا فارسی پڑھتے تھے۔ لیکن یہاں اردو یا اور کوئی ملکی زبان نہ پڑھائی جاتی تھی۔ فارسی کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے کمپنی کی طرف سے ہر انگریز ملازم کو تیس روپیہ فی کس دئے جاتے تھے۔ وہ لوگ اردو اپنے طور پر پڑھ لیتے تھے یا انگریز حکام اپنے ماتحتوں کے لئے اردو کی تعلیم کا انتظام کر دیا کرتے تھے۔ اس زمانے میں مغلیہ سلطنت کی زبان فارسی تھی۔ فارسی ہی میں تمام عدالتی و ملکی کاروبار انجام پاتے تھے۔ سلطنت کے اثر سے شمالی ہند میں کثرت سے اور عام طور پر اور کم و بیش تمام ہندوستان میں فارسی تعلیم کا رواج تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کو بھی پہلا اور بڑا تعلق سلطنت مغلیہ ہی سے پیدا کرنا تھا۔ اس لئے انگریز بھی فارسی کی تحصیل پر زیادہ توجہ دیتے تھے لیکن مغلیہ سلطنت اور فارسی زبان کا تنزل اور اردو زبان کی ترقی اس سرعت کے ساتھ جاری تھی کہ لارڈ ویلزلی نے انگریزوں کے لئے اردو کی ضرورت کو محسوس کر لیا۔ اور اس کی باضابطہ تعلیم کا انتظام کر دیا۔ اس ضرورت کے ساتھ ہی

گورنر جنرل کو اس بات کا بھی احساس تھا کہ جو انگریز کمپنی میں ملازم ہو کر آتے ہیں.
وہ ولایت سے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے نہیں آتے اور کاروانی و حکم رانی کے لئے علوم و
فنون کی مہارت ضروری ہے۔ اس لئے اس نے یہ چاہا تھا کہ یہ فورٹ ولیم کالج علوم و
فنون کی اعلیٰ درس گاہ ہو۔ جس میں علمی زبانیں عربی و فارسی و سنسکرت بھی پڑھائی
جائیں۔ اور ملکی زبانیں اردو، بنگالی، مرہٹی وغیرہ بھی، اور یورپین زبانیں انگریزی
لاطینی، یونانی بھی۔ اور علوم و فنون کی تعلیم بھی دی جائے۔ جن میں تاریخ عالم،
تاریخ ہند، جغرافیہ، اصول قانون، شرع اسلام، دھرم شاستر وغیرہ شامل ہوں
لیکن کمپنی نے ایسے عظیم الشان کالج کے مصارف کثیر برداشت کرنے سے
قطعاً انکار کر دیا۔ اس لئے کالج کو صرف زباندانی کا کالج بنانا پڑا۔

ڈاکٹر گل کرائسٹ اس کالج کے پہلے پرنسپل مقرر ہوئے۔ وہ، جیسا کہ پہلے ذکر
آچکا ہے، اردو کے بڑے حامی و ماہر تھے، اور کئی سال پہلے سے اردو کی خدمت کر رہے
تھے۔ کمپنی کے ملازموں کو بھی اپنے طور پر اردو پڑھایا کرتے تھے۔ اب کالج میں باقاعدہ
اردو کی تعلیم شروع کر دی۔ اور اپنی مدد کے لئے ہندوؤں اور مسلمانوں کو بھی مدرس
مقرر کیا۔ اس تعلیم کے ساتھ ہی انھوں نے اردو کی تالیف و تصنیف کا محکمہ بھی
قائم کر دیا۔ اور ہندوستانی اہل زبان اور ماہران فن سے اردو زبان میں ترجمہ و
تصنیف کا کام بھی لینا شروع کر دیا۔ اور ان کتابوں کے چھاپنے کے لئے اردو ٹائپ کا
مطبع بھی قائم کر دیا۔ یہی ہندوستان میں سب سے پہلا چھاپہ خانہ تھا۔[1]

---

[1] فورٹ ولیم کے چھاپہ خانہ کے بعد انگریز پادریوں نے سیرامپور میں مطبع قائم کیا۔ پادری مارٹن نے
انجیل کے عہد جدید کا ترجمہ ۱۸۱۴ء میں یونانی زبان سے اردو زبان میں کیا۔ سیرامپور کے مشنریوں
نے پوری بائبل کا ترجمہ پانچ جلدوں میں ۱۸۱۶ء سے ۱۸۱۹ء تک شائع کیا۔ لکھنؤ میں نواب
غازی الدین حیدر (سال جلوس ۱۸۱۴ء / ۱۲۲۹ھ) کے زمانے میں ٹائپ کا مطبع قائم ہوا۔ (باقی اگلے صفحے پر)

اس وقت تمام ملک میں اردو کی ایک کتاب نثر بھی ایسی نہ تھی جس کو فورٹ ولیم کالج کے نصاب تعلیم میں شامل کیا جاتا۔ مطبوعہ کتاب کا تو اس سے پہلے امکان ہی نہ تھا۔ قلمی کتابوں میں فضلی کی دہ مجلس یا کربل کتھا اور شاہ صاحبان دہلوی کے تراجم قرآن مجید مذہبی کتابیں تھیں۔ انگریزوں کے کام کی نہ تھیں۔ تحسین کی نو طرز مرصع مشکل و ادق تھی اور جو کتابیں متفرق لوگوں نے لکھیں وہ قلمی ہونے کے سبب سے اور غیر مشہور اشخاص کی تصانیف ہونے کی وجہ سے گمنام تھیں۔ اور اب ان کا پتہ چلا ہے تو مشکل سے کوئی کتاب مذہبی تعلیم سے علیحدہ عام لٹریچر (تاریخ، سیرت، فسانہ وغیرہ) کے متعلق تھی اسلئے ڈاکٹر گل کرائسٹ کا اردو زبان پر کتنا بڑا احسان ہے کہ انھوں نے اردو کا سب سے پہلا لٹریچر پیدا کر دیا۔ ہندوستان کے ذی علم و اہل زبان لوگوں کو جمع کیا۔ اور کتابیں لکھوائیں

(بقیہ صفحہ گذشتہ) اس میں سب سے پہلی کتاب ہفت قلزم (فارسی لغت) طبع ہوئی۔ لیتھو کا سنگی مطبع سب سے پہلے ۱۸۳۰ء میں ایک انگریز مسٹر آرچر نے کانپور میں جاری کیا۔ ۱۸۳۵ء میں دہلی میں سنگی مطبع قائم ہوا۔ اور ۱۸۳۶ء میں دہلی سے مولوی محمد باقر (مولانا محمد حسین آزاد دہلوی کے والد) نے دہلی اردو اخبار جاری کیا۔ یہ اردو زبان کا دوسرا اخبار تھا۔ پہلا اردو اخبار مولوی اکرم علی نے کلکتہ سے ۱۸۱۰ء میں نکالا تھا۔ نواب نصیر الدین حیدر (سال جلوس ۱۸۲۷ء ۱۲۴۳ھ) نے مسٹر آرچر کو کانپور سے بلا کر لکھنؤ میں سنگی مطبع قائم کیا جس میں سب سے پہلی کتاب شرح الفیہ چھپی۔ ۱۸۳۷ء میں دہلی میں ٹائپ کا مطبع بھی قائم ہو گیا۔ اس سال کے بعد تمام ہندوستان میں لیتھو کے چھاپے خانے کھلنے لگے۔ اور اخبارات نکلنے لگے۔ آگرہ، میرٹھ، بنارس، بریلی، پنجاب، بمبئی، مدراس وغیرہ میں بڑی کثرت سے مطابع و اخبارات جاری ہو گئے۔ ۱۸۴۹ء میں صرف ممالک مغربی شمالی (یعنی موجودہ یوپی) دہلی اور پنجاب میں سو مطبعے تھے۔ اور ان مقامات پر ۲۳ اخبار اردو کے نکلتے تھے۔ اس سال تمام ہندوستان کے اردو اخباروں اور رسالوں کی تعداد پچاس کے قریب تھی۔ اور صرف ممالک مغربی شمالی میں الہا کتابیں طبع ہوئی تھیں۔ غدر کے اگلے سال ۱۸۵۸ء میں مطبع نولکشور قائم ہوا۔ اور اسی سال (بقیہ صفحہ آیندہ)

ڈاکٹر گلکرائسٹ صرف چار سال اس کالج میں رہے لیکن ان کا شروع کیا ہوا کام جاری رہا ان کے قائم مقام انگریز پرنسپل اور منتظم اس محکمہ تالیف وتصنیف کی نگرانی و سرپرستی کرتے رہے ڈاکٹر صاحب کے بعد کپتان ٹامس روبک کالج کے پرنسپل اور منتظم اس محکمہ تالیف وتصنیف کی نگرانی و سرپرستی کرتے رہے۔ ڈاکٹر صاحب کے بعد کپتان ٹامس روبک کالج کے پرنسپل ہوئے انھوں نے ڈاکٹر صاحب کو بھی ان کی تالیفات میں مدد دی اور خود بھی لغت جہازرانی وغیرہ کتابیں لکھیں جن کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ کپتان ٹیلر اور ڈاکٹر ہنٹر بھی فورٹ ولیم کالج کے اردو پروفیسر تھے ان کی تصنیفات اردو کا ذکر بھی پہلے کیا جاچکا ہے۔ اب کالج کے ہندوستانی مصنفوں کا تذکرہ لکھا جاتا ہے۔

(بقیہ صفحہ گذشتہ) اس مطبع سے اودھ اخبار جاری ہوا۔ یہ اخبار آئندہ چل کر روزانہ ہوگیا اور ملک کے ممتاز اخباروں میں شمار ہونے لگا۔ اور مطبع نولکشور کو اس قدر ترقی ہوئی کہ نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام ممالک مشرقی میں اس سے بڑا مطبع نہ تھا لیکن بعد کو اس مطبع کی مطبوعات میں صحت کتابت اور حسن طباعت کا التزام نہ رہا۔ اس اعتبار سے منشی رحمت اللہ رعد کے مطبع نامی کانپور نے نام پیدا کیا جو انیسویں صدی کے آخر میں قائم ہوا تھا۔ اور بیس سال سے زیادہ ملک کی خدمت کرکے اپنے مالک کے ساتھ ختم ہوگیا۔ اس کی مطبوعات حسن وخوبی کے لحاظ سے ایشیا بھر میں بے نظیر تھیں۔ قدیم مطابع میں مطبع نولکشور کے علاوہ صوفی قادر علی خاں کے مطبع مفید عام آگرہ کو بھی فن طباعت میں بڑی شہرت حاصل ہوئی۔ بیسویں صدی میں متعدد اعلیٰ مطابع جاری ہوئے، کامیاب رہے اور قائم ہیں لیکن موجودہ زمانے میں بلاک کی چھپائی اس قدر عام اور ارزاں ہوگئی ہے کہ تمام سنگی مطابع کی خوشنمائی اس کے سامنے ہیچ ہے۔ عمومیت اس قدر کہ جنتریاں اور دواخانوں کی فہرستیں پوری بلاک چھپائی جاتی ہیں اور ارزانی اتنی کہ بلاک کا چھپا ہوا پورا قرآن مجید ایک روپیہ میں اور حمائل شریف آٹھ آنہ میں دستیاب ہوسکتی ہے۔ یہ مطابع کی مختصر تاریخ ہے۔ اسکی تفصیلات موقع بموقع کتاب کے اندر آئینگی۔

میر اَمَّن دہلوی

میر امّن کا نام میر امان تھا۔ اور امّن تخلص، لیکن میر امّن کے نام سے مشہور ہیں۔ میر امّن فورٹ ولیم کالج کے مصنفوں میں پہلے نہیں ہیں، ان سے پہلے میر بہادر علی حسینی وہاں میر منشی تھے۔ میر امّن کے دوست تھے۔ انہی کے ذریعہ سے میر امّن ملازم ہوئے۔ میر امّن نے کتابیں بھی اوروں سے کم لکھیں یعنی صرف دو باغ و بہار اور گنج خوبی۔ ان میں سے بھی صرف باغ و بہار ہی مشہور ہے۔ دوسری کا نام بھی کم لوگ جانتے ہیں لیکن اکیلی باغ و بہار نے انکے نام کو غیر فانی بنا دیا ہے۔ دلّی کی زبان، اردوے معلّیٰ کے روزمرّہ اور محاورے، بیان کی دلکشی فقروں کی شگفتگی، مکالموں کی دلفریبی، حسبِ موقع اختصار و تطویل، مناظر کی تصویر، یہ سب خوبیاں اس زمانے کے کسی مصنف میں ایسے کمال کے ساتھ یکجا نہیں ہیں۔ میر امّن کے ذاتی حالات کسی تذکرے میں اتنے بھی نہیں ہیں جتنے انھوں نے خود باغ و بہار کے دیباچہ میں لکھدیئے ہیں۔ ہم انہی کے الفاظ میں نقل کرتے ہیں کہ یہ ان کے نمونۂ تحریر کا بھی کام دیں گے۔

"میرے بزرگ ہمایوں بادشاہ کے عہد سے ہر ایک بادشاہ کی رکاب میں پشت بہ پشت جانفشانی بجالاتے رہے اور وہ بھی پرورش کی نظر سے قدر دانی جتنی چاہیئے فرماتے رہے جاگیر و منصب اور خدمات کی عنایات سے سرفراز کر مالامال اور نہال کر دیا۔ اور خانہ زاد موروثی و منصبدار قدیمی زبان مبارک سے فرمایا۔ چنانچہ یہ لقب بادشاہی دفتر میں داخل ہوا۔ جب ایسے گھر کی (کہ سارے گھر اسی گھر کے سبب آباد تھے) یہ نوبت پہنچی کہ ظاہر ہے۔ عیاں راچہ بیاں، تب سورج مل جاٹ نے جاگیر کو ضبط کر لیا۔ احمد شاہ دُرّانی نے گھر بار تاراج کیا۔ ایسی ایسی تباہی کھا کر ایسے شہر سے (کہ وطن اور جنم بھوم میرا ہے اور آنکھ نال وہیں گڑا ہے) جلا وطن ہوا۔ اور ایسا جہاز کہ جس کا ناخدا بادشاہ تھا، غارت ہوا۔ میں بے کسی کے سمندر میں غوطے کھانے لگا۔

ڈوبتے کو تنکے کا سہارا بہت ہے۔ کتنے برس بلدۂ عظیم آباد میں دم لیا۔ کچھ بنی کچھ بگڑی آخر وہاں سے بھی پاؤں اکھڑے۔ روزگار نے موافقت نہ کی، عیال و اطفال کو چھوڑ کر تن تنہا کشتی پر سوار ہوا۔ اشرف البلاد کلکتہ میں آب و دانہ کے زور سے آ پہنچا چندے بیکاری میں گذری۔ اتفاقاً نواب دلاور جنگ نے بلوا کر اپنے چھوٹے بھائی میر محمد کاظم خاں کی اتالیقی کے واسطے مقرر کیا۔ قریب دو سال کے وہاں رہنا ہوا لیکن نباہ اپنا نہ دیکھا۔ تب منشی میر بہادر علی جی کے وسیلے سے حضور تک جان گل کرسٹ صاحب بہادر دام اقبالہ کے رسائی ہوئی۔ بارے طالع کی مدد سے ایسے جوانمرد کا دامن ہاتھ لگا ہے۔ چاہیئے کہ دن کچھ بھلے آویں نہیں تو یہ بھی غنیمت ہے کہ ایک ٹکڑا کھا کر پاؤں پھیلا کر سو رہتا ہوں۔ اور گھر میں دس آدمی چھوٹے بڑے پرورش پا کر دعا اس قدردان کو کرتے ہیں۔ خدا قبول کرے۔"

باغ و بہار کے قصہ کا ماخذ اور طرز تحریر بھی خود میر امن کی زبانی یہ ہے

"قصہ چہار درویش کا ابتدا میں امیر خسرو دہلوی نے اس تقریب سے کہا کہ حضرت نظام الدین اولیا زری بخش جو انکے پیر تھے (اور درگاہ ان کی قلعہ سے تین کوس لال دروازے کے باہر مٹیا دروازے سے آگے لال بنگلے کے پاس ہے) انکی طبیعت ماندی ہوئی۔ تب مرشد کے دل بہلانے کے واسطے امیر خسرو یہ قصہ ہمیشہ کہتے اور تیمارداری میں حاضر رہتے۔ اللہ نے چند روز میں شفا دی۔ تب انھوں نے غسل صحت کے دن یہ دعا دی کہ جو کوئی اس قصے کو سنے گا، خدا کے فضل سے تندرست رہے گا۔ جب سے یہ قصہ فارسی میں مروج ہوا۔ اب خداوند نعمت صاحب مروت، نجیبوں کے قدردان جان گل کرسٹ صاحب نے (کہ ہمیشہ اقبال ان کا زیادہ رہے جب تک گنگا جمنا بہے) لطف سے فرمایا کہ قصے کو ٹھیٹ ہندوستانی گفتگو میں جو اردو کے لوگ ہندو مسلمان، عورت مرد، لڑکے بالے، خاص و عام، آپس میں بولتے چالتے ہیں

ترجمہ کرد. موافق حکم حضورؐ کے میں نے بھی اسی محاورے سے لکھنا شروع کیا جیسے کوئی باتیں کرتا ہے :۔

باغ و بہار ۱۸۰۱ء ۱۲۱۵ھ میں لکھنی شروع کی اور ۱۸۰۲ء ۱۲۱۷ھ میں ختم کی ۔ ۱۸۰۳ء میں پہلی بار طبع ہوئی ۔ باغ و بہار تاریخی نام ہے (۱۲۱۷ھ نکلتے) میر امن نے فارسی کے قصہ کو اپنی کتاب کی اصل بتایا ہے ۔ لیکن مولوی عبدالحق صاحب نے اپنے مقدمہ باغ و بہار میں ثابت کیا ہے کہ میر امن نے باغ و بہار کو چہار درویش سے ترجمہ نہیں کیا ، بلکہ تحسین کی نوطرز مرصع کو دیکھ کر لکھا ہے ۔ لیکن تحسین کی ثقیل عبارت کو سلیس کر دیا ہے ۔ غیر ضروری باتوں کو چھوڑ دیا ہے ۔ ضروری باتوں کا اضافہ کیا ہے ۔ حسب ضرورت مختصر بیان کو مفصل اور مفصل کو مختصر کر دیا ہے ۔ اور بہ حیثیت مجموعی کتاب کو اپنا بنا لیا ہے ۔ میر امن نے قواعد زبان کی پابندی سے زیادہ روزمرہ اور محاورہ اور بول چال کا خیال رکھا ہے ۔ اس کے علاوہ موجودہ اردو کے مقابلے میں میر امن کی زبان میں تذکیر و تانیث کا اختلاف ، قدیم محاورے ، ہندی کے الفاظ پائے جاتے ہیں جو اب متروک ہیں ۔

اسی قصے کو اسی سال (۱۲۱۷ھ) میں ایک اور شخص محمد عوض زرین نے لکھا ہے ۔ اس نے "قصہ چار درویش" کو پہلے فارسی میں لکھ کر راجہ رام دین برادر راجہ سیتل پرشاد کو دکھایا ، اور راجہ کی فرمائش سے پھر اس کو اردو میں لکھا ۔ عجیب بات ہے کہ زرین نے تحسین کی کتاب کے دیکھنے کا ذکر نہیں کیا لیکن نام وہی تحسین والا رکھا ہے یعنی نوطرز مرصع ۔ اور عجیب تر یہ کہ زرین کو میر امن کی کتاب کی خبر نہیں ۔ لیکن اس نے تاریخ تصنیف وہی میر امن والی نکالی ہے ۔ یعنی باغ و بہار ۔ دیباچہ میں لکھتا ہے :۔

بنا کر یہ گلدستۂ روزگار ... لکھی اس کی تاریخ باغ و بہار

محمد عوض زرین نے وہی چار درویشوں کے قصے لکھے ہیں ، لیکن بہت مختصر قافیہ پیمائی کی ہے لیکن عبارت بالکل سادہ ہے ۔ کوئی لطف اور کوئی خصوصیت ان دونوں

کتابوں کے مقابلے میں نہیں ہے۔ البتہ کتاب کے اندر جابجا بلکہ اکثر صفحوں پر کئی کئی جگہ دو دو چار چار شعر لکھے ہیں جو مثنوی کی طرز میں ایک ہی بحر کے ہیں اور بیان داستان کا جزو ہیں۔ یہ نظم نثر سے زیادہ دلچسپ ہے۔

میرامن کی باغ و بہار اس قدر مقبول ہوئی کہ انگریزی، فرانسیسی، پرتگالی، لاطینی زبانوں میں ترجمے ہوئے، اردو میں متعدد شاعروں نے نظم کیا۔ میرامن کی زبان و بیان کو ہر ہندوستانی اور یورپین نے سراہا ہے۔ فرانسیسی مستشرق گارسن دتاسی نے اپنے خطبات میں بار بار باغ و بہار کا ذکر کیا ہے اور اس کی خوبیاں گنائی ہیں ایک جگہ کہتا ہے: "اس کتاب کے پڑھتے وقت آپ بہت مفید اور کار آمد باتیں پائیں گے کہ ان قصوں میں ہر صفحہ پر آپ کو قومی خصوصیات کے متعلق ایسی باتیں ملیں گی جو تمہیں اصلی ہندوستان اور خاص کر اسلامی ہندوستان کے سمجھنے میں بہت کار آمد ہوں گی۔" دوسرے خطبہ میں باغ و بہار کی ایک خصوصیت کا ذکر کرتا ہے اور اس کو اعتراض کے طور پر بیان کرتا ہے۔ بات یہ ہے کہ گارسن دتاسی عیسائی ہے اس کو اسلام کی اشاعت و تبلیغ پسند نہیں اور اس بات کو قصے میں عجیب سمجھتا ہے لیکن میرامن مسلمان ہیں۔ قصے کے کسی مسلمان شخص کو مسلمان دکھانا یا بقول دتاسی اسلام کی تبلیغ کرنا ان کے لئے بالکل درست بلکہ فطری بات ہے۔ ہم گارسن دتاسی کی تنقید درج کرتے ہیں، اور اس نے باغ و بہار کے جن فقروں کا حوالہ دیا ہے ان کو میرامن کے الفاظ میں باریک قلم سے نقل کرتے ہیں یہ مختصر ٹکڑا باغ و بہار کے مکالمات کی بھی چھوٹی سی دلچسپ مثال ہے۔

گارسن دتاسی کہتا ہے: "باغ و بہار کی نسبت میں اپنے ۱۸۵۲ء کے خطبے میں

لہ خطبات گارسن دتاسی مطبوعہ انجمن ترقی اردو

تہ یہ عبارت بھی مع باغ و بہار کے اقتباس کے خطبات گارسن دتاسی سے ماخوذ ہے

ذکر کر چکا ہوں۔ اس جگہ پھر ایک امر کی جانب اشارہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں جو پہلے بھی عرض کر چکا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ اسلامی قصوں میں آپ ہمیشہ دیکھیں گے کہ تبلیغ اسلام کی جانب کسی نہ کسی پیرایہ میں ضرور اشارہ کیا جاتا ہے۔ اور غنائی شاعری تصوف، عشق مجازی، اور ہمہ اوست کے مسائل سے آگے نہیں بڑھتی۔ قصوں میں اسلامی عقائد اثباتی نوعیت کے ساتھ پیش کئے جاتے ہیں، اور اسلام کی جانب غیر مسلموں کو نہایت مؤثر انداز میں رجوع کیا جاتا ہے۔ مثلاً باغ و بہار میں جہاں بخارا کے تاجر کا ذکر ہے کہ اسے کیونکر دختر وزیر کی وساطت سے مصائب سے نجات ملتی ہے، تو وہاں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ تاجر دوگانہ شکرانے کا رو بقبلہ ہو کر پڑھنے لگا۔ وزیر کی لڑکی یہ حرکات و سکنات دیکھ کر متعجب ہوتی ہے اور اس تاجر سے دریافت کرتی ہے کہ وہ یہ کیا کر رہا ہے؟ تاجر جواب دیتا ہے:۔

"جس خالق نے ساری خلقت کو پیدا کیا اور تجھ سی محبوبہ سے میری خدمت کروائی اور تیرے دل کو مجھ پر مہربان کیا اور زنداں سے خلاص کروایا، اسکی ذات لا شریک ہے اسکی میں نے عبادت کی اور بندگی بجا لایا اور ادائے شکر کیا۔ یہ بات سن کر کہنے لگی، تم مسلمان ہو؟ میں نے کہا، شکر الحمدللہ۔ بولی میرا دل تمہاری باتوں سے خوش ہوا میرے تئیں بھی سکھاؤ اور کلمہ پڑھاؤ، میں نے دل میں کہا الحمدللہ کہ یہ ہمارے دین کی شریک ہوئی۔ غرض میں نے لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ پڑھا اور اس سے پڑھوایا

(باغ و بہار)

باغ و بہار اُس زمانے کے تمدن و معاشرت کا آئینہ ہے۔ اسلامی عقائد اور ضعیف الاعتقادیاں، رسم و رواج، طعام و لباس، مشاغل و معمولات، آداب و اخلاق، غرض ہر قسم کے حالات پر روشنی پڑتی ہے۔ میر امن شاعر بھی تھے، لیکن پیشہ ور نہیں صرف تفریحی و اتفاقی۔ امن اور لطف دونوں تخلص تھے۔

میرامن کی دوسری کتاب گنج خوبی ہے۔ یہ ملا حسین واعظ کاشفی (مصنف انوار سہیلی) کی اخلاق محسنی کا ترجمہ ہے۔ اس کے متعلق میر امن خود لکھتے ہیں ؛-

لیکن فقط فارسی کے ہو بہو معنی کہنے میں کچھ لطف اور مزہ نہ دیکھا اس لئے
اس کا مطلب لیکر اپنے محاورے میں سارا احوال بیان کیا۔" (گنج خوبی)

یہ کتاب بھی ڈاکٹر گل کرائسٹ کی فرمائش سے باغ و بہار کے بعد سنہ ۱۸۰۲ء/۱۲۱۷ھ میں لکھی تھی لیکن اس کو شہرت و مقبولیت نصیب نہوئی۔ معلوم ہوتا ہے ڈاکٹر صاحب نے اس کو چھپوایا بھی نہیں۔ مدتوں بعد گنج خوبی کا ایک ایڈیشن مطبع احمدی کلکتہ سے سنہ ۱۸۴۶ء/۱۲۶۲ھ میں بڑی تقطیع کے ۲۶۲ صفحوں میں شائع ہوا۔ اس کی ایک کاپی لائبریری پٹنہ کے الاصلاح لائبریری سکشن میں محفوظ ہے۔ اسکے بعد سنہ ۱۸۷۵ء/۱۲۹۲ھ میں مطبع محبوب بمبئی میں چھپی۔ اس کا ایک بوسیدہ نسخہ مولوی سید محمد صاحب بی اے (عثمانیہ) کو کتب خانہ آصفیہ (حیدر آباد دکن) میں ملا ہے جس سے انھوں نے ایک حکایت بطور نمونہ اپنی تالیف (ارباب نثر اردو) میں نقل کی ہے۔ کتاب کے نادر و نایاب ہونے کے سبب سے ہم بھی اس حکایت کو درج کرتے ہیں۔ کیا ب چیز کا جس قدر حصہ جتنا مشتہر ہو جائے غنیمت ہے ؛-

کہتے ہیں کہ ایک بزرگ نے جب اپنی زندگی کی امانت اجل کے فرشتے کو سونپی اور اسباب اپنی ہستی کا اس سرائے فانی سے منزل باقی میں پونہچایا، کسو شخص نے انھیں خواب میں دیکھا، اور پوچھا کہ مرنے کے بعد تم پر کیا کیا واردات گذری اور اب کیا حال ہے جواب دیا کہ ایک مدت تئیں عذاب کے عقاب کے پنجے میں سختی کے شاہین کے چنگل میں گرفتار تھا، ایک بارگی کریم کے کرم سے اس حالت سے چھٹکارا ہوا، اور سارے گناہ معاف ہوگئے۔ سائل نے پھر سوال کیا کہ اس کا کیا سبب ہے اور باعث کے تجھ میں معلوم ہو تو بیان کرو کہ کس کے وسیلے سے نجات پائی۔ بولے کہ ایک میدان

میں مسافر خانہ بنایا تھا۔ شاید کوئی غریب راہ چلتا جیٹھ کے دن میں دوپہر کی دھوپ میں تونسا ہوا اُس کے سایہ میں آنکر بیٹھا، اس نے کوئی دم آرام پایا، جب ٹھنڈی ہوا اور راہ کی ماندگی سے ہرا ہوا، خوش ہو کر نہایت عاجزی سے بدل دعا کی کہ اے بار الہا اس مکان کی بنا کرنے والے کے گناہ بخش، اور اسکی روح کو فردوس کی چھاؤں میں جگہ دے۔ وہیں اسکی دعا کا تیر قبولیت کے نشانہ پر درست بیٹھا میری آمرزش ہوئی، اور جہنم کے گڑھے سے نکال کر بہشت کے غرفے میں رہنے کا حکم ہوا۔ بیت

ہر چند کہ سب کاموں میں میں غور کرتا ہوں
نیکی ہی بھلی سب میں ہے اور باقی ہے سب پوچ

سید حیدر بخش حیدری

فورٹ ولیم کالج کے مصنفوں میں حیدری نے سب سے زیادہ کتابیں لکھی ہیں، لیکن نہ سب کی سب شائع ہوئیں نہ سب کے قلمی نسخے ملتے ہیں۔ حیدری کے آبا و اجداد نجف اشرف سے ہندوستان آئے دہلی میں سکونت اختیار کی۔ انکے والد کا نام سید ابوالحسن ہے۔ معاش سے پریشان ہو کر ان کے والد لالہ سکھدیو رائے کے ساتھ دہلی سے بنارس چلے گئے۔ اور وہیں رہنے لگے بنارس میں نواب علی ابراہیم خاں خلیل (مصنف تذکرہ گلزار ابراہیم) عدالت کے جج تھے حیدری کی تعلیم و تربیت نواب صاحب کی صحبت میں ہوئی۔ جب فورٹ ولیم کالج کا افتتاح ہوا اور وہاں ہندوستانی منشیوں کی ضرورت ہوئی تو حیدری نے اردو میں قصہ مہر و ماہ لکھا اور اس کو لیکر کلکتہ پہنچے۔ ڈاکٹر گل کرائسٹ کے سامنے اپنی تصنیف پیش کی۔ انھوں نے بہت پسند کی اور حیدری کو ملازم رکھ لیا۔ حیدری ۱۸۱۴ء (۱۲۲۹ھ) سے پہلے اس ملازمت سے سبکدوش ہو کر بنارس واپس آگئے۔ اور ۱۸۲۳ء (۱۲۳۸ھ) میں انتقال کیا۔ حیدری کی تصنیفات کی فہرست یہ ہے :-

(۱) قصہ مہر و ماہ حیدری کی سب سے پہلی تصنیف ہے۔ اوائل ۱۲۱۴ھ/اوسط ۱۷۹۹ء میں لکھی۔ اس کا کوئی قلمی یا مطبوعہ نسخہ دستیاب نہیں ہوتا۔

(۲) قصہ لیلیٰ و مجنوں۔ امیر خسرو کی فارسی مثنوی لیلیٰ و مجنوں کا اردو ترجمہ ہے ۱۲۱۴ھ/۱۸۰۰ء میں تمام ہوا۔ یہ بھی مفقود ہے۔

(۳) ہفت پیکر۔ حیدری کی تصنیف منظوم ہے۔ نظامی گنجوی کی اسی نام کی مثنوی کے جواب میں مثنوی ہے۔ ۱۲۲۰ھ/۱۸۰۵ء میں لکھی گئی۔ مرزا کاظم علی جوان نے اسکی تاریخ تصنیف کہی تھی "یہ جان تازہ ہفت پیکر یہ ہوئی" (۱۲۲۰ھ) یہ بھی اب ناپید ہے۔

(۴) تاریخ نادری، فارسی تصنیف تاریخ جہاں کشائے نادری[1] مصنفہ مرزا محمد مہدی استرآبادی کا اردو ترجمہ ہے۔ مہدی نادر شاہ کا مصاحب تھا۔ اپنے آقا کے حالات (تا وفات نادر شاہ ۱۱۶۰ھ/۱۷۴۷ء) لکھے ہیں۔ یہ کتاب تاریخ نادری کے نام سے مشہور ہے۔ یہی نام حیدری نے اپنے ترجمہ کا رکھا۔ یہ ترجمہ ۱۲۲۴ھ/۱۸۰۹ء میں ختم ہوا۔ یہ بھی نایاب ہے۔

(۵) گلزار دانش۔ شیخ عنایت اللہ کی فارسی تصنیف بہار دانش کا اردو ترجمہ ہے۔ ترجمہ کا سنہ دریافت نہ ہوا۔ فارسی کی تصنیف ۱۰۶۱ھ/۱۶۵۱ء میں ہوئی ہے۔ جہاندار شاہ اور بہرہ ور بانو کا قصہ ہے۔ عنایت اللہ نے دیباچہ میں لکھا ہے کہ یہ قصہ فرضی نہیں سچا واقعہ ہے۔ بہر حال حیدری کی گلزار دانش بھی اب گم ہے۔

(۶) گلدستۂ حیدری۔ میں حیدری کی متفرق تالیفات جمع ہیں یعنی مجموعۂ مراثی حکایات و لطائف، دیباچۂ مہر و ماہ، دیباچۂ لیلیٰ و مجنوں، غزلیات و قصائد وغیرہ

---

[1] "تاریخ جہاں کشا" کے نام سے فارسی کی ایک اور تاریخ بھی مشہور ہے۔ ان دونوں کو خلط ملط نہ کر لیا جائے وہ فارسی تاریخ اس فارسی تاریخ سے پانسو برس پہلے کی لکھی ہوئی ہے۔ ابن عطا ملک جوینی نے چنگیز و ہلاکو کے حالات ۶۵۸ھ/۱۲۶۰ء میں لکھے ہیں۔ جوینی بھی ہلاکو خاں کا ملازم و مصاحب تھا۔ جیسے مہدی نادر شاہ کا۔

یہ کتاب بھی طبع نہیں ہوئی اور کمیاب ہے۔

(۷) گلشن ہند، شعرائے اردو کا تذکرہ ہے جو حیدری نے ۱۲۱۴ھ/۱۸۰۱ء میں ختم کیا۔ عجیب اتفاق ہے کہ فورٹ ولیم کالج ہی کے ایک اور متوسل میرزا علی لطف نے اسی زمانے میں شعرائے اردو کا ایک تذکرہ لکھا ہے اور اس کا نام بھی گلشن ہند رکھا ہے۔ لطف کا تذکرہ ۱۲۱۵ھ/۱۸۰۱ء میں تمام ہوا ہے۔ دونوں نے اختتام تالیف کی جو تاریخیں نکالی ہیں ان سے یہی سنہ نکلتے ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ حیدری نے اپنی تالیف لطف سے ایک سال پہلے پوری کی۔ حیدری نے یہ قطعۂ تاریخ لکھا ہے۔

مرتب کر چکا جب تذکرہ میں — زروئے حق یہ بولے شیخ اور رند
کہی تاریخ اس کی حیدری خوب — "اسے کہتا ہے ہر یک گلشن ہند"

۱۲۰۶
۸
۱۲۱۴ھ

اور میرزا علی لطف کا قطعہ یہ ہے:-

ہر ایک گل ہمیشہ بہار اس حدیقہ کا — کہتا ہے یوں خزاں سے کہ تو کیا پلشت[1] ہے
حیران پھرے ہیں بے سر و پا بہمن اور دے — تاریخ اس کی جب سے کہ "رشک بہشت ہے"[2]

۱۲۲۷ — ۱۲
۱۲
۱۲۱۵

---

[1] پلشت۔ ذلیل و زبوں۔ [2] مؤلف ارباب نثر اردو کو (جن کی تالیف سے یہ حالات اور اقتباسات ماخوذ ہیں) "رشک بہشت" سے تاریخ نکالنے میں غلط فہمی ہوئی۔ انھوں نے لکھا ہے کہ "جب" کے اعداد کا تخرجہ کیا جائے تو سنہ ۱۲۱۵ھ نکلتا ہے۔ "رشک بہشت" کے اعداد ۱۲۲۷ ہیں۔ "جب" کے ۵ عدد گھٹائے جائیں گے تو ۱۲۲۲ بچیں گے...... قطعہ کے چوتھے مصرع میں (جب سے) کا اشارہ جمع کرنے کی طرف ہو سکتا ہے تفریق کی طرف نہیں۔ انھوں نے قطعہ کے تیسرے مصرع پر غور نہیں کیا۔ بہمن اور دے کے بے سر و پا ہونے سے یہ مقصود ہے کہ بہمن کا سر (ب) اور (دے) کا پاؤں (ے) لیکر ان کے ۱۲ عدد تفریق کئے جائیں گے۔ — قادری

حیدری کا یہ تذکرہ کمیاب ہے۔ انگلستان میں اس کی دو کاپیاں ہیں۔ ان میں سے برٹش میوزیم کے نامکمل نسخہ سے تھوڑا سا اقتباس ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور (پروفیسر جامعہ عثمانیہ حیدرآباد) نے مولوی سید محمد صاحب کو بھیجا تھا جو انھوں نے "ارباب نثر اردو" میں درج کیا ہے۔ اس میں سے صرف مؤلف (حیدری) کا حال ہم نقل کرتے ہیں:۔

احوال مؤلف۔ اس احقر نے موافق اپنی محنت و مشقت کے چھ سات برس میں ان بزرگوں کے نام مع اشعار و تخلص کے جمع کئے اور کئی جز بخوبی تمام لکھے۔ افسوس ہے کہ دو جز حرف شین سے لے کر حرف ی تک خدا جانے کیا ہوئے۔ اس واسطے نوبت تحریر حرف ی تک نہ پہونچی۔ انشاء اللہ تعالیٰ اگر زمانہ اسی صورت سے قدرے رفاقت کرتا ہے تو یہ خاکسار پھر نئے سرے احوال ان شعراؤں کا خاطر خواہ لکھتا ہے۔ اور یہ جلد دو چار جز کی جو کلام و ابیات سے تیار ہوئی سو دستگیری سے منشی میر بہادر علی صاحب قبلہ دام اقبالہ کی کہ وہ دستگیر درماندگاں حامی بے کساں ہے۔ اللہ تعالیٰ دنیا میں خوش و خرم رکھے اور مشکل کشائی اس کی مشکل کشا کیا کرے بحق محمد و آلہ الامجاد۔

حیدری نے اپنے تذکرہ میں میر شیر علی افسوس کا حال دو سطروں میں لکھا ہے اور میرزا سودا دہلوی کا ایک سطر میں۔ اس حساب سے بیشک شین سے ی تک دو جز ہوتے ہونگے اور الف سے سین تک بھی دو جزو سے زیادہ کیا ہوں گے۔ گویا پورا تذکرہ چار پانچ جزو کا ہوا۔ حالانکہ لطف کا تذکرہ باوجود پیشتر کی قطع دبریدکے دو سو صفحوں پر طبع ہوا ہے۔ البتہ حیدری کی عبارت سادہ و سلیس ہے اور لطف کی مقفّٰی اور پیچدار (جیسا کہ آگے نمونے سے معلوم ہوگا)

(۸) طوطا کہانی۔ حیدری کی شہرت ان کی دس تالیفات میں سے دو کتابوں کے سبب

سے ہے: جن میں سے ایک "طوطا کہانی" ہے اس کے متعلق خود حیدری کا بیان ہے

"بہ موجب فرمایش صاحب موصوف (یعنی گل کرائسٹ) کے محمد قادری کے طوطی نامہ کا جس کا ماخذ طوطی نامہ ضیاء الدین نخشبی ہے زبان ہندی میں موافق محاورہ اردوے معلیٰ کے عبارت سلیس و خوب الفاظ رنگین و مرغوب میں ترجمہ کیا اور نام اس کا طوطا کہانی رکھا۔"

ہم نے طوطی نامہ اور اس کے تراجم کا ذکر اسی تاریخ اردو کے پچھلے صفحات میں متن و حاشیہ میں کر دیا ہے۔ حیدری کی طوطا کہانی ١٢١٥ھ/١٨٠١ء میں لکھی گئی اور ١٨٠٢ء میں شائع ہو کر کالج کے نصاب میں شامل کی گئی۔ یہ کتاب نہایت مقبول ہوئی اور بار بار مختلف مطابع میں چھپی۔ ١٨٥٣ء میں ڈنکن فاربس نے لندن سے اس کا نہایت خوبصورت ایڈیشن شائع کیا جی اسمال نے انگریزی میں ترجمہ کیا مختصر نمونہ یہ ہے۔

جب سورج چھپا اور چاند نکلا خجستہ باسینہ پر سوز چشم گریاں آہیں بھرتی ہوئی طوطے کے پاس گئی اور کہنے لگی اے سبز پوش طوطے میں عشق کے غم سے موئی جاتی ہوں اور تو ہر ایک شب میری نصیحت اور گفتگو میں کھو دیتا ہے۔ فرد

نصیحت کی باتیں نہ مجھ کو سنا　　　میں عاشق ہوں مجھ کو نصیحت سے کیا

طوطا کہنے لگا اے خجستہ یہ کیا کہتی ہے۔ دوستوں کی بات ماننا چاہئے کیونکہ جو کہنا دوستوں کا نہیں مانتا خراب ہوتا ہے اور پشیمانی کھینچتا ہے"

(٩) آرایش محفل، حیدری کی دوسری مشہور کتاب ہے۔ داستان حاتم طائی کی سات سیروں کا فسانہ ہے اس لئے عبد الغفور نساخ نے اپنے تذکرہ "سخن شعرا" میں حیدری کی اس کتاب کا نام ہفت سیر حاتم لکھا ہے۔ حیدری نے ١٢١٦ھ/١٨٠٢ء میں ڈاکٹر گل کرائسٹ کی فرمایش کے مطابق فارسی کی داستان کو اردو میں لکھا محض ترجمہ نہیں کیا۔ بلکہ کمی و بیشی کر کے نئی اور زیادہ دلچسپ داستان بنا دی۔ چنانچہ کہتے ہیں

"زبان ریختہ میں اپنی طبع کے موافق اس کتاب سے جو ہاتھ لگی تھی ترجمہ نثر میں کیا اور اس کا نام آرایش محفل رکھا، مگر اس میں اپنی طبیعت سے جہاں جہاں موقع اور مناسب پایا وہاں زیادتیاں کیں تاکہ قصہ طولانی ہو جائے اور سننے والوں کو خوش آئے۔"

اسی نام سے ایک کتاب میر شیر علی افسوس نے لکھی ہے۔ وہ بالکل الگ چیز ہے، اور حیدری کی کتاب کے کئی سال بعد ۱۲۲۰ھ/۱۸۰۵ء میں لکھی گئی ہے۔ اس زمانے کے لوگوں کی یہ عجیب عادت ہے کہ کسی مشہور کتاب کے نام پر اپنی کتاب کا نام رکھ دیتے ہیں، خواہ کتنا ہی ناموزوں بے محل اور بے ضرورت ہو۔ محمد عوض زرین نے تحسین کی کتاب نوطرز مرصع کا نام لے لیا۔ لطف و حیدری دونوں نے اپنے تذکروں کا نام گلشنِ ہند ہی رکھا خواہ کسی نے کسی سے لیا ہو۔ افسوس نے بھی حیدری والا نام آرایش محفل ہی پسند کیا حالانکہ افسوس کی کتاب "مملکت ہندوستان کی تاریخ ہے" آرایش محفل" کا نام تاریخ سے زیادہ قصہ کہانی کے لئے موزوں تھا۔ زرین کی عبارت میں سجع و ترصیع نہیں ہے پھر اس کو "نوطرز مرصع" کہنے کی کیا ضرورت تھی۔[1] گلشن ہند کا لفظ تذکرۂ شعرا کا مترادف یا مُشعر نہیں ہے کہ خواہ مخواہ یہی نام ذہن میں آئے یا موزوں معلوم ہو۔

حیدری کی آرایش محفل نہایت دلچسپ خوبصورت سلیس روزمرہ میں لکھی گئی ہے اس لئے بہت مقبول ہوئی اور کثرت سے شائع ہوئی۔ نمونہ یہ ہے۔

چند روز بعد جب وہ لڑکی شعور دار ہوئی تو اپنے ذہن کی رسائی اور نیک بختی کے باعث سے دائی سے کہا کہ اے مادر مہربان، دنیا مانند حباب ہے، اس کا ٹھکانا

---

[1] اگر مولانا عبدالحق کے قیاس کے مطابق محمد عوض زرین نے خود اپنی کتاب کا یہ نام نہ رکھا بلکہ مطبع نولکشور والوں نے کتاب چھاپتے وقت نوطرز مرصع نام تجویز کر دیا ہو تو اہل مطبع بھی اُسی زمانے کے لوگ ہیں۔ اور ہمارے اعتراض کی زد میں ہیں (قادری)

کچھ بڑی بات نہیں۔ اس قدر دولت تنہا لیکر میں کیا کروں گی مصلحت یہی ہے کہ اس کو خدا کی راہ میں لٹا دوں اور آپ کو آلائش دنیاوی سے پاک رکھوں اور شادی نہ کروں بلکہ یادِ خدا میں مصروف رہوں۔ اس واسطے تم سے پوچھتی ہوں کہ اس سے کس طرح چھٹکارا پاؤں جو مناسب جانو کہو۔ دائی نے کہا، اے جانِ پدر تو ان سات سوالوں کا اشتہار لکھ کر دروازے پر چپکا دے اور یہ کہہ کہ جو کوئی میرے ساتوں سوال پورے کرے گا میں اس کو قبول کروں گی اور وہ سوال یہ ہیں۔ پہلا سوال یہ ہے کہ وہ کیا ہے جو ایک بار دیکھا دوسری بار دیکھنے کی ہوس ہے۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ نیکی کر اور دریا میں ڈال۔ تیسرا سوال یہ ہے کہ کسی سے بدی نہ کر اگر کرے گا تو وہی پاوے گا۔ چوتھا سوال یہ ہے کہ سچ کہنے والے کو ہمیشہ راحت ہے۔ پانچواں سوال یہ ہے کہ کوہ ندا کی خبر لاوے۔ چھٹا سوال یہ ہے کہ وہ موتی جو مرغابی کے انڈے کی برابر بالفعل موجود ہے اس کی جوڑی پیدا کرے۔ ساتواں سوال یہ ہے کہ حمام بادگرد کی خبر لاوے۔ حسن بانو نے دائی کی اس بات کو پسند کیا اور خوش ہو کر دل میں کہا وہ ایسا کون ہے جو ان ساتوں کو بہم پہنچائے گا۔

(۱۰) گلِ مغفرت، زمانۂ تصنیف کے اعتبار سے حیدری کی کتابوں میں آخری کتاب ہے۔ اور فورٹ ولیم کالج کے لئے نہیں لکھی گئی۔ ملا حسین واعظ کاشفی (مصنف انوارِ سہیلی و اخلاقِ محسنی و تفسیرِ حسینی) کی تصنیف روضۃ الشہدا نہایت مشہور اور اپنے موضوع کی بے نظیر کتاب ہے۔ اس میں شہدائے اسلام اور خصوصاً شہدائے کربلا کے حالات ہیں۔ جن کو دس ابواب میں لکھا ہے اس کو دہ مجلس بھی کہتے ہیں۔ اس کتاب سے اردو میں مختلف ترجمے اور تالیفیں ہوئی ہیں۔ اور وہ بھی اکثر دہ مجلس کے نام سے مشہور ہوئی ہیں فضلی کی کربل کتھا بھی کاشفی کی کتاب سے ماخوذ ہے۔ اور وہ بھی دہ مجلس کہلائی جاتی ہے۔ حیدری کی گلِ مغفرت میں بھی روضۃ الشہدا سے شہدائے

کربلا کے حالات لئے گئے ہیں۔ جیسا کہ خود حیدری کہتے ہیں:۔

"صاحبان درد و غم و مبتلایان رنج و الم پر ظاہر و ہویدا ہووے کہ اس حیدر بخش حیدری کی کتاب گلشن شہیداں سے جس کو پہلے روضۃ الشہدا سے زبان ریختہ میں ترجمہ کر چکا تھا۔ اب شہر محرم الحرام کی بیسویں تاریخ سن بارہ سو ستائیس ہجری میں جناب فیض مآب گل گلزار معانی، شمع بزم نکتہ دانی، بحر سیادت و امانت، سرو جوئبار گلشن شرافت و نجابت، مولوی سید حسین علی صاحب جونپوری زاد الطافہ کے ارشاد کرنے سے جن کی خدمت فیض درجت میں اس ہیچ مداں کو ایک رسوخ دلی و یگانگی باطنی ہے اس نسخہ دہ مجلس کو انتخاب کیا اور نام اس کا گل مغفرت رکھا۔ اس لئے کہ ہر ایک خاص و عام کی نظر اشرف سے گزرے، مقبول خاطر ہوئے بحق محمد و آلہ الامجاد۔"

گل مغفرت ۱۲۲۷ھ / ۱۸۱۲ء میں لکھی گئی۔ اور اسی سال کلکتہ سے شائع ہوئی۔ ۱۸۴۵ء میں کسی فرانسیسی نے فرنچ زبان میں ترجمہ کر کے شائع کیا تھا۔ گل مغفرت اب کہیں نہیں ملتی۔ مولف ارباب نثر اردو کو ایک نسخہ مطبوعہ ۱۲۷۷ھ / ۱۸۶۰ء ملا ہے اور انہوں نے اس کا اقتباس درج کیا ہے۔ ہم بھی اس کو اس خیال سے نقل کرتے ہیں کہ اس کتاب کا اتنا نمونہ بھی اور کہیں دستیاب نہ ہوا۔

کتاب ایوان الرضا میں یوں لکھا ہے کہ اے اہل بیت رسالت کے ہوا خواہو والے آل عبا کے ماتم دارو، ماہ محرم میں گریہ و زاری کرو خوشی و خرمی کو دل میں راہ نہ دو حق تعالیٰ اس رونے اور غم کرنے کا اجر عظیم دے گا، بہشت بریں سا مکان عطا فرمائے گا۔ کہتے ہیں کہ عمرو بن لیث خراسان کے بادشاہ کا ہمیشہ سے یہ معمول و دستور تھا کہ جب کوئی امیر سو سوار مکمل و مسلح اپنے ساتھ لا کر موجودات دیتا ایک گرز طلائی سے سرفراز ہوتا۔ ایک دن اس کے لشکر کی نظر ثانی ہوئی

ایک سو چوبیس سردار صاحب گرز شمار کئے گئے۔ عمرو بن لیث اس فوج کو دیکھ کر یہاں تلک رو یا کہ غش کھا گیا۔ جب ہوش میں آیا، ایک وزیر نے ہاتھ جوڑ کر پوچھا، اے بادشاہ تجھے کیا ہو گیا، ایسا کیا حادثہ تجھ پر پڑا؟ اس نے کہا کہ اے وزیر نیک تدبیر، یہ فوج دریا موج دیکھ کر میں نے جناب امام حسین علیہ السلام کو یاد کیا اور جی میں یہ گزرا کہ اگر اس لشکر فتح پیکر سے جناب سید الشہدا کے ساتھ کربلائے معلیٰ میں ہوتا تو ان کافرِ بد نہادوں کو مارتا، آپ کے ساتھ فتح و نصرت سے پھرتا۔ حاصل کلام وہ نیک انجام بعد تھوڑے دنوں کے مر گیا۔ شب کے وقت کسی شخص نے اسے خواب میں دیکھا۔۔۔۔۔۔۔ کہ ایک تاج مرصع سر پر دھرے خلعت شاہانہ پہنے کارچوبی پٹکا کمر میں باندھے ہوئے، حور و غلماں اپنے ساتھ لئے ہوئے ایک اسپ خوش خرام پر سوار ہے اندر بہشت بریں کی سیر کرتا پھرتا ہے۔ پوچھا۔ اس نے کہا کہ اے شخص پہلے میں غضب الٰہی میں گرفتار ہوا تھا، بعد اسکے حضرت امام حسین علیہ السلام کا غم والم یاد کرنے اور آپ کے حال زار پر رونے کے صدقے سے بخشا گیا۔ یقین ہے کہ جو کوئی آپکے ماتم میں شریک ہوگا اور آپکے رنج والم کو یاد کر کے روئے گا، یہ گریہ و زاری حشر کے دن اسکے کام آوے گی۔ موجب نجات کا ہوگا۔"

حیدری کا طرز تحریر بھی سادہ ہے۔ مقفیٰ عبارت نہیں، لیکن عربی و فارسی کے الفاظ زیادہ استعمال کرتے ہیں، محاورے کا زیادہ خیال نہیں رکھتے میرامن چھوٹے جملے، ہندی کے الفاظ روزمرّہ و محاورہ اس طرح برتتے ہیں کہ انکی عبارت نہایت دلکش ہو جاتی ہے۔ میر شیر علی افسوس حیدری سے بھی زیادہ عربی و فارسی الفاظ لکھتے ہیں۔ (جیسا کہ افسوس کے نمونوں سے معلوم ہوگا)

میر شیر علی افسوس

ان کے والد کا نام سید علی مظفر خاں ہے۔ آبا و اجداد ہندوستان آئے اور قصبۂ نارنول (صوبۂ آگرہ) میں سکونت اختیار کی۔ افسوس کے دادا محمد شاہ بادشاہ کے زمانے (۱۷۱۹ء ۱۱۳۱ھ تا ۱۷۴۸ء ۱۱۶۱ھ) میں دہلی آئے۔ یہیں افسوس پیدا ہوئے۔ اس وقت انکے والد نواب عمدۃ الملک کے ملازم تھے ۱۷۴۶ء ۱۱۵۹ھ میں عمدۃ الملک کا انتقال ہوا تو ان کی جگہ افسوس کے چچا سید غلام علی خاں الہ آباد کے صوبہ دار مقرر ہوئے۔ محمد شاہ کے بعد سلطنت کا نظام ابتر ہو گیا، اور غلام علی خاں نے بھی وفات پائی۔ تو افسوس کے والد پٹنہ چلے گئے اور میر قاسم نواب بنگالہ کے داروغۂ توپ خانہ ہو گئے۔ میر قاسم کے بعد اسکے بیٹے میر جعفر کے ہاں ۱۷۶۰ء تک ملازم رہے۔ وہاں سے لکھنؤ آئے اور نواب شجاع الدولہ بادشاہ اودھ کے ہاں تین سو روپیہ پر ملازم ہو گئے۔ افسوس بنگال میں باپ کے ساتھ تھے اور لڑکپن کا زمانہ تھا۔ گیارہ برس کا سن تھا۔ اسی وقت سے شعر گوئی شروع کر دی تھی۔ لکھنؤ آئے تو یہاں میر و سودا، جرأت و انشا کی سخن سنجیوں کی دھوم تھی۔ افسوس نے بھی شاعری کی مشق کی اور اساتذہ سے داد سخن لی۔ میر حیدر علی حیران دہلوی کے شاگرد تھے۔ شہزادہ مرزا جواں بخت جہاندار شاہ (ولی عہد سلطنت مغلیہ) اس زمانہ میں لکھنؤ میں تھے۔ انھوں نے افسوس کا کلام پسند کیا اور اپنا مصاحب و شاعر بنا لیا۔ شہزادہ کے لکھنؤ سے واپس دہلی جانے کے بعد بھی افسوس لکھنؤ میں رہے۔ سرفراز الدولہ ان کی سرپرستی کرتے رہے۔ جب فورٹ ولیم کالج میں منشیوں کی ضرورت ہوئی تو سرفراز الدولہ نے لکھنؤ کے رزیڈنٹ کرنل اسکاٹ سے افسوس کی سفارش کر کے کلکتہ بھجوا دیا۔ وہاں ۱۸۰۱ء ۱۲۱۵ھ میں پہنچے۔ ڈاکٹر گل کرائسٹ نے دو سو روپیہ ماہوار تنخواہ پر ملازم رکھ لیا۔ ۱۸۰۹ء میں افسوس نے انتقال کیا۔

باغ اردو، افسوس نے فورٹ ولیم پہنچکر پہلی کتاب باغ اردو مرتب

کی۔ اس کے دیباچہ میں لکھتے ہیں۔

لیکن تعلق میرا جو مدرسہ ہندی (یعنی فورٹ ولیم کالج) سے ہوا۔ بنابراس کے بسااوقات خدمت میں صاحب عالی طبیعت والافطنت، مدرس ہندی مسٹر جان گل کرائسٹ صاحب دام ثروتہم کے کہ جامع قوانین اس زبان کے ہیں حاضر ہونے لگا۔ ایک دن صاحب موصوف نے مہربانی سے فرمایا کہ گلستان سعدی شیرازی کا زبان اردو میں ترجمہ کر۔ میں نے دھیان کیا کہ عبارت اس کی بظاہر صاف و بباطن پیچدار ہے۔ علاوہ اسکے عبارت کا اختلاف بے شمار ہے اور ابتدا میں قوت تالیف اور شیخ مرحوم کی تصنیف کا جو خیال کیا تو کسی طرح کی نسبت نہ پائی۔ مصرع

چہ نسبت خاک را با عالم پاک

بارے فضل ایزدی اور لطف سرمدی سے تمام کتاب زبان اردو میں لکھی اور وہ مقبول خاص و عام ہوئی۔ نام اس کا باغ اردو رکھا، چنانچہ اس کی شروع کی تاریخ بھی اسی میں نکلتی ہے۔ قطعہ

میں تاریخ اس کی جو چاہا مع نام — کہوں دل کھول باآئین نیکو
کہ اس میں ہاتف غیبی یہ بولا — کہ ہے آغاز اردی باغ اردو

۱۲۱۴
۱
۱۲۱۵

کتاب کے خاتمہ پر لکھتے ہیں:۔

سن ہجری بارہ سے سولہ (۱۲۱۶ھ) اور عیسوی اٹھارہ سے دو (۱۸۰۲ء) میں ترجمہ کہ مسمّی بہ باغ اردو ہے تمام ہوا۔

قطعہ

عون توفیق رب سبحاں سے — ترجمہ یہ کیا تمام میں جب
ختم کی اس کے پیر عقل سے کی — میں نے تاریخ عیسوی جو طلب

ابتداے بہارت یہ کہا   باغ اردو ہوئی گلستاں اب[1]

١٧٩٩
٢
١٨٠١

افسوس نے باغ اردو کے دیباچہ میں جو حمد و نعت لکھی ہے اسکی عبارت

[1] اس مصرع تاریخ میں ۱۷۹۹ء نکلتے ہیں اور لفظ بہار کی ابتدا ب کے دو عدد بڑھانے سے ۱۸۰۱ء
ہوتے ہیں۔ حالانکہ قطعہ سے اوپر افسوس نے سن ہجری و عیسوی دونوں لفظوں میں لکھے ہیں اور
ختم کتاب کا سال ۱۸۰۲ء بتایا ہے۔ اس لئے تطابق مشکل ہو گیا۔ اسی طرح کی الجھن افسوس کے کلکتہ جانے
کے زمانے کے متعلق پیدا ہوتی ہے۔ سیر المصنفین میں افسوس کے پہلے دیباچہ کی جو عبارت نقل کی گئی
ہے اس میں یہ فقرہ ہے "ستائیسویں تاریخ روز جمعہ کو وہی سترھویں ماہ اکتوبر کی تھی سن ہجری بارہ سے
پندرہ تھے اور ۱۸۰۰ء کہ صاحب جلیل القدر کرنل اسکاٹ بہادر نے مجھے بلوا بھیجا اور کلام میرا سنا۔
پھر الطاف نوازش سے فرمایا کہ تو سرکار کمپنی بہادر دام دولتہم کے ملازموں میں اسی تاریخ سے سرفراز
ہوا۔ بدل جمعی تمام کلکتہ کو روانہ ہو کر صاحب عالی شان دام ظلہم زبان اردو کا محاورہ اور صحت فرمایا
کیا چاہتے ہیں، بنابر اسکے تجھے طلب کیا ہے"۔ حالانکہ سیر المصنفین کے مؤلف نے اس سے اوپر افسوس
کے حالات میں لکھا ہے کہ آپ ۱۸۰۱ء میں کلکتہ پہنچے۔ ارباب نثر اردو میں غالباً افسوس کے اس بیان
کی بنا پر لکھا ہے کہ "اس موقع پر حسن رضا خاں نے اکتوبر ۱۸۰۰ء میں کرنل اسکاٹ سے افسوس کا تعارف
کرایا"۔ اب دشواری یہ ہے کہ اکتوبر ۱۸۰۱ء، ۱۲۱۶ھ میں واقع ہوتا ہے۔ ۱۲۱۵ھ میں نہیں آتا۔
اس لئے کہ ۱۲۱۶ھ آغاز محرم سے آخر ذی الحجہ تک ۱۴ مئی ۱۸۰۱ء تا ۳ مئی ۱۸۰۲ء کے مطابق ہے۔
اس لئے افسوس کے کلکتہ پہنچنے کا عیسوی سن (۱۸۰۱) غلط معلوم ہوتا ہے۔ ہجری سن (۱۲۱۵) صحیح ہے
اسی ہجری سال میں اکتوبر ۱۸۰۰ء واقع ہوگا۔ لہذا ۱۸۰۰ء ۱۲۱۵ھ میں افسوس کلکتہ گئے۔ اسی سال باغ
اردو لکھنی شروع کی اور اگلے سال ۱۸۰۱ء ۱۲۱۶ھ میں تمام کی۔ اس طرح آغاز کتاب کی تاریخ ۱۲۱۵ھ
اور اختتام کتاب کی تاریخ ۱۸۰۱ء درست ہو جائے گی۔ — قادری

رنگین و مقفیٰ ہے، لکھتے ہیں :۔

"تازگی گلستان سخن کی حمد باغبان حقیقی کی ہے کہ اس نے بوستان عالم کو طرح طرح درختوں سے آرائش دی، اور رنگ برنگ کے پھولوں سے زینت بخشی اور اسکے ابر رحمت کی بارش سے ہر ایک گل تر و تازہ، نسیم فیض سے اسکے ہر ایک درخت ہرا بھرا، ہر گل کی زبان دل ہے اسکے ذکر میں، جو غنچہ سر بجیب ہے اسی کے فکر میں، قمری اسی کے طوق بندگی میں اسیر تدرو اسی کے بند عشق سے پا بہ زنجیر ۔۔۔۔"

لیکن اس کے بعد اسی دیباچہ میں جو اپنا حال اور باغ اردو کے ترجمہ کا ذکر لکھا ہے، جس کا اقتباس اوپر درج کیا گیا۔ اسکی عبارت سادہ ہے۔ تاہم حیدر بخش حیدری کے مقابلے میں زیادہ، اور میر امن کے مقابلے میں بہت زیادہ عربی و فارسی کے الفاظ اضافتیں، بندشیں، افسوس کے قلم سے نکلتی ہیں۔ لفظوں کی تقدیم و تاخیر اردو روز مرہ سے زیادہ نہیں ہے۔

گلستان سعدی کا ترجمہ افسوس نے اکثر لفظی کیا ہے اور لفظی ترجمہ کی کوشش میں کہیں کہیں اپنی بول چال اور روزمرہ سے بھی ہٹ گئے ہیں۔ بعض مقامات پر گلستاں ہی کے الفاظ بجنسہ اپنے ترجمہ میں اختیار کر لئے ہیں۔ حالانکہ ان کا بدل سہل تر الفاظ سے ممکن تھا۔ مثلاً ایک ترجمہ یہ ہے :۔

"ایک بزرگ سے طینت صاحبان صفا کی پوچھی، کہا، ان سے ادنیٰ فعل ان کا مقدم رکھنا ہے یاروں کے دل کی مراد کو اپنے مقصدوں پر۔ اور حکیموں نے کہا ہے، وہ بھائی کہ اپنے ہی بند و بست میں رہے، نہ وہ بھائی ہے اپنا۔"

لیکن یہ دانشمندی کی ہے کہ سعدی کے وہ مقولے اور مصرع، جو ضرب المثل بن گئے ہیں بجنسہ لے لئے ہیں۔ مثلاً

ہر کسے را کہ پارسا بینی	پارسادان و مرد نیک انگار

دد میوانی کہ درنہانش جیست	محتسب را دردن خانہ چکار

(ترجمہ)

جس کو ظاہر میں متقی دیکھے	اس کے تقوے کا تو نہ کر انکار
کھوج مت کر کسی کے باطن کی	محتسب را دردن خانہ چہ کار

باغ اردو میں ایک حکایت کا ترجمہ یہ ہے :-

"ایک فقیر کو میں نے سنا ہے کہ فاقہ کی آگ میں جلتا، پیوند پر پیوند گانٹھتا اور تسلی اپنی خاطر کی ان دو بیتوں سے کرتا ؎

لباس فقر و نان خشک پر میں	یہ لازم ہے کہ کر بیٹھوں قناعت
ہر ایک کی منتوں کا بوجھ اٹھانا	ہے بہتر یا کہ اپنا بار محنت

کسی نے کہا اس سے، کیا بیٹھا تو، فلانا شخص اس شہر میں ایسا صاحب ہمت ہے کہ دست کرم اپنا اس نے کھول دیا ہے، اور اپنی کمر کو آزادوں کی خدمت کیلئے باندھ لیا ہے۔ اگر صورت حال پر تیری اطلاع پاوے تو اپنے پر منت رکھے اور تیری خدمت کرنی غنیمت جانے۔ کہا اس نے، چپ رہ کہ فقیری میں مرنا اچھا ہے کہ حاجت کسی کے آگے لیجانا چنانچہ کہہ گئے ہیں ؎

پیوند گانٹھ، صبر کا کونہ کر اختیار	پر اغنیا سے کر نہیں جامہ کی التجا
مثل عذاب نار ہے ہمسایہ کے سبب	جانا ترا جو گلشن فردوس میں ہوا [۱]

ایک اور حکایت کا ترجمہ یہ ہے :-

"حکایت: کہتے ہیں کہ نوشیروان عادل کے واسطے شکار گاہ میں ایک شکار کے کباب بھونتے تھے۔ نمک موجود نہ تھا۔ لوگوں نے زمیندار کے پاس آدمی بھیجا کہ نمک لے آؤ۔ نوشیرواں بولا کہ نمک قیمت دے کر لیجو تاکہ رسم نہ بگڑ جائے اور گاؤں خراب نہ ہو۔ لوگ بولے اے بادشاہ اتنی سی بات سے

---

[۱] آداب باب نثر اردو

کیا خلل پیدا ہوگا۔ نوشیروان نے کہا اولاً ظلم کی بنیاد تھوڑی ہی سی تھی، جو آیا اس پر بڑھاتا گیا حتیٰ کہ اس درجہ کو پہونچ گئی۔ بیت

نہیں رہتا ہے ظالم بد شعار   سدا اس پہ لعنت ہو پائیدار

قطعہ

جو کھائے شاہ رعیت کے باغ سے اک سیب
غلام اس کے درختوں کو ڈالیں جڑ سے اکھاڑ
جو آدھے انڈے پہ سلطان ستم روا رکھے
سپاہی سیخ پہ بھونیں ہزار مرغ پچھاڑ

افسوس کی دوسری کتاب آرائش محفل ہے اوپر ذکر آچکا ہے کہ یہ کتاب حیدری کی کتاب کی ہمنام ہے، لیکن ہم مضمون نہیں۔ یہ آرائش محفل ہندوستان کی تاریخ ہے، اور اردو لٹریچر میں پہلی چیز ہے۔ فورٹ ولیم میں بھی اکثر کتابیں قصہ، اخلاق تذکرہ، صرف و نحو، لغت وغیرہ موضوعات پر لکھی گئیں۔ اسکے علاوہ تاریخ کی جو کتابیں لکھی گئیں وہ اب مفقود ہیں۔ مثلاً حیدری کی تاریخ نادری اور حسینی کی تاریخ آسام۔ اس کے بعد کی ایک کتاب ولا کی تاریخ شیر شاہی البتہ قلمی موجود ہے۔ ۱۱۰۷ھ/۱۶۹۵ء میں منشی سجان رائے ساکن پٹیالہ نے فارسی میں عہد ہنود و عہد اسلام کی مکمل تاریخ لکھی تھی جس میں اس زمانے کی تمام موجودہ تواریخ سے مدد لی تھی اور ان سب کا خلاصہ کر دیا تھا۔ اسی لئے اس کا نام خلاصۃ التواریخ رکھا تھا۔ ڈاکٹر گل کرائسٹ کے فورٹ ولیم سے جانے کے بعد افسوس نے ۱۲۱۹ھ/۱۸۰۴ء میں مسٹر جے۔ ایچ مارنگٹن کی فرمائش سے اس فارسی تاریخ کا ترجمہ شروع کیا اور ۱۲۲۰ھ/۱۸۰۵ء میں عہد ہنود کی تاریخ تمام کر کے آرائش محفل نام رکھا۔ جو ۱۲۲۳ھ/۱۸۰۸ء میں شائع ہوئی، اور انگریزوں کے امتحان اردو کے نصاب تعلیم میں شامل کی گئی۔ اسکے بعد کلکتہ، لکھنؤ، لاہور کے مطابع

چند بار شائع ہوئی۔ میجر ہنری کورٹ نے پوری کتاب کا انگریزی میں ترجمہ شائع کیا
جان شیکسپیر نے اس کے دس باب کا انگریزی ترجمہ کر کے اپنی کتاب منتخبات ہندی
میں شامل کیا۔

آرائش محفل کی عبارت مقفیٰ ہے، لیکن قافیہ پیمائی سے روانی و بے تکلفی میں
فرق نہیں آیا۔ نمونہ یہ ہے:-

"جب سے یہ مرکز خاک آرام گاہ حیوانات ہوا، سیکڑوں لاکھوں شہر قصبے بسے اور بستے
جاتے ہیں۔ کوئی ادنیٰ کوئی اعلیٰ ہندوستان کی سرزمین کا عالم سب سے نرالا ہے، کوئی
ولایت اسکی وسعت کو نہیں پہنچتی اور کسی مملکت کی آبادی اس کو نہیں لگتی۔ یہاں
کی ہر ایک بستی میں گہما گہمی، جا بجا ایک نئی طرح کا عالم، ہر شہر و قصبہ میں ستھری پاکیزہ
پختہ متعدد سرائیں، مسافر کے واسطے ہر قسم کے اوڑھنے بچھونے اور اقسام کی غذائیں
اکثر بستیوں میں مسجدیں، خانقاہیں، مدرسے، باغات، غریبوں بے کسوں مسافروں کے
لئے متعدد مکانات، قلعے بڑے بڑے مضبوط، وسعت میں ایسے کہ سیکڑوں گاؤں ان
میں بسیں، اور رفعت میں اس قدر کہ بادل انکے نیچے برسیں، ندی، نالے، تالاب،
کوئیں، لطیف دریا، پاکیزہ ہزارہا، ان میں میٹھا ٹھنڈا ستھرا بھرا ہوا، بڑے بڑے
دریاؤں میں کشتیاں، نواڑے، بجرے وغیرہ بے شمار، شاہ راہ کے ندی نالوں پر
بیشتر مقاموں پر پل بندھے ہوئے تیار، اکثر راستوں میں کوسوں تک سایہ دار درختوں
کی دو طرفہ قطار، ایک ایک کوس کی مسافت پر ایک ایک مینار نمودار، ہر ایک چوکی
پر تمام چیزیں مہیا، سودے والوں کی دکانیں جا بجا۔ مسافر خوش و خرم کھاتے
پیتے اٹھتے بیٹھتے دن بھر چلے جاتے ہیں، اور شام کو منزل پر بھی سب طرح کا آرام
پاتے ہیں۔

جہاں دیکھئے یہ رہی خیر ہے — سفر یہ نہیں باغ کی سیر ہے۔

افسوس نے ان دو کتابوں کے علاوہ کوئی نثر کی کتاب تالیف نہیں کی۔ اپنا دیوان البتہ مرتب کیا۔ فورٹ ولیم کے لئے مرزا سودا دہلوی کے دیوان کا افسوس نے انتخاب کیا جس میں سودا کے قصائد و غزلیات، مثنوی و مرثیہ کے اعلیٰ نمونے موجود ہیں۔ اسکے علاوہ افسوس نے میر بہادر علی حسینی کی کتاب نثر بے نظیر کی نظر ثانی کی، اور نہال چند لاہوری کی مذہب عشق کی تصحیح کی۔

میرزا علی لطف یہ بھی فورٹ ولیم کالج کے مصنفوں میں ہیں، لیکن صرف ایک کتاب تذکرہ گلشن ہند لکھی ہے، معلوم ہوتا ہے وہاں مستقل ملازم نہ تھے۔ تھوڑے دنوں رہے میرزا علی نام تھا لطف تخلص، انکے والد کاظم بیگ خاں استرآبادی ۱۱۵۴ھ/۱۷۴۱ء میں نادر شاہ کے ساتھ دہلی آئے، ابوالمنصور خاں صفدر جنگ (نواب آصف الدولہ وزیر اودھ کے دادا) کے ذریعہ محمد شاہ بادشاہ دہلی کے دربار سے تعلق ہوا۔ ہجری تخلص کرتے تھے، فارسی کے شاعر تھے۔ میرزا علی لطف فارسی میں باپ کے شاگرد تھے۔ دہلی میں پرورش ہوئی۔ یہیں تعلیم پائی اور فارسی و اردو دونوں میں شاعری شروع کی۔ مختلف تذکروں میں لطف کو میر تقی اور مرزا سودا کا شاگرد بتایا ہے لیکن لطف اس تذکرہ میں اپنے حال میں لکھتے ہیں کہ "مشورہ ریختہ کا فقط اپنی ہی طبع نا صواب سے ہے"۔

دہلی کی تباہی کے بعد میرزا لطف باہر نکلے اور حیدرآباد جانے کا ارادہ کیا، اول لکھنؤ پہنچے وہاں استادوں کا مجمع تھا۔ شہزادہ مرزا جواں بخت لکھنؤ میں مقیم تھے اور شعرا کے قدرداں تھے۔ انھوں نے لطف کا کلام بھی سنا اور پسند کیا۔ لیکن لطف کو اساتذۂ سخن کے مقابلے میں اپنے نباہ کی صورت لکھنؤ میں نظر نہ آئی پٹنہ پہنچے وہاں سے کلکتہ کی سیر کر کے دکن کا قصد تھا کہ ڈاکٹر گل کرائسٹ سے ملاقات ہو گئی۔ انھوں نے لطف سے یہ تذکرہ لکھنے کی فرمائش کی۔ لطف نے دیباچہ میں اس تذکرہ کا

ماخذ اور تالیف کا حال اور زمانۂ تالیف بیان کیا ہے۔ ہم درمیان میں سے کچھ حذف کر کے لطف ہی کے بیان کو مسلسل کئے دیتے ہیں۔ یہی نمونۂ کتاب کا کام دیگا لکھتے ہیں:۔

"علی ابراہیم خاں مرحوم نے ایک تذکرہ شعرائے ہند کا عبارت فارسی میں لکھا ہے، اور نام اس کا گلزار ابراہیم رکھا ہے۔ ۱۱۹۶ھ گیارہ سو چھیانوے ہجری اور ایک ہزار سات سو چوراسی عیسوی (۱۷۸۴ء) میں وہ تذکرہ تمام ہوا۔ مشہور یوں ہے کہ بارہ برس میں سرانجام ہوا۔ رفتہ رفتہ جب سر حلقۂ بزم نکتہ دانی، رونق افزائے محفل معانی، سخن کی جان اور سخنداںوں کے قدردان، صاحب والا مناقب، مسٹر گلکرسٹ صاحب کی نظر مبارک سے گزرا، ازبسکہ شاعروں کا احوال اس میں مجمل لکھا تھا۔ ایک مدت سے صاحب عالی حوصلہ کو خیال اس بات کا تھا کہ اگر بیان اس کا مفصل زبان ریختہ میں کیا جائے تو خوب ہو۔ اور ہر ایک شاعر کی پوری پوری غزل اپنا جلوہ دکھلائے تو نہایت طبع کے مرغوب ہو۔ مبتدی اس سے بڑا مزہ پائیں گے، اور خوش کیفیت بہت اٹھائیں گے۔

چنانچہ اس خیر خواہ خفی و جلی میرزا علی کو کہ لطف تخلص کرتا ہے، نہایت محبت اور اخلاق سے فرمایا کہ تو اگر تن دہی اس مقدمہ میں کرے، تو ہم اس تذکرے کو اپنی طرز پر بعکس، اگرچہ یہ پابند الفت کا اس ایام میں ارادہ حیدرآباد کی سرکار رکھتا تھا۔ لیکن اس خلق مجسم کے اخلاق کا کیا بیان کروں کہ اس مضمون کو اس وقت اس خوبی سے ادا فرمایا کہ مجھ سے سوائے اس بات کے اور کچھ بن نہ آیا، کہ میں لاکھ جان سے حاضر ہوں، اور ایک سر مو آپ کے فرمانے سے نہیں باہر ہوں.......

الحمدللہ آج کے دن تک کہ ۱۲۱۵ھ بارہ سو پندرہ ہجری اور اٹھارہ سو ایک مطابق عیسوی کے ہیں۔ موافق حکم اس صاحب الامناقب کے، کہ نام نامی اور اسم گرامی

اس کا اوپر مذکور ہوا ہے اس ہیچداں نے یہ تذکرہ لکھا، اور نام اس کا بہ حسب ارشاد
اس صاحب ممدوح کے گلشن ہند رکھا۔"

یہ طرز تحریر دیباچہ سے مخصوص نہیں ہے تمام تذکرہ کی عبارت اسی نمونہ کی ہے یہی قافیہ پیمائی یہی خیال آرائی، جابجا عربی فارسی کے الفاظ اور ترکیبیں ہیں مقفٰی عبارت کے شوق میں تعقید کی بھی پروا نہیں کی۔ مثلاً میر تقی میر کے حال میں لکھتے ہیں :۔

"ناقدردانی سے اغنیا کی، اور نافہمی سے اہل دنیا کی، اب بازار سخن سازی اس درجہ کاسد ہے، اور ہوائے شہرستان معنی طرازی اس مرتبہ فاسد، کہ میر سا شاعر، جو کہ سحر کاری سخن میں طلسم ساز ہے خیال کا، اور جادو طرازی بیان میں معانی پرداز ہے مقال کا، وہ نان شبینہ کا محتاج ہے، اور بات کوئی نہیں پوچھتا اسکی آج ہے"

حیران کا حال اس طرح شروع کرتے ہیں :۔

"حیران تخلص، میر حیدر علی نام، ساکن شاہ جہاں آباد کے، شاگرد رائے سرپ سنگھ دیوانہ تخلص استاد کے۔"

دوسرے فقرے پر مولانا شبلی نے نوٹ لکھا ہے تعقید کی شکایت کرتے ہیں: "اس فقرہ میں قافیہ کی پابندی سے سخت تعقید پیدا ہو گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ سرپ سنگھ جن کا تخلص دیوانہ ہے اور جو استاد فن ہیں، حیران انکے شاگرد ہیں۔"

لطف اس تذکرہ کی ترتیب کے بعد حیدرآباد چلے گئے وہاں اعظم الامرا ارسطو جاہ مدارالمہام تھے۔ انہوں نے قدردانی کی اور ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار مقرر کر دیا۔ لطف کے دو بھائی اور بھی ان کے ساتھ تھے اور شہر میں سوز خوانی کیا کرتے تھے۔ لطف نے ۱۸۲۲ء ۱۲۳۸ھ میں وہیں انتقال کیا۔

تذکرۂ گلشن ہند نایاب و ناپید تھا۔ اتفاق سے ۱۹۰۸ء ۱۳۲۰ھ میں حیدرآباد کی موسیٰ ندی میں عظیم الشان سیلاب آیا، صدہا گھر ویران ہو گئے اور اسباب بہہ گیا۔ اسی میں یہ تذکرہ

کسی کے ہاتھ آگیا۔ مولانا شبلی حیدرآباد میں تھے، ان کو دکھایا، انھوں نے بہت پسند کیا اور خود اس پر تشریحی حواشی لکھے۔ مولوی عبدالحق صاحب سیکریٹری انجمن ترقی اردو نے مفصل عالمانہ مقدمہ لکھا۔ اور سنہ ۱۹۰۶ء میں پہلی مرتبہ شائع ہوا۔ بعد کو دوبارہ انجمن نے اپنی طرف سے گلشن ہند اور اس کے ماخذ و اصل گلزار ابراہیم دونوں کو یک جا شائع کر دیا ہے۔

میر بہادر علی حسینی

ان کے والد کا نام سید عبداللہ کاظم ہے۔ دہلی میں قیام تھا حضرت شاہ عبدالقادر صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا اردو ترجمہ قرآن مجید حسینی کے والد کے اہتمام سے پہلی مرتبہ دہلی میں چھپا تھا۔ میر امن حسینی کے خاص دوست تھے۔ حسینی پہلے فورٹ ولیم کالج میں پہنچ گئے تھے، اور وہاں میر منشی تھے۔ انہی کی سفارش سے میر امن کا تقرر ہوا تھا۔ حسینی نے چار کتابیں مرتب کیں۔

(۱) نثر بے نظیر۔ اس کا سبب تالیف اور طرز تحریر خود حسینی بیان کرتے ہیں:۔

> قصہ بے نظیر و بدر منیر کا نظم میں تصنیف کیا ہوا شاعر بے ہمتا، دانشمند یکتا، رونق بزم سخن میر حسن مرحوم متخلص بہ حسن، سعید ازلی خلف الرشید میر غلام حسین ضاحک دہلوی کا تھا۔ فی الواقع ہر ایک مصرع اس کا فصاحت و بلاغت میں بے نظیر ہے اور ہر ایک شعر حسن و خوبی میں مثل بدر منیر۔ جو سخنداں منصف مزاج عاشق پیشہ ہیں، وہی اسکی طرز بخوبی پہچانتے ہیں۔ مقابل اس کے نظم کس سے ہو سکے، بلکہ کوئی رمزوں کو پا تو سکے؟ قاصر ہے زبان اس کی توصیف میں، ہر کہ دمہ مشغول ہے اس کی تعریف میں۔
>
> اب اس کو عہد میں شاہ عالم بادشاہ کے اور ریاست امیر سراپا تدبیر۔ مارکوئس ولزلی گورنر جنرل بہادر دام اقبالہ کے ۱۲۱۸ھ مطابق ۱۸۰۳ء کے، حکم سے صاحب خداوند نعمت..... جان گل کرائسٹ صاحب بہادر دام حشمتہ کے، عاصی میر بہادر علی حسینی نے شروع قصہ سے موافق محاورہ خاص کے نثر میں لکھا ہے۔ پہلے

اس سے یہ خاکسار اس کہانی کو خاص و عام کی بول چال کے مطابق بہ طرز سہل
واسطے صاحبان نو آموز کے تحریر کر چکا تھا اب جی میں یوں آئی کہ اس داستان
شیریں کو کہ فی الحقیقت قصۂ شیریں سے شیریں تر ہے اس رتبے سے نثر کروں کہ ہر ایک بانی
دان و شاعر اس کو سن کر عش عش کرے اور اس ہیچمداں کی ایک یادگاری اس
دنیا میں رہے"۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس تالیف کا یہ دیباچہ ہے اس سے پہلے کالج کے نو آموز انگریزوں
(صاحبانِ نو آموز) کے واسطے "اس کہانی کو خاص و عام کی بول چال کے مطابق بہ طرزِ
سہل تحریر کر چکے تھے۔ پھر دوبارہ یہ تالیف کی جو اس وقت زیر نظر ہے۔

حسینی کی یہ نثر اصل مثنوی کے سامنے کوئی خاص دلچسپی نہیں رکھتی۔ لیکن
حسینی نے اسکو دلچسپ بنانے کی یہ تدبیر کی ہے کہ اپنی نثر کے درمیان میں موقع بموقع
مثنوی کے اشعار لکھدئے ہیں۔ مثنوی میر حسن فورٹ ولیم کالج کے نصاب تعلیم میں
شامل تھی، ڈاکٹر گل کرائسٹ نے نثر بے نظیر کو بھی مثنوی کے ساتھ چھپوا دیا۔ دوسری
طباعت کے وقت میر شیر علی افسوس نے اس پر نظر ثانی کی۔ متعدد بار مختلف مطابع
سے شائع ہوئی۔ انگریزی میں بھی اس کا ترجمہ ۱۸۷۱ء میں ایم اتچ کورٹ نے شائع
کیا۔ اب اسکے نسخے نہیں ملتے۔ موّلف ارباب نثر اردو کو بڑی سعی و تلاش کے بعد ایک
نسخہ حاصل ہوا ہے۔ یہ کالج پریس کا مطبوعہ ۱۸۰۳ء ہے۔ چھوٹی تقطیع کے ۱۵۲ صفحات
پر مشتمل اور ٹائپ میں چھپا ہوا ہے۔ اس میں سے "داستان سواری کی تیاری" کا نمونہ
درج کیا جاتا ہے۔

"جب گیارہ برس خیریت سے گزرے، بارھواں برس آیا، الحمدللہ جس دن کی آرزو
تھی سو کریم نے ساتھ خوشی کے دکھایا۔ شادی محل میں چاروں طرف سے گئی
مبارک بادی کی صدا پھر بلند ہوئی۔ نظم

پڑی جب گرہ بارھویں سال کی　　کھلی گلجھڑی غم کے جنجال کی

چار گھڑی دن رہے عرض بیگی کو بادشاہ نے ارشاد کیا کہ صبح سواری مبارک جلوس سے تیار ہو کر میں شہزادے کو لیکر سوار ہوں گا، تا رعیت اور سپاہ اس کا دیدار دیکھ کر شاد ہو اور بستی انکے دل کی بھی آباد، تم نقیبوں کو تعینہ کرو گھر گھر یہ حکم پونہچا دیں اور ہر ایک چھوٹے بڑے کو جتا دیں کہ زرق برق سے نکلے اور تمام اسباب سواری کا بھی نیا اور جگمگاتا ہو۔ خبردار ایک سوار میلا اور گھوڑے کا زین پرانا نظر نہ آوے احیاناً کسی کو اس وقت اگر کوئی چیز میسر نہ آوے تو سرکار سے بے تکلف لیوے کہ مایدولت کی مرضی اور خوشی اسی میں ہے۔ نظم

کریں شہر کو مل کے آئینہ بند　　سواری کا ہو نور جس سے دو چند

اتنے میں شام پڑی۔ آفتاب والشمس پڑھ کے سجدۂ شکر میں گیا، مہتاب سورۂ نور پڑھتا ہوا نکلا، حضرت محل میں تشریف لے گئے۔ تمام رات ناچ راگ رہا۔ مارے خوشی کے محل میں کوئی نہ سویا۔ نظم

عجب شب تھی وہ جوں سحر رو سفید　　عجب روز تھا مثل روز امید

القصہ رات آخر ہوئی، چاند نے بالین استراحت پر اپنا سر رکھا، اور سورج بڑی چمک سے آنکھیں ملتا ہوا اٹھا۔ نظم

کہا شاہ نے اپنے فرزند کو　　کہ بابا نہا دھو کے تیار ہو

(۲) اخلاق ہندی۔ میر بہادر علی حسینی کی دوسری کتاب ہے، اور پہلی سے زیادہ مشہور ہے۔ یہ اخلاقی کہانیاں پہلے سنسکرت میں لکھی گئی تھیں۔ سنسکرت سے اسکے دو ترجمے فارسی میں ہوئے، نگار دانش اور مفرح القلوب۔ مفرح القلوب کا سبب تالیف حسینی نے اخلاق ہندی کے دیباچہ میں یہ لکھا ہے:۔

”یہ کتاب سرکار دولتمدار میں ملک الملوک شاہ نصیر الدین کے جسکی تخت گاہ

صوبۂ بہار تھی، پوچھی، جب انھوں نے سُنا: اس میں قصے ازبسکہ دلچسپ ہیں اور
نصیحت میں نہایت مرغوب، اور باتیں خوب، اور حکایتیں اکثر مفید، تب اپنے
ملازموں سے ایک کی طرف مخاطب ہو کے فرمایا کہ اس کو ترجمہ سلیس فارسی میں
کرو تو میں اپنے مطالعہ میں رکھوں، اور اس کے مضمون سے مستفید ہوں، تب
ان میں سے ایک شخص (منشی تاج الدین) حکم بجالایا، اور نام اسکا مفرح القلوب رکھا"
اس مفرح القلوب کا حسینی نے ڈاکٹر گل کرائسٹ کی فرمائش سے ۱۸۰۲ء ۱۲۱۷ھ میں ترجمہ
کیا، اور اخلاق ہندی نام رکھا۔ ۱۸۰۳ء میں کلکتہ سے شائع ہوئی۔ اس کے بعد بھی
کئی ایڈیشن نکلے۔ اس کی عبارت سادہ و سلیس ہے، لیکن کوئی خاص دلکشی نہیں
نمونہ یہ ہے:-

"سانپ ہر روز دو تین مینڈک کھانے لگا۔ تھوڑے دنوں میں سب کو نگل گیا۔
اکیلا بادشاہ رہا۔ سانپ نے پوچھا اے بادشاہ آج میں کیا کھاؤں، مجھے بھوک
لگی ہے۔ مینڈک نے کہا اے سانپ کسی جھیل کے کنارے چل کر اپنا پیٹ بھر لے۔
تب اس نے کہا تمہارے لشکر نے میرے پیٹ میں چھاؤنی کی ہے، بادشاہ کو
لشکر سے جدا رہنا خوب نہیں، اپنی فوج کے ساتھ آپ بھی اسی چھاونی میں
داخل ہوں تو بہتر ہے۔ تب وہ اپنی موت سمجھ کر چپ ہو رہا۔ سانپ نے اپنے
شہسوار کو زمین پر پٹک کر کوڑے دُم کے مارے اور کھا گیا، جیسا کہ کسو شاعر
نے کہا ہے۔ فرد

گردن بندگی نت خم ہے در فرماں پر   گوے سر اپنا فدا کیوں نہ کرے چوگاں پہ"

(۳۱) تاریخ آسام۔ شہاب الدین طالش ابن ولی محمد نے فارسی میں تاریخ
آسام لکھی تھی جس میں شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے سپہ سالار میر جملہ کی مہم آسام
(۱۶۶۲ء ۱۰۷۳ھ) کا حال لکھا تھا۔ میر بہادر علی حسینی نے اس کا اردو میں ترجمہ کیا۔ منشی کریم الدین

نے اپنے تذکرہ طبقات الشعراء میں ذکر کیا ہے کہ یہ ترجمہ ۱۸۰۵ء/۱۲۲۰ھ میں ختم ہوا۔ اور فرانسیسی مستشرق گارسان دتاسی نے لکھا ہے کہ اس کا ترجمہ فرانسیسی زبان میں ۱۸۴۶ء/۱۲۶۱ھ میں شائع ہوا تھا۔ لیکن حسینی کا ترجمہ ناپید ہے۔

(۴) رسالہ گل کرسٹ حسینی کی یہ چوتھی تالیف ہے، جو اصل میں حسینی کے دماغ کی پیداوار نہیں بلکہ ڈاکٹر گل کرائسٹ کی مفصل کتاب صرف و نحو ہندستانی کا خلاصہ ہے۔ اصل کتاب ضخیم تھی۔ فورٹ ولیم کالج کے انگریزی طالب علموں کو امتحان کے لئے اسکے تیار کرنے میں دشواری ہوتی تھی، اس لئے حسینی نے اسکو مختصر کر دیا۔ یہ رسالہ ۱۸۱۰ء میں کلکتہ سے شائع ہوا۔ اس کے بعد ۱۸۷۲ء میں چھپا۔ لیکن زیادہ اشاعت نہیں ہوئی۔ اور اب کمیاب ہے۔

مظہر علی خاں وِلاؔ

دہلی کے رہنے والے تھے۔ ان کا نام مرزا لطف علی تھا لیکن مظہر علی خاں کے نام سے مشہور ہیں۔ انکے والد سلیمان علی خاں، وداد فارسی کے شاعر تھے، اور دادا محمد حسین علی قلی خاں کے خطاب سے مشہور تھے۔ مظہر علی خاں وِلا فارسی، سنسکرت، ہندی کے اچھے عالم تھے شاعری میں منّون، مصحفی، اور طپش سے مشورہ کیا ہے۔ لیکن وِلا کا دیوان مفقود ہے بعض تذکروں میں دو ایک شعر ملتے ہیں۔ ولا نے ۱۸۰۲ء سے ۱۸۰۵ء تک فورٹ ولیم کالج میں چند کتابیں لکھیں۔ ان کے ہم عمر و ہم پیشہ منشی بینی نراین جہاں نے اپنے تذکرہ شعرا دیوان جہاں میں جو ۱۸۱۲ء/۱۲۲۹ھ میں مرتب ہوا ہے، ان کو بقید حیات اور کلکتہ میں مقیم بتایا ہے۔ اس سے زیادہ حالات دستیاب نہیں ہوتے۔

ولا کی تالیفات یہ ہیں (۱) مادھونل اور کام کندلا۔ (۲) ترجمہ کریما۔ (۳) ہفت گلشن (۴) اتالیق ہندی (۵) بیتال پچیسی۔ (۶) تاریخ شیر شاہی۔ ان میں سے،

شیخ سعدی کے کریما کا ترجمہ نظم میں ہے اس لئے اس وقت ہماری بحث سے خارج ہے۔ اس داستان تاریخ اردو کے حصۂ نظم میں اس کا ذکر آئے گا۔ اور آتالیق ہندی فارسی کی کتاب ہے اس کا تذکرہ بھی ترک کیا جاتا ہے۔

(۱) **مادھونل اور کام کندلا** قدیم ہندی زبان کے قصہ (مصنفہ موتی رام کبیشر) کا اردو ترجمہ ہے۔ وِلاؔ نے ڈاکٹر گل کرائسٹ کی فرمائش سے ۱۸۰۲ء میں مرتب کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے انتخاب بیاض ہندی میں اس کا ایک حصہ چھاپا تھا۔ پوری کتاب نہیں چھپی۔ صرف برٹش میوزیم میں اس کا ایک قلمی نسخہ دریافت ہوا ہے۔ ارباب نثر اردو سے معلوم ہوا کہ وِلاؔ نے اس کتاب کے آخر میں دو قطعہ تاریخ لکھے ہیں۔ ایک سے ہجری سال ۱۲۱۵ھ نکلتا ہے، دوسرے سے ۱۸۰۱ء نکلتا ہے[1]۔ اسی تذکرے سے وِلاؔ کی کتاب کا نمونہ نقل کیا جاتا ہے۔

---

[1] یہ دونوں سال ہجری و عیسوی باہم مطابق نہیں ہیں۔ اسلئے ہجری سال آغاز تالیف کا ہوگا اور عیسوی اختتام کا۔ اسی طرح اس سے اوپر تذکرۂ دیوان جہاں کے جو سال ترتیب درج کئے گئے ہیں وہ ارباب نثر اردو میں ۱۸۱۳ء مطابق ۱۲۲۷ھ بتائے گئے تھے۔ ان میں سے بھی کسی سال کا کوئی حصہ دوسرے سال میں واقع نہیں ہوتا۔ اس لئے ہم نے سال عیسوی کو درست مان کر سال ہجری بجائے ۱۲۲۷ھ کے ۱۲۲۹ھ کر دیا ہے۔ اسی طرح کے عدم مطابقت کا ذکر میر شیر علی افسوس کے ذکر میں حاشیہ میں کیا گیا ہے۔ یہ عدم تطابق کا مسئلہ نہایت عجیب ہے۔ قدیم مصنفین اپنے زمانے کے ہجری و عیسوی سن لکھنے میں غلطی نہیں کر سکتے۔ یقیناً ناقلانِ کتب کی بے پروائی سے یا بعد کے مولفین تذکرہ و تاریخ کی بے احتیاطی سے یا مطابع کی غلطیوں سے ہم تک پہنچتے پہنچتے کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے۔ ہمارے سامنے اس وقت مطابقت ہجری و عیسوی کی دو فہرستیں ہیں (ان دونوں سے سنین مذکورہ کی مطابقت نہیں ہوتی) ایک موجودہ زمانے کی مطبوعۂ ایران ہے۔ دوسری سر سید احمد خاں نے اپنی تالیف تبیین الکلام فی تفسیر التوراۃ والانجیل علیٰ ملۃ الاسلام" حصہ اول مطبوعہ ۱۸۶۲ء/۱۲۷۸ھ کے

بلند بلند مکانوں کے بالاخانوں کا عالم دیکھ کر آسمان زمین کا عالم تہ و بالا، نئے
نئے طور کے مکان منقش عالی شانوں پر سنہری کلسیوں کے چمکنے سے عجیب اُجالا،
صاحب علم و ہنر، نیک افعال و نیک کردار اور لوگ اچھے اچھے آرام چین سے
اس بستی میں بستے تھے۔ وہ پہپاوتی نگری مشہور تھی، اور راجہ گوبند چند
دانش و بخشش میں یکتا، نیک افعال، خجستہ خصال، مہر سے معمور، علم و
حیا سے مشہور، صورت و سیرت میں خوب خلق طالب وہ مطلوب، دوست

(بقیہ صفحہ گذشتہ)
آخر میں درج کی ہے۔ سر سید نے اپنی فہرست میں سنہ ۱۵۸۲ء کے بعد سے مطابقت کی دو جدولیں قائم کی ہیں
(۱) بموجب نئے حساب کے اور (۲) بموجب قدیم حساب کے۔ ایرانی فہرست اس قدیم حساب کے مطابق ہے
قدیم و جدید حساب میں گیارہ دن کا فرق ہے۔ مثلاً یکم محرم سنہ ۹۹۰ھ مطابق ۲۶ جنوری سنہ ۱۵۸۲ء تھی
تو یکم محرم سنہ ۹۹۱ھ مطابق ۱۵ جنوری سنہ ۱۵۸۳ء ہونی چاہیے، لیکن اسکو ۲۵ جنوری سنہ ۱۵۸۳ء کے
مطابق کر دیا گیا ہے۔ یعنی گیارہ دن چھوڑ دیے گئے۔ اس انقلاب تقویم کی تاریخ یہ ہے۔
تاریخ ترمیم تقویم: سنہ ۱۵۸۲ء میں پوپ گریگری نے مشہور ہیئت داں کلویس کے مشورہ سے
حکم دیا کہ ۴ اکتوبر سنہ ۱۵۸۲ء کو ۱۵ اکتوبر مانا جائے۔ اور صدی کے وہ سال سال کبیسہ مانے جائیں
جو ۴۰۰ پر پورے تقسیم ہو جائیں۔ یہ ترمیم تمام کیتھولک ممالک میں اختیار کر لی گئی لیکن کلیسائے
یونان اور اکثر پروٹسٹنٹ اقوام نے پوپ کی تعمیل حکم سے انکار کیا۔ پھر تقریباً دو صدی بعد
سنہ ۱۷۵۱ء میں انگلستان کی پارلیمنٹ نے اس ترمیم کو تسلیم کیا اور حکم جاری کر دیا کہ ۳ ستمبر سنہ ۱۷۵۲ء
کو ۱۴ ستمبر مانا جائے یعنی گیارہ دن چھوڑ دیے جائیں، اور آئندہ یہی حساب جاری رہے۔ یہ
حساب قدیم کہلاتا ہے۔ ہر چوتھے سال کو جو چار پر پورا تقسیم ہو جائے، سال کبیسہ ماننا اور اسکے
ایک مہینہ (فروری) میں ایک دن کا اضافہ کرنا، سنہ ۴۶ قبل مسیح میں جولیس سیزر نے جاری کیا
تھا۔ ان سالہائے کبیسہ میں سے ایسے سال کو خارج رکھنا جو ۴۰۰ پر تقسیم نہ ہوں (مثلاً
۱۷۰۰۔ ۱۸۰۰۔ ۱۹۰۰) گریگری کی ترمیم تھی۔

اس کے لطف سے شاد، دشمن اس کے قہر سے برباد، جا بجا اس کی دعا کی
غرض وہاں راج راجہ اندر کی طرح کرتا تھا۔"

(۲) ہفت گلشن۔ ناصر علی خاں واسطی بلگرامی نے کوئی اخلاقی کتاب فارسی میں تصنیف کی تھی، اس کا مظہر علی ولا نے یہ اردو ترجمہ کیا ہے۔ یہ بھی ڈاکٹر گل گرائسٹ کی فرمائش سے ۱۸۰۲ء (۱۲۱۷ھ) میں مرتب ہوئی۔ اس میں اخلاقی مضامین کو جا بجا حکایتوں سے دلچسپ و مؤثر بنایا ہے۔ اس کا بھی قلمی نسخہ برٹش میوزیم ہی میں پایا جاتا ہے۔ اور ہم اس کا نمونہ بھی ارباب نثر اردو ہی سے درج کرتے ہیں۔

"حکایت چوتھی مرغی اور مور کی ہے کہ ایک مرغی دانے کی تلاش میں جنگل کو گئی
اور ہر طرف دانہ چگنے لگی کہ ناگاہ ایک سوراخ پاس انڈے کتنے ایک مار سیاہ
کے پائے، تب خوش ہو کر نہایت شفقت و مہربانی سے ایک درخت کے نیچے
ان انڈوں کو اکٹھا کر کے اپنے پروں کے نیچے لے بیٹھی اور سینے لگی ۔۔۔"

(۳) بیتال پچیسی۔ یہ اصل میں سنسکرت زبان کی کتاب تھی۔ اس میں بیتال نامی ایک شخص کی کہی ہوئی ۲۵ کہانیاں ہیں۔ محمد شاہ کے زمانے میں اس کا ترجمہ "برج بھاشا" میں ہوا۔ اس ترجمے سے ولا نے ۱۸۰۳ء (۱۲۱۷ھ) میں اردو ترجمہ مرتب کیا۔ اس کی تیاری میں فورٹ کے ایک اور منشی للو لال جی نے ولا کو مدد دی۔ بیتال پچیسی کلکتہ میں اور ہندوستان کے مختلف مطابع میں متعدد بار چھپی اور مقبول ہوئی۔ اس میں جا بجا برج بھاشا کے الفاظ بجنسہ استعمال کئے ہیں۔ نمونہ یہ ہے:۔

"اسی عرصہ میں کسو راجہ کی بیٹی سہیلیوں کا جھنڈ ساتھ لیتے ہوئے اسی تالاب کے
دوسرے کنارے پر اشنان کرنے آئی، سو اشنان دھیان پوجا کر سہیلیوں کو ساتھ
لے درختوں کی چھانو میں ٹہلنے لگی۔ اُدھر دیوان کا بیٹا بیٹھا۔ اور راجہ کا بیٹا پھر تا تھا
کہ اچانک اس کی اور راجہ کی بیٹی کی چار نظریں ہوئیں۔ دیکھتے ہی اسکے روپ کو

راجہ کا بیٹا فریفتہ ہوا۔ اور اپنے دل میں کہنے لگا کہ اے خدا ال کام دیو مجھ کو کیوں ستاتا ہے۔ اور اس راج پتری نے اس کنور کو دیکھ سر میں جو کنول کا پھول لو جا کر رکھا تھا وہی پھول ہاتھ میں لے، کان سے لگا، دانت سے کتر، پاؤں تلے دبا پھر اٹھا چھاتی سے لگا لیا۔ اور سہیلیوں کو ساتھ لے، سوار ہو، اپنے مکان کو گئی اور یہ راج پتر نہایت نراس ہو، مرہ میں ڈوبا ہوا دیوان کے پاس آیا اور ساتھ شرم کے اس کے آگے حقیقت کہنے لگا۔"

(۴) تاریخ شیر شاہی۔ اکبر بادشاہ کے حکم سے عباس خاں شروانی نے شیر شاہ سوری بادشاہ دہلی کے عہد کی تاریخ فارسی میں لکھی تھی۔ اس کو مظہر علی خاں ولا نے کپتان جیمس مونٹ کے حکم سے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ ۱۸۰۵ء ۱۲۲۰ھ میں ترجمہ ختم ہوا لیکن کہیں شائع نہیں ہوا۔ گارساں دتاسی نے ۱۸۶۵ء میں اس کا فرانسیسی ترجمہ شائع کیا تھا۔ ولا کا ترجمہ قلمی صورت میں انڈیا آفس لندن میں ہے۔ ارباب نثر اردو سے اس کا نمونہ نقل کیا جاتا ہے:۔

"اس نے کہا اپنے بھائی میرداد کو شیر خاں کے پاس بھیجے تاکہ وہ اس سے یہ قرار داد کرے کہ ہم قلعہ دیتے ہیں لیکن اس شرط سے کہ تو عہد کرے کہ اس بیٹے بدبخت نے اپنے باپ کو مارا ہے اسکی ناک اور کان کاٹے گا اور دل کو کان ہوں۔ جب میرداد شیر خاں کے پاس گیا۔ اس سے یہ قسمیہ عہد و پیمان کیا کہ لاڈ ملکہ اور تم تینوں بھائیوں کے ساتھ کسی نوع کی مخالفت نہ کروں گا۔ اور مہمانداری کی رسم بخوبی بجا لایا۔ کوئی فروگذاشت نہ کی اور اسکے آنے سے نہایت خوش ہوا بہجت و انبساط حد سے زیادہ کیا، اور کہا کہ اگر لاڈ ملکہ میرے تین قلعہ دیوے اور مجھ سے نکاح کرے تو میں اس کا نہایت ممنون احسان ہوں گا۔ مرغ دل کا شکار کرنا احسان سے خوب ہے اور اچھے کاموں سے ہے۔"

(۵) جہانگیر نامہ۔ وِلاکی اس تالیف کا حال بجز اس کے کچھ معلوم نہیں کہ گارساں دتاسی نے لکھا ہے کہ تزک جہانگیری کے ایک حصہ کا ترجمہ مظہر علی خاں ولاؔ نے کیا تھا۔ اس کا کوئی قلمی یا مطبوعہ نسخہ دستیاب نہیں ہوتا۔

مرزا کاظم علی جوانؔ دہلی کے رہنے والے تھے۔ وہاں سے لکھنؤ آئے۔ لکھنؤ کے ریزیڈنٹ کرنل اسکاٹ کی سفارش سے فورٹ ولیم کالج میں ملازم ہوئے۔ ۱۸۰۱ء میں ڈاکٹر گل کرائسٹ کی فرمائش سے شکنتلا ڈراما کا ترجمہ کیا یہ ڈراما کالیداس نے سنسکرت میں لکھا تھا، اس کو نواز کبیشر نے برج بھاشا میں ترجمہ کیا تھا۔ اس ہندی کے ترجمے سے جوانؔ نے اردو میں ترجمہ کیا۔ اسکے دیباچہ میں یہ حال لکھا ہے:۔

"دوسرے ہی دن انھوں نے (ڈاکٹر گل کرائسٹ نے) نہایت مہربانی والطاف سے ارشاد فرمایا کہ سکونتولا کا ترجمہ اپنی زبان کے موافق کر، اور للولال جی کب کو حکم کیا کہ بلاناغہ لکھایا کرے، اگرچہ کبھی سوا نظم کے نثر کی مشق نہ تھی، لیکن خدا کے فضل سے بخوبی انصرام ہوا کہ جس نے سنا پسند کیا اور اچھا کہا، بہت سا پڑھنے لکھنے میں آیا اور کچھ چھپ کر اتفاقات سے رہ گیا۔ ان دنوں میں کہ ۱۸۰۴ء میں اوراحقر قرآن شریف کے ہندی ترجمہ کا محاورہ درست کرتا ہے صاحب ممدوح نے فرمایا ہم چاہتے ہیں کہ اس کتاب کو چھپوادیں، نظر ثانی لازم ہے اور اس کب کو فرمایا کہ تم بھی اس کتاب سے مقابلہ کرو کہ اگر کہیں مطلب کی کمی بیشی ہوئی ہو نہ رہے چنانچہ ہم انکا فرمانا بجا لائے۔ پھر موافق حکم صاحب کے بندے نے تھوڑا سا دیباچہ اور بھی لکھا"

اس کے بعد یہ کتاب لندن، بمبئی اور لکھنؤ سے بھی شائع ہوئی۔ نواز کبیشر نے یہ قصہ کبت اور دوہروں میں لکھا تھا۔ کاظم علی نے نثر میں لکھا اور موقع موقع پر ہندی

اشعار کی جگہ اپنے اردو کے شعر لکھ دئے۔ اگرچہ شاعری کے اعتبار سے ان میں کوئی خاص بات نہیں ہے، تاہم ایک لطف پیدا ہو گیا ہے۔ ہندی کے الفاظ بھی جا بجا استعمال کئے ہیں، اور وہ موزوں معلوم ہوتے ہیں۔ عبارت مقفیٰ لکھی ہے لیکن صاف و سلیس ہے اس لئے لطف کی تحریر کی طرح بے لطف نہیں ہے۔ ارباب نثر اردو سے اس کا مختصر نمونہ درج کیا جاتا ہے:۔

"غرض اس تپشوی کا یہی حال تھا، آٹھوں پہر تپ جپ کا خیال تھا، جو تسٹھ برس تک وہ بیابان نورد تھا، سر سے لگا کر پاؤں تلک گرد گرد تھا، بنا س پتی کھاتا رہتا بھوک پیاس کی ایذائیں سہتا اور رو بہ آفتاب ہو کر

گرمیوں میں وہ جگر تفتہ جلا کر گرد آگ | بیٹھتا تھا ڈھیر جیسے راکھ کا آوے نظر
اور جاڑوں میں گلے تک پانی میں جو کر کھڑا | جپ کیا کرتا تھا شوقِ دل سے ہر شام و سحر

ایسی باتیں سن کر راجہ اندر کو بہت سوچ پڑا، ڈر دل میں ہوا۔ اس کے اس جوگ کو توڑنے کیلئے منوکا پری کو بلا کر بہت سی آؤ بھگت کی، اور یہ احوال ظاہر کیا وہ راجہ کے حسن سلوک سے بہت خوش ہوئی اور اس مطلب کے سنتے ہی یوں لولی کہ میں وہ پری ہوں کہ اگر میرا سایہ بر تھا بشنو مہادیو پر پڑے دیوانے ہو جاویں

جو وے ہو ویں وحشی تو کر لوں میں رام | مری یاد میں بھولیں سب اپنے کام
یہ ایسی ہیں جادو بھری انکھڑیاں | رہے دیکھ کر ان کو سدھ بدھ کہاں
یہ احوال جب ایسے لوگوں کا ہو | رکھوں پاک دامن میں کب اور کو

وسوامتر کو ایک پل میں اپنے پر دیوانہ کر لوں، تمام عمر کو قشقہ کی جاگہ یہ کلنگ کا ٹیکا ماتھے پر دھر دوں۔۔۔۔۔۔

وہ ایک ایسا ستارہ تھی کہ تمام عالم کو جس نے روشن کر دیا، تس پر سنگار بارہ ابھرن جو اس نے سر سے پاؤں تلک کئے دن کو سورج اس کا جلوہ دیکھ رشک کی

آگ سے جلا، اور رات کو چاند غیرت سے داغ ہو کر ستاروں کے انگاروں پر لوٹا"

کاظم علی جوان کی یہ شکنتلا اردو میں پہلا ناٹک یا ڈراما ہے۔ یہ صنف ادب بھی لٹریچر کا ضروری جزو ہے اور اس کے آغاز کا بھی اسی کالج کے سر سہرا ہے۔

شکنتلا ناٹک کے علاوہ جوان نے ایک طویل نظم بارہ ماسہ یا "دستور ہند" لکھی جس میں ہندو مسلمانوں کے تہواروں کی تفصیل بیان کی۔ اور تاریخ فرشتہ کے ایک حصّہ کا بھی اردو میں ترجمہ کیا، لیکن یہ دونوں کتابیں اب نایاب ہیں۔ ان تصانیف کے علاوہ جوان نے للو لال جی کو سنگھاسن بتیسی لکھنے میں مدد دی۔ قرآن مجید کے اردو ترجمہ کو درست کیا اور شعرا کے کلیات کے انتخاب میں اعانت کی۔ مولوی حفیظ الدین کی کتاب خرد افروز کی ۱۸۱۵ء میں نظر ثانی کی۔

مولوی امانت اللہ شیدا

ان کا وطن، حالات، سنین ولادت و وفات وغیرہ بالکل نامعلوم ہیں۔ فورٹ ولیم کالج میں ملازم تھے۔ تصانیف سے معلوم ہوتا ہے کہ عربی و فارسی کے اچھے عالم تھے۔ کالج میں کام کرنے سے پہلے بطور خود انھوں نے فقہ اسلام کے متعلق ایک ضخیم کتاب عربی زبان میں ہدایت الاسلام کے نام سے لکھی تھی۔ پھر اس کے فائدے کو عام اور وسیع کرنے کے خیال سے اسی کتاب کا اردو میں ترجمہ کیا اور وہی نام رکھا۔ پہلی جلد ترجمہ کر کے ڈاکٹر گل کرائسٹ کے سامنے پیش کی۔ ڈاکٹر پر ان کے فضل و کمال کا بڑا اثر ہوا، اور ان کو عربی و فارسی کی مشکل کتابوں کے ترجمہ کے لئے ملازم رکھ لیا۔ انکی تالیفات یہ ہیں:- (۱) اردو ترجمہ ہدایت الاسلام دو جلدوں میں (۲) اردو ترجمہ اخلاق جلالی (۳) اردو ترجمہ قرآن مجید (۴) صرف اردو منظوم۔

(۱) ہدایت الاسلام کی پہلی جلد ۱۸۰۴ء میں فورٹ ولیم کالج سے

شائع ہوئی اور ڈاکٹر گل کرائسٹ نے اس کا انگریزی میں بھی ترجمہ کیا۔ نمونہ یہ ہے

"فصل کعبے کے درمیان نماز پڑھنے میں۔ فرض کی یا نفل کی نماز کعبہ کے اندر صحیح ہے اگرچہ مقتدی کا منہ امام کے منہ کی طرف ہو، اور جو مقتدی کی پیٹھ اسکے منہ کی طرف تو نماز اس کی صحیح نہیں ہوتی ہے۔ اور کعبہ کے اوپر مکروہ ہے۔ اور کعبہ کے چاروں طرف اقتدا کرنا گو بعضے مقتدی امام کی نسبت سے اس کی طرف نزدیک ہوں صحیح ہے، پر امام جس جانب میں ہے اگر مقتدی اسی طرف کو امام کی نسبت سے کعبہ کی طرف نزدیک ہو تو اسکی نماز درست نہیں کیونکہ اس تقدیر میں وہ امام کے آگے ہو جاوے گا اور مقتدی کو اس کے آگے کھڑا ہونا درست نہیں ہے۔"

(۲) ترجمہ قرآن مجید۔ ہدایت الاسلام کی دوسری جلد کا ترجمہ ختم کرنے کے بعد ڈاکٹر گل کرائسٹ کے حکم کے مطابق میر بہادر علی حسینی کے ساتھ ملکر قرآن مجید کا ترجمہ شروع کیا۔ لیکن اسی دوران میں ڈاکٹر صاحب بسبب علالت پنشن لیکر ۱۸۰۴ء میں ولایت چلے گئے۔ ان کے بعد کپتان جیمس مونٹ مقرر ہوئے۔ انھوں نے قرآن مجید کا ترجمہ موقوف کرادیا۔ اور جتنا ترجمہ مرتب ہوا تھا۔ اس کو بھی شائع کرنا گوارا نہ کیا۔ لیکن بعد کو کسی نے مولوی امانت اللہ کا مترجم حصہ شائع کر دیا۔ اس کا نمونہ یہ ہے۔

"اور نہیں کوئی چلنے پھرنے والا زمین میں مگر خدا ہی پر ہے اسکی روزی، اور جانتا ہے وہ اسکے ٹھیراؤ کو اور اسکے سونپے جانے کی جگہ کو۔ سب کچھ روشن کتاب میں ہے اور وہی تو وہ خدا ہے جس نے بنا ڈالا آسمانوں کو اور زمین کو چھ دن میں اور اس کا عرش پانی پر تھا، تاکہ آزمائے تمہیں کہ کون ہے تم میں سے بہتر چال چلن کی راہ سے۔ اور اگر کہتا ہے تو کہ ضرور تم اٹھائے جاؤ گے مرنے کے بعد

تو کہنے لگتے ہیں وہ لوگ کہ جو کافر ہو گئے کہ نہیں ہے یہ مگر صریح جادو۔"

(بارھویں پارہ کا شروع)

(۳) جامع الاخلاق یعنی اردو ترجمہ اخلاق جلالی کپتان جیمس مونٹ کی فرمایش سے مرتب کیا۔ خاتمہ کتاب میں لکھتے ہیں:۔

"جولائی کی بیسویں دو شنبہ کے دن ۱۸۰۵ء مطابق ۱۲۲۰ھ کے بہت محنت جانفشانی اور فضل یزدانی کی مدد اور صاحبان عالی شان کے اقبال کی برکت سے اس ہیچداں نے کتاب لوامع الاشراق فی مکارم الاخلاق عرف اخلاق جلالی کے ترجمہ سے فراغت کی۔ لیکن داناؤں کے نزدیک پوشیدہ نہ رہے کہ اس کے لآلی مطالب کو جو فارسی عبارت کے صدف میں پنہاں تھے غواص طبیعت نے دریائے فکر میں کس کس طرح سے غوطے مار کر نکالا اور ان آبدار موتیوں کو رشتہ تحریر میں پرو کر ریختہ زبان کے اردو بازار میں لا حاضر کیا۔"

مولوی امانت اللہ کا نام اسی ترجمہ کے سبب سے مشہور ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اخلاق جلالی جیسی علمی مشکل اور ضخیم کتاب کا ترجمہ کر لینا ہی ایک کارنامہ تھا لیکن حقیقت میں مولوی امانت اللہ کا ترجمہ کوئی بڑا کارنامہ ثابت نہ ہو سکا۔ انہوں نے لفظی ترجمہ کا اہتمام کیا ہے اور بہت سے عربی اور فارسی الفاظ بے ضرورت جنسہ رہنے دیے ہیں۔ عبارت میں سلاست نہیں رہی، اکثر تعقید اور پیچیدگی پیدا ہو گئی ہے۔ مثلاً

"لیکن بمقتضائے اسکے کہ معانی اسکے اسرار حکمت پر مشتمل اور احکام مصلحت کو شامل تھے یہ تشبیہ اس خیال سے کہ شاہد متناسب الاعضا اور عروس خوبیا کو کیا پریاں اور کیا دیبا، ہر لباس میں ہے وہ خوشنما، اس کی زلف مطالب کی عقدہ کشائی ناخن فکر کو تیز کر کے عقل حکمت شناس کی شاطگی سے آراستہ کیا۔"

لیکن اس سے صاف و سلیس عبارت بھی موجود ہے۔ لکھتے ہیں:۔

"عدالت پہلے شخص اور اسکے خصائل سے علاقہ رکھتی ہے جیسے اسکی طرف اشارہ ہوا ہے، پھر اسکے شریکوں کے ساتھ اہل خانہ یا شہر کے رہنے والوں میں سے ہوں اس واسطے پیغمبر خدا علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ہے کہ ہر ایک تم میں سے اپنے اعضائے جسمانی اور قوائے نفسانی کا نگہبان ہے، وہ قیامت میں پوچھا جائے گا انکے احوال سے، اور جب فرمایا کہ عادل لوگ منبر کے اوپر حق سبحانہ تعالےٰ کے نور کی مثال ہیں۔ صحابیوں نے پوچھا۔ وے کون آدمی ہیں، فرمایا وے جو پہلے اپنے حق میں اور اپنی اولاد کے حق میں عدالت کریں، پھر ان کے حق جو انکے ملک میں اور انکے تابع فرمان رہیں"

جامع الاخلاق کالج کی طرف سے شائع نہ کی گئی۔ مدت تک مسودہ کی صورت میں رہی۔ پھر کہیں طبع ہونے کی نوبت آئی۔ لوہے کے نستعلیق ٹائپ میں چھپی ہے۔ شائع کرنے والا لکھتا ہے کہ "اب سنہ ۱۲۶۴ھ ہجری میں موافق سنہ ۱۸۴۸ء کے ..... خادم الطلبا احقر غلام حیدر ساکن ہوگلی نے اس ترجمے کو کلکتے کے بیچ مطبع احمدی میں چھاپا۔ تاکہ طالب علموں کو اس سے فائدہ پہنچے اور عاصی کو ثواب ملے"۔ اس فقرے کے بعد غلام حیدر نے کتاب کی تعریف میں ایک قطعہ بہت خوبصورت لکھا ہے:۔

قطعہ

ہر ایک حکایت ہے حدیث لب شیریں　　ہر ایک ورق اس کا نقاب رخ لیلیٰ
گر خوان پہ تحسین کے سخن کی ہو مدارات　　مہمان ہو یہ۔ اور ہوں سب اسکے طفیلی

(۴) صرف اردو منظوم۔ مولوی امانت اللہ نے صرف اردو کے قواعد مثنوی کی صورت نظم کئے ہیں۔ اس کا نمونہ اس تاریخ کے حصہ نظم میں دکھایا جائے گا۔

شیخ حفیظ الدین انکے اسلاف خاندان عرب سے دکن آئے، اور پھر دکن سے بنگال چلے گئے۔ جب کلکتہ میں وارن ہیسٹنگز گورنر جنرل نے ایک مدرسہ (جس کو عیلیٹو کالج کہتے تھے) قائم کیا، تو اس میں شیخ حفیظ الدین احمد کے والد شیخ بلال الدین مدرس مقرر ہوئے۔ شیخ حفیظ الدین نے اسی مدرسہ میں تعلیم پائی۔ پھر جب فورٹ ولیم کالج قائم ہوا تو ڈاکٹر گل کرائسٹ نے ان کو مدرس مقرر کر لیا اور ڈاکٹر صاحب ہی کی فرمائش سے تصنیف و ترجمہ کا کام بھی کیا۔ کالج کی ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد ریزیڈنٹ دہلی کے میر منشی ہو گئے۔ ان کے علمی کارنامے یہ ہیں :-

خرد افروز۔ شیخ ابوالفضل علامی کی کتاب عیار دانش کا اردو میں ترجمہ کیا۔ یہ وہی کلیلہ دمنہ کی داستان ہے جس کا شمار دنیا کے مشہور فسانوں میں ہے۔ اصل میں سنسکرت زبان میں تصنیف ہوا تھا۔ ہندوستان سے ایران پہنچا قدیم فارسی زبان میں ترجمہ کیا گیا، فارسی سے عربی میں لکھا گیا۔ اسی کا بہترین پیرایہ انوار سہیلی ہے جس سے ملا حسین واعظ کاشفی کا نام روشن ہے۔ اسی کو ابوالفضل نے عیار دانش کے نام سے مرتب کیا، لیکن علامی کی تالیف کاشفی کا چربہ نہیں ہے۔ دونوں میں اختلاف ہے اردو میں یہ قصہ پہلی مرتبہ حفیظ الدین نے عیار دانش سے لکھا ہے انکے بعد اوروں نے بھی اردو میں لکھا۔ انیسویں صدی کے آخر تک کم سے کم سات مختلف لوگوں کے اردو قصوں کا پتہ چلتا ہے۔ ان میں سے جان بہاری لال راضی کا فسانہ ارژنگ راضی منظوم ہے جو ۱۸۸۵ء میں شائع ہوا ہے۔ اور سب سے مشہور فقیر محمد خاں گویا کا بستان حکمت ہے جو ۱۸۳۵ء ۱۲۵۱ھ میں مرتب ہوا (اس کا ذکر و نمونہ آگے درج کیا جائے گا)

حفیظ الدین احمد نے اپنے والد کی مدد سے عیار دانش کا ترجمہ کر کے ڈاکٹر گل کرائسٹ

کے سامنے پیش کیا۔ انھوں نے اس کے طرز بیان کو بہت پسند کیا۔ عبارت صاف و سادہ ہے اگرچہ میر امن کی سی شگفتگی نہیں ہے، لیکن باقاعدہ و بامحاورہ نثر ہے۔ تکلفات سے خالی ہے۔ اور فورٹ ولیم کالج کے اکثر مصنفین سے بہتر ہے اس لئے مترجم اور کالج دونوں کی طرف سے اردو زبان کی قابل قدر خدمت ہے اسی لئے بہت مقبول ہوئی۔

خرد افروز کالج کی طرف سے ۱۸۰۵ء میں شائع کی گئی۔ اسکے بعد ۱۸۱۵ء میں حفیظ الدین کی ترک ملازمت کے بعد کپتان ٹامس روبک نے میر کاظم علی جوان وغیرہ سے نظر ثانی کرانے کے بعد شائع کی۔ پھر ۱۸۵۰ء میں انگلستان سے اس کا نہایت عمدہ اڈیشن نکلا۔ انگریزی میں بھی خرد افروز کا پورا ترجمہ شائع ہوا۔ مختصر نمونہ یہ ہے

"چاروں دوست ایک دل خوشی سے منزل طے کرتے اور ایک دوسرے کو دیکھ کر فارغ بال و آسودہ حال رہتے تھے۔ دور دراز منزل کو طے کرکے شہر نسطور میں پہنچے اور شہر کے ایک کنارے اچھی جگہ اترے، کسی کے پاس کچھ خرچ کو نہ رہا تھا۔ ان یاروں میں سے ایک نے کہا، اب وقت ہے کہ ہر کوئی اپنا اپنا ہنر دکھلادے اور زور بازو سے کچھ بہم پہنچا دے۔ تو چین سے چند روز اس شہر میں رہیں۔ بادشاہ زادے نے کہا، سب کام خدا کی تقدیر پر موقوف ہیں آدمی کی کوشش سے سرانجام نہیں ہو سکتے۔ جو لوگ دانا ہیں اس کی تلاش میں نہیں دوڑتے۔ خوبصورت نوجوان نے کہا حسن، دولت کے حاصل کرنے میں بڑا ایک وسیلہ ہے، جہاں اسکی نمود ہو۔ دولت تابع ہوگی۔ سوداگر بچہ نے بھی حال اپنا ظاہر کرکے کہا کہ حسن کی پونجی معاملہ کے بازار میں ایک متاع بے بہا ہے اور تھوڑے عرصہ میں اس سے کچھ منفعت نہیں ہوتی بھلائے صواب و تدبیر درست اور کاردانی و معاملہ فہمی کا فائدہ سب چیزوں سے

زیادہ ہے جو بے سامان اس کو اختیار کرے جلد اپنے مطلب کو پونہچے۔ دہقان بچے نے کہا کہ معاملہ فہمی و کاردانی سب وقت کام نہیں آتی ہے۔ اکثر میں نے دانا کو حیران اور نادان کو کامیاب دیکھا ہے۔ بہت سے کسب اور کوششیں ہیں جو آدمی کو کامیاب و مقصد ور بناتی ہیں۔ اور ہنر و حرفہ عقلمند کے سامان و دولت کا وسیلہ ہوتا ہے۔"

خلیل علی خاں اشک ان کے ذاتی حالات دریافت نہیں ہوئے ۱۲۱۵ھ/۱۸۰۱ء میں ڈاکٹر گلکرائسٹ کی فرمائش سے داستان امیر حمزہ اردو میں لکھی۔ اسکے متعلق اشک کا بیان یہ ہے:-

"مخفی نہ رہے کہ بنیاد اس قصہ دلچسپ کی سلطان محمود بادشاہ کے وقت سے ہے۔ اور اس زمانے میں جہاں تک راویان شیریں کلام تھے انھوں نے آپس میں مل کر واسطے سنانے اور یاد دلانے منصوبے لڑائیوں اور قلعہ گیری اور ملک گیری کے خاص بادشاہ کے واسطے امیر حمزہ صاحب کے قصہ کی چودہ جلدیں تصنیف کی تھیں ہر رات کو ایک داستان حضور میں سناتے تھے انعام و اکرام پاتے تھے۔ اب شاہ عالی جاہ عالم بادشاہ کے عہد میں مطابق سنہ بارہ سو پندرہ ہجری اور سنہ اٹھارہ سو ایک عیسوی کے خلیل علی خاں نے جو متخلص بہ اشک ہے حسب خواہش مسٹر گلکرسٹ صاحب عالی شان والا مناقب بنا بر آموزان زبان ہندی اس قصہ کو اردوئے معلّٰی میں لکھا تاکہ صاحبان مبتدیان کے پڑھنے کو آسان ہو وے۔"

خلیل علی خاں کے بعد داستان امیر حمزہ کو منشی نول کشور نے حافظ سید عبداللہ بلگرامی سے مرتب کرا کے شائع کیا۔ پھر مطبع نول کشور کے مشہور مصنف و

مصنف سید تصدق حسین نے اس کو اپنے طرز پر لکھا۔ اس زمانے میں فسانۂ عجائب کی بڑی دھوم تھی، اور اس کی رنگین عبارت آرائی نہایت مقبول تھی۔ سید تصدق حسین نے قصہ امیر حمزہ کو شاعرانہ صنعت گری کا عجائب خانہ بنا دیا۔ اور اپنے نزدیک فسانۂ عجائب کا جواب لکھ دیا۔ اس کے مقابلے میں خلیل علی خاں کا طرز بیان سادہ اور سلیس ہے۔ انھوں نے بھی کہیں کہیں رنگین و مقفّٰی فقرے لکھے ہیں اور خیال آرائی کی ہے لیکن اس قدر نہیں کہ ناظرین پر بار گزرے صنائع و استعارات و تشبیہات بھی معتدل ہیں۔ فارسی ترکیبیں بھی معقول حد تک ہیں۔ خلیل علی خاں نے اگرچہ فارسی زبان کے قصے سے اپنی داستان مرتب کی ہے لیکن اس میں ہندوستانی رسم و رواج اور مناظر کو داخل کر کے ہندوستانی مذاق کے مطابق بنا دیا ہے۔

بعد کے لوگوں نے اسی ایک قصہ کو طول دیکر بڑی ضخیم کتابیں طلسم ہوش ربا، طلسم ہشت پیکر وغیرہ تیار کر دیں۔ سید تصدق حسین اپنی تالیف میں ایک قصہ کو اس طرح شروع کرتے ہیں :-

"نخل بندان بوستان اخبار، چمن پیرایان گلستان اظہار، تختۂ کاغذ صاف میں اس طرح اشجار الفاظ موقع بموقع نصب فرماتے ہیں صحن شفاف قرطاس کو گل ریاحین مضامین رنگا رنگ سے یوں رشک تختۂ ارژنگ بناتے ہیں کہ جب باغ بیداد تیار ہوا نمونۂ بہشت شداد نمودار ہوا القش خوشی سے پھول گیا۔ فکر دارین بھول گیا"

خلیل علی خاں اسی داستان کو اس طرح لکھتے ہیں :-

"یہاں سے دو کلمہ داستان ملک القش کے ملاحظہ فرمائیے۔ جبکہ وہ باغ تیار ہوا، ایک دن بادشاہ کے حضور میں عرض کی غلام نے ایک باغ حضور کی بدولت بنایا ہے اور بندہ امیدوار ہے کہ ظل سبحانی وہاں رونق افروز ہو کر ایک چمہ

آش نوش جان فرمائیں کہ باعث عزت از دیاد خانہ زاد ہے۔

شاہاں چہ عجب گر بنوازند گدارا

اس کے علاوہ خلیل علی خاں نے کپتان ولیم ٹیلر کی فرمائش سے ابوالفضل کے اکبرنامہ کا ۱۸۰۹ء میں ترجمہ کیا اور واقعات اکبر نام رکھا۔ لیکن شائع نہیں ہوا۔

اکرام علی ان کے حالات بھی معلوم نہیں۔ فورٹ ولیم کالج میں رہ کر صرف ایک کتاب اخوان الصفا ہندی لکھی ہے۔ اخوان الصفا کے نام سے بصرہ میں ایک انجمن تھی۔ اسکے اراکین نے متعدد رسالے مختلف علمی مباحث کے متعلق لکھے ہیں۔ یہ "رسائل اخوان الصفا" عربی زبان کی مشہور و مقبول تصنیف ہے۔ ان میں سے پہلے رسالہ میں مخلوقات کی افضلیت کے دعوے پر انسان اور حیوانات میں مباحثہ ہے، جنوں کا بادشاہ ان کا حَکَم و منصف ہے۔ آخر میں انسان کا فضل و شرف اس بنا پر تسلیم کیا جاتا ہے کہ جملہ مخلوقات میں صرف انسان خلافت الٰہی کا اہل اور بار امانت کا حامل ہے۔ اس رسالہ کو مولوی اکرام علی نے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ اسکے متعلق لکھتے ہیں:-

"جب میں بموجب حُسن ایما جناب صاحب نامدار...... خداوند نعمت مستر ابراہم لاکٹ صاحب بہادر دام اقبالہ کے اور موافق طلب اخی داستاذی جناب بھائی صاحب مولوی تراب علی صاحب دام ظلہم کے شہر کلکتہ میں آیا۔ اور رہنمونی طالع سے بعد حصول شرف ملازمت مورد عنایت و مرحمت ہوا۔ ازبسکہ صاحب موصوف کو کمال پرورش منظور تھی، سرکار کمپنی بہادر میں نوکر رکھوا کر اپنے پاس متعین کر لیا۔ بعد چند روز کے باستصواب جناب عالی شان .... مدرس ہندی کپتان جان ولیم ٹیلر صاحب بہادر دام دولتہ نے فرمایا کہ رسالہ اخوان الصفا کہ

انسان وبہائم کے مناظرے میں ہے تو اس کا زبان اردو میں ترجمہ کر، لیکن نہایت سلیس کہ الفاظ مغلق اس میں نہ ہوویں بلکہ اصطلاحات علمی اور خطبے بھی اسکے کہ تکلف سے خالی نہیں ہیں قلم انداز کر، صرف خلاصہ مضمون مناظرہ کا ہونا چاہیے۔ مترجم نے بموجب فرمانے کے فقط حاصل مطلب کو محاورۂ اردو میں لکھا، خطبوں کو نکال ڈالا، اور اکثر اصطلاحات علمی کہ مناظرے سے ان کو علاقہ نہ تھا ترک کیں، مگر بعضے خطبے اور اصطلاحات ہندی وغیرہ کہ اصل مطلب سے متعلق تھے باقی رکھے۔"

یہ رسالہ ۱۸۱۰ء/۱۲۲۵ھ میں اکرام علی نے لکھا، ۱۸۱۱ء میں پہلی مرتبہ شائع ہوا۔ اسکے بعد بمبئی وغیرہ میں چھپا۔ انگریزی میں بھی ترجمہ کیا گیا۔ نمونہ یہ ہے:۔

"بادشاہ نے کہا یہ جو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ یعنی انسان کو ہم نے نہایت سڈول بنایا ہے اس کا کیا جواب دیتے ہو۔ اس نے عرض کیا جہاں پناہ، کلام ربانی میں ظاہری معنوں کے سوا بہت سی تاویلیں ہیں کہ بغیر اہل علوم کے کوئی نہیں جانتا۔ تفسیر اس کی عالموں سے پوچھا چاہیے۔ چنانچہ ایک حکیم دانشمند نے بموجب حکم بادشاہ کے مطلب اس آیت کا یوں ظاہر کیا جس دن اللہ تعالیٰ نے آدم کو پیدا کیا، سبھ گھڑی، نیک ساعت تھی۔ ستارے اپنے اپنے برج شرف میں جلوہ گر اور ہیولیٰ عناصر کے، واسطے قبول کرنے صورتوں کے آمادہ و مستعد تر تھے۔ اسلئے صورتیں اچھی، قد سیدھے، ہاتھ پاؤں درست بنے، اور احسن تقویم کے ایک معنی اور بھی اس آیت سے ظاہر ہوتے ہیں فَعَدَلَكَ فِي أَيِّ صُورَةٍ مَا شَاءَ رَكَّبَكَ یعنی اللہ تعالیٰ نے انسان کو حد اعتدال پر پیدا کیا ہے نہ بہت لمبا بنایا نہ چھوٹا۔ بادشاہ نے کہا اس قدر اعتدال اور مناسبت، اعضا کی واسطے فضیلت کے کفایت کرتی ہے۔ حیوانوں نے عرض کیا کہ ہمارا بھی یہی حال ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ہم کو بھی ساتھ اعتدال کے جو مناسب تھا ہر ایک عضو بخشا۔ اس
فضیلت میں ہم اور تم برابر ہیں۔ انسان نے جواب دیا کہ تمہارے لئے مناسبت
اعضا کی کہاں ہے۔ بصورتیں نہٹ مکروہ، قد بے موقع، ہاتھ پاؤں بھدّے سے
کیونکہ تم میں سے ایک اونٹ ہے۔ ڈیل بڑا، گردن لنبی، دم چھوٹی۔ اور ہاتھی
ہے جس کا ڈیل ڈول بہت بڑا اور بھاری، دو دانت منہ سے باہر نکلے ہوئے
کان چوڑے۔ آنکھیں چھوٹی چھوٹی"

ایک اور فصل کا اقتباس:۔

"بادشاہ نے کہا جنوں کی قوم میں نیک و بد اور مسلمان و کافر ہوتے ہیں جس طرح
انسانوں میں۔ جو کہ نیک ہیں وہ اپنے رئیس کی اطاعت و فرماں برداری اس قدر
کرتے ہیں کہ آدمیوں سے کبھی نہیں ہو سکتی۔ اس واسطے کہ اطاعت و فرماں برداری
جنات کی مثل ستاروں کے ہے۔ آفتاب ان میں تمیز تو بادشاہ ہے اور سب ستارے
بجائے فوج و رعیت کے ہیں۔ چنانچہ مریخ سپہ سالار، مشتری قاضی، زحل خزانچی
عطارد وزیر، زہرہ حرم، ماہتاب ولی عہد ہے۔ اور ستارے گویا فوج و رعیت ہیں
اس واسطے کہ سب آفتاب کے تابع ہیں، اسی کی حرکت سے حرکت کرتے ہیں۔ وہ
جو ٹھہر رہتا ہے، سب متوقف ہو جاتے ہیں، اپنے معمول و حد سے تجاوز نہیں کرتے۔
یعسوب نے پوچھا کہ ستاروں نے یہ خوبی اطاعت و انتظام کی کہاں سے حاصل
کی۔ بادشاہ نے کہا یہ فیض ان کو فرشتوں سے حاصل ہے کہ وہ سب اللہ تعالیٰ
کی فوج ہیں۔ اور اس کی اطاعت کرتے ہیں"

تمام کتاب میں اس طرح کے مکالمات اور مباحثات نہایت دلچسپ ہیں۔ مختلف
مسائل و موضوعات کے متعلق معلومات کا خزانہ جمع کر دیا ہے۔ مولوی اکرام علی
نے نہایت خوبی سے ترجمہ کیا ہے۔ متروک الفاظ، قدیم محاورے، قواعد زبان سے

اختلاف بہت کم ہے تمثیل نگاری کا (جس کو انگریزی میں "ایلیگری" کہتے ہیں) نہایت نادر نمونہ ہے۔ انوار سہیلی پر فسانہ کا رنگ غالب ہے اخوان الصفا میں علمی شان بھی ہے اور دلچسپی بھی ہر جگہ قائم رہتی ہے

نہال چند لاہوری

دہلی کے رہنے والے تھے، وہاں سے پنجاب چلے گئے لاہور کو وطن بنا لیا اور لاہوری مشہور ہوئے۔ ایک انگریز کپتان دلورٹ کی سفارش سے فورٹ ولیم کالج میں ملازم ہوئے۔ اور ڈاکٹر گل کرائسٹ کی فرمایش سے ۱۸۰۳ء (۱۲۱۷ھ) میں گل بکاؤلی کا قصہ فارسی سے اردو میں ترجمہ کیا۔ فارسی میں عزت اللہ بنگالی نے لکھا تھا۔ نہال چند نے مذہب عشق تاریخی نام رکھا۔ کتاب کے آخر میں ہجری و عیسوی تاریخیں نکالی ہیں۔ لکھتے ہیں:۔

غرض جس طرح سے کیا ان کو شاد | ہماری بھی دے یا الٰہی مُراد
یہ قصہ ہوا جب بخوبی تمام | تو پھر فکر تاریخ تھی صبح و شام
یکایک سُنی میں نے آواز غیب | کہ ہے "مذہب عشق" تاریخ و نام
۱۲۲۷ھ

ہوئی پھر یہ خواہش کہ کلکِ زباں | کریں عیسوی سال کو بھی عیاں
تو پھر ہاتف غیب نے دی ندا | کہ اس مذہب عشق میں کوئی آ
۱۲۲۷ھ

کرے مشرب جام اگر اختیار | تو راز نہاں اس پہ ہو آشکار

یعنی مذہب عشق میں مشرب ۵۵۰ جام کو ملایا جائے تو ۱۸۰۳ء حاصل ہو جائیں گے

لالہ نہال چند نے نہایت سلیس، صحیح، با محاورہ، با قاعدہ زبان لکھی ہے۔ متروک الفاظ اور محاورے خال خال ہیں۔ پہلی مرتبہ مذہب عشق ۱۸۰۴ء میں شائع ہوا

دوبارہ اشاعت کے وقت میر شیر علی افسوس نے نظر ثانی کی۔ اس کے بعد بھی ہندوستان کے مختلف مطابع میں بار بار شائع ہوا۔ اسی قصہ کو پنڈت دیا شنکر نسیم نے نظم کرکے گلزار نسیم نام رکھا۔ ۱۸۳۸ء / ۱۲۵۴ھ میں یہ مثنوی لکھی گئی۔ اس نظم کی خوبی و لطف نے نہال چند کے قصہ کی شہرت و مقبولیت کو کم کر دیا۔ مذہب عشق کا نمونہ یہ ہے

اُس نے کہا کہ آج تم یہ گٹھے میرے آقا کے باورچی خانہ میں لے چلو، دولت خانہ اس کا نزدیک ہے، اس نے اس ویرانہ میں ایک شہر آباد کیا ہے، واجبی قیمت ملے گی، بلکہ ایسا انعام پاؤ گے کہ پھر کہیں اور لکڑیاں بیچنے نہ جاؤ گے! انھوں نے کہا کہ ہماری تمام عمر اسی کام میں اور اسی بیابان سے لکڑیاں لیجاتے گزری ہے۔ لیکن آبادی کا یہاں نشان نہ دیکھا نہ سُنا۔ ساعد نے کہا ذرا تم آگے بڑھ کر دیکھو اگر میرے کہنے کا کچھ اثر ظاہر ہو تو بہتر، نہیں تو تمہارے پھر آنے کا کوئی مانع نہ ہوگا۔ لکڑہارے انعام کے لالچ سے ساعد کے آگے ہو لئے، پھر تھوڑی دور جاکر سب ایکبارگی پکار اُٹھے کہ نعوذ باللہ من الشیطان الرجیم! اے میاں، تم ہمیں آگ میں جھونکنے کو لئے جاتے ہو، چولھے میں جائے انعام اور بھاڑ میں پڑے اکرام بس ہمیں معاف کرو ہم نے بھر پایا۔ ساعد نے کہا یہ شعلۂ آتش نہیں حویلی کے جواہرات چمک رہے ہیں۔ تم ہرگز اندیشہ نہ کرو اور میرے ساتھ چلے آؤ۔ وہ اس کے کہنے سے کچھ اور بھی بڑھے آگے ساری زمین سونے کی نظر آئی۔ سب نے اسکی بات سچی پائی، قدم اُٹھائے بیدھڑک چلے ؎

بینی نراین جہاںؔ لاہور کے رہنے والے تھے، ان کے والد مہاراجہ لکشمی نراین بڑے رئیس تھے۔ ان کے بھائی رائے کھم نراین عالمؔ شاعر تھے، رندؔ تخلص کرتے تھے۔ بینی نراین گردش روزگار سے تباہ ہو کر کلکتہ پہنچے اس زمانے

یں ڈاکٹر گل کرائسٹ فورٹ ولیم کالج سے رخصت ہو کر ولایت چلے گئے تھے۔ بینی نراین ایک عرصہ تک کلکتہ میں بیکار اور پریشان رہے پھر حیدر بخش حیدری کے وسیلہ سے کالج میں ملازم ہوئے۔ ان کی تصانیف یہ ہیں۔ (۱) چار گلشن۔ (۲) دیوان جہاں (۳) ترجمہ تنبیہ الغافلین۔ یہ کبھی شائع نہیں ہوئیں۔ برٹش میوزیم اور انڈیا آفس میں انکے مسودے محفوظ ہیں "ارباب نثر اردو" سے ان کے نمونے درج کئے جاتے ہیں۔

(۱) چار گلشن عشقیہ قصہ ہے بینی نراین نے ۱۸۱۱ء ۱۲۲۵ھ میں یہ قصہ امام بخش صہبائی کو زبانی سنایا تھا۔ انھوں نے پسند کیا اور لکھنے کی رائے دی۔ انکے مشورے کے مطابق بینی نراین نے لکھا تھا۔ کلکتہ میں کپتان روبک اور کپتان ٹیلر کے سامنے پیش کیا۔ دونوں نے پسند کیا اور معقول صلہ دیا۔ نمونہ یہ ہے:۔

"زمانہ گزشتہ کے نقل بیان کرنے والوں اور ایام سلف کے قصہ کہنےہاروں نے ان نادر قصوں اور عجیب حکایتوں کے گوہر آبدار کو رشتہ بیان میں اس طرح منسلک کیا ہے کہ بیچ بلاد خجستہ بنیاد وسعت آباد ہندوستان جنت نشان کے شہروں سے کسی شہر میں ایک بادشاہ جم جاہ، نہایت عالیشان والا دودمان تھا جق سبحانہٗ تعالیٰ نے شان و شوکت اور جاہ و حشمت اس کو اس قدر عطا فرمائی تھی کہ اس زمانے میں کوئی دوسرا بادشاہ اس کی برابری نہ کر سکتا تھا اور اس کے داب و رعب کے آگے پاؤں رستم کا بھی نہ ٹھہر سکتا تھا بیت

فلک مرتبت تھا وہ کیوان شاہ | دو مشعل فروزاں کے تھے مہر و ماہ"

(۲) دیوانِ جہاں۔ یہ شعرائے اردو کا تذکرہ ہے جو بینی نراین جہاں نے کپتان روبک کی فرمائش سے ۱۸۱۲ء ۱۲۲۹ھ میں مرتب کیا۔ اس میں ۱۲۵ شاعروں کا مختصر حال ہے جن میں بہت سے ایسے لوگ بھی شامل ہیں جن کا اور کہیں ذکر نہیں ملتا۔ بینی نراین نے اپنا کلام تقریباً سب کا سب درج کر دیا ہے، گویا یہی تذکرہ "دیوان جہاں" بھی ہے

فورٹ ولیم کالج میں ہر سال ۲۵؍جولائی کو مشاعرہ ہوا کرتا تھا جس میں کالج و بیرون کالج کے شعرا شریک ہوتے تھے۔ دیوانِ جہاں میں ایک مشاعرہ کی غزلیں بھی آخر میں بطور ضمیمہ شامل ہیں۔ تذکرہ کا نمونہ یہ ہے:۔

"محبت تخلص، نام نواب محبت خاں، نواب حافظ رحمت خاں کے بیٹے، بریلی کے رہنے والے۔ اس نحیف پر نہایت مہربانی فرماتے تھے، اور ہفتہ میں ایک بار چہار شنبہ کے دن اس خاکسار کے غریب خانہ میں تشریف لاتے تھے۔"

(۳) تنبیہ الغافلین۔ اس نام سے ایک کتاب مولانا شاہ رفیع الدین دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (مترجم قرآن مجید) نے مولوی سید احمد بریلوی کی فرمائش سے فارسی میں لکھی تھی۔ بینی نراین جہاں نے اس کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ جہاںؔ کے مسلمان ہو جانے اور مولوی سید احمد کے ہاتھ پر بیعت کرنے کی اطلاع کا ذمہ دار فرانسیسی مستشرق پروفیسر گارسن دتاسی ہے۔ اس نے اپنے تذکرہ شعرا میں بھی جہاںؔ کا حال لکھا ہے اور اپنے پانچویں خطبہ (۱۸۵۴ء) میں جہاںؔ کی تصانیف کے سلسلے میں لکھا ہے:۔

"تیسری ایک کتاب "تنبیہ الغافلین" کا ترجمہ ہے۔ یہ ایک مذہبی کتاب ہے جو فارسی زبان میں مشہور مسلمان مصلح اور فرقہ وہابی کے بانی سید احمد کی فرمائش پر تالیف ہوئی تھی۔ اس کتاب کے اور ترجمے بھی ہندوستانی زبان میں ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جہاںؔ فرقہ وہابی سے تعلق رکھتا تھا، یا کم سے کم مسلمان ہو گیا تھا، کیونکہ وہ اس کتاب کے دیباچہ میں اس طرح لکھتا ہے جیسے سچ مچ کا مسلمان ہو۔"

خطبات گارسن دتاسی صفحہ ۹۰ و صفحہ ۹۱ مطبوعہ انجمن ترقی اردو

تنبیہ الغافلین کے جو ترجمے مطبوعہ ملتے ہیں وہ بینی نراین کے نہیں ہیں، دوسرے مصنفوں کے ہیں۔ ان میں ۲۵ باب ہیں۔ اور بینی نراین کے ترجمہ میں (جو مسودے کی صورت میں انڈیا آفس میں موجود ہے) ۲۰ باب کا ترجمہ ہے۔ اس کا نمونہ یہ ہے:۔

"بنی اسرائیل سے ایک جگہ تین بھائی تھے۔ ان میں ایک بڑا دانا تھا۔ اس نے اپنے بھائیوں سے کہا اے بھائیو، ماں باپ کی خدمت ہم کو سپرد کرو تو ہم بجا لاویں بعد مرنے کے جب میراث ان کی ملے گی، تم دونوں ہی بانٹ لیجیو۔ یہ بات سن کر وہ بہت خوش ہوئے اور ایسا ہی کیا۔ الغرض وہ اکیلا خدمت ان کی کرنے لگا۔ جب ماں باپ ان کے مر گئے، یہ دونوں بھائی ورثہ ان کا پا کر خوش گذران کرنے لگے، اور بڑے بھائی کو اس مال سے کچھ نہ دیا۔ اس نے چھوٹے بھائیوں سے کہا، اے بھائیو جیسا ماں باپ کے وقت میں کھانے پینے کو پاتا تھا ایسا ہی اب مجھ کو دو میں اور کچھ نہیں مانگتا ہوں۔ اس کی زندی یہ بات سن کے قضیہ کرنے لگی۔ ایک رات اس بیچارے نے خواب میں دیکھا کہ ایک آدمی کہتا ہے کہ فلانی جگہ سو دینار سونے کے گڑے ہیں تو نکال لے۔ اس نے اعتبار نہ کیا۔ آخر یہی بات تین رات پیہم خواب میں دیکھا کیا۔ بعد اس کے جو اس جگہ کو کھودا تو وہ دینار پائے۔"

للّو لال جی گجرات کے برہمن تھے لیکن اوائل عمر میں شمالی ہند میں آ بسے تھے۔ یہ بھی فورٹ ولیم کالج میں شروع زمانہ ہی میں ملازم ہو گئے تھے۔ اس کالج میں اردو کے ساتھ ہندی کی تصنیف و ترجمہ کا کام بھی جاری کیا گیا تھا۔ ہندی میں سب سے زیادہ کارنامہ للّو لال کا ہے، اور ان کے بعد ان کے رفیق کار سدل مسر کا۔ مسر اجی نے صرف ایک قصہ ہندی زبان میں لکھا ہے۔ للّو لال نے سب سے پہلے پریم ساگر لکھی جو ۱۸۰۳ء میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب بھگوت گیتا کے دسویں باب کا ترجمہ ہے اس سے پہلے ایک اور شخص پنڈت چتر بھوج مسر نے اس کو برج بھاشا میں لکھا تھا لیکن اس زمانے کی دیگر تصانیف کی طرح اس میں کثرت سے سنسکرت الفاظ تراکیب، محاورات تھے، گویا برج بھاشا سے زیادہ سنسکرت کی کتاب تھی۔ اس لئے عام فہم

تھی۔ للّولال نے سنسکرت زبان کا عنصر کم کر کے آسان زبان میں ترتیب دی۔ اسکی عبارت مقفی ہے اور جا بجا اشعار بھی حسب موقع ہیں۔ یہ پریم ساگر موجودہ ہندی لٹریچر کا سنگ بنیاد ہے اس سے پہلے اس سے زیادہ صاف کھڑی بولی اور عام فہم شمالی ہند کی بھاشا میں کوئی نثر ہندی کی کتاب موجود نہیں ہے۔

پریم ساگر کے علاوہ للّولال نے راج نیتی ہندی میں لکھی، اس میں کہانیوں کے

ہندی زبان کی تاریخ

اردو اور ہندی دونوں زبانیں ایک ہی پراکرت یعنی "برج بھاشا" کی دو صورتیں ہیں۔ اور اپنی تقویم و ترقی میں ایک دوسری سے متاثر ہیں۔ نیز اسی زمانے میں فورٹ ولیم کالج کے ذریعہ سے ہندی زبان کی موجودہ ادبیات کا آغاز ہوا ہے، اس لئے ادبیات ہندی کی مختصر تاریخ، ناظرین تاریخ اردو کے لئے دلچسپی اور فائدہ سے خالی نہ ہوگی۔ ہندوستان کی تمام زبانیں انڈو آرین زبان کی شاخیں ہیں۔ اس زبان کی علمی صرف۔ سنسکرت نہایت مکمل، وسیع، باقاعدہ زبان ہے۔ لیکن صرف علمی و کتابی زبان ہے۔ پہلے بھی سنسکرت کبھی عام بول چال میں داخل نہیں ہوئی۔ عام بول چال کی زبان کو سنسکرت کے مقابلے میں پراکرت کہتے ہیں۔ اس کی صورتیں صوبے صوبے میں مختلف ہیں۔ کہیں زیادہ فرق ہے کہیں کم۔ ہندوستان کے نصف شمالی کی پراکراتوں کی تقسیم اس طرح ہو سکتی ہے:-

(۱) راجستھانی، اس میں میواتی، مارواڑی، جیپوری اور مالوی زبانیں شامل ہیں۔ ان میں سے مارواڑی علمی زبان ہے۔ اس حصۂ ملک میں برج بھاشا بھی شاعری کیلئے مستعمل ہے (۲) پچھمی بھاشا اس میں پنجابی، برج بھاشا، قنوجی، بندیلی زبانیں شامل ہیں (۳) پوربی بھاشا اس میں بگھیلی چھتیس گڑھی، بیسواڑی (راجودھیا کی زبان) شامل ہیں۔ ان میں سے اودھ یعنی اجودھیا کی زبان علمی شان رکھتی ہے (۴) بہاری جو بنگالی کی ایک صورت خاص ہے۔

ان بولیوں میں برج بھاشا کو سب سے زیادہ وسعت حاصل ہوتی۔ باوجودیکہ پنجاب، بہار اودھ، راجپوتانہ وغیرہ میں الگ الگ بولیاں موجود تھیں، لیکن شاعری کی زبان (بقیہ برصفحہ آئندہ)

ذریعہ سے اخلاق و حکومت کے آداب بتائے ہیں۔ ایک مجموعہ ہندوستانی لطیفوں کا لطائف ہندی کے نام سے لکھا۔ ایک منظوم فسانہ مہادیو بلاس مرتب کیا۔ سبھا بلاس کے نام سے ہندی کی دلچسپ نظموں کا انتخاب تیار کیا۔

یہ سب ہندی کی کتابیں ہیں، لیکن ایک کتاب سنگھاسن بتیسی للّو لال نے اردو میں بھی لکھی ہے۔ اس میں ہندی کے الفاظ بھی بکثرت ہیں عربی فارسی کے الفاظ بھی ہیں

(بقیہ صفحہ گذشتہ) کے لئے برج بھاشا سے زیادہ موزوں سمجھی گئی تھی۔ اسی برج بھاشا سے آگے چل کر دو صورتیں بہ رسم خط میں اردو اور ہندی کے نام سے رائج ہوئیں۔ یہ فرق اور یہ نام مسلمانوں کے تسخیر دہلی کے بعد پیدا ہوا۔ اس سے پہلے برج بھاشا کی علمی و ادبی شان صرف شاعری میں محدود تھی۔ اردو زبان کی ساخت اور رواج سے دو سو برس تک برج بھاشا میں کوئی نثر کی کتاب موجود نہ تھی۔ نظم کا لکھنا اس قدر آسان اور پسندیدہ تھا کہ فن عروض، قواعد صرف و نحو، علم نجوم، شرح و تفسیر، فسانہ، ڈراما جس موضوع پر کتابیں لکھی گئیں سب نظم میں لکھی گئیں۔ پھر بھی بعض نثر کی کتابیں پائی جاتی ہیں۔ نثر ہندی کی ایک تصنیف گورکھ ناتھ سے منسوب ہے جو چودھویں صدی عیسوی میں تھا۔ اس کتاب کی اس مصنف سے نسبت مشتبہ ہے لیکن اگر درست ہو تو یہ سب سے پہلی تصنیف نثر ہے۔ اس سے قبل کسی کتاب کا نام و نشان نہیں پایا جاتا۔ اسکے بعد سولہویں صدی میں وٹھل ناتھ کی کتاب منڈن اور گوکل ناتھ کی تصنیف چوراسی وارتا ہیں۔ پھر سترھویں صدی میں دامودر داس نے مارکنڈے پران کا ترجمہ نثر میں کیا۔ اسکے بعد بھی تھوڑا بہت نثر کا لٹریچر پایا جاتا ہے۔ اٹھارویں صدی میں چتر بھوج مسرا نے بھگوت گیتا کے ایک حصّہ کا ترجمہ کیا جس کو للّو لال نے پریم ساگر کے نام سے سہل تر زبان میں لکھا۔ چودھویں صدی سے اٹھارویں صدی تک تمام تصانیف نثر کا یہ طرز ہے کہ سنسکرت کا غلبہ ہے لیکن جملوں کی ساخت برج بھاشا کے قواعد کے مطابق ہے۔ افعال و ضمائر برج بھاشا کے ہیں۔ اس لئے یہ زبان سنسکرت سے آسان ہے (باقی آئندہ صفحہ پر)

اور طرز ادا، اور اسلوب بیان بھی اردو کے مطابق ہے۔ یہ کتاب اردو اور ہندی دونوں رسم خط میں شائع ہوئی، بار بار چھپی اور مقبول ہوئی۔ نمونہ یہ ہے:۔

برہمن کہنے لگا، جب تلا لگن آ دے جو اس میں مندر اٹھا دے، جب تک وہ لگن رہے تب تک کام اس میں جاری رکھے اور جب تلا لگن ہو چکے تب اس کا کام موقوف کر دے اسی طرح تلا لگن میں ہی وہ سارا مکان تیاری پر لا دے

(بقیہ صفحہ گذشتہ) تاہم عام فہم نہیں ہے۔ للو لال پہلے شخص ہیں جنھوں نے اپنی تصانیف میں روز مرہ کی بول چال اور اسلوب بیان اختیار کیا اور سنسکرت کے نامانوس و مشکل الفاظ کی جگہ برج بھاشا کے سہل تر الفاظ استعمال کیے۔ للو لال کی عبارت چند الفاظ بدلنے سے اردو کی متعارف عبارت بن جاتی ہے۔ مثلاً للو لال کی پریم ساگر سے چند سطریں ناگری رسم خط سے اردو میں لکھی جاتی ہیں۔

یہ سنتے ہی کنس ڈر کر کانپ اٹھا اور کرودھ کر (غصہ ہو کر) دیوکی کو جھونٹے پکڑ کر رتھ سے نیچے کھینچ لایا۔ کھڑگ (تلوار) ہاتھ میں لے، دانت پیس پیس لگا کہنے، جس بیر کو جڑ ہی سے اکھاڑئے تس پھول پھل کاہے کو لگنے گا۔ اب اسی کو مارو ں تو نربھے (بے فکر) راج کروں، یہ دیکھ سُن، باسدیو من میں کہنے لگے۔ اس مورکھ (بے وقوف) نے دیا ستناپ (رنج) جانا نہیں ہے پُن اور پاپ، جو میں اب کرودھ (غصہ) کرتا ہوں تو کاج بگڑے گا، تس سے اس سمے (وقت) چھما (درگذر) کرنی یوگ (بھلی) ہے۔"

فورٹ ولیم کالج میں ہندی کا آسان لٹریچر پیدا کرنے کی کوششیں جاری تھیں کہ ان سے علیحدہ بلکہ ان سے پہلے، ایک اردو کے شاعر سید انشاء اللہ خاں دہلی (متوفی ۱۸۱۷ء) کو لکھنؤ میں ایک "انوکھی بات" سوجھی اور انھوں نے ایک طویل کہانی ایسی روز مرہ کی بول چال میں لکھدی جس میں عربی فارسی کا ایک لفظ بھی نہیں آیا۔ یہ کہانی ناگری حروف میں چھپ کر ہندی (بقیہ صفحہ آئندہ پر)

اس کا آنوٹ بھنڈارہ ہو۔ اور کبھی اسکے یہاں سے کبھی نہ جاوے۔ یہ بات سن کر راجہ من میں خوش ہوا۔ دیوان کو بلایا اور مندماٹھانے کی اجازت دی کہ تم اچھی جگہ ڈھونڈھ کر محل بناؤ۔ اتنے میں تُلالگن بھی آن پہنچی، اس منڈ کی نیو دی ہر دیس میں یہ آدا ہوئی کہ راجہ تُلالگن میں محل بنواتا ہے جتنے کاریگر اس میں کام کرتے تھے، وے اُٹھ کر تلالگن میں بناتے تھے۔ کہیں کام اس میں سولے کا اور کہیں

(بقیہ صفحہ گزشتہ) کتابوں میں شامل ہے اور فارسی خط میں چھپی ہوئی اردو کے کتب خانہ میں داخل ہے۔ اس کا مفصل تذکرہ آئندہ صفحات میں عنقریب آتا ہے۔ یہاں اسکی چند سطریں ہندی تحریر کی مثال کے طور پر درج کی جاتی ہیں :-

"ہم اچھی گھڑی شبھ مہورت سوچ کے تمہارے سسرال میں کسی باہمن کو بھیجتے ہیں جو بات چیت چاہی ٹھیک کر لاوے۔ باہمن، جو شبھ گھڑی دیکھ کر ہڑ بڑی سے گیا تھا، اس پر کڑی پڑی۔ سنتے ہی رانی کیتکی کے باپ نے کہا ان کے ہمارے ناتا نہیں ہونے کا۔ ان کے باپ دادا ہمارے باپ دادوں کے آگے سدا ہاتھ جوڑ کے باتیں کرتے تھے اور جو ٹک تیوری چڑھی دیکھتے تھے تو بہت ڈرتے تھے کیا ہوا جواب بڑھ گئے اور اونچے پر چڑھ گئے جس کے ماتھے ہم بائیں پاؤں کے انگوٹھے سے ٹیکا لگا دیں وہ مہاراجوں کا راجہ ہو جائے، کس کا منہ جو یہ بات ہمارے منہ پر لاوے"

فورٹ ولیم کالج میں ہندی تصانیف کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا وہ کالج کے بعد اور کالج سے باہر بھی جاری رہا۔ تمام علوم و فنون کی کتابیں ہندی میں ترجمہ و تالیف ہونے لگیں اخبارات و رسائل جاری ہوئے۔ اور ہندی تجربہ کے مختلف اسلوب پیدا ہو گئے۔

سنہ ۱۸۳۷ء میں لیتھو کا ہندی مطبع دہلی میں قائم ہوا۔ ہندی کا سب سے پہلا اخبار گوبند رگھوناتھ کی اڈیٹری میں بنارس اخبار کے نام سے ۱۸۴۵ء میں جاری (بقیہ صفحہ آئندہ پر)

روپے کا اور کہیں لوہے کا اور کہیں کاٹھ کا نئی نئی طرح سے بنتا تھا۔"

ان تصنیفات کے علاوہ للولال نے مظہر علی ولا کو بیتال پچیسی ترجمہ کرنے میں مدد دی۔

فورٹ ولیم کالج میں مذکورۂ بالا منشیوں اور مصنفوں کے علاوہ کچھ اور لوگ بھی ملازم و متوسل تھے لیکن انکے ادبی کارنامے نہ زیادہ ہیں نہ اعلیٰ نہ مشہور اس لیئے اہل قلم بھی شہرت نہ پا سکے۔ مثلاً حمید الدین بہاری نے ڈاکٹر گل کرائسٹ کی فرمائش سے کھانے اور مٹھائیاں تیار کرنے کی ترکیبیں لکھیں اور اس کتاب کا نام خوان الوان

(بقیہ صفحہ گذشتہ) ہوا لیتھو میں چھپتا تھا یہی اخبار اسی نام سے اردو میں بھی شائع ہوتا تھا، لیکن اردو کا پہلا اخبار نہ تھا اس سے پہلے اردو کے اور اخبار نکل رہے تھے) دوسرا ہندی کا اخبار بنارس ہی سے سدھاکر کے نام سے تارا موہن مترا کی اڈیٹری میں ۱۸۵۰ء میں جاری ہوا۔ یہ پرچہ پہلے اردو میں نکلا تھا، پھر اردو کی جگہ ہندی میں چھپنے لگا ہندی کا سب سے پہلا ڈراما گوپال چند نے نہوس کے نام سے ۱۸۶۰ء میں مرتب کیا مقالہ نگاری سب سے پہلے بال کرشن بھٹ نے ۱۸۷۵ء میں شروع کی۔ ہندی لکھنے والوں میں وہ لوگ بھی تھے جو اردو نہیں جانتے تھے، صرف ہندی میں لکھتے تھے ان لوگوں نے اپنی تحریر میں سنسکرت کا عنصر بڑھا دیا اور عربی و فارسی کے مالوس و مروج الفاظ سے پرہیز کیا۔ ایسے مصنفوں میں پنڈت شیام سندر داس بہت ممتاز ہیں۔ ان کی نسبتہً سادہ تحریر کا نمونہ یہ ہے

"آجکل کی ببستھا (زمانہ) میں دن پر دن اپ بیے (فضول خرچی) کرنے کا دوش بڑھتا جاتا ہے، کیوں بڑے بڑے رئیس اور دھن وان (دولت مند) ہی اب بیائی (فضول خرچ) نہیں ہوتے بلکہ مدھم اور اتم سٹر پریں (متوسط و ادنیٰ درجہ) کے لوگ بھی خرچ کرنے میں بڑی اُدارتا (شان) دکھلاتے ہیں، اس کا کارن (نتیجہ) یہی ہے کہ لوگ اپنی یاست بک وشا (اصلی حالت) کو چھپاتے اور لوگوں کو اپنی جھوٹی مہنتا دکھلانے کے لئے اوپری تڑک بھڑک ادھک رکھتے ہیں"۔ باقی برصفحہ آئندہ)

رکھا۔ مرزا محمد فطرت نے انجیل کے ایک حصہ کا ترجمہ کیا محی الدین فیض نے پند نامہ عطار کا منظوم ترجمہ کیا۔ ان میں سے ایک مصنف البتہ امتیاز کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔

مرزا جان طپش ان کا نام مرزا محمد اسمٰعیل ہے۔ مرزا جان کے لقب سے مشہور ہیں۔ دہلی میں ۱۱۸۲ھ/۱۷۶۸ء میں پیدا ہوئے عربی فارسی اور سنسکرت کے عالم تھے۔ لڑکپن سے شاعری کا شوق ہوا۔ خواجہ میر درد دہلوی کے شاگرد تھے۔

(بقیہ صفحہ گذشتہ) لیکن ان میں جو لوگ اردو ہندی دونوں میں لکھتے ہیں۔ وہ زیادہ عام فہم لکھتے اور عربی و فارسی کے آسان الفاظ بھی بے تکلف استعمال کرتے ہیں ان میں منشی پریم چند کا خاص درجہ ہے انھوں نے بعض فسانے اردو ہندی دونوں زبانوں میں لکھے ہیں۔ ان کا فرق ذیل کے نمونوں سے واضح ہوگا۔ ایک فسانہ (بڑے گھر کی بیٹی) ہندی میں اس طرح شروع کرتے ہیں:۔

بینی مادھو سنگھ گوری پور گاؤں میں زمیندار اور نمبردار تھے، انکے پتاماکسی سمے بڑے دھن دھانیہ سمپن تھے۔ گاؤں کا پکا تالاب اور مندر جن کی اب مرمت بھی مشکل تھی انھیں کی کیت استمبھ تھے، کہتے ہیں اس دروازے پر ہاتھی جھومتا تھا، اب اسکی جگہ ایک بوڑھی بھینس تھی، جس کے شریر میں استہ پنجر کے سوا اور کچھ شیش نہ رہا تھا، پر دودھ شاید بہت دیتی تھی، کیونکہ ایک نہ ایک آدمی ہانڈی لئے اسکے سر پر سوار ہی رہتا تھا۔

اسی قصہ کو اردو میں اس طرح لکھتے ہیں:۔

بینی مادھو سنگھ موضع گوری پور کے زمیندار اور نمبردار تھے۔ انکے بزرگ کسی زمانے میں بڑے صاحب ثروت تھے۔ پختہ تالاب اور مندر انھیں کی یادگار تھی کہتے ہیں اس دروازے پر پہلے ہاتھی جھومتا تھا۔ اس ہاتھی کا موجودہ نعم البدل ایک بوڑھی بھینس تھی جس کے بدن پر گوشت تو نہ تھا مگر شاید دودھ بہت دیتی تھی (باقی بر صفحہ آئندہ)

۱۷۸۴ء / ۱۱۹۸ھ میں دہلی سے لکھنؤ آئے۔ وہاں سے بنگال چلے گئے، اور ڈھاکہ میں نواب شمس الدولہ سید احمد علی خاں کے دربار میں توسل اختیار کیا۔ نواب صاحب کے حکم سے اردو محاورات کی لغت لکھی اور اس کا نام نواب صاحب کے خطاب کی مناسبت سے شمس البیان فی مصطلحات ہندوستان رکھا۔ یہ لغت ۱۷۹۲ء / ۱۲۰۷ھ میں مرتب ہوا ہے، اور فورٹ ولیم کالج سے پہلے کی تصنیف ہے اس لئے فورٹ ولیم کالج سے باہر کی تصانیف میں اس کا ذکر موزوں تھا۔ لیکن چونکہ مرزا جان طپش

(بقیہ صفحہ گذشتہ) کیونکہ ہر وقت ایک نہ ایک آدمی ہانڈی لئے اس کے سر پر سوار رہتا تھا۔

علمی مضامین اور تصانیف کی زبان اور اسلوب بیان تو دشوار ہونا ہی چاہئے۔ لیکن عام لٹریچر، اخبار، رسائل، فسانہ، تاریخ وغیرہ میں بھی یہ اختلاف تھا کہ کسی کی زبان آسان، کسی کی مشکل ہوتی تھی، یعنی کوئی شخص سنسکرت اور برج بھاشا کے نامانوس الفاظ زیادہ استعمال کرتا تھا، کوئی فارسی عربی کے عام فہم الفاظ لکھتا تھا۔ لیکن ۱۹۳۵ء سے ہندی زبان کے مقرر، نامہ نگار مصنف کھڑی بولی اور عام فہم بھاشا کو دقیق اور دشوار اور سنسکرت سے مشابہ بنانے لگے ہیں اس مقصد کے لئے ایک یہ اسلوب اختیار کیا جاتا ہے کہ عربی فارسی کے الفاظ تو استعمال کئے جاتے ہیں، لیکن ان کے ساتھ سنسکرت اور بھاشا کے مشکل اور غیر متعارف الفاظ بھی برتے جاتے ہیں۔ مثلاً

بچوں کے بھاؤ سے ماتائیں ادھک پرچیت ہوتی ہیں، بچے ماؤں سے ادھک پریم کرتے ہیں، پریم پورک کہی ہوئی باتوں کا دل پر بہت اچھا اثر پڑتا ہے۔

نیز مشہور و مروّج الفاظ، مدرسہ، استاد، استانی، کتاب۔ امتحان وغیرہ کو صرف ادبی تصانیف سے نہیں بلکہ عام بول چال سے بھی خارج کر کے انکی جگہ سنسکرت اور بھاشا کی دشوار اصطلاحیں استعمال کی جاتی ہیں۔ مثلاً اسمبلی کا ایک ریزولیوشن ان الفاظ میں پیش کیا گیا ہے:-

"یہ اسمبلی سرکار سے سفارش کرتی ہے کہ وہ ڈسٹرکٹ بورڈوں (باقی بر صفحہ آئندہ)

بعد کو کالج میں چلے گئے تھے، اور وہاں اگرچہ خود کوئی تصنیف نہیں کی، تاہم دوسروں کو مدد دی، اس لئے کالج ہی کے سلسلے میں اس لُغت کا بھی ذکر کیا جاتا ہے۔ یہ کتاب ایک مرتبہ مرشدآباد سے ۱۸۴۹ء/۱۲۶۵ھ میں شائع ہوئی ہے اسمیں اردو محاوروں کے معنی فارسی زبان میں لکھے ہیں، لیکن ان کی مثالیں شعرائے اردو کے کلام سے درج کی ہیں۔ اس زمانے کی تصانیف کی اکثر یہی روش ہے کہ اردو زبان کے متعلق کتابیں بھی فارسی

(بقیہ صفحہ گزشتہ) تھا میونسپل بورڈوں کو ادیش کرے کہ وہ لوور پرائمری تتھا پرائمری میں ایسے بجائے پرش ادھیاپکوں کے استری ادھیاپکائیں نیوکٹ کریں، پرنتو یدی ورتمان سمے میں ضرورت کے مطابق استری ادھیاپکائیں نہ ملیں تو عارضی طور سے پرش ادھیاپک رکھ لئے جائیں، لیکن جیسے ہی یوگیہ ادھیاپک ملیں فوراً عارضی ادھیاپکوں کو ہٹا کر استری ادھیاپکائیں مقرر کی جائیں"۔

ڈاکٹر تاراچند سکریٹری ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد ہندی کے مشہور ادیب ہیں۔ سہ ماہی رسالہ ہندوستانی (ہندی اڈیشن) بابت جولائی ۱۹۳۷ء میں ڈاکٹر صاحب نے ایک مضمون لکھا ہے جس کا عنوان ہے نام سمبندھی غلط فہمیاں (نام کے متعلق غلط فہمیاں)

اس کے چند فقرے یہ ہیں:۔

پرشن کے بکش بپکش میں بچار کرنے اور دونوں وردھی دلوں کے پرتھک
مسئلہ دونوں رخ غور مخالف گروہوں الگ

پرتھک درشٹی کونوں کو سمجھنے کے پہلے مجھے یہ آوشیک معلوم ہوتا ہے کہ جن ناموں کا ہم
الگ زاویۂ نگاہ ضروری

پریوگ کریں انکی ٹھیک ٹھیک پربھاشا دیدیں۔ کیونکہ اس سمبندھ میں بہت کچھ غلط فہمی
استعمال تعریف تعلق

اس کارن ہوتی ہے کہ ان ناموں کے ارتھ کے بارے میں لوگوں کو بھرم ہے۔ اس
سبب مفہوم دھوکا

(باقی بر صفحہ آئندہ)

زبان میں لکھتے تھے۔ جیسے انشاء اللہ خاں کی دریائے لطافت، کہ اس کا موضوع اردو زبان کے قواعد و متعلقات شعر و ادب ہیں لیکن فارسی عبارت میں تصنیف کی گئی ہے (اس کا ذکر آیندہ آتا ہے۔ شمس البیان کا نمونہ یہ ہے :۔

انگاروں پر لوٹنا۔ کنایہ از بیقراری کہ در عالم رشک لاحق گردد۔ ولی دکنی گوید ؎

شعلہ خوجب سے نظر آتا نہیں   تب سے انگاروں پہ لوٹے ہے ولی

(بقیہ صفحہ گزشتہ)

دشے میں بہت سے ناموں کا پریوگ ہوا ہے جن میں سے کچھ یہ ہیں:۔ بھاشا، ہندی
بارے   استعمال

ہندوستانی، زبان ہندوستان، دہلوی، کھڑی بولی، مدھیا دیس کی بولی، ریختہ، زبان
                                  صوبجات متوسط

اردوے معلّٰی، اردو۔ ان سب ناموں میں ہندی، ہندوستانی اور اردو کا پریوگ
                                                                    استعمال

ادھک ہوتا ہے، اور واستو میں واد و واد بھی اب ان تین ناموں کے پریوگ
بہت   حقیقت   مباحثہ   استعمال

کے ہی سمبندھ میں ہے۔"
        تعلق

یہ ہندی کے مختلف اسالیب بیان کی مثالیں تحریر و تقریر کی پیش کی گئی ہیں۔ بہرحال ہندی لٹریچر نے ان سوا سو برس میں نہایت کثرت و وسعت پیدا کرلی ہے۔ تمام علوم و ادبیات میں اعلیٰ پایہ کی تصانیف ہوئی ہیں اور ہو رہی ہیں۔ اخبارات و رسائل، مطابع و ادارات ہندی زبان و ادب کی وسعت و اشاعت میں بہتر سے بہتر کوشش کر رہے ہیں۔

ہندی شاعری کی تاریخ نثر کی تاریخ سے زیادہ دلچسپ ہے، اور زیادہ قدیم بھی اس لئے کہ برج بھاشا اصل میں شاعری ہی کی زبان ہے۔ اور اس زبان کا آغاز ہی (باقی صفحہ آیندہ پر)

رفو چکر میں آنا، حیران ماندن بہ مشاہدہ امر عجیب و عوام[۱] بازاری استعمال کنند، سراج الدین سراج دکنی گوید ؎

رفوگر کو کہاں طاقت کہ زخم عشق کو ٹانکے
اگر دیکھے مرا سینہ رفو چکر میں آجاوے

فورٹ ولیم کالج میں رنگین طپش نے ایک مثنوی میر حسن کی تقلید میں لکھی اور بہار دانش نام رکھا، اپنا دیوان بھی مرتب کیا اور کالج نے اس کو خرید کر شائع کیا۔

---

[۱] اس محاورہ (رفو چکر میں آنا) کو عوام بازاری کا محاورہ اس لئے کہا گیا ہے کہ رفو چکر ہونا اور چکر میں آنا دو الگ الگ محاورے ہیں۔ مثلاً

جس طرف دیکھتی تھی بھر کے نظر ہوش ہو جاتے تھے رفو چکر

قیامت تک یہی گردش رہے گی رات دن ان کو
مہ و خورشید حسن یار سے آئے ہیں چکر میں

جاہل آدمیوں نے دوسرے محاورے میں رفو کا لفظ بھی ملا لیا اور حیران ہونے کیلئے "رفو چکر میں آنا" اور رفو چکر ہونا بولنے لگے۔

(بقیہ صفحہ گذشتہ)

شاعری کے ساتھ ہے۔ نثر ہندی کی تصنیف چودھویں صدی عیسوی سے پہلے نہیں ملتی لیکن نظم ہندی کا وجود بارہویں صدی سے بھی پہلے پایا جاتا ہے۔ نثر ہندی میں کوئی عجیب خصوصیت نثر اردو کے مقابلے میں نہیں ہے لیکن نظم ہندی دنیا بھر کی شاعری سے نرالی ادا رکھتی ہے۔ اور ایسی انفرادی حیثیت کی مالک ہے جس میں کوئی ملک اور کوئی زبان اور کوئی شاعری شریک نہیں ہندی شاعری کے مختلف موضوعات و اجزاء و عناصر پر اردو میں بھی بعض کتابیں لکھی گئی ہیں۔ غالباً سب سے پہلے جناب نیاز فتحپوری نے جذبات بھاشا کے نام سے (باقی بر صفحہ آیندہ)

فورٹ ولیم کالج کی خدمات پر مختصر تبصرہ

(۱) فورٹ ولیم کالج کے قائم ہونے سے پہلے اور جاری رہنے کے زمانے میں کالج و کلکتہ سے باہر بھی اردو تصانیف نثر کا سلسلہ جاری تھا، جیساکہ پہلے ذکر کیا گیا اور آئندہ لکھا جائے گا، لیکن کوئی باقاعدہ اور متحدہ کوشش نہ تھی بلکہ متفرق طور پر لوگ کچھ کچھ لکھ رہے تھے۔ کالج کے منتظموں نے سلیس نثر نگاری کا مقصد متعین کرکے کام شروع کیا۔ یہ گویا پہلا علمی اور ادبی ادارہ پائندہ تھا۔

(۲) اردو ٹائپ کا پہلا مطبع اسی کالج کی طرف سے قائم کیا گیا۔ اور بعض کتابیں خاص حسن و خوبی کے ساتھ شائع کی گئیں۔

(۳) کالج کی یہ خدمات کم و بیش بیس (۲۰) برس جاری رہیں۔ اس عرصہ میں اٹھارہ (۱۸) مصنفوں نے پچاس کتابیں اردو میں تصنیف، تالیف اور ترجمہ کیں۔ اس زمانے میں (۱۸۰۱ء سے ۱۸۲۰ء تک) فورٹ ولیم کالج سے باہر تمام ہندوستان میں اتنی کتابیں نثر اردو کی مشکل سے لکھی گئی ہوں گی۔ اور جتنی لکھی گئیں ان میں سے اکثر کو آج تک چھپنا نصیب نہیں ہوا۔

(بقیہ صفحہ گزشتہ) نہایت دلچسپ کتاب لکھی ہے۔ اسکے علاوہ انھوں نے اپنے رسالہ نگار لکھنؤ کی ایک اشاعت (جنوری ۱۹۳۶ء) ہندی شاعری کیلئے مخصوص کردی تھی۔ اس میں نیاز صاحب نے ایک انگریز مصنف مسٹر ایف ای کے کی تاریخ ادب ہندی کا ترجمہ شائع کردیا ہے۔ لیکن اصل کتاب اور ترجمہ دونوں میں نمونے نہیں ہیں، نمونے اسی رسالے کے دوسرے مضامین میں موجود ہیں۔ ڈاکٹر اعظم کریوی وغیرہ نے بھی ہندی شاعری پر کتابیں لکھی ہیں۔

اس حاشیہ میں زبان ہندی کی تقسیمیں اور بعض معلومات اسی انگریز مصنف کی تاریخ سے ماخوذ ہیں نمونے اس کتاب میں نثر کے بھی نہیں ہیں۔

(۴) بیرونِ کالج کی کوئی تصنیف زبان و محاورہ کی سلاست اور اسلوبِ بیان کی دلکشی میں میر امن، حیدری، اکرام علی وغیرہ کی کتابوں سے بہتر اور داستانِ امیر حمزہ و اخوان الصفات زیادہ ضخیم نہیں ہے۔

(۵) کالج کی تالیفات میں مختلف ضروری، مفید اور دلچسپ موضوع کی کتابیں شامل ہیں، یعنی فسانہ، تذکرہ، صرف و نحو، تاریخ، اخلاق، فقہ اسلام، ترجمہ قرآن مجید، ترجمہ انجیل مقدس۔

(۶) سب سے بڑی خدمت اس کالج کی یہ ہے کہ سلیس نثر نگاری کی شاہراہ قائم کردی۔ اگر یہ محکمہ جاری نہ ہوتا تو بھی اربابِ علم و ادب اس رستے پر آتے، لیکن دیر لگتی۔ ان کتابوں کا نمونہ موجود ہونے پر بھی لوگوں نے اس طرف کم توجہ کی اور بہت آہستہ آہستہ اس راہ پر آئے۔

---

(۲) مصنفین بیرونِ کالج

سنہ ۱۸۰۱ء تا سنہ ۱۸۳۰ء
۱۲۱۵ھ — ۱۲۴۵ھ

اسی زمانے میں جبکہ فورٹ ولیم کالج میں تصنیف و تالیف کا محکمہ جاری تھا ہندوستان کے دوسرے شہروں میں بھی اصحابِ علم و ادب انفرادی طور پر نثر اردو کی کتابیں لکھنے میں مصروف تھے۔ دکن کے اسی عہد کے بعد مصنفین نثر (اشرف الدولہ بدرالدولہ وغیرہ) کا ذکر "دکن میں عہد مغلیہ کے بعد کے دور" میں آچکا ہے، دہلی لکھنؤ آگرہ وغیرہ مقامات میں بھی اربابِ قلم رفتارِ اردو کی ترقی میں سعی پیہم کر رہے تھے۔ لیکن کالج سے باہر کے مصنفوں کو مطبع و اشاعت کی آسانیاں میسر نہ تھیں

کالج میں دارالترجمہ کے ساتھ مطبع قائم ہوگیا، اور ۱۸۰۲ء سے کتابیں چھپنی شروع ہوگئیں لیکن فورٹ ولیم کالج سے باہر ۱۸۳۷ء میں دہلی میں مطبع کھلا۔ اس کے بعد کتابوں کو طباعت واشاعت نصیب ہوئی۔ اس سبب سے دہلی، لکھنؤ وغیرہ میں قیام کالج سے پہلے، اور زمانۂ کالج، بلکہ اس سے کچھ عرصہ بعد تک جو کتابیں لکھی گئیں وہ مشہور وعام نہ ہو سکیں۔ یہ بات ثابت کرنے لئے کہ ترقی اردو انیسویں صدی کے شروع میں بھی تنہا فورٹ ولیم کالج ہی کی احسان مند نہیں ہے۔ بلکہ بیرون کالج بھی اردو کی رفتار کو تیز کرنے کی کوششیں جاری تھیں، چند نام اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے گنائے جاتے ہیں[1]:۔

(۱) ہری ہر پرشاد سنبھلی مصنف بدائع الفنون (۱۷۳۳ء۔ ۱۱۴۶ھ)

(۲) بندرابن متھرادی (متوفی ۱۷۵۶ء۔ ۱۱۶۹ھ) مصنف تذکرۂ معاصرین

(۳) محمد حسین کلیم دہلوی (۱۷۵۴ء۔ ۱۱۶۷ھ میں زندہ تھے) مترجم فصوص الحکم

(۴) نادر علی شاہ قادری مصنف رسالہ تصوف (۱۷۷۶ء۔ ۱۱۹۰ھ)

(۵) مولوی قدر عالم بن مولوی بدر عالم مصنف فقہ محفوظ خانی (۱۷۸۵ء۔ ۱۱۹۹ھ)

(۶) حکیم محمد شریف خاں دہلوی (متوفی ۱۸۰۷ء۔ ۱۲۲۲ھ) مترجم قرآن مجید

(۷) محمد جعفر مصنف روح الایمان واسلام (۱۷۸۹ء۔ ۱۲۰۳ھ)

(۸) مولوی کریم الدین دہلوی مترجم تاریخ ابی الفداء (۱۸۰۰ء۔ ۱۲۱۵ھ)

(۹) مولوی حافظ احمد مصنف سراج ایمان (۱۸۰۰ء۔ ۱۲۱۵ھ)

(۱۰) مولوی محمد صفا مصنف زاد آخرت (۱۸۰۲ء۔ ۱۲۱۷ھ)

(۱۱) مولوی حافظ محمد علی مصنف راہ نجات (۱۸۰۳ء۔ ۱۲۱۸ھ)

---

[1] یہ فہرست مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی اکبر آبادی کی تصنیف یوپی میں اردو سے ماخوذ ہے اور ان میں سے چند مصنفوں کے حالات اور نمونے بھی جو آگے آتے ہیں۔

(۱۲) مولوی محمد حیات مصنف سراج الحیات (۱۸۰۶ء۔ ۱۲۲۱ھ)

(۱۳) مولوی عبد القادر مصنف گلشن دین (۱۸۱۲ء۔ ۱۲۲۷ھ)

(۱۴) مولوی محمد نماتی اکبرآبادی مصنف مخزن القواعد (۱۸۱۳ء۔ ۱۲۲۸ھ)

(۱۵) مولوی ولی محمد مصنف میخانۂ وحدت (۱۸۲۰ء۔ ۱۲۳۶ھ)

(۱۶) مولوی قادر بخش پانی پتی مصنف مختصر التجوید (۱۸۲۶ء۔ ۱۲۴۲ھ)

یہ سب فورٹ ولیم کالج سے پہلے اور ساتھ کے مصنفین ہیں۔ ان کے علاوہ اور لوگ بھی ہیں اور ان سے زیادہ مشہور ہیں۔ ان میں سے بعض متقدمین کے حالات اور نمونۂ تصانیف درج کئے جاتے ہیں۔

محمد حسین کلیم دہلوی

شاعر و مصنف دونوں تھے۔ میر حسن دہلوی (مصنف مثنوی سحر البیان) نے اپنے تذکرۂ شعرا میں کلیم کے متعلق لکھا ہے۔ کہ انھوں نے خصوص الحکم کا اردو میں ترجمہ کیا۔ میر حسن کے الفاظ یہ ہیں "در ہندی نثر کتابے ایجاد کردہ۔ اس "ایجاد کردہ" سے معلوم ہوتا ہے کہ میر حسن کو اس سے پہلے کی کسی اردو کتاب کا علم نہ تھا۔ اور اس کا کچھ تعجب نہیں۔ دکن کی اردو تصانیف کا شمالی ہند دہلی میں پہنچنا اور مشہور ہونا قرین قیاس نہیں ہے۔ میر حسن اور محمد حسین کلیم ہم عصر تھے۔ میر حسن کا انتقال ۱۷۸۶ء ۱۲۰۰ھ میں ہوا ہے اور اور کلیم ۱۷۴۷ء ۱۱۶۰ھ میں زندہ تھے جس سال احمد شاہ بن محمد شاہ بادشاہ دہلی کی آنکھیں نکلوائی گئیں۔ اس عہد کی صرف ایک کتاب فضلی کی کربل کتھا ہے جو ۱۷۳۱ء ۱۱۴۳ھ میں لکھی گئی اور ۱۷۴۷ء ۱۱۶۰ھ میں مصنف نے اس پر نظر ثانی کی (جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے) اس زمانے میں کلیم و میر حسن دونوں زندہ تھے۔ اگر فضلی کی کتاب شمالی ہند دہلی کی ہوتی تو میر حسن کو اگرچہ اس کا علم ہونا لازم نہ تھا لیکن ممکن

دمتوقع ضرور تھا۔ اس لئے کہ یہ کربل کتھا یا دہ مجلس مجالس عزا میں پڑھنے کے لئے لکھی گئی تھی، اور میر حسن شیعہ تھے۔ یہ قیاسات میر حسن کے فقرے کے لفظ "ایجاد" پر قائم کئے گئے ہیں۔ لیکن اگر میر حسن کی مراد (ایجاد کردہ سے (بوجود آوردہ) ہو۔ یعنی "تصنیف کی" تو بات صاف ہے۔ میر حسن نے کلیم کا صرف ایک فقرہ احمد شاہ بادشاہ دہلی کے نابینا ہونے کے متعلق نقل کیا ہے۔ یہی فقرہ تبرک کی طرح تمام مصنفین، "آب حیات" "دمیر المصنفین" ذیوپی میں اردو وغیرہ میں دست بدست منتقل ہوتا رہا ہے ہم بھی اسی کا لہو لگا کر شہیدوں میں ملے جاتے ہیں۔ کلیم کا فقرہ یہ ہے:۔

"کل کے دن تھے بادشاہ اور وزیر آج کے دن بیٹھے ہیں اندھے ہو بصیر[1]

ایسی دولت سے زنہار زنہار" فاعتبروا یا اولی الابصر

کلیم کے فقرے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی ساری نثر میں ایسی ہی قافیہ پیمائی ہو گی جیسی اس زمانے کی کربل کتھا اور نو طرز مرصع میں ہے۔

حکیم شریف خاں دہلوی

حکیم محمد شریف خاں، مُلّا علی داؤد برادر مُلّا علی قاری کی اولاد سے تھے۔ اس لئے سلسلہ نسب حضرت خواجہ عبید اللہ احرار رحمۃ اللہ علیہ سے ملتا ہے۔ حکیم صاحب کے اجداد میں سے ایک بزرگ بابر بادشاہ کے ہمراہ ہندوستان آئے۔ اور حیدر آباد میں قیام کیا۔ حکیم شریف خاں کے دادا حکیم محمد واصل خاں آگرہ آکر

---

[1] یہ محاورہ کی بوالعجبی ہے کہ بصیر کے معنی دیکھنے والے کے ہیں لیکن پاس خاطر و دلجوئی کے لئے اندھے کو بھی بصیر کہدیتے ہیں۔ گویا چشم ظاہر بند ہے تو کیا، دیدۂ باطن کھلا ہوا ہے۔ اسی غرض سے اندھے کو حافظ کہتے ہیں چاہے اس کو الحمد اور قل ہو اللہ بھی یاد نہ ہو۔ اسی طرح سقّے کو بہشتی؛ حجام کو خلیفہ خاکروب کو مہتر کہتے ہیں۔

سکونت پذیر ہوئے۔ پھر شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے دربار میں شاہی طبیب مقرر ہوئے۔ حکیم واصل خاں شاہ علم اللہ کے خلیفہ بھی تھے۔ ان کے بیٹے حکیم محمد اکمل خاں محمد شاہ بادشاہ دہلی (عہد سلطنت ۱۷۱۹ء/۱۱۳۱ھ تا ۱۷۴۸ء/۱۲۶۱ھ) کے طبیب خاص ہوئے، اور "حاذق الملک" خطاب فرمایا۔ ان کے بیٹے حکیم شریف خاں تھے جو ۱۷۲۲ء/۱۱۳۶ھ میں پیدا ہوئے۔ اپنے والد سے تحصیل علوم کی، بڑے مشہور و مستند عالم تھے، فن طب میں "ثانی بو علی سینا" کہے جاتے تھے۔ شاہ عالم بادشاہ (۱۷۵۹ء/۱۱۷۳ھ تا ۱۸۰۶ء/۱۲۲۱ھ) کے عہد میں شاہی طبیب تھے، "اشرف الحکماء" خطاب تھا۔ تصنیف و تالیف کا بھی شوق رکھتے تھے۔ ۱۷۷۹ء/۱۱۹۳ھ میں حدیث شریف کی کتاب مشکوٰۃ کا فارسی ترجمہ کاشف المشکوٰۃ کے نام سے کیا۔ حاشیہ نفیسی، حاشیۂ شرح اسباب، آثار نبوت، شرح حمد اللہ وغیرہ متعدد عربی و فارسی کی تصانیف آپ کی یادگار ہیں۔ ۱۸۰۷ء/۱۲۲۲ھ میں انتقال کیا۔ رفتار اردو کے سلسلے میں حکیم شریف خاں کا بڑا کارنامہ قرآن مجید کا اردو ترجمہ ہے، جو حضرت شاہ عبد القادر دہلوی کے ترجمہ اردو سے تقریباً بیس سال پہلے کا ہے لیکن آج تک قلمی و گمنام ہے۔ حکیم محمد احمد خاں دہلوی مرحوم (متوفی ۱۹۲۷ء) کے پاس یہ پورا ترجمہ مترجم کے ہاتھ کا لکھا ہوا موجود تھا۔ اس ترجمہ میں سے سورۂ فاتحہ کی صرف پہلی آیت کا ترجمہ نقل کیا ہے وہ یہ ہے:-

جو تعریف کہ اول سے آخر تلک موجود ہے؛ لائق ہے واسطے اللہ کے کہ پالنے والا ہے تمام عالموں کا بخشنے والا وجود کا آخرت میں ؞

یہ صرف اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ کا ترجمہ ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حکیم صاحب نے باوجود ترتیب لفظی کے تشریحی ترجمہ کیا ہے۔ لفظ الحمد کا ترجمہ اور مترجم "سب تعریف" یا تمام تعریفیں کرتے ہیں۔ لیکن حکیم صاحب نے لکھا ہے :" جو تعریف کہ اول سے

آخر تلک موجود ہے۔" اسی طرح رب العلمین کے ترجمہ میں "پالنے والا" کے آگے "بخشنے والا وجود کا آخرت میں" بھی بڑھا دیا ہے تاکہ رب کا مفہوم واضح ہو جائے یعنی اس عالم میں روح کی تکمیل تربیت کے بعد آخرت میں باقی مراتب روحانی کا طے کرانا بھی اللہ تعالیٰ کی ربوبیت میں شامل ہے۔

اب زمانۂ فورٹ ولیم کالج کے ساتھ اور بعد کے بعض مشہور مصنفوں کا ذکر لکھا جاتا ہے۔

سید انشاء اللہ خاں دہلوی

ان لوگوں میں خاص طور پر قابل ذکر ہیں ان کا کارنامہ کثیر و ضخیم نہیں، لیکن نوعیت میں طرفہ و عجیب ہے، ان کے والد کا نام حکیم ماشاء اللہ خاں ہے۔ آبا و اجداد ایران سے کشمیر آئے، وہاں سے دہلی میں آبسے۔ حکیم ماشاء اللہ خاں شاہی طبیب تھے، دہلی کی تباہی کے بعد مرشد آباد چلے گئے، وہیں انشاء اللہ خاں پیدا ہوئے۔ جوان ہو کر تعلیم سے فارغ ہو کر دہلی آئے۔ شاہ عالم بادشاہ کے دربار کا وسیلہ پکڑا۔ لیکن کچھ عرصہ بعد لکھنؤ چلے گئے اور نواب سعادت علی خاں کے مصاحب ہو گئے۔ انشا عالم، شاعر، زباندان، نکتہ سنج، لطیفہ گو، مسخرے، نقال سبھی کچھ تھے۔ نواب کی ناک کا بال ہو گئے لیکن کچھ زمانے کے بعد بگڑ گئی تو نواب نے آٹے کے بال کی طرح نکال کر پھینک دیا۔ لکھنؤ میں ۱۸۱۷ء ۱۲۳۳ھ میں انتقال کیا (ان کے حالات آب حیات میں پڑھنے کے قابل ہیں) ان کے کلیات میں غزلیات، قصائد، مثنویات، قطعات، رباعیات، ریختی، چیتاں پہیلیاں، سبھی کچھ ہے۔ ان کا ذکر موقع و محل پر آئے گا۔ نثر کی تصانیف کا انشا کے گرد و پیش کوئی رواج نہ تھا۔ لیکن انھوں نے زبان اردو اور نثر اردو کی دو عجیب خدمتیں کی ہیں۔

(۱) رانی کیتکی اور کنور اودے بھان کی کہانی

یہ انشا کی ذہانت کی عجیب و نادر کارستانی ہے ایک داستان لکھی ہے جس میں عربی فارسی وغیرہ کسی ہندوستان باہر کی زبان کا کوئی لفظ نہیں آیا۔ کوئی چھوٹی سی حکایت نہیں، پچاس صفحوں کی مکمل داستان ہے۔ قصہ بھی دلچسپ اور اندازِ بیان بھی دلکش۔ جا بجا رباعیاں ہیں ان کو "چوتکا" لکھا ہے۔ اشعار کو دوہے اور کبت لکھا ہے، بعض اشعار ہندی اسلوب میں لکھے ہیں، مثنوی کے طرز پر چھوٹی بحر میں جو شعر لکھے ہیں

۱؎ آجکل کچھ نئے پرانے لکھے پڑھے لوگوں کے یہ جی میں آئی ہے اور اس دیس کی بھلائی اس میں سوچی ہے کہ اپنی بول چال، لکھت پڑھت، چٹھی پتر سب میں ایسا ڈھنگ برتیں جس میں دیسی بولی کے سارے بول اور سب ڈھب رہیں، پرائے دیسوں اور سمندر پار کی بولیوں کا کوئی بول نہ آنے پائے۔ ہمارے بھائیوں کو جو یہ لو لگی اور دھن بندھی ہے، اور ایسی جو آج کل ہے یہ ہونی انہونی بھلی بری جیسی ہو گی ہو رہے گی اور دیکھی جائے گی کہنے سننے کی بات ہے یہ اچنبھا جو یہ لکھنے والا لکھ کر چھوڑ گیا ہے۔ اس بولیوں کے کھیل کے کھلاڑی اور باتوں کے اکھاڑے کے گربی کو آج سوا سو برس پہلے یہ بات سوجھی تھی، اور اس نے ایک انوکھی کہانی کا نرالے ڈھنگ سے ڈول ڈالا تھا۔ اس نے ایک کہانی رانی کیتکی اور کنور اودے بھان کی لکھی ہے جس میں اسی دیس کی ساری بولی ہے کسی اور دیس کی بولی کا میل نہیں ہے۔ پھر کچھ یہ بات نہیں جا ادھر ادھر کی انمل باتیں جوڑ دی ہوں، کوئی چھوٹی موٹی کہانی گھڑ دی ہو نہیں، دیکھئے تو اس سرے سے اس سرے تک پوری سڈول گھڑی گھڑائی بنی بنائی اچھی بڑی کہانی ہے۔ جس میں نئے نئے سماں باندھے ہیں، ڈھنگ ڈھنگ کی بات چیت لکھی ہے۔ کہیں چاہ پیار کی باتیں ہیں کہیں چھیڑ چھاڑ کی گھاتیں، نئے روپ نرالے بہروپ، لگاوٹ کی چاندنی لاگ کی دھوپ، راج نیت اور راج ہٹ، تریا ہٹ اور کایا پلٹ، جوگ بروگ جنتر منتر

(باقی بر صفحہ آئندہ)

ان میں عجیب روانی اور لطافت ہے۔ انشا بڑے زندہ دل اور شوخ مزاج تھے۔ اس کہانی کی ایجاد ہی ان کی شوخی طبیعت کی دلیل ہے، سارے قصے میں یہی شوخی جلوہ گر ہے۔ شروع میں سبب تالیف بیان کرتے ہیں:۔

ایک دن بیٹھے بیٹھے یہ بات اپنے دھیان میں چڑھ آئی کہ کوئی کہانی ایسی کہئے جس میں ہندوی چھٹ اور کسی بولی سے پُٹ نہ ملے، تب جاکے میرا جی پھول کی کلی کے روپ سے کھلے۔ باہر کی بولی اور گنواری کچھ اس کے بیچ نہو۔ اپنے ملنے والوں میں سے ایک کوئی پڑھے لکھے پرانے دھرانے بوڑھے گھاگ یہ کھٹراگ لائے سرہلا کر منہ بناکر ناک بھوں چڑھاکر آنکھیں پھراکر لگے کہنے

(باقی صفحہ گذشتہ) لڑائی بھڑائی، میل ملاپ، سبھی کچھ ہے اور ساری کہانی کے بول ایسے میٹھے جن کو پڑھ کر بول بول پر ہونٹ چاٹیے اور باتیں ایسی نرالی جن کو سن کر بات بات پر اچنبھے میں آجاتے۔

اس کہانی کے پڑھنے سے پہلے یوں ہی جی میں سوچیں تو ٹھیک بھید نہیں کھلتا، اور ایسا کچھ سمجھ میں آتا ہے جیسے اس ڈھب سے کہانی بنالینا کچھ کٹھن نہ ہوگا۔ ایسا کہنے اور سمجھنے والے آپ لکھ کر دیکھیں تو تارے دکھائی دینے لگیں ان دنوں جو ایسی بولی کی سوجھی ہے جس میں بدیسی کھوٹ اور پرایا میل نہو تو اسکے لئے کرتے کیا ہیں؟ بدیسی بولیوں کے ہلکے پھلکے، میٹھے پیارے، جانے پہچانے، بول چال میں کھپے کھپائے بول نکال دیتے ہیں، اور انکی جگہ سنسکرت اور برج بھاشا کے موٹے بھدے، بھاری پتھر بول رکھ دیتے ہیں جن سے بات سلجھنے کی جگہ اور الجھ جاتی ہے۔ اور بولی سمجھ میں تو کیا آتی ایک اچنبھا اور گورکھ دھندا ہوکر رہ جاتی ہے۔ رانی کیتکی والی کہانی میں یہ بات نہیں ہے۔ اتنا تو ہے، اور نہ کیوں ہوتا، اگلے لوگوں کی لکھی ہوئی جو ٹھہری، سو برس پہلے کی بولی جو ہوتی، پرانے لوگوں کی بات چیت اور لکھنے پڑھنے کا جو ڈھنگ تھا، جو اور جیسے بول وہ بولتے لکھتے تھے اور اب وہ بہت دنوں سے چھوٹ گئے ہیں اور ان کو سن کر اب (باقی برصفحہ آئندہ)

یہ بات ہوتی دکھائی نہیں دیتی۔ ہندوی پن بھی نہ نکلے اور بھاکا پن بھی نہ ٹھونس
جائے، جیسے بھلے لوگ اچھوں سے اچھے آپس میں بولتے چالتے ہیں جوں کا توں
وہی ڈول رہے، اور چھانہ کسی کی نہ پڑے، یہ نہیں ہونے کا۔ میں نے ان کی
ٹھنڈی سانس کی پھانس کا ٹھوکا کھا کر جھنجلا کر کہا، میں کچھ ایسا بڑبولا نہیں
جو رائی کو پربت کر دکھاؤں اور جھوٹ سچ بول کے انگلیاں نچاؤں، اور
بے سری بے ٹھکانے کی الجھی سلجھی باتیں سجاؤں، جو مجھ سے نہ ہو سکتا تو
بھلا یہ بات منہ سے کیوں نکالتا، جس ڈھب سے ہوتا اس بکھیڑے کو ٹالتا
اب اس کہانی کو کہنے والا یہاں آپ کو جتاتا ہے اور جیسا کچھ لوگ اسے

(بقیہ صفحہ گذشتہ) ہمارے کان کھڑے ہوتے ہیں، وہ تو جگہ جگہ اس کہانی میں بھی ملتے ہیں۔ سو یہ
بات کچھ اس کہانی اور اس کے لکھنے والے کی برائی نہیں کہی جاسکتی۔ جب کا کونسا لکھنے والا ہے
جس نے کچھ نہ کچھ ایسا نہ لکھا ہو بس بات کو چھوڑ دیجئے اور بھول جائیے تو ویسے یہ رانی کی کہانی،
کہانی کی رانی ہے۔ دھیان میں نہیں آسکتا جو ایسے ہی ڈھب سے لکھنے کی ٹھہرے تو اس
سے اچھی کیونکر لکھی جاسکتی ہے۔

اس کہانی کو پڑھ کر ہمارے جی میں آیا کہ اس پر ہم جو کچھ لکھیں اس میں بھی یہی بات ہو،
اکیلی دیسی بولی ہی میں پوری بات کہدیں، اور بولیاں نہ ملنے دیں۔ پہلے تو سوچا، ان باتوں
کو اوپر ہی جہاں اس کی ٹھیک جگہ ہے لکھدیں، پھر یہ بات کچھ ڈھنگ کی نہ دکھائی دی
ہم نے اب تک لکھنے کا جو ڈھنگ رکھا ہے۔ جس میں اتنا بہت سا اس سے پہلے لکھ آئے ہیں
وہ کچھ اور ہے اور یہ کچھ اور۔ پڑھنے والے اس کو پڑھتے پڑھتے جب اس تک آئیں گے تو
اچک اٹک جائیں گے اور جی میں کہیں گے، لکھنے والا گرگٹ کے سے روپ بھرتا ہے
کیا سے کیا لکھنے لگا۔ اس لئے ہم نے اس کو یہاں نیچے لکھ دیا ہے۔

پکارتے ہیں کہ ستاتا ہے۔ دھناہا تھ منہ پر پھیر کر آپ کو جتاتا ہوں، جو
میرے داتا نے چاہا تو وہ تاؤ بھاؤ اور آؤ جاؤ اور کود پھاند اور لپٹ جھپٹ
دکھاؤں جو دیکھتے ہی آپ کے دھیان کا گھوڑا جو بجلی سے بھی بہت چنچل،
اچھلاہٹ میں ہرنوں کے روپ میں ہے۔ اپنی چوکڑی بھول جائے ؂

گھوڑے پر اپنے چڑھ کے آتا ہوں میں
کرتب جو ہیں سو سب دکھاتا ہوں میں

اس چاہنے والے نے جو چاہا تو ابھی
کہتا جو کچھ ہوں کر دکھاتا ہوں میں

آگے کہانی کا ایک ٹکڑا یہ ہے۔

ایک رات رانی کیتکی نے اپنی ماں کام لتا سے بھلاوے میں ڈال کے یہ
پوچھا، گرو جی گسائیں مہندر گر نے جو بھبوت باپ کو دیا تھا۔ وہ کہاں رکھا ہے
اور اس سے کیا ہوتا ہے۔ اس کی ماں نے کہا میں تیرے واری تو کیوں پوچھتی ہے
رانی کیتکی کہنے لگی، آنکھ مچولی کھیلنے کے لئے چاہتی ہوں، جب اپنی سہیلیوں کے
ساتھ کھیلوں اور چور بنوں تو کوئی مجھ کو پکڑ نہ سکے۔ رانی کام لتا نے کہا، وہ
کھیلنے کیلئے نہیں ہے ایسے لٹکے کسی بڑے دن کے سنبھال لینے کو ڈال رکھتے ہیں،
جانے کوئی گھڑی کیسی ہے، کیسی نہیں، رانی کیتکی اپنی ماں کی اس بات سے اپنا
منہ تھتھا کے اٹھ گئی اور دن بھر نہ کھانے پیئے پڑی رہی مہاراج نے جو پوچھا تو کہا
مجھے رُنچ[1] نہیں ہے تب رانی کام لتا بول اٹھیں، اجی کچھ تم نے سنا بھی بیٹی تمھاری
آنکھ مچولی کھیلنے کے لئے وہ بھبوت گرو جی کا دیا ہوا مانگتی تھی؛ میں نے نہ دیا اور
کہا، بیٹی یہ لڑکپن کی باتیں اچھی نہیں، کسی برے دن کے لئے گرو جی دے گئے
اسی پر مجھ سے روٹھی ہے، بہیترا بہلاتی پھسلاتی ہوں۔ مانتی نہیں۔ مہاراج نے
کہا، بھبوت تو کیا مجھے تو اپنا جی بھی اس سے پیارا نہیں، اس کی ایک گھڑی

---

[1] بھوک

بھر کے بہل جانے پر ایک۔ جی تو کیا، لاکھ جی ہوں تو دے ڈالیے، رانی کیتکی کو
ذبیا میں سے تھوڑا سا بھبوت دیا۔ کئی دن تلک آنکھ مچولی اپنے ماں باپ کے
سامنے سہیلیوں کے ساتھ کھیلتی، سب کو ہنساتی رہتی، جو سو سو تھال
موتیوں کے نچھاور ہوا کئے۔ کیا کہوں ایک چہل تھی جو کہئے تو کروڑوں پوتھیوں
میں جیوں کی تیوں نہ آسکے۔

(۲) دریائے لطافت۔ یہ تصنیف اردو زبان و قواعد ادب کے متعلق سید انشا کا نہایت قابل قدر کارنامہ اور غیر فانی یادگار ہے۔ کتاب فارسی زبان میں لکھی ہے لیکن مضمون و موضوع اردو زبان ہے اس کے دو حصے ہیں۔ پہلا حصہ اردو کی قواعد و محاورہ کے متعلق ہے اور انشا کا لکھا ہوا ہے۔ دوسرا حصہ منطق و معانی و عروض پر ہے، اور محمد احسن قتیل کی تصنیف ہے دریائے لطافت ۱۸۰۷ء ۱۲۲۲ھ میں مرتب ہوئی، اور پہلی مرتبہ ۱۸۵۲ء ۱۲۶۸ھ میں مطبع آفتاب عالمتاب مرشد آباد میں چھپی اسکے بعد مولانا عبدالحق نے انجمن ترقی اردو کی طرف سے مع اپنے عالمانہ مقدمہ کے ۱۹۱۶ء میں شائع کی، اس جدید اشاعت میں کچھ اختصار و ترمیم بھی کی گئی ہے۔ انشا نے جا بجا فحش کلمات بے تکلف استعمال کئے تھے ان کو خارج کر دیا گیا ہے مولوی عبدالحق اس کتاب کی خوبیاں بیان کرتے ہیں:۔ کتاب کی جان پہلا ہی حصہ ہے۔ اگرچہ اس سے قبل بعض اہل یورپ نے متعدد کتابیں اردو قواعد پر لکھی تھیں، لیکن یہ پہلی کتاب ہے جو ایک ہندی اہل زبان نے اردو صرف و نحو پر لکھی ہے، اور حق یہ ہے کہ عجیب جامع اور بے مثل کتاب ہے۔ اردو زبان کے قواعد، محاورات اور روزمرہ کے متعلق اس سے پہلے کوئی ایسی مستند اور محققانہ کتاب نہیں لکھی گئی۔ جو لوگ اردو زبان کا محققانہ مطالعہ کرنا چاہتے ہیں یا اس کی صرف و نحو یا لغت پر کوئی محققانہ تالیف کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے لئے اسکا

مطالعہ ضروری ہی نہیں بلکہ ناگزیر ہے۔"

سید انشا نے الگ الگ باب باندھ کر حروف تہجی کی بحث، دہلی کے مختلف محلوں کی زبان کا فرق، بعض شعرا و فصحا کا ذکر، دہلی و لکھنؤ کی فصاحت و فوقیت کا موازنہ دہلی کی اصطلاحیں، عورتوں کی خاص گفتگو اور اصطلاحات صرف و نحو کے مجتہدانہ اصول بیان کئے ہیں۔ اور ہر جگہ عجیب ظرافت سے کام لیا ہے۔

دریائے لطافت کے تیسرے باب کے متعلق عبدالحق صاحب لکھتے ہیں "اسی باب میں نواب عمادالملک، بھاڑا مل، مرزا صدرالدین صفاہانی اور ملا عبدالفرقان کی دلچسپ تقریریں ہیں، خاص کر بی نورن اور میر غفر غینی کی تقریریں نہایت پرلطف ہیں بی نورن اور میر غفر غینی کی تقریر ایسی پاک صاف شستہ ہیں کہ آج کل کی بول چال بھی اس سے زیادہ فصیح نہیں ہو سکتی۔ اس سے سید انشا کی زباندانی اور فصاحت کلام کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ باوجود اس قدر زمانہ گزرنے کے اور زبان کے منجھنے اور ترقی پانے کے جو کچھ وہ لکھ گئے ہیں، اس میں کہیں حرف گیری کا موقع نہیں۔ بلکہ ویسی فصیح اور پاک صاف اردو اب بھی ہر شخص نہیں لکھ سکتا اور اس میں شعرائے عصر کے کلام پر جو تنقید کی ہے وہ بہت ظریفانہ ہے یہاں تک کہ اپنے آپ کو بھی نہیں چھوڑا۔"

ہم اسی کا نمونہ ذیل میں درج کرتے ہیں:۔

کلام بی نورن کسبی باشندۂ کوچۂ بلاقی بیگم با میر غفر غینی دیانی:۔

اجی آؤ میر صاحب تم تو عید کے چاند ہو گئے، دلی میں آتے تھے، دو دو پہر رات تک بیٹھتے تھے، اور ریختے پڑھتے تھے، لکھنؤ میں تمہیں کیا ہو گیا کہ کہیں تمہارا اثر آثار معلوم نہ ہوا۔ ایسا نہ کیجیو، کہیں آٹھوں[1] میں بھی نہ چلو۔ تمہیں علی کی قسم

---

[1] آٹھوں کا میلا لکھنؤ کا مشہور تہوار ہے۔

آنکھوں میں مقرر جلیو۔

جواب از میر غفر غینیؔ دیانی۔[1]

اجی بی نورن، یہ کیا بات فرماتی ہو، تم تو، اپنے چھوڑے کی چین ہو، پر کیا کہیں جب سے دلی چھوڑی ہے کچھ جی افسردہ ہو گیا ہے، اور شعر پڑھنے کو جو کہو تو کچھ لطف اس میں بھی نہیں رہا کہ تجھ سے سنئے، ریختے میں استاد میاں ولی ہوئے، ان پر توجہ شاہ گلشن صاحب کی تھی، پھر میاں آبرو اور میاں ناجی اور میاں حاتم، پھر سب سے بہتر مرزا رفیع السودا اور میر تقی صاحب، پھر حضرت خواجہ میر درد صاحب برد اللہ مرقدہٗ جو میرے بھی استاد تھے، وہ لوگ تو سب مر گئے، اور انکی قدردانی کرنے والے بھی جان بحق تسلیم ہوئے۔ اب لکھنؤ کے جیسے چھوکرے ہیں ویسے ہی شاعر ہیں اور دلی میں بھی ایسا ہی کچھ چرچا ہے۔ تخم تاثیر صحبت کا اثر، سبحان اللہ، یہ کون میاں جرأت بڑے شاعر، پوچھو تو تمہارا خاناں کس دن شعر کہتا تھا؟ اور رضا بہادر کا کونسا کلام ہے؟ اور دوسرے میاں مصحفی کہ مطلق شعور نہیں رکھتے، اگر پوچھئے کہ ضَرَبَ زَیدٌ عَمرُواً کی ترکیب تو ذرا بیان کرو تو اپنے شاگردوں کو ہمراہ لیکر لڑنے آتے ہیں۔ اور میاں حسرت کو دیکھو، اپنا عرق بادیان اور شربت انارین چھوڑ کے شاعری میں آگے قدم رکھا ہے، اور میر انشاء اللہ خاں بچارے میر ماشاء اللہ خاں کے بیٹے، آگے بریز اد تھے، ہم بھی گھورنے کو جاتے تھے، اب چند روز سے شاعر بن گئے ہیں، مرزا مظہر جان جاناں صاحب کے روزمرہ کو نام رکھتے ہیں سب سے زیادہ ایک اور سنئے کہ سعادت یار، طہماسپ کا بیٹا

---

[1] میر غفر کو غینی دیانی اس لئے کہا ہے کہ میر صاحب لام اور رے کو اکثر غین اور کے تری بولتے ہیں۔ انشاؔ نے ان کی ساری تقریر غین اور ی کے ساتھ لکھی ہے مولوی عبدالحق نے دریائے لطافت کے حاشیہ میں درست کر کے لکھ دیا ہے یہ بھی انشاؔ کی لاجواب ظرافت تھی۔

الوری ریختہ آپ کو جانتا ہے، رنگین تخلص ہے۔ ایک قصہ کہا ہے، اس مثنوی کا
نام دلپذیر رکھا۔ رنڈیوں کی بولی اس میں باندھی ہے۔ میر حسن پر زہر کھایا ہے
ہر چند اس مرحوم کو بھی شعور نہ تھا۔ بدر منیر کی مثنوی نہیں کہی، گویا سانڈے کا
تیل بیچتے ہیں بھلا اس شعر کو کیونکر کہیے۔ سارے دلی لکھنؤ کے رنڈی سے
لیکر مرد تک پڑھتے ہیں ؎

چلی واں سے دامن اٹھاتی ہوئی ۔۔۔ کڑے کو کڑے سے بجاتی ہوئی

سو اس بچلانے رنگین نے بھی اسی طور پر قصہ کہا ہے کوئی پوچھے کہ بھائی
تیرا باپ رسالدار مسلم، لیکن بچارا برچھی بھالے کا ہلانے والا، تیغ کا چلانے والا
تھا، تو ایسا قابل کہاں سے ہوا۔ اور گراہی پن (یا کلاہی پن) جو بہت مزاج
میں رنڈی بازی سے آگیا ہے تو ریختہ کے تئیں چھوڑ کر ایک ریختی ایجاد کی ہے
اس واسطے کہ بھلے آدمیوں کی بہو بیٹیاں پڑھ کر مشتاق ہوں، اور ان کے
ساتھ اپنا منہ کالا کرے۔ بھلا یہ کلام کیا ہے کہ

یہاں سے ہے کے پیسے ڈولی کہارو[۱]

اور نچوڑی انگیا، اور نگوڑی انگیا، اور مرڈڑی انگیا۔ اور مرد ہو کے یوں کہے ؏

کہیں ایسا نہ ہو کمبخت میں ماری جاؤں

---

۱ ریختی شاعری کی ایک قسم نکالی گئی ہے جس میں عورت کی زبان سے بے حیائی کے عشقیہ جذبات
و معاملات بیان کرتے ہیں، ریختی سعادت یار خاں رنگین کی ایجاد نہیں ہے جیسا انشاؔ
نے بیان کیا، بلکہ رنگین سے بہت پہلے ہاشمی دکنی نے سب سے پہلے ریختی کہی ہے۔ رنگین کی
اس غزل کا مطلع و مقطع یہ ہے:۔

جو ہونی تھی وہ بات ہولی کہارو ۔۔۔ چلو لے چلو میری ڈولی کہارو
ذرا گھر کو رنگین کے تحقیق کر لو ۔۔۔ یہاں سے ہے کے پیسے ڈولی کہارو

اور ایک کتاب بنائی ہے۔ اس میں رنڈیوں[1] کی بولی لکھی ہے۔ اوپر والیاں چیلیں
اوپر والا چاند۔ اجلی دھوپن۔ اندر والا دل۔ اور سہ گانا، دوگانا۔ یگانا، زناخی،
الائچی (یعنی) دوست۔

مرزا قتیل

فرید آباد (دہلی) کے رہنے والے، قوم کے کھتری تھے۔ دیوالی سنگھ نام تھا۔ مسلمان ہو گئے۔ محمد حسن نام رکھا گیا۔ مرزا قتیل کے نام سے مشہور ہیں۔ بہ ۱۲۳۳ھ/۱۸۱۷ء میں انتقال کیا۔ فارسی کے شاعر و ادیب تھے۔ مولوی غلام امام شہید آپ کے شاگرد ہیں۔ دربار اودھ کے متوسل تھے۔ نہر الفصاحت، چار شربت، دیوان وغیرہ فارسی کی تصنیفات ان سے یادگار ہیں۔ سید انشا سے بڑا یارانہ تھا۔ قتیل کا اردو زبان کے متعلق یہی کارنامہ ہے کہ دریائے لطافت انشا کی شرکت میں مرتب کی۔ اس کا دوسرا حصہ جیسا کہ پہلے لکھا گیا، منطق، عروض، قافیہ، معانی، بیان کے متعلق قتیل نے لکھا ہے۔ قتیل نے بھی انشا کی طرح ظرافت سے کام لیا ہے، لیکن ان سے بڑھے نہیں۔ مثلاً فن عروض میں اوزانِ بحر کے مشہور الفاظ کی جگہ نئے الفاظ تراشے ہیں، جیسے:-

مفعول مفاعیلن، مفعول مفاعیلن کی جگہ بی جان پری خانم بی جان پری خانم
فاعلن مفاعیلن فاعلن مفاعیلن کی جگہ چت لگن پری خانم چت لگن پری خانم

منطق میں بھی ایک جدت پیدا کی۔ اپنے نزدیک تو اس میں ظرافت و شوخی کا پہلو نکالا ہے، لیکن وہ ایک علمی تجویز بھی ہے جو وضع اصطلاحات اور ترجمۂ علوم و فنون کے ماہرین کے لئے قابل غور ہے۔ یعنی منطق کی اصطلاحوں کے لئے اردو کے

---

[1] رنڈی لکھنؤ میں عورت کیلئے بولا جاتا تھا۔ طوائف کے معنوں میں بعد کو استعمال ہوا ہے اُس زمانے میں طوائف کو کسبی کہتے تھے اور آج بھی کہتے ہیں۔

الفاظ تلاش کئے ہیں۔ مثلاً

تصور	دھیان
موضوع	بول
محمول	بھرپور
نسبت	ملاپ
قضیہ	بات
تسلسل	اُلجھا سوت

تصدیق	جوں کا توں
دَوْر	ہیر پھیر
مطابقت	ٹھیک ٹھیک
التزامی	اوپری لگاؤ
مثلث	تکرڑا
مربع	چوکرڑا

مرزا قتیل نے علم بیان و بدیع کا حصہ بھی خوب لکھا ہے۔ یہ علوم اردو میں غالباً سب سے پہلے اسی کتاب میں مرزا قتیل کے قلم سے مرتب ہوئے ہیں۔ امام بخش صہبائی کا ترجمہ حدائق البلاغت اس سے بعد کا ہے قتیل نے تمام صنائع لفظی و معنوی کی مثالیں اپنی طبع زاد نظم یا نثر میں لکھی ہیں۔ مشہور معروف صنعتوں کے علاوہ اور نئی نئی کاریگریاں نکالی ہیں۔ تعریف و تشریح فارسی زبان میں ہے اور مثالیں اردو میں لکھی ہیں۔ تحریر کا انداز یہ ہے، ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

سوائے ضلع مناسبت درمیان دو چیز مخالف یکدیگر بہ یک لفظ بیان کنند آں را نسبت نام نہند، مثلاً اگر کسے بپرسد کہ کنوئے اور آتشبازی میں کیا نسبت ہے؟ باید گفت کہ "چرخی"۔ یا بپرسد کہ بندوق اور مہاجن اور فرنگی میں کیا نسبت؟ باید گفت کہ "کوٹھی"۔ یا ایں کہ شمشیر و پلٹن باہم چہ نسبت دارند؟ باید گفت "باڑھ" یا میانۂ چوپڑ و دوپٹہ چہ نسبت است؟ باید گفت کہ "گوٹ"۔

ضلع کی مثال میں دریا کے مناسب چیزیں بیان کرنے کے لئے دو صفحے میں اردو کی عبارتیں لکھی ہیں۔ جن میں پانی کے اقسام؛ دریاؤں کے نام، اور دریائی جانور کشتی اور تیراکی کے الفاظ ضلع یا ایہام کے طور پر استعمال کئے ہیں۔ شروع کے

فقرے یہ ہیں :۔

"آپ کا بجرہ کچھ آج کمل گیا ہے، واللہ تمہاری بات پانی بہت مشکل ہے، ہمیں کل سوتا چھوڑ گئے، ہر چند ضعف نالی کی، تو بھی رتھ میں جگہ ندی، ایک بادلی رنڈی کے کہنے سے ہماری چاہ دل سے اٹھادی"

ایک عبارت مرتب کی ہے جس میں حرف نون کہیں نہیں آنے دیا۔ لکھتے ہیں۔

جس کا جی چاہے ہمارے پاس آئے۔ گھر ہے اس کا، اور جو کوئی آتا آتا یکبارگی رہ جائے تو ہم کو کیا غرض، اگر یہ چاہے کہ ہم سا بے لیاقت بھی کبھی کبھی آیا کرے تو یہ بات بہت مشکل ہے۔ اس واسطے کہ عاصی پُراز معاصی ایسا عہد کر بیٹھا ہے کہ اس گوشہ ہی کے بیچ اسی طرح جما ہے کہ اگر ہزار بار دورۂ کامل فلک مشتم کا کہ جس کو خلق خدا کی کرسی کہتی ہے سر پر گزر جائے تو بھی اس جگہ سے اُٹھ کر جو بہت جائے تو اس دوسرے حجرے تک جاوے سو بھی دیکھا چاہئے۔ یہ بھی اس وقت کا ایک زٹل قافیہ ہے۔

ایک عبارت موصل، دو حرفی کی صنعت میں لکھی ہے، یعنی دو دو حرف ملے ہوئے ہیں: نہ کوئی حرف الگ ہے نہ دو سے زیادہ ملے ہیں ۔ فرماتے ہیں :۔

"چوٹی کو کا جی کی لڑکی کی گڑیا کالی ناگن ہے، پر جب جی چاہے تب کاٹے ہے۔
جو جو خوبی حق نے کوکا صاحب کی لڑکی کو دی ہے، شاید نوشابہ کو دی ہو تو دی ہو"

اس عبارت کے ضمن میں اُس زمانے کی سوسائٹی کے اخلاق بھی قابل ذکر و توجہ ہیں۔ انشا، قتیل اور رنگین تینوں گہرے اور بے تکلف دوست ہیں تینوں کو کسبی عورتوں سے بڑی دلچسپی ہے، انشا کی زبانی بی نورن کا ذکر بیان کیا جا چکا ہے۔ انشا نے رنگین کی بھی اس دلچسپی کا ذکر کیا ہے، قتیل نے ان دونوں سے کم اپنی دلچسپی و وابستگی کا اظہار نہیں کیا۔ اپنے حصہ تالیف میں جتنی مثالیں

دی ہیں۔ اکثر میں رنڈیوں اور کسبیوں کا ذکر ہے۔ صنعت توشیح میں انہی عورتوں کے نام نکالے ہیں۔ معمے انہی کے بنائے ہیں۔ اشعار اور عبارتوں میں انہی کا ذکر ہے۔ اور اوزان بحر میں انہی کے نام رکھے ہیں۔ شاید اس زمانے کے لکھنؤ کی سبھی رنڈیوں اور کنچنیوں کے نام لکھ دیے ہیں۔ اس عہد کے لکھنؤ پر عیش و عشرت کے بادل چھائے ہوئے تھے، تاہم یہ بات قابل داد ہے کہ وہ بزرگ بے باکی یا بے تکلفی و صاف دلی کے ساتھ کہہ دیتے ہیں۔ ممکن ہے، بلکہ یقین ہے کہ اس زمانے میں یہ ذکر اذکار سب کرتے تھے، حال و کردار سب کے ایسے نہ تھے۔ لیکن ہمارے زمانے میں حال وہی ہے، قال وہ نہیں۔

دریائے لطافت کے علاوہ مرزا قتیل کی اردو نثر کی تحریر مرزا کے مجموعہ مکتوبات میں بھی پائی جاتی ہے۔ مرزا کے شاگرد خواجہ امداد الدین نے انکے خطوط جمع کرکے ۱۲۳۲ھ ۱۸۱۷ء میں معدن الفوائد کے نام سے شائع کئے تھے۔ اس میں مرزا قتیل نے حمد و نعت عربی، فارسی، ترکی، اردو میں لکھی ہے۔ اردو کا نمونہ یہ ہے۔

بہت بندگی اور بہت غلامی کے لائق وہ جناب ہے کہ اس کو خدائے برتر نے اپنا پیغمبر کیا، اور تمام فاضلوں اور عالموں اور آدمیوں کو اسکی اُمت کیا سبحان اللہ اس بزرگ درگاہ کا دیکھنے والا ہوں کہ میری ہدایت کی راہ کا دکھلانے والا ہے، اور سعادت کی منزل کا خضر ہے"

اس عبارت کے اسلوب پر فارسی کا اثر ہے، دریائے لطافت کے اقتباسات سلیس و فصیح روزمرہ میں ہیں۔ بہرحال مرزا قتیل بھی ترقی اردو کے کاربردازوں میں شامل ہیں۔

مولوی اسمٰعیل دہلوی

شاہ عبدالغنی صاحب کے بیٹے اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی کے پوتے تھے ۱۲۱۰ھ ۱۷۹۶ء میں پیدا ہوئے۔ والد کا انتقال ان کے بچپن میں ہو گیا تھا۔ ان کے چچا شاہ عبدالعزیز صاحب نے تربیت کی اور آغاز جوانی میں علوم معقول و منقول کی تحصیل سے فارغ ہو گئے۔ جوان ہو کر مولوی سید احمد بریلوی کے مُرید ہو گئے جو ہندوستان میں فرقہ وہابیہ کے بانی ہوئے ہیں۔ مولوی سید احمد ۱۱۹۷ھ ۱۷۸۳ء میں پیدا ہوئے تھے، شاہ عبدالعزیز اور شاہ عبدالقادر سے تعلیم پائی تھی، لیکن بعد کو وہابیت کی طرف مائل ہو گئے تھے۔ نہایت خوش بیان مقرر تھے اس لئے لوگ کثرت سے ان کے معتقد و مرید ہو جاتے تھے۔ ہندوستان میں اپنے عقائد کی اشاعت کرنے کے بعد ۱۲۳۷ھ ۱۸۲۲ء میں حج کو گئے۔ مکہ معظمہ سے قسطنطنیہ گئے اچھ سال تک ترکی اور ممالک اسلامیہ کی سیر و سیاحت کر کے اپنے عقائد کی تبلیغ کرتے رہے۔ پھر دہلی واپس آ کر پہلے سے زیادہ جوش و خروش کے ساتھ اشاعت عقائد شروع کر دی، اور آخر انتہائے جوش میں سکھوں کے خلاف جہاد کا اعلان کر دیا ۱۲۴۳ھ ۱۸۲۸ء میں مولوی اسمٰعیل کو ساتھ لیکر عظیم الشان لشکر کی قیادت کرتے ہوئے سکھوں سے جنگ کرنے کے لئے پشاور کو روانہ ہو گئے۔ ان کے لشکر کی تعداد ایک لاکھ سے زیادہ ہو گئی تھی۔ بڑے بڑے مشاہیر ملک اور اہل دولت ان کے معاون و مددگار تھے۔ ۱۸۲۹ء میں انھوں نے پشاور پر قبضہ کر لیا۔ لیکن ان کے عقائد و اصول کی سخت گیری سے تنگ آ کر سرحدی افغانوں نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا اور یہ پشاور چھوڑ کر دریائے اٹک کے پار پناہ لینے پر مجبور ہو گئے آخر ۱۲۴۶ھ ۱۸۳۱ء میں قلعہ بالاکوٹ کے قریب سکھوں سے جنگ کرتے ہوئے مولوی سید احمد و مولوی اسمٰعیل دونوں نے سفر آخرت اختیار کیا اور

شہید مشہور ہوئے۔

جب اس شکست کی خبر دہلی پہنچی تو مشہور شاعر شاہ نصیر نے ظرافت و تمسخر کے انداز میں طویل قصیدہ کہا، اس کے دو شعر یہ ہیں:۔

کلام اللہ کی صورت ہوا دل ان کا سیپارہ
نہ یاد آئی حدیث ان کو نہ کوئی نصّ قرآنی

ہرن کی طرح میدانِ وغا میں چوکڑی بھولے
اگرچہ تھے دُمِ شملہ سے وہ شیر نیستانی

یہ قصیدہ دہلی میں مشہور ہوا تو ان کے مرید پیر کی یہ توقیر سن کر برافروختہ ہوگئے، اور کثیر تعداد میں شاہ نصیر کے مکان پر چڑھ آئے۔ قریب تھا کہ شاہ صاحب دشمنوں کی زد میں آجائیں لیکن کوتوال شہر میرزا خانی کو اطلاع مل گئی، وہ موقع پر پہنچ گئے اور شاہ نصیر کی جان بچالی۔ شاہ صاحب نے شکریہ کا اضافہ کیا اور یہ شعر بھی کہا۔

نہوتے شحنۂ دہلی اگر یاں میرزا خانی
نصیرالدین بیچارہ تو رستہ طوس[1] کا لیتا

مولوی سید احمد بریلوی نے اردو میں کوئی کتاب نہیں لکھی۔ فارسی میں تنبیہ الغافلین لکھی ہے جس کا اردو میں ترجمہ مولوی عبداللہ نے ۱۸۳۰ء میں ہگلی (کلکتہ) سے شائع کیا تھا۔ مولوی اسمٰعیل دہلوی نے کئی کتابیں اپنے عقائد کے متعلق اردو میں لکھیں، جن میں سے تقویت الایمان بہت مشہور ہے۔ اس زمانے میں مولوی سید احمد کے اور مریدوں نے بھی بہت سی کتابیں تبلیغ و اشاعت کی غرض سے لکھیں مثلاً ترغیب جہاد ہدایۃ المومنین، نصیحۃ المومنین وغیرہ یہ

---

[1] طوس کے لفظ سے شاہ نصیر نے اپنے ہمنام خواجہ نصیرالدین طوسی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ور نہ رستہ تو ملک عدم کا لیتے۔

کتابیں بھی اردو کی ترقی کے سلسلے میں شامل ہیں۔ مولوی اسمٰعیل کی تقویت الایمان
بہت صاف اور سلیس زبان میں ہے۔ صرف کہیں کہیں ترتیب الفاظ اور اندازِ
بیان میں قدامت ہے۔ نمونہ یہ ہے:۔

"ہر خاص و عام کو چاہئے کہ اللہ و رسول ہی کے کلام کو تحقیق کریں اور اسی کو
سمجھیں اور اسی پر چلیں، اور اسی کے موافق اپنے ایمان کو ٹھیک کریں۔ سو سننا
چاہئے کہ ایمان کے دو جز ہیں مثلاً کو خدا جاننا اور رسول کو رسول سمجھنا اور خدا
کو خدا سمجھنا اس طرح ہوتا ہے کہ اس کا شریک کسی کو نہ سمجھے اور رسول کا رسول
سمجھنا اس طرح ہوتا ہے کہ اس کے سوائے کسی کی راہ نہ پکڑے۔ اس پہلی بات
کو توحید کہتے ہیں اور اسکے خلاف کو شرک، اور دوسری بات کو اتباع سنت
کہتے ہیں اور اسکے خلاف کو بدعت۔ سو ہر کسی کو چاہئے کہ توحید اور اتباع سنت
کو خوب پکڑے اور شرک و بدعت سے بہت بچے، کہ یہ دونوں چیزیں اصل ایمان
میں خلل ڈالتی ہیں اور باقی گناہ ان سے پیچھے ہیں کہ وہ اعمال میں خلل ڈالتے ہیں

تقویت الایمان کثرت سے شائع ہوئی۔ اسکے پہلے حصہ کا انگریزی ترجمہ
رایل ایشیاٹک سوسائٹی (لندن) کے رسالہ میں شائع ہوا تھا۔

سید اعظم علی اکبر آبادی

آگرہ کے رہنے والے مولوی ببر علی کے بیٹے تھے
انکے نانا آگرہ کے مشہور بے نظیر عالم و صاحبدل
بزرگ مولوی ولی محمد (شارح مثنوی مولانا روم) تھے انکے سایہ میں مولوی اعظم علی نے
پرورش پائی تھی۔ تحصیل علوم کے بعد مین پوری میں محصّلِ لگان رہے۔ پھر آگرہ
کالج میں فارسی کے مدرس ہوگئے۔ علمی مذاق رکھتے تھے صاحب تصانیف ہیں
۱۸۰۵ء / ۱۲۲۰ھ میں سکندرنامہ کا ترجمہ کیا؛ ۱۸۲۴ء / ۱۲۴۰ھ میں فسانہ سرور افزا اردو میں لکھا

سنہ ۱۸۰۵ء میں ایک فارسی مثنوی "اکسیر اعظم" لکھی۔ یہ آخری تصنیف ہے۔ مرزا غالب سے مولوی اعظم علی کے مراسم خط و کتابت تھے۔ غالب کے پنج آہنگ میں مولوی صاحب کے نام بھی ایک فارسی کا رقعہ ہے۔ فسانۂ سرور افزا کا نمونہ یہ ہے،
حمد باری تعالیٰ لکھتے ہیں:-

احسان ایسے بادشاہ عادل اور شہنشاہ باذل کا کہ جس نے واسطے عبادت و معرفت اپنی ذات کے انسان ضعیف بنیان کے تئیں تہ خانۂ ظلمات عدم سے نکال کر خلعت جواہر نگار حیات ابدی کا عنایت فرمایا؛ مقدور کس بشر کا ہے کہ زبان بیان سے ادا کر سکے، اور شکر ایسے ہادی برحق و کریم مطلق کا کہ ایسے مشت خاک سراسر ناپاک کے تئیں تمامی مخلوقات و موجودات سے ممتاز و سرفراز کر کے نور عقل و شمع ایمان سے منور کیا، طاقت کس کی ہے جو ایک حرف اس دفتر بے پایاں سے بیان کرے۔ ایسا خداوند حقیقی ہے کہ ہر ذی حیات کو بے رعایت سلسلہ طاعت و عبادت کے، شام و صباح وظیفہ خوار نعمتوں بے قیاس کا رکھتا ہے، اور عجب رزاق مطلق ہے کہ مور سے مار تلک کسی جاندار کو اپنے مائدۂ فضل و نوال سے محروم و مایوس نہیں کرتا ہے۔

یہ عبارت ترجمہ نہیں ہے، مصنف کی طبع زاد تحریر ہے لیکن اسلوب ترجمہ کا سا معلوم ہوتا ہے۔ اس زمانے میں فارسی پڑھنے لکھنے کے سبب سے درسیات و ادبیات فارسی کا طرز بیان ذہن نشین ہوتا تھا، وہی انداز اپنی آزادانہ نگارش میں بھی پیدا ہو جاتا تھا۔ اس کو بدلنا اور سلاست و روانی پیدا کرنا اپنی اپنی افتاد طبیعت اور اقتضائے حال کے مطابق ہو سکتا ہے۔ فورٹ ولیم کالج کی تصانیف کا مقصد ہی سادہ و آسان اردو لکھنا تھا۔ اس لئے اکثر ایسی ہی لکھی گئیں، پھر بھی سب کا طرز ایک سا نہیں ہے۔ میر امن اور حیدری نے ترجموں کو بھی اپنا کر لیا ہے:

افسوس پورے کامیاب نہو سکے امانت اللہ بالکل ناکام رہے۔ لطف نے سلاست وسادگی کے جھگڑے ہی میں پڑنا پسند نہ کیا۔ اپنی وہی قدامت کی آن قائم رکھی جب کالج کے متعین مقصد اور متحدہ کوشش کا یہ حال ہے تو کالج سے باہر تو کوئی پابندی تھی ہی نہیں۔ انشا اور قتیل ذہین، طبّاع، جدّت پسند تھے، بہت سے بہتر اردو لکھ گئے اور لوگ اپنی اپنی روش پر چلتے رہے۔

مرزا رجب علی بیگ سرور

لکھنؤ کے سب سے پہلے مصنفِ نثر ہیں۔ مرزا اصغر علی بیگ کے بیٹے ہیں۔ غالباً ۱۷۸۷ء ۱۲۰۲ھ میں پیدا ہوئے (مرزا غالب سے دس برس پہلے) فن خوشنویسی کے بڑے ماہر و استاد تھے۔ موسیقی میں بھی کمال رکھتے تھے۔ عربی و فارسی کی تعلیم بھی کافی پائی تھی۔ شاعری میں آغا نوازش حسین کے شاگرد تھے۔ نہایت ظریف زندہ دل، خوش رو، خوش خو آدمی تھے۔ نواب غازی الدین حیدر شاہ اودھ (عہد وزارت و سلطنت ۱۸۱۴ء ۱۲۲۹ھ تا ۱۸۲۷ء ۱۲۴۲ھ) کے حکم سے جلاوطن ہو کر لکھنؤ سے کانپور چلے گئے

مختصر تاریخ وزارت و شاہی اودھ

(۱) شاہان اودھ کا مورث اعلیٰ خراسان کا تاجر محمد امین تھا جو حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی اولاد سے تھا۔ اس کا باپ محمد نصیر بہادر شاہ (جی اورنگ زیب عالمگیر) بادشاہ دہلی ۱۷۰۷ء ۱۰۱۹ھ تا ۱۷۱۲ء ۱۰۲۴ھ کے عہد سلطنت میں ہندوستان آتا تھا۔ باپ کے مرنے کے بعد محمد امین ہندوستان میں آیا اور نواب سربلند خاں صوبہ دار گجرات کے دربار میں ملازم ہوا۔ پھر صوبہ دار سے ناراض ہو کر دہلی آگیا، اور فرخ سیر بادشاہ دہلی (۱۷۱۳ء ۱۱۲۵ھ تا ۱۷۱۹ء ۱۱۳۱ھ) اور محمد شاہ (۱۷۱۹ء ۱۱۳۱ھ تا ۱۷۴۸ء ۱۱۶۱ھ) کے عہد میں ہنڈون و بیانہ کا فوجدار رہا۔ ایک موقع پر سادات بارہہ کے مقابلے میں محمد شاہ کی مدد کی۔ بادشاہ نے سعادت خاں بہادر کا خطاب دیا

کانپور میں حکیم سید اسد علی کے مشورے سے اپنی مشہور تصنیف فسانہ عجائب لکھنی شروع کی۔ جب سنہ ۱۸۴۷ء ۱۲۶۲ھ میں واجد علی شاہ تخت نشین ہوئے تو انہوں نے سرور کو درباری شاعر مقرر کیا، اور پچاس روپیہ ماہوار تنخواہ کردی سنہ ۱۸۵۶ء میں سلطنت اودھ ختم ہو گئی اور بادشاہ معزول ہو گئے، پھر سنہ ۱۸۵۷ء ۱۲۷۳ھ میں غدر کی تباہی آئی۔ سرور اس عرصہ میں سخت پریشان رہے۔ سنہ ۱۸۵۹ء میں مہاراجہ بنارس نے اپنے پاس بلالیا، پھر مہاراجہ الور اور مہاراجہ پٹیالہ نے بھی مہمان بلایا، مہاراجہ

(بقیہ صفحہ گذشتہ) اس کے بعد بادشاہ نے اس کو اودھ کا صوبہ دار مقرر کر دیا اور برہان الملک کا خطاب عنایت کیا۔ جب سنہ ۱۷۳۹ء ۱۱۵۱ھ میں نادر شاہ کابل و پشاور و پنجاب فتح کرتا ہوا دہلی کے ارادے سے پانی پت تک آگیا تو برہان الملک سعادت خاں نے اودھ سے آکر محمد شاہ کی مدد کی اور پانی پت پر بادشاہ کے ساتھ نادر شاہ سے جنگ کی۔ اتفاق سے برہان الملک اور نظام الملک آصف جاہ دونوں نادر شاہ کے ہاتھ میں گرفتار ہو گئے۔ نادر شاہ نے محمد شاہ کو بھی بارادۂ صلح اپنے خیمہ میں بلالیا اور جنگ ختم کر کے ان سب کو ساتھ لیکر نادر شاہ دہلی آگیا نظام الملک برہان الملک کا دشمن تھا اور اس کو اپنے راستے سے ہٹانا چاہتا تھا جس صبح کو نادر شاہ نے دہلی میں قتل عام کیا اس سے پہلی رات کو نظام الملک برہان الملک کے پاس آیا اور کہا کہ نادر شاہ کہتا ہے اگر پچاس کروڑ روپیہ مجھے دیدو تو میں واپس چلا جاؤں گا ورنہ تمہاری جان کی خیر نہیں۔ اتنا روپیہ کہاں ہے۔ لیکن یہ دل: آج میرے لئے ہے کل تمہارے لئے اس بے آبروئی سے موت بہتر اس لئے ہم تم دونوں زہر کے پیالے پی کر اپنا کام آپ تمام کرلیں برہان الملک سادہ دل آدمی تھا۔ کہنے میں آگیا اور زہر پی کر جان دیدی۔ نظام الملک آرام سے اپنے گھر آکر سو رہا۔ برہان الملک کے بعد محمد شاہ نے اسکے بھانجے صفدر جنگ کو اودھ کا صوبہ دار بنادیا۔

(۲) منصور علی خاں صفدر جنگ (سنہ ۱۷۳۹ء ۱۱۵۱ھ تا سنہ ۱۷۵۴ء ۱۱۶۷ھ) (باقی در صفحہ آئندہ)

پٹیالہ نے طلائی کڑے نذر کئے۔ سرور نے ایک خط میں اپنے سفر دہلی و میرٹھ و راجپوتانہ کے مصائب کا حال لکھا ہے۔ ۱۸۶۳ء میں سرور اپنی آنکھوں کے علاج کے لئے کلکتہ گئے اور واجد علی شاہ کی خدمت میں بھی حاضر ہوئے جو مٹیا برج میں نظر بند تھے۔ وہاں سے واپس آکر بنارس چلے گئے اور وہیں ۱۸۶۷ء ۱۲۸۴ھ میں انتقال کیا۔ سرور کی تصنیفات یہ ہیں:۔

(۱) فسانہ عجائب یہ ۱۸۲۴ء ۱۲۴۰ھ میں لکھی۔ (۲) سرور سلطانی ترجمہ شمشیر خانی

بقیہ صفحہ گذشتہ

اس عہد میں روہیلہ افغانوں نے اودھ پر حملہ کیا اور صفدر جنگ نے ان کو شکست دی۔ مقبرۂ صفدر جنگ دہلی کی مشہور عمارت ہے۔ صفدر جنگ کا باپ جعفر خاں جس سے سعادت خاں کی بہن منسوب تھی سادات میں سے نہ تھا۔ بلکہ آرمینیا کی مشہور ترکمان قوم قراقزلو سے تھا۔ صفدر جنگ کی ماں سیدانی تھی۔

(۳) شجاع الدولہ (۱۷۵۴ء ۱۱۶۷ھ تا ۱۷۷۵ء ۱۱۸۸ھ) صفدر جنگ کا بیٹا تھا۔ تاریخ ہندوستان کا بڑا نامور اور ہنگامہ پرور آدمی ہے۔ انگریزوں سے جنگ کی شکست کھائی اور صلح کر لی۔ روہیلوں سے لڑا اور کامیابی پائی۔ اسی کے زمانے میں روہیلہ پٹھانوں کی ریاست رام پور کی بنیاد پڑی۔ اسی زمانے میں احمد شاہ ابدالی نے ہندوستان پر حملہ کیا۔ پانی پت پر تیسری مشہور جنگ ہوئی (۱۷۶۱ء ۱۱۷۵ھ)

(۴) آصف الدولہ (۱۷۷۵ء ۱۱۸۸ھ تا ۱۷۹۷ء ۱۲۱۲ھ) ابن شجاع الدولہ بڑی شان و شوکت کا نواب تھا۔ اس کا زمانہ نسبتہً پُرامن رہا۔ شجاع الدولہ تک لڑائیاں اور دھکا مکڑ حکومت فیض آباد رہا۔ آصف الدولہ نے لکھنؤ کو دار الحکومت بنایا۔ مقبرۂ آصف الدولہ ہندوستان کی بے نظیر عمارتوں میں شامل ہے۔ سلطنت مغلیہ کی بربادی کے سبب سے دہلی کے شعرا و اہل کمال شجاع الدولہ و آصف الدولہ کے زمانے میں اودھ آئے۔ مرزا سودا، میر تقی میر، میر حسن، میر سوز انہی زمانوں میں لکھنؤ آئے۔ اور ان کے آنے سے لکھنؤ میں شعر و سخن (باقی بر صفحہ آئندہ)

۱۸۴۷ء میں واجد علی شاہ کے حکم سے مرتب کی گئی نے شاہنامہ فردوسی کا خلاصہ نثر
فارسی میں شمشیر خانی کے نام سے لکھا تھا۔ سرور نے اس کا ترجمہ کیا ہے۔ (۳) شرر عشق
۱۸۵۶ء میں نواب سکندر جہاں بیگم ریاست بھوپال کے حکم سے لکھا۔ یہ بھوپال کے
جنگل کے پرندوں کا ایک عجیب واقعہ ہے (۴) شگوفہ محبت بھی اسی سال ۱۸۵۶ء
میں لکھا۔ یہ قصہ پہلے مہر چند کھتری نے لکھا تھا۔ اسی کو سرور نے اپنے رنگ میں لکھا
(۵) گلزار سرور، ترجمہ حدائق العشاق فارسی۔ یہ مذہبی کتاب ہے جس میں روح و عشق کا

(بقیہ صفحہ گذشتہ) کی رونق ہوئی۔ آصف الدولہ خود بھی شاعر تھا، اچھا کہتا تھا۔

(۵) وزیر علی خاں (۱۷۹۷ء ۱۲۱۲ھ میں صرف چار مہینے حکومت کی، آصف الدولہ کا فرزند اکبر تھا، لیکن اس کی بدکرداری کے سبب خود اسکی دادی بہو بیگم والدۂ آصف الدولہ اور چند امراد اعیان سلطنت مخالف ہو گئے اور انگریزوں کی مدد سے معزول کرا دیا۔ رعایا وزیر علی خاں کی طرفدار تھی لیکن اس کی کچھ نہ چلی۔ وزیر فورٹ ولیم کلکتہ میں مقید رہا اور وہیں ۱۸۱۷ء ۱۲۳۲ھ میں انتقال کیا

(۶) سعادت علی خاں۔ (۱۷۹۸ء ۱۲۱۲ھ تا ۱۸۱۴ء ۱۲۲۹ھ) آصف الدولہ کا چھوٹا بھائی تھا بھائیوں میں نباہ نہ ہو سکتا تھا اس لئے سعادت علی خاں لکھنؤ سے باہر بریلی۔ آگرہ۔ ڈیگ (بھرتپور) وغیرہ میں اقامت گزیں رہا۔ لیکن انگریزوں سے برابر خط و کتابت کرتا رہا کہ آصف الدولہ کے بعد اسی کو حکومت دی جائے۔ جب وزیر علی خاں کو انگریزوں نے معزول کیا تو سعادت علی خاں سے یہ شرط کی کہ اگر تم نصف ملک ہمیں دیدو اور نصف پر اپنی حکومت رکھو تو تم کو حکمراں بنائے دیتے ہیں۔ سعادت علیخاں نے منظور کر لیا اور معاہدہ پر دستخط کر دئے۔ اس طرح کوڑہ۔ کٹرہ فرخ آباد، الہ آباد، بریلی وغیرہ بہت سا ملک ہاتھ سے نکل گیا اور ایک کروڑ ۳۵ لاکھ ۲۳ ہزار ۴ سو ۸۵ روپیہ کا نقصان ہو گیا۔ دوسری عجیب و غریب نادانی سعادت علی خاں نے یہ کی کہ ہندوستان پر اپنا سکہ جمانے کیلئے تمام ممالک محروسۂ انگریزی کا اس شرط کے ساتھ ٹھیکہ لینا چاہا کہ کروڑہا روپیہ زر پیشگی دینے کا وعدہ کیا۔ اس کام کے لئے ایک انگریز (باقی بر صفحہ آئندہ)

مناظرہ دکھایا ہے۔ سرور نے اپنے مخصوص طرز رنگین و مقفیٰ میں لکھا ہے۔ مرزا غالب نے اسی طرز میں اس پر تقریظ لکھی ہے۔ (۶) شبستان سرور اس میں الف لیلہ کے چند قصوں کا ترجمہ ہے۔ (۷) انشائے سرور سرور کے خطوط کا مجموعہ ہے جو انکے بعد مرتب شائع ہوا۔ ان میں سے بعض کے نمونے درج کئے جاتے ہیں۔

ا۔ سرور سلطانی ترجمہ شمشیر خانی کی عبارت مقفیٰ ہے۔ شاہنامہ نثر اردو میں لکھا ہے۔ یہ کتاب مشہور و مقبول نہ ہوئی، حالانکہ سرور کا مخصوص اسلوب تحریر

(بقیہ صفحہ گذشتہ) مسٹر اڈنی کو لندن بھیج کر بادشاہ اور پارلیمنٹ کے سامنے ٹیکس کی درخواست پیش کردی۔ اسی زمانے میں لارڈ ہسٹنگز گورنر جنرل ہو کر آ رہا تھا اس معاملہ کی سعی و سفارش کے لئے لارڈ کو لیک کروڑ روپیہ بھیج دیا۔ لارڈ ہندوستان آنے لگا تو اس نے سعادت علی خاں کو خط لکھا کہ میں آتے ہی تمہارا کام کردوں گا۔ نواب اس خوشی سے ایسا پھولا کہ اپنے دربار میں اس کا ذکر کردیا۔ یہ غلطی پر غلطی ہوئی۔ لکھنؤ کا ریزیڈنٹ کرنل بیلی پہلے ہی سے نواب کا دشمن تھا اس نے بھی سن لیا۔ اتفاق سے انہی دنوں میں نواب عارضۂ جگر و استسقا میں مبتلا ہوا۔ غسل صحت کے بعد سواری پر باہر گیا۔ رات کو آکر یخنی مانگی۔ نواب کے سالے رمضان علی خاں نے زہر ملا کر یخنی پیش کردی۔ پیتے ہی زہر سرایت کر گیا اور خاتمہ کردیا۔ نواب سعادت علی خاں بڑا زندہ دل، شاہانہ مزاج تھا۔ علم و فن اور شعر و ادب کا بڑا قدردان تھا۔ سید انشا، الٰہ خاں مصحفی، مرزا قتیل، رائے گلاب رائے گلشن، اسی دربار کے شعرا تھے۔

(۷) غازی الدین حیدر (وزارت ۱۲۲۹ھ / ۱۸۱۴ء تا ۱۲۳۴ھ / ۱۸۱۹ء۔ شاہی ۱۲۳۴ھ / ۱۸۱۹ء تا ۱۲۴۳ھ / ۱۸۲۷ء) سعادت علی خاں کا فرزند اکبر تھا۔ چند سال وزارت و نوابی کے بعد ہیسٹنگز نے غازی الدین حیدر کو مستقل بادشاہ بنا دیا۔ اور سلطنت دہلی سے تعلق منقطع کردیا۔ یہ نواب بھی علم دوست تھا۔ اسکے زمانے میں لکھنؤ میں ٹائپ اور لیتھو کے مطبع قائم ہوئے۔ کتابیں تصنیف و طبع ہوتیں۔ رجب علی سرور، نقیر محمد خاں گویا، شیخ ناسخ، خواجہ آتش (آیندہ صفحہ پر)

اس میں بھی موجود ہے۔ سہراب ورستم کی آخری جنگ سے چند سطریں نقل کی جاتی ہیں:۔

"دوسرے دن جس وقت تہتنِ مشرق (آفتاب) آغشتہ بخوں سمندِ نیلگوں (آسمان) پر سوار ہوا، سہراب رستم سے دوچار ہوا۔ آخرکار تہتن نے نعرہ کیا کوہ دہاموں کا جگر پارہ کیا، اور سہراب کا کمر بند پکڑ کے سر سے بلند کر کے زمین پر دے پٹکا، اور فوراً کمر سے خنجر آبدار نکال اس کے سینہ کو چاک کر دیا۔ سہراب نے

(بقیہ صفحہ گذشتہ) خواجہ وزیر اسی زمانے میں تھے۔

(۸) نصیر الدین حیدر (۱۸۲۷ء ۱۲۴۳ھ تا ۱۸۳۷ء ۱۲۵۲ھ) اس کے زمانے میں شاہی خاندان میں بہت فتنہ و فساد رونما ہوا۔ اس بادشاہ کی محبوب ملکہ نواب قدسیہ بیگم تھی۔ کسی بات پر بادشاہ اس سے بدظن و بددل ہو گیا۔ اس نے زہر کھا لیا۔ بادشاہ کو سخت صدمہ ہوا، اور اس نے ماتمی سیاہ لباس پہننے کا تمام رعایا اور اہل خاندان کو حکم دیا۔ بادشاہ کی والدہ بادشاہ بیگم بہو سے ناراض تھی۔ اس نے ماتم کرنے سے انکار کیا۔ بادشاہ ماں سے ناراض ہو گیا۔ اور اس کو الماس باغ میں رہنے کا حکم دیا۔ بادشاہ کا فرزند اکبر مرزا فریدوں بخت عرف منا جان اپنی ماں کے مرنے کے بعد سے دادی کے پاس رہتا تھا وہ بھی بادشاہ بیگم کے ساتھ چلا گیا۔ بادشاہ نے لڑکے کو اپنے پاس رکھنا چاہا۔ بیگم نے نہ بھیجا۔ بادشاہ بیٹے سے بھی ناراض ہو گیا، اور اعلان کر دیا کہ فریدوں بخت بادشاہ زادہ ہی نہیں ہے۔ اس طرح ماں بیٹے (بادشاہ بیگم اور نصیر الدین حیدر) کے رنجش و عناد کو بہت طول ہو گیا۔ آخر میں بادشاہ نے ماں کو راضی کرنا چاہا تو وزیر الممالک نے آتش فتنہ کو اور بھڑکایا اور کسی طرح صلح نہ ہونے دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بادشاہ کو زہر دیدیا گیا۔ نصیر الدین حیدر نے بھی اہل کمال کی بہت قدر کی۔ جدید مطابع جاری ہوئے۔ بعض نادر کتابیں عربی و فارسی کی شائع ہوئیں

(۹) محمد علی شاہ (۱۸۳۷ء ۱۲۵۲ھ تا ۱۸۴۲ء ۱۲۵۸ھ) نصیر الدین حیدر کی (باقی بر صفحہ آئندہ)

آہ سرد دل زخمی دپر درد سے کھینچی اور کہا افسوس مشتاق دیدار پدر، محروم و ناکام پسر، دار ناپائدار سے چلا تہمتن شیر افگن نہ ملا۔ مگر اب تو مچھلی بنکر زیر قدم گاو زمیں پناہ لے جائے گا یا اختر ہو کر فلک ہفتمیں پر اپنے تئیں چھپائے گا، میرا باپ کہیں منھ نہ موڑے گا۔ کسی طرح تجھ کو زندہ نہ چھوڑے گا۔ رستم نے پوچھا اس کا کیا نام ہے۔ سہراب نے کہا رستم جہاں پہلوان ہے، اور میری ماں دختر شاہ سمنگاں ہے۔ یہ سنتے ہی دنیا رستم کی نظر میں تیرہ و تار بن گئی۔!!

(بقیہ صفحہ گذشتہ) وفات ناگاہ کی خبر پاتے ہی لکھنؤ کے انگریز ریزیڈنٹ جنرل لو نے نصیر الدین حیدر کے چچا نصیر الدولہ خلف نواب سعادت خاں کو تخت نشین کرنے کی تیاری شروع کر دی ابھی نصیر الدولہ ملبوس شاہی پہننے میں مشغول تھا کہ بادشاہ بیگم اپنے پوتے نصیر الدین حیدر کے لڑکے مرزا فریدوں بخت کو لیکر آگئی۔ اور اس کو تخت نشین کرنا چاہا۔ دولت خانہ شاہی کا دروازہ ریزیڈنٹ کے حکم سے بند تھا۔ بادشاہ بیگم نے ہاتھیوں کے ذریعہ سے دروازہ توڑ ڈالا اور فریدوں بخت کو تخت پر بٹھا دیا اور نذریں لینا اور احکام شاہی جاری کرنا شروع کر دیا۔ ریزیڈنٹ نے آکر بیگم کو سمجھایا کہ مداخلت کرنا بیگم کے لئے اچھا نہ ہوگا لیکن اس نے نہ مانا ریزیڈنٹ نے انگریزی فوج بلائی اور توپوں کے فیر کا حکم دیدیا بادشاہ بیگم کے حمایتی کچھ کام آئے کچھ فرار ہو گئے۔ بادشاہ بیگم اور فریدوں بخت گرفتار ہو گئے اور نصیر الدولہ محمد علی شاہ کا لقب اختیار کر کے بادشاہ بن گیا۔ نیک دل اور مدبر تھا، لیکن اس کے عہد میں بعض کمینوں کو بہت عروج ہوا۔ لکھنؤ کی دوسری بے نظیر عمارت امام باڑہ حسین آباد اسی بادشاہ کی یادگار ہے۔ بادشاہ نے اس امام باڑے کے مصارف کے لئے بارہ لاکھ روپیہ انگریزی خزانہ میں جمع کر دیے تھے کہ ان کے سود سے مصارف کا انتظام کیا جائے۔ چنانچہ یہ انتظام آج تک بدستور جاری ہے۔

(۱۰) امجد علی شاہ (۱۸۴۲ء، ۱۲۵۸ھ تا ۱۸۴۷ء، ۱۲۶۳ھ) یہ بڑا مذہبی (باقی برصفحہ آئندہ)

۲۔ گلزار سرور۔ اس کے آغاز میں سرور نے کچھ اپنا حال اور تالیف کتاب کا سبب بیان کیا ہے۔ اس کا اقتباس درج کیا جاتا ہے۔ قافیہ پیمائی اور رنگین نگاری سرور کی ہر جگہ خصوصیت ہے لکھتے ہیں:۔

"یہاں سے نقاش ثانی معترف نادانی، گردش دیدہ بلا رسیدہ، یار دیار سے دور، رجب علی بیگ سرور، اپنی گذشتہ داستانِ حیرت بیان لکھتا ہے بارہ سو چوہتر ۱۲۷۴ ہجری شہر شعبان میں فلک نے وہ سامان کیا، گلزار لکھنؤ پر عین بہار میں خزاں آئی، اس شعبدہ باز کہن نے نئی نیرنگی دکھائی:۔۔۔

(بقیہ صفحہ گذشتہ) بادشاہ تھا۔ امور مملکت و عدالت کا اختیار کُلّی مجتہد العصر کو سپرد کر دیا تھا مجالس عزا و مرثیہ خوانی کا اہتمام پہلے سے زیادہ اس کے عہد میں ہوا۔ میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ کے کمال کو اسی زمانے میں عروج شروع ہوا۔

(۱۱) واجد علی شاہ (۱۸۴۷ء ۱۲۶۳ھ تا ۱۸۵۶ء ۱۲۷۲ھ) یہ بادشاہ عیش و عشرت کی طرف اس قدر راغب تھا کہ بعض کور نمک پست فطرت لوگوں کو دخل اندازی کا موقع مل گیا اور نظام سلطنت بگڑنے لگا۔ انگریزی حکومت کی طرف سے چند بار متنبہ کیا گیا، کچھ توجہ نہ ہوئی آخر غدر سے ایک سال پہلے ۱۸۵۶ء میں بادشاہ کو معزول کر کے اودھ کا حکومت انگریزی سے الحاق کر لیا۔ شاہی اودھ ختم ہو گئی۔ بادشاہ کو کلکتہ کے فورٹ ولیم میں نظر بند کر دیا۔ اسی سال بادشاہ نے الحاق اودھ اور واپسی سلطنت کی داد فریاد کے لئے ایک وفد انگلستان کو ملکہ وکٹوریہ کے پاس بھیجا۔ اس وفد میں جناب عالیہ ملکہ کشور اور مرزا ولی عہد اور مرزا سکندر حشمت (مخاطب بہ جرنیل صاحب) اور مولوی مسیح الدین خاں کاکوروی خاص لوگ تھے اور بہت سے ان کے مصاحب و خادم تھے یہ لوگ انگلستان پہنچے۔ ملکہ سے ملاقات کی لیکن ساتھ کے کینہ طبع لوگوں نے ارکان وفد میں اختلاف رائے پیدا کر دیا ادھر ۱۸۵۷ء میں ہندوستان میں غدر ہو گیا۔ اور

بے فکری اس جا کی دور دور مشہور تھی، بقول مشہور لنگوٹی میں پھاگ کھیلتی تھی فاقہ کشی میں ڈنڈ پیلتی تھی، اپنے زعم میں قیصر و فغفور تھی، ایسی چمک دمک ہوئی کہ حد سے گذر گئی۔ ہر کمالے را زوالے، فلک کو اُجاڑنا، اس کا نام و نشان بناکے بگاڑنا منظور تھا، دگرنہ نہ بادشاہ کے دل میں نہ یہاں کی رعایا کی طبیعت میں فتور تھا۔ حضرت واجد علی شاہ سلطان عالم نے نو برس شاہی کی اس پر سرکار سے سرتابی نہ کی بلکہ خیر خواہی کی، قیصر باغ کو غیرت گلزار ارم بنایا تھا۔ کیا لکھوں دن رات جو لطف اٹھایا تھا۔ خدا جانے کس کمبخت کی نظر اس شہر کو کھا گئی۔ امیر فقیر سب پر تباہی آ گئی ...... ہند میں فوج سرکار قدیم نمک خوار، پیادہ اور سوار، شامت اعمال سے پھر گئے۔ غربا سے

(بقیہ صفحہ گذشتہ) ولایت کے انگریزوں نے الحاق اودھ کو بھی غدر کا ایک سبب قرار دے دیا۔ غرض یہ وفد ناکام رہا۔ واپسی میں فرانس میں ملکہ کشور اور مرزا سکندر حشمت کا انتقال ہو گیا۔ مرزا ولی عہد بادشاہ کے پاس کلکتہ آ گئے۔ بادشاہ قلعہ فورٹ ولیم سے مٹیا برج میں منتقل کر دئے گئے۔ یہاں نسبتہً بہت عیش و راحت اور یک گونہ آزادی نصیب ہو گئی۔ قلعہ میں بالکل قیدی تھے۔ ۱۸۸۷ء مطابق ۱۳۰۴ھ میں مٹیا برج میں انتقال کیا۔ واجد علی شاہ کے زمانے میں لکھنؤ کو عیش و نشاط کے علاوہ علوم و فنون، صنعت و تجارت میں بھی بہت ترقی ہوئی۔ قیصر باغ اسی کی یادگار ہے۔ واجد علی شاہ خود شاعر تھا، اختر تخلص تھا۔ چھ دیوان غزلیات، تین جلد مراثی، چند مثنویاں اور بہت سے مجموعے نظم و نثر کے تصنیف کئے جن کی تعداد ایک درجن سے زیادہ ہے۔ دیگر مشاہیر ادب کے نام یہ ہیں مرزا رجب علی سرور، اصغر علی خاں نسیم دہلوی، نواب محمد خاں رند، مظفر علی خاں اسیر آفتاب الدولہ قلق، نظیر حسن اوج، عابد علی کوثر، علی اوسط رشک، منیر شکوہ آبادی امیر مینائی، امانت، برق، بحر وغیرہ۔

اُمرا تک بلائیں گھر گئے۔ جا بجا شور و شر مچا یا قتل و غارت سے فساد ہوا۔
پتوں کا کیا بگڑا، ہندوستان اس بکھیڑے میں برباد ہوا۔ پہلے دہلی اجڑی
پھاٹک ٹوٹا، پھر لکھنو لوٹا، یہاں تک کہ بے چراغ ہوا، بے بہن دے پامال
خزاں خانہ باغ ہوا۔"

۳۔ فسانۂ عجائب۔ یہ سرور کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ اسی سے ان کا نام
زندہ ہے، اردو انشا پردازوں میں ان کا ایک انفرادی درجہ قائم ہے فسانۂ عجائب
کی چند خصوصیات یادگار و قابل ذکر و توجہ ہیں:۔

(۱) فسانۂ عجائب کی رنگین و مقفّٰی عبارت اُس زمانۂ قدیم کے طرز نگارش سے
جداگانہ نہیں ہے۔ اس سے پہلے اس رنگ کی کم سے کم دو کتابیں ممتاز ہیں فضلی
کی دہ مجلس یا کربل کتھا، اور تحسین کی نو طرز مرصع۔ ان کے گذشتہ نمونوں سے
ظاہر ہے کہ قافیہ پیمائی، عبارت آرائی، عربی و فارسی کے الفاظ و تراکیب زور قلم
اور علمی شان میں کسی سے کم نہیں یہی حال فسانۂ عجائب کا ہے۔ پھر بھی سرور
نے اس روش کو اعتدال کے ساتھ اختیار کیا ہے مسلسل بیان میں کچھ دیر کے لئے
قافیے بھی ترک کر دیتے ہیں، اور ثقیل الفاظ سے روانی و صفائی میں کمی نہیں آنے
دیتے۔ اس لئے فضلی و تحسین کی سی تعقید اور گنجلک کم پیدا ہوتی ہے۔ اور تحسین کی
سی ثقالت و معمائیت شاذ و نادر پیدا ہوتی ہے۔

(۲) فسانۂ عجائب کے اسلوب تحریر کو اب کیسا ہی سمجھا جائے اور کسی نظر سے
دیکھا جائے، لیکن یہ قدیم زمانے کا محبوب و مقبول انداز تھا اور علم انشا کا کمال گنا
جاتا تھا۔ اس لئے اس کو اسی نظر سے دیکھنا چاہیئے۔ اس لفظی آرائش اور علم و قابلیت
کی نمائش سے موزوں اور ناموزوں دونوں کام لئے جا سکتے ہیں۔ مرزا سرور کی
تحریر میں بھی مناسب و نامناسب دونوں انداز موجود ہیں۔ مثلاً سرور کہیں عربی و

فارسی تراکیب، تشبیہ و استعارے سے محاکات و منظر کشی کرتے ہیں، لیکن ناکام رہتے ہیں یعنی وہ منظر آنکھوں کے سامنے نہیں آتا۔ دیکھئے، رات گزرنا اور دن نکلنا بیان کرتے ہیں:۔

"جس وقت زاغ شب نے بیضہ ہائے انجم آشیانہ مغرب میں چھپائے اور صیادان سحر خیز دام بردوش آئے، اور سیمرغ زریں جناح مطلا بال غیرت لال قفس مشرق سے جلوہ افروز ہوا، یعنی شب گذری روز ہوا"

یا ایک جگہ "سردی کی شدت" دکھلانے کے لئے یہ فقرے لکھتے ہیں:۔

"آتش رخسار گل شبنم نے بجھائی تھی، باغ میں بھی جاڑے کی دہائی تھی، اوس برگ و بار کی صنعت پروردگار کی دکھاتی تھی، مرصع کاری یک لخت نظر آتی تھی، دانہ ہائے اشک شبنم خواہ بڑے یا ریزے تھے، ہر شجر کے پتے اور شاخ میں الماس اور موتیوں کے آویزے تھے"

اس سے سردی کا سماں پیش نظر نہیں ہوتا، لیکن اسی سردی کو جب اسی مقفی انداز میں لیکن واقعات کے ساتھ اور قریب واقعہ تشبیہوں کی مدد سے بیان کرتے ہیں تو پوری منظر کشی ہو جاتی ہے۔ لکھتے ہیں:۔

چلے کے جاڑے کڑاکے کی سردی تھی۔ گویا زمین سے آسمان تک یخ بھر دی تھی؛ سردی سے سب کا جی جلتا تھا، دم تقریر ہر شخص کے منہ سے دھواں دھار دھواں نکلتا تھا۔ زمانے کے کاروبار میں خلل تھا۔ ہر ایک دست در بغل تھا، ہر سنگ کے سینے میں آگ تھی، گواہ شرعی شرر تھا۔ لیکن سردی کو یہی لاگ تھی اور جاڑے کا ایسا اثر تھا کہ سلیں کی سلیں جمی پڑی تھیں، فولاد سے زیادہ کڑی تھیں!"

(۳) سرور حسب موقع زبان اختیار کرنے پر قدرت رکھتے ہیں۔ عربی و فارسی کے استعمال کی مثالیں اوپر مذکور ہو گئیں۔ ضرورت پر آیات قرآن مجید بھی

تضمین کر دیتے ہیں مثلاً۔

لیکن بایں حکومت و ثروت کاشانہ امید کا چراغ گل، اولاد بالکل نہ تھی، خواہش فرزند دردل، نہ ہونے کی خواہش متصل، حسرت پسر میں رَبِّ لَا تَذَرْنِیْ فَرْداً وَّاَنْتَ خَیْرُ الْوَارِثِیْنَ ہر ساعت برزباں۔ رَبِّ ھَبْ لِیْ مِنْ لَّدُنْکَ وَلِیّاً وظیفۂ دہاں۔ لڑکے کی تمنا میں بادشاہ مثل گدا دست دراز، ایسا لاپرواہ بے نیاز کی قدرت سے بانیاز۔"

لیکن اس سے آگے جب اس بادشاہ کے ہاں فرزند پیدا ہوتا ہے، اور بادشاہ شہزادہ کا جنم پتر کھلوانے کے لئے نجومی پنڈت بلاتا ہے تو سرور پنڈتوں کی مخصوص زبان و اصطلاحات لکھتے ہیں۔

نجومی پنڈت جفر داں حاضر ہوئے، بہت سوچ بچار کر برہمنوں نے عرض کی، مہاراج کا بول بالا، جاہ وحشم مرتبہ دوبالا ہے، ہماری پوتھی کہتی ہے بھگوان کی دیا سے شہزادہ کا چندرمان بلی ہے، اچھا سورج ہے جو گرہ ہے وہ بھلی ہے، دیگ تیغ کا مالک ہے، دھرم مورت یہ بالک ہے، جلد راج پر براجے۔ پرتھمی میں دھوم مچے ایسی شادی رچے، مگر پندرھویں برس مشتری بارھویں آئے گی، سنیچر پاؤں پڑے گا ایک پنکھیر و سوے کے برن میں ہاتھ آئے گا، تریا کی کھٹ پٹ سے وہ بچن سنائے گا کہ راج پاٹ چھڑا دیس بدیس لے جائے گا، ڈگر میں شاہزادہ بھٹکے کوئی پاس نہ پھٹکے، ساتھی چھٹیں، اپنے ڈیل سے ڈانواں ڈول رہے پھر ایک منکھ ٹھاکر کا سیوک کر باکرے راہ لگائے، کوئی کلنکن سوجھی ہو کشٹ لگائے"۔

(۴) اسی طرح مختلف فنون کی اصطلاحیں، شریف و رذیل کا طرز کلام اہل بازار و اہل حرفہ کی گفتگو وغیرہ مختلف اجزائے فسانہ مناسب زبان و بیان میں ادا کئے ہیں اس اعتبار سے فسانہ عجائب اس مخصوص اسلوب تحریر کی پہلی بہترین و مکمل تصنیف ہے

(۵) اصل فسانہ میں کوئی خاص جدت نہیں ہے خلاف قیاس واقعات اور عجائبات جیسے اس سے پہلے داستان امیر حمزہ وغیرہ میں ہیں فسانہ عجائب میں بھی ہیں۔

(۶) فسانۂ عجائب کا اس اعتبار سے مطالعہ کرنا ضروری بھی ہے اور دلچسپ بھی کہ یہ داستانی لٹریچر کا جزو ہے۔ اس سے پہلے کم اور اس کے بعد بڑی کثرت سے نہایت طویل و ضخیم داستانیں لکھی گئیں۔ ان داستانوں میں اس کا کیا درجہ ہے؟ پھر فسانۂ عجائب کی تصنیف (۱۸۲۴ء) کے تقریباً چالیس برس بعد اردو میں جدید ناول نگاری کا دور شروع ہو گیا۔ سب سے پہلے ڈپٹی نذیر احمد نے ۱۸۶۲ء میں زنانہ ناول مرآۃ العروس لکھا۔ اور پھر پے در پے متعدد ناول تصنیف کئے، اور پھر پنڈت رتن ناتھ سرشار نے ۱۸۸۰ء میں فسانہ آزاد لکھا۔ ان ناولوں سے فسانہ عجائب کا کیا مقابلہ ہے؟

(الف) داستانوں میں فسانۂ عجائب کو کوئی نمایاں مرتبہ حاصل نہیں ہے اس کے بعد الف لیلہ اور بوستان خیال اور داستان امیر حمزہ اور اس کے سلسلے ایک الماری بھر داستانیں لکھی گئیں جن میں سے ایک ایک فسانۂ عجائب سے کئی کئی گنی بڑی ہے اور واقعات و نیرنگ و فسوں اور تجربات و مشاہدات کی انسائیکلو پیڈیا ہیں۔

(ب) ناولوں کی خصوصیات کے لحاظ سے بھی فسانۂ عجائب کو کوئی درجہ نہیں دیا جا سکتا۔ یعنی افراد قصہ کا کیرکٹر، مربوط و منضبط پلاٹ، اشخاص کا مکالمہ جذبات نگاری جدید ناول کے اصول سے مطابق نہیں ہیں۔ کہیں یہ اجزا درست ہیں، کہیں ناقص۔ مثلاً "ملکۂ مہر نگار" کا کردار مہر و وفا، صدق و صفا، ہمت و استقلال دانائی و کاردانی صحیح طور پر پیش کیا ہے۔ فسانۂ عجائب کا مقابلہ نذیر احمد، سجاد حسین

عبدالحلیم وغیرہ کے ناولوں سے تو ہو ہی نہیں سکتا۔ سرشار کے فسانۂ آزاد سے اس اعتبار سے مقابلہ کیا جا سکتا ہے کہ سرور نے اپنی کتاب کے دیباچہ میں اور سرشار نے اپنے تمام فسانہ میں لکھنؤ کی معاشرت اور سوسائٹی اور تہذیب و تمدن کا حال دکھایا ہے۔ لیکن سرور کی نقاشی ایسی ہے جیسے نمائش گاہ میں باتصویر پردہ جس پر بازاروں، مجلسوں، مجمعوں کی تصویریں صحیح کھینچی ہوئی ہوں لیکن بالکل خاموش اور بے حس۔ اور سرشار کی مصوری ایسی ہے جیسے متکلم سینما کے پردے پر چلتی پھرتی، بولتی چالتی تصویریں۔ سرور مختصر طور پر سرسری بیان لکھتے ہیں سرشار چھوٹی چھوٹی باتوں کی تفصیل لکھتے ہیں۔ سرور قصہ اور اس کے عجائبات سے دلچسپی رکھتے ہیں، سرشار قصہ کو چھوڑ دیتے بلکہ بھول جاتے ہیں اور افراد قصہ اور ان کے خصائص طبع و عجائب فطرت کو بیان کرتے ہیں۔ سرور میں ظرافت و شوخی کہیں نہیں، اور سرشار میں ہر جگہ اور ہر وقت ہے۔

(۷) آخر میں سرور کے متعلق یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ انھوں نے فسانۂ عجائب کے دیباچہ میں میر امن دہلوی اور ان کے باغ و بہار پر چوٹیں کی ہیں، لکھتے ہیں:۔

"اگرچہ اس ہیچ میرز کو یہ یارا نہیں کہ دعویٰ اردو زبان پر لائے یا اس فسانے کو بنظر نثاری کسی کو سنائے، اگر شاہجہاں آباد کہ مسکن اہل زبان، کبھی بیت السلطنت ہندوستان تھا، وہاں چندے بود و باش کرتا، فصیحوں کو تلاش کرتا، فصاحت کا دم بھرتا، جیسا میر امن صاحب نے چار درویش کے قصے میں بکھیڑا کیا ہے کہ ہم لوگوں کے دین و حصہ میں یہ زبان آئی ہے۔ دلّی کے روڑے ہیں کہ محاورں کے ہات پاؤں توڑے ہیں، پتھر پڑیں ایسی سمجھ پر کہ یہی خیال انسان کا خام ہوتا ہے۔ مفت میں نیک بدنام ہوتا ہے بشر کو دعویٰ کب سزا وار ہے۔ کاملوں کو بیہودہ گوئی سے انکار بلکہ ننگ و عار ہے۔ مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید۔"

حالانکہ میر امن نے کسی کا نام لیکر چوٹ نہیں کی تھی۔ نہ اُس زمانہ (سنہ ۱۸۰۲ء) تک لکھنؤ کا کوئی مستند مصنف مشہور ہوا تھا۔ بلکہ اس زمانے میں لکھنؤ میں بھی جو شاعر ممتاز و مقبول تھے (میر، جرأت، مصحفی، انشا، خلیق وغیرہ) وہ دہلی ہی کے تھے۔ میر امن نے دہلی کے ٹکسال اور مرکز زبان ہونے کے سبب سے یہ لکھدیا تھا۔

"جو شخص دلی کا روڑا ہو کر رہا اور دس پانچ پشتیں اسی شہر میں گزریں اور اس نے دربار اُمرا کے دیکھے، اور میلے ٹھیلے، عرس، چھڑیاں، سیر و تماشا اور کوچہ گردی اس شہر کی کی ہوگی اور وہاں سے نکلنے کے بعد اپنی زبان کو لحاظ میں رکھا ہوگا، اس کا بولنا البتہ ٹھیک ہے۔"

بہر حال رجب علی بیگ سرور کا یہ لعن طعن ہنگامہ آرائی کا سبب بن گیا جس سے اردو لٹریچر میں بھی اضافہ ہوا یعنی سرور کے جواب میں خواجہ فخر الدین حسین سخن دہلوی نے ایک قصہ "سروش سخن" لکھا اور اس میں سرور کا جواب دیا اور اُلٹے اور اعتراض کئے یہ کتاب سنہ ۱۸۶۰ء میں لکھی گئی۔ اس کے جواب میں اور سرور کی حمایت میں جعفر علی شیون لکھنوی نے سنہ ۱۸۶۲ء میں ایک فسانہ "طلسم حیرت" لکھا، اس میں اہل دہلی کے طعنوں کا جواب دیا۔

"فسانۂ عجائب" کے آغاز و اختتام تصنیف کے صحیح سال دریافت نہیں ہوئے مرزا محمد عسکری صاحب نے "تاریخ ادب اردو" میں لکھا ہے کہ "سنہ ۱۲۴۰ھ میں سرور کانپور گئے" اور یہ سال سرور کی تحریر سے ثابت کیا ہے۔ اس سے آگے لکھتے ہیں۔ "کانپور ہی میں یہ کتاب لکھی گئی.... یہ کتاب غازی الدین حیدر کے زمانہ میں شروع ہوئی تھی اور نصیر الدین حیدر کے عہد میں تمام ہوئی" اس کے بعد لکھتے ہیں "بعد اختتام بعہد نصیر الدین حیدر لکھنؤ میں آئی" اس کا سنہ تصنیف سنہ ۱۲۴۰ھ ہے جیسا کہ آخر کے

قطعات تاریخ سے معلوم ہوتا ہے۔" یہ بیانات نہایت غیر مطابق اور غیر ذمہ دارانہ ہیں۔ اگر ان سنوں کو صحیح مان لیا جائے تو سرورؔ جس سال کانپور گئے اسی سال کے اندر یہ کتاب لکھ لی، اور آخر میں اسی سال کے قطعات تاریخ شامل کر دیتے یہ بالکل قرین قیاس ہے، لیکن سنہ ۱۲۴۰ھ (مطابق ۱۸۲۴ء) غازی الدین حیدر کے زمانے کا سال ہے۔ نصیر الدین حیدر کا عہد حکومت اس سے تین سال بعد ۱۲۴۳ھ (مطابق ۱۸۲۷ء) میں شروع ہوتا ہے، پھر اس کے لکھنے کے کیا معنی کہ نصیر الدین حیدر کے عہد میں تمام ہوئی۔"

فسانۂ عجائب کا طویل نمونہ دینے کی ضرورت نہیں، نہایت مشہور عام و رائج کتاب ہے۔ اسکولوں اور یونیورسٹیوں کے نصاب تعلیم میں اس کے اقتباسات شامل ہیں۔ ایک مختصر ٹکڑا درج کیا جاتا ہے جس میں عربی و فارسی کی لفاظی کم ہے روزمرّہ محاورہ زیادہ:۔

> یہاں تو یہ حیص بیص تھی کہ جانعالم تشریف فرما ہوا۔ عجیب صحبت دیکھی کہ شہزادی بچشم پُر آب یا دلِ کباب غیظ میں آ، تھرتھرا، طوطے سے بحث رہی ہے۔ شہزادہ نے فرمایا، خیر باشد طوطا بولا آج نزاع ہے، خیر بخیر، مگر چندے حیات اس وحشی کی اور آب و دانہ قفس پینا کھانا باقی تھا، اگر آپ اور گھڑی بھر دیر لگاتے تشریف نہ لاتے تو میرا طائرِ روح گرفتۂ غضب شہزادی سے مجروح ہو کر پرواز کر جاتا، ہرگز جیتا نہ پاتے، مگر بہ جز احالی دیکھ مزاج عالی پریشان ہوتا بحسرت و افسوس یہ فرماتے ؎
>
> طوطا ہمارا مر گیا کیا بولتا ہوا
>
> ماہ طلعت ان باتوں سے زیادہ مکدّر ہوئی، شہزادے سے کہا، اگر میری بات کا طوطا جواب صاف نہ دے گا تو اس تگوڑے کی گردن مروڑ اپنے تلوؤں سے اس کی

آنکھیں ملوں گی جب دانہ پانی کھاؤں پیوں گی۔ جان عالم نے کہا کچھ حال تو کہو طوطے نے گذارش کی حضور یہ مقدمہ غلام سے سنئے۔ آج شہزادی صاحب اپنی دانست میں بہت نکھریں ع

دیکھ آئینہ کو کہتی تھی کہ اللہ رے میں

مجھ سے پھر فرمایا، تونے ایسی صورت کبھی دیکھی ہے؟ مجھ اجل رسیدہ کے منہ سے نکلا، خدا نہ کرے! اس جرم قبیح پر شہزادی کے نزدیک کشتنی، سوختنی گردن زدنی ہوں۔ بقول میر تقی میر ؎

بے جرم تہ تیغ ہی رکھا تھا گلے کو
کچھ بات بری منہ سے نہ نکلی تھی بھلے کو

جان عالم نے کہا، تم بھی کتنی عقل سے خالی، حمق سے بھری ہو، تم تو پری ہو، جانور کی بات پر اتنی آزردہ ہو، گو گویا ہے پھر طائر ہے میاں مٹھو کو ان باتوں کی تاب نہ آئی۔ آنکھ بدل، وحشی صورت بنائی، اور زمیں سے بولا، خداوند نعمت جھوٹ جھوٹ ہے۔ سچ سچ ہے، میں نے تو جھوٹ اور سچ دونوں سے بچ کر یہ کلمہ کہا تھا۔ اگر سچ کہا ہوتا گردن کج کئے سیدھا گور میں سوتا۔ یہ سن کے وہ اور کمدر ہوئی مثل مشہور ہے، راج ہٹ، تریا ہٹ، بالک ہٹ جان عالم نے مجبور ہوکر کہا، جو ہو سو ہو، مٹھو میاں سچ کہدو۔

محمد بخش مہجور شرفائے دہلی سے تھے، رسمی علوم میں اچھی دستگاہ تھی۔ شاعرانہ ذوق رکھتے تھے۔ جرأت (متوفی ۱۸۱۰ء / ۱۲۲۵ھ) کے رشید تھے۔ میر و سودا کا زمانہ دیکھا تھا۔ نثر اردو میں وہی طرز مقفی ان کو بھی پسند تھا۔ گلشن نو بہار ان سے یادگار ہے۔ اس زمانے کے گمنام مصنف ہیں اسلئے

ان کی کتاب میں سے حمد باری تعالیٰ کی چند سطریں نقل کی جاتی ہیں۔ کہ ان کا نام زندہ رہے :-

حمد و سپاس و ثنائے بے قیاس، اس کریم کارساز بے نیاز بے انباز بندہ نواز، بے چون و بے چگوں کو، کہ جس نے ساتھ ابر کرم اور بہار قدرت کے گل ہائے گونا گونِ انسان ضعیف البنیان سے گلشن تکوین کو سرسبز و شاداب کر کے اپنے تئیں برنگ نکہت ہر غنچہ و گل میں جلوہ گر کیا ہے۔ فی الواقع بقول میاں جرأت کے ؎

اسے دیکھو تو ہے ہر رنگ میں وہ
عیاں گل میں نہاں ہے سنگ میں وہ
وہ ہے ہر رنگ میں اور پھر جُدا ہے
خدا ہے وہ، خدا ہے وہ، خدا ہے

نثر کا چوتھا دور

سنہ ۱۸۳۱ء / ۱۲۴۶ھ تا سنہ ۱۸۷۰ء / ۱۲۸۶ھ

اس سے پہلے اُن مصنفوں کا تذکرہ کیا گیا جو مصنفین فورٹ ولیم کالج کے ساتھ لیکن کالج سے باہر ہندوستان میں اردو نثر کی تصنیف و تالیف کر رہے تھے۔ یہ چوتھا دور ان کے بعد کے مصنفوں کا ہے جن کا زمانۂ تصنیف غدر (۱۸۵۷ء) سے پہلے یا کچھ بعد ہے۔ یہ تیسرے اور چوتھے دور کی علیحدگی کسی خاص ادبی ولسانی تغیر کے اصول پر نہیں ہے۔ اس اعتبار سے انیسویں صدی کا نصف اول بلکہ دو ثلث تقریباً یکساں ہیں۔ زبان و انشا کی بے قاعدگی و باقاعدگی دونوں ساتھ ساتھ جاری رہی ہیں۔ ۱۸۳۱ء سے ۱۸۷۰ء تک، میر امّن سے معاصرین غالب تک بے اصول و با اصول دونوں طرح کے لکھنے والے رہے ہیں۔ ہم نے فورٹ ولیم کالج کی اہمیت کو پیش نظر رکھ کر اس کو الگ دور میں رکھا ہے۔ اور یہ ثابت کرنے کے لئے کہ اسی زمانے میں اور لوگ بھی اسی شاہراہ پر گامزن تھے۔ بیرون کالج والوں کو اسی دور میں لکھ دیا ہے، یہ چوتھا دور اسی کے سلسلے میں بعد کے لوگوں کا ہے۔

سدا سکھ لال | ۱۸۳۲ء میں اردو عدالتی و سرکاری زبان مقرر کی گئی، لیکن اس سے پہلے اہل ہند کی آسانی کیلئے دیوانی و

فوجداری و مال گذاری کے قوانین کا اردو میں ترجمہ شروع ہو گیا تھا چنانچہ ۱۸۰۳ء ۱۲۱۸ھ میں گورنمنٹ مغربی و شمالی (جس میں موجودہ یوپی شامل تھی) کی طرف سے "ہدایت نامہ مال گزاری" اردو میں مرتب ہوا۔ یہ قانون کی سب سے پہلی کتابوں میں ہے جو اردو میں لکھی گئیں۔ اس کے بعد بھی سلسلہ جاری رہا۔ ۱۸۳۴ء ۱۲۴۹ھ میں منشی سدا سکھ لال نے مجموعہ قوانین (ایکٹ ہائے سپریم گورنمنٹ) مرتب کیا، جس میں ۱۷۹۳ء سے ۱۸۳۴ء تک جملہ ایکٹ ہائے مروجہ ممالک مغربی و شمالی تھے۔ اس کی پہلی جلد ۱۸۶۴ء میں مطبع نور الابصار آگرہ میں چھپی تھی۔ بعد کی تین جلدیں بھی اسی مطبع میں ۱۸۶۶ء میں چھپیں۔ اس کے دیباچہ کی چند سطریں یہ ہیں:-

> فائدے اس تالیف کے ایسے نہیں ہیں کہ احتیاج ان کے بیان کی ہو۔ فی الواقع یہ جلدیں آئینہ تمامے انتظام جملہ سر رشتہ ہائے سلطنت عظیم الشان سرکار دولت مدار انگلشیہ کی ہیں۔ ان کے دیکھنے سے بآسانی معلوم ہو سکتا ہے کہ ہر باب میں کتنے قوانین مجاریہ وقت ہیں، اور کتنے منسوخ ہو گئے۔ واضح ہو کہ مصنف نے ترجمہ اردو میں کہ وہ مسلمۂ گورنمنٹ اور مندرجہ گزٹ سرکاری تھا، کچھ تصرف نہیں کیا ہے"۔

اس کے علاوہ سدا سکھ لال نے "فن زراعت" کے متعلق ایک کتاب انگریزی سے اردو میں ترجمہ کی اور اس کا نام گنگا کی نہر رکھا۔ یہ ۴۴ صفحہ کا مختصر رسالہ ہے، ۱۸۵۴ء میں آگرہ میں طبع ہوا۔

تراجم علوم و فنون:- اس موقع پر یہ ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ فورٹ ولیم کالج کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی ہی کی حکومت میں یعنی غدر ۱۸۵۷ء سے پہلے اردو میں ہر قسم کے علوم و فنون کی کتابیں ترجمہ و تالیف ہو گئی تھیں، اور ان میں سے اکثر طبع ہو گئی

تھیں۔ تاریخ و جغرافیہ، مذہب، سائنس، نجوم و ہیئت، معاشیات (اکنامکس) منطق طبعیات (فزکس) فن زراعت، تعلیمات، درسیات وغیرہ موضوعات و مضامین کی کتابیں لکھی گئیں۔ ان میں سے چند کتابیں بعض پرائیویٹ کتب خانوں میں دستیاب ہوتی ہیں، کلکتہ وغیرہ کی بڑی یا سرکاری لائبریریوں میں اور ریاستوں یا امیروں کے کتب خانوں میں موجود ہوں گی لیکن لندن کے انڈیا آفس کی لائبریری میں سب کی سب موجود ہیں، جن میں مطبوعات بھی ہیں اور قلمی بھی ان کی تصنیف و تالیف میں ہندو اہل قلم برابر کے شریک ہیں۔ چند مطبوعہ کتابوں کے نام درج کیے جاتے ہیں۔

۱۔ کھیت کرم ۲ حصہ مصنفہ کالی رائے، مطبوعہ دہلی ۱۸۴۶ء (فن زراعت)

۲۔ اصول علم انتظام مدن مترجمہ دھرم نرائن، مطبوعہ دہلی ۱۸۴۶ء (معاشیات)

۳۔ اصول علم طبعی، مترجمہ اجودھیا پرشاد و شیوا پرشاد، مطبوعہ دہلی ۱۸۴۸ء (طبعیات)

۴۔ عجائب روزگار مصنفہ ماسٹر رام چندر، مطبوعہ دہلی ۱۸۴۷ء (طبعیات)

۵۔ مرآۃ العلوم مصنفہ ہری درسن لال، مطبوعہ بنارس ۱۸۴۹ء (طبعیات)

۶۔ اصول قواعد مائیات مترجمہ اجودھیا پرشاد، مطبوعہ دہلی ۱۸۵۰ء (طبعیات)

۷۔ قانون الطباع (چھاپہ کا فن)، مصنفہ سیتل پرشاد، مطبوعہ دہلی ۱۸۴۸ء (سائنس)

۸۔ اصول علم ہیئت مصنفہ ماسٹر رام چندر، مطبوعہ دہلی ۱۸۴۵ء (نجوم و ہیئت)

۹۔ مختصر دقائق النجوم مؤلفہ گمٹالے، مطبوعہ مدراس ۱۸۴۸ء (نجوم و ہیئت)

۱۰۔ خلاصہ نظام آسمانی مرتبہ پنڈت واسی دھیرا، مطبوعہ آگرہ ۱۸۵۲ء (نجوم و ہیئت)

۱۱ جغرافیہ ہند، مترجمہ پنڈت سواروپ نرائن و شیوا روپ نرائن، مطبوعہ دہلی

۱۸۴۹ء (جغرافیہ)

۱۲۔ فتح گڑھ نامہ (جغرافیہ ضلع فتح گڑھ) مرتبہ کالی رائے، مطبوعہ دہلی ۱۸۴۹ء (جغرافیہ)

۱۳۔ پند نامہ کاشتکاری مصنفہ موتی لال، مطبوعہ آگرہ ۱۸۵۲ء (زراعت)

۱۴۔ ریشم کا کیڑا مرتبہ موتی لال، مطبوعہ لاہور ۱۸۵۳ء (صنعت و حرفت)

۱۵۔ بخار کی کل (اسٹیم انجن) مولفہ ایشوری لال، مطبوعہ بنارس ۱۸۵۵ء (سائنس)

۱۶۔ ہوا کا بیان مرتبہ بدری لال، مطبوعہ بنارس ۱۸۵۴ء (علم طبعیات)

۱۷۔ معدنیات مولفہ جواہر لال، مطبوعہ آگرہ ۱۸۵۵ء۔ (طبعیات)

۱۸۔ خلاصتہ الصنائع مترجمہ بھولا ناتھ، مطبوعہ آگرہ ۱۸۵۴ء۔ (سائنس)

۱۹۔ تحصیل فی جرالثقیل مصنفہ سید احمد خاں (سر سید) مطبوعہ آگرہ ۱۸۴۴ء (طبعیات)

۲۰۔ ترجمہ معاشیات مل مترجمہ وزیر علی، مطبوعہ دہلی ۱۸۴۴ء (معاشیات)

۲۱۔ ترجمہ شمسیہ مترجمہ سید محمد، مطبوعہ دہلی ۱۸۴۴ء۔ (منطق)

۲۲۔ مقاصد العلوم مترجمہ سید محمد میر، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۴۱ء۔ (طبعیات)

۲۳۔ علم حکمت (میکانکس) مولفہ چارس ننک، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۴۳ء (سائنس)

۲۴۔ بحر الحکمتہ (اسٹیم انجن) مرتبہ ریورنڈ پارکن، مطبوعہ لکھنؤ ۱۸۴۷ء (سائنس)

۲۵۔ توصیف زراعت مرتبہ کلب حسین، مطبوعہ آگرہ ۱۸۴۶ء (زراعت)

۲۶۔ علم جغرافیہ مترجمہ میر غلام علی، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۵۱ء۔ (جغرافیہ)

۲۷۔ رسالہ مقناطیس مترجمہ سید کمال الدین۔ مطبوعہ دہلی ۱۸۵۰ء (طبعیات)

۲۸۔ بجلی کی ڈاک مولفہ جے، ڈبلیو، بیل، مطبوعہ آگرہ ۱۸۵۴ء۔ طبعیات)

۲۹۔ اصول جر ثقیل مرتبہ محمد احسن، مطبوعہ بنارس ۱۸۵۴ء۔ (طبعیات)

۳۰۔ چاہے لگانے کی کتاب، مطبوعہ لاہور ۱۸۵۴ء (زراعت)

فقیر محمد خاں گویا لکھنؤ کے رئیس تھے، شاہان اودھ کے زمانے میں فوج کے رسالدار رہے۔ نواب حسام الدولہ خطاب تھا گویا تخلص ہے۔ ناسخ اور وزیر دونوں سے مشورۂ سخن کیا ہے۔ صاحب دیوان ہیں مطبع نولکشور میں دیوان طبع ہو گیا ہے۔ ۱۲۶۶ھ ۱۸۵۰ء میں انتقال کیا۔ گویا کی صرف ایک تصنیف ہے۔ ۱۲۵۱ھ ۱۸۳۵ء میں "انوار سہیلی" کا ترجمہ بستان حکمت کے نام سے کیا۔ انوار سہیلی کے اردو ترجمے گویا سے پہلے اور بعد کو اور لوگوں نے بھی کیے جن میں سے بعض کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ فورٹ ولیم کالج کے منشی حفیظ الدین نے خرد افروز کے نام سے ترجمہ کیا تھا اس کے بعد ۱۸۲۴ء میں محمد ابراہیم بیجاپوری نے ترجمہ کیا۔ لیکن ان سب سے فقیر محمد گویا کا ترجمہ بہتر ہے۔ سرور کی طرح قافیہ پیمائی نہیں ہے، لیکن الفاظ و فقرات کی ترتیب میں قدامت کا اثر ہے جس سے خواہ مخواہ ترجمہ معلوم ہوتا ہے۔ تاہم یہ تنہا گویا کا قصور نہیں ہے۔ الفاظ کی صحیح و باقاعدہ ترتیب اس زمانے میں کیا، بہت بعد تک پیدا نہ ہوئی تھی۔ ہر مصنف کی تحریر میں بلا استثنا یہی بات ہے۔ سرسید احمد خاں کی تحریریں تو بے قاعدگی بہت کثرت سے ہے۔ خود غالب کی سہل ممتنع زبان بھی اس سے خالی نہیں۔ اگرچہ کم ہے۔ نذیر احمد و حالی کے دور سے یہ عیب بالکل جاتا رہا۔ فقیر محمد خاں گویا نے اپنے ترجمہ میں اصل کتاب انوار سہیلی کی عربی و فارسی الفاظ و تراکیب جابجا قائم رکھی ہیں۔ اس لئے زبان بالکل آسان نہیں رہی۔ پھر بھی نہایت خوشنما دلچسپ اور پر معنی ہے۔ گویا نے دیباچہ میں جو اپنی عبارت لکھی ہے اس کا بھی یہی رنگ ہے۔ سبب تالیف بیان کرتے ہیں:۔

"اب سنا چاہئے کہ ایک روز بندہ اور خواجہ وزیر اور میاں فرخ شاکر کہ یہ دونوں شاگرد رشید شیخ ناسخ صاحب کے ہیں، اور چند احباب اور بھی باہم بیٹھے ہوئے تھے اور وقت شغل انوار سہیلی کے مطالعے کا تھا، اور اس کے مصنف کی فکر رسا پر سب نے زبان ثنا کھولی تھی کہ سبحان اللہ مصنف اسکا عجیب حکیم بے مثل تھا اور عجب کتاب تصنیف کی ہے کہ گنجینہ ہے اسرار الٰہی کا اور خزینہ ہے فیض غیر متناہی کا، بلکہ قرینہ اس پر دال ہے کہ جو کچھ اس نے بیان کیا ہے مظنہ ہے کہ کہ بامداد الہام غیبی ہو، والّا ورنہ انسان ضعیف البنیان کب کنہ کو اس قدر جزئیات عالم کے پہونچ سکتی ہے ...."

غرض ان خواجہ تاشوں کی فرمائش سے گویا نے یہ کتاب مرتب کی۔ ترجمہ کے متعلق کہتے ہیں :- "برائے نام ترجمہ کیا جاتا ہے۔ ورنہ یہ کتاب حقیقت میں جدا ہے، لیکن حق یوں ہے کہ یہ احسان نقاش اوّل کا ہے۔ ورنہ مجھ سے بے مایہ کو کہاں طاقت اس کے بیان کی تھی"۔

بستان حکمت کا مختصر نمونہ یہ ہے :-

بادشاہ نے حکم دیا کہ دمنہ کو دار القضا میں سپرد کر دو تا قاضی اسکا حال دریافت کرے کہ احکام سیاست میں جب تک شرائط شرعی تمام نہوں گے کچھ حکم نہ کیا جائے گا۔ دمنہ نے کہا کہ کون حاکم راست کار بادشاہ سے زیادہ ہے اور کون قاضی؛ عادل شہریار سے بالا تر ہے۔ الحمد اللہ کہ ضمیر منیر بادشاہ آئینہ ہے باصفا، بلکہ جام ہے جہاں نما، کہ صورت حال ہر ملازم و رعایا کی اس میں ہویدا ہے۔ رباعی سودا

ایوان عدالت میں تمہاری اے شاہ	ہے ظلم کو کیا دخل؛ عیاذاً باللہ
شیشے کا اگر طاق سے ٹوٹے ہی پاؤں	پتھر سے نکلتی ہے صدا بسم اللہ

اور یہ یقین اتنا جانتا ہوں کہ کشفِ شبہات اور رفع حجاب میں کوئی چیز برابر

فراست پادشاہ جم جاہ کے نہیں ہے۔ اگر خود شہریار بنفس نفیس، رائے جہاں آرا

کو متاعی میرے حال کا فرمائے تو کذب اور صدق میرا مانند صبح صادق کے

روشن ہو جائے، جیسا کہ حافظ نے فرمایا۔ بیت

عرض حاجت در حریم حضرتت محتاج نیست   رازِ کس مخفی نماند بر فروغ رائے تو

شیر نے کہا کہ اے دمنہ اندیشہ نہ کر کہ اس مہم میں جستجوے تمام کی جائے گی، اور

تحقیق اس کام کی اس طرح پر کہ زیادتی اس سے متصوّر نہو، عمل میں آئے گی۔ نظم

جدا کریں گے ہم اس طرح حق و باطل کو   کہ جیسے دودھ سے مکھّی نکال لیتے ہیں

نکال لیتے ہیں جس طرح عطر پھولوں سے   ہر ایک بات کا ہم جی نکال لیتے ہیں

نیم چند کھتّری

اُس زمانے میں ہنود اہل ذوق دار باب علم اردو شعر و سخن اور علم و ادب کی تحصیل، ترویج اور تکمیل میں نہایت مستعدی سے کوشش کر رہے تھے، جیسا کہ پہلی فہرستوں اور نمونوں سے دریافت ہوا۔ منشی نیم چند کھتّری بھی ایسے ہی ادیبوں میں ہیں۔ فارسی سے "قصہ گل با صنوبر" ۱۲۵۲ھ / ۱۸۳۷ء میں ترجمہ کیا۔ اور شائع و مقبول ہوا۔ اس کا نمونہ مولانا احسن مارہروی کی تالیف "نمونۂ منثورات" سے نقل کیا جاتا ہے۔ قصّہ کے ٹائٹل پیج کی عبارت یہ ہے:۔

زبان فارسی سے زبان اردو میں ترجمہ کیا ہوا نیم چند کھتّری کا نام سے بابو گور

چرن کے نواب مستطاب لارڈ جارج آکلنڈ صاحب بہادر دام اقبالہٗ کے

عہد میں، داتا رام برہمن کی تصحیح سے چھاپا گیا۔

تحریر کا مختصر نمونہ یہ ہے:۔

"بعد ازاں فقیر حقیر بضائے الٰہی پر خرسند نیم چند، یوں لکھتا ہے کہ اس عالم ناپائدار میں کسی چیز کو قرار نہیں، اور نیستی پر سب کا مدار ہے۔ اسکی ذات لازوال کے واسطے بقا، اور باقی سب کو فنا ہے، مگر ایک گلستان سخن کہ خزانِ جہاں سکے گلوں پر نہیں آتی، چوروں کی چوری، اور رہزنوں کی سرزوری سے یہ دولت کہیں نہیں جاتی، چمن اس کا ہمیشہ تازہ و خرم رہتا ہے۔ اور اس کی نہروں میں زلال زندگی بہتا ہے۔ اس کے مکان کی نیو کو حادثے کے بھونچال کا کچھ خطرہ نہیں ہوتا۔"

نواب قطب الدین خاں دہلوی

ان کے والد کا نام محمد محی الدین احراری ہے دہلی کے بہت بڑے عالم و محدث تھے۔ امارت و ثروت بھی رکھتے تھے۔ مولانا حاجی محمد اسحاق دہلوی (مولانا شاہ عبد العزیزؒ دہلویؒ کے نواسے) کے شاگرد رشید تھے۔ ۱۸۷۲ء ۱۲۸۹ھ میں انتقال کیا۔

سر سید احمد خاں نے "آثار الصنادید" کے باب چہارم میں مولانا نواب قطب الدین خاں کا مختصر حال لکھا ہے۔ اس میں سے کچھ اقتباس یہ ہے۔

آپ کے اجداد والا تبار عالی خاندان والا دودمان تھے، ہمیشہ پیش گاہ سلطنت سے مناصب جلیلہ رکھتے تھے۔ اب اس جزو زماں میں بھی آپ کو تقرب حضرت سلطانی سے وہ عزت و جاہ حاصل ہے جو چاہیئے جو تھے دن اپنے استاد کی پیروی اور خلق کی رہنمائی کے لئے مجلس وعظ منعقد فرماتے ہیں۔ اکثر مسائل زبان ریختہ میں واسطے فوائد عوام کے تحریر کئے اور اس میں مسائل ضروریہ ہر طرح کے مندرج فرمائے۔ اور حق یہ ہے کہ

ان رسالوں سے خلق کو بہت فائدہ ہوا کہ ضروریات دین سے ہر شخص مطلع اور آگاہ ہو گیا۔"

ان کی تصانیف میں سے دو کا ذکر کیا جاتا ہے۔

(۱) ظفر جلیل اردو ترجمہ "حصن حصین" (مصنفہ قاضی القضاۃ شمس الدین محمد دمشقی متوفی ۸۳۳ھ/۱۴۳۰ء) مولوی قطب الدین نے تاریخی نام رکھا ہے۔ اس سے سال تالیف ۱۲۵۳ھ (مطابق ۱۸۳۷ء) نکلتا ہے۔ اس کا نمونہ یہ ہے

"حمد بے شمار ہے اس پاک پروردگار کے لئے کہ ہم کو توفیق دی اپنے ذکر کی اور راہ بتائی اپنی فکر کی، یا الٰہی درود و سلام بے حد نازل کر خاتم النبیین...

شفیع المذنبین رسول امین پر، اور ان کے اصحاب ابرار اور آل اطہار پر اور سب پر"

(۲) مظاہر حق اردو ترجمہ و شرح "مشکوٰۃ المصابیح" اس ترجمہ کا نام بھی تاریخی ہے، اس سے ۱۲۵۴ھ (مطابق ۱۸۳۸ء) نکلتے ہیں۔ یہ مولانا قطب الدین کا نہایت عظیم الشان کارنامہ ہے۔ یعنی چار جلدوں میں بہت بڑی تقطیع کے دو ہزار صفحوں سے زیادہ پر طبع ہوا ہے۔ اردو زبان میں یہ سب سے پہلی جامع و مکمل حدیث شریف ہے۔ اس کا حال خود قطب الدین صاحب نے دیباچہ میں لکھا ہے۔

بعد اس کے مسکین محمد قطب الدین شاہجہان آبادی عرض کرتا ہے کہ کتاب مشکوٰۃ شریف علم حدیث میں عجب نافع کتاب ہے کہ ہر مضمون کی حدیثیں اس میں مندرج ہیں، اس کا ترجمہ عدیم النظیر میرے استاد بزرگوار مولانا مخدومنا مکرمنا حضرت حاجی محمد اسحاق نواسہ حضرت شیخ عبدالعزیز رحمہما اللہ تعالیٰ کے نے بیچ زبان ہندی کے بین السطور میں لکھا تھا۔ لیکن کاتبوں سے اس کی

صحت میں فرق آنے لگا، مرضی جناب موصوف کی ایسی پائی کہ اگر یہ بطور شرح کے لکھا جاوے بہتر ہے اسلئے کہ اس ہیچمدان نے ترجمہ اس کا عبارت عربی سے علیحدہ کر کے لکھا، اور فائدے مختصر مناسب مقام کے، شروح مشکوٰۃ وغیرہ سے مثل مرقاۃ شرح ملا علی قاری اور ترجمہ حضرت شیخ عبدالحق اور حاشیہ سید جمال الدین رحمہم اللہ کے، اور سوائے ان کے سے زیادہ کر کے خدمت عالی میں عرض کی، اور جناب ممدوح نے بھی کہ کچھ فائدے لکھے تھے، تبرکاً اس میں درج کئے اور نام اس کا مظاہر حق رکھا گیا کہ اس میں تاریخ اس کی نکلتی ہے

مولانا قطب الدین کے استاد بزرگوار کا ترجمہ اس سے بھی پہلے کا ہے لیکن اب نایاب ہے۔ مولانا نے مظاہر حق کے فائدوں میں ہر جگہ اُن شروح تراجم و حواشی کا حوالہ دیدیا ہے جن سے استفادہ کیا ہے۔

مظاہر حق میں احادیث کا ترجمہ تو ہر مقام پر ایک ہی اسلوب قدیم کا ہے لیکن فائدے کہیں بالکل پرانی روش بے قاعدہ کے ساتھ ہیں، کہیں ترتیب الفاظ زیادہ صاف و باقاعدہ ہے۔ ترجمہ و فائدہ کا نمونہ عربی کی حدیث کو چھوڑ کر درج کیا جاتا ہے:-

اور روایت ہے واثلہ بن اسقع سے کہا فرمایا رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے جس شخص نے کہ طلب کیا علم، اور حاصل ہوا اس کو، ہوگا واسطے اس کے دوہرا ثواب اور اگر نہ حاصل ہوا اس کو علم، تو ہوگا واسطے اسکے ایک حصہ ثواب سے، روایت کی یہ دارمی نے۔ ف دوہرا ثواب، ایک ثواب طلب کا اور مشقت کا کہ تحصیل علم میں کھینچی ہے، دوسرا ثواب حاصل ہونے علم کا اور پڑھانے کا اوروں کو، یا ثواب عمل کا کہ علم پر کیا ہے۔ اور دوسرے کو ایک ثواب مشقت ہی کا ہوگا۔ بہر تقدیر طلب علم میں رہنا چاہئے اگر حاصل ہوا

نورٌ علیٰ نور، ورنہ طلب علم میں مرنا بھی سعادت ہے۔ بیت

اگرچہ نتواں بدوست رہ بردن   شرطِ یاری ست در طلب مُردن

مفتی صدرالدین آزردہ

والد کا نام مولوی لطف اللہ کشمیری، مفتی صاحب دہلی میں ۱۲۰۴ھ / ۱۷۹۸ء میں پیدا ہوئے۔ مولانا شاہ عبدالعزیز، مولانا شاہ عبدالقادر، مولانا محمد اسحاق مولانا فضل حق خیرآبادی جیسے مشاہیر علماء سے علوم عقلیہ و نقلیہ کی تحصیل کی۔ غدر سے پہلے انگریزی حکومت کی طرف سے دہلی میں صدرالصدور اور مفتی تھے۔ غدر ۱۸۵۷ء میں ان پر جہاد کے فتوے کا الزام لگایا گیا، گرفتاری اور جائداد کی ضبطی عمل میں آئی۔ لیکن چند روز بعد رہا کر دئے گئے، اور جائداد کا بھی ایک حصہ واپس دیدیا گیا۔ تعلیم و تدریس کا اس قدر شوق تھا کہ "صدرالصدور" ہونے کی حالت میں بھی طالب علموں کو پڑھایا کرتے تھے۔ مفتی صاحب کے شاگردوں میں نواب یوسف علی خاں والی ریاست رام پور، سرسید احمد خاں، نواب صدیق حسن خاں بھوپالی بھی شامل ہیں۔ عربی، فارسی کی چند تالیفات اور فتاویٰ ان کی یادگار ہیں۔ شاعری کا بھی ذوق تھا۔ عربی، فارسی، اردو تینوں زبانوں میں شعر کہتے تھے آزردہ تخلص تھا۔ اردو میں شاہ نصیر، میر ممنون اور میاں مجرم اکبرآبادی سے مشورہ کیا ہے۔ اردو کے شاعروں کا ایک تذکرہ فارسی میں مرتب کیا تھا، لیکن اب نایاب ہے۔ ۱۲۸۵ھ / ۱۸۶۸ء میں انتقال کیا۔ مرزا غالب، نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ امام بخش صہبائی سے مفتی صاحب کے خاص تعلقات تھے۔ اور ان صاحبوں سے اردو میں خط و کتابت رکھتے تھے۔ اردو کی یہی تحریریں مفتی صاحب کی یادگار ہیں ایک خط کی چند سطریں نمونہ و تبرک کے طور پر درج کی جاتی ہیں جو کہ ٹوپی میں اردو۔۔

سے ماخوذ ہیں :۔

نامۂ آزردہ بنام نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ

"شکر ہے اس پروردگار عالم کا جس نے مجھ کو ایسی دلدل سے کہ بہ تن اس میں غرقاب تھا، نکالا، کیسے علائق میں جکڑ بند تھا کہ نکلنا اس سے سوائے ایسی صورت کے جو پیش آئی ممکن نہ تھا۔ مقدمات اصلی کا فیصل کرنا، منصفوں اور صدر امینوں کے مقدمات کا مرافعہ سننا، رجسٹری کے وثائق پر دستخط کرنا، مقدمات دورہ میں فتویٰ دینا۔ کیٹیوں میں حاضر ہونا، طلبۂ مدرسۂ سرکاری کا امتحان ماہواری لینا، احکام اخیر کو اپنے ہاتھ سے لکھنا، ہزار ہا غذوں پر دستخط کرنا، پھر گھر میں آکر طالب علموں کو پڑھانا، اور اطراف و جوانب کے سوالات شرعی کا جواب لکھنا، وہابیوں اور بدعتیوں کے جھگڑے میں حکم ہونا، مجالس شادی و غمی اور اعراس میں جانا، شعر و شاعری کی صحبت کو گرم رکھنا باغات کی سیر کو اور خواجہ صاحب کی زیارت کو اکثر جانا......"

مفتی سعد اللہ رامپوری

خلف رشید مولوی محمد نظام الدین مراد آبادی اصلی وطن مراد آباد ہے۔ وہیں ۱۲۱۹ھ/۱۸۰۴ء میں پیدا ہوئے۔ علمائے عصر سے تحصیل علوم کی جن میں مفتی صدر الدین آزردہ بھی ہیں۔ دہلی میں تعلیم حاصل کر کے لکھنؤ گئے، وہاں تکمیل کر کے مدرسہ شاہی میں مدرس رہے۔ الحاق اودھ (۱۲۷۲ھ/۱۸۵۶ء) تک وہیں رہے۔ اس کے بعد رامپور چلے گئے۔ نواب رامپور یوسف علی خاں ناظم اور منشی امیر احمد مینائی بھی ان کے شاگرد ہیں ۱۲۹۴ھ/۱۸۷۷ء میں انتقال کیا۔ امیر مینائی اپنی تصنیف "انتخاب یادگار" میں مفتی سعد اللہ کے حالات میں لکھتے ہیں :۔ "جامعیت فضل و کمال میں مشہور آفاق، علم معقول و منقول میں طاق طبیعت

ہمہ گیر نکتہ وقاد، ہندوستان میں ہزاروں کے اُستاد، مولوی صاحب کی بہت سی تصنیفات ہیں، مُطول و مختصر اٹھائیس تالیفات ہیں، ان کتابوں میں بعض ناتمام ہیں کچھ چھپ بھی گئی ہیں۔ مولوی صاحب برسوں دہلی اور لکھنؤ میں رہے۔ ایک مدت سے اس دارالریاست (رام پور) میں مکان بنوالیا ہے، اہل و عیال سب یہیں ہیں اب یہی مسکن ہے، مرادآباد سے کچھ علاقہ نہیں رہا ہی وطن ہے۔ سرکار فیض آثار نواب کلب علی خاں (والیٔ رامپور) کی قدردانی سے باعزاز و اکرام منصب حکومت مرافعہ عدالتین پر مامور ہیں، نظم و نثر عربی میں بھی دور دور مشہور ہیں کبھی کبھی شعر فارسی کی طرف بھی توجہ فرماتے ہیں۔" مفتی سعد اللہ آشفتہ تخلص کرتے تھے۔

مفتی سعد اللہ صاحب نے بعض عربی کتابوں کا اُردو میں ترجمہ کیا ہے۔ حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے رسالہ فقہ اکبر کا اردو ترجمہ ۱۸۴۰ء/۱۲۵۵ھ میں کیا اس کا نمونہ یہ ہے۔

"یہ کتاب ہے اصل توحید اور اعتقاد صحیح کے بیان میں، واجب ہے ہر مسلمان پر کہ کہے صدق دل سے، یقین لایا میں اللہ پر اور اس کے سب فرشتوں اور کتابوں اور رسولوں پر اور قیامت کے دن پر، اور جلا اُٹھانے پر پیچھے مرنے کے اور خیر و شر کی تقدیر پر کہ اللہ تعالیٰ کی بنائی ہے، اور حساب ہونا اور تُلنا اعمال کا قیامت میں، اور بہشت اور دوزخ سب حق ہے اور اللہ تعالیٰ ایک ہے، عدد سے نہیں، پر اس راہ سے کہ اس کا کوئی ساجھی نہیں۔"

عباس بن ناصر علی المورخ

اٹھارویں صدی میں زمانۂ زیر تحریر (انیسویں صدی کے درمیان) تک مذہبی کتابیں فقہ اسلام، عقائد اسلام وغیرہ ضروریات اسلامی کے متعلق کثرت سے لکھی گئیں، جیسا کہ مختصر فہرست مندرجہ صفحہ ۱۶۳/۱۶۴ سے معلوم ہوا ہوگا۔ مولوی عباس نے بھی عام مسلمانوں

کے فائدے کے لیے ایک رسالہ صبح کا ستارہ لکھا۔ اس کے متعلق خود مصنف آغاز کتاب میں لکھتے ہیں:۔

بعد ازاں عباس بن ناصر علی المورخ بن فضل اللہ العلامہ الجاجموی غفر اللہ لہم کہتا ہے۔ کہ سنہ بارہ سو انچاس میں جب میرے بھائی قاسم علی نے کہ نہایت سخی و شجاع و مجاہد تھا اور میری والدہ نے انتقال کیا، میں نے کتاب دقائق الاخبار کو کہ حجۃ الاسلام ابو حامد محمد بن محمد الغزالی رحمۃ اللہ علیہ نے موت کے احوال میں تصنیف کی تھی، مغلق عربی سے سلیس اُردو میں ترجمہ کیا، تا فائدہ اس کا عام ہو جائے، اور ثواب اس کا میں نے ان دونوں کی روح کو بخشا۔۔۔۔ اور اصل کتاب میں میں نے کچھ کمی و بیشی نہیں کی، مگر بعض جگہوں میں بضرورت یا بقصد اختصار او ر نام اس ترجمے کا صبح کا ستارہ ہے۔

مترجم جاجمو (آگرہ) کے رہنے والے تھے۔ یہ رسالہ ۱۸۳۲ء (۱۲۴۹ھ) میں مرتب ہوا، اور ۱۰ شوال ۱۲۶۹ھ (۱۸۵۲ء) کو مطبع مصطفائی شہر کانپور محلہ پٹکاپور میں چھاپا گیا۔ اس میں موت اور بعدِ موت کا حال لکھا ہے۔ ہر بیان کو آیات و احادیث و اقوالِ علماء و اولیاء سے مدلل کیا ہے۔ ترجمہ دقائق الاخبار کے بعد مترجم نے اپنی طرف سے چند اختلافی مسائل پر روشنی ڈالی ہے۔ ایک مسئلہ بطور نمونہ درج کیا جاتا ہے۔

مسئلہ، حق تعالیٰ سے اس طرح دعا مانگنا کہ الٰہی بحرمت نبی یا ولی کے میری حاجت روا کر، روا ہے، ملا علی قاریؒ نے قواعد الایمان میں لکھا ہے کہ اگر بحرمت مصطفےٰؐ گوید شاید چہ دعائے استفتاح الشہر الحرام والمشعر الحرام وقبلہ نبیک علیہ السلام ماثور و مروی ست" اور حصن حصین میں صحیح بخاری وغیرہ سے منقول ہے کہ دعا میں توسل بانبیاء و صلحاء جائز و مستحب ہے۔ اور فتاوی

سراجیہ میں ہے کہ "دعا میں بحق فلاں کہنا ابوالفضل کرمانی نے مکروہ لکھا ہے۔ اس واسطے کہ حق تعالیٰ پر کسی مخلوق کا حق نہیں۔ ولیکن روایات و آثار سے اس کا جواز معلوم ہوتا ہے۔" انتہیٰ راقم عفا اللہ عنہ کہتا ہے کہ اگلے زمانہ میں معتزلہ کا بہت غلبہ تھا۔ اس واسطے کرمانی وغیرہ نے بحق کہنا مکروہ لکھا ہے۔ تا بخوبی ثابت ہو کہ اللہ تعالیٰ پر کچھ واجب نہیں، اور کسی کا حق نہیں، وہ مالک مختار ہے، جو چاہے کرے، پس منع کرنا اس لفظ کا احتیاطاً تھا۔ والا اس کے جواز میں شبہ نہیں قَالَ اللہُ تَعَالیٰ وَکَانَ حَقّاً عَلَیْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِیْنَ۔ اور شیخ عبدالحق دہلوی نے جذب القلوب الی دیار المحبوب میں لکھا ہے کہ جب حضرت علیؓ کی ماں نے وفات پائی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اللّٰھم اغفر لھا بحقی وبحق جمیع الانبیاء من قبلی

امام بخش صہبائیؔ دہلی کے رہنے والے، فارسی کے بڑے عالم و محقق تھے، فارسی کی بعض نہایت ادق کتب درسیہ "سہ نثر ظہوری" وغیرہ کی شرحیں بڑی تحقیق کے ساتھ فارسی میں لکھی ہیں۔ غدر سے پہلے دہلی کالج[1] میں پروفیسر تھے۔ جہاں مولوی محمد حسین آزاد، ماسٹر پیارے لال آشوبؔ وغیرہ ان کے شاگرد تھے۔ سر سید احمد خاں سے صہبائی کے خاص تعلقات تھے۔ انھوں نے آثار الصنادید کی تیاری میں سر سید کو بڑی مدد دی تھی۔ اس کتاب

---

[1] دہلی میں انگریزوں نے ہندوستانیوں کو مغربی علوم سکھانے کے لیے ایک اسکول کھولا تھا۔ پھر اس کو ترقی دے کر کالج کر دیا گیا۔ دہلی کالج اور قدیم دہلی کالج کے نام سے مشہور ہے ۱۸۲۷ء سے اس میں انگریزی زبان کی تعلیم بھی جاری کر دی گئی۔ یہ عجیب بات تھی کہ (باقی اگلے صفحہ پر)

کا پہلا اڈیشن جو ۱۸۴۷ء میں شایع ہوا اس میں عمارتوں کے حالات صہبائی نے لکھے تھے۔ اسی لیے عبارت میں پُرانا پن زیادہ تھا اور سرسید کے اسلوب تحریر کے خلاف

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ

ہندوستانیوں کو انگریزوں کی زبان سے تو وحشت و نفرت تھی لیکن انگریزوں کے علوم و فنون سیکھنے کا بیحد شوق تھا۔ پھر بھی چار سال میں یعنی ۱۸۳۱ء میں انگریزی زبان پڑھنے والوں کی تعداد کالج میں تین سو سے کم نہ تھی۔ یہ کالج دہلی میں کشمیری دروازے کے قریب تھا۔ ریاضی سائنس وغیرہ علوم کی تعلیم لکچروں کے ذریعہ سے ہوتی تھی۔ اس لیے کہ انگریزی کتابیں آسانی سے میسر نہ آسکتی تھیں، اور علوم و فنون کے ترجمے اردو میں ہوئے نہ تھے۔ طالب علموں سے کوئی فیس نہ لی جاتی تھی۔ بلکہ وظیفے بھی دے دے کر شوق دلایا جاتا تھا۔ علوم کیمیا و طبیعیات کے اسباق و تجربات آلات کے ذریعہ سے سکھائے جاتے تھے۔ سائنس کے تجربے اور مشاہدے ہندوستانیوں کے لیے عجیب حیرت و مسرت کا باعث ہوتے تھے۔ اس کالج کا پرنسپل انگریز ہوتا تھا۔ پروفیسر انگریز اور ہندوستانی دونوں قسم کے تھے۔ مثلاً ماسٹر رام چندر، ماسٹر رام کشن، مولوی کریم الدین پانی پتی۔ مولوی امام بخش صہبائی۔ صہبائی کے زمانے میں ایک فرانسیسی ایم فیلکس بوترو پرنسپل تھا (اس کا نام صہبائی نے اپنے ترجمہ حدائق البلاغت میں بوترس لکھا ہے۔ لیکن فرنچ کے قاعدے سے تس کا تلفظ نہ ہوگا واد پڑھا جائے گا) اس فرنچ پرنسپل کی نگرانی میں ایک ادبی و علمی انجمن ۱۸۴۳ء میں ورنیکولر ٹرانسلیشن سوسائٹی کے نام سے دہلی کالج میں قائم کی گئی۔ اس کے اصلی کارپرداز، مولانا صہبائی اور ماسٹر رام چندر تھے۔ اس انجمن نے عربی فارسی، سنسکرت، انگریزی زبانوں سے ترجمے کر کے ملک و زبان کی بڑی خدمت کی۔ پروفیسر رام چندر کی خدمات کا ذکر آئندہ آئے گا۔ پروفیسر رام کشن نے سر ولیم میکناٹن کی قانونی تالیف "اصول ہندو شاستر" کا انگریزی سے ترجمہ

تھا۔ شاہی قلعۂ معلّٰی سے بھی صہبائی کی رسم و راہ تھی۔ شاہی خاندان کے بعض افراد

بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۱۷

کیا۔ اصول حکومت، فن زراعت، فن طب، صرف و نحو زبان انگریزی وغیرہ کتابیں ترجمہ و تالیف کیں۔ مولوی کریم الدین پانی پتی بھی دہلی کالج میں پروفیسر تھے، انھوں نے عورتوں کے لیے چند دلچسپ و مفید کتابیں تصنیف کیں، فن عروض پر ایک کتاب لکھی، تاریخ ابوالفدا کا ترجمۂ شعرائے عرب کا تذکرہ، شعرائے اردو کا تذکرہ (جو مسٹر فیلن کی شرکت میں مرتب کیا) قانون وراثت اسلامی پر ایک رسالہ، گلستان ہند (مجموعہ لطائف) وغیرہ متعدد کتابیں مولوی کریم الدین کی یادگار ہیں۔ دہلی کالج کے بعض طالب علم بڑے مشہور و نام آور ہوئے، مثلاً ماسٹر رام چندر، ماسٹر پیارے لال آشوب، مولوی ذکاء اللہ، مولوی محمد حسین آزاد، مولوی نذیر احمد، مولوی شہامت علی وزیر اعظم ریاست اندور، ڈاکٹر مکند لال جو طب مغرب کے بڑے عالم و ماہر تھے۔ دہلی کالج کے یورپین پرنسپل بھی اردو کے بڑے ماہر و سرپرست گزرے ہیں۔ مثلاً ڈاکٹر اسپرنگر، موسیو بوترو، مسٹر ٹیلر۔ اسپرنگر کی خدمات سے استفادہ آج تک ناگزیر ہے۔ آخر دہلی کالج ہنگامۂ غدر کی نذر ہو گیا۔ ۱۲ مئی ۱۸۵۷ء کو کالج کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی۔ اس کے کتب خانہ کو نذر آتش کر دیا گیا، اور کالج کے پرنسپل مسٹر فرانسس ٹیلر کو قتل کر دیا گیا، مگر خوش قسمتی سے اس کالج کی آمدنی ایک وقف سے تھی، وہ وقف قائم رہا۔ چنانچہ شورش غدر فرو ہونے کے بعد دوسرا کالج چاندنی چوک میں دہلی انسٹی ٹیوٹ کے نام سے قائم کیا گیا۔ تھوڑے ہی دنوں میں اس کو مقبولیت حاصل ہو گئی۔ اور چار سو پانچ سو طالب علم تعلیم پانے لگے۔ اب کالج کے ساتھ لائبریری بھی قائم ہو گئی اور ایک عجائب خانہ بھی کھولا گیا۔ اس کالج کے مقابلے میں پہلا کالج قدیم دہلی کالج کہلاتا ہے۔

ان کے شاگرد تھے۔ شعر وسخن میں ان سے مشورہ کرتے تھے۔ غدر ۱۸۵۷ء ۱۲۷۴ھ کے سلسلے میں جن لوگوں پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹے ان میں صہبائی کا حصہ بھی کسی سے کم نہ رہا۔ یعنی قتل کئے گئے اور ان کا مکان کھود کر زمین کے برابر کر دیا گیا۔ مفتی صدر الدین آزردہ نے کس درد سے کہا ہے۔

کیونکہ آزردہ نکل جائے نہ سودائی ہو

قتل اس طرح سے بے جرم جو صہبائی ہو

صہبائی نے دہلی کالج کی ملازمت کے زمانے میں ۱۸۴۲ء ۱۲۵۸ھ میں منشی شمس الدین فقیر کی تصنیف حدائق البلاغت (مصنفہ ۱۷۵۵ء ۱۱۶۸ھ) کا اردو ترجمہ مرتب کیا۔ لیکن صرف کہنے کو ترجمہ ہے، ورنہ اصل میں فن بلاغت کو اُردو میں منتقل کیا ہے۔ یہ اُردو میں اس فن کی پہلی مکمل و مستند کتاب ہے۔ صہبائی اپنے ترجمہ کے دیباچہ میں لکھتے ہیں۔

"نسخہ حدائق البلاغت علم بیان اور بدیع اور عروض میں شمس الدین فقیر رحمۃ اللہ علیہ کے قلم بلاغت رقم کا ثمرہ ہے، اور اس کتاب کا اس فن کے استیعاب میں شہرہ ہے، صاحب والا مناقب بلند مراتب حاکم دادودہش گستر بوترس صاحب بہادر، دام اقبالہ نے کہ شہر سعادت بہر شاہجہاں آباد کے مدارس کے پرنسپل ہیں فقیر سراپا تقصیر خاکپائے علما، گدائے سرکوچہ فضلا، سرگشتہ وادی ناتوانائی امام بخش صہبائی کو کہ طلبۂ فارسی کی تعلیم کے لئے مدرسی اول کے عہدے پر مشرف ہے، ارشاد کیا کہ اگر یہ نسخہ فارسی زبان سے اُردو میں ترجمہ کیا جاوے، اور اس میں عربی اور فارسی مثالوں کی جگہ اشعار اردو، زباندانان ہند کے مندرج ہوں تو ان لوگوں کے واسطے کہ اُردو اشعار سے ذوق رکھتے ہیں، اور اس قدر استعداد نہیں رکھتے کہ عربی اور فارسی کتابوں سے ان مطالب عالیہ کو سمجھ لیں، بہت مفید ہوگا، اس واسطے

اس خاکسار نے بوجہ اس کے کہ المامور معذور با وجود کم استعداد کے تقدیم امر مبنی کر کے اسی رسالہ کو ۱۲۵۸ھ مطابق ۱۸۴۲ء میں مرتب کیا۔ لیکن مستعمان انصاف پسند پر مطالعہ کے وقت ظاہر ہوگا کہ اس کم استعداد نے مسائل علمی کے لکھنے اور امثلۂ اردو کے فراہم کرنے میں کس قدر سعی کی ہے اور چونکہ یہ مقصود تھا کہ علم بیان اور بدیع اور عروض سے طالبین کو فائدہ تام حاصل ہو، اس واسطے بہت مسائل اصل کتاب سے زیادہ کر دیے، تاکہ از بسکہ لفظ بلفظ کے ترجمے میں مطلب کی توضیح خوب نہیں ہوتی، اس لئے ترجمہ میں اس امر کا مقید نہیں ہوا۔"

ترجمۂ حدائق البلاغت کا مختصر نمونہ یہ ہے:-

صنعت تلمیح - یہ اس طرح پر ہے کہ کلام مُشعر ہو کسی واقعہ مشہورہ پر، یا ایسی چیز پر اشارہ کیا جائے کہ کتب مستعلہ میں مذکور ہو۔ جیسے شعر سوداؔ کا ؎

دکھلائیے جا کر تو تجھے مصر کا بازار
پر واں کوئی خواہاں نہیں اس جنس گراں کا[۵۸]

اس شعر میں اشارہ ہے طرف قصہ حضرت یوسفؑ کے کہ وہ مشہور ہے، اور یہ شعر فقیر محمد خاں گویاؔ کا ؎

نہ دکھانا تو کہاں باتیں تھیں ایسی مجھ تک
لن ترانی کی بھی آئی نہ صدا میرے بعد

اس شعر میں حضرت موسیٰؑ کے قصے کی طرف اشارہ ہے، حق یہ ہے کہ جو لوگ کہ چاشنی انصاف اور مذاق شعر سے بہرہ رکھتے ہیں ان کے نزدیک یہ شعر جواب نہیں رکھتا۔ اور جیسے یہ شعر ؎

خزاں میں اس لئے لوٹنے ہے خاک پر غنچہ
کہ یہ علاج ہے اس کا جسے ہوا استقا

---

۵۸ مرزا غالب کو یہ شعر بہت پسند تھا لیکن وہ اس طرح پڑھا کرتے تھے۔

دکھلائیے لیجا کے تجھے مصر کا بازار
لیکن کوئی خواہاں نہیں اُن جنس گراں کا

اس شعر میں اشارہ ہے طرف مسئلۂ طب کے"

یہ ترجمہ پہلی مرتبہ حدائق البلاغت کے حاشیہ پر دسمبر ۱۸۵۶ء میں مطبع نول کشور واقع شہر کانپور سے شائع ہوا۔

مولوی مسیح الزماں

خلف مولوی نور محمد۔ ۱۸۴۸ء میں تعلیم مکاتب کے لیے ایک کتاب معلم الحساب ملقّب بہ مکتب نامہ لکھی، جس میں لڑکوں کے لیے نصائح، حکایات، انشائے رقعات، اور قواعد حساب درج کئے۔ اس میں ایک جنتری بارہ سو برس کی درج ہے۔ کتاب کے صفحہ پر اوپر انگریزی مہینوں کے نام اور نیچے ایک مہینہ کی تاریخیں خانوں میں لکھی ہوئی ہیں۔ بیچ میں جو جگہ خالی ہے اس میں کاغذ کا گول ٹکڑا لگا ہوا ہے جس پر ایک سو بارہ سنہ عیسوی لکھے ہوئے ہیں۔ اوپر کے کاغذ کا کوئی سنہ کسی مہینے کے سامنے لانے سے نیچے اسی مہینے کی تاریخیں نکل آتی ہیں۔ اس وضع کی جنتریاں ہمارے زمانے میں بہت عام ہیں لیکن آج سے تقریباً ایک صدی پہلے کی کتاب میں بہت عجیب و دلچسپ معلوم ہوتی ہے۔

مکتب نامہ دوسری بار ۱۸۵۹ء ۱۲۷۵ھ میں مطبع نظامی کانپور سے شائع ہوا۔ بطور نمونہ ایک قاعدۂ حساب درج کیا جاتا ہے:-

"**قاعدہ** - ہر اپریل کے مہینے میں جو سنہ فصلی ہووے جب اس پر ساڑھے چھ سو برس اور بڑھائے جاویں تو سنبت بن جاوے گا، جیسے اپریل ۱۸۵۹ء میں ۱۲۶۶ء فصلی ہیں اس پر ساڑھے چھ سو اور بڑھائے۔ اُنیس سو سولہ ہوئے۔ یہی سال سنبت ہے۔"

منشی عبدالکریم

لکھنؤ وطن تھا، کلکتہ میں گورنر جنرل کے دفتر فارسی کے میر منشی تھے ان کو قصے کہانی کی کتابوں میں الف لیلہ بہت پسند تھی۔ ملازمت سے پنشن لینے کے بعد الف لیلہ کے انگریزی ترجمہ سے ۱۸۴۲ء ۱۲۵۸ھ میں اردو ترجمہ مرتب کیا۔ اور ۱۸۴۸ء ۱۲۶۴ھ میں چھپوایا۔ پھر ۱۸۴۹ء ۱۲۶۵ھ میں باتصویر شائع کیا۔ اس کا حال دیباچہ میں لکھا ہے۔ اسی کا اقتباس بطور نمونہ "سیر المصنفین" سے اخذ کیا جاتا ہے۔

" وہ کتاب سواد و سورات کی کہ جس کو شیخ احمد عرب یمنی شروانی نے واسطے پڑھانے صاحبان عالی شان کالج کلکتہ کے بکمال تلاش عرب سے منگوا کر چھپوایا تھا میسر نہ آئی، آخر کار جب راقم بہ سبب شدت امراض کے بعد تقرر پنشن بیت السلطنت لکھنؤ میں کہ مولد اپنا ہے، خانہ نشین ہوا، وہ نسخہ تمام و کمال انگریزی زبان میں مع تصویرات بہم پہنچا۔ راقم نے اس کو اول سے آخر تک بسبب استعداد سمجھنے انگریزی کے دیکھا از بسکہ قصے دلچسپ تھے دو برس تک اس کا ترجمہ کرتا رہا۔ اور ۱۲۵۸ ہجری میں تمام کیا۔ شہر میں شہرہ ہوا۔ اکثر لوگوں نے منگوا کر نقل اس کی لی، کثر مسودہ راقم کے گھر رہا۔ دست بدست پھرا کیا۔ چنانچہ پانچ سات جزو تلف ہوئے۔ راقم کو اس کے لکھنے میں دوبارہ تکلیف کرنا پڑی۔ اور طلب کرنے احباب سے نہایت تنگ آیا، جس کو نہ دیتا وہ خفا ہوتا، اور دینے میں اپنی کتاب سے ہاتھ دھوتا۔ آخر کو خیال ہوا کہ یہ کتاب چھپ جائے تا سب کے ہاتھ آئے۔ اور راقم بھی ایک ایک نسخہ اس کا عزیزوں اور دوستوں کو بانٹے۔ فقط اسی واسطے راقم نے جس طرح ہو سکا بیچ عہد معدلت مہد پادشاہ جم جاہ، خاقان زماں، ابو المظفر مصلح الدین محمد امجد علی شاہ بادشاہ غازی ملک اودھ خلد اللہ ملکہ، اور وزارت وزیر اعظم نواب امین الدولہ عماد الملک امداد حسین خاں بہادر ذوالفقار جنگ دام اقبالہ

کے چھپوایا اور سنہ ہجری طبع اس کتاب کے ۱۲۶۳ھ اور عیسوی ۱۸۴۶ء ہیں۔"
منشی عبدالکریم کی عبارت سادہ ہے، قافیہ پیمائی نہیں ہے، لیکن ترتیب الفاظ
کی بے قاعدگی وہی ہے جو ان سے پہلے ہر جگہ ہے۔

ماسٹر رام چندر دہلی کالج میں پروفیسر تھے، مولوی محمد حسین آزاد، مولوی ذکاءاللہ، مولوی نذیر احمد ان کے شاگرد ہیں۔ گارسان دتاسی دسمبر ۱۸۵۲ء
کے خطبہ میں رام چندر کے متعلق لکھتا ہے کہ "ان کے عیسائی مذہب قبول کر لینے پر اس
سال کے ماہ جولائی میں خاصی ہلچل مچ گئی تھی، کہا جاتا ہے کہ دہلی کے یہ پہلے ہندو ہیں۔
جنھوں نے یہ مذہب اختیار کیا، اس پنڈت کی عمر اس وقت ۲۵ سال کی ہے۔ یہ
شخص دہلی کالج کا طالب علم تھا، اور اس کالج میں اس نے انگریزی، ہندوستانی
اور فارسی زبانوں کو حاصل کیا تھا، لیکن علم ریاضی کی طرف اس کا خاص رجحان
تھا، وہ متعدد مفید کتابوں کا مصنف اور مترجم ہے، جن میں سے ایک الجبرا ہے۔
ایک کتاب علم مثلث پر ہے جس میں مخروطات بھی شامل ہیں، اور ایک کتاب علم ہندسہ
پر ہے۔ ایک کتاب علم الحساب پر لکھی ہے، اور ان کے علاوہ کئی کتابیں ادب پر ہیں۔
یہ پروفیسر دو رسالوں کے اڈیٹر بھی ہیں۔ ان میں سے ایک خاص طور پر قابل ذکر ہے
جس کا نام "محبوب ہند" ہے۔ یہ ایک ماہانہ پرچہ ہے جس میں اہم مسائل و معلومات
وقت پر، اہل ہند کی تعلیمی حالت پر، اور عام ادب یعنی ہندوستانی زبان کی ترقی پر
مضامین لکھے جاتے ہیں[1]"

ان کے علاوہ ماسٹر رام چندر نے عجائب روزگار تصنیف کی جو دہلی میں ۱۸۴۷ء

---

[1] منقول از خطبات گارسن دتاسی مطبوعہ انجمن ترقی اردو

میں شائع ہوئی، ایک کتاب اصول علم ہیئت لکھی جو ۱۸۶۳ء میں چھپی، ایک تالیف تذکرۃ الکاملین کے نام سے مرتب کی جو ۱۸۴۹ء میں دہلی سے نکلی، اس کے بعد تین بار مطبع نولکشور میں چھپی۔ ماسٹر صاحب ملازمت انگریزی کے بعد ریاست پٹیالہ میں ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم ہو گئے تھے۔ اور تذکرۃ الکاملین ریاست کے نصاب تعلیم میں شامل ہو گئی تھی۔

تذکرۃ الکاملین میں یونان، روم قدیم، یورپ، ایران، ہندوستان کے مشاہیرِ علم و فضل کے مختصر حالات درج کئے ہیں۔ نمونہ کے طور پر کتاب کے سب سے آخری شخص کے حال کا اقتباس درج کیا جاتا ہے۔

"ذکر مہندس بھاسکر کا۔ یہ شخص بہت بڑا عقلمند اور مہندس ہند میں گزرا ہے، اس کے برابر ذہین اور عاقل اور سچے علم کی پیروی کرنے والا کوئی اور شخص قوم میں نہیں ہوا ہے۔ یہ بزرگ بمقام شہر بنارس میں بیچ ۱۱۱۵ء کے پیدا ہوا تھا۔ اس شخص نے ہمارے شاستر کی غلطیوں کو درست کیا، لیکن اکثر برہمن اس کے قول پر عمل نہیں کرتے، اگرچہ اس کو اپنا بزرگ سمجھتے ہیں۔ لیکن جو بڑے بڑے فاضل اور عاقل ہیں وہ اس کے کلام کو کلام پُران پر ترجیح دیتے ہیں۔ کسی شاستر میں لکھا ہے کہ زمین شکل دائرے کے ہے، اور کہیں یہ لکھا ہے کہ وہ شکل مثلث کے ہے۔ بھاسکر نے ان لغو باتوں کو رد کیا، اور لکھا کہ زمین کی شکل کروی ہے۔ یہاں سے اس کے ذہن کو دیکھنا چاہئے۔ شاستر میں لکھا ہے کہ زمین سانپ کے پھن اور کچھوے اور آٹھ ہاتھیوں پر سہارا پائے ہوئے ہے۔ بھاسکر نے کہا کہ اگرچہ یہ شاستر میں لکھا ہے، لیکن محض غلط ہے اس نے فرمایا کہ زمین ہوا میں بہ ارادے معبود حقیقی کے اس میں معلق ہے۔

آغا امانت لکھنوی

سید آغا حسن نام، امانت تخلص، ۱۲۳۱ھ/۱۸۱۶ء میں پیدا ہوئے، شاعری مرثیہ گوئی سے شروع کی۔ اس زمانے میں میاں دلگیر لکھنؤ میں مرثیہ کے بڑے استاد تھے۔ ان سے اصلاح لی۔ پھر مرثیہ چھوڑ کر غزل گوئی شروع کی۔ بیس برس کی عمر میں کسی بیماری سے زبان بند ہو گئی اور دس برس تک گونگے رہے۔ زبان کا کام تحریر سے لیتے تھے۔ اسی حالت میں کربلا گئے۔ وہاں زبان کھل گئی لیکن لکنت باقی رہی۔ امانت شاعر کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ اپنے زمانے میں استاد مانے جاتے تھے، رشک، برق، بحر، گویا جیسے باکمالوں کے ہمعصر تھے۔ لیکن تمام کلام ضلع جگت، ایہام، مراعاۃ النظیر سے معمور ہے۔ امانت کا منظوم ڈراما ناٹک اندر سبھا نہایت مشہور و مقبول ہوا۔ اردو میں یہ اپنی نوع کی پہلی کتاب ہے۔ دیوان غزلیات اور واسوخت بھی امانت کی یادگار ہیں۔ ۱۸۵۸ء میں انتقال کیا۔

امانت نے اپنی منظوم "اندر سبھا" کی توضیح و تشریح نثر میں شرح اندر سبھا کے نام سے لکھی تھی، لیکن وہ گمنام تھی اس کو سید مسعود حسن صاحب رضوی ایم اے سابق پروفیسر لکھنؤ یونیورسٹی نے رسالہ اردو میں شائع کر دیا ہے۔ اس کی عبارت اس زمانے کی روش کے مطابق مقفیٰ ہے، لیکن الجھاو اور گنجلک نہیں۔ اکثر صاف و رواں ہے۔ اس میں سے "سبب تالیف اندر سبھا" کا اقتباس بطور نمونہ نقل کیا جاتا ہے۔

ایک روز کا ذکر ہے کہ حاجی مرزا عابد علی یگانۂ ازلی، رفیق شفیق مونس و غم خوار، قدیمی جاں نثار، شاگرد رشید، موزوں طبیعت، تخلص عبادت، عاشق کلام امانت، انھوں نے از راہ محبت کہا کہ بے کار بیٹھے بیٹھے گھبرانا عبث ہے، ایسا کوئی جلسہ (ناٹک) کے طور پر طبع زاد نظم کیا چاہیے کہ دو چار گھڑی دل لگی

کی صورت ہووے، اور خلق میں شہرت ہووے، آخرالامر موافق ان کی
فرمایش کے بندہ اس کے کہنے پر آمادہ ہوا، دمبدم شوق زیادہ ہوا، چونکہ
یہ جلسہ کہنا سب کو مرغوب تھا، مگر اپنے نزدیک معیوب تھا، اس لحاظ سے
اپنا تخلص بدل کر اس میں استاد تخلص کیا، لیکن لوگوں نے غزلوں کے
سبب سے بندے کا کلام دریافت کر لیا۔ غرض کہ چودھویں تاریخ شوال
کی ۱۲۶۸ھ ہجری میں اندر سبھا اس جلسے کا نام رکھ کر بجائے چار رباب،
چار پریاں قرار دے کر شروع کیا، شہرت گھر گھر ہوئی، اہل محلہ کو خبر ہوئی،
دو شخص اس جلسے کی تیاری پر آمادہ ہوئے، ہجوم حد سے زیادہ ہوئے، رفتہ
رفتہ بعد ہزاراں ہزار شور و فساد اور رجحت و تکرار کے ڈیڑھ برس میں جلسہ
تیار ہوا مگر اپنے نزدیک بیکار رہا، کہ کس ریاض سے ایک درخت لگایا،
آخر کو اس سے رنج کا پھل پایا، خیر ہوا سو بہتر ہوا۔ اپنا تو یہ قول ہے،
تقدیر سے گلہ ہے کسی سے گلہ نہیں ":

منشی چرنجی لال الہ آباد کے رہنے والے تھے۔ فلسفہ و ریاضی کا بہت
شوق تھا۔ ایک کتاب مصباح المساحت ۱۸۵۴ء میں
لکھی۔ اس کے بعد مسٹر ہنری کارٹر کی تحریک اور مسٹر چارلس فنک کی اعانت سے
علم نفسیات کی ایک کتاب انگریزی سے ترجمہ کی اور اس کا نام تعلیم النفس رکھا۔
یہ کتاب گورنمنٹ پریس میں ۱۸۵۵ء میں طبع ہوئی۔ اس کا ایک فقرہ یہ ہے،۔

"سنین ماضیہ میں اکثر اساتذہ بہ سبب اس کے کہ ان کو بہ تعمق و تامل سیر کتب کی
عادت تھی، نامور اور مشتہر ہو گئے ہیں، اور کبھی ممکن نہیں ہے کہ کوئی بلا حصول
اس عادت کے فضیلت پیدا کرے ":

ماسٹر بنسی دھر

پنڈت بنسی دھر نارمل اسکول آگرہ میں مدرس تھے۔ مختلف کتابیں اور رسالے تصنیف کئے بعض چیزوں کے ترجمے بھی کیے۔ ایک اخبار "آب حیات ہند" نکالتے تھے۔ جو انھیں کے قائم کردہ مطبع نور العلم آگرہ میں چھپتا تھا۔ ایک "انجمن حق" قائم کی تھی۔ اس کے صدر تھے۔ ایک کتاب حقائق الموجودات منشی چرنجی لال کی اعانت سے تالیف کی۔ اسکا مقصد لکھا ہے:۔ "براد استعمالِ مدارس ممالک مغربی کے"۔ لوح پر یہ بھی لکھا ہے کہ ۔۔۔ "بدیا نگر سے ترجمہ کیا"۔ معلوم ہوتا ہے کہ پہلے ہندی میں چھپی ہوگی اور اس کا نام "بدیا نگر" ہوگا۔ "مطبع اسعد الاخبار اکبر آباد کی چھاپی گئی ۱۸۵۲ء"۔ حجم ۹۶ صفحے۔

پوری کتاب "حقائق الموجودات" ایک مکالمے کی شکل ہے جو شاگرد اور اُستاد میں ہوتا ہے۔ مختلف مضامین کو جو عام معلومات کی چیزیں ہیں، بیان کیا ہے ضرورت کے مطابق نقشے کھینچ کر چیزوں کو سمجھایا ہے۔ کتاب اس طرح شروع ہوتی ہے۔

پہلا سبق
خلقت کے باب میں

ایک استاد مدرسے میں بیٹھا ہوا طالب علموں کو درس دے رہا تھا کہ اتفاقاً ایک آدمی جنگلی گینڈے کو پکڑے ہوئے مدرسے کے سامنے آنکلا۔ اس جانور کو دیکھ کر سب طالب علم متحیر ہو کر استاد سے پوچھنے لگے کہ خلیفہ جی ایسا جانور ہم نے کبھی نہیں دیکھا ہے۔

اُستاد

خدا کی خلقت میں ایسے ہزارہا مخلوق ہیں کہ جن کی حقیقت صرف علم کے ذریعے سے معلوم ہوتی ہے جو تم لوگ تحصیل علم میں کوشش اور سعی کرو گے تو حقیقت

حال دریافت کروگے۔

شاگرد

اب ہماری یہ خواہش ہے کہ آپ زبان شریف سے خلقت کا کچھ حال بیان فرمائیں اور میں سُن کر کچھ آگاہی پیدا کروں۔

اسی انداز سے پہلے مخلوقات کا بیان ہے۔ اس کے بعد "رنگ" اور "ڈیل ڈول" (یعنی ابعاد و اقدار) سے بحث کی ہے۔ پھر زبانوں اور متفرق معلومات کا بیان ہے۔ آج یہ کتاب کچھ زیادہ اہم نہیں معلوم ہوتی لیکن ایک صدی پہلے یقیناً بہت اہم تھی۔ اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ غدر سے پہلے ہی مدرسوں کے لیے کتابیں کیسی صاف زبان اور دل نشیں اسلوب میں لکھی جانے لگی تھیں [1]

مولوی ضیاء الدین خلف شیخ غلام حسن خاں جاگیردار بسی دارا پور۔ وطن سے دہلی آکر سکونت پذیر ہوگئے۔ مدرسہ تعلیم المعلمین (نارمل اسکول) میں مدرس مقرر ہوئے۔ علم طبیعیات (فزکس) سے خاص لگاؤ تھا، میجر فلر ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم پنجاب کی فرمائش سے "اصول علم طبیعیات" پر ایک کتاب مخزن الطبیعیات دو حصوں میں ترتیب دی۔ جو لاہور میں ۱۸۶۵ء/۱۲۸۱ھ میں طبع ہوئی۔ حصہ دوم کی عبارت کا نمونہ یہ ہے۔

"ارباب بصیرت پر ظاہر ہو کہ جن اجسام میں کشش اتصال اس قدر کم ہے کہ ان کے

---

[1] یہ حال اور نمونہ ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی ایم اے پی ایچ ڈی (الہ آباد یونیورسٹی) کا عطیہ ہے۔

اجزا بغیر محسوس ہونے مزاحمت کے متحرک ہو سکتے ہیں، ان کو سیال کہتے ہیں
اجرام سیال میں بڑا فرق یہی ہے کہ اجسام سخت کے اجزا کو کشش اتصال متصل
اور پیوستہ رکھتی ہے۔"

مرزا غالب دہلوی

اب تک جن مصنفوں کے حالات لکھے گئے اُن میں مشکل سے کوئی ایسا ہوگا جس کے مفصل حالات اور مکمل سوانح حیات علیحدہ یا تذکروں اور تاریخوں میں ملتے ہوں۔ کتنے ایسے ہیں جن کے سنین ولادت و وفات مولد و مسکن معمولی احوال زندگی بھی نامعلوم ہیں، اس لیے ہم بھی زیادہ تفصیل نہ دے سکے۔ مرزا غالب پہلے شخص ہیں جن کی ساری زندگی کے پورے حالات ہمارے سامنے ہیں۔ اور اس صفت میں شاید وہ اول و آخر شخص ہیں کہ ان کی تصنیف اور ان کی سیرت ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ اگرچہ انھوں نے اپنی مسلسل سوانح عمری نہیں لکھی، لیکن ان کی تمام حیات نہ صرف ان کی تحریروں میں جا بجا مذکور ہے، بلکہ ان کے اسلوب و موضوع نگارش پر اثر انداز بھی ہے۔ غالب کی اس خصوصیت اور ان کے شعر و ادب کی انفرادیت کے سبب سے، ان کی ترتیب سوانح، تجزیۂ سیرت، تبصرہ کلام، شرح دیوان کے متعلق کثرت سے کتابیں لکھی گئیں۔ سب سے پہلے مولانا حالی نے شاگردی کا حق ادا کیا۔ اور حق یہ ہے کہ حق ادا کر دیا۔ مولانا کی "یادگار غالب" کے بعد مسٹر غلام رسول مہر کی کتاب "غالب"، مسٹر محمد اکرام کا "غالب نامہ" منشی امتیاز علی عرشی کی تالیف "مکاتیب غالب" ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کا مقدمہ کلیات غالب، ڈاکٹر عبداللطیف کی کتاب "غالب"، مرزا محمد عسکری کی "ادبی خطوط غالب" وغیرہ اور مختلف مصنفوں کی شروح دیوان غالب" غالب کو سمجھنے کے لیے اور موافق و مخالف دونوں پہلوؤں پر غور کرنے کے لیے نہایت ضروری ہیں۔

مولانا عرشی۔ مولانا مہر اور مسٹر مالک رام کی غالب پر تحقیقات کتابوں اور مقالات کے ذریعے سامنے آتی رہتی ہیں۔ غالب کے متعلق متفرق مضامین کا جو مختلف رسائل و اخبارات میں شائع ہوئے ہیں، کوئی حساب و شمار نہیں ہو سکتا۔

بعض کج فہم و تنگ نظر لوگوں کو شکایت ہے کہ غالب کے ساتھ ضرورت سے زیادہ اعتنا کیا گیا ہے۔ لیکن اعتراض کرنے والے یہ بات بھول جاتے ہیں کہ اردو زندہ زبان ہے، اور یہ اس کی زندگی کا ثبوت بھی ہے اور اس کی قوت کا سامان بھی۔ اہل یورپ نے اپنے مصنفین و شعراء میں سے ایک ایک کے تذکرہ و تبصرہ سے ایک ایک کیا کئی کئی الماریاں بھر دی ہیں۔ یہاں اگر مرزا غالب، میر انیس، ڈاکٹر اقبال وغیرہ پر ایک ایک دو دو درجن کتابیں لکھ دی گئیں تو ابھی الماری کا ایک ایک خانہ بھی پُر نہیں ہوا۔

غالب کا نام و خطاب

اسد اللہ خاں نام، "مرزا نوشہ" عرف، "نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ" خطاب شاہی۔

پہلے اسدؔ تخلص تھا پھر حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے لقب اسد اللہ الغالب کی مناسبت سے غالبؔ تخلص کر لیا۔

نسل و نسب

غالب کے آبا و اجداد تورانی ایبک ترک تھے، سلسلۂ نسب فریدون بادشاہ تک پہنچتا ہے۔ غالب کو اپنے نسب پر بڑا فخر تھا۔ کہتے ہیں:۔

غالب از خاک پاک تورانیم   لاجرم در نسب فرہ مندیم

ایبکیم از جماعتِ اتراک   در تمامی ز ماہ دہ چندیم

باپ دادا

غالب کے دادا شاہ عالم بادشاہ دہلی (۱۷۵۹ء/۱۱۷۳ھ تا ۱۸۰۶ء/۱۲۲۱ھ) کے

عہد میں سمرقند سے ہندوستان آئے، بادشاہ کی طرف سے منصب ملا اور پہاسو کا پرگنہ ذات اور رسالہ کی تنخواہ میں عطا ہوا۔ غالب کے والد عبداللہ بیگ خاں عرف مرزا دولھا کی شادی آگرہ کے ایک رئیس خواجہ غلام حسین کی لڑکی سے ہوئی جو میرٹھ میں فوج کے میدان (نائب کپتان) تھے۔ عبداللہ بیگ خاں کا قیام اپنی سسرال میں آگرہ رہتا تھا۔ لیکن مختلف ملازمتیں بھی کیں۔ اول نواب آصف الدولہ وزیر اودھ کے ہاں ملازم ہوئے پھر حیدر آباد میں نواب نظام علی خاں کی سرکار میں تین سو سوار کے سردار رہے۔ وہاں سے ترک خدمت کر کے آگرہ آ گئے آگرہ سے آلور جاکر ریاست سے متوسل ہو گئے۔ وہیں ایک لڑائی میں قتل ہوئے

چچا

غالب کے حقیقی چچا نصراللہ بیگ خاں بہادر کی شادی نواب فخرالدولہ والی لوہارو کے خاندان میں ہوئی۔ نصراللہ بیگ پہلے مرہٹوں کی طرف سے آگرہ کے صوبہ دار رہے۔ پھر انگریزی فوج میں چار سو سواروں کے رسالدار ہو گئے، اور جنرل لارڈ لیک کے ساتھ بڑی فوجی خدمات ادا کیں جس کے صلے میں نواح آگرہ کا پرگنہ "سونک سونسا" بقید حین حیات جاگیر میں ملا۔ سنہ ۱۸۰۶ء (۱۲۲۱ھ) میں نصراللہ بیگ خاں کا انتقال ہو گیا۔ سرکار نے جاگیر واپس لے لی، اور ان کے وارثوں کے لیے سات ہزار روپئے سالانہ پنشن مقرر کر دی۔

ولادت وتربیت

غالب ۸ رجب سنہ ۱۲۱۲ھ (سنہ ۱۷۹۷ء) کو آگرہ میں پیدا ہوئے، ان کا مکان آگرہ میں اس جگہ تھا جہاں اب پیپل منڈی کی سڑک پر "کالا محل" واقع ہے۔ غالب پانچ برس کے تھے جو والد کا انتقال ہو گیا چچا نصراللہ بیگ خاں نے پرورش کی، لیکن ابھی آٹھ برس کی عمر تھی کہ چچا نے بھی انتقال کیا۔ اس کے بعد غالب کی تربیت ان کی ننھیال میں ہوئی اور

لڑکپن آگرہ میں گزرا۔ ایک بزرگ استاد شیخ معظم سے تعلیم حاصل کی، آگرہ کے مشہور بے نظیر شاعر میاں نظیر اکبرآبادی سے بھی کچھ پڑھا۔

شادی غالب کی عمر ۱۳ برس کی تھی کہ ۷ رجب ۱۲۲۵ھ (۱۸۱۰ء) کو ان کی شادی نواب الٰہی بخش خاں معروف کی لڑکی سے ہوئی، جو نواب احمد بخش خاں والی فیروزپور جھرکہ و جاگیردار لوہارو کے حقیقی بھائی تھے۔ غالب کے چچا کی شادی بھی اسی خاندان میں ہوئی تھی، اسی وسیلے سے غالب کا رشتہ ہوا۔[۵] نواب الٰہی بخش خاں دہلی میں رہتے تھے۔ شادی کے بعد غالب کی آمد و رفت دہلی میں شروع ہو گئی۔

تحصیل فارسی اسی عرصے میں ایک شخص ایرانی ملا عبدالصمد ۱۲۲۶ھ ۱۸۱۱ء میں (حسب تحریر "قاطع برہان" مصنفہ غالب) آگرہ آیا، اور غالب کے گھر دو برس رہا۔ یہ شخص "زرتشتی" سے مسلمان ہوا تھا۔ غالب نے اس سے فارسی زبان سیکھی۔ اس شخص ایرانی اور اس سے تحصیل فارسی کے متعلق خود غالب کے بیانات میں عجیب و دلچسپ اختلاف یا ظرافت ہے۔ "اردوئے معلیٰ" کے متعدد خطوط کے علاوہ ایک مکتوب ۷ اکتوبر ۱۸۶۶ء میں نواب کلب علی خاں

---

[۵] نواب احمد بخش خاں نے اپنی زندگی میں اپنے لڑکے نواب شمس الدین احمد خاں کو والی فیروزپور بنا دیا تھا، اور خود گوشہ نشین ہو گئے تھے۔ یہ نواب شمس الدین احمد خاں، نواب مرزا داغ دہلوی کے والد تھے اس حساب سے غالب کا داغ سے سسرالی رشتہ تھا۔ نواب شمس الدین احمد خاں ۱۸۳۵ء میں قتل ہوئے۔ ان کے بعد ان کے چھوٹے بھائی نواب ضیاء الدین احمد خاں والی فیروزپور و لوہارو ہوئے۔ ان سے غالب کے خاص تعلقات انس و محبت تھے۔

رئیس رامپور کو لکھتے ہیں:۔

"بدو فطرت سے میری طبیعت کو زبان فارسی سے ایک لگاؤ تھا۔ چاہتا تھا کہ فرہنگوں سے بڑھ کر کوئی ماخذ مجھکو ملے، بارے مراد بر آئی، اور اکابر پارس میں سے ایک بزرگ یہاں وارد ہوا، اور اکبر آباد میں فقیر کے مکان پر دو برس رہا، اور میں نے اس سے حقائق و دقائق زبانِ پارسی کے معلوم کئے اب مجھے اس امر خاص میں نفس مطمئنہ حاصل ہے۔"

(از مکاتیب غالب صفحہ ۵۲)

اس کے برعکس ایک خط میں فرماتے ہیں:۔

"مجھ کو مبدء فیاض کے سوا کسی سے تلمذ نہیں۔ عبدالصمد محض ایک فرضی نام ہے، چونکہ لوگ مجکو بے استادا کہتے تھے۔ ان کا منہ بند کرنے کے لیے ایک فرضی استاد گھڑ لیا۔"

ان دو بیانوں میں مطابقت نہیں ہو سکتی بجز اس کے کہ دوسرا بیان بطور ظرافت ہے، یا یہ بات ثابت کرنے کے لیے ہے کہ غالب زبان و ادب فارسی میں کسی کے شاگرد نہ تھے، اور یہی واقعہ معلوم ہوتا ہے۔ پہلا بیان چند فارسی محاوروں کے سلسلے میں ہے جن کے معنوں میں غالب اور نواب خلد آشیاں کے درمیان اختلاف تھا۔ نواب صاحب ہندوستانی مصنفین لغات کے معنوں کو درست سمجھتے تھے۔ غالب اسی خط کے آئندہ سطور میں اُن سب فرہنگ نویسوں کو نالائق اور غیر معتبر ٹھہراتے ہیں۔ یہ غالب کی انشا پردازی ہے کہ کسی اہم بات کے لیے شاندار اور فیصلہ کن الفاظ لکھتے ہیں۔ چنانچہ نواب صاحب کا "منہ بند کرنے کے لئے" لکھ دیا کہ "میں نے اس سے حقائق و دقائق زبان پارسی کے معلوم کیے، اب مجھے اس امر خاص میں نفس مطمئنہ حاصل ہے۔" گویا "حقائق و دقائق پارسی" "لطائف

تصوف اور اسرارِ معرفت سے کہ ایک مرشد کامل نے دو سال میں سارا سلوک طے کرا دیا، یا سینہ سے لگا کر علمِ لدنی آنِ واحد میں عطا کر دیا، اور اس سے "نفس مطمئنہ" حاصل ہو گیا۔ بلاشبہ غالب کو" اس امر خاص میں نفس مطمئنہ" حاصل تھا۔ اور اکثر ان کی رائے درست ہوتی تھی: لیکن یہ بات ان کو کافی مطالعہ کے بعد حاصل ہوئی ہوگی: یہ ضرور ہے کہ عبدالصمد ایرانی سے دو سال تک جو فارسی میں گفتگو کی ہوگی، شعر و شاعری کا ذکر و فکر رہا ہوگا، اس سے یک گونہ بصیرت پیدا ہو گئی ہوگی جس نے ذوق سلیم، فکر صحیح، مطالعۂ وسیع کے ساتھ مل کر آئندہ رائے صائب کا ملکہ پیدا کر دیا۔

قیامِ دہلی غالباً ۱۸۱۳ء یا ۱۸۱۴ء میں غالب آگرہ چھوڑ کر دہلی آ رہے، اس لئے کہ نواب خلد آشیاں کو یکم ستمبر ۱۸۶۶ء کے خط میں لکھتے ہیں۔ "میں باون ترپن برس سے یہاں رہتا ہوں" (از مکاتیب غالب) لیکن دہلی میں آخر عمر تک کوئی ذاتی مکان نہ بنایا۔ مختلف محلوں میں کرایہ کے مکانوں میں رہا کئے۔ سب سے آخر میں حکیم محمود خاں مرحوم کے مکان کے قریب مسجد کے عقب میں رہتے تھے۔ اس مکان کے متعلق کسی کو لکھتے ہیں۔

مسجد کے زیر سایہ اک گھر بنا لیا ہے	یہ بندۂ کمینہ ہمسایۂ خدا ہے

اولاد ہوئی لیکن زندہ نہ رہی۔ بیوی کے بھانجے زین العابدین خاں عارف کو بیٹا بنا لیا تھا۔ عارف اور ان کے بچوں کو اولاد سے بڑھ کر سمجھا۔ غالب کے ایک چھوٹے بھائی بھی تھے مرزا یوسف خاں، ان سے بھی بڑی محبت کرتے تھے۔ ایک مرتبہ مرزا یوسف نے کسی مرض سے صحت پائی تو غالب نے کہا تھا:۔

دی مرے بھائی کو حق نے از سر نو زندگی	میرزا یوسف ہے غالب یوسفِ ثانی مجھے

بھائی نے ۳۰ برس دیوانہ رہ کر اکتوبر ۱۸۵۷ء میں انتقال کیا، زین العابدین خاں بھی

سے پہلے دو بچے چھوڑ کر جوانی میں ۱۸۵۶ء/۱۲۷۲ھ میں داغ دے گئے تھے۔

دیگر حالات

غالب کو چچا کی جاگیر کے عوض سات سو روپیہ سالانہ بحساب باسٹھ روپئے آٹھ آنے ماہوار ملتے تھے، لیکن اس قدر آمدنی ان کے لیے کافی نہ تھی اور وہ اس کو اپنے حق سے کم بھی سمجھتے تھے، اس لیے اس میں اضافہ کرانے کی غرض سے سنہ ۱۸۳۰ء میں کلکتہ گئے۔ گورنمنٹ میں اپیل کی، شہنشاہ انگلستان اور انگریز حکام کی شان میں زندہ داد قصیدے کہے، لیکن دو سال رہ کر کلکتہ سے ناکام آئے۔ اس سفر میں لکھنؤ، بنارس کی بھی سیر کی۔ نوابان اودھ کی مدح میں قصیدے پیش کئے۔ واجد علی شاہ بادشاہ اودھ کے دربار سے پانچ سو روپئے سالانہ مقرر ہوا۔ لیکن ۱۸۵۶ء میں الحاق اودھ کے ساتھ بند ہو گیا۔

۱۸۵۶ء/۱۲۵۵ھ میں دہلی کالج میں "مدرس فارسی" کا جدید عہدہ قائم کیا گیا اس کیلئے مسٹر ٹامسن نے (جو بعد کو صوبہ کے لفٹنٹ گورنر ہوئے) غالب کا انتخاب کیا اور ملاقات یا امتحان کیلئے بلایا غالب پالکی میں گئے لیکن منتظر رہے کہ صاحب بہادر لینے کے لئے آئیں۔ وہ غالب کو امیدوار ملازمت سمجھ کر نہ آئے۔ انھوں نے اپنی کسر شان سمجھی، اور نوکری سے معذرت کر کے لوٹ آئے۔ مولوی امام بخش صہبائی اس عہدے پر رکھ لئے گئے۔ غالب کو چوسر کھیلنے کا بہت شوق تھا، اور ہمیشہ کچھ برائے نام بازی بد کر کھیلا کرتے تھے ۱۸۴۷ء/۱۲۶۴ھ میں جو کوتوال شہر تھا اس کو غالب سے کچھ عناد تھا، اس نے قمار بازی کے الزام میں غالب کو گرفتار کر لیا اور چھ مہینے کی سزائے قید کرا دی۔ کوتوال کا عناد درست سہی، لیکن واقعہ یہ ہے کہ غالب کا مکان جوے کا اڈا بن گیا تھا۔ جواری جمع رہتے تھے۔ بہر حال تین مہینے کے بعد خود مجسٹریٹ ہی کی رپورٹ پر رہا کر دئے گئے۔ قید خانہ میں غالب کے ساتھ ہر طرح کی عزت کا سلوک ہوتا تھا، گویا صرف نظر بندی تھی، لیکن غالب کے غیور و حساس قلب پر اس بے عزتی کی ایسی چوٹ لگی کہ وہ خود اپنی نظر سے گر گئے، اور

اپنے نزدیک رؤسا، و معززین سے ملنے جلنے کے قابل نہ رہے، چنانچہ ۱۸۵۲ء ۱۲۶۸ھ میں منشی ہرگوپال تفتہ کو لکھتے ہیں۔

"سرکار انگریزی میں بہت بڑا پایہ رکھتا تھا، رئیس زادوں میں گنا جاتا تھا پورا خلعت پاتا تھا، اب بدنام ہو گیا ہوں، بہت بڑا دھبہ لگ گیا ہے، کسی ریاست میں دخل نہیں کر سکتا، مگر ہاں استاد یا پیر یا مداح بن کر راہ و رسم پیدا کروں۔"

لیکن لوگوں نے غالب کو ایسا نہیں سمجھا، ہر رئیس و بادشاہ کی نظر میں بھی وہی وقعت رہی جو ہمیشہ سے تھی۔ چنانچہ ۱۸۵۰ء ۱۲۶۶ھ میں بہادر شاہ ظفر آخری تاجدار مغلیہ نے غالب کو "تاریخ شاہی" لکھنے کی خدمت پر مامور کیا۔ نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ کا خطاب و خلعت دیا، پچاس روپیہ ماہوار تنخواہ مقرر کی اور جب ۱۸۵۴ء ۱۲۷۱ھ میں بادشاہ کے استاد ذوق کا انتقال ہو گیا تو بادشاہ غالب سے اپنے کلام پر اصلاح لینے لگے پھر جب نواب یوسف علی خاں مسند نشیں رامپور ہوئے (۱۸۵۵ء ۱۲۷۱ھ تا ۱۸۶۵ء ۱۲۸۱ھ) تو انھوں نے سو روپے ماہوار تنخواہ کر دی۔ جس زمانے میں نواب صاحب، اپنے والد کی مسند نشینی سے پہلے، دہلی میں اقامت گزیں تھے، تو ۱۸۴۰ء سے پہلے نواب صاحب نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں غالب سے فارسی پڑھی تھی۔ مسند نشین ہونے کے بعد نواب صاحب نے شاعری شروع کی اور غالب کو استاد سخن بھی بنا لیا، انہی کے مشورے سے ناظم تخلص کیا۔ غدر میں جب بادشاہ دہلی و قلعۂ شاہی سے تعلقات کے سبب سے غالب کی سرکاری پنشن بند ہو گئی تو نواب صاحب ہی کی سعی و سفارش سے تین سال بعد ۱۸۶۰ء میں پھر جاری ہوئی۔ لیکن عجیب بات ہے کہ غالب نے اس حقیقت حال کے اظہار سے اغماض کیا ہے۔ یوسف مرزا

لہ منقول از مکاتیب غالب صفحہ ۵۵

صاحب کو ان کے استفسار کے جواب میں لکھتے ہیں:۔

"والی رامپور کو اس پنسن[۵۳] کے اجرا میں کچھ دخل نہیں، یہ کام خداساز ہے بعلی ابن ابی طالب علیہ السّلام"۔

نواب کلب علی خاں رئیس رامپور (۱۸۶۵ء/۱۲۸۱ھ تا ۱۸۸۷ء/۱۳۰۴ھ) نے بھی غالب کے سو روپیہ ماہوار جاری رکھے۔ ان دونوں رئیسوں کے دربار سے تنخواہ مقررہ کے علاوہ بھی صدہا روپیہ وصول ہوتے رہے۔

وفات ۱۵؍ فروری ۱۸۶۹ء مطابق ۲؍ ذی قعدہ ۱۲۸۵ھ کو ۷۳ برس کی عمر میں انتقال کیا، اور حضرت سلطان نظام الدین اولیا قدس سرہٗ کی درگاہ میں اپنے خسر کے پائیں مزار دفن ہوئے۔ "آہ غالب بمرد" مادۂ تاریخ ہے، جس میں دس بارہ آدمیوں کو توارد ہوا، اور وہ اس وجہ سے کہ آٹھ برس پہلے خود غالب اپنی موت کی آرزو اور پیشین گوئی میں "غالبِ مُرد" (۱۲۷۷) سے تاریخ نکال چکے تھے۔ اب اس پر لفظِ آہ اور حرفِ ب کا اضافہ عامۃ الورود تھا۔

اخلاق و عادات غالبؔ، انسان، دوست، اُستاد، مربّی، مخدوم، خادم، شہری ہر حیثیت میں بے نظیر آدمی تھے۔ بہت بڑا حلقہ احباب رکھتے تھے۔ ہر شخص کے دکھ درد میں شریک تھے اور واقعی طور پر متاثر ہوتے تھے۔ خدمتِ احباب، ہمدردی، فیاضی کا یہ حال تھا کہ اپنی آمدنی اپنی ذات سے زیادہ دوسروں پر صرف کر دیتے تھے۔ اسی لیے ہمیشہ مقروض رہتے تھے۔ لیکن ہمیشہ قرض کا سخت بار محسوس کرتے تھے؛ اور جلد ادا کرنا چاہتے تھے۔ دوستوں اور شاگردوں سے خط و کتابت کا سلسلہ برابر جاری رکھتے تھے۔ ہر ایک کے ہر حال

---

۵۳ غالب پنشن کو سین سے پنسن لکھا کرتے تھے۔

سے باخبر رہنا چاہتے تھے۔ شاگردوں کے کلام پر اہتمام کے ساتھ اصلاح دیتے تھے۔ باقاعدہ جواب دینے کا ایسا التزام تھا کہ بیماری، ضعف، معذوری میں بھی لیٹے لیٹے لکھ یا لکھوا دیتے تھے۔ حد یہ ہے کہ مرنے سے ایک روز پہلے کئی پہر کے بعد بے ہوشی سے افاقہ ہوا تو نواب علاء الدین احمد خاں کو جواب خط لکھوایا، اس میں ایک فقرہ یہ بھی تھا۔ "میرا حال مجھ سے کیا پوچھتے ہو، ایک آدھ روز میں ہمسایوں سے پوچھنا۔" فراخ حوصلہ ایسے تھے کہ کسی سائل کو دروازے سے خالی نہ جانے دیتے تھے۔ ایک بار لفٹننٹ گورنر کے دربار سے سات پارچہ کا خلعت اور تین رقوم جواہر لے کر آئے، جانتے تھے کہ چپراسی اور جمعدار انعام مانگنے آئیں گے، اس لیے گھر آتے ہی خلعت و جواہر بازار بھیج دیئے۔ چپراسی آئے تو ان کو بٹھا لیا، بازار سے ان چیزوں کی قیمت آئی تو انعام دے کر رخصت کیا۔ نہایت متواضع، ملنسار، بے تعصب، زندہ دل آدمی تھے۔ ہندو مسلمانوں سے یکساں تعلق اور برتاؤ تھا۔ ان کے خطوط کے مکتوب الیہم میں منشی ہرگوپال تفتہ، ماسٹر پیارے لال آشوب، منشی بہاری لال مشتاق، بابو ہرگوبند سہائے، منشی شیو نراین وغیرہ کتنے ہندو شامل ہیں۔ منشی ہرگوپال کو مرزا تفتہ کہا کرتے تھے۔ ان کے نام ۱۲۲ خطوط ہیں اتنے کسی دوسرے کو نہیں لکھے۔

علم و فضل اور سخن فہمی

غالب کو مطالعہ کتب سے بے حد شوق تھا، لیکن کتاب خریدتے نہ تھے، کتب فروشوں سے کرایہ پر منگا کر پڑھتے تھے۔ شعر و ادب، اخلاق و تصوف، طب و حکمت، قافیہ و نجوم سے بہت دلچسپی تھی، ان علوم و فنون کو خصوصاً ادبیات و تصوف کو کثرت سے مطالعہ کیا تھا۔ اور ان میں بڑی بصیرت رکھتے تھے۔ درسیات رسمی کی تعلیم مکمل طور پر حاصل نہ کر سکے تھے۔ لیکن ان کے فہم دراک، ذہن رسا اور ذوق نقادنے اس

کمی کو پورا کر دیا تھا۔ شعرائے عجم کے کلام پر بڑا عبور رکھتے تھے۔ اسی لیے ان کے ذوقِ سلیم اور ذہن متوازن نے یہ چیلنج دے دیا تھا۔ "بیا در ید گر اینجا بود زباں دانے" اسی سبب سے اپنے اور معاصرین میں سے کسی کو فارسی و اردو میں اپنا ہم پایہ نہ گردانتے تھے۔ مومن و ذوق سے خاص کر چوٹیں چلتی تھیں۔ لیکن چونکہ حقیقی شاعر اور صحیح سخن فہم تھے، اس لیے شعر کو شاعر کی ذات سے الگ کر کے بھی دیکھ سکتے تھے۔ چنانچہ مومن و ذوق کے ان اشعار کو بے حد پسند کرتے تھے۔

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا — جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

(مومن)

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے — مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

(ذوق)

مومن کا شعر سُن کر فرمایا تھا کہ "کاش میرا سارا دیوان لے لیتا اور یہ شعر مجھے دے دیتا۔" مومن و غالب میں ایسی چشمک تھی کہ دونوں ایک مشاعرے میں شریک نہیں ہوتے تھے، پھر بھی غالب مومن کے قدردان تھے۔ مومن کے انتقال (۱۸۵۲ء) پر یہ رباعی کہی تھی۔

شرط است کہ رُوئے دل خراشم ہمہ عمر — خونابہ برُخ ز دیدہ پاشم ہمہ عمر
کافر باشم اگر بمرگ مومن — چوں کعبہ سیہ پوش نباشم ہمہ عمر

ظرافت

شوخی و ظرافت غالب کا وہ چمکتا ہوا جوہر تھا جس کی آب و تاب آج تک باقی ہے۔ ان کے خلق و عادت کی یہ خوبی ان کی تمام زندگی پر ایسی چھائی ہوئی تھی کہ بات بات میں شوخی، اور فقرے فقرے میں ظرافت تھی۔ ان کی مہر و محبت، سخا و تواضع کی اب صرف یاد ہی یاد باقی ہے، کوئی اثر و نتیجہ جاری و باقی نہیں، لیکن ان کی شوخی و ظرافت آج بھی ویسا ہی ہنساتی اور خوش کرتی ہے جیسا

ان کی زندگی میں ان کے مخاطب (مکتوب الیہ) کو خوش کرتی تھی۔ (غالب کے لطیفے "یادگار غالب" وغیرہ میں دیکھنے چاہئیں) آج کل مزاح نگاری ایک مستقل علم و فن بن گئی ہے۔ لیکن یہ سب "عقلی مزاح" ہے، اور غالب کی "فطری ظرافت" تھی۔ غالب کو اپنی اس فطرت سے بعض فائدے بھی حاصل ہوئے۔ ایک تو یہ کہ طبعی زندہ دلی کے سبب سے وہ غم و الم کو آسانی سے جھیل جاتے تھے، اور مصیبت کو ہنسی میں ٹال دیتے تھے۔ دوسرے یہ کہ ان کی بعض نازیبا باتیں "مذاق" کے پردے میں چھپ جاتی تھیں۔ تیسرے یہ کہ وہ ہنسی ہنسی میں بعض کام بنا لیتے تھے۔ ایک دن غدر کے بعد تحقیقات کے لیے غالب کرنل براؤن کے سامنے پیش ہوئے، اس نے ان کا حلیہ دیکھ کر پوچھا، "تم مسلمان ہو؟" یہ بولے "حضور آدھا۔" کرنل نے کہا "کیا مطلب؟" بولے، "شراب پیتا ہوں، سور نہیں کھاتا۔" ایک اور موقع پر کہا تھا کہ "میں نے کسی دن نماز نہیں پڑھی اور کسی دن شراب نہیں چھوڑی، پھر مجھے مسلمان کیوں سمجھتے ہیں۔" یہ باتیں اصل میں غالب نے جان و آبرو بچانے کے لیے ڈر سے کہی تھیں، لیکن شوخی و ظرافت کے رنگ میں کہیں، اور واقعہ بھی یہی تھا، اس لیے ان کا نازیبا ہونا مخفی و غیر محسوس رہا۔

شراب و کباب غالب شراب پیتے تھے، لیکن اس عیب کو چھپاتے نہ تھے، علانیہ پیتے تھے، اور اس گناہ کا احساس رکھتے تھے آم کا بے حد شوق تھا۔ آموں کی کسی نے صفت پوچھی تو کہا، "بہت ہوں اور میٹھے ہوں۔" کھانے میں شامی کباب خاص طور پر پسند تھے۔ جب اور کچھ نہ کھا سکتے تھے تب بھی کباب ضرور کھاتے تھے۔ ان تینوں چیزوں کا اپنے خطوط میں بار بار ذکر کیا ہے۔

بعض عجیب باتیں غالب کے حالات میں بعض ایسی باتیں پائی جاتی ہیں جو

ان کے اخلاق سے تخالف رکھتی ہیں۔ غالب غیور تھے، خود دار تھے، جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا کہ دہلی کالج کی ملازمت کا ارادہ اپنے معیارِ عزت کو پیش نظر رکھ کر، ترک کر دیا، اور سو روپیہ ماہوار کی آمدنی سے قطع نظر کر لی لیکن دوسرے موقعوں پر تحصیل زر کی جد و جہد اور الحاح و زاری میں کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھا۔ غدر سے پہلے پنشن کے اضافہ کے لیے کلکتہ کا سفر کیا، اور انگریز حکام کی مدح میں فارسی قصیدے کہے یہ کوشش نامناسب نہ تھی، لیکن قصیدہ خوانی، اور اس حد تک عجیب تھی۔

پھر غدر کے بعد جب پنشن بند ہو گئی، تو اس کو جاری کرانے اور دربار و خلعت کو بحال کرانے کی خاطر مدح خوانی و قصیدہ سرائی کی کوئی حد نہ رکھی۔ ملکہ وکٹوریا، گورنر جنرل وائسرائے، لفٹنٹ گورنر، کمشنر وغیرہ کوئی انگریز حاکم، جس کو پنشن کے معاملے سے ذرا سا بھی تعلق تھا، ایسا نہ رہا جس کی تعریف میں قصیدہ یا قطعہ نہ کہا ہو، دونوں موقعوں کے لیے فارسی کے ۲۵ قصیدے اور قطعے کہے ہیں۔ اس کے علاوہ اپنے خطوط میں پنشن بند ہونے کی حسرت، اجرا کی ضرورت، آرزو، توقع، انتظار، بیقراری کے جذبات جیسے اور جتنے جابجا ظاہر کئے ہیں، وہ بجائے خود عجیب و دلچسپ ہیں۔ غالب کے قدیم مجموعات خطوط میں بھی یہ مضامین ہیں، لیکن اب "مکاتیب غالب" یعنی رئیسان رامپور کے نام غالب کے خطوط شائع ہو جانے سے ان واقعات پر اور زیادہ روشنی پڑ رہی ہے۔ طرفہ تر یہ کہ غالب اجرائے پنشن کے لیے نواب یوسف علی خاں صاحب بہادر سے سفارش چاہتے ہیں۔ نواب صاحب اپنے استاد کی تعمیل ارشاد کرتے ہیں، اور غالب کو اطمینان دلانے کے لیے لکھتے ہیں کہ "ہنگام ملاقات کے اکثر صاحبان ذی شان سے تذکار محامد اوصاف ذاتی اور صفاتی آپ کا عمل میں آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل اور قدردانی سرکار دولت مدار سے یقین واثق ہے کہ جو مدارج شریف آپ کے قدیم سے ہیں

پیش گاہ گورنمنٹ سے بھی اسی مطابق ظہور میں آوے گا۔" جب پنشن جاری ہونے کا حکم آتا ہے تو غالب جانتے ہیں کہ اس کامیابی میں نواب صاحب کی کوشش وسفارش شامل ہے۔ اور ایک خط میں نواب صاحب سے اس کا اقرار بھی کرتے ہیں: "جس طرح عالم شہادت میں آپ میری دستگیری کر رہے ہیں، عالم غیب میں آپ کا اقبال مجکو مدد پہنچا رہا ہے۔" لیکن پنشن وصول ہونے کے بعد جب لوگ ان سے یہ بات پوچھتے ہیں تو صاف لکھ دیتے ہیں کہ "والی رامپور کو اس پنشن کے اجرا میں کچھ دخل نہیں۔"

"مکاتیب غالب" کی اشاعت نے غالب کی سیرت کا ایک نیا باب کھول دیا ہے، یا جو باب پہلے مجمل تھا، اب اس کی شرح شائع کر دی ہے۔ غالب کے دوستوں میں بعض روسا، و جاگیردار بھی تھے۔ اور وہ ہمیشہ ہر موقع پر امداد کرتے رہتے تھے، لیکن ان میں سے نواب ضیاء الدین خاں اور نواب علاء الدین خاں بھی، جن سے خاص الخاص مراسم و تعلقات تھے، ایسے نہ تھے کہ بے تحاشا دیتے، اور غالب کی ضرورتیں اسی کی متقاضی تھیں خوبی تقدیر سے نواب یوسف علی خاں اور نواب کلب علی خاں رئیس رامپور یکے بعد دیگرے ایسے قدر دان مل گئے جو اپنے آپ کو ان کا شاگرد سمجھتے تھے، اور اس قدر عزت کرتے تھے کہ اس سے زیادہ تصور میں نہیں آسکتی۔ ان بزرگوں سے طلب زر کے لیے غالب کی الحاح والتجا، اور حسن طلب یا تیج سوال کے اسالیب و تراکیب، عجائب فطرت بھی ہیں، اور نوادر ادبیت بھی۔ ان سے لطف اندوز ہونے کے لیے مکاتیب غالب کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ یہاں مثالاً بعض فقرے نقل کئے جاتے ہیں۔

نواب یوسف علی خاں بہادر کو لکھتے ہیں۔

(۱) "سو روپیہ کی ہنڈوی بابت مصارف ماہ نومبر ۱۸۵۹ء پہنچی، اور روپیہ وصول میں آیا، اور صرف ہو گیا اور میں بدستور بھوکا اور ننگا رہا۔ تم سے نہ

کہوں تو کس سے کہوں۔ اس مشاہرہ مقرری کے علاوہ دو سو روپیہ اگر مجکو اور بھیج دیجئے گا تو جلا لیجئے گا، لیکن اس شرط سے کہ اس عطیۂ مقرری میں محسوب نہ ہو اور بہت جلد مرحمت ہو۔"

(۲) یہ تحریر نہیں مکالمہ ہے۔ گستاخی معاف کروا کے اور آپ سے اجازت لے کے بطریق انبساط عرض کرتا ہوں کہ سوا سو روپیے[۱] جو تورۂ خلعت کے نام سے مرحمت ہوئے ہیں، میں کال کا مارا اگر یہ سب روپیہ کھا جاؤں گا اور اس میں لباس نہ بناؤں گا تو میرا خلعت حضور پر باقی رہے گا یا نہیں۔"

نواب کلب علی خاں بہادر کو لکھتے ہیں:۔

(۱) "پیر و مرشد! حضرت فردوس مکان (یعنی نواب یوسف علی خاں) کا دستور تھا کہ جب میں قصیدہ بھیجتا، اس کی رسید میں خط تحسین و آفرین کا، شرم آتی ہے کہتے ہوئے مگر کہے بغیر نہیں بنتی، دو سو پچاس کی ہنڈی اس خط میں ملفوف عطا ہوا کرتی تھی۔ یہ رسم بری نہیں ہے، اگر جاری رہے تو بہتر ہے۔"

(۲) "حضور ملک و مال جس کو جس قدر چاہیں عطا کر سکتے ہیں، میں آپ سے صرف راحت مانگتا ہوں، اور راحت منحصر اس میں ہے کہ قرض باقی ماندہ ادا ہو جائے، اور آئندہ قرض لینے کی حاجت نہ پڑے۔"

(۳) "ماہ صیام میں سلاطین و امرا خیرات کیا کرتے ہیں۔ اگر حسین[۲] علی خاں یتیم کی

---

[۱] نواب صاحب نے اپنے چھوٹے لڑکے صاحبزادہ حیدر علی خاں کی شادی کے موقع پر ۱۲۵ روپیہ تورہ دخلعت کے بجائے بھیجے تھے۔

[۲] زین العابدین خاں عارف کا چھوٹا لڑکا۔ غالب نے اس کے باپ کے انتقال کے بعد اس کو متبنیٰ بنا لیا تھا۔ حسین علی خاں غالب کی وفات کے بعد ریاست رامپور میں ملازم دربار ہو گئے تھے۔

شادی اسی مہینے میں ہو جائے، اور اس بڈھے اپاہج فقیر کو روپیہ مل جائے، تو اس مہینے میں تیاری ہو رہے۔"

ان محسنانِ رامپور کی شان میں قصیدے تو چار پانچ بھی نہیں، اور یہ مکتوبات کی مدح خوانیاں کثیر و طویل ہیں۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی دلچسپ ہے کہ غالب نواب خلد آشیاں (نواب کلب علی خاں) کے دعوت نامہ پر اکتوبر ۱۸۶۵ء میں رام پور پہنچے۔ نواب صاحب نے ۷ نومبر کو ایک ہزار روپیہ عطا کیے۔ ۲۸ نومبر کو غالب مرزا تفتہ (منشی ہرگوپال) کو رامپور سے خط لکھتے ہیں، لیکن اس عطیہ کا ذکر نہیں کرتے بلکہ مزید بخشش کی آرزو لکھتے ہیں۔ فرماتے ہیں:۔

"میں نثر کی داد اور نظم کا صلہ مانگنے نہیں آیا، بھیک مانگنے آیا ہوں۔ روٹی اپنی گرہ سے نہیں کھاتا، سرکار سے ملتی ہے۔ وقتِ رخصت میری قسمت اللہ منعم کی ہمت۔"

دسمبر میں نواب صاحب نے دو سو روپیہ زادِ راہ کے لیے مرحمت کر دیے۔

غالب میں یہ بات بھی بڑی دلچسپ تھی کہ کسی ہندوستانی کی فارسی دانی کے قائل نہ تھے، خصوصاً اپنے زمانے کے اور اپنے زمانے سے قریب کے شعرا اور مصنفین فارسی کو تو بالکل ہیچ و پوچ سمجھتے تھے۔ ان میں بھی ہندو اہلِ قلم سے نہایت بیزار تھے۔ خاص کر جب خود ان کے مقابلے میں کسی ہندی یا ہندو کا نام کوئی شخص لیتا تھا تو جل جاتے تھے، اور بڑی تحقیر سے اس کا ذکر کرتے تھے۔ مرزا قتیل، مولوی غیاث الدین مصنف غیاث اللغات وغیرہ سب کو نالائق سمجھتے تھے۔ مولوی محمد حسین برہانی تبریزی کی "برہانِ قاطع" کی قطع و برید کا تو ایک ہنگامہ برپا کیا۔ بعض اور فرہنگ نویسوں کے متعلق نواب خلد آشیاں کو لکھتے ہیں:۔

میاں انجو جامع فرہنگ جہانگیری، شیخ رشید راقم فرہنگ رشیدی، عظمائے

عجم میں سے نہیں، ہند ان کا مولد، ماخذ ان کا اشعار قدما، اور ان کا قیاس
ٹیک چند اور سیالکوٹی مل الہ سکھ بیرد، سبحان اللہ! ہندی بھی اور ہندو
بھی۔ نورٌ علیٰ نور

مولوی امام بخش صہبائی غالب کے ہم عصر اور دوست تھے اور فارسی کے بڑے مشہور و مستند فاضل تھے غالب ان کو بھی کچھ نہ سمجھتے تھے۔ "برہانِ قاطع" کی غلطیاں ثابت کرنے کے لیے غالب نے "قاطع برہان" لکھی۔ غالب کے جواب میں کسی شخص نے "ساطع برہان" شائع کی۔ اس کے مصنف رحیم بیگ کے متعلق غالب لکھتے ہیں (رشیاح دشا کہ کے نام کے خطوط کا یہ اقتباس ہے)۔

وہ جو ایک اور کتاب کا تم نے ذکر لکھا ہے، وہ ایک لڑکے پڑھانے والے مُلّائے مکتب دار کا خبط ہے رحیم بیگ اس کا نام، میرٹھ کا رہنے والا، کئی برس سے اندھا ہو گیا ہے، باوجود نابینائی کے احمق بھی ہے۔...... کتاب پڑھ نہیں سکتا، سُن لیتا ہے، عبارت لکھ نہیں سکتا، لکھوا دیتا ہے، بلکہ اس کے ہم وطن ایسا کہتے ہیں کہ وہ قوت علمی بھی نہیں رکھتا اوروں سے مدد لیتا ہے۔ اہلِ دہلی کہتے ہیں کہ مولوی الہی بخش صہبائی سے اس کو تلمذ نہیں ہے، اپنا اعتبار بڑھانے کو اپنے کو ان کا شاگرد بتاتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ وائے اس اپج پوچ پر جس کو صہبائی کا تلمذ موجب عزّ و وقار ہو[۵۲]

اسی کتاب کی بحث کے سلسلے میں ایک اور جگہ غالب نے مولانا صہبائی پر اس سے زیادہ سخت حملہ کیا ہے۔ مرزا رحیم بیگ مصنف "ساطع برہان" کو ایک رقعہ

---

[۵۱] اُردوئے معلّیٰ (مجموعہ رقعات غالب)، بحوالہ مکاتیب غالب
[۵۲] عود ہندی (مجموعہ رقعات غالب)

(مطبوعہ عود ہندی) میں لکھتے ہیں:-

"یہ جو آپ نے مولوی امام بخش کو "امام المحققین" خطاب دیا ہے، کتنے محققین نے آپ کو (یعنی مولوی امام بخش کو) اپنا امام مان لیا ہے ؟ ...... اگر حضرت (یعنی رحیم بیگ) بفتحۂ قافِ ثانی بصیغۂ تثنیہ امام المحققین کہتے، تو ایک امام (پیر امام) آپ، اور نرائن داس تنبولی دوسرا ہوتا۔"

غالب کا مقصود یہ ہے کہ امام بخش صہبائی سب محققوں کے امام تو ہو نہیں سکتے۔ دو محققوں کے امام ہو سکتے ہیں، ایک رحیم بیگ کے، دوسرے نرائن داس تنبولی کے۔ صہبائی اس زمانے میں زندہ نہ تھے ورنہ ان فقروں کا مزہ لیتے۔

غالب کا مذہب

بیسویں صدی سے پہلے اہل ہند کی ذہنیت ایسی نہ تھی کہ تذکرہ و تاریخ میں کسی مشہور شخص یا شاعر و مصنف کے مذہب و عقائد کے متعلق بحث روا رکھی جاتی۔ لیکن عصر حاضر میں تقلید فرنگ اور تحقیق و تنقید کے رواج نے اس کی اجازت دے دی ہے۔ اہل یورپ اپنے مشاہیر کے متعلق ذرا ذرا سی بات کی کرید کرتے ہیں۔ اور صفحے کے صفحے لکھ ڈالتے ہیں۔ اسی طرح عقائد و رجحاناتِ مذہبی کے ایک ایک پہلو کو روشن کرتے ہیں۔ اور یہ محض علمی تحقیقات ہوتی ہے۔ عناد و فساد مقصود نہیں ہوتا۔ غالب کے مذہب پر بھی اسی طرح نظر ڈالنی چاہیے۔ ان کے لیے اپنا پسندیدہ مذہب ثابت کرنے کی کوشش تاریخی و علمی نظر میں غیر مستحسن ہے۔ ان کا کوئی مذہب ثابت ہو یا کوئی مذہب بھی ثابت نہ ہو، مورخ و نقاد یا شاعر و ادیب کے نزدیک ان کا پایۂ کمال غیر متزلزل رہنا چاہیے۔ غالب کے متعلق اس زمانے میں اس امر خاص پر بھی بحثیں ہوئی ہیں اور مختلف مضامین رسائل میں شائع ہوئے ہیں، اور وہ ہمارے پیش نظر ہیں۔ تاریخ و تذکرہ اور تنقید و تبصرہ کے ذریعہ سے لوگوں نے غالب کے لیے مختلف عقائد ثابت کیے ہیں، یعنی تفضیلی، مائل

بہ تشیّع، شیعہ، شیعہ غالی، نصیری، صوفی، چشتی و نظامی، اور بیدین ولا مذہب۔ اور ان عقائد کے لیے خود غالب یا غالب کے دیکھنے والوں کے بیانات دلیلوں میں لائے گئے ہیں۔ تفصیل کی گنجائش نہیں، مختصر طور پر ہماری رائے اور تحقیق یہ ہے۔

غالب کو بیدین ولا مذہب ان کے مختلف و متضاد اقوال کی بنا پر کہا گیا ہے، کہ کبھی نصیری ہونے کا دعوے کرتے ہیں، کبھی شیعہ ہونے سے بھی انکار ہے کبھی اپنے آپ کو صوفی صافی بتاتے ہیں۔ کبھی خلفا سے راشدین سے بھی بیزار ہیں۔ جس کا ایسا مذہب ہو، اس کا کوئی مذہب نہیں۔ لیکن غالب پر یہ الزام لگانا انتہا درجہ کی جسارت اور محض عناد ہے۔ یاد رکھنا چاہئے کہ غالب شاعر بھی تھے اور ظریف بھی، دنیادار بھی تھے اور رند مشرب بھی۔ ایسا شخص جیسا موقع دیکھتا اور ضرورت سمجھتا ہے کبھی بطریق انبساط، کبھی بطرز شاعری، کبھی بتقاضائے بشریت جو چاہتا ہے کہہ دیتا ہے، لیکن وہ اس کے صحیح خیالات اور اصلی معتقدات نہیں ہوتے۔ اگر اس طرح کے مواقع و اقوال کی گرفت کی جائے تو نماز روزے کے لطیفوں پر ہی غالب کو کافر کہا جاسکتا ہے۔ لیکن یہ فتوائے کفر فتور عقل کا ثبوت ہوگا۔ اسی طرح اگر غالب نے یہ کہا۔

منصورِ فرقۂ اسداللّٰہیاں منم   آوازۂ "انا اسد اللّٰہ" برآورم

تو اس کو دعوائے نصیریت سے کچھ تعلق نہیں۔ یہ مضمون ایسا سوجھا اور اس میں انا اسد اللّٰہ ایسا معنی خیز تھا، کہ اگر اس سے شرک جلی بھی لازم آتا تو غالب کہنے سے باز نہ رہتے، اور بیشک کہنا چاہئے تھا۔ ایسے شعر اتفاق سے پیدا ہو جاتے ہیں کہ نوادر شاعری میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ "صوفی" ہونے کا غالب نے بارہا دعوی کیا ہے، اور اپنے آپ کو چشتی نظامی بھی بتایا ہے، یعنی لکھا ہے:۔

"شاہ محمد اعظم صاحب خلیفہ تھے مولانا فخرالدین صاحب کے، اور میں مرید

ہوں اسی خاندان کا۔"

مولانا فخر الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ حضرت سلطان المشائخ نظام الدین اولیا قدس سرہٗ کے سلسلہ چشتیہ نظامیہ کے بزرگ تھے۔ غالب کے آبا و اجداد سب سنّی تھے، ان کی بیوی سنّی تھیں، ان کی سسرال والے (جاگیرداران لوہارو) سنّی تھے۔ اور ان میں سے اکثر اسی خاندان کے مرید و معتقد تھے۔ اس لیے غالب بھی اسی خاندان کے مرید ہوں تو عجب نہیں۔ لیکن غالب کا اپنے آپ کو صوفی صافی کہنا اصطلاحی معنوں میں نہ تھا، بلکہ بطور محاورہ تھا، "ولی اللہ" ہونے کا دعویٰ نہ تھا، بلکہ یہ مقصود تھا کہ :-

"آزادہ رَو ہوں اور مرا مسلک ہے صلح کُل"

غالب نے تصوف کا کثرت سے مطالعہ کیا تھا، اس کے مسائل ذہن نشین تھے، اصطلاحیں برزبان تھیں، باتیں کرنے اور باتیں بنانے کا بہت شوق تھا، سخن آرائی اور سخن پروری کی بڑی مشق تھی۔ اسی کا اثر ان کی باتوں اور ان کی شاعری سے نمایاں ہے فارسی و اردو کلام میں تصوف کے مسائل بہت لکھے ہیں، لیکن ان میں تصوّف کی زبان ہے، صوفی کا دل نہیں۔ خواجہ میر درد اور غالب کے متصوفانہ کلام کا مقابلہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ درد دل سے کہتے ہیں، اور غالب زبان سے۔ درد اُس عالم میں پہنچے ہوئے ہیں، اور غالب کو وہاں کی ہوا بھی نہیں لگی۔ غالب "حقیقتِ حقہ وحدتِ وجود" کے بڑے قائل ہیں، اور فرماتے ہیں کہ :-

"زبان سے لا الٰہ الا اللہ کہتا ہوں اور دل میں لا موجود الا اللہ، لا موثر فی الوجود الا اللہ سمجھے ہوئے ہوں۔"

لیکن یہ کہنا کسی صاحب حال کا سا کہنا نہ تھا۔ بلکہ ایسا تھا کہ

"بڑھا بھی دیتے ہیں کچھ زیبِ داستاں کے لئے"

غالب کے مذہب کے متعلق مولانا حالی لکھتے ہیں:۔

"مگر زیادہ تر ان کا میلان طبع تشیع کی طرف پایا جاتا تھا اور جناب امیر کو رسولِ خدا کے بعد تمام امت سے افضل جانتے تھے"

مولانا آزاد دہلوی (صاحب آبِ حیات) کی رائے ہے:۔

"مگر اہل راز اور تصنیفات سے یہی ثابت ہے کہ ان کا مذہب شیعہ تھا اور لطف یہ تھا کہ ظہور اس کا جوش محبت میں تھا، نہ کہ تبرا و تکرار میں"

لیکن غالب کا ایک فقرہ اس سے زیادہ کا بھی پتہ دیتا ہے، فرماتے ہیں:۔

"مشرک وہ ہیں جو وجود کو واجب و ممکن میں مشترک جانتے ہیں، مشرک وہ ہیں جو مسیلمہ کو نبوت میں ختم المرسلینؐ کا شریک گردانتے ہیں، مشرک وہ جو نو مسلموں کو ابو الائمہ کا ہمسر جانتے ہیں"

"ابو الائمہ" سے مراد حضرت علی کرم اللہ وجہہ ہیں اور جن بزرگوں کو حضرت علی کا ہمسر مانا جاتا ہے ان کو "نو مسلم" کہا ہے، اور جو لوگ مانتے ہیں ان کو "مشرک" ٹھہرایا ہے۔

تصانیف فارسی غالب نے آخری بادشاہِ دہلی بہادر شاہ ظفر کے حکم سے ۱۸۵۰ء/۱۲۶۶ھ میں خاندان تیمور کی تاریخ لکھنی شروع کی۔ اس کتاب کا نام "پرتوستان" تجویز کیا تھا۔ لیکن پہلا حصہ تمام ہوا تھا کہ غدر ہو گیا۔ یہ حصہ مہر نیم روز کے نام سے شائع ہو گیا ہے۔ اس میں تیمور سے ہمایوں بادشاہ تک کے حالات ہیں۔ دوسرے حصہ میں اکبر بادشاہ سے بہادر شاہ ظفر تک کی تاریخ ہوتی، لیکن لکھنے کا موقع نہ ملا۔ اس حصے کا نام غالب نے "ماہِ نیم ماہ" تجویز کیا تھا۔ اس ترکیب پر ان کو بڑا ناز تھا۔ دوسرے "رستخیز بیجا" پر بہت فخر کرتے

تھے۔ یہ ہنگامۂ غدر کا مادۂ تاریخ ہے، اور بے شک بے مثل ہے[1] (۲) دستنبو، اس میں غدر کا حال لکھا ہے۔ خود غالب کا بیان یہ ہے۔ "گیارھویں مئی ۱۸۵۷ء سے یکم جولائی ۱۸۵۸ء تک کی روداد نثر میں بہ عبارتِ فارسی ناآمیختہ بہ عربی لکھی ہے۔ دستنبو اس کا نام رکھا ہے۔ اور اس میں صرف اپنی سرگذشت اور اپنے مشاہدے کے بیان سے کام رکھا ہے" (۳) پنج آہنگ میں فارسی انشار پردازی کے نمونے ہیں (۴) کلیاتِ نظم غالب، بقول غالب "ایک فارسی دیوان دس ہزار کئی سو بیت کا ہے۔" اس میں قصائد، غزلیات، قطعات، رباعیات، سب کچھ ہے (۵) سبد چین میں چند فارسی قصائد و غزلیات و رقعات ہیں۔

(۶) قاطع برہان میں "برہانِ قاطع" مصنفہ مولوی محمد حسین برہان تبریزی کے اغلاط ثابت کئے ہیں۔ بعد کو اس میں اضافہ کیا اور اس کا نام درفشِ کاویانی رکھا۔

اردو تصانیف

(۱) عودِ ہندی، رقعات غالب کا پہلا مجموعہ غالب کی زندگی میں، وفات سے چار مہینے پہلے اکتوبر ۱۸۶۸ء (رجب ۱۲۸۵ھ) میں پہلی مرتبہ مطبع مجتبائی میرٹھ سے شائع ہوا۔ اس میں ۱۶۲ رقعات ہیں اور ان کے علاوہ غالب کی لکھی ہوئی دو کتابوں کی تقریظیں اور تین کتابوں کے دیباچے بھی

---

[1] "رستخیز بیجا" تخرجہ کے ساتھ تاریخ ہے۔ تخرجہ کا عیب جن تاریخی مادوں میں حسن بن گیا ہے ان میں سے ایک یہ بھی ہے۔ رستخیز کے اعداد (۱۲۷۷) ہیں۔ ان میں سے (جا) کے چار عدد نکالے جائیں تو ۱۲۷۳ھ پیدا ہوتے ہیں، یہی غدر کا سال ہے "بیجا" کہہ کر تخرجہ (تفریق) کی طرف اشارہ کیا ہے۔ "رستخیز بیجا" (یعنی بے محل قیامت) غدر کے لیے کس قدر موزوں لفظ ہے۔ غالب کی دوسری تاریخ "غدر ہندی" ۱۲۷۳ھ بھی خوب ہے۔ لیکن پہلی اس سے بھی بہتر ہے۔

شامل ہیں۔

(۲) اُردوئے معلّٰی حصّہ اوّل دوسرا مجموعہ خطوط، غالب کے انتقال سے ۱۹ روز بعد ۶، مارچ ۱۸۶۹ء مطابق ۲۱، ذیقعدہ ۱۲۸۵ھ روز جمعہ کو مطبع اکمل المطابع دہلی میں چھپ کر تیار ہوا۔ غالب کے شاگرد مرزا قربان علی سالک نے سال طبع لکھا۔

"آج اردو کا سخن تمام ہوا" اس میں ۴۴۶ صفحے اور ۲۷۴ خطوط ہیں۔
۱۲۸۵

(۳) اُردوئے معلّٰی حصّہ دوم، ۱۸۹۹ء میں مطبع مجتبائی دہلی سے شائع ہوا۔ اس کے ساتھ ہی حصّہ اوّل بھی تھا جو پہلے بھی چھپ چکا تھا۔ حصّہ دوم پہلی مرتبہ چھپا تھا۔ اس کے متعلق مولوی عبدالاحد مالک مطبع نے لکھا ہے کہ "اس حصہ میں خاص کر وہ رقعات ہیں جن میں انھوں نے (مرزا غالب نے) لوگوں کو اصلاحیں دی ہیں، یا شاعری کے متعلق کوئی ہدایت کی ہے، یا کوئی نکتہ بتایا ہے، اور بعض کتابوں کے دیباچے اور ریویو بھی ہیں" اس میں ۵۶ صفحے اور ۵۳ رقعے ہیں۔ اس کے بعد ۱۹۲۹ء میں جب شیخ مبارک علی تاجر کتب لاہور نے اردوے معلّٰی کے دونوں حصّے یک جا شائع کئے تو آخر میں ایک ضمیمہ بھی شامل کر دیا جس میں غیر شائع شدہ ۲۳ خطوط ہیں۔

(۴) مکاتیب غالب، آخری مجموعہ خطوط ہے۔ جس میں نواب یوسف علی خاں بہادر اور نواب کلب علی خاں بہادر فرماں روایان رامپور کے نام غالب کے ۱۱۵ مکتوبات ہیں۔ یہ مجموعہ نہایت خوبصورت ٹائپ میں بہترین طباعت کے ساتھ ریاست کی جانب سے ۱۹۳۷ء میں شائع ہوا ہے۔ منشی امتیاز علی صاحب عرشی ناظم کتب خانۂ سرکاری نے ۱۸۱ صفحوں کا دیباچہ لکھا ہے، جس میں ان خطوط کی مدد سے غالب کے حالات پر مزید روشنی ڈالی ہے۔ یہ رقعے ادبی اعتبار

ہے کچھ زیادہ وقیع نہیں ہیں۔ درجنوں رقعے صرف چار چار یا پانچ پانچ سطروں کے ہیں جن میں تنخواہ ماہانہ کی ہنڈی (یا بقول غالب ہنڈوی) کی رسیدیں ہیں۔ پھر بھی کہیں کہیں کوئی ادبی یا علمی بات بھی آ گئی ہے۔ یا کوئی قطعہ یا تاریخ شامل ہے، جو اب تک شائع نہ ہوا تھا۔ غالب کا مخصوص اسلوب نگارش سب میں ہے، اور ظرافت اکثر میں۔ اس لیے یہ مجموعہ بھی تبرکات غالب میں شامل ہے۔

(۵-۶-۷) لطائف غیبی، تیغ تیز، نامہ غالب، یہ تینوں رسالے "قاطع برہان" کے مخالفوں کے جواب میں لکھے ہیں۔

(۸) رقعاتِ غالب کے اور بھی کئی مجموعے بعد میں شائع ہوئے۔ جن میں منشی مہیش پرشاد اور مولانا مہر کے مرتب کردہ مکاتیب زیادہ اہم ہیں۔

غالب کا اسلوب تحریر

تقریظوں اور دیباچوں میں غالب نے تحریر کا طرز وہی رکھا ہے جو خود اُن کتابوں کا ہے یا جو اُس زمانے میں مقبول و رائج تھا یعنی قافیہ پیمائی اور عبارت آرائی۔ بقول مولانا حالی کے، "مرزا کو اس میں معذور سمجھنا چاہئے۔ جو لوگ تقریظوں اور دیباچوں کی زمائش کرتے تھے۔ وہ بغیر ان تکلفات باردہ کے ہرگز خوش ہونے والے نہ تھے۔ جو طریقہ اس زمانہ میں ریویو لکھنے کا نکلا ہے۔ اس کو اب بھی بہت کم لوگ پسند کرتے ہیں، اور مرزا کے وقت میں تو اس کا کہیں نام و نشان بھی نہ تھا۔" اگرچہ ان تحریروں میں کوئی جدت و ندرت نہیں، تاہم غالب کی یادگاریں ہیں۔ اس لیے دو تین تحریروں کے چند فقرے نقل کیے جاتے ہیں۔

۱۔ مرزا حاتم علی مہر کی مثنوی کی تقریظ:۔

"یہ مثنوی کہ مجموعہ دانش و آگہی ہے، اگرچہ اس کو سفینہ کہہ سکتے ہیں، لیکن فی الحقیقت ایک نہر ہے کہ بحر سخن سے ادھر کو بہی ہے۔ سخن ایک معشوقۂ پری پیکر

ہے، تقطیع شعر اس کا لباس اور مضامین اس کا زیور ہے۔ دیدہ وروں نے شاہد سخن کو اس لباس اور اس زیور میں رد کش ماہ تمام پایا ہے، اسی رو سے اس مثنوی نے شعاع مہر نام پایا ہے۔ لیکن یہ نہ سمجھنا کہ یہاں مہر سے مراد آفتاب ہے۔ یہ شعاع اس مہر کی ہے کہ جو ذرہ خاک کو بیضۂ ید کہ سچ تو یوں ہے کہ سخنور روشن ضمیر مہر چہر، مرزا حاتم علی مہر کو سخن طرازی میں ید بیضا ہے۔"

۲- گلزار سرور مصنفہ مرزا رجب علی بیگ سرور کی تقریظ:-

مجھ کو دعویٰ تھا کہ انداز بیان کی خوبی میں فسانۂ عجائب بے نظیر ہے، جس نے میرے دعویٰ کو اور "فسانۂ عجائب" کی یکتائی کو مٹا دیا وہ یہ تحریر ہے۔ کیا ہوا کہ ایک طرح اور ایک تماشے کے ہیں، یہ دونوں دلفریب نقش ایک ہی نقاش کے ہیں۔ مانا کہ ایک دوسرے کا ثانی ہے، یہ تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ نقاش لاثانی ہے۔ مانی نقاش بے معنی صورتیں بنا کر دعویٰ پیمبری کا کرے کیا عقل کی کمی ہے۔ یہ بندۂ خدا معنی کی تصویر کھینچ کر دعویٰ خدائی نہ کرے کس حوصلہ کا آدمی ہے۔"

۳- حدائق الانظار تالیف خواجہ بدرالدین خاں کا دیباچہ:-

"دریں ولا میرا برادرزادہ سعادت تواماں، خواجہ بدرالدین خاں عرف خواجہ اماں، کہ وہ ایک جوان شیریں بیان تیز ہوش ہے، اور ہر فن کی تحصیل میں سخت کوش ہے۔ ستار کا جو خیال ہوا، ایسا بجایا کہ میاں تان سین کو انگلیوں پر نچایا، مصوری کی طرف جو طبیعت آئی، وہ تصویر کھینچی کہ اس کو دیکھ کر مانی و بہزاد کو حیرت آئی۔ اس اقبال آثار کا یہ ارادہ ہوا، "معزنا" کی فارسی نثر کے اردو کرنے پر آمادہ ہوا... بعد اختتام نگارش غالب

فلک زدہ سے دیباچہ لکھنے کی آرزو کی، میں نے ہر چند عجز آمیز معذرت انگیز گفتگو کی، بیداد گر نے ایک بات نہ سُنی، اور ایک عذر نہ مانا۔ بھلا اس اصرار کا کیا علاج اور اس ضد کا کیا ٹھکانا۔ بھتیجا اور پیارا بھتیجا، ناچار بجز خامہ فرسائی کچھ بن نہ آئی۔"

۴۔ سراج المعرفت کا دیباچہ :-

اس کے متعلق مولانا حالی لکھتے ہیں کہ "ان میں سے بعض نثریں مرزا کی روش خاص میں نہایت ممتاز ہیں، خصوصاً وہ دیباچہ جو انھوں نے مفتی میرلال کی کتاب "سراج المعرفت" پر لکھا ہے۔ اس میں جس خوبی اور متانت سے تصوف کے اعلیٰ خیالات ظاہر کئے ہیں، اس کے لحاظ سے کہا جاسکتا ہے کہ اردو زبان میں تصوف کے اعلیٰ خیالات نہ اس سے پہلے اور نہ اس کے بعد ایسی عمدہ نثر میں کسی نے لکھے۔"

اس دیباچہ کا مختصر نمونہ یہ ہے :-

"حق یوں ہے کہ حقیقت از روے مثال ایک نامۂ درہم پیچیدہ سربستہ ہے کہ جس کے عنوان پر لکھا ہے۔ لا موجود فی الوجود الا اللہ، اور خط میں مندرج ہے لا موجود الا اللہ، اور اس خط کا لانے والا اور اس راز کا بتانے والا، وہ نامہ آور اور نام آور کہ جس پر رسالت ختم ہوئی ختم نبوت کی حقیقت اور اس معنی غامض کی صورت یہ ہے کہ مراتب توحید چار ہیں، آثاری، افعالی، صفاتی، ذاتی۔ انبیائے پیشین صلوات اللہ علیٰ نبینا و علیہم اعلان مدارج سہ گانہ پر مامور تھے۔ خاتم الانبیا کو حکم ہوا کہ حجاب تعینات اعتباری اٹھادیں۔ اور حقیقت بیرنگی ذات کو صورت الآن کما کان میں دکھادیں۔ اب گنجینۂ معرفت، خواص امت محمدی کا سینہ ہے، اور کلمہ لا الٰہ الا اللہ مفتاح باب گنجینہ ہے۔ زہے عامۂ مومنین کہ وہ اس کلام سے صرف نفی شرک

فی العبادۃ مراد لیتے ہیں، اور نفی شرک فی الوجود، جو اصل مقصود ہے، ان کی نظر پر نہیں۔ مگر جب لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللہِ کہیں گے، اسی توحید ذاتی کے اعتقاد کی قدم گاہ پر آرہیں گے یعنی ہماری اس کلمہ سے وہ مراد ہے جو خاتم الرسل کا مقصود تھا، یہی حقیقت ہے شفاعت محمدی کی، اور یہی معنی ہیں رحمۃ للعالمین ہونے کے، اور اسی مقام سے ناشی ہے ندائے روح افزائے من قال لا الٰہ الا اللہ دخل الجنۃ.......۔

جب اولیاء اللہ نے، کہ وہ اطبار روحانی ہیں، دیکھا کہ نفوس بشری پر وہم غالب ہے، اور بسبب استیلاء وہم کے مشاہدۂ وحدت ذات سے محروم رہ جاتے ہیں، ہر چند ان کو سمجھائیں گے، راہ پر نہ آئیں گے ناچار اشغال واذکار وضع کئے۔ تاکہ قوتِ تخیلہ اس میں الجھی رہے۔ اور رفتہ رفتہ بیخودی طاری ہو جاوے۔ وحدت وجود اس طرح کی بات تو نہیں کہ نہ ہو، اور ہم اس کو بجبر یا بہ تکلف ثابت کیا چاہتے ہوں۔ ع

دانی ہمہ اوست ورندانی ہمہ اوست

وہم صورت گری اور پیکر تراشی کر رہا ہے اور معدومات کو موجود سمجھ رہا ہے۔ پس جب وہ وہم شغل وذکر کی طرف مشغول ہو گیا بے شبہ اپنے کلام سے یعنی صورت گری اور پیکر تراشی سے معزول ہو گیا۔ بیخبری اور بیخودی چھا گئی اور وہ کیفیت جو موحدین کو بمجرد فہم حاصل ہوتی ہے اس شاغل کے نفس کو بیخودی میں آ گئی ایک دریا میں جان کر کودا، ایک کو کسی نے غافل کر کے دھکیل دیا، انجام دونوں کا ایک ہے وہ لوگ جو وحدت وجود کو سمجھ لیں یہ میں نہیں کہتا کہ نہیں ہیں، مگر ہاں کم ہیں اور کہیں کہیں ہیں۔ اور ایسے نفوس کہ جو کسب حالت بیخودی کے واسطے محتاج اشغال واذکار ہیں، بہت ہیں بلکہ بیشمار ہیں۔

رقعاتِ اُردو کی خصوصیات اور غالب کی اوّلیت

نثر اُردو میں غالب کی اولویت اور اوّلیت ان کے رقعات کے سبب سے ہے۔ اُردو خطوط نویسی کا غالب نے جو طریقہ ایجاد کیا، اور اس میں جو جدتیں پیدا کیں، اور ان کو جس التزام، اہتمام اور کمال کے ساتھ برتا، اس میں غالب اوّل بھی ہیں اور آخر بھی۔

۱۸۵۰ء تک غالب فارسی میں خط لکھا کرتے تھے۔ اس سال میں بہادر شاہ ظفر نے ان کو تاریخ نویسی کی خدمت سپرد کی۔ وہ فارسی تحریریں بڑی محنت و کاوش سے لکھا کرتے تھے۔ اب اس تاریخ کے ساتھ خطوط فارسی پر بھی محنت کرنا دشوار تھا۔ اس لیے اُردو میں خط کتابت شروع کر دی۔ پھر غدر کے بعد صدمات اعزہ و احباب، مالی تردّدات، اور پیری و امراض نے زیادہ مضمحل کر دیا تو ۱۸۶۱ء میں ارادہ کر لیا اور اعلان کر دیا کہ فارسی انشا پردازی ترک کر کے اردو ہی میں لکھا کریں گے، لیکن باوجود اس عزم کے بضرورت کبھی کبھی فارسی میں بھی خطوط لکھتے رہے۔ آخر ۱۸۶۵ء سے فارسی نگاری بالکل چھوڑ دی، اور تا دمِ مرگ (۱۸۶۹ء) اُردو میں خط کتابت کرتے رہے۔

جتنے خطوط اب تک دستیاب ہوئے ہیں، اور تین چار مجموعوں میں شائع ہو چکے ہیں، ان کی ضخامت تقریباً ۹۰۰ صفحات ہے، اور تعداد خطوط تقریباً ۸۲۵۔ اگرچہ رقعات کا شمار تصنیف میں نہیں ہوا کرتا، لیکن ایسا ضخیم مجموعہ یقیناً غالب کی مستقل تصنیف کہلائے جانے کا مستحق ہے۔ خاص کر جب ان میں سے تخمیناً سَو خطوط کو چھوڑ کر (غالباً اس سے بھی کم) باقی سب میں غالب کا ایجاد کردہ طرزِ تحریر ہے، یا اُن کی شوخی و ظرافت ہے، یا ادبی نکات ہیں، یا علمی مباحثہ ہے، یا اشعار کی تشریح ہے، یا شاگردوں کے کلام کی اصلاحات ہیں۔

"رقعات غالب" کی خصوصیات مختصر طور پر یہ ہیں:۔

(۱) غالب نے القاب و آداب، مزاج پرسی و خیریت نگاری کا قدیم دستور، جس سے سر مو تجاوز کرنا روا نہ رکھا جاتا تھا، بالکل ترک کر دیا۔ یہ بات نہیں کہ یہ باتیں لکھتے ہی نہ تھے، مگر ان قاعدوں کے اور ان کی ترتیب کے پابند نہ تھے۔ کبھی القاب و آداب بالکل چھوڑ دیتے اور اول سطر سے مضمون شروع کر دیتے تھے، کبھی لکھتے تھے تو نئے مختصر، موزوں القاب لکھتے تھے۔ مثلاً "میاں" "برخوردار" "بندہ پرور" "مہاراج" "پیر و مرشد" "بھائی صاحب"۔ اس سے زیادہ لکھا تو "میری جان کے چین، میاں سرفراز حسین"۔ "میرے مہربان، میری جان، مرزا تفتہ سخندان"۔ کبھی یہ سب غائب اور خط اس طرح سے شروع:۔

"ہاں صاحب، تم کیا چاہتے ہو؟" یا "مار ڈالا یار تیری جواب طلبی نے"!

اسی طرح دعا، سلام اور اپنا نام، اور تاریخ تحریر لکھنے میں بھی کوئی پابندی نہ تھی مثلاً

"نور چشم، راحت جان میر سرفراز حسین، جیتے رہو اور خوش رہو۔"

"ناوک بیداد کا ہدف، پیر خرف، یعنی غالب آداب بجا لاتا ہے۔"

"قبلہ۔ کبھی آپ کو یہ بھی خیال آتا ہے کہ کوئی ہمارا دوست، جو غالب کہلاتا ہے، وہ کیا کھاتا پیتا ہے، اور کیونکر جیتا ہے؟"

"۶ دسمبر ۱۸۶۵ء کی، بدھ کا دن، صبح کے آٹھ بجا چاہتے ہیں۔ کاتب کا نام غالب ہے کہ تم جانتے ہو گے۔"

"جواب کا طالب غالب۔ سہ شنبہ، از روئے جنتری ۲۶، اور از روئے رویت ۲۵ رجب ۱۲۸۳ھ۔"

(۲) خط کو مکالمہ بنا دیتے ہیں۔ اس طرح لکھتے ہیں گویا سامنے بیٹھے باتیں کر رہے

ہیں۔ چنانچہ خود بعض لوگوں کو لکھتے ہیں کہ، "پیرو مرشد یہ خط لکھنا نہیں، باتیں کرنی ہیں"۔ "بھائی، مجھ میں تم میں نامہ نگاری کا ہے کو ہے، مکالمہ ہے۔" "اب حضرت سے باتیں کر چکا خط کو سر نامہ کرکے کہار کو دیتا ہوں"۔ اس طرح کے خط کا ایک نمونہ درج کیا جاتا ہے ان کو یہ لکھنا تھا کہ محمد علی بیگ میرے کوٹھے کے نیچے سے گزرا، میں نے پوچھا کہ لوہارو کی سواریاں روانہ ہوگئیں؟ اس نے کہا ابھی نہیں ہوئیں، میں نے پوچھا کیا آج جائیں گی؟ اس نے کہا، آج ضرور جائیں گی، تیاری ہو رہی ہے اس مطلب کو انھوں نے اس طرح لکھا ہے:۔

"محمد علی بیگ ادھر سے نکلا۔ بھئی محمد علی بیگ، لوہارو کی سواریاں روانہ ہوگئیں؟ حضرت، ابھی نہیں۔ کیا آج نہ جائیں گی؟ آج ضرور جائیں گی تیاری ہو رہی ہے۔"

اس طرح کا ذرا طویل انتخاب آگے درج ہوگا۔

(۳) اس طرز مکالمہ میں کبھی یہ جدت پیدا کرتے ہیں کہ مکتوب الیہ کو خطاب کرتے کرتے غائب فرض کر لیتے ہیں۔ یہاں تک کہ جو لوگ ان کے انداز بیان سے واقف نہیں وہ اس کو مکتوب الیہ کا غیر سمجھ لیتے ہیں۔ مثلاً میر مہدی مجروح کو لکھتے ہیں۔

"میر مہدی جیتے رہو! آفریں! صد ہزار آفریں! اردو لکھنے کا کیا اچھا ڈھنگ پیدا کیا ہے، کہ مجھے رشک آنے لگا ہے۔ سنو دلی کی تمام مال و متاع و زر و گوہر کی لوٹ پنجاب احاطہ میں گئی ہے۔ یہ طرز عبارت خاص میری دولت تھی، سو ایک ظالم پانی پت انصاریوں کے محلے کا رہنے والا لوٹ لے گیا۔ مگر میں نے اس کو بحل کیا، اللہ برکت دے۔"

اس "ظالم" سے مراد یہی میر مہدی ہیں۔

(۴) غالب کے خطوط کی سب سے بڑی خوبی، جس نے، بقول مولانا حالی،

ان کے مکاتبات کو ناول اور ڈراما سے زیادہ دلچسپ بنا دیا ہے، ان کی شوخیِ تحریر ہے، جو اکتساب یا مشق و مہارت یا پیروی و تقلید سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ پھر جس رتبے کا مکتوب الیہ ہوتا تھا، اس کی سمجھ اور مذاق کے موافق خط میں شوخیاں کرتے تھے۔ مثلاً اپنے ایک دوست کو خط لکھا ہے، اس میں ان کی لڑکی کو جو بچپن میں مرزا کے سامنے آتی تھی اور اب جوان ہو گئی ہے، بعد دعا کے لکھتے ہیں:۔

"کیوں بھئی اب ہم اگر کول آنے بھی تو تم کو کیونکر دیکھیں گے؟ کیا تمہارے ملک میں بھتیجیاں چچا سے پردہ کرتی ہیں؟"

یا مثلاً نواب امیر الدین احمد خاں رئیس لوہارو کو ان کے بچپن کے زمانے میں ان کے رقعے کا جواب، جس میں مرزا کو دادا صاحب لکھا تھا، اس طرح لکھتے ہیں:۔

اے مردمِ چشمِ جہاں بینِ غالب! پہلے القاب کے معنی سمجھ لو یعنی چشمِ جہاں بینِ غالب کی پتلی چشمِ جہاں بیں تمہارا باپ مرزا علاء الدین احمد خاں بہادر اور پتلی تم، میاں تمہارے دادا تو نواب امین الدین خاں بہادر ہیں۔ میں تو صرف تمہارا دلدادہ ہوں۔"

(۵) کبھی اس پیرایۂ ظرافت سے حسنِ طلب کا کام لیتے ہیں جیسے نواب صاحب رامپور کے نام کا خط پہلے درج کیا گیا۔ کبھی کسی فرمائش کو ہنسی ہنسی میں ٹال دیتے ہیں۔ مثلاً ایک بار نواب علاء الدین احمد خاں نے اپنے لڑکے کی تاریخ ولادت، اور تاریخی نام کی فرمائش کی غالب مادۂ تاریخ نکالنے سے ہمیشہ گھبراتے تھے۔ اس فرمائش کے جواب یں لکھتے ہیں۔

شیر اپنے بچوں کو شکار کا گوشت کھلاتا ہے، طریق صید افگنی سکھاتا ہے۔ جب جوان ہو جاتے ہیں، آپ شکار کر کھاتے ہیں۔ تم سخنور ہو گئے، حسنِ طبع خداداد رکھتے ہو، ولادت فرزند کی تاریخ کیوں نہ کہو؟ اسم تاریخی کیوں نہ نکال لو، کہ

مجھ پیر غم زدہ دل مردہ کو تکلیف دو۔ علاء الدین احمد خاں، تیری جان کی قسم!
میں نے پہلے لڑکے کا جو اسم تاریخی نظم کر دیا تھا، اور وہ لڑکا نہ جیا، مجھ کو اس
وہم نے گھیرا ہے کہ وہ میرے نحوست طالع کی تاثیر تھی۔ میرا ممدوح جیتا نہیں
نصیر الدین حیدر، اور امجد علی شاہ ایک ایک قصیدے میں چل دیے،
واجد علی شاہ تین قصیدوں کے متحمل ہوئے، پھر نہ سنبھل سکے، جس کی
مدح میں دس بیس قصیدے کہے گئے، وہ عدم سے بھی پرے پہونچا۔
ناصاحب، دُہائی خدا کی! میں نہ تاریخ ولادت کہوں گا، نہ نام تاریخی ڈھونڈوں
گا۔"

(۶) ظرافت کے لیے نئے نئے پیرایے پیدا کرتے ہیں۔ ناداری میں کپڑے
بیچنے پڑے تو لکھتے ہیں:-

"اور لوگ روٹی کھاتے ہیں، میں کپڑا کھاتا ہوں۔"

رامپور کے ایک جشنِ سرکاری کے حال میں لکھتے ہیں:-

"طوائف کا وہ ہجوم، حکّام کا وہ مجمع، کہ اس مجلس کو طوائف الملوک کہا چاہیے!"

(۷) بعض خطوط مقفیٰ بھی لکھے ہیں۔ لیکن بقولِ مولانا حالی، مقفیٰ عبارت خاص کر
ان خطوں میں لکھتے تھے جن سے ہنسی، ظرافت، اور مخاطب کا خوش کرنا مقصود ہوتا
تھا۔ مفتی میر عباس کو ان کے احترام اور قدامت پسندی کے سبب سے سراسر مقفیٰ
خط لکھا ہے۔

(۸) بعض جگہ الفاظ کی ترتیب میں قدامت ہے۔ یہ فارسی کی عادت کا اثر تھا، جو
پہلے سے تھا اور بعد تک رہا ہے۔ بعض فارسی محاوروں کو ترجمہ کر دیا ہے۔ مثلاً لکھتے
ہیں:-

"کوئی بیوفائی بھی سرزد نہیں ہوئی جو دستور قدیم کو برہم مارے (فارسی 'برہم زند')

اب بعض خطوط پورے، اور بعض کا اقتباس درج کیا جاتا ہے۔ نواب خلد آشیاں کلب علی خاں رئیس رامپور کے نام کا مکمل مکتوب یہ ہے:۔

"حضرت ولی نعمت، آیۂ رحمت سلامت

بعد تسلیم معروض آنکہ منشور عطوفت عزّ ورود لایا، تنخواہ جولائی ۱۸۶۵ء حال کا روپیہ از روئے ہنڈوی ملفوفہ معرض وصول میں آیا۔ اگرچہ یہاں مینھ اسی قدر برسا ہے کہ جس کے پانی سے زمیندار حاصل فصلِ ربیع سے ہاتھ دھوبیں مگر چونکہ بفرمان ازلی میرے رزق کی برات آپ پر ہے، اور آپ کے ملک میں بارش خوب ہوئی ہے، ابر رحمت کے شکریہ میں ایک قطعہ ملفوف اسی عرضی کے بھیجتا ہوں۔ بنظر اصلاح نظم و اصلاحِ حال ملاحظہ ہو۔ زیادہ حد آداب۔

تم سلامت رہو ہزار برس

ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

نجات کا طالب غالبؔ۔ جمعہ ۱۱ راہ اگست ۱۸۶۵ء

(قطعہ)

مقام شکر ہے اے ساکنانِ خطۂ خاک
رہا ہے زور سے، ابر ستارہ بار برس

کہاں ہے ساقیِ مہوش؟ کہاں ہے ابر مطیر؟
بیار لالۂ گلنار گوں، ببار، برس

خدا نے تجھکو عطا کی ہے گوہر افشانی
درِ حضور پر، اے ابر، بار بار برس

ہر ایک قطرہ کے ساتھ آئے جو ملک وہ کہے
امیر کلب علی خاں جئیں ہزار برس

فقط ہزار برس پر کچھ انحصار نہیں
کئی ہزار برس بلکہ بے شمار برس

جناب قبلۂ حاجات، اس بلاکش نے
بڑے عذاب سے کاٹے ہیں پانچ چار برس

شفا ہو آپ کو، غالب کو بندِ غم سے نجات　　خدا کرے کہ یہ ایسا ہو سازگار برس"

نواب خلد آشیاں ہی کے نام دوسرا عریضہ ہے۔ رام پور کی نمائش گاہ بے نظیر میں شریک نہ ہو سکنے کی حسرت لکھتے ہیں، کیا خوب پیرایہ پیدا کیا ہے:

"حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت

بعد تسلیم معروض ہے، نمائش گاہ سراسر سور رامپور کا ذکر اخبار میں دیکھتا ہوں، اور خون جگر کھاتا ہوں، کہ ہائے میں وہاں نہیں؛ بالاخانے پر رہتا ہوں، اتر نہیں سکتا۔ مانا کہ آدمیوں نے گود میں لے کر اتارا، اور پالکی میں بٹھا دیا، کہار چلے، راہ میں نہ مرا، اور رامپور پہنچ گیا، کہاروں نے جا کر بینظیر میں میری پالکی رکھ دی ——— پالکی قفس، اور میں طائر اسیر، وہ بھی بے پر و بال، نہ چل سکوں، نہ پھر سکوں۔ جو کچھ اوپر لکھ آیا ہوں۔ یہ سب بطریق فرض محال ہے ورنہ ان امور کے وقوع کی کہاں مجال ہے۔ بارے تین بیت کا قطعۂ تاریخ بھیجتا ہوں۔ اگر پسند آئے، تو میں خوشنودی مزاج مبارک سے اطلاع پاؤں:

نمایشگہے در خور شان خویش،	بر آراست نواب عالی جناب
مہ ہیں چوں طرب را نہایت نماند	بود سال آں "بخشش بیحساب
خدایا! پسندد خداوندگار	کہ از طبع غالب رود پیچ و تاب

بخشش بے حساب کے بارہ سو پچاسی ہوتے ہیں۔ طرب کی نہایت بائے موحدہ ہے۔ جب وہ نہ رہی تو دو عدد گھٹے۔ اور ۱۲۸۳ رہ گئے۔ فہو المقصود

اگر حضرت کی مرضی ہو، تو دبدبۂ سکندری میں یہ تاریخ چھاپی جائے۔

تم سلامت رہو ہزار برس　　ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

داد کا طالب غالب ۱۴ ماہ اپریل ۱۸۶۶ء عیسوی"[1]

---

[1] یہ دونوں خط مکاتیب غالب مرتبہ امتیاز علی صاحب عرشی رامپوری سے منقول ہیں۔

قاضی عبدالجمیل بریلوی کے نام کا خط ہے، اس میں فضلائے ہند پر رائے زنی ہے۔ مقفٰی عبارت لکھی ہے:۔

"صاحب! وہ خط جس میں اشعار سید مظلوم کے تھے۔ مجکو پہنچا، اور میں نے اس خط کا جواب تم کو بھیجا۔ اور ذکر اشعار قلم انداز کیا۔ فارسی کیا لکھوں یہاں ترکی تمام ہے۔ اِخوان واحباب، یا مقتول یا مفقود الخبر، ہزار آدمی کا ماتم دار ہوں؛ آپ غمزدہ اور آپ غمگسار ہوں۔ اس سے قطع نظر کہ تباہ اور خراب ہوں، مرنا سر پر کھڑا ہے۔ پا بہ رکاب ہوں۔ طَرح بالفتح بمعنی نمونہ اور بمعنی قریب، سچ ہے لیکن طَرَح بفتحتین اور چیز ہے۔ غیاث الدین رامپور میں ایک مُلائے مکتبی تھا لا عاقل، جس کا ماخذ اور مستند علیہ قتیل کا کلام ہوگا اس کا فن لغت میں کیا فرجام ہوگا۔ مصرع "کیستم من کہ تا ابد بزیم" لاحول ولا قوۃ! یہ مصرع میرا نہیں۔ "تا ابد بزیم" یہ فارسی لالہ قتیل کی ہے۔ میرا قطعہ یہ ہے سہ

کیستم من کہ جاوداں باشم   چوں نظیری نماند و طالب مُرد
در بگویند، در کدامیں سال   مُرد غالب؟ بگو کہ "غالب مُرد"

یہ مادۂ تاریخ از روئے نجوم نہیں۔ بلکہ از روے کشف ہے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن!"

مولوی عبدالرزاق شاکر کو کہتے ہیں، اور ان کے اشعار پر اصلاح دیتے ہیں:۔

"آج غزل کو دیکھا، کل یہ لفافہ روانہ کروں گا۔ شعر

کوئی آتا نہیں آگے ترے ہٹتا ہو کر   آئنہ جب نظر آیا ہے تو اندھا ہو کر

یہ مطلع دلنشیں ہے۔ مگر اتنا تامل ہے کہ آئینہ کو اندھا کہا جائے یا نہیں۔ شعر

مردم چشم سیہ جب نظر آتا ہے ترا   بیٹھ جاتا ہے مرے دل میں سویدا ہو کر

مردم، آنکھ کی پتلی: مذکر نہیں معشوق کی قید کیا ضرور ؟ دعویِ حُسن پرستی رہے عموماً. یہ خوب ہے. شعر.

نظر آتی ہے جہاں مردمک چشمِ سیاہ — بیٹھ جاتی ہے مرے دل میں سویدا ہو کر

شعر

حرمتِ مے کے لیے پیرِ مغاں کا یہ حکم — ریشِ قاضی کی رہے پنبۂ مینا ہو کر

یہ شعر بے لُطف ہو گیا۔ کس واسطے کہ جب قاضی کی ریش کہی، تو وہ ایہام "ریشِ قاضی" کہاں رہا ؟

غالب کا یہ نکتہ شاعروں اور ادیبوں کے یاد رکھنے کے قابل ہے کہ محاورۂ فارسی جو کسی خاص معنی کے لیے مستعمل ہو۔ بجنسہ لینا چاہیئے۔ اس میں تغیّر کرنا، مثلاً اُردو میں ترجمہ کر لینا، جائز نہیں۔ شراب چھاننے کے کپڑے کو فارسی میں ریشِ قاضی کہتے ہیں۔ اُردو میں اس کو قاضی کی ریش نہیں کہتے: اس لئے شاکر کے شعر میں وہ ایہام نہیں رہتا۔ اردو شعر میں اس کی مثال ناسخ کا یہ شعر ہے :-

نہ پائی ریشِ قاضی تو لیا عمامۂ مفتی
مزاج ان مے فروشوں کا بھی کیا ہی لااُبالی ہے (ناسخ)

میر مہدی مجروح کے نام خط لکھتے ہیں، اور اس میں مکالمہ کا عجیب لطف پیدا کرتے ہیں اس سے بہتر اور شوخ تر مکالمہ خود غالب کے اور رقعات میں بھی نہیں ہے اس رقعہ میں لکھنا یہ ہے کہ میرن صاحب آئے، اور ان سے یہ یہ باتیں ہوئیں۔ مگر معمولی و عام طریقہ پر نہیں لکھتے، بلکہ اس طرح شروع کرتے ہیں :-

"اے میرن صاحب ! السلام علیکم" "حضرت آداب" "کہو صاحب آج اجازت ہے میر مہدی کو خط کا جواب لکھنے کی" "حضور میں کیا منع کرتا ہوں ؟ مگر میں اپنے ہر خط میں آپ کی طرف سے دعا لکھ دیتا ہوں، پھر آپ کیوں تکلیف

کریں؟" تم نہیں میرن صاحب: اس کے خط کو آئے ہوئے بہت دن ہوئے ہیں، وہ
خفا ہوا ہوگا. جواب لکھنا ضرور ہے." حضرت. وہ آپ کے فرزند ہیں، آپ سے خفا کیا ہوں
گے؟" بھائی آخر کوئی وجہ تو بتلاؤ کہ تم مجھے خط لکھنے سے باز رکھتے ہو؟" سبحان اللہ! اے لو
حضرت، آپ تو خط نہیں لکھتے اور مجھے فرماتے ہیں کہ تو باز رکھتا ہے!" اچھا. تم باز نہیں
رکھتے، مگر یہ کہو کہ تم کیوں نہیں چاہتے کہ میں میر مہدی کو خط لکھوں؟" کیا عرض
کروں؟ سچ تو یہ ہے کہ جب آپ کا خط جاتا اور وہ پڑھا جاتا تو میں سنتا اور حظ
اٹھاتا. اب جو میں وہاں نہیں ہوں تو نہیں چاہتا کہ آپ کا خط جاوے. میں
اب پنجشنبہ کو روانہ ہوتا ہوں. میری روانگی کے تین دن بعد آپ شوق سے
لکھئے گا." میاں مٹھو، ہوش کی خبر لو، تمہارے جانے نہ جانے سے مجھے کیا علاقہ؟
میں بوڑھا آدمی، بھولا آدمی، تمہاری باتوں میں آگیا، اور آج تک اسے خط نہیں
لکھا. لاحول ولا قوۃ الا باللہ!"

اس کے بعد میر مہدی سے مخاطب ہو کر خط کا مضمون شروع کرتے ہیں۔

ان گوناگوں جدتوں، نو بنو اسلوبوں، رنگارنگ ظرافتوں نے غالب کے خطوط
میں ایسی دلکشی اور انفرادیت پیدا کردی ہے کہ یہ طرز اُن سے شروع ہو کر انھیں پر ختم
ہو گیا. لیکن عام طور پر یہ فائدہ بھی حاصل ہو گیا کہ ان خطوں کو دیکھ کر لوگ سادہ
دیبے تکلف خط لکھنے لگے۔

خواجہ امان دہلوی

بدرالدین خاں عرف خواجہ امان، دہلی کے رہنے والے
مرزا غالب کے عزیز تھے، یعنی بقول غالب "میرے
ایک رشتہ دار کے بھتیجے." انھوں نے داستان "بوستان خیال" کا فارسی سے اردو میں
ترجمہ کیا. "بوستان خیال" کا مصنف میر تقی خیال گجرات کا رہنے والا تھا. محمد شاہ بادشاہ

کے زمانے میں دہلی آیا۔ اس زمانے میں "داستان امیر حمزہ" بہت مقبول تھی۔ میر تقی خیال نے اس کے جواب میں "بوستان خیال" لکھی۔ چونکہ پہلی داستان میں تاریخ اسلام کے ایک بزرگ حضرت امیر حمزہ کے کارنامے تھے، اس لئے خیال نے بھی ایک تاریخی ہستی تلاش کی اور شاہزادہ معز الدین ابوتمیم کو ہیرو بنایا جو حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نسل میں تھے۔ میر تقی خیال نے دس جلدوں میں بہت ضخیم داستان تیار کی ہے۔ خواجہ امان دہلوی نے مہاراجہ شیودان سنگھ والی ریاست الور کی فرمائش سے پانچ جلدوں کا ترجمہ کیا۔ باقی کے لئے عمر فانی نے وفانہ کی۔

ترجمۂ خواجہ امان کی پہلی جلد کا نام حدائق الانظار اور دوسری کا ریاض الابصار ہے۔ پہلی جلد کے لئے غالب نے دیباچہ لکھا تھا جس کا اقتباس ان کے نمونوں میں درج کیا گیا ہے۔ اس کتاب کا ذکر غالب نے کئی دوستوں کو لکھا ہے۔ اور خریداری کی فرمائش کی ہے۔ خواجہ غلام غوث بیخبر کو لکھتے ہیں:- "میرے ایک رشتہ دار کے بھتیجے نے بوستان خیال کا اردو میں ترجمہ کیا ہے، میں نے اس کا دیباچہ لکھا ہے۔۔۔۔۔۔ آپ کے پسند آئے یا اور اشخاص خرید کرنا چاہیں تو چھ روپیہ قیمت اور محصول ذمہ خریدار ہے۔"

خواجہ امان نے تمہید میں مقفیٰ عبارت لکھی ہے، اور عربی و فارسی سے کام لیا ہے لیکن اصل داستان بہت سادہ سلیس لکھی ہے۔ ریاض الابصار کی تمہید کے چند فقرے یہ ہیں:-

"امید کہ یہ ناظورۂ تالیف جدید بھی مثل جملۂ جلد گزرانیدہ بحصول تقدم مرحمت پذیرائی، اور خلعت سرسبزی اُحسنت جیب و دامان مراد کو پُر کرے: اور جاکر موردِ شیٔ اسی وسیلہ جزیلہ کے سبب گاہ گاہ مذکور بارگاہ فلک کارگاہ و سرمایہ اعزاز و تفاخر ہووے۔ خدا کا شکر کہ ادائے شکر خداوند نعمت کے پردے میں

ادا ے شکر نعمت خدا ہوا، یعنی شکر نعمت خداوند کیا، شکر خدا ادا ہوا۔"

داستان کا نمونہ یہ ہے۔ اس قدر صاف با محاورہ زبان لکھی ہے کہ ترجمہ نہیں معلوم ہوتی۔

اب عاقبؔ حرّانی کا حال سنو اول بیان ہوا ہے کہ عاقب حرّانی حکومت کے علاوہ فن عیاری میں بھی نہایت مستعد و چالاک ہے۔ اس نے ایک شب قصد کیا کہ خبر و اخبار کے واسطے حریف کے لشکر میں چلئے اور دیکھئے کہ وہ حکیم ضارمنکوس کس کام میں مشغول ہے۔ آخر عاقب حرّانی ایک نقب کی راہ سے جس کا دہن بیرون شہر بلغ میں تھا۔ باہر نکلا، اور بہت ہوشیاری سے جم قدر کے لشکر میں پہنچا۔ قضارا۔ اس وقت ایک خدمت گار خاص ضارمنکوس کا کسی کام کے واسطے خیمے سے نکلا تھا۔ عاقب نے اس خدمت گار کی گردن میں اس طرح کمند بندی کہ حلق سے آواز تک نہ نکلی۔ بعد ازاں اس کا پشتارہ باندھ کر ایک خرابے میں رکھ آیا۔ اور اپنی صورت اس خدمت گار کی شکل سے تبدیل کی، بلکہ اسی کا لباس پہنا اور خدمت گاروں کی صف میں وارد ہو گیا۔"

مولوی غلام امام شہید

والد کا نام مولوی شاہ غلام محمد۔ قصبہ امیٹھی ضلع لکھنؤ وطن تھا، عربی و فارسی کے بڑے عالم تھے۔ فارسی آغا سید محمد اسمٰعیل مازندرانی سے حاصل کی تھی، نظم فارسی میں مرزا قتیل کے شاگرد تھے۔ اردو میں شیخ مصحفی کے۔ ایک عرصہ تک صدر نظامت آگرہ میں سررشتہ دار رہے۔ ۱۸۳۹ء میں سرسید احمد خاں بھی نوکر ہو کر آگرہ آ گئے۔ مولانا شہید، سرسید اور دیگر مشاہیر آگرہ کی صحبتیں گرم رہتی تھیں۔ شہید کی ترک ملازمت کے بعد ہندوستان کے مشاہیر امرا اور رؤسا ان کی خدمت کرتے رہے۔ نواب کلب علی خاں والی رامپور

سرسالار جنگ وزیر اعظم حیدرآباد، سعید عالم خاں رئیس سورت ان کے بڑے قدر دان تھے، حیدرآباد سے ۲۰۰ روپیہ سالانہ نذرانہ مقرر ہو گیا تھا۔ جو آخر عمر تک ملتا رہا۔ یہ سب قدر دانیاں شہید کے عشق و محبت رسول اللہ کی برکتیں تھیں۔ ان کی شیفتگی و فدائیت اس درجہ پر پہنچ گئی تھی کہ بجز نعت شریف لکھنے اور پڑھنے کے کوئی شغل نہ تھا۔ اسی سبب سے "مداح نبی" "عاشق رسول" کے مبارک القاب سے مشہور تھے۔ اطراف ہندوستان میں اضلاع آگرہ و مراد آباد، رامپور و الہ آباد و دکن میں شہید نے صدہا شاگرد اور مرید چھوڑے۔ پیرانہ سالی میں ۱۲۹۲ھ ۱۸۷۳ء میں انتقال کیا۔ منشی غلام غوث بیخبر نے طویل قطعۂ تاریخ کہا مصرع تاریخ یہ ہے:-

"وائے امام شعرا شد شہید" = ۱۲۹۲ھ

فارسی میں قصائد و غزلیات وغیرہ کا ضخیم کلیات شہید کی یادگار ہے۔ اردو میں انشائے بہار بے خزاں ان کے خطوط و مضامین کا مجموعہ ہے جو ۱۸۶۶ء میں مرتب و شائع ہوا۔ دوسری کتاب محفل میلاد النبیؐ میں پڑھنے کے لئے تصنیف کی جو مولد شریف شہید کے نام سے مشہور ہے۔ یہ کتاب اس قدر مقبول ہوئی اور اتنی مرتبہ چھپی کہ اس کی اشاعتوں کا شمار دشوار ہے۔ آج تک رائج و شائع ہے۔ اس کے ایک ایک فقرے، ایک ایک روایت ایک ایک شعر سے شہید کا عشق و ولولہ، جوش و شوق، سوز و درد مترشح ہے۔ سنا ہے جب شہید خود اس کو محفل میں پڑھتے تھے۔ عجب سماں بندھ جاتا تھا۔ اکثر اہل محفل پر فور رقت سے غش طاری ہو جاتا تھا اس طرز اور اس مقصد کی یہ اردو میں پہلی کتاب ہے۔ اس کو دیکھ کر لوگوں نے اس سے اخذ و اقتباس کیا۔ اس کی نقلیں کیں، اس کے ہو بہو نمونے کی کتابیں لکھیں۔

مولد شریف شہید میں حمد و نعت کے مقامات مقفّٰی، عالمانہ اور عربی و فارسی کے

الفاظ و تراکیب سے معمور ہیں۔ باقی مضمون سادہ عبارت میں ہے لیکن اس میں بھی عربی کے الفاظ بیساختہ قلم سے نکلتے ہیں۔ الفاظ کی تقدیم و تاخیر کا وہی قدیم رنگ ہے بعض مقامات سے مختصر نمونے دکھلائے جاتے ہیں۔ حمد و نعت اس طرح شروع کرتے ہیں۔

"سبحان اللہ تعالیٰ شانہٗ کہ ذات مستجمع صفات اس کی بری ہے شرک اور زوال سے، اور اُوحدیت اور صمدیت اس کی پاک ہے ادراک وہم و خیال سے مشابہت اعراض اور جواہر سے قطعاً مبرا، اور مناسبت اوہام خواطر سے مطلقاً معرا، کیسا معبود مطلق کہ جس نے بنی آدم کے واسطے چراغ رہنمائی کا انبیا کے ہاتھ میں دیا، اور تمام عالم کو سید الانبیا، سند الاصفیا، احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی شمع جمال جہاں آرا سے روشن کیا۔"

تخلیق نور محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق لکھتے ہیں:۔

اے عاشقان روے محمدؐ و اے شیفتگان گیسوے احمدؐ، جانو اور آگاہ ہو کہ نور محمدی صلی اللہ علیہ وسلم مادہ تمام موجودات اور خلاصہ جمیع کائنات کا ہے۔ یعنی جب صانع باکمال کو ظاہر کرنا اپنے حسن بے زوال کا منظور ہوا پہلے نور احدیت سے نور احمدی پیدا کیا، اور تمام موجودات کو اس کے نور سے عالم ظہور میں لایا، اور ظہور اس ذات ستودہ صفات کا سب انبیا کے بعد محض اس واسطے تھا کہ جس طرح بعد طلوعِ آفتاب کے روشنی ماہتاب اور ستاروں کی چھپ جاتی ہے، فروغِ ملت محمدی ناسخ سب ملتوں کی ہے اگر وہ نور قدم پہلے سب کے جلوہ افروز ہوتا تو اور انبیا رسالت اور نبوت سے محروم رہتے۔ رباعی لا اعلم

پیش از ہمہ شاہان غیور آمدۂ	ہر چند کہ آخر بظہور آمدۂ
اے ختمِ رُسل قرب تو معلوم شد	دیر آمدۂ، زراہِ دور آمدۂ

سیرت پاک کے حالات اس طرح بیان کرتے ہیں :۔

"جب عمر شریف آٹھ برس کی ہوئی عبدالمطلب کی عمر ایک سو بیس برس کی تھی۔ دریافت کیا کہ اب ایام اپنی موت کے قریب آئے، ابو طالب وغیرہ سے کہا کہ اگرچہ موت سب کے واسطے ہے لیکن اس فرزند ہشت سالہ کی یتیمی پر کہ ابھی صغیر اور یتیم بے مادر و پدر ہے، سخت حسرت و تاسف ہے، کاش عمر میری اسکی تربیت تک وفا کرتی تو اپنے سامنے خاطر خواہ تربیت اور پرورش کرتا، ایتم میں سے کون اس کی پرداخت کا متکفل ہو سکتا ہے۔ ابو لہب نے کہا میں بجان و دل حاضر ہوں جواب دیا کہ تو دولت و مال البتہ بہت رکھتا ہے لیکن سنگدل اور بے رحم ہے فرزندان یتیم اکثر مجروح دل، شکستہ خاطر، نازک مزاج ہوتے ہیں، تھوڑے سے رنج کا تحمل نہیں کر سکتے۔ شاید تجھ سے کسی بات میں خاطر نازک اس یتیم کی آزردہ ہو جائے۔ بعدہ حمزہ نے مثل ابو لہب کے التماس کیا، جواب پایا کہ تو کوئی فرزند نہیں رکھتا، اس یتیم کے درد سے کیونکر خبردار ہوگا۔ پھر عباس نے کہا اگر میں اس خدمت کا سزاوار ہوں تو شرط خدمت کی بجا لاؤں۔ کہا تو عیال و اطفال بہت رکھتا ہے اپنے لڑکوں کے ہوتے یتیم بے پدر کو کب یاد رکھے گا۔ تب ابو طالب نے کہا کہ میں ہر چند مال اور سرمایہ کچھ نہیں رکھتا ہوں، لیکن اگر مجھے لائق اس خدمت کا جانو تو بدل و جان حاضر ہوں۔ کہا تو البتہ قابل اس کام کے ہے۔"

انشائے بہار بے خزاں سے ایک "رقعہ تہنیت و تعزیت آمیز" کا مختصر اقتباس اول و آخر سے درج کیا جاتا ہے :۔

"مجموعہ انشائے شیریں زبانی، دیباچہ کتاب سخن معانی زاد حشمتہ، قلم ابلد تشریح مراتب اشتیاق و آرزو مندی کے، تعزیت کے مضمون سے آنسو بھی بہاتا ہے، اور کچھ خوشی میں اگر مبارکباد کا مضمون بھی زبان پر لاتا ہے تو نیلانے

میں خوشی دغم دونوں کا چولی اور دامن کا ساتھ ہے، اور دنیا میں دھوپ چھاؤں کی طرح شادی کے ہاتھ میں ماتم کا ہاتھ ہے۔ دو پھول ایک ہی شاخ میں پھولتے ہیں، ایک دولہا دلھن کے سہرے کے کام آتا ہے، دوسرا میت کی تربت پر چڑھایا جاتا ہے۔ دو موتی ایک سیپ میں پیدا ہوتے ہیں، ایک بادشاہ کے تاج میں لگاتے ہیں، دوسرے کو کھرل میں پیس کر دوا میں ملاتے ہیں۔ ایک ہی کافور سے دو شمعیں بنتی ہیں، ایک محفل سرود میں کام آتی ہے، دوسری مُردے کے مزار پر جلائی جاتی ہے...... حاصل یہ کہ آپ کے والد ماجد نے عین عید کے دن انتقال فرمایا، گویا اس گردش لیل ونہار کی خزاں وبہار کا تماشا دکھایا۔ اور اس غم نے جتنا رلایا تھا، آپ کی شادی نے اتنا ہی ہنسایا،...... رنج میں دو ہتڑ جو پہلے منھ پر مارا تو پھر خوشی میں وہی دونوں ہاتھ اٹھا کر یوں دعا مانگی کہ خدا اس مرحوم کو جنت نصیب کرے، اور آپ سلامت رہیں اور یہ شادی مبارک ہو۔"

شہید کی تمام انشا پردازی میں یہی قافیہ پیمائی وعبارت آرائی ہے۔ اور اس طرز نگارش میں وہ کسی سے کم نہیں ہیں۔ تخلیق معانی، ایجاد اسالیب اور تزئین بیان کے بہتر سے بہتر نمونے شہید کی نثر میں ملتے ہیں۔ ان کا ایک مضمون روضۂ تاج گنج آگرہ کے متعلق بہت مشہور ہے۔ اس طرح کے اسلوب تحریر سے محاکات ومنظر کشی کا کام نہیں لیا جاتا بلکہ مدح خوانی کی جاتی ہے، قصیدہ سے کسی بادشاہ کی شوکت وعظمت جیسی کچھ ذہن نشین ہوا کرتی ہے، وہی کام شہید کی نثر تاج محل کے متعلق کرتی ہے بہر حال انکے علم وفضل اور صنعت گری کا نہایت نادر نمونہ ہے۔ مختصر ٹکڑا نقل کیا جاتا ہے۔

سبحان اللہ، کیا روضہ ہے کہ رضواں جس کے لطف ولطافت سے راضی وخوشنود ہے۔ بارک اللہ، کیا باغ ہے جس میں بہشت کی ہر نعمت موجود ہے سورج اس باغ کا ایک زرد آلو ہے، چاند اس چمن کا گل شبو ہے، پہلے دروازے

کی بلندی دیکھنے کو جو آسمان گردن اور سر اٹھائے تو اس کو آفتاب کی پگڑی سنبھالنی دشوار ہو جائے۔ دونوں بازو کے سرے سے محراب کی چوٹی تک کلام مجید کا سورہ جو پتھر قلم سے جو لکھا ہے، عقل اس طلسمات سے حیران ہے کہ ہر حرف جیسا نزدیک سے نظر آتا ہے، ویسا دور سے دکھائی دیتا ہے۔ اس فن کے معتبر انصاف سے دیکھیں کہ یہ بات کیسی مشکل اور کس طرح کی تقسیم کا مل ہے۔ سنگ مرمر پر سنگ موسیٰ کی پچے کاری کہئے یا آنکھوں کی سفیدی پر پتلیوں کی سیاہی کی نموداری، حرف ہیں یا کافور کے قرص پر مشک کے دانے پڑے ہیں، لفظ ہیں یا ہیرے کی تختی پر نیلم کے نگیں جڑے ہیں۔ مینار آسمان کی طرف تعجب کا ہاتھ اٹھائے ہے کہ یہ خم دیکھئے اور اس بارگاہ کے ساتھ ہمسری کا دعویٰ اور دم دیکھئے، محراب کا خم ابرو سے اشارہ کر رہا ہے کہ اندر جا کر ذرا بہار کا عالم دیکھئے نہیں نہیں، غلطی ہوئی مجھ سے، بلکہ محراب کا یہ اشارہ ہے کہ پہلے حواس کو یہاں طاق پر رکھ جائیے تب آگے قدم بڑھائیے پس جو ادھر چوکھٹ لانگھنے کی عزیمت ہوئی تو ادھر عقل اور حکمت رخصت ہوئی۔ سیر سے سیر ہونا تو نگاہ کے ہاتھ ہے، لیکن حیرت یہاں ہر قدم کے ساتھ ہے۔"

خواجہ غلام غوث بیخبر

خلف خواجہ ظہور اللہ کشمیری۔ انکے مورث اعلیٰ سلطان زین العابدین بادشاہ کشمیر کی اولاد سے تھے۔ سلاطین مغلیہ کے تسلط کشمیر کے زمانے میں خواجہ بیخبر کے بعض بزرگ کشمیر میں قاضی رہے۔ بیخبر کے والد کشمیر سے ترک وطن کر کے لاسہ (تبت) چلے گئے۔ وہاں سے ریاست نیپال پہنچے، مہاراجہ نیپال نے بڑی عزت کی، خواجہ غلام غوث نیپال میں ۱۸۲۴ء / ۱۲۴۰ھ میں پیدا ہوئے۔ چار برس کی عمر تھی کہ ان کے والد ہندوستان آگئے

اور بنارس میں قیام کیا. خواجہ صاحب نے یہیں پرورش پائی اور تعلیم حاصل کی. ان کے خالو خان بہادر مولوی سید محمد خاں، لفٹنٹ گورنر صوبہ شمال مغرب کے میر منشی تھے. بیخبر ۱۷ سال کی عمر میں ۱۸۴۰ء میں میر منشی کے نائب مقرر ہوئے. صوبہ کا صدر مقام آگرہ تھا. بیخبر مدتوں آگرہ رہے. جب لارڈ ایلن برا گورنر جنرل (۱۸۴۲ء تا ۱۸۴۴ء) نے گوالیار پر حملہ کیا (۱۸۴۳ء) تو گورنر کے منشی خانہ کے ساتھ بیخبر بھی شریک مہم ہوئے. اور خاتمۂ جنگ پر کارگذاری کے صلے میں خلعت پایا. اس وقت ان کی عمر ۱۹ برس کی تھی. خالو کی پنشن کے بعد ان کی جگہ میر منشی ہو گئے. غدر کے زمانے میں صدہا ہندوستانیوں کی جان بچائی اور گورنمنٹ کے بھی انتہا درجہ کے وفادار رہے. اس کے صلے میں سند اور خلعت ہفت پارچہ مع تین رقوم جواہر سرکار کی طرف سے مرحمت ہوئے. ملکہ وکٹوریا کے خطاب شہنشاہی اختیار کرنے کے موقع پر لارڈ لٹن نے جو دربار کیا اس میں بھی خواجہ صاحب کو تمغہ قیصری عطا ہوا. ۴۵ سال کی ملازمت کے بعد ۱۸۸۵ء میں پنشن لی. گورنمنٹ نے خان بہادر ذوالقدر کا خطاب دیا. اور یہ مزید اعزاز بخشا کہ پنشن لینے کے لئے عدالت کی حاضری معاف کی. پنشن کے بعد نواب خلد آشیاں کلب علی خاں بہادر والی رامپور نے خواجہ صاحب کو ریاست کا مدار المہام بنانا چاہا لیکن انھوں نے شکریہ کے ساتھ معافی چاہی اور آخر عمر کو یاد الہٰی میں گزار کر ۱۹۰۵ء میں انتقال کیا.

بیخبر عربی و فارسی کے عالم تھے. فارسی کے ایسے بلند پایہ شاعر تھے کہ اہل زبان ایران جو وارد ہندوستان ہوئے انھوں نے ان کی زبان دانی و نکتہ سنجی کی داد دی. بیخبر مرزا غالب سے چھوٹے تھے، اور ان کا بیحد احترام کرتے تھے. غالب باوجود بڑا ہونے کے بیخبر کی نہایت عزت کرتے تھے، اور خطوط میں "قبلہ" اور "مولانا" لکھتے تھے. بیخبر کی سخن گوئی کے ایسے مدّاح تھے کہ ان کو ایک خط میں لکھا تھا: "رامپور

میں تھا کہ اودھ اخبار میں حضرت کی غزل نظر افروز ہوئی، کیا کہنا ہے!! ابداع اس کو کہتے ہیں، جدّتِ طرز اس کا نام ہے، جو ڈھنگ تازہ نوایانِ ایران کے خیال میں نہ گزرا تھا، وہ تم بروئے کار لائے۔ خدا تم کو سلامت رکھے!" رقعات غالب کا پہلا مجموعہ (عودِ ہندی) بیخبر کی اعانت و مشورہ سے طبع ہوا۔[1]

بیخبر کے رقعات و نظم فارسی کا مجموعہ خونابۂ جگر کے نام سے شائع ہوا رقعاتِ نثر اردو کا مجموعہ فغانِ بیخبر ہے، جو ۱۸۹۱ء میں شائع ہوا۔ بیخبر کے انتقال کے بعد ان کے ایک عزیز نے بقیہ نظم و نثر کا مجموعہ رشکِ لعل و گوہر کے نام سے ۱۹۰۸ء / ۱۳۲۶ھ میں شائع کیا۔ بیخبر اردو کے بھی شاعر تھے، لیکن کم کہتے تھے۔ اردو میں نثر نگاری و خطوط نویسی کی طرف ۱۸۴۲ء میں توجہ کی، یعنی غالب سے بھی کچھ پہلے۔ تقریظوں میں، بیخبر کا بھی وہی رنگ ہے جو اس زمانے میں مقبول تھا۔ گویا تقریظ کا مفہوم نثر میں قصیدہ خوانی تھا لیکن اور قسم کی نثریں اس سے بہتر و سلیس تر لکھی ہیں۔ چند نمونے دکھلائے جاتے ہیں

(۱) مولوی غلام امام شہید، بیخبر کے رشتے کے خسر ہوتے تھے۔ بیخبر ان کی بے انتہا عظمت کرتے تھے کہ لوگوں کو تلمذ کا شبہہ ہونے لگا تھا۔ بیخبر نے شہید کی "انشائے بہارِ بیخزاں" کی تقریظ لکھی ہے۔ مختلف مقامات سے اس کے چند فقرے یہ ہیں۔

---

[1] "عودِ ہندی" میں اس رقعۂ غالب کے ساتھ بیخبر کی وہ غزل بھی درج ہے، مسلسل غزل کہی ہے مطلع و مقطع اور ایک شعر نقل کیا جاتا ہے:۔

چشم کہ باز شد زخواب؟ فتنہ از و بچار سوست	پردہ ز رخ کہ بر کشاد؟ مہر ز شرم زرد روست
جام صبوحے کہ زد؟ شیشہ بسجدہ می رود	مے ز لب کہ کام یافت؟ جوش نشاط در سبوست
بخت کجاست بیخبر؟ تا بر کابِ او دوم	بر سرِ رہ نشستہ ام، نیم نگاہم آرزوست

"مردم دیدہ آج گھر بیٹھے بہشت کی سیر کرتے ہیں، اللہ اللہ صفحۂ قرطاس پر کیا جوش بہار معانی ہے! اتارنگاہ میں بے تکلف موتی پروئے جاتے ہیں. واہ واہ کلک گہربار کی کیا دُرافشانی ہے...... حرفوں کی سیاہی سے کاغذ کی سفیدی وہ کیفیت دکھاتی ہے، گویا درختوں سے چاندنے کھیت کیا ہے، کاغذ کی سفیدی پر حرفوں کی سیاہی کی وہ بہار نظر آتی ہے، جیسے صحن باغ پر بادل چھارہا ہے...... اب ان کی اردو سے سودا کی روح کو سودا ہوگا، میر اپنا مرنا غنیمت جانیگا ہوس کو پہلے ہی خوب سوجھی جو یہ تخلص اختیار کیا یعنی در پردہ معذرت چاہی کہ میں تو ہوس کرتا ہوں، کمال حق اور کسی کا ہے۔ سوز کو بھی ان کی خبر پہنچ گئی تھی کہ آتش رشک سے جل کر یہ تخلص اپنے حسب حال رکھا۔ ناسخ اب ہوتا تو مصحفی سے تخلص اپنا منسوخ مشہور کرتا۔ آتش نہ مرتا تو کیسا کیسا جلتا۔ ان کی اس نثر نے رتبہ نظم کا کھودیا، استادوں کا سفینہ دریا میں ڈبودیا"

(۲) نیرّ نے شہید کا دیوان مرتب کر کے اس پر دیباچہ لکھا ہے، اسکے متعلق شہید کو خط لکھتے ہیں:۔

"قبلہ! میری شوخی دیکھئے یوسف کو آئینہ دکھاتا ہوں، خورشید کو روشنی کی حکایت سناتا ہوں، گلزار میں پھول لے جاتا ہوں، ختن میں مشک تحفہ بھیجتا ہوں دریا کے سامنے روانی کے معانی بیان کر رہا ہوں، چاند کے روبرو نور افشانی کا معاملہ کرتا ہوں، لعل کے حضور میں رنگ کی دُکان کھولتا ہوں۔ قند کے مواجہ میں شیرینی تولتا ہوں، مسیحا سے کہتا ہوں جان بخشی کی روایت سنیے۔ موسیٰ سے تمنا کرتا ہوں کہ ید بیضا کی چمک دیکھئے، یعنی حضرت کا دیوان مرتب کر کے آپ کے حضور میں پیش کرتا ہوں۔ میرے لئے اس کا دیباچہ لکھنے کا ارادہ کرنا ایسا تھا

جیسے ایک فقیر شاہی خزانوں کے اہتمام کا قصد کرے، ایک شیشہ گر ہیرا تراشنے
کی آرزو کرے، اندھا چاہے کہ قدرت کے نظارے سے حظ اُٹھائے، گونگا چاہے
کہ فصاحت کا سکہ بٹھائے .... میری خوش طالعی ہے اگر یہ قبول ہو، اس
کے لئے شرف ہے اگر دیوان میں داخل ہونے کی عزت اسے حصول ہو۔"

(۲) بیخبر نے اپنی انشا پردازی سے منظر کشی بھی کی ہے۔ صبح، دوپہر، شام کا سماں دکھایا ہے۔ ان مضامین میں مقفٰی فقرے اور مبالغہ و تشبیہ وغیرہ بھی ہیں، اور سادہ و سلیس عبارتیں بھی۔ دوپہر کے منظر کا اقتباس یہ ہے:۔

"دوپہر کا وقت ہوا۔ آفتاب سمت الراس پر آیا، زمین تپنے لگی، پاؤں رکھتے ہوئے
خوف آتا تھا کہ چھالے نہ پڑیں۔ بیٹھے ہوئے جی ڈرتا تھا کہ سانس کی گرمی سے لب پر
تبخالے نہ پڑیں۔ آسمان سے وہ آتش بازی ہونے لگی کہ ہوا نے شعلۂ جوالہ کی صورت
پیدا کی۔ خاک کے ذرّوں نے چنگاریوں سے ہیئت بدلی ...... برہمن تبخانے
کے کونے میں یوں خاموش ہو کر بیٹھا کہ بت بن گیا، میکدے میں مغ زانو پر سر رکھ کے
اس شکل سے ہو بیٹھا کہ معلوم ہوتا تھا مٹکے پر پیالہ اوندھا دیا۔ غریبوں نے اپنے
گھروں میں گھاس کی ٹٹیاں لگا لیں، مٹی کی صراحیوں پر کپڑا بھگو کے لپیٹ دیا
امیروں نے تہ خانوں میں آرام فرمایا، خس کی ٹٹیاں چھڑکی جانے لگیں، فرشی
پنکھے کھنچنے لگے، خس کی خوشبو سے ہوا کے جھونکوں پر لخلخہ کا یقین آنے لگا، صراحیاں
برف میں لگائی گئیں، شربت کی قفلیاں جمائی گئیں۔"

پہلے اور تیسرے نمونے کے خط کشیدہ فقروں میں کس قدر جدید، موزوں اور مکمل تشبیہیں پیدا کی ہیں۔ دوسرے فقرے میں لطیف ظرافت بھی ہے۔

بیخبر کا اسلوب نثر اُس زمانے سے جداگانہ نہیں ہے، لیکن روش قدیم کے محاسنِ تحریر کے لحاظ سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ بیخبر بیسویں صدی کے

شروع کمسے ہیں، لیکن ان کا طرزِ نگارش بھی انیسویں صدی کے نصف اول کا ہے۔ اور اسی زمانے کے لکھنے والوں اور غالب کے ہم عصروں میں ہیں۔ اس لئے ان کو اسی دور میں شامل کر لیا گیا ہے۔

مصنفین دکن

(۱) محمد ابراہیم بیجاپوری

شمالی ہند کے ساتھ ساتھ دکن میں بھی تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری رہا ہے۔ اس دور سے پہلے کے مصنفینِ دکن کا پہلے سلسلۂ دکن میں ذکر آچکا ہے۔ دورِ چہارم میں بھی دکن کے اہلِ تصانیف کی خدمات گراں قدر ہیں اسلئے ان کا امتیاز قائم رکھنے کے لئے، علٰحدہ ذکر کیا جاتا ہے۔

محمد ابراہیم بیجاپوری مرزا رجب علی بیگ سرور لکھنوی کے ہمعصر ہیں۔ ان کا ترجمہ انوار سہیلی اُس سال طبع ہوا ہے جس سال سرور نے اپنا فسانہ عجائب لکھا ہے یعنی ۱۲۴۰ھ/۱۸۲۴ء میں۔ تصنیف کا زمانہ کچھ پہلے ہوگا۔ اس کا نمونہ مولوی نصیر الدین ہاشمی کی تالیف (دکن میں اردو) سے نقل کیا جاتا ہے۔ یہ تحریر اسی دور کی تصانیف شمالی ہند کے مقابلے میں کس قدر بے جوڑ معلوم ہوتی ہے۔ دکنی الفاظ، محاورات طرزِ بیان کی اتنی کثرت ہے کہ بعض معاصرین دکن، باقر آگاہ وغیرہ کی عبارات سے بھی زیادہ قدامت آمیز ہے۔ چند فقرے یہ ہیں:-

"چین کے ملک کے اورس چورس میں ایک بڑا بادشاہ تھا، اس کا نام ہمایوں فال' ہور اُسے ایک بڑا یکا وزیر تھا، اس کا نام خجستہ رائے۔ ہمایوں فال ایک بار خجستہ رائے کو سات لیکر شکار کو گیا، وہاں سوا لنگے تو دھوپ پڑی تھی۔ ایک پہاڑ کی انی پو جھاڑاں تھے۔ چھاؤں کی خاطر خجستہ رائے کو سات لے کر اسی چھاؤں کے تلے جا بیٹھا۔ ہور دیکھا تو کیا، کہ ایک جھاڑ اسی کا کھیڑ کا بڑا ہو گیا ہے۔ اسکے

اندر شہد کے مکھیاں پوتی بندنے اندر گھسنے اور بہار نکلتے ہیں .....؟"

---

(۲) شمس الامراء امیر کبیر ثانی

نظام حیدر آباد دکن کے دربار میں امیر الامراء تھے بسنہ ۱۲۰۸ھ میں پیدا ہوئے اندر تین شاہان آصفیہ (نواب[۱] نظام علیخاں آصف جاہ ثانی، نواب[۲] آصف جاہ ثالث سکندر جاہ اور نواب[۳] ناصر الدولہ آصف جاہ رابع) کا زمانہ دیکھا۔ آخری عہد میں امیر کبیر کا خطاب ملا، اور پیشکاری و مدار المہامی کے عہدے پر بھی فائز ہوئے علم ریاضی کے بڑے ماہر تھے۔ شمس الہندسہ ان کی مشہور تصنیف ہے۔ دیگر علوم و فنون میں بھی ان کی تصانیف موجود ہیں۔ بسنہ ۱۲۸۰ھ ۱۸۶۳ء میں رحلت کی۔

ابستہ[؟] شمسیہ۔ یہ علم طبعیات پر چھ رسالے ہیں۔ موتف[؟] دکن میں اردو" کو ان کے مترجم کا نام تحقیق نہیں ہوا بسنہ ۱۲۵۳ھ ۱۸۳۷ء میں طبع ہوئے۔ ان کا دیباچہ خود شمس الامرا امیر کبیر نے لکھا ہے۔ لیکن یہ نہیں لکھا کہ خود انھوں نے ترجمہ کیا ہے، نہ کسی مترجم کا نام لکھا ہے۔ اس لئے ان رسالوں کو شمس الامراء سے منسوب کر دیا گیا ہے۔ اہتمام بہر حال انھیں کا ہے دیباچہ میں لکھتے ہیں:۔

> نیازمند درگاہ ایزدی کا محمد فخر الدین خاں المخاطب شمس الامرا اس طور پر گذارش رکھتا ہے کہ اکثر اوقات کتابیں چھوٹی بڑی علوم فلاسفر کی جو زبان فرنگ میں مرقوم ہیں، بہ سبب میلان طبیعت کے نسبت اس طرف شوق رکھتا تھا میری سماعت میں آئیں...... اس واسطے مدت سے ارادہ تھا کہ مبتدیوں کے فائدہ کیلئے کوئی کتاب مختصر جامع چند علوم کی زبان فرنگ سے ایسی ترجمہ کی جاوے کہ فرصت قلیل میں اس کے معلومات سے طالبوں کو کچھ کچھ فائدہ میسر ہووے۔ کس واسطے کہ اگر بڑی کتابوں کا ترجمہ ہوگا تو طالبوں کے ذہن پر اس کے مطالعہ کا

بار ہوگا، اور مختصر رسالوں کے دیکھنے سے ان کی طبیعت آشنائے علوم ہو جائے گی
پھر طالبین از خود ارادہ بسوط کتابوں کے دیکھنے کا کریں گے، چنانچہ ان دنوں میں
حسب مدعا چند رسالے مختصر علوم فلسفہ کے بطریق سوال و جواب کے لکھے ہوئے
ریورنڈ رنٹ چالس صاحب کے انگریزی زبان میں جو ۱۸۱۶ء میں بیچ شہر لندن کے
چھاپے گئے تھے بہم پہونچے۔"

کتاب کے ترجمہ کا نمونہ یہ ہے :-

"کشش ثقل کے بیان میں۔

استاذ۔ اب میں نے ارادہ کیا ہے کہ تم کو کیفیت و حقیقت سے کُلیۃً
عمدہ کی آگاہ کروں، جس کو کشش ثقل کہتے ہیں، اور وہ ایک قوت ہے جس کے
سبب اجسام بعیدہ باہمدیگر تجاذب رکھتے ہیں، اور یہ امر ظاہر ہے گرنے سے
تمام اجسام ثقیلہ کے زمین پر۔

تلمیذ کلاں۔ گولی ہاتھ سے گرنا، اور اینٹ کا چھت سے ساقط ہونا، اور
سیب کا جھاڑ سے زمین پر آنا یہ سب کیا بہ سبب اسی قوت کے ہیں؟

استاذ۔ ہاں بہ سبب اسی قوت کے ہیں جسکو کشش ثقل سے تعبیر کرتے ہیں
پس وہ اجسام جس میں کچھ بھی میل ہے، اگر ان کو کوئی تھامنے والا نہ ہو تو سطح
زمین پر قریب عمود دار گریں گے......"

اس دیباچہ اور ترجمہ میں بہ نسبت ابراہیم بیجاپوری کے ترجمۂ انوار سہیلی کے
دکنی زبان کا اثر بالکل نہیں ہے، حالانکہ ان دونوں میں دس بارہ سال کا پس و پیش ہے۔

۲۔ رسالۂ اعمال کرہ۔ یہ رسالہ بھی انھیں امیر کبیر کے اہتمام سے ترجمہ ہوا، اور سنہ ۱۸۴۱ء
میں طبع ہوا۔ اس میں چار باب ہیں، پہلے مقالے میں تعریفات، دوسرے میں جغرافیہ،
تیسرے اور چوتھے میں ہیئت۔ دو ایک مقام سے اس کے نمونے یہ ہیں :-

"سوال۔ جون کی دسویں کو آفتاب کون کون مقام میں عمود وار رہتا ہے، اور کون کون مقام میں طلوع اور غروب نہیں ہوتا؟

جواب۔ سندیلہ اور کلکتہ اور آوا اور مکا در جزیرہ چین وغیرہ میں آفتاب عمود وار رہتا ہے، اور منطقہ مبردۂ شمالی میں مکنزئی اور گرین دیدا اور کیپ میں غروب نہیں ہوتا، اور منطقہ مبردۂ جنوبی میں اس جگہ کہ جہاں تمام بحور ہیں' طلوع نہیں کرتا،"

"زحل کا بیان۔ یہ سیارہ مدھم روشنی سے نظر آتا ہے، آفتاب سے بہت دور ہے اور باستعانت بہتر آلہ دوربین کے اہل علم کو اس سیارے کی پیٹی کے دیکھنے سے حیرت ہوتی ہے، اور یہ پیٹی اس سیارے کے اطراف بتمامہ ایک حلقۂ روشن ہے۔ اور اس حلقہ کے باہر سات قمر گردش کرتے ہیں اور ان اقمار میں سے ایک قمر اس حلقہ کی سطح پر حرکت کرتا ہے۔"

---

(۳) محمد عثمان مبین

انھوں نے عقائد اسلام اور مسائل فقہ کے متعلق ایک کتاب لازم الاسلام ۱۲۶۱ھ/۱۸۴۵ء میں مرتب کی۔ اس میں سے "وحدت الوجود" کی بحث کا نمونہ "دکن میں اردو" سے نقل کیا جاتا ہے:۔

"جان کہ اے دوست تمام عالم میں نظر کر دتو خلق کئی کئی طرح کا ہے جو حدیث میں آیا ہے۔ عالم اٹھارا ہزار طرح کا ہے۔ بالفعل عالم دنیا کو دیکھو تو کوئی عاجز ہے کوئی مختار ہے، اور کوئی قابل ہے' اور کوئی نابکار ہے۔ اور کوئی نیک ہے کوئی بد ہے، اور کوئی بدشکل ہے' اور کوئی خوش قد ہے۔ پس معلوم ہوا کہ ہر سبب اپنے ہوتے ہیں، آپ ہی مختار ہوتے تو سب لوگ خوب وخوش اور نیک ہوتے جو

پسند خاطر ہر ایک ہے۔ یہاں یقین یہ ہوا کہ پیدا کرنے ہار ان کا کوئی جدا ہے کہ
ان کی قابلیت کے موافق پیدا کیا جیسا کہ کمہار مٹی سے طرح طرح کے باسن قابلیت
پر ہر ایک ظاہر کیا کرتا ہے۔ پس جان تو پیدا کرنے ہار اسب عالم کا شاید دوسرا
کوئی ہے۔"
یہ عبارت بھی باوجود آسان طرز بیان کے، صاف نہیں ہے۔ گنجلک پیدا ہو گئی۔

---

(۴) غلام امام خاں ترین حیدرآبادی

انھوں نے دو کتابیں لکھی ہیں جو تاریخ دکن کے سلسلے میں نہایت معتبر مانی جاتی ہیں:۔

(۱) تاریخ رشید الدین خانی۔ یہ سلاطین دہلی و دکن کی تاریخ ہے، جو غلام امام خاں نے شمس الامرا نواب رشید الدین خاں امیر کبیر ثالث کے حکم سے لکھی اور اپنے مربّی و مخدوم کے نام پر اس کا تاریخی نام رشید الدین خانی رکھا، یعنی ۱۲۷۰ھ میں مرتب[1] کی، اور یہی سنہ اس کے نام سے نکلتا ہے جو ۱۸۵۴ء کے مطابق ہے۔ چنانچہ مصنف

---

[1] اس کتاب کے سال تالیف کے سلسلے میں مولوی نصیر الدین ہاشمی اپنی کتاب (دکن میں اردو) میں لکھتے ہیں:۔ "اگرچہ کتاب ۱۲۷۰ھ میں طبع ہوئی ہے، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس کی ترتیب بہت پہلے شروع ہو چکی تھی۔ چنانچہ بہادر شاہ کے حال میں لکھا ہے:۔ "سلطنت دہلی کو بہادر شاہ بادشاہ وقت کے جلوس سے ان اوراق کی تحریر تک کہ آخر ذی حج ۱۲۳۵ھ ہے سولہ برس چھ مہینے پچیس دن ہوتے ہیں۔" یہاں یہ ۱۲۳۵ھ یقیناً غلط ہے خواہ ہاشمی صاحب کے نقل کرنے میں غلطی ہوئی ہو یا کتاب کے کاتب مطبع سے، یا اصل تاریخ کے ناقل و کاتب سے۔ اس لئے کہ بہادر شاہ ظفر آخری تاجدار مغلیہ ۱۲۵۳ھ (۱۸۳۷ء) میں تخت نشین ہوئے تھے۔ سال زیر بحث (باقی صفحہ ۲۸۲ پر)

دیباچہ میں لکھتے ہیں۔ (اقتباس درج کیا جاتا ہے)

اما بعد اس خوشہ چین خرمن اساتذۂ متقدمین و متاخرین، خادم الطلبہ نائب الشعرا غلام امام خاں ترین المتخلص بہ ہجر ابن محمد منور خاں ملک غفر اللہ ذنوبہ نے ۱۲۷۰ھ بارہ سے ستر ہجری نبوی میں بیچ عہد۔۔۔۔۔ میر فرخندہ علی خاں ناصر الدولہ بہادر خلد اللہ ملکہٗ و سلطانہٗ کے، حسب الحکم۔۔۔۔۔ نواب معلی القاب اقتدار الدولہ بہادر جنگ محمد رشید الدین خاں بہادر دام اقبالہٗ کے، خلاصہ احوال فرماں روایان ہند و دکن کا، راجہ ہائے کبار اور سلاطین والا اقتدار سے، ضمیمہ کیفیت ورود و نزول افسرانِ فرہنگ اہل فرنگ کے، اور جملہ سوانحات آشتی و جنگ اُنکے رؤسائے اس دیار کے ابتدائے عروج سے انتہائے زوال تک ہر ایک ریاست جداگانہ کے، کتب قدیم و جدید سے جمع فریق، اور اخبارات حال کے انتخاب کرکے، سلیس فقراتِ ہندی میں یہ ایک کتاب مختصر تیار کی ہے۔ تا ارباب امارت اور اصحاب متانت کو وقت تقریر اور تدبیر کے کار آمد ہو، اور نام اس کا اسم گرامی پر جناب ممدوح کے، رشید الدین خانی ہے۔ اور مادۂ تاریخ بھی "رشید الدین خانی"

یہ ضخیم کتاب ہے۔ بڑی تقطیع کے تقریباً ۸۰۰ صفحوں پر چھپی ہے۔ راجگان ہند سلاطین دہلی، اسلامی سلاطین دکن، مشاہیر دکن کے حالات لکھے ہیں۔ آخر میں

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۸۱) بہادر شاہ کے باپ اکبر شاہ ثانی کے سال جلوس ۱۲۲۱ھ (۱۸۰۶ء) سے سترہ برس بعد کا ہو سکتا ہے۔ اسکے علاوہ یہ ماننا پڑتا ہے کہ مصنف تاریخ "رشید الدین خانی" نے کم سے کم ۳۲ سال اس کی تالیف میں صرف کرکے ۱۲۷۰ھ میں اس کو ختم کیا، تو اتنے پہلے نواب رشید الدین خاں کا زمانہ اور ان کا حکم نہیں ہو سکتا اور کتاب کے نام اور دیباچہ سے ظاہر ہے کہ انھیں کیلئے لکھی گئی

انگریزوں کے دکن میں آنے، اور حیدر علی و ٹیپو سلطان سے جنگ کرنے کے واقعات بھی درج کئے ہیں۔

یہ عجیب بات ہے کہ غلام امام خاں مصنف "رشید الدین خانی" نے یہ دیباچہ کی عبارت جو بالیقین ان کی اپنی تحریر ہے ترجمہ نہیں ہے، بالکل طرز قدیم میں لکھی ہے بے قاعدہ ہے۔ لیکن خود کتاب کی عبارت نہایت صاف، مربوط، سلجھی ہوئی ہے نمونہ کے لئے "دکن میں اردو" سے آصف جاہ اول کا ایک واقعہ نقل کیا جاتا ہے:۔

"نواب چونکہ بہ نفس نفیس جمیع مقدمات مالی اور ملکی کا انصرام فرماتے تھے، مگر بعضے ندمانے فی الجملہ ان کے آرام کا خیال کر کے امرائے کبار میں سے ایک معتمد علیہ متدین کو تجویز کر کے جن کا نام راقم کو تحقیق نہیں ہوا، اس عہدہ کا مژدہ ان کو پونہچایا۔ محمد ابوالخیر خاں بہادر جو ایک دور اندیش شخص اور خیر خواہ سرکار تھے۔ انھوں نے اس کو نامناسب جانا اور شب کے وقت جس کی صبح کو کار خدمت ان کے سپرد ہونے والا تھا، ابوالخیر خاں در دولت پر حاضر ہوئے اور نواب کو اطلاع کرائی۔ نواب باہر تشریف لائے، اور فرمایا کہ نا وقت آنے کا کیا سبب ہے؟ عرض کیا جناب والا کل دیوان کیا چاہتے ہیں۔ میں اس بات کا خیال کرتا ہوں شاہجہاں آباد میں جب اس تقرری کا علم ہوگا تو وہ یقین کریں گے، آصف جاہ کبر سنی کی وجہ سے آرام طلب ہو گئے ہیں۔ اور یہ بات نامناسب ہوگی۔ تو نواب نے فرمایا میں تو حکم دے چکا ہوں۔ ابوالخیر خاں نے عرض کیا، کچھ مضائقہ نہیں ہے۔ دربار کے وقت بجائے عرض بیگی کے بندہ کو اعلام کا حکم ہو، فدوی اس وقت کچھ حکمت عملی کر گزرے گا۔ صبح کو جب اعلام کا حکم خان موصوف کیلئے ہوا، تو خان موصوف نے اس معتمد علیہ کا نام لیکر زبان فارسی میں ادا کی کہ "از خدمت صوبہ داری برہان پور فلاں شخص سرفرازی یافت"!

ہر چند ناواقف لوگ مع مذام کے کہتے رہے، نہیں اعلام دیوانی کا حکم ہے، مگر چوبدار
نے حسب ایماء خان موصوف جلد مجرا ادا کرا دیا، اور نذر پیش کرا دی۔"

یہ دونوں عبارتیں، دیباچہ و اصل کتاب کی، مشکل سے ایک شخص کی لکھی ہوئی تسلیم
کی جاسکتی ہیں۔ جو شخص اوپر کی سلیس و با اصول تحریر لکھ سکتا ہے اس سے تعجب ہے کہ
دیباچہ میں ایسی بے ربطی جائز رکھے۔ اس کے علاوہ اسی مصنف نے چودہ[۱۴] برس بعد
دوسری تاریخ لکھی ہے جس کا نیچے ذکر آتا ہے۔ اتنے عرصہ میں زبان اور طرز بیان نوْ یا نو
صاف ہونا چاہیے، ورنہ ایسا ہی رہنا چاہیے۔ لیکن مندرجہ ذیل نمونوں سے
معلوم ہوگا کہ دوسری کتاب (خورشید جاہی) کی دیباچہ و اصل مضمون کی عبارتیں
باہم مشابہ ہیں لیکن اتنی بامحاورہ و باقاعدہ نہیں ہیں جیسی "رشید الدین خانی"
کی مرقومہ بالا عبارت[۱] ہے۔

(۲) تاریخ خورشید جاہی۔ امیر کبیر ثالث موصوف الصدر کے فرزند خورشید جاہ
محمد محی الدین خاں بہادر امیر کبیر رابع کے حکم سے مرتب ہوئی۔ دیباچہ میں حال
تالیف لکھتے ہیں:۔

"سنہ ہذا میں کہ ایک ہزار دو سو[۱۲۸۴] چوراسی ہجری ہے، اس کمترین عقیدت
گزیں ہیچمیرز علماء دیں مولوی محمد امام خاں ترین ریاضی داں ملک تخلص کو فرمایا کہ
ایک کتاب علم تاریخ میں مختصر مفید، واسطے ملاحظہ اوقات گرامی ہمارے اور
فوائد عام خلائق کے، لکھ کر گزرانو، تاہم اس کو حلیۂ طبع سے آراستہ کر کے انعام
ارباب استعداد کا کریں۔ چونکہ یہ تحریر کتاب لاثانی "رشید الدین خانی" کے کہ

---

[۱] ہم نے دونوں کتابوں کے دیباچے مولانا احسن مارہروی کی تالیف (نمونہ منثورات) سے، اور دونوں
کتابوں کی درمیانی عبارتیں مولوی نصیر الدین ہاشمی کی کتاب (دکن میں اردو) سے نقل کی ہیں۔

کہ اس وقت تخلص نامہ نگار کا ہجر تھا۔ ان ایام میں فرصت حاصل تھی حسب الفرمان واجب الاذعان کے کرسی کی میان جان کے باندھ کر، ارادہ کیا ہے حسبی اللہ نعم الوکیل چونکہ اُس میں احوال صوبہ جات کا راستہ نہ تھا، اس واسطے اس کی ابتدا صوبہ جات سے کی گئی ہے، اور ذکر اولیاؤں کا اور سوانحات بادشاہان ایران و توران اور روم کے مندرج و مندمج ہیں۔ اور مفصل کیفیت حال چہار ۱۴ دہ سال کی ۱۲۷۰ھ سے زمانہ ہذا تک بیان کی گئی ہے؛ اور نام اس کا اسم گرامی پر ممدوح کے "خورشید جاہی" ہے؛ اور مادۂ تاریخ تاریخ جلیل ہے ؎

کتاب کی عبارت کا نمونہ یہ ہے۔ صوبہ خجستہ بنیاد کا حال لکھتے ہیں:۔

"اس صوبہ کو ملک مرہٹہ کہتے ہیں، پس زمانہ میں نظام شاہیہ کے صوبہ احمد نگر قرار پایا۔ صاحب نسخہ مجدیلے نے لکھا ہے کہ زمانہ سابق میں نام اس کا دیوگڈھ تھا، اور عہد میں راجہ بھوج کے دہارا کہا کرتے تھے۔ جب فخر الدین جونا شاہ دہلی نے تمام دکن پر قبضہ کیا تو قلعہ دیوگڈھ کا نام دولت آباد رکھا، اور دار السلطنت اپنا فرمایا۔ بعدہٗ نوبت فتوحات دکن کی اورنگ زیب عالمگیر کو پونچی، نزدیک ہمایوں موضع کھرکی میں ۱۰۳۰ھ میں ایک شہر کمال لطافت و استحکام کے ساتھ آباد کر کے نام اس کا خجستہ بنیاد اورنگ آباد رکھا"۔

شاہ علی قلعہ ادھونی (حیدرآباد دکن) کے رہنے والے تھے۔ نواب رشید الدین خان امیر کبیر ثالث کے حکم سے فن ریاضی کے دو رسالے ۱۲۸۱ھ / ۱۸۶۴ء میں مرتب کئے۔ ایک کا نام تذکرہ رکھا، دوسرے کا انوار بدریہ۔

انوار بدریہ کا نمونہ یہ ہے:۔

تعریف نسبت مساوات۔ مقادیر دو نصف کی جو مراتب میں برابر اور نسبت میں

ایسے ہوں کہ دو مقدار میں ایک صفت کے وہ نسبت ہو جو ہر دو مقدار میں
صفت آخر کی ہے۔ پس اطراف ہر صفت کے نسبت دینے کو اوساط نسبت مساوات
کہتے ہیں۔"
شمالی ہند میں بھی اس زمانے میں اور اس سے پہلے ریاضی، سائنس، فلسفہ
وغیرہ بہت سے علوم و فنون کی کتابیں تالیف و ترجمہ ہوئی ہیں جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے

دو چہارم کی نثر پر تبصرہ

(۱) یہ دور اس لئے یہاں ختم کیا گیا ہے کہ اس کے بعد سر سید احمد خاں کے زمانے
سے اردو زبان و ادب میں نمایاں انقلاب شروع ہو جاتا ہے۔ سر سید کی تصانیف۔
اخبار، سوسائٹی، کالج کے ذریعے سے تعلیم اور وسائل تعلیم بھی وسیع ہو گئے۔ اور
ان کے زیر اثر بہترین مصنف بھی پیدا ہونے لگے، جن کی اختراعات ادبی نے شمع راہ
کا کام کیا۔ سر سید کی کوششوں کے ساتھ ساتھ دہلی، لکھنؤ، لاہور وغیرہ بہت
سے مقامات پر تعلیمی ادارے قائم ہوئے، اور انفرادی و اجتماعی سعی و کاوش سے انیسویں
صدی کے ختم ہوتے ہوتے "کائنات اردو" ہی بدل گئی۔

(۲) سر سید کی مساعی علمی و ادبی اسی دور میں شروع ہو گئی تھیں لیکن بیشتر
تصانیف اور وسیع تر کارنامے غدر کے بعد کے ہیں۔ اور آخر صدی تک جاری رہے
ہیں۔ اس لئے ان کو دور آئندہ میں رکھا ہے لیکن سب سے پہلے۔

(۳) چوتھے دور میں زبان، محاورات، ترتیب الفاظ، پابندی قواعد، تمام
مصنفین میں تھوڑے بہت فرق کے ساتھ تقریباً یکساں ہیں۔ انشا و غالب سے

بہتر اردو کسی نے نہیں لکھی۔ اس زمانے میں غالب اس اعتبار سے نہایت ممتاز و منفرد ہیں
(۴) عبارت میں قافیہ پیمائی بہت مقبول ہے لیکن ادبیات لطیف" (افسانہ
و انشا) میں زیادہ پائی جاتی ہے۔ مذہب اور علوم و فنون کی کتابوں میں نہیں
ہے یا کہیں کہیں ہے۔ اس زمانے میں طرز بیان کی سادگی و شگفتگی عام نہیں ہے
(۵) اس دور میں یعنی انیسویں صدی کے ۷۰ سال میں (علاوہ فورٹ ولیم
کالج کے) ہر علم و فن کی کتابیں تصنیف ہوئیں۔ اگرچہ ان کا ایک حصہ چھپنے کے
بعد بھی اب کمیاب یا مفقود ہے، اور ایک حصہ مسودہ کی صورت میں رہا۔ لیکن
بہت سا لٹریچر معلوم و موجود ہے۔
(۶) دہلی کالج اور دہلی ورنیکولر ٹرانسلیشن سوسائٹی نے رواج تعلیم اور
اشاعت علوم میں بڑا کام کیا۔ ہزارہا ہندوستانیوں کو عالم و روشن خیال
بنایا، اور درجنوں مصنف و اہل قلم پیدا کر دیئے، جنھوں نے آیندہ دور کی
پیشوائی و رہنمائی کی۔
(۷) اس دور میں ہندو اہل قلم بھی اردو نثر کی ترقی میں برابر کوشش کرتے
رہے، ہر قسم کی کتابیں خصوصاً علوم و فنون، سائنس وغیرہ کی طرف بہت توجہ کی جیسا کہ
بعض نمونوں سے، اور مصنفین کی فہرست سے معلوم ہوا ہوگا، ان صاحبوں
کی تصانیف کے نمونے زیادہ دستیاب نہ ہو سکے۔
(۸) یورپین مصنفین نے بھی اردو میں اور اردو کے متعلق اپنی زبانوں میں
تصانیف کیں۔ اس دور کے یورپین مصنفین کے تذکرے اور نمونے، ان کی مساعی
علمی کو یکجا دکھانے کے لئے پہلے درج کر دیئے گئے ہیں۔ ان میں فرانسیسی
مستشرق گارساں دتاسی خاص طور پر قابل ذکر ہے اسکی تصانیف اور لکچر یادگار ہیں
اس کا حال اور فہرست تصانیف درج ہو چکی ہے۔

(۹) اس زمانے میں انگریز حکام کی اردو سے دلچسپی کی یہ مثالیں بھی یادگار ہیں کہ پنجاب کے لفٹنٹ گورنر نے، جنوری ۱۸۶۹ء کو لاہور میں دربار کیا جس میں خطابات اور خلعت دیے گئے۔ اس موقع پر لفٹیننٹ گورنر نے انگریزی میں نہیں بلکہ اردو میں تقریر کی۔ اس کے بعد فروری میں چیف کمشنر لکھنؤ نے اودھ کے تعلقداروں کا جلسہ کیا، اس میں بھی اس نے اردو میں تقریر کی۔

(۱۰) لیتھو اور ٹائپ کے مطابع، خصوصاً لیتھو کے (سنگی) چھاپے خانے نہایت کثرت سے جاری ہوئے، ۱۸۳۲ء سے اردو سرکاری زبان قرار پائی ۱۸۳۵ء سے اخبارات کو آزادی ملی۔ اس لئے اس سال کے بعد سے ۱۸۷۰ء تک تمام ہندوستان میں ایک سو کے قریب اخبارات و رسائل جاری ہوئے، جن میں سے بعض اسی دوران میں بند ہو گئے۔ بہت سے بعد تک جاری رہے چند اخبار مثلاً اودھ اخبار لکھنؤ، آگرہ اخبار، دبدبۂ سکندری رامپور آج تک جاری ہیں مطابع میں جس نے سب سے زیادہ ترقی کی، مطبع نول کشور ہے۔ یہ بھی اب تک قائم ہے اودھ اخبار اسی مطبع کا پرچہ ہے۔ آگرہ اخبار پریس اور دبدبۂ سکندری کا مطبع حسنی بھی باقی ہیں۔ ان کے علاوہ اور چند چھاپے خانے اسی زمانے سے اب تک موجود ہیں۔

(۱۱) علمی و اصلاحی انجمنیں بے شمار قائم ہوئیں، ان میں سب سے پہلی ورنیکولر ٹرانسلیشن سوسائٹی دہلی (قائم شدہ ۱۸۴۲ء) تھی اور وسعت خدمت کے لحاظ سے سب سے اعلیٰ سرسید کی سائنٹفک سوسائٹی (قائم شدہ ۱۸۶۲ء) اور زمانۂ زیر بحث میں باعتبار ترتیب قیام سب سے آخری نینی تال انسٹی ٹیوٹ (قائم شدہ ۱۸۶۹ء) یہ امراء و روسا کی انجمن تھی۔ اس کا مقصد تصنیف و تالیف نہ تھا۔ بلکہ مختلف ذرائع سے ملک میں تعلیم و روشن خیالی کی اشاعت کرنا تھا۔ ان کے

علاوہ شاہجہانپور، اٹاوہ، بنارس، بدایوں، مرادآباد، الہ آباد، لاہور، بہار وغیرہ مقامات پر الگ الگ انجمنیں اور سوسٹیاں قائم ہوئیں۔ جنھوں نے تصنیف، ترجمہ، اخبار تقریر وغیرہ تمام ذرائع علم وادب کی ترقی کے لئے استعمال کئے۔

(۱۲) مذہبی مناظرے، علمی مباحثے، اور شعر وسخن کے مشاعرے بھی جاری رہے جن کے وسیلوں سے اردو کی خدمت ہوتی رہی۔ گارسان دتاسی (جس کے خطبات سے اس تبصرہ کی اکثر معلومات اخذ کی گئی ہیں) کے آخری خطبہ میں مذکور ہے کہ اس دور کا آخری شاندار مشاعرہ ۱۶ اکتوبر ۱۸۶۹ء کو آگرہ میں ہوا۔ دتاسی لکھتا ہے کہ "اودھ اخبار مورخہ ۲۸ ستمبر ۱۸۶۹ء میں اُن شعرا کے لئے ہدایات کا اعلان شائع ہوا جو اس مشاعرے میں شرکت کرنا چاہتے ہیں۔ ان ہدایات میں یہ بھی ہے کہ شعرا پہلے سے اپنے نام، تخلص، مذہب، عمر، استاد کا نام، اور یہ کہ آیا استاد زندہ ہے یا فوت ہوگیا، مطبوعہ دواوین کے نام اور دوسرے حالات کے متعلق اطلاع دیدیں"

غرض یہ "عہد اردو" آیندہ ادبی انقلاب اور علمی ترقی کے لئے پیش خیمہ تھا جس نے آنے والی نسلوں کے لئے راستہ بنادیا۔

نثر اردو کا پانچواں دور

سنہ ۱۸۷۱ء ۱۲۸۸ھ تا سنہ ۱۹۰۰ء ۱۳۱۸ھ

سر سید احمد خاں

سید احمد خاں[1] ۱۷ اکتوبر سنہ ۱۸۱۷ء مطابق ۵ ذی الحجہ سنہ ۱۲۳۲ھ کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ باپ کی طرف سے سید تھے۔ ان کا سلسلہ نسب امام نہم حضرت امام محمد تقی علیہ السلام تک پہنچتا ہے اسی لئے وہ اپنے آپ کو تقوی سید کہتے تھے۔ غالباً ان کے بزرگ ہندوستان میں شاہجہاں کے عہد میں آئے۔ اور اس وقت سے اکبر شاہ ثانی کے زمانے تک ان کو سلطنت مغلیہ کے ساتھ برابر کسی نہ کسی قدر تعلق رہا۔ سر سید کے بزرگوں میں سے ایک شخص سید محمد دوست دکن کی مہم میں اورنگ زیب عالمگیر کے ساتھ تھے اور مع اپنی جمعیت کے ایک مورچہ پر متعین تھے۔ جب اس مورچہ کو انھوں نے تنہا بلا شرکت کسی

---

[1] سر سید کے حالات مولانا حالی کی حیات جاوید سے ماخوذ ہیں، بلکہ اسی کتاب کی عبارت کو مختصر کر کے مسلسل کر دیا ہے۔

دوسرے افسر کے فتح کرلیا تو عالمگیر نے ان کو یکہ بہادر کا خطاب دیا۔ سرسید کے دادا سید ہادی تھے، ان کو بادشاہ عالمگیر ثانی کے سنہ ۲ جلوس (۱۷۵۵ء / ۱۱۶۸ھ) میں جواد علی خاں کا خطاب اور منصب ہزاری ذات و پانصد سوار ملا، اور ان کے بھائی سید مہدی کو بھی وہی منصب اور قباد علی خاں خطاب دیا۔ قباد علی خاں دکن چلے گئے، اور وہیں انتقال کیا۔ جواد علی خاں (سرسید کے دادا) بدستور دہلی میں بادشاہ کے پاس رہے۔ جب عالمگیر ثانی کا زمانہ ختم ہوا، اور شاہ عالم بادشاہ ہوئے (۱۷۵۹ء / ۱۱۷۲ھ تا ۱۸۰۶ء / ۱۲۲۱ھ) تو سرسید کے دادا کے خطاب میں جوادالدولہ کا اضافہ ہوا، اور عہدہ احتساب درصوبہ شاہجہاں آباد عنایت ہوا۔ اور پھر ۱۷۷۴ء / ۱۱۸۸ھ میں عہدہ قضائے لشکر پر متعین ہوئے۔ اسی سال انھوں نے انتقال کیا۔ سرسید کہتے تھے کہ "سید ہادی فارسی شعر کہتے تھے اور ان کا پورا دیوان ان کے ہاتھ کا لکھا ہوا میرے پاس موجود تھا جو غدر کے زمانے میں تلف ہو گیا۔" سید ہادی کے بیٹے، یعنی سرسید کے والد میر متقی، ایک آزاد طبیعت کے آدمی تھے۔ جب سید ہادی کے بعد ان کا خطاب اور منصب میر متقی کو دیا جانا تجویز ہوا تو انھوں نے اس کو قبول کرنا مصلحت نہ سمجھا، مگر چونکہ ان کو اکبر شاہ کے ساتھ شاہزادگی کے زمانے سے نہایت خلوص اور خصوصیت تھی اس لئے شاہ عالم کے انتقال کے بعد ان کا رسوخ دربار میں پہلے سے بھی زیادہ ہو گیا تھا؛ اور وہ دربار خاص میں جہاں خاص خاص لوگوں کے سوا کوئی نہ جا سکتا تھا، برابر جاتے تھے۔ سرسید کہتے تھے کہ "میں بارہا اپنے والد کے ساتھ اور نیز تنہا بھی اس خاص دربار میں گیا ہوں۔" سرسید کے والد کو حضرت شاہ غلام علی سے جن کی خانقاہ دہلی میں مشہور ہے بیعت تھی، اور شاہ صاحب ان پر پدرانہ شفقت رکھتے تھے۔

سرسید کی ننھیال خواجہ میر درد کے خاندان سے علاقہ رکھتی تھی۔ سرسید کے نانا خواجہ فریدالدین احمد، خواجہ محمد یوسف ہمدانیؒ کی اولاد میں تھے۔ آپ کے

بھائی خواجہ نجیب الدین نواح دہلی میں "شاہ فدا حسین" کے نام سے مشہور ہیں یہ بڑے عالم اور خوش بیان تھے، لیکن "رسول شاہی" فرقہ میں داخل ہو گئے تھے، اس لئے چار ابرو کا صفایا کئے، ایک غرقی باندھے، بھبوت ملے بیٹھے رہتے تھے۔ سر سید کے حقیقی نانا دبیر الدولہ امین الملک خواجہ فرید الدین احمد خاں بہادر مصلح جنگ خاندان میں سب سے زیادہ با اقبال لائق دانشمند، صاحب علم و فضل اور خاص کر ریاضیات میں وحید عصر تھے۔ زیج اور آلات رصد کے علم میں اپنا نظیر نہ رکھتے تھے، اور خود آلات رصد کے بنانے پر قادر تھے۔ علم ہیئت اور آلات رصد کے متعلق چند رسالے بھی تصنیف کئے تھے۔ ان میں سے ایک کا سر سید نے اردو میں ترجمہ کر دیا ہے۔ انکے چھوٹے بیٹے نواب زین العابدین خاں سر سید کے ماموں بھی فنون ریاضی کے ماہر تھے۔ خواجہ فرید الدین تحصیل علوم کے بعد ۱۷۹۷ء ۱۲۱۲ھ میں مدرسہ کلکتہ میں (جو فورٹ ولیم کالج سے پہلے قائم ہوا تھا اور آج تک ہے) سات سو روپیہ ماہوار تنخواہ پر سپرنٹنڈنٹ ہو گئے۔ وہاں سے گورنر جنرل مارکوئس ویلزلی نے ان کو ایران میں سفارت پر بھیجا۔ اس کے بعد برما میں ایک پولٹیکل معاملے کے طے کرنے کو بطور ایجنٹ کے بھیجا۔ ۱۸۱۵ء میں اکبر شاہ ثانی بادشاہ دہلی نے کلکتہ سے بلا کر وزیر سلطنت بنایا اور خطاب دبیر الدولہ امین الملک مصلح جنگ عنایت کیا۔ یہ بھی اپنے بھائی کی طرح رسول شاہیوں میں داخل تھے۔ لیکن وہ وضع اختیار نہ کی تھی۔ مرنے سے دو سال پہلے اپنے مرشد کی پوری پوری پیروی کرنے کے لئے صرف ایک بار چار ابرو کا صفایا کرایا تھا۔

سر سید کی والدہ نہایت دانشمند، نیک دل، پاک سرشت تھیں۔ انکی تربیت و اخلاق کا سر سید کی حیات و سیرت پر خاص اثر ہوا ہے۔ ان کا خاندان حضرت شاہ عبد العزیز صاحبؒ کا معتقد و مرید تھا، لیکن وہ خود حضرت شاہ غلام علیؒ سے

ارادت رکھتی تھیں۔ ان کی خانقاہ میں نذر نیاز، تعویذ گنڈے کا رواج تھا۔ اس لئے سرسید کی والدہ بھی ان چیزوں کی معتقد نہ تھیں۔ لیکن ان سے بالکل منکر و مانع بھی نہ تھیں سرسید کا بیان ہے کہ:۔

"میری ننھیال والے اگرچہ عام توہمات میں مبتلا نہ تھے، مگر شاہ عبدالعزیز صاحب کے ہاں جو کچھ ہوتا تھا اس پر سب اعتقاد رکھتے۔ شاہ عبدالعزیز اور انکے ہاں کے بزرگ بچوں کو ایک گنڈا دیا کرتے تھے، اور اس کے ساتھ ایک تعویذ ہوتا تھا جس میں ایک ہندسہ یا حرف سفید مرغ کے خون سے لکھا جاتا تھا۔ اور جس بچے کو دیا جاتا تھا اس کو بارہ برس کی عمر تک انڈا یا مرغی کھانے کی ممانعت ہوتی تھی۔ سید حامد اور سید محمود (سرسید کے بیٹے) کو بھی ان کی ننھیال والوں نے وہ گنڈے پہنائے تھے۔ باوجود اس کے میری والدہ جب کبھی وہ ان کے ساتھ کھانا کھاتے اور کھانے میں انڈا یا مرغی ہوتی تو وہ بے تامل ان کو کھلا دیتیں۔"

سرسید کے نانا خواجہ فرید الدین کا انتقال ۱۸۲۸ء/۱۲۴۴ھ میں ہوا۔ والد کا ۱۸۳۸ء/۱۲۵۴ھ میں بڑے بھائی سید محمد خاں منصف ہنگام ضلع فتحپور کا ۱۸۴۵ء/۱۲۶۱ھ میں۔ والدہ کا ۱۸۵۷ء/۱۲۷۴ھ میں۔ سرسید کے بھائی شاہ غلام علی صاحب سے بیعت تھے اور بڑے پاک باطن تھے۔ ان کا مرنا اہل اللہ کا سا مرنا تھا۔ دسہرے کی تعطیل میں دہلی آئے تھے۔ وہاں بخار کی فصل تھی۔ سید محمد خاں کو بھی بخار آنے لگا۔ ان کو یقین ہو گیا کہ اب وقت آگیا۔ اسی حالت میں حضرت خواجہ باقی باللہ رحمتہ اللہ علیہ کی درگاہ گئے۔ اپنی قبر کے لئے جگہ پسند کی۔ جب قبر تیار ہو گئی تو سوار ہو کر وہاں پہنچے۔ قبر میں اتر کر لیٹے۔ بہت پسند کی۔ دوسرے دن کفن کے لئے کپڑا منگوایا۔ سلوا کر پہنا، پسند کیا۔ پھر ایک دن حضرت شاہ احمد سعید صاحبؒ کو (جو ان کے پیر و مرشد کے سجادہ نشین تھے) بلایا اور ان کے ہاتھ پر تجدید بیعت کی۔ اور تیسرے دن انتقال کیا۔ ایسے ہی لوگوں کے لئے

شیخ سعدی نے کہا ہے۔

ہر دسی بود نوبت ماتمت　　چو بر نیک روزی بود خاتمت

مفتی صدرالدین خاں آزردہ نے جو سرسید کو ان کے بھائی کی تعزیت کا خط بھیجا تھا، اس میں یہ شعر لکھا تھا:-

قسمت نگر کہ کشتہ شمشیر عشق یافت　　مرگے کہ زندگاں بدعا آرزو کنند

سرسید کی تعلیم | سرسید کی بسم اللہ کی تقریب حضرت شاہ غلام علی صاحبؒ کے مبارک ہاتھوں سے عمل میں آئی۔ شاہ صاحب حضرت میرزا مظہر جانجاناں رحمتہ اللہ علیہ کے سلسلہ نقشبندیہ کے خلیفہ تھے۔ سرسید کو شاہ صاحب سے بسم اللہ پڑھنے پر بڑا فخر تھا۔ بڑے ہو کر انھوں نے اس موقع کے لئے یہ شعر کہا تھا، اور اپنی تقریب بسم اللہ کے ذکر پر اس شعر کو بھی پڑھا کرتے تھے:-

بمکتب رفتم و آموختم اسرار یزدانی　　ز فیض نقشبند وقت، جان[1] جان جانانی

اس کے بعد تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا۔ قرآن مجید کے بعد فارسی و عربی پڑھی، صرف و نحو، معانی و بیان و بدیع، منطق و فلسفہ، ریاضی، اقلیدس، ہیئت، تمام علوم میں بصیرت پیدا کی۔ فن طب بھی حاصل کیا اور چند مہینے مطب بھی کیا۔ دہلی میں جو اہل علم اور فارسی دانی میں نام آور تھے جیسے صہبائی، غالب، آزردہ وغیرہ، ان سے ملنے کا اور علمی مجلسوں میں بیٹھنے کا اکثر موقع ملتا رہا۔ پھر نوکر ہونے کے بعد جب فتحپور سے بدلکر دہلی میں آئے تو مولوی نوازش علی دہلی کے مشہور عالم و واعظ سے پچھلی پڑھائی کو تازہ کیا۔ فقہ و اصول فقہ پڑھا، مولوی فیض الحسن سہارنپوری سے مقامات حریری و سبعہ معلقہ پڑھے۔ مولانا مخصوص اللہ سے جو شاہ عبدالعزیز صاحب کے بھتیجے اور

---

[1] جان جاناں حضرت میرزا مظہرؒ، اور ان کی جان حضرت شاہ غلام علیؒ۔

شاہ رفیع الدین صاحب کے خلف الصدق تھے، حدیث پڑھی، پھر قرآن مجید کی سند لی استادوں سے تو اتنا ہی پڑھا، لیکن اپنا مطالعہ ہمیشہ جاری رکھا۔ سرسید کے شوق علم کے متعلق یہ واقعہ بھی یادگار ہے کہ جب وہ دہلی سے قائم مقام صدرامین ہو کر رُہتک جانے لگے۔ اس وقت مولوی نوازش علی سے تکمیل تعلیم کر رہے تھے۔ مولوی صاحب سے کہا، آپ میرے ساتھ چلئے۔ انھوں نے عذر کیا کہ میرے پاس بہت سے طالب علم ہیں۔ ان کو چھوڑ کر کیسے چلا جاؤں۔ سرسید نے کہا سب کو لے چلئے۔ ان کے مصارف کا میں ذمہ دار ہوں۔ مولوی صاحب بڑے حیران ہوئے۔ آخر سرسید مولوی صاحب کو اور ان کے سب شاگردوں کو لے گئے، اور جب تک وہاں رہے سید کے اخراجات کے کفیل رہے۔ اور یہ لطیفہ بھی قابل ذکر ہے کہ غازی پور میں سرسید کے پاس ایک یہودی سالم نام، (صنعا یمن) کا رہنے والا آیا، اور کہا کہ تمام ہندوستان میں معاش کی تلاش میں پھرا ہوں، کہیں کوئی صورت نہیں نکلی۔ سرسید نے پوچھا کیا تنخواہ لوگے؟ اس نے دس یا پندرہ روپیہ کہے۔ سرسید نے کہا، میں تم کو پچیس روپیہ مہینہ دونگا، مجھے عبرانی زبان سکھاؤ، یہودی نے یہ سن کر خوشی کے مارے بڑھ کر سرسید کی داڑھی چوم لی، اور کہا کہ آج تک مجھے ایسا کوئی شخص نہیں ملا جس نے درخواست سے زیادہ دیا ہو۔ سرسید نے اس کو نوکر رکھ لیا، مگر چونکہ وہ مُسرف اور آوارہ مزاج تھا اس لئے اس کو بقدر ضرورت دیتے رہے، اور اس کی باقی تنخواہ جمع کرتے رہے۔ جب وہ وطن کو جانے لگا تو کئی سو روپیہ جو اس کا چڑھا ہوا تھا۔ حساب کر کے اس کے حوالے کر دیا۔

سرسید کی جوانی سرسید کا زمانۂ شباب رنگین صحبتوں میں گزرا تھا، باغوں کی سیر، میلوں، تماشوں، راگ رنگ کے جلسوں میں شریک ہوتے تھے۔ خود بھی بڑے زندہ دل، بذلہ سنج، حاضر جواب تھے۔ دہلی میں ایک مشہور طوائف شیریں جان نہایت

حسین تھی۔ لیکن اس کی ماں بھدی اور سانولے رنگ کی تھی۔ ایک مجلس میں جہاں وہ اپنی ماں کے ساتھ مجرے کے لئے آئی تھی، سرسید بھی تھے۔ اور وہیں ان کے ایک قندھاری دوست بھی بیٹھے تھے۔ وہ اس کی ماں کو دیکھ کر بولے،

"مادرش بسیار تلخ است" سرسید نے فوراً یہ مصرع پڑھا:-

گرچہ[1] تلخ است ولیکن بر شیریں دارد

لیکن بھائی کے مرتے ہی سرسید کا دل رنگین صحبتوں سے اُچاٹ ہو گیا۔ لباس اور وضع میں جو اس وقت بانکپن سمجھا جاتا تھا یک قلم ترک کر دیا۔ سر گھٹوا لیا، داڑھی چھوڑی، پائینچے متشرع کر لئے، کرتا پہن لیا۔ رنگین طبع نوجوانوں کی صحبت رفتہ رفتہ کم ہونے لگی، اور روز بروز مولویت کا رنگ چڑھنے لگا۔

سرسید کی ملازمت سرسید کے والد کو قلعہ شاہی سے تنخواہ ملتی تھی۔ انکے انتقال کے بعد وہ آمدنی بند ہو گئی۔ معافی کی ملکیں بھی والد کی حیات تک تھیں، وہ بھی ضبط ہو گئیں تو ان کو سرکار انگریزی کی نوکری کا خیال پیدا ہوا۔ ان کے خالو مولوی خلیل اللہ خاں دہلی میں صدر امین تھے۔ انھوں نے ۱۸۳۸ء میں سرسید کو اپنی کچہری میں سررشتہ دار مقرر کر دیا۔ پھر فروری ۱۸۳۹ء سے کمشنری آگرہ کے دفتر میں نائب منشی ہو گئے وہیں منصفی کا امتحان پاس کیا۔ دسمبر ۱۸۴۱ء میں منصف مین پوری مقرر ہوئے جنوری ۱۸۴۲ء میں مین پوری سے فتحپور سیکری آ گئے اور وہاں چار برس منصف رہے۔ فتحپور سیکری میں جہاں اکبر بادشاہ کی خوابگاہ تھی، حسن اتفاق سے وہی عالی شان مکان سرسید کو رہنے کے لئے ملا، یہ چاروں برس اسی مکان میں گزرے۔

---

[1] یہ مصرع اس طرح ضرب المثل ہے "صبر تلخ است ولیکن بر شیریں دارد"

اسی زمانے میں بہادر شاہ آخری تاجدار دہلی نے سر سید کو ان کا موروثی خطاب عنایت کیا۔ ۱۸۴۲ء میں دہلی آئے ہوئے تھے حکیم احسن اللہ خاں نے بادشاہ سے سفارش کی۔ بادشاہ نے سر سید کو بلا کر "جوا دالدولہ سید احمد خاں عارف جنگ" کا خطاب دیا۔ اور خطاب ملنے کی تمام رسمیں حسب قاعدہ ادا کی گئیں۔

۱۸۴۶ء میں فتحپور سیکری سے دہلی تبدیل ہو گئے۔ یہاں سے دوبار قائم مقام صدر امین ہو کر رہتک بھی گئے۔ جنوری ۱۸۵۵ء میں مستقل صدر امین مقرر ہو کر دہلی سے بجنور کو تبدیل ہو گئے۔ بجنور میں سوا دو برس گزرے تھے کہ غدر ہو گیا۔

غدر میں سر سید کی خدمات | ۱۰ ارمئی ۱۸۵۷ء (۱۶ ار رمضان ۱۲۷۳ھ) کو دہلی میں بغاوت ہوئی، اور ۱۲ ارمئی کو یہ خبر بجنور پہنچ گئی۔ وہاں اس وقت بیس یوروپین اور یوریشین عورتوں اور بچوں سمیت تھے۔ مسٹر شیکسپیر کلکٹر و مجسٹریٹ تھے۔ جب بجنور میں بغاوت کے آثار نمودار ہوئے تو یہ لوگ بہت گھبرائے، لیکن سر سید نے جا کر ان کی تشفی کی، اور کہا کہ

"جب تک ہم زندہ ہیں آپ کو گھبرانا نہیں چاہئے، جب آپ دیکھیں کہ ہماری لاش کوٹھی کے سامنے پڑی ہے، اس وقت گھبرانے کا مضائقہ نہیں"

چنانچہ سر سید مع اور ہندوستانی افسروں کے تمام رات مسلح ہو کر کلکٹر کی کوٹھی پر پہرا دیتے تھے۔ ساری رات کرسیوں پر بیٹھے یا کوٹھی کے آگے ٹہلتے، یا شہر میں گشت کرتے گزر جاتی تھی۔ آخر کار باغیوں کو نشیب و فراز سمجھا کر انگریزوں کے قتل سے باز رکھا، اور سب کو رڑکی روانہ کر دیا۔ انگریزوں کے جانے کے بعد بجنور میں باغیوں کی عملداری ہو گئی۔ اور وہ لوگ سر سید کے اور ان کے رفقا میر تراب علی اور ڈپٹی رحمت خاں کے قتل کے درپے ہو گئے سر سید نے ایک مہینے تک بجنور کا انتظام بخوبی قائم رکھا۔ لیکن باغی دشمن ہو گئے تھے اس لئے

سر سید اور ڈپٹی رحمت خاں میرٹھ کے ارادے سے روانہ ہو گئے۔ راستے میں مختلف مقامات پر چند بار باغیوں نے ان کے قتل و غارت کا ارادہ کیا لیکن ہر موقع پر بعض خیر خواہ زمینداروں نے بچا لیا۔ اثنائے راہ میں چاند پور سے چل کر سرسید نے بچھراؤں پونچ کر علالت اور راستے کی کوفت کے سبب سے چند روز مولوی محمود[۱] عالم صاحب کے مکان پر، جو ان کے دوست تھے، مقام کیا، اور اپنی مفصل سرگزشت حکام انگریزی کو لکھ بھیجی، اور چند روز بعد خود بھی میرٹھ چلے گئے۔

سرسید میرٹھ میں کئی مہینے رہے۔ وہاں معلوم ہوا کہ دہلی میں انگریزی فوج کے سپاہیوں نے ان کا گھر اسباب لوٹ لیا۔ ان کے ماموں اور ماموں زاد بھائی مارے گئے۔ ان کی والدہ اور خالہ دہلی میں تھیں۔ سرسید میرٹھ سے دہلی آئے، گھر تباہ ہو چکا تھا۔ ماں خالہ کو میرٹھ لے گئے۔ انگریزوں نے رڑکی میں اپنی فوج جمع کر لی

---

[۱] مولوی محمود عالم صاحب رحمۃ اللہ علیہ خاکسار مولف کے پردادا تھے۔ حضرت بابا فرید گنج شکر قدس اللہ سرہ العزیز کی اولاد میں تھے۔ اور سلسلۂ چشتیہ نظامیہ میں حضرت شاہ نیاز احمد صاحب بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ تھے۔ زمانہ غدر میں اپنے وطن بچھراؤں (ضلع مراد آباد) میں رضا و توکل اور سکون و وقار کے ساتھ بیٹھے رہے۔ اہل قصبہ نے لوٹ مار کے ڈر سے اپنا زر و زیور ان کے پاس رکھ دیا تھا۔ مولوی محمود عالم صاحبؒ مرزا غالب کے ہم عمر تھے اور ان سے بھی مراسم رکھتے تھے۔ دہلی کی آمد و رفت کے زمانے میں سرسید سے بھی تعلقات قائم ہوئے ہونگے غالب سے دو سال پہلے ۴ ذی قعدہ ۱۲۸۳ھ مطابق ۱۱ مارچ ۱۸۶۷ء کو وفات پائی سرسید کے قیام بچھراؤں کا ذکر مولانا حالی کی "حیات جاوید" مطبوعہ ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۶ سے ماخوذ ہے۔ باقی تمام حالات بھی اسی کتاب سے تقریباً مولانا حالی ہی کے الفاظ میں نقل کئے گئے ہیں۔

سرسید بھی تمام عملۂ بجنور کے ساتھ بحکم سرکار رڑکی بلا لیے گئے۔ تمام روہیل کھنڈ
سخت باغی تھا، بجنور، مرادآباد، بریلی کے ضلعے سرکشوں کے زیر اثر تھے۔ ان اضلاع پر
قبضہ کرنے کے لئے رڑکی سے فوج روانہ ہوئی۔ سرسید بھی ساتھ تھے۔ اس موقع پر
سرسید نے کمال دلیری و دانشمندی سے کام لیا۔ حکام سرکاری میں یہ بحث پیش آئی
کہ اب ان اضلاعِ سرکش میں کون لوگ باغی تصور کئے جائیں۔ سرسید نے اس باب
میں افسران فوج سے گفتگو کی، اور بہت بحث مباحثہ کے بعد یہ طے کرالیا کہ سرکار
کے نزدیک باغی صرف وہی لوگ قرار پانے چاہئیں جو اب سرکار سے مقابلے کے
ساتھ پیش آئیں۔ باقی جو فسادات رعایا، ہندو مسلمان، دونوں نے ایک دوسرے
کے مقابلے میں کئے، ان کے سبب سے کسی کو سرکار کے مقابلے میں باغی قرار نہیں
دیا جاسکتا۔ اس وقت اگر سرسید یہ جرأت نہ کرتے، اور یہ فیصلہ نہ کرادیتے تو ضلع
بجنور بالکل تباہ ہوجاتا۔ خصوصاً کوئی مسلمان اس ضلع میں باقی نہ رہتا۔ سرسید کی
اس دانشمندی کے سبب سے ضلع بجنور غدر کے نتائج میں سب سے کم مبتلا ہوا۔
اور ضلع مرادآباد میں ضبط شدہ جاگیریں سب سے زیادہ واپس دی گئیں۔

خدمات غدر کا صلہ | گورنمنٹ کی خیرخواہی اور وفاداری جو سرسید سے ظہور میں
آئی، وہ کسی خلعت یا انعام کی توقع پر مبنی نہ تھی۔ لیکن گورنمنٹ نے ان کی خدمات
کی قدر کی اور ان کے صلے میں ایک خلعت قیمتی ایک ہزار روپیہ کا اور دو سو روپیہ
ماہوار کی پولیٹیکل پنشن دو نسلوں تک مقرر کی۔ میر صادق علی اور میر رستم علی رئیسان
چاندپور ضلع بجنور کا تعلقہ اس جرم میں کہ ان کی عرضی بادشاہ دہلی کے دفتر سے
برآمد ہوئی تھی، سرکار نے ضبط کرلیا تھا۔ اور جس طرح دیگر خیرخواہان سرکار کو باغیوں
کی ضبط شدہ جائدادیں دی گئیں تھیں یہ تعلقہ چاندپور سرکار نے سرسید کو دینا
چاہا لیکن انھوں نے صاف انکار کردیا۔ سرسید نے خود ایک مرتبہ اسکے

متعلق کہا تھا کہ

"بعوض اس وفاداری کے تعلقہ جہاں آباد جو سادات کے ایک نامی خاندان کی ملکیت اور لاکھ روپیہ سے زیادہ مالیت کا تھا مجھ کو دینا چاہا تو میرے دل کو نہایت صدمہ پہنچا. میں نے اپنے دل میں کہا کہ مجھ سے زیادہ کوئی نالائق دنیا میں نہ ہوگا. کہ قوم پر تو یہ بربادی ہو اور میں ان کی جائداد لیکر تعلقہ دار بنوں"

غدر کے بعد اپریل ۱۸۵۸ء میں سر سید صدر الصدور ہو کر مراد آباد گئے. وہاں چند کتابیں لکھیں. ۱۸۶۰ء میں وہاں سخت قحط پڑا. قحط کا انتظام سر سید نے ایسی خوبی سے کیا کہ انسانی ہمدردی کا اس سے بہتر نمونہ ملنا مشکل ہے. قحط زدوں کی سرکاری امداد کے علاوہ خود سر سید کے مکان پر ہر روز ایک دیگ سالن کی اور روٹیاں محتاجوں کو تقسیم ہوتی تھیں. مراد آباد کے ایک عالم اور رئیس مولوی عالم علی کو بغاوت کے الزام اور سزائے موت سے بچایا. مولوی صاحب نے چند یورپین عورتوں اور بچوں کو اپنے مکان میں پناہ دی تھی. باغیوں نے زبردستی گھر میں گھس کر ان سب کو قتل کر دیا. اور مولوی صاحب کے گھر کا آدمی کوئی نہ مارا گیا ان پر الزام یہ لگایا گیا کہ ان کے اشارے سے یہ قتل عمل میں آیا. سر سید نے مولوی صاحب کی بے گناہی ثابت کر کے بری کرا دیا. چار برس کے بعد ۱۸۶۲ء میں سر سید کی بدلی مراد آباد سے غازی پور کو ہو گئی. وہاں بھی علمی و تعلیمی کام کرتے رہے. (ان کاموں کا ذکر الگ عنوان میں آئے گا) ۱۸۶۴ء میں غازی پور سے علی گڈھ کو تبدیل ہوئے. ۱۸۶۷ء میں عہدۂ جج خفیفہ پر ترقی پا کر علی گڈھ سے بنارس گئے. یکم اپریل ۱۸۶۹ء کو بنارس سے انگلستان روانہ ہوئے. دونوں بیٹے سید حامد اور سید محمود ساتھ تھے. سفر کا مقصد سید محمود کی تعلیم کے علاوہ ولایت کے طریقۂ تعلیم کا مطالعہ و مشاہدہ تھا. لندن میں ان کو سی. ایس. آئی کا خطاب اور تمغہ ملا

مشاہیر و عمائدِ ملک سے ملاقات کی۔ ملکہ وکٹوریا اور پرنس آف ویلز کی "لیوی" اور بالِ عام ایں شریک ہوئے بعض کلب کے ممبر بنائے گئے، وہاں کی یونیورسٹیوں، کتب خانوں، کارخانوں کو غور سے دیکھا۔ ان سب باتوں کے سوا سر سید کا سب سے زیادہ ضروری اور اہم مقصد ولایت کے سفر سے ایک ایسی کتاب کو لکھنا اور انگریزی میں اس کا ترجمہ شائع کرنا تھا جس سے اسلام کی اصلیت عیسائی قوموں پر ظاہر ہو، اور جو غلطیاں اکثر عیسائی مصنفوں نے اور خاص کر سر ولیم میور (لفٹنٹ گورنر صوبہ شمال مغرب) نے اپنی کتاب لائف آف محمد میں اسلام کی حقیقت اور بانی اسلام کی سیرتِ پاک کے متعلق کی ہیں ان کو رفع کیا جائے۔ چنانچہ سر سید نے لندن میں ایک مختصر رسالہ انگریزی میں شائع کیا۔ اور ولایت سے آکر مفصل کتاب اردو میں چھپوائی۔ ولایت میں تقریباً ڈیڑھ سال رہ کر سر سید مع بڑے بیٹے سید حامد کے اکتوبر ۱۸۷۰ء میں ہندوستان آگئے۔ اور بنارس میں اپنے عہدے کا چارج لے لیا۔ بنارس ہی کے زمانۂ قیام میں ۱۸۷۵ء میں ایک ابتدائی مدرسہ علی گڑھ میں قائم کیا اور پھر جولائی ۱۸۷۶ء سے پنشن لیکر مستقل طور پر علی گڑھ میں رہنے لگے

سر سید کی وفات | پنشن کے بعد ۲۲ برس ہمہ تن قومی خدمات میں مصروف رہ کر ۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء کو ۱۰ بجے رات کے علی گڑھ میں انتقال کیا۔ اور کالج کی مسجد میں دفن ہوئے۔ تواریخ وفات عربی الفاظ اور قرآنی آیات سے بے نظیر نکلی ہیں، یعنی۔

غَفَرَ لَهُ (۱۳۱۵) إِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِيْن (۱۳۱۵) إِنِّي مُتَوَفِّيكَ وَرَافِعُكَ إِلَيَّ وَمُطَهِّرُكَ (۱۳۱۵) [1]

---

[1] قرآن مجید سے یہ تاریخ علامہ ڈاکٹر اقبال نے نکالی تھی جیسا کہ انھوں نے ایک بار محمد حسن صاحب قرشی سے کہا تھا۔ (ملفوظات اقبال مرتبہ محمود نظامی ص ۵۱)

سرسید کے خطابات و اعزازات شاہی خطاب "جواد الدولہ عارف جنگ" کا پہلے ذکر آچکا ہے۔ گورنمنٹ نے سی۔ ایس۔ آئی کے بعد ۱۸۸۸ء میں "کے سی ایس آئی" کا خطاب دیا۔ ایڈنبرا یونیورسٹی نے ۱۸۸۶ء میں "ایل ایل ڈی" کی اعزازی ڈگری دی۔ لندن جانے سے پہلے "رایل ایشیاٹک سوسائٹی لندن" کے فیلو مقرر ہوگئے تھے لندن میں وہاں کے سب سے زیادہ نامی اور معزز کلب ایتھی نیم کلب کے ممبر بنائے گئے۔ ۱۸۶۹ء میں وائسرائے کی لیجسلیٹو کونسل کے ممبر مقرر ہوئے اور چار برس ممبر رہے۔ ۱۸۸۲ء میں ایجوکیشن کمیشن کے ممبر ہوئے اور شہادت دی۔ ۱۸۸۶ء میں پبلک سروس کمیشن کے ممبر مقرر ہوئے۔

سرسید کی ملکی و قومی خدمات | سرسید نے ہنگامہ غدر کے سلسلے میں اپنے ملک و قوم کی جو خدمتیں کیں ان کے علاوہ ہندوستان کے لئے عموماً اور اسلام اور مسلمانوں کے لئے خصوصاً فلاح و صلاح کی جدوجہد شروع کر دی تعلیمی میدان میں پہلا قدم یہ تھا کہ

(۱) ۱۸۵۹ء میں ایک فارسی مدرسہ مرادآباد میں قائم کیا۔

(۲) اسی سال رسالہ اسباب بغاوت ہند لکھ کر مسلمانوں کی طرف سے گورنمنٹ کی بدگمانی رفع کرنے کی کوشش کی۔

(۳) ۱۸۶۳ء میں غازی پور میں سائنٹفک سوسائٹی قائم کی، اور علمی کتابیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرائیں۔

(۴) اسی سال غازی پور میں انگریزی مدرسہ ہندو مسلمان دونوں کے لئے قائم کیا۔ غازی پور سے علی گڑھ بدلی ہوئی تو سوسائٹی کا دفتر بھی ساتھ آگیا علی گڑھ میں اس کیلئے تیس ہزار روپیہ لاگت سے عمارت اور باغ تیار ہوا۔ اس میں ہر مہینے سائنس پر لکچر دیا جاتا تھا۔ اور آلات سے تجربے دکھاتے جاتے تھے

تاریخ، معاشرت، کاشتکاری کے متعلق بہت سی کتابوں کے ترجمے شائع کئے گئے۔

(۵) ۱۸۶۶ء میں علی گڑھ میں سرسید نے ایک انجمن "برٹش انڈین ایسوسی ایشن" کے نام سے قائم کی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستانی اپنے حقوق حاصل کرنے کے لئے پارلیمنٹ سے تعلق پیدا کریں اور اس ایسوسی ایشن کے ذریعہ سے اپنے تمام مقاصد مطالب گورنمنٹ اور پارلیمنٹ تک پہنچائیں۔ چنانچہ ریل اور ڈاک خانہ کی بعض آسانیاں حاصل کی گئیں۔

(۶) ۱۸۶۷ء میں اور اس کے بعد سرسید کی تحریک سے مختلف اضلاع شمال مغرب میں تعلیمی کیٹیاں قائم کی گئیں جن میں ضلع کے رئیس اور زمیندار بھی شامل تھے۔

(۷) ۱۸۶۶ء ہی میں سرسید نے سائنٹفک سوسائٹی سے ایک اخبار علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ جاری کیا۔ جو آج تک جاری ہے لیکن اس کا نام مسلم یونیورسٹی گزٹ رکھدیا گیا ہے۔

(۸) ۱۸۶۷ء میں سرسید نے اردو یونیورسٹی قائم کرنے کی تجویز گورنمنٹ کے سامنے پیش کی جس میں تمام علوم و فنون کی تعلیم مادری زبان میں ہو۔ اسی زبان میں امتحان لئے جائیں، اور جو سندیں انگریزی خواں طلبہ کو علم کی مختلف شاخوں میں دی جاتی ہیں وہی سندیں ان طلبہ کو دی جائیں جو انھیں مضمونوں کا دیسی زبان میں امتحان دیکر کامیاب ہوں۔ اس یونیورسٹی کے لئے تمام علوم و فنون کی کتابیں اپنی سوسائٹی کی نگرانی میں ترجمہ و تالیف کرانے کا سرسید نے ذمہ لیا اور اہتمام شروع کردیا۔ منجملہ دیگر اہل علم و قلم کے مولوی ذکاء اللہ، ماسٹر پیارے لال آشوب اور پنڈت دھرم نرائن بھی اس خدمت کے لئے آمادہ ہوگئے لیکن یونیورسٹی کی تجویز آگے نہ بڑھ سکی اس لئے کہ سرسید کو گورنمنٹ کا یہ ارادہ

معلوم ہوا کہ وہ کلکتہ یونیورسٹی کو توڑ کر ورنیکولر یونیورسٹی قائم کرنا چاہتی ہے جس میں انگریزی بطور اختیاری زبان کے رہے گی، اور سرسید یہ نہ چاہتے تھے کہ ہندوستانی انگریزی زبان سے محروم رہ جائیں۔ اس کے علاوہ اردو زبان کے مخالفوں نے اخباروں میں چھیڑ چھاڑ شروع کر دی کہ سرسید کی مجوزہ یونیورسٹی میں مسلمانوں کے لئے اردو، اور ہندوؤں کے لئے ہندی زبان ہو۔ آخر سرسید نے اس کا خیال ہی چھوڑ دیا۔

(۹) بنارس میں سرسید کو یہ خیال پیدا ہوا کہ ہومیو پیتھک علاج کے طریقہ سے بہتر کوئی طریقہ علاج عمدہ بے خطر نہیں ہے، چنانچہ ۱۸۶۷ء میں انھوں نے بنارس میں اس علاج کے رواج کے لئے ایک کمیٹی بنائی جس کے پریزیڈنٹ مہاراجہ بنارس اور سکریٹری سرسید تھے۔ اور ایک شفا خانہ بنام ہومیو پیتھک ڈسپنسری اینڈ ہاسپٹل کھولا گیا۔ اس شفا خانہ کا چرچا چند روز میں نزدیک و دور ہو گیا پہلے مہینے ہی میں پانچ سو سولہ مریض شفا خانہ میں آئے۔ سرسید نے اس علاج کے اصول پر لکچر بھی دیا اور ایک رسالہ بھی لکھ کر چھپوایا۔

(۱۰) ۱۸۶۷ء میں بنارس کے بعض سربرآوردہ ہندوؤں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ جہاں تک ممکن ہو تمام سرکاری عدالتوں میں سے اردو زبان اور فارسی خط کے موقوف کرانے کی کوشش کی جائے اور بجائے اس کے بھاشا زبان جاری ہو جو دیوناگری میں لکھی جائے۔ چنانچہ ہندوؤں نے اس کام کے لئے کمیٹیاں اور سبھائیں بنائیں اور گورنمنٹ کو میموریل بھیجے۔ سرسید کہتے ہیں کہ یہ پہلا موقع تھا جبکہ مجھے یقین ہو گیا کہ اب ہندو مسلمانوں کا بطور ایک قوم کے ساتھ چلنا اور دونوں کو ملا کر سب کے لئے ساتھ ساتھ کوشش کرنا محال ہے۔ سرسید نے اردو کی حمایت میں مضامین لکھے۔ اس وقت اردو کے مخالفوں کی تدبیریں

کارگر نہ ہوئیں۔ بت ۱۸۸۲ء میں پھر ہندوؤں نے ایجوکیشن کمیشن کو میموریل بھیجے۔ سرسید
باقاعدہ طریقے سے کمیشن پر ظاہر کر دیا کہ یہ مسئلہ تعلیمی نہیں ہے بلکہ بہت بڑا پولیٹیکل
مسئلہ ہے جس کے ساتھ گورنمنٹ کے مصالح ملکی وابستہ ہیں۔ اس کی بحث ایجوکیشن
کمیشن سے کچھ علاقہ نہیں رکھتی۔ اس کے بعد مارچ ۱۸۹۸ء میں جبکی ستائیسویں
کو سرسید نے دنیا سے رحلت کی، ہندوؤں نے سرانٹونی مکڈانل لفٹننٹ گورنر کی
خدمت میں پھر ایک میموریل اردو کی مخالفت اور ہندی کی حمایت کے لئے پیش
کیا۔ اگرچہ سرسید پر اس زمانے میں ہجوم رنج والم کے سبب سے (جس کا سب سے بڑا
باعث سرسید کے بڑے بیٹے سید حامد کی علالت اور سوء مزاج تھا) ایسا سکتہ کا سا عالم
طاری تھا کہ وہ بالکل نقش دیوار بن گئے تھے، مگر اسی حالت میں انھوں نے
اس مسئلہ پر ایک مضمون لکھا جو ۱۹ر مارچ کے "انسٹی ٹیوٹ گزٹ" میں سرسید
کی وفات سے نو دن پہلے شائع ہوا۔ یہ غالباً ان کی آخری قومی تحریر تھی، اس میں
بھی ان کی فطری صاف گوئی نمایاں ہے۔ مضمون کے شروع میں لکھتے ہیں:۔

"غالباً اس وقت ان کے (یعنی ہندوؤں کے) اس جوش کے اٹھنے کا سبب
یہ ہے کہ اس صوبہ کے ہز آنر لفٹنٹ گورنر بہادر اُس زمانے میں جبکہ صوبہ بہار
میں کیتھی حرف اور بہاری زبان بعوض اردو زبان اور فارسی خط کے جاری
ہوئی تھی، کلکٹر و مجسٹریٹ معاون اس تجویز کے تھے، پس ان صوبوں میں بھی
ہندی وناگری حروف جاری ہونے میں تامل نہ فرمائیں گے۔ اور شاید یہ غلط
خیال بھی اس پرانے مردہ مضمون کے اٹھانے کا باعث ہوا ہو کہ ان دنوں میں
گورنمنٹ کی نظر عنایت مسلمانوں کی نسبت کم ہے۔ اور وہ ان کو ناشکرا سمجھتی ہے"

اس کے بعد انھوں نے میموریل کے خلاف اردو زبان اور فارسی خط کی ترجیح پر دلیلیں
پیش کی ہیں۔ اس وقت ہز آنر نے عدالتوں کی زبان میں کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں

بھی لیکن سرسید کے انتقال کے بعد ۱۰ راپریل ۱۹۰۰ء کو وہ مشہور رزولیوشن پاس ہوا جو دونوں قوموں کو سر انٹونی مکڈانل کا عہد حکومت ہمیشہ یاد دلائے گا یعنی عدالت کی زبان بجائے ہندی و اردو کے انگریزی قرار دیدی گئی۔

(۱۱) سرسید کا سفر لندن بھی قوم کی خاطر تھا، وہاں بھی قوم و مذہب کی خدمت سے غافل نہ رہے جس کا پہلے ذکر کیا گیا۔ ولایت سے آکر ایک رسالہ تہذیب الاخلاق جاری کیا، جس کا پہلا نمبر ۲۴ر دسمبر ۱۸۷۰ء مطابق یکم شوال ۱۲۸۷ھ کو نکلا۔ اس پرچہ کے ذریعے اردو صحافت میں، انشا پردازی میں، اخلاق و معاشرت میں، عام معلومات میں اس قدر ترقی اور اتنا اچھا انقلاب پیدا ہوا کہ اُس زمانے کے بیسیوں اردو رسائل و اخبارات سے نہ ہو سکتا تھا۔ سرسید کے علاوہ بہترین اہل علم و قلم اس کے مضمون نگار تھے۔ "تہذیب الاخلاق" کے بعض مذہبی مباحث سے مسلمانوں نے اختلاف کیا، جوابات لکھے، سرسید پر کفر کے فتوے لگائے، اس رسالہ کے جواب میں رسالے نکالنے شروع کئے، یہ سب کچھ ہوا لیکن اس سے اردو زبان و ادب کو بڑا نفع پہنچا۔ "تہذیب الاخلاق" کی سلیس، بااصول، پُرزور نثر نگاری نے تمام ملک میں یہی طرز نگارش عام کر دیا۔ تہذیب الاخلاق پہلی بار ۱۸۷۰ء / ۱۲۸۷ھ سے ۱۸۷۶ء / ۱۲۹۳ھ تک جاری رہا۔ دوسری بار ۱۸۷۹ء / ۱۲۹۶ھ سے ۱۸۸۱ء / ۱۲۹۹ھ تک۔ تیسری بار ۱۸۹۴ء / ۱۳۱۱ھ سے ۱۸۹۷ء / ۱۳۱۴ھ تک۔ سرسید کی وفات کے بعد "تہذیب الاخلاق" کی جلدوں سے سرسید، نواب محسن الملک، مولوی چراغ علی، نواب وقار الملک وغیرہ مضمون نگاروں کے مضامین کے مجموعے مرتب کر دیے گئے۔ جو ان بزرگوں کی مستقل تصانیف کا حکم رکھتے ہیں۔

(۱۲) سرسید نے "تہذیب الاخلاق" کے ساتھ ہی ۲۶ر دسمبر ۱۸۷۰ء کو بنارس میں کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان قائم کی۔ اس کے مقاصد کا اعلان

پہلے سے اشتہار و اخبار کے ذریعہ سے کر دیا گیا تھا کہ

"انگریزی حکومت سے جو تعلیم کے فائدے لوگ عام طور پر اٹھا رہے ہیں، اور مسلمان ان سے مستفید نہیں ہوتے اس کے اسباب دریافت کرنے کی طرف خود مسلمانوں کو متوجہ ہونا چاہیے۔ نیز یہ کہ اس بیماری کی اصل جڑ دریافت کرنی گورنمنٹ کو بھی ضرور ہے۔ پس مناسب ہے کہ ایک انعامی اشتہار جاری کیا جائے، اور مسلمانوں کو اس مسئلہ پر مضامین لکھنے کی ترغیب دی جائے، اور اس کام کے لئے مسلمانوں اور انگریزوں سے چندہ جمع کیا جائے۔"

چنانچہ نواب کلب علی خاں بہادر رئیس رامپور، کنور وزیر علی خاں رئیس دانپور اور سر ولیم میور لفٹننٹ گورنر شمال مغرب نے اس کام کی طرف خاص توجہ کی انعامی اشتہار جاری کیا گیا، تین انعام پانسو، تین سو اور ڈیڑھ سو روپیہ کے مقرر ہوئے۔ میعاد معیّن کے اندر ۳۲ مضمون مختلف لوگوں کے لکھے ہوئے موصول ہوئے۔ مولوی مہدی علی خاں (نواب محسن الملک) کا مضمون سب سے عمدہ تھا۔ مگر ان کی خواہش سے وہ انعام کی فہرست سے خارج رکھا گیا۔ اور پہلا انعام مولوی سید اشرف علی ایم اے کو ملا، جو اس زمانے میں بنارس کالج کے طالب علم تھے۔ دوسرا انعام نواب انتصار جنگ مولوی مشتاق حسین (وقار الملک) کو، اور تیسرا انعام مولوی عبدالودود کو ملا۔ سر سید نے ان مضامین سے رپورٹ تیار کر کے شائع کی۔ اسی رپورٹ میں مجوزہ علی گڑھ کالج کی اسکیم بھی تھی۔ گورنمنٹ ہند اور لوکل گورنمنٹوں نے قیام کالج کی تجویز کو پسند کیا اور ہر طرح کی امداد دینے کا وعدہ کیا

(۱۳) مجوزہ مدرستہ المسلمین کا سرمایہ جمع کرنے کیلئے سر سید نے کمیٹی خزینۃ البضاعۃ قائم کی جس میں لارڈ نارتھ بروک وائسرائے و گورنر جنرل نے دس ہزار روپیہ اور سر ولیم میور لفٹننٹ گورنر نے ایک ہزار روپیہ دیئے۔

(۱۴) ۲۴ رمئی ۱۸۷۵ء کو علی گڑھ میں ابتدائی مدرسہ کی رسم افتتاح ادا کی گئی۔ اور یکم جون سے جماعت بندی ہو کر تعلیم شروع ہو گئی۔ قیام مدرسہ کی تاریخ مولوی صفدر حسین نے خوب کہی ہے۔ قطعہ کا آخری شعر یہ ہے:-

تھی فکر مجھ کو اک دن تاریخ مدرسہ کی | بولا یہ ملہم غیب "اٹھارہ سے بچپن[1]"

۱۲۹۲ھ

(۱۵) ۸ر جنوری ۱۸۷۷ء کو لارڈ لٹن وائسرائے نے علی گڑھ میں محمڈن اینگلو اورنٹیل کالج کا سنگ بنیاد رکھا، اور یکم جنوری ۱۸۷۸ء سے کالج کلاس قائم ہو گیا۔ ۱۸۸۳ء تک ایف اے، بی اے، اور قانون کے امتحانات کے لئے کلکتہ یونیورسٹی سے اس کالج کا الحاق ہو گیا۔ اس کے بعد سائنس، آرٹس اور قانونی تعلیم میں الہ آباد یونیورسٹی سے اس کا تعلق ہو گیا۔ اور آج وہی کالج مسلم یونیورسٹی بنا ہوا ہے۔

(۱۶) سرسید ۱۸۷۸ء سے ۱۸۸۲ء تک وائسرائے کی لیجسلیٹو کونسل کے ممبر رہے اس عرصہ میں انھوں نے دو قانونی مسودے کونسل میں پیش کئے۔ چیچک کے ٹیکے کا قانون، اور قاضیوں کے تقرر کا قانون۔ یہ دونوں مسودے پاس ہو گئے اور اس وقت سے آج تک ان کے موافق ہندوستان کے اکثر حصوں میں عمل درآمد چلا آتا ہے۔ تیسرا نہایت ضروری و مفید مسودۂ قانون وقف خاندانی (یا وقف علی الاولاد) کے متعلق تیار کیا تھا، تاکہ ذی مقدور خاندانوں کی اولاد موروثی جائداد کو فروخت نہ کر سکے اور وہ چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم اور قرضہ میں نیلام نہ ہو سکے۔ لیکن اس وقت مختلف وجوہ سے سرسید یہ مسودۂ قانون کونسل میں پیش نہ کر سکے۔ اب "قانون وقف علی الاولاد" پاس ہو گیا ہے اور رائج ہے۔

---

[1] لفظوں میں عیسوی سنہ ظاہر کیا گیا ہے، اور اعداد سے ہجری سنہ نکلتا ہے۔

(۱۷) اس کے علاوہ سر سید نے قانون انتقال جائداد، قانون حقوق استفادہ قانون ترمیم ضابطہ فوجداری، قانون لوکل سیلف گورنمنٹ متعلقۂ اضلاع متوسطہ کے کونسل میں پیش ہونے پر جیسی پرزور اور باوقعت تقریریں کیں، ان کو سن کر کونسل کے انگریز ممبر اور خود وائسرائے بھی حیران تھے۔ سر سید برائے نام انگریزی جانتے تھے اپنے دستخط کر سکتے تھے اور چند جملے ٹوٹے پھوٹے بول سکتے تھے۔ لیکن کونسل میں اسپیچ دینے کے لئے اکثر چھوٹی چھوٹی تقریروں کو وہ اول خود اردو میں ۔ پران کا انگریزی میں ترجمہ کراتے تھے، اور پھر انگریزی الفاظ کو فارسی حرفوں میں لکھ کر خود کونسل میں پڑھتے تھے۔ اور بڑی بڑی اسپیچوں کو کونسل کا سیکرٹری پڑھ کر سنا دیتا تھا۔ سر سید کی ایک انگریزی اسپیچ پر جو فارسی حرفوں میں لکھ کر دی تھی لارڈ لٹن نے بڑا تعجب ظاہر کیا تھا۔ سر سید کہتے تھے کہ۔

"جب میں اجلاس ختم ہونے کے بعد کونسل کے ہال سے اپنے کمرے کی طرف چلا تو لارڈ لٹن بھی پیچھے پیچھے چلے آئے، اور مہربانی سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگے کہ میں نے ایسی قابل اسپیچ کبھی نہ سنی تھی"۔

(۱۸) ۱۸۸۲ء میں جبکہ سر سید کونسل کے ممبر تھے، ان کی شہادت بھی ایجوکیشن کمیشن میں لی گئی تھی جس سے ان کا بڑا تجربہ کار ایجوکیشنسٹ (ماہر تعلیم) ہونا ثابت ہوتا ہے۔ اس کمیشن کے چند سوالات یہ تھے۔

"کیا مغربی علوم کی تعلیم دیسی زبانوں میں بہ نسبت انگریزی کے زیادہ مفید ہو گی؟" "کونسی تدبیر سے تعلیم کی آزادی اور اس کا اختلاف نوعی محفوظ رکھا جا سکتا ہے؟" "گورنمنٹ کو کس کس حد تک ہر قسم کی تعلیم کی امداد دینی مناسب ہے؟" "گرانٹ ان ایڈ (امداد تعلیمی) کا قاعدہ جو بالفعل مروج ہے وہ کافی ہے یا نہیں؟" گورنمنٹ مسلمان لڑکیوں کی تعلیم میں کہاں تک کوشش کر سکتی ہے اور

اس میں کامیابی کی کیا توقع ہے ؟"

اس طرح کے سب سوالوں کے جواب سرسید نے نہایت دانشمندی معاملہ فہمی، صداقت اور دلیری کے ساتھ دئے۔ پھر ۱۸۸۳ء میں گورنر جنرل کی کونسل میں سی پی لوکل سیلف گورنمنٹ بل پیش ہوا۔ اس میں "سادہ وعام انتخابات" کی تجویز کی گئی تھی یعنی تمام صوبہ کا مشترکہ و مخلوط انتخاب کیا جائے۔ اس کے یہ معنی تھے کہ جس قوم کی آبادی زیادہ ہوگی اسی کے ممبر زیادہ منتخب ہوں گے۔ سی پی یعنی صوبجات متوسط میں ہندوؤں کی تعداد نہایت کثرت سے تھی۔ تو ممکن تھا کہ مسلمان ممبر ایک بھی منتخب نہ ہو یا اتنے کم ہوں کہ لوکل بورڈ اور کمیٹی میں انکی کوئی آواز نہ سنی جائے۔ اس بنا پر سرسید نے اس بل کی نہایت سختی سے مخالفت کی۔ سرسید اس سے پندرہ برس پہلے ۱۸۶۶ء میں ہندوؤں کی ہمدردی اور تعاون عمل سے مایوس ہو چکے تھے (جیسا کہ اوپر کہیں اردو ہندی کے قضیہ میں خود سرسید کا قول نقل کیا جا چکا ہے) سرسید نے گورنر جنرل کی کونسل میں پرجوش تقریر کی اور تفصیلی دلائل کے ساتھ ثابت کیا کہ ہندوستان میں سب قوموں کا یکجائی و بلا امتیاز انتخاب جاری کرنا نہایت خطرناک ہے۔

(۱۹) ۱۸۸۳ء میں سرسید نے "محمڈن سول سروس فنڈ ایسوسی ایشن" قائم کی، تاکہ اس کے چندے سے مسلمان لڑکوں کو انگلستان بھیجا جائے اور سول سروس کے امتحان مقابلہ، یا ولایت کی کسی یونیورسٹی کی ڈگری یا بیرسٹری، ڈاکٹری، انجینیری کا ڈپلوما حاصل کرنے میں اعانت کی جاتے۔

(۲۰) ۱۸۸۶ء میں سرسید نے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس قائم کی، یہ ہندوستان میں سب سے بڑی تعلیمی انجمن تھی۔ سرسید کی زندگی میں اس کے گیارہ اجلاس ہوئے اتنے ہی عرصے میں اس کانفرنس کے ذریعے تمام ہندوستان کے مسلمانوں میں بیداری

پیدا ہوگئی، بے شمار انجمنیں، مکاتب، اسکول قائم ہوئے۔ کتابیں تصنیف و ترجمہ ہوئیں، تعلیمی مردم شماریاں ہوئیں، غیر سرکاری اسکولوں میں مذہبی تعلیم کا انتظام کیا گیا۔ طالب علموں کو وظائف دئے گئے۔ اسی طرح سے مسلمانوں کی اصلاح حال اور ترقی تعلیم کا ہر ممکن وسیلہ اختیار کیا گیا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد یہ کانفرنس جس کا مرکز علی گڑھ تھا ختم ہوگئی۔ اور کراچی میں اس نے پاکستان مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے نام سے دوبارہ جنم لیا۔

(۲۱) "انڈین نیشنل کانگریس" کی مخالفت بھی سرسید کا ایک کارنامہ ہے ایجوکیشنل کانفرنس سے ایک سال پہلے کانگریس قائم ہوئی تھی۔ پہلے یہ مجلس بنگالیوں نے بالو سرندر ناتھ بنرجی کی سعی و مشورہ سے کلکتہ میں قائم کی تھی اور اس کا نام "بنگال نیشنل لیگ" رکھا تھا۔ پھر اسی سے انڈین نیشنل کانگریس کی تشکیل کی گئی پہلے اس کا جو مقصد مشتہر کیا گیا تھا اس کا خلاصہ یہ تھا کہ گورنمنٹ نے جن حقوق کے دینے کا ہندوستانیوں سے وعدہ کیا ہے اس کا مطالبہ کیا جائے۔ اس کے بعد مختلف پمفلٹوں کے ذریعہ سے جو خیالات شائع کئے گئے ان میں گورنمنٹ کی بے انصافی اور موجودہ طریقۂ حکومت کی برائی ایسے طور پر ظاہر کی گئی جس سے خاص کر جاہل اور ناعاقبت اندیش لوگوں کے دل پر برا اثر پڑتا تھا۔ اور گورنمنٹ کی طرف سے غلط خیالات پیدا ہونے کا اندیشہ تھا۔ پھر بھی سرسید نے دو سال تک کانگریس کی رفتار اور کارروائی کو بغور دیکھا آخر یہ رائے قائم کرنے پر مجبور ہوئے کہ گورنمنٹ کے انتظام پر نکتہ چینی کرنا اور ایجی ٹیشن (شورش) پھیلانا بعینہ ایسا ہے جیسے سلطنت سے بغاوت اختیار کرنا بس مسلمانوں کی خیر اسی میں ہے کہ وہ ایجی ٹیشن سے بالکل علیحدہ رہیں۔ چنانچہ ۲۸ دسمبر ۱۸۸۷ء کو جبکہ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا دوسرا اجلاس لکھنؤ میں اور انڈین نیشنل کانگریس کا تیسرا اجلاس مدراس میں ہو رہا تھا

مسلمانوں کے عام جلسہ میں سر سید نے کانگریس کے خلاف نہایت مفصل اور پُرزور لکچر دیا۔ اس کے بعد ۱۶ مارچ ۱۸۸۸ء کو میرٹھ میں دوسرا لکچر ایسا ہی طولانی دیا۔ اور پھر مضامین، تقریروں اور زبانی گفتگو کے ذریعہ سے علانیہ مخالفت شروع کردی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت کم مسلمان کانگریس میں شریک ہوئے اس کام میں کانفرنس کے وجود نے بھی مدد دی دونوں کا انعقاد دسمبر کے ہفتہ آخری میں ہوتا تھا۔ اس لئے ہزارہا مسلمان کانفرنس کی طرف متوجہ رہتے تھے۔

(۲۲) اس کے بعد اگست ۱۸۸۸ء میں سر سید نے علی گڑھ میں پیٹریاٹک ایسوسی ایشن (مجلس محبانِ وطن، اس غرض سے قائم کی کہ جو قومیں اور رئیس اور تعلقہ دار وغیرہ کانگریس میں شریک نہیں ہیں۔ ان کی رائیں اور خیالات اور خط کتابت بطور پمفلٹ کے وقتاً فوقتاً انگریزی میں چھپوا کر اہل انگلستان اور ممبران پارلیمنٹ کی اطلاع کے لئے ولایت کو بھیجی جائے؛ اور نیز اخبارات کے ذریعہ سے ہندوستان اور انگلستان میں عام طور پر شائع کی جائے۔ اس ایسوسی ایشن کے قائم کرنے کا یہ نتیجہ ہوا کہ بنگال، بہار، مدراس، بمبئی، ممالک متوسطہ، اضلاع شمال مغرب و اودھ اور پنجاب کی بے شمار اسلامی انجمنوں میں کانگریس کے برخلاف جلسے کئے گئے۔ تمام تعلقہ داران اودھ۔ مہاراجہ بنارس ریاست حیدرآباد اور دیگر ریاستوں کی طرف سے ایسوسی ایشن کے ساتھ اتفاق کیا گیا۔ ان تدبیروں سے گورنمنٹ کو یقین دلایا گیا کہ کانگریس میں ہندوستان کی بہت سی قومیں اور خاص کر مسلمان شریک نہیں ہیں۔ سر سید ایک خط میں بدرالدین طیب جی کو کانگریس کے ایجی ٹیشن میں مسلمانوں کی شرکت کے نقصانات کا ذکر کرکے لکھتے ہیں کہ:-

غدر میں کیا ہوا؟ ہندوؤں نے شروع کیا۔ مسلمان دل چلے تھے بیچ میں کود پڑے

ہندو تو گنگا نہا کر جیسے تھے ویسے ہی ہو گئے، مگر مسلمانوں کے تمام خاندان تباہ و برباد ہو گئے۔"

سر سید کی گوناگوں خدمات کا یہ مختصر خاکہ ہے، جو "حیات جاوید" سے تقریباً مولانا حالیؔ ہی کے الفاظ میں اختصار کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ اس میں ان کی مذہبی خدمات شامل نہیں ہیں۔ ان کا ذکر ان کی تصانیف کے سلسلے میں آئے گا۔

سر سید کی تصانیف اور علمی و مذہبی خدمات

سنہ ۱۸۳۵ء میں اخبارات کو آزادی ملی، اسی سال سر سید کے بڑے بھائی سید محمد خاں نے دہلی سے سید الاخبار جاری کیا۔ سر سید کی سب سے پہلی علمی و ادبی خدمت اس اخبار میں مضمون نویسی تھی۔

(۱) جام جم (فارسی) ملازمت آگرہ کے زمانے میں سر سید نے فارسی زبان میں ایک فہرست بطور نقشہ کے مرتب کی۔ اس میں امیر تیمور سے بہادر شاہ تک ۴۳ بادشاہوں کا مختصر حال لکھا۔ سنہ ۱۸۴۰ء میں چھپ کر شائع ہوئی۔

(۲) جلاء القلوب بذکر المحبوب۔ مولفہ سنہ ۱۸۴۲ء / ۱۲۵۸ھ مولود شریف کی محفلوں میں پڑھنے کے لئے سر سید نے اس رسالہ میں اس زمانے کے خیالات کے موافق صحیح روایتیں درج کیں۔

(۳) تحفۂ حسن، مولفہ سنہ ۱۸۴۴ء / ۱۲۶۰ھ۔ حضرت شاہ عبد العزیز صاحب محدث دہلوی کی تصنیف تحفۂ اثنا عشریہ کے باب دہم و دوازدہم کا ترجمہ۔ یہ رسالہ شیعوں کی تردید میں لکھا تھا۔ اس کے بعد سر سید نے کبھی شیعوں کے عقائد و اعمال سے تعرض نہیں کیا۔

(۴) تسہیل فی جر الثقیل، مطبوعہ سنہ ۱۸۴۴ء۔ ابو ذر یمنی کے عربی رسالہ سے کسی عالم بو علی نے فارسی میں ترجمہ کیا تھا، اور "معیار العقول" نام رکھا تھا، سر سید نے فارسی سے

اردو میں ترجمہ کیا تھا، اس رسالہ میں مصنف نے جر ثقیل کے پانچ اصول بیان کئے ہیں۔ یعنی بھاری چیزوں کے اٹھانے، سخت چیزوں کے چیرنے، دبانے، نچوڑنے کے لئے پانچ کلیں بتائی ہیں، اور ان کے بنانے اور استعمال کرنے کا طریقہ اور مختلف ترکیبیں بیان کی ہیں۔

(۵) آثار الصنادید۔ یہ کتاب سرسید کا نہایت عجیب و نادر کارنامہ و یادگار ہے اور اردو میں اپنی نوع کی پہلی چیز۔ اور جس محنت و کاوش سے مرتب کی گئی اسکے لحاظ سے کم سے کم ہندوستان میں اور اردو میں آخری چیز بھی ہے۔ اسمیں عمارات دہلی کا حال ہے۔ عمارات بیرون شہر، لال قلعہ و عمارات قلعہ، عمارات شہر دہلی یعنی تمام حویلیوں، مسجدوں، مندروں، بازاروں، باؤلیوں، کنوؤں وغیرہ کے حالات ان کے نقشے، تصویریں، کتبے، دہلی کے پرانے شہروں، قلعوں، محلوں کا بیان، پھر مشاہیر اہل دہلی کا حال لکھا ہے، جس میں ایک سو بیس مشائخ، علما، فقرا مجاذیب اطبا، قرا، شعرا، خوشنویس، مصور، موسیقی داں وغیر کا بیان ہے۔ اکثر عمارتوں کے عرض و طول و بلندی کی پیمائش کرنی، ہر عمارت کی صورت حال قلمبند کرنی کتبوں کے چربے اُتارنے، ہر کتبے کا بعینہ اس کے اصلی خط میں دکھانا، ہر ٹوٹی پھوٹی عمارت کا نقشہ جوں کا توں مصور سے کھچانا، اور اس طرح سوا سو سے زیادہ عمارتوں کی تحقیقات کرنا فی الحقیقتہ نہایت دشوار کام تھا سرسید کہتے تھے کہ

> قطب صاحب کی لاٹھ کے بعضے کتبے جو زیادہ بلند ہونے کے سبب سے پڑھے نہ جا سکتے تھے، ان کے پڑھنے کو ایک چھینکا دو بلیوں کے بیچ میں ہر ایک کتبے کے محاذی بندھوالیا جاتا تھا۔ اور میں خود اوپر چڑھ کر اور چھینکے میں بیٹھ کر کتبے کا چربہ اُتارتا تھا۔ جس وقت میں چھینکے میں بیٹھتا تھا تو مولانا صہبائی فرط محبت کے سبب، بہت گھبراتے تھے، اور خوف کے مارے ان کا رنگ متغیر ہو جاتا تھا۔

باوجود اس قدر مشکلات کے "آثار الصنادید" کا پہلا ایڈیشن ڈیڑھ برس کے اندر اندر ۱۸۴۷ء/۱۲۶۳ھ میں چھپ کر تیار ہو گیا۔ اس کی عبارت سر سید نے مولوی امام بخش صہبائی سے لکھوائی تھی' اس لئے رنگین و مقفّٰی تھی، سلیس و رواں نہ تھی۔ اُسی زمانے میں مسٹر رابرٹس کلکٹر و مجسٹریٹ دہلی ولایت جاتے تھے، وہ اس کا ایک نسخہ ساتھ لیگئے: اور وہاں جا کر اس کو رائل ایشیاٹک سوسائٹی میں پیش کیا۔ ممبروں نے بہت پسند کیا۔ اور اس کا انگریزی میں ترجمہ کرانا چاہا۔ مسٹر رابرٹس نے دہلی واپس آکر سر سید کی شرکت سے انگریزی میں ترجمہ کرانا چاہا۔ اس وقت سر سید نے اس پر نظر ثانی کی پہلے ایڈیشن کی عبارت قدیم طرز کی رنگینی اور مبالغہ و تکلفات کے سبب سے بے مزہ ہو گئی تھی۔ دوبارہ سادہ و سلیس عبارت میں لکھی گئی۔ دوسرا ایڈیشن ۱۸۵۴ء میں چھپ کر شائع ہوا لیکن غدر میں اس کے تقریباً تمام نسخے تلف ہو گئے۔ مسٹر رابرٹس کی بھی دہلی سے تبدیلی ہو گئی تھی اس لئے انگریزی کا ترجمہ بھی رہ گیا لیکن فرانس کے مشہور مستشرق گارسان دتاسی نے ۱۸۶۱ء میں اس کا ترجمہ فرانسیسی زبان میں کر کے مشتہر کیا۔ جس کی ایک جلد سر سید کو بھی بھیجی اس فرنچ ترجمہ کو دیکھ کر لندن کی رائل ایشیاٹک سوسائٹی نے سر سید کو سوسائٹی کا آنریری فیلو مقرر کیا۔

آثار الصنادید کے پہلے اور دوسرے ایڈیشن کے بعد تیسرا اور چوتھا ایڈیشن مطبع نول کشور لکھنؤ سے شائع ہوا تھا۔ جس کے نسخے خدا بخش لائبریری پٹنہ میں محفوظ ہیں۔ اس کے بعد پانچواں ایڈیشن منشی رحمت اللہ رعد نے اپنے نامی پریس کانپور میں ۱۹۰۴ء میں شائع کیا جس میں پہلے دونوں ایڈیشنوں کی خوبیاں جمع کر دیں۔ لیکن یہ بڑی کمی کر دی کہ سر سید نے جو حالات مشاہیر دہلی کے لکھے تھے ان کو حذف کر دیا۔

(۶) کلمۃ الحق، مولفہ ۱۸۴۹ء۔ یہ رسالہ پیری مریدی اور بیعت کے طریقۂ مروجہ کے برخلاف لکھا ہے۔

(۷) راہ سنت در رد بدعت، مولفہ ۱۸۵۰ء یہ رسالہ وہابیت کے جوش کے زمانے میں اہل بدعت کے برخلاف متبعین سنت کی تائید میں لکھا ہے۔ سرسید خود بھی غیر مقلد تھے اور مقلدین کو بدعتی سمجھتے تھے۔

(۸) نمیقہ در بیان مسئلہ تصور شیخ، مرقومہ ۱۸۵۲ء۔ یہ رسالہ فارسی زبان میں بطور ایک فرضی یا واقعی مکتوب کے لکھا ہے، جس میں تصور شیخ مصطلح مشائخ نقشبندیہ کو وسیلۂ محبت خدا و محبت و رحمت الٰہی بنایا ہے۔ یہ دلچسپ بات ہے کہ مشائخ نقشبندیہ جن کے تصور شیخ کو سرسید وسیلۂ محبت الٰہی بتاتے ہیں وہ سب کے سب اہل تقلید تھے یعنی سرسید ان کے اصلی تصوف کو صحیح مانتے ہیں۔ لیکن ان کے اصول تقلید کو غلط جانتے ہیں۔

(۹) سلسلۃ الملوک، مرتبہ ۱۸۵۲ء۔ یہ ان راجاؤں اور بادشاہوں کی مختصر مگر مفید و صحیح فہرست ہے جو دہلی میں پانچ ہزار برس سے فرماں روا ہوتے چلے آئے ہیں۔ اس میں راجہ یدھشٹر سے ملکہ وکٹوریا تک ۲۰۲ بادشاہوں کا حال نقشۂ جدول کی صورت میں لکھا ہے۔ جو اب آثار الصنادید کے تیسرے ایڈیشن میں شامل ہے۔ اور دوسرے میں بھی شامل تھا۔

(۱۰) قول متین در ابطال حرکت زمین۔ اس رسالہ میں قدیم خیالات کے مطابق سرسید نے زمین کی حرکت کو غلط ثابت کرنا چاہا تھا۔ لیکن بعد کو حرکت زمین کے قائل ہو گئے تھے اور اس کو یقینی جانتے تھے۔

(۱۱) فوائد الافکار فی اعمال الفرجار، مترجمہ ۱۸۴۶ء سرسید کے نانا نواب دبیرالدولہ فریدالدین نے "پرکار متناسبہ" کے اعمال پر جو انھوں نے خود سوچ کر

نکالے تھے، فارسی میں ایک رسالہ لکھا تھا۔ سرسید نے دو انگریز عالموں کے کہنے سے ان
مسودات کا ترجمہ اردو میں کیا۔ اور شالیں اپنی طرف سے اضافہ کیں۔

(۱۲) سیرت فریدیہ۔ سرسید نے یہ کتاب اپنے نانا دبیر الدولہ خواجہ فریدالدین کے
حالات میں لکھی ہے۔ اس میں اپنے بچپن کے حالات بھی درج کئے ہیں۔

(۱۳) تاریخ ضلع بجنور۔ جنوری ۱۸۵۵ء میں سرسید صدر امین ہو کر بجنور گئے
وہاں کلکٹر کی فرمائش سے ضلع بجنور کی تاریخ مرتب کی۔ کلکٹر نے اس کو گورنمنٹ میں بھیج دیا
ابھی وہاں سے واپس نہ آئی تھی کہ غدر ہو گیا۔ اور وہ غالباً آگرہ میں غدر کے سبب سے
تلف ہو گئی۔

(۱۴) تصحیح آئین اکبری۔ شہنشاہ مغلیہ اکبر اعظم (۹۶۳ھ/۱۵۵۶ء تا ۱۰۱۴ھ/۱۶۰۵ء) کے
وزیر و مشیر ابوالفضل (متوفی ۱۰۱۱ھ/۱۶۰۲ء) نے بادشاہ کے اصول و طریق سلطنت پر
"آئین اکبری" لکھی تھی۔ اس کی فارسی زبان بالکل نئے طرز کی تھی، جس میں عربی کے
الفاظ کم تھے۔ اور اسلوب بیان دشوار فہم تھا۔ کاتبوں کی بے پروائی سے اس کتاب
میں غلطیاں بہت تھیں۔ سرسید نے بجنور میں ایک تاجر دہلی حاجی قطب الدین
کی فرمایش سے آئین اکبری کی تصحیح کی۔ پہلی اور تیسری دو جلدیں ۱۸۵۶ء میں شائع
ہو گئیں۔ دوسری جلد کی تصحیح میں دشواریاں تھیں۔ اس لئے اس کو موخر رکھا تھا
جب اس کی صحت مکمل ہوئی اور مطبع میں بھیجی گئی تو غدر ہو گیا۔ اور وہ ضائع ہو گئی۔
اس کی پہلی جلد خاکسار راقم کے کتب خانہ میں بھی موجود ہے۔ دہلی کے نامور لوگوں
نے آئین اکبری پر تقریظیں[1] لکھی تھیں

---

[1] مولانا صہبائی، مفتی صدرالدین آزردہ وغیرہ کے علاوہ مرزا غالب نے بھی منظوم تقریظ مثنوی کی
صورت میں لکھی تھی۔ اہل ہند کی فارسی انشا پردازی سے نفرت و تحقیر غالب کی (باقی صفحہ ۲۱۸ پر)

(۱۵) تاریخ سرکشی بجنور، مراد آباد آگرہ لکھی، اس میں مئی ۱۸۵۶ء سے اپریل ۱۸۵۶ء تک کے حالات و واقعاتِ غدر جو ضلع بجنور میں گزرے بہ قید تاریخ نہایت تفصیل سے بیان کئے ہیں۔ اس میں بہت سی تحریریں اور یادداشتیں ایسی ہیں جن کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سرسید ابتدا سے اخیر تک اس کتاب کے لئے مواد جمع کرتے رہے تھے ایسی حالت میں، جبکہ جانوں کے لالے پڑے ہوئے تھے، انگریزی عملداری بالکل اُٹھ گئی تھی، لوگوں کے گھر بار لٹ رہے تھے، اور خود سرسید نہایت خوف و ہراس کی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) طبیعت ثانیہ بن گئی تھی، اور انگریز پرستی کو انھوں نے اپنا شعار بنالیا تھا اس لئے "آئین اکبری" کی تعریف کرنا ان کے خلاف آئین تھا چنانچہ اپنی تقریظ منظوم میں سرسید کی رائے تصحیح کو ننگ دعا رہمت دالا بتایا ہے۔ آئین اکبری کو "متاع کس مخر" کہا ہے اس کے طرز تحریر سے اپنی انشاپردازی کو کہنہ "خوشتر بتایا ہے۔ سرسید کی اس کوشش کو "مردہ پروردن" سے تعبیر کیا ہے۔ اور اکبر بادشاہ کے آئین و اصول حکمرانی کے مقابلے میں انگریزوں کی ریل، دخانی جہاز، تار برقی، بجلی کی روشنی وغیرہ کو سراہا ہے۔ چند اشعار درج کئے جاتے ہیں۔

مژدہ یاراں راکہ ایں دیریں کتاب	یافت از اقبالِ سید فتح باب
دیدہ بینا آمدہ بازو قوی	کہنگی پوشید تشریف نوی
دیں کہ در تصحیح آئین رائے اوست	ننگ دعا رہمت والائے اوست
کس مخر باشد گیتی ایں متاع	خواجہ راچہ بود امید انتفاع
گر ز آئیں می رود با ما سخن	چشم بکشا اندریں دیر کہن
صاحبانِ انگلستاں را نگر	شیوہ و انداز ایشاں را نگر
تاچہ آئیں ہا پدید آوردہ اند	انچہ ہرگز کس ندید آوردہ اند
گر دخاں کشتی بہ جیحوں می برد	گہ دخاں گردوں بہ ہاموں می برد

(باقی صفحہ ۳۱۹ پر)

حالت میں تھے، وہ ان کاغذات اور یادداشتوں کو بحفاظت رکھتے جاتے تھے۔

(۱۹) رسالہ اسباب بغاوت ہند۔ مرادآباد ہی میں یہ رسالہ بھی ۱۸۵۸ء میں لکھ کر چھپوایا۔ یہ بھی سرسید کی ملکی خیرخواہی، قومی محبت اور اخلاقی جرأت کی یادگار ہے۔ ہنگامۂ غدر میں گورنمنٹ عموماً اہل ہند سے اور خصوصاً مسلمانوں سے بدظن ہو گئی تھی۔ سب سے زیادہ تباہیاں مسلمانوں پر آئی تھیں۔ سرسید نے اس کتاب میں غدر کو حکومت کی خامیوں اور خرابیوں کا نتیجہ ثابت کیا ہے۔ اور تمام بدتدبیریاں

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

غلتک گردوں بگرداند دُخاں	زَہ گاو و اسپ را ماند دخاں
نغمہ ہا بے زخمہ از ساز آورند	حرف چوں طائر بہ پرواز آورند
رو بہ لندن کاندراں رخشندہ باغ	شہر روشن گشتہ در شب بے چراغ
طرز تحریرش اگر گوئی خوش است	نے فزدل از ہر چہ می جوئی خوش است
ہر خوشے را خوشترے ہم بودہ است	گر سری ہست افسرے ہم بودہ است
مُردہ پروردن مبارک کار نیست	خود بگو کاں نیز جز گفتار نیست

سرسید نے یہ تقریظ نہیں چھپوائی اور یہ کہہ کر غالب کو واپس کردی کہ ایسی تقریظ مجھے درکار نہیں غالب کے کلیات فارسی میں چھپی ہوئی ہے۔ مولانا حالی نے لکھا ہے کہ جب سے سرسید نے تقریظ کے چھاپنے سے انکار کیا تھا وہ مرزا غالب سے اور مرزا ان سے نہیں ملے تھے، اور دونوں کو حجاب دامنگیر ہو گیا تھا۔ اتفاق سے مرزا غالب مارچ ۱۸۶۰ء میں رامپور سے دہلی کو جاتے ہیں مرادآباد اترے۔ سرسید مرادآباد میں صدرالصدور تھے لیکن اسی حجاب کے سبب سے غالب نے ان کو اطلاع نہ دی تھی اور سرائے میں ٹھہر گئے تھے۔ سرسید کو معلوم ہوا تو فوراً سرائے میں پہنچے اور مرزا غالب کو مع اسباب اور ہمراہیوں کے اپنے مکان میں لے آئے۔ مرزا پالکی سے اترے تو ایک بوتل ان کے ہاتھ میں تھی۔ انھوں نے اس کو مکان میں لا کر ایسے موقع پہ رکھ دیا جہاں ہر ایک آتے جاتے کی (باقی صفحہ ۳۲۰ پر)

اور سختیاں گنائی ہیں۔ سر سید نے تفصیل کے ساتھ لکھا ہے کہ اہل ہند نے سرکشی کے لئے پہلے سے کوئی سازش نہ کی تھی، مسلمانوں میں بھی جہاد کی کوئی سازش نہ تھی اودھ کی ضبطی بھی اس عام فساد کا باعث نہ تھی، فوج میں باہم بغاوت کی صلاح بھی نہ تھی، باغی فوج کی پہلے سے بادشاہ دہلی سے بھی سازش نہ تھی بلکہ بہت سی باتیں برسوں سے جمع ہو رہی تھیں جن سے ہندوستانیوں کا دل گورنمنٹ سے پھٹتا جاتا تھا۔ اور اس کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ انتظام حکومت قانون سازی اور مشورہ و تدبیر میں ہندوستانیوں کو کوئی دخل نہ تھا اور حاکم و رعایا کے درمیان تبادلۂ خیالات کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ گورنمنٹ کے احکام و قوانین کی مصلحت کو اہل ہند نہ سمجھ سکتے تھے بلکہ برعکس سمجھ لیتے تھے، اور ان کو سمجھانے کا کوئی وسیلہ اختیار نہ کیا گیا تھا۔ گورنمنٹ نے جو انتظامات کئے، اور جو قانون نافذ کئے ان سے ہندوستانیوں کو غلط فہمی پیدا ہوئی، اور انھوں نے اسکے دو نتیجے سمجھے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

نگاہ پڑتی تھی۔ سر سید نے کسی وقت اس کو وہاں سے اٹھا کر اسباب کی کوٹھری میں رکھ دیا۔ مرزا نے بوتل کو وہاں نہ پایا تو بہت گھبرائے۔ سر سید نے کہا آپ خاطر جمع رکھئے۔ میں نے اس کو بہت احتیاط سے رکھ دیا ہے۔ مرزا صاحب نے کہا، بھئی مجھے دکھا دو۔ تم نے کہاں رکھی ہے۔ انھوں نے کوٹھری میں لے جا کر بوتل دکھا دی۔ آپ نے اپنے ہاتھ میں بوتل اٹھا کر دیکھی، اور مسکرا کر کہنے لگے کہ بھئی، اس میں تو کچھ خیانت ہوئی ہے۔ سچ بتاؤ کس نے پی ہے۔ شاید اسی لئے تم نے کوٹھری میں لا کر رکھی تھی۔ حافظ نے سچ کہا ہے ؎

واعظاں کایں جلوہ بر محراب و منبر می کنند
چوں بخلوت می روند آں کار دیگر می کنند

سر سید ہنس کر چپ ہو رہے، اور اس طرح وہ رکاوٹ جو کئی برس سے چلی آتی تھی رفع ہو گئی مرزا دو ایک دن وہاں ٹھہر کر دہلی چلے آئے۔

ایک یہ کہ سرکار ہندوستانیوں کو مفلس و تباہ کرنا چاہتی ہے۔ دوسرے یہ کہ ان کے مذہب میں مداخلت کرنا اور ان کو عیسائی بنانا چاہتی ہے۔ یہ مسالہ مدتوں سے جمع ہو رہا تھا۔ اس کے بھڑک اٹھنے کے لئے کارتوس کاٹنے کا حکم اور نافرمانی پر میرٹھ کی فوج کو پابہ زنجیر کر کے رسوا کرنا شتابہ بن گیا۔ بہرحال غدر کی معلومات کے متعلق سرسید کا یہ رسالہ آج بھی قابل مطالعہ ہے۔ سرسید اگر اس کی مطبوعہ کاپیاں ہندوستان میں عام طور پر شائع کر دیتے، تو اہل ہند میں از سر نو جوش پیدا کرنے کا سبب بن سکتا تھا، لیکن انہوں نے یہ دانشمندی کی کہ چھپوانے کے بعد اس کی ایک جلد گورنمنٹ آف انڈیا کو بھیجدی، اور چند جلدیں اپنے پاس محفوظ و مخفی رکھیں۔ باقی کچھ کم پانسو جلدیں سیدھی ولایت کو گورنمنٹ کے پاس بھیجدیں۔ وہاں اس کے ترجمے ہوئے، اس پر بحثیں ہوئیں۔ اکثر نے اس رسالہ کو سرسید کی خیرخواہی پر محمول کیا۔ لیکن بعضوں نے اس کی بنا پر سرسید کو غدار اور مفسد قرار دیا۔ اور گورنمنٹ سے سرسید کو سزا دینے کا مطالبہ کیا۔ لیکن جب ان لوگوں کو یہ معلوم ہوا کہ سرسید نے شائع کرنا کیسا، کسی کو یہ کتاب دکھائی تک نہیں، تو یہ حیران رہ گئے۔

(۱۷) لایل محمڈنز آف انڈیا (ہندوستان کے وفادار مسلمان) چونکہ غدر کے بعد گورنمنٹ کی چشم غضب سب سے زیادہ مسلمانوں کی طرف تھی۔ ان کی غداری کا ہر جگہ چرچا تھا، اور وفاداری کا کہیں ذکر نہ تھا، اس لئے سرسید نے مسلمانوں کے حالات کا ایک سلسلہ اس نام سے شروع کیا، اور اس کو اردو انگریزی دونوں زبانوں میں شائع کیا۔ لیکن یہ سلسلہ جاری نہ رہ سکا۔ ۷۲ صفحے چھپ کر اور شائع ہو کر رہ گئے۔ ۱۸۶۰ء میں جاری ہوا، اور تین نمبروں کے بعد ۱۸۶۱ء میں بند ہو گیا۔

(۱۸) تحقیق لفظ نصاریٰ۔ غدر کے بعد بعض مسلمانوں کی ایسی تحریریں گورنمنٹ کو دستیاب ہوئیں جن میں انگریزوں کو "نصاریٰ" لکھا تھا۔ انگریزوں نے اس لفظ کو

اپنی توہین وتحقیر سمجھا۔ اور یہ خیال کیا کہ جس طرح یہودی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو حقارت سے ناصری (یعنی ناصرہ گاؤں کا رہنے والا) کہتے ہیں، اسی طرح مسلمان ہم کو "نصاریٰ" کہتے ہیں۔ اس بنا پر گورنمنٹ نے بعض مسلمانوں کو سزائیں دیں۔ سرسید کو جو یہ حال معلوم ہوا تو انھوں نے زمانۂ قیام مرادآباد میں لفظ نصاریٰ کی تحقیق پر مختصر رسالہ لکھ کر شائع کیا۔ اس میں ثابت کیا ہے کہ یہ لفظ ناصری سے مشتق نہیں ہے، بلکہ نصر سے مشتق ہے۔ قرآن میں حضرت عیسیٰؑ کو ناصری نہیں کہا گیا، نہ "قریۂ ناصرہ" کا کہیں ذکر ہے بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں عیسائی خود اپنے آپ کو "نصاریٰ" کہتے تھے۔ جب کہ رسالہ شائع ہوا تو کسی انگریزی اخبار نے لکھا کہ سید احمد خاں کا بیان غلط ہے، کیونکہ کسی شخص کو نصاریٰ کا لفظ لکھنے پر سزا نہیں ہوئی۔ اس پر ایک معزز یوربین افسر نے جواب دیا اور یہ لکھا کہ خود ہمارے سامنے ایک شخص کو اسی جرم میں کانپور میں پھانسی دی گئی! اس رسالہ کی اشاعت کے بعد کسی سے اس لفظ پر مواخذہ نہیں ہوا۔

(۱۹) تصحیح تاریخ فیروز شاہی۔ مرادآباد ہی میں سرسید نے ضیاءالدین برنی کی "تاریخ فیروز شاہی" کی تصحیح کی۔ یہ مورخ برن (یعنی بلند شہر) کا رہنے والا تھا، بہت بڑا فاضل اور راست بیانی میں مشہور تھا۔ اس لئے اس کی یہ تاریخ جو فیروز شاہ تغلق کے عہد حکومت کے متعلق ہے، بہت معتبر اور مستند ہے۔ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے لئے سرسید نے چار مختلف نسخوں سے مقابلہ کر کے تصحیح کی، اور سوسائٹی نے سنہ ۱۸۶۲ء میں شائع کی۔

(۲۰) تبئین الکلام۔ یہ تصنیف بھی سرسید کی قومی محبت، تدبر و دانشمندی شوق علم وتحقیق، ہمت واستقلال کا عجیب وغریب نمونہ ہے۔ خیال کرنے کی بات ہے کہ کہاں سرسید اور ان کی قدیم رنگ کی تعلیم اور سرکاری وقومی مصروفیتیں،

اور کہاں توریت و انجیل کی تفسیر! لیکن بقول مولانا حالی کے "مشکل نہیں کوئی پیش ہمت دشوار" سر سید نے غدر کے بعد جتنی کتابیں لکھیں، ان کے دو مقصد تھے۔ ایک یہ کہ عیسائی قوم اور انگریزی حکومت کے دل سے اسلام اور مسلمانوں کی طرف سے بدگمانی اور غداری کا خیال رفع کیا جائے، دوسرے یہ کہ اسلام کی ہمہ گیری و رواداری اور مطابقت عقل و سائنس کو مسلمانوں کے ذہن نشین کر کے ان میں بیداری، روشن خیالی اور آزادی رائے پیدا کی جائے، اور انگریزوں سے میل جول، انکے علوم و فنون، اور ان کی حکومت سے فائدہ حاصل کرنے کی طرف متوجہ کیا جائے انہی مقاصد کو پیش نظر رکھ کر سر سید نے پہلے انجیل کی تفسیر اور پھر قرآن کی تفسیر لکھی یہ خطبات احمدیہ اور اس کے مختلف مقالے جو علیحدہ شائع ہوئے، وہ بھی اسی کام کے لئے تھے۔ بلکہ ان کے صد ہا مضامین "تہذیب الاخلاق" کا بھی بیشتر یہی مدعا تھا۔

غدر سے پہلے جب دہلی آگرہ وغیرہ میں مشنریوں کے کاروبار زیادہ پھیلنے لگے، اور مسلمانوں کے ساتھ ان کے جابجا مباحثے ہونے لگے، اس وقت سر سید کو خیال آیا کہ اسلام کی حمایت میں عیسائیوں کے اعتراضات کے جواب لکھے جائیں۔ عیسائیوں کے ساتھ زبانی یا تحریری مباحثہ کرنے کا مخاصمانہ طریقہ جو مسلمانوں میں غدر سے پہلے جاری تھا، اس کا نتیجہ اگرچہ ایک لحاظ سے مسلمانوں کے حق میں بہت اچھا ہوا کہ مسلمان اور قوموں کی طرح مشنریوں کے زیادہ شکار نہیں ہوئے، مگر عیسائیوں کے دل میں اسلام کی طرف سے کوئی عمدہ خیال پیدا نہ ہوا۔ وہ اسلام کو بدستور ظلم، خوں ریزی، تعصب اور دیگر برائیوں کا سرچشمہ سمجھتے رہے، اور مسلمانوں کو عیسائیوں کا دشمن اور عیسائی قوم کی حکومت کا بدخواہ خیال کرتے رہے۔ پس جس طرح مسلمانوں کو مشن کی زد سے بچانے کے لئے مناظرہ کا طریقہ جاری رکھنا ضروری تھا، اسی طرح یہ بھی ضرور تھا کہ مناظرہ کے مخاصمانہ طریقہ کو چھوڑ کر آشتی اور مصالحت کا طریقہ

اختیار کیا جائے، اور عیسائیوں کو دکھایا جائے کہ دنیا میں اگر کوئی مذہب عیسائی مذہب کا دوست ہو سکتا ہے تو وہ صرف اسلام ہی ہو سکتا ہے اور بس۔ ظاہر ہے کہ اس مطلب کے حاصل ہونے کے لئے کوئی طریقہ اس سے بہتر نہ تھا کہ توریت اور انجیل کی تفسیر ایک مسلمان کے ہاتھ سے لکھی جائے۔ اور جو امور فی الواقع دونوں مذہبوں میں موافق یا مخالف ہیں ان کو اپنی اپنی جگہ صاف طور پر بیان کیا جائے اور اس طرح اس بیگانگی اور وحشت کو جو دونوں قوموں کی غلط فہمی سے پیدا ہو گئی ہے رفع کیا جائے[1]۔

اس تفسیر کیلئے عیسائی مذہب، بائبل کی حقیقت اور اس کی تاریخ سے واقفیت ضروری تھی اور بہت کچھ سامان درکار تھا۔ یہ سرسید کی بے نظیر ہمت و محنت کا ثبوت ہے کہ انھوں نے عیسائی مذہب کی تمام ضروری کتابیں خریدیں، ایک انگریزی خواں نوکر رکھا جو ان کا ترجمہ سناتا تھا، کتب احادیث و تفسیر سے سندیں بہم پہنچانے کیلئے ایک عربی داں عالم کو نوکر رکھا، ایک یہودی سالم نام کو نوکر رکھ کر عبرانی زبان پڑھنی شروع کی، مولوی عنایت رسول چریاکوٹی عربی و عبرانی کے بہت بڑے عالم تھے، ان سے مدد لی، اپنی اردو تحریر کو انگریزی میں ترجمہ کرانے کیلئے ایک یورپین کو سو روپیہ ماہوار پر نوکر رکھا۔ کئی ہزار روپیہ کا پریس رڑکی سے منگوایا، اور اسکے لئے اردو ٹائپ کے علاوہ عبرانی اور انگریزی ٹائپ کے حروف بھی منگوائے۔ چنانچہ تالیف کے ساتھ ساتھ طباعت بھی شروع ہو گئی۔ ایک کالم میں عبرانی توریت کی عبارت عبری خط میں، اور اس کا اردو ترجمہ اور انگریزی ترجمہ اس کے نیچے لکھا جاتا

---

[1] یہ عبارت بجنسہ مولانا حالی کی "حیات جاوید" سے منقول ہے۔ دوسری کتابوں کے متعلق بھی اس سے پہلے اور بعد کی اکثر عبارتیں اسی کتاب سے لی گئی ہیں، البتہ کہیں کہیں مقدم و موخر اور مختصر کر دی گئی ہیں۔

تھا۔ دوسرے کالم میں اسی مضمون کی کوئی آیت قرآنی یا حدیث اور اس کا اردو اور انگریزی ترجمہ اس کے نیچے لکھا جاتا تھا۔ اس کے بعد تفسیر لکھی جاتی تھی۔ تفسیر شروع کرنے سے پہلے سرسید نے دس مقدمے جن میں سے اکثر بہت طولانی ہیں بڑی محنت اور تحقیق و تلاش سے لکھے ہیں یہ مقدمے درحقیقت باہمی تنافر مذہبی کے دور کرنے کی تمہید ہیں لیکن مسلمانوں کی ناقدردانی و مخالفت، اور طباعت کی کثرت مصارف کے سبب سے دو جلدیں چھپ کر رہ گئیں۔ ایک میں دس مقدمے اور دو تتمے ہیں۔ دوسری میں تفسیر۔ اس کتاب کا پورا نام سرسید نے یہ رکھا ہے :۔ تبیین الکلام فی تفسیر التوراۃ و الانجیل علی ملۃ الاسلام ۱۸۶۲ء ۱۲۷۸ھ میں غازی پور میں شائع ہوئی۔ (اس کا نمونہ آئندہ درج کیا جائے گا)

(۲۱) علاج ہومیو پیتھک۔ بنارس میں سرسید نے ہومیو پیتھک طریقۂ علاج کے رائج کرنے کی کوشش کی، شفا خانہ قائم کیا۔ اسی کے سلسلے میں ایک رسالہ بھی ۱۸۶۷ء میں لکھ کر شائع کیا۔

(۲۲) احکام طعام اہل کتاب۔ مسلمانوں کے دلوں سے انگریزی معاشرت کی نفرت دور کرنے، اور انگریزوں کے ساتھ کھانے پینے کی عادت ڈالنے کیلئے یہ رسالہ لکھا، اور قرآن و حدیث سے اہل کتاب کے کھانے کو جائز ثابت کیا۔ سرسید نے خود پہلے ہی سے انگریزوں کے ساتھ کھانا پینا شروع کر دیا تھا۔ مسلمانوں نے حسب عادت اس پر بھی بہت لے دے کی۔

(۲۳) سفرنامۂ لندن۔ سرسید نے اس سفرنامہ میں ہر ایک دلچسپ حال جو اثنائے راہ میں پیش آیا ہے قلمبند کیا ہے۔ یورپ کے عجائبات ایسے طور پر بیان کئے ہیں جس سے پڑھنے والوں کو یورپ کے سفر کی ترغیب ہو۔

(۲۴) خطبات احمدیہ۔ سرسید کی مذہبی خدمات ماضی و مستقبل میں بہترین

خدمت یہ تصنیف ہے۔ اس سے پہلے جتنی کتابیں لکھیں "اسباب بغاوت" "تبیین الکلام" وغیرہ، وہ بھی قوم و مذہب کے سوز و درد کا نتیجہ تھیں، لیکن ان میں دنیا کے مقاصد و فوائد کا خیال بھی شریک تھا۔ "خطبات احمدیہ" خالص اسلامی خدمت تھی۔ اس کے بعد سر سید نے تفسیر القرآن لکھی، اور وہ بھی دینی خدمت، اور اس سے زیادہ مہتم بالشان خدمت تھی۔

"خطبات احمدیہ" کی ضرورت و اہمیت اور اسکی تالیف کے لئے سر سید کی کوشش و کاوش کا اندازہ مولانا حالی کے اس بیان سے ہوتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ہندوستان میں اسلام تین خطروں سے گھرا ہوا تھا۔ ایک طرف مشنری اس کی گھات میں لگے ہوئے تھے۔ سب سے زیادہ ان کا دانت مسلمانوں پر تھا، ان کی منادیوں میں اخباروں اور رسالوں میں زیادہ تر بوچھار اسلام پر ہوتی تھی، اسلام کی برائیاں اور بانی اسلام پر نکتہ چینیاں ان کی تقریر و تحریر کا موضوع تھیں۔ اور بعض جاہل و مفلس مسلمان ان کے دام میں آجاتے تھے۔ دوسرے مسلمان اس نظر سے کہ ہندوستان کی سلطنت انگلش قوم نے مسلمانوں سے لی تھی، ہمیشہ حکمراں قوم کی نگاہ میں کھٹکتے تھے، اور انگریز مسلمانوں کے مذہب کو بغاوت و فساد کا سرچشمہ اور امن و عافیت کا دشمن خیال کرتے تھے۔ تیسرے مذہب اسلام کو انگریزی تعلیم اور مغربی علوم و فنون کی طرف سے خطرہ تھا، جو روز بروز ہندوستان میں پھیلتے جاتے تھے اور جن سے ہندوستانیوں کو کسی طرح مفر نہ تھا، یہاں تک کہ خود سر سید کو یہ تعلیم پھیلانی پڑی۔ اندیشہ تھا کہ مسلمانوں کے دل میں اسلام کے عقائد و اعمال اور اصول و قوانین کی طرف سے غلط فہمی پیدا ہو جائے۔

سر سید نے ان مقاصد کی طرف پہلی ہی بار اس وقت توجہ کی تھی جب مراد آباد میں "تفسیر انجیل" کی بنیاد ڈالی۔ پھر جب سر ولیم میور (لفٹیننٹ گورنر صوبہ شمال مغربی)

کی کتاب لائف آف محمد چار جلدوں میں چھپ کر ہندوستان میں پہنچی، جس کی نسبت عیسائیوں میں شہور تھا کہ اس نے اسلام کی بیخ کنی میں تسمہ لگا نہیں رکھا، اس وقت سرسید کی بے چینی اور جوش و خروش کا عجب حال تھا۔ آخر کار جب انھوں نے دیکھا کہ غدر میں اسلامی کتب خانے برباد ہو گئے، اور جن کتابوں کی اس مضمون کے لئے ضرورت ہے وہ یہاں دستیاب نہیں ہو سکتیں تو ان کو ولایت جانے کا خیال ہوا۔ چنانچہ ایک ہی دو برس بعد جب سید محمود کا ولایت جانا قرار پایا تو وہ بھی ان کے ساتھ روانہ ہو گئے۔ ان کے بعض دوست جو سرکاری عہدہ دار اور سر ولیم میور کی گورنمنٹ کے ماتحت تھے، سر ولیم کی کتاب کا جواب لکھنے سے مانع آتے تھے، مگر سرسید نے ان کا کہنا نہ مانا، اور ولایت پہنچتے ہی اس کی فکر میں مصروف ہو گئے۔ انڈیا آفس اور برٹش میوزیم کے کتب خانوں سے کتابیں اور اطلاعیں بہم پہنچائیں، عربی کی کتابیں مصر و فرانس و جرمنی سے منگائیں، لیٹن اور انگریزی کی پرانی نایاب کتابیں بہت گراں قیمت پر لندن کے بازار سے خریدیں، اور شب و روز کی لگاتار محنت سے بارہ مقالات لکھ کر ایک لائق انگریز سے انگریزی میں ترجمہ کرائے اور لندن ہی میں خطبات احمدیہ کے نام سے ۱۸۷۰ء میں چھپوا کر شائع کئے۔

اس کتاب کے لکھتے وقت جس قدر جوش سرسید کے دل میں، اور جو مالی مشکلات اس کے شائع کرنے میں پیش آئیں اور جو سخت محنت اس کے لکھنے میں ان کو کرنی پڑی، اس کا کسی قدر اندازہ ان کے خطوں سے ہوتا ہے۔ جو انھوں نے ولایت سے مولوی سید مہدی علی خاں (نواب محسن الملک) کو لکھے تھے۔ مختلف خطوں کے اقتباسات یہ ہیں۔ لکھتے ہیں۔

ولیم میور صاحب کی کتاب کو دیکھ رہا ہوں۔ اس نے دل کو جلا دیا۔ اور اسکی ناانصافیاں اور تعصبات دیکھ کر دل کباب ہو گیا، اور مصمم ارادہ کیا کہ آنحضرت صلعم کی سیر میں جیسا کہ پہلے سے

ارادہ تھا کتاب لکھدی جائے۔ اگر تمام روپیہ خرچ ہو جائے اور میں فقیر بھیک مانگنے کے لائق ہو جاؤں تو بلا سے...... لکھنے میں شب و روز مصروف ہوں، اس کے سوا اور کچھ خیال نہیں، جانا آنا ملنا جلنا سب بند ہے۔ کسی مہاجن سے میرے لئے ہزار روپیہ قرض لیجئے، سود اور روپیہ میں ادا کروں گا، ہزار روپیہ بھیجنے کے لئے دلی لکھا ہے، اور لکھدیا ہے کہ کتابیں اور میرا اسباب یہاں تک کہ میرے ظروف مسی تک فروخت کر کے ہزار روپیہ بھیجدو کیا کیجئے اس کتاب کے پیچھے خواب و خور حرام ہو گیا ہے۔ خدا مدد کرے...... لکھتے لکھتے کمر درد کرنے لگتی ہے، اور کسی شخص کے مددگار نہ ہونے سے یہ کام اور بھی سخت ہو گیا ہے"

غرض چار ہزار کے قریب روپیہ خرچ ہوا اور کتاب چھپ گئی اس کی ان کو بے انتہا خوشی اور فخر تھا۔ نواب محسن الملک کو لکھتے ہیں کہ

"اگر میری یہ کتاب تیار ہو گئی تو میں لندن میں آنا دس حج کے برابر سمجھوں گا" سر ولیم میور صاحب اور اور مصنفوں نے جو کچھ لکھا ہے سب کے ایک ایک حرف کا جواب لکھا ہے، نہایت محققانہ جواب ہیں، اور یہ شرط ہے کہ کسی شخص کے آگے ڈالدو، وہ کیسا ہی بے دین کیوں نہ ہو اگر وہ کہے کہ ہاں نہایت سچ اور انصاف کا جواب ہے تو تو میرا نام، ورنہ میرا نام نہیں"

ایک اور خط میں لکھتے ہیں:۔

"میری کتاب خطبات احمدیہ ایک مسلمان عالم متبحر نے پڑھی جو قسطنطنیہ سے یہاں آیا ہے۔ جو الفاظ کہ اس نے کہے اور مجھے لکھے، اور جس طرح میرے ہاتھ چومے اس کی لذت میں ہی جانتا ہوں"

اس کتاب کے متعلق انگریزوں کی رائے سب سے زیادہ قابل توجہ ہے، اس لئے کہ انہی کی تردید میں لکھی گئی ہے۔ ریورنڈ ہوپر پرنسپل ڈیونٹی کالج لاہور کہتے ہیں کہ

"مسلمانوں سے نہایت تعجب ہے کہ وہ سید احمد خاں کو کافر ملحد اور بد مذہب سمجھتے ہیں

ہمارے نزدیک جو کام سید احمد خاں نے اسلام کی حمایت کا کیا ہے وہ آج تک کسی مسلمان سے بن نہیں آیا۔ میں نہیں جانتا کہ تیرہ سو برس میں سید احمد خاں سے پہلے کسی ایک مسلمان نے بھی ایسا کام کیا ہو۔"

مسٹر آرنلڈ مصنف "پریچنگ آف اسلام" لکھتے ہیں کہ

"ایسی مثالیں پائی جاتی ہیں کہ کسی مسلمان نے بمقابلہ عیسائیوں کے اپنی زبان میں اپنے ہی ملک میں بیٹھ کر اسلام کی حمایت پر کوئی کتاب لکھی، اور اس کا ترجمہ کسی یورپ کی زبان میں ہو گیا۔ لیکن مجھے کوئی ایسی مثال معلوم نہیں کہ کسی مسلمان نے یورپ ہی کی کسی زبان میں اس مضمون پر کتاب لکھ کر شائع کی ہو۔"

لندن کے ایک اخبار میں کسی انگریز نے لکھا تھا کہ

"عیسائیوں کو ہوشیار ہو جانا چاہئے کہ ہندوستان کے ایک مسلمان نے انھیں کے ملک میں بیٹھ کر ایک کتاب لکھی ہے جس میں اس نے دکھایا ہے کہ اسلام ان تمام داغوں اور دھبوں سے پاک ہے جو عیسائی اس کے خوشنما چہرے پر لگاتے ہیں۔"

سرسید نے ولایت سے آکر خطبات احمدیہ کو تفصیل کے ساتھ مرتب کیا اور اردو میں شائع کیا۔ اردو کتاب انگریزی کتاب سے بہت زیادہ طویل و مفصل ہے اس کا نمونہ آگے درج کیا جائے گا۔

اس سلسلے میں سرسید کی یہ خدمات بھی قابل ذکر ہیں کہ لندن پہنچ کر ان کو معلوم ہوا کہ وہاں کے ایک مصنف جان ڈیون پورٹ نے عیسائیوں کے برخلاف اسلام کی حمایت میں ایک کتاب اپالوجی فار محمد اینڈ قرآن لکھی ہے۔ سرسید نے اس کے مضامین سنے اور بہت پسند کئے۔ مصنف کو اتنی استطاعت نہ تھی کہ اپنے روپیہ سے چھپواتا اور لندن کا کوئی پبلشر اسکے چھاپنے کی ہامی نہ بھرتا تھا۔ سرسید نے فوراً روپیہ کا بندوبست کر کے دامیں اس کتاب کو چھپوا دیا اور اس کی کئی سو جلدیں

ہندوستان کو بھیجدیں۔ یہاں اس کا ایک ترجمہ مولوی عنایت الرحمٰن دہلوی نے کیا اور دوسرا ابوالحسن نے دونوں ترجمے چھپ کر شائع ہو گئے۔

انگلستان کے ایک اور ذی وقعت مصنف گاڈفری ہگنز کی کتاب جو اس نے کسی زمانے میں اسلام کی تائید میں لکھی تھی اور اب نایاب ہو گئی تھی، سرسید نے لنڈن میں ایک جرمن کتاب فروش کی دکان سے دس گنی قیمت پر خریدی، اور ہندوستان میں آکر ان لوگوں کے لیے جن کو مشنریوں سے مذہبی گفتگو کرنے کا اتفاق ہوتا ہے، پانسو روپیہ خرچ کر کے اس کا اردو ترجمہ مولوی محمد احسن پروفیسر بریلی کالج سے کرا کے حمایت الاسلام کے نام سے شائع کر دیا۔

(۲۵) رسالہ ابطال غلامی۔ یہ مضمون اگرچہ بقدر ضرورت "خطبات احمدیہ" میں لکھا جا چکا تھا، مگر ولایت سے آنے کے بعد سرسید نے اس مضمون پر ایک مستقل رسالہ لکھ کر اول "تہذیب الاخلاق" میں شائع کیا، اور پھر علیٰحدہ کتاب کی شکل میں چھپوایا۔ علمائے اسلام کو تو یہ بھی احساس نہ تھا کہ بردہ فروشی کا دستور جو عرب و افریقہ میں جاری ہے اس میں کیا برائی ہے اور وہ اصول اسلام کے موافق ہے یا نہیں۔ اور اس کی بھی پروا نہ تھی کہ عیسائی قومیں اسلام پر بڑا طعن کرتی ہیں کہ اس نے لونڈی غلام بنانا جائز کیا ہے۔ اگرچہ اٹھارویں صدی تک یورپ و امریکہ میں بھی غلامی کی رسم جاری تھی اور وہاں غلاموں کی جو حالت زار تھی، اس بے رحمی اور سنگدلی کی اسلام میں کہیں نظیر نہیں پائی جاتی لیکن انیسویں صدی سے وہاں غلامی کا بالکل انسداد ہو گیا تھا۔ اس لئے وہ لوگ اسلام پر اعتراض کرنے میں دلیر تھے۔ سرسید پہلے شخص ہیں جنھوں نے نہایت مدلل طریقے سے ثابت کیا کہ اسلام نے اوّل اوّل غلاموں کے ساتھ حسن سلوک اور آزاد کرنے کی ترغیب دی اور پھر اس رسم کو بالکل ممنوع کر دیا۔ سرسید کے بعض دعووں اور دلیلوں میں علمائے اسلام سے اختلاف پایا جاتا ہے۔

(۲۶) تفسیر القرآن۔ سرسید نے قرآن مجید کی تفسیر لکھنے میں کمال جسارت سے کام لیا۔ ان کے پیش نظر وہی خطرے تھے جو خطبات احمدیہ کے لکھنے کا باعث ہوئے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ نوجوان مسلمان مغربی فلسفہ و سائنس پڑھ کر اسلام کے ہر عقیدہ و قانون کو عقل سے جانچیں گے، اور عقل کے موافق نہ پانے کے سبب اسلام سے برگشتہ ہو جائیں گے۔ اس لئے سرسید نے یہ طے کر لیا کہ اسلام کے ہر عقیدے، ہر قانون، ہر حکم، ہر قصّے کو عقل کے مطابق ثابت کیا جائے۔ اور جو اس کسوٹی پر کھرا نہ نکلے اس کو ٹکسال باہر کر دیا جائے۔ سرسید کا یہ خیال صرف ایک حد تک درست تھا یعنی اسلام کی بہت سی باتیں عقل انسانی اور قدرت کے قوانین معلومہ و مسلمہ کے بالکل موافق ہیں۔ بلکہ جملہ مذاہب عالم میں صرف اسلام ہی ایسا مذہب ہے جسکی صداقت و فضیلت کی علم و عمل اور عقل و تجربہ نے ... تصدیق کی ہے، لیکن نفس مذہب ایسی چیز ہے جس میں بعض ان دیکھی اور بن سمجھی باتوں کے مانے بغیر کام نہیں چل سکتا۔ اور اسلام بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں ہے۔

تفسیر القرآن میں تمام معجزات اور خلاف عادت اور غیب کی باتوں سے انکار کرنا ایمان بالغیب کی غلط تاویل کرنا، جنوں سے صحرائی اقوام مراد لینا وغیرہ وغیرہ اصلاحی نظر سے غیر ضروری تھا، اور اسلامی نگاہ میں غلط فہمی پر مبنی۔ چنانچہ مولانا حالی کی بھی یہی رائے ہے۔ کہتے ہیں:۔

"آخر عمر میں سرسید کی خود رائی یا وثوق کہ ان کو اپنی رایوں پر تھا وہ حد اعتدال سے متجاوز ہو گیا تھا۔ بعض آیات قرآنی کے وہ ایسے معنی بیان کرتے تھے جن کو سن کر تعجب ہوتا تھا کہ کیونکر ایسا عالی دماغ آدمی ان کمزور اور بودی تاویلوں کو صحیح سمجھتا ہے۔"

سرسید نے ایمان بالغیب کی اہمیت و ضرورت پر نظر نہیں کی۔ انھوں نے یورپ کے ایک فلاسفر کولٹن کا یہ مقولہ نہ سنا تھا کہ

"وہ شخص جو صرف اُن چیزوں پر اعتقاد رکھتا ہے جن کو وہ پوری طرح سمجھ لیتا ہے یا تو اس کا سر بہت لمبا ہے، یا اس کا مذہب بہت چھوٹا ہے۔"

اس قسم کی باتوں کے علاوہ سرسید نے اپنی تفسیر میں قرآن کے اور مسائل کی تشریح و توجیہ میں البتہ کارنمایاں کیا ہے۔ مثلاً قصص قرآنی پر عیسائیوں کو اعتراض تھا کہ غلط بیان ہوئے ہیں۔ یا بعض واقعات کی سرے سے کوئی اصل ہی نہیں۔ سرسید نے ہر ایسے قصے یا واقعہ کا بائیل میں سراغ لگایا ہے اور قرآن و بائیل کی تطبیق کی ہے، یا عدم مطابقت کی وجہ بیان کی ہے، اور جس قصے کا پتا موجودہ بائیل میں نہیں لگا اس کا ثبوت اور ذریعوں سے دیا ہے۔ اسی طرح ارکان و فرائض اسلام نماز روزہ، حج وغیرہ کے مصالح بیان کئے ہیں۔ جہاد اسلام کی تشریح اس قدر واضح و مدلل طریقے سے کی ہے کہ اس پر انکار کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی۔ اسی طرح تعدّد ازدواج، طلاق، غلامی وغیرہ قوانین و احکام کی تفسیر قول فیصل کا حکم رکھتی ہے، اگر سرسید بجائے پوری تفسیر اور آیت آیت کی تشریح و توجیہ کے، صرف ایسے ہی مسائل پر الگ الگ مضامین لکھ دیتے، تو زیادہ اچھا ہوتا۔ بہر حال ان کی نیت بخیر تھی ان کے خلوص و صداقت میں کوئی کلام نہیں، اس لئے ان کو خطائے اجتہادی پر بھی ثواب ملے گا۔ سرسید پر اس سے پہلے بھی کفر کے فتوے لگائے جا رہے تھے، یہ تفسیر "سمندِ ناز کو اک اور تازیانہ ہوا" انھوں نے کافر گروں کو اپنے اس شعر سے جواب دیا ہے:۔

خدا دارم، دلِ بریاں زعشقِ مصطفےٰ دارم
ندارد ہیچ کافر سازو سامانے کہ من دارمؑ

ؑ سرسید شاعر تھے۔ آہی تخلص تھا۔ کبھی کبھی کہتے تھے۔ لیکن یہ غزل جس کا ایک شعر اوپر درج ہے شاعری کے شوق میں نہیں لکھی بلکہ ایک مقصد سے کہی گئی ہے، سرسید نے اپنی (باقی صفحہ ۳۳۳ پر)

تفسیر القرآن کی پہلی جلد ۱۲۹۷ھ، ۱۸۸۰ء میں چھپ کر شائع ہوئی، اور اس کے بعد وقتاً فوقتاً اور جلدیں شائع ہوتی رہیں۔ نصف قرآن سے کچھ ہی زیادہ کی تفسیر لکھنے پائے تھے کہ پیغام اجل آپہنچا۔ اور چھ جلدیں چھپی ہوئی آخر سورۂ بنی اسرائیل تک اور ایک جلد بن چھپی سورۂ انبیا تک، اور چند چھوٹے چھوٹے رسالے مثل تفسیر السموات ازالۃ الغین فی قصہ ذی القرنین، ترقیم فی قصۃ اصحاب الکہف والرقیم وغیرہ جن کو تفسیر کے اجزا سمجھنا چاہئے، سرسید سے یادگار رہ گئے۔

(۲۷) النظر فی بعض المسائل۔ چند مسائل اسلامی و قرآنی پر بحث کی ہے۔

(۲۸) سفرنامہ پنجاب۔ علی گڑھ کالج کی کوشش کے سلسلے میں سرسید نے ۱۸۸۴ء میں پنجاب کا سفر کیا۔ وہاں انھوں نے جو لکچر دئے اور تقریریں کیں وہ سب برجستہ و برمحل زبانی تقریریں تھیں، لیکن سید اقبال علی کی حیرت انگیز زود نویسی کے سبب قلمبند ہو گئیں۔

(باقی حاشیہ گذشتہ صفحہ سے) تفسیر قرآن میں جمہور مفسرین سے جو اختلاف وحی، ملائکہ جشر وغیرہ کے متعلق کیا ہے، اس پر ملا سخت اعتراض کرتے تھے۔ لیکن سرسید کو اپنے خیالات پر بڑا فخر تھا۔ انہوں نے ایک مضمون میں تاویل عقائد کرنے کے بعد یہ فقرے لکھے ہیں "یہ وہ حقائق ہیں جو نہ حکمت یونان میں پائے جاتے ہیں اور نہ فلسفۂ علم کلام میں بلکہ یہ انوار ہیں مشکوٰۃ نبوت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے۔ جو بلا واسطۂ سفینہ، سینۂ منور محمدی سے سینۂ احمدی میں پہنچے ہیں گو نابلدان کوچۂ حقیقت ان انوار محمدی کو نعوذ باللہ کفر و زندقہ سے تعبیر کریں" ——— ان ہی خیالات کے جوش میں سرسید نے یہ غزل لکھی ہے:—

فلاطوں طفلکے باشد بہ یونانے کہ من دارم
مسیحا رشک می دارد بہ درمانے کہ من دارم

زکفر من چہ می خواہی، ز ایمانم چہ می پرسی
ہماں یک جلوۂ عشق ست ایمانے کہ من دارم

(باقی صفحہ ۳۳۵ پر)

(۲۹) جواب اُمّہات المومنین۔ یہ گویا سرسید کی آخری تصنیف ہے۔ کسی دیسی عیسائی نے حضرت رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے تعدّد ازواج پر اعتراض کیا اور "امہات المومنین" کے نام سے ایک رسالہ شائع کیا۔ سرسید نے باوجود ضعف و مرض کے اس کا جواب لکھا۔

(۳۰ و ۳۱) انشاء اللہ۔ نادان خدا پرست۔ یہ دو مضمون قصہ کے طور پر سرسید نے لکھے ہیں۔ "تہذیب الاخلاق" میں شائع ہونے کے بعد ان کو الگ بھی چھاپ دیا گیا

(۳۲) مضامین تہذیب الاخلاق۔ پہلے ذکر آچکا ہے کہ سرسید کا رسالہ "تہذیب الاخلاق" تین دفعہ کرکے گیارہ بارہ برس جاری رہا۔ اس میں اور لوگوں نے

خدادارم، دلِ بریاں زعشقِ مصطفےٰ دارم	ندارد ہیچ کافر ساز و سامانے کہ من دارم
زجبریل امیں قرآں بہ پیغامے نمی خواہم	ہمہ گفتارِ معشوق است قرآنے کہ من دارم
فلک یک مطلع خورشید دارد با ہمہ شوکت	ہزاراں ایں چنیں دارد گریبانے کہ من دارم
زبرہاں تا بہ ایماں سنگ ہا دارد رہِ واعظ	ندارد ہیچ واعظ ہیچ برہانے کہ من دارم

چوتھا شعر (زجبریل امیں .....) نہایت معنی خیز ہے اسکا ایک مفہوم یہ ہو سکتا ہے کہ میری نظر اس پر نہیں ہے کہ قرآن جبریل امین کی زبانی بطور وحی نازل ہوا ہے۔ بلکہ میں تو اس پر لوٹ ہوں کہ یہ حضورؐ کی زبان مبارک سے ہم تک پہنچا ہے۔ عاشق تو اسکو گفتار معشوق سمجھتا ہے ـــــ لیکن سرسید کا اس شعر سے جو مقصود ہے وہ یہ ہے کہ ـــ میں اس بات کا قائل نہیں کہ قرآن کو جبریل لایا کرتے تھے۔ فرشتے اور جبریل کا کوئی وجود نہیں۔ بلکہ یہ حضور ہی کے سینہ سے نکلے ہوئے الفاظ ہیں جو قرآن کی صورت میں مرتب ہیں۔

بہر حال ان خیالات میں سرسید تنہا نہیں ہیں۔ صدہا سال سے یہ مسائل زیر نظر ہیں معتزلہ و متکلمین نے یہ بحثیں اٹھائی ہیں ہندوستان میں البتہ یہ مسائل اس طور پر سرسید ہی کے قلم سے وجود میں آئے

بھی مضامین لکھے، لیکن سب سے زیادہ سر سید کے مضامین ہیں۔ ان کے انتقال کے بعد انکے سب مضامین علیحدہ چھاپ دئے گئے ہیں۔ اور یہ بھی سر سید کی ایک تصنیف ہے۔ یہ رسالہ اردو کا پہلا رسالہ نہ تھا، اس سے پہلے درجنوں نکل چکے تھے اور نکل رہے تھے لیکن مضمونوں اور مضمون نگاروں دونوں کے لحاظ سے ہندوستان کا بہترین پرچہ تھا۔ سر سید کے مجموعہ مضامین میں زبان، طرز بیان، مضمون کی ایسی رنگارنگی اتنی جدت، اس قدر دلکشی ہے کہ بغیر مطالعہ کے اندازہ دشوار ہے اس میں مذہبی قومی، اخلاقی، اصلاحی، ہر قسم کے مضامین ہیں۔ اوران کے اسلوب نگارش میں فکر و تخیل، منطق و فلسفہ، جوش و خروش، متانت و جزالت، شوخی و ظرافت ہر رنگ کا حسب موقع جلوہ ہے۔ بعض نمونے پیش کئے جائیں گے۔

(۳۳) خطوط سر سید، سر سید۔ کے پوتے مرحوم سر راس مسعود (نواب مسعود جنگ) متوفی ۱۹۳۷ء نے چند سال ہوئے انکے خطوط کا مجموعہ شائع کردیا ہے۔ غالب کے بعد سر سید پہلے شخص ہیں جن کے خطوط زبان و ادب اور علم و عمل کے نقطۂ نظر سے دلکشی اور افادہ کا گنجینہ ہیں، ان میں پرائیویٹ خط بھی ہیں۔ اور قومی و ملکی و مذہبی معاملات کے متعلق بھی۔ صرف ان خطوں سے بھی سر سید کی سیرت و اخلاق کا صحیح و اصلی نقشہ مرتب ہو سکتا ہے۔

(۳۴) مجموعہ لکچرز و اسپیچز، سر سید کی تمام تقریریں یکجا شائع کر دی گئی ہیں۔

سر سید کا طرز تحریر اور اسکے نمونے (۱) دورِ قدیم۔ سر سید کے بڑے بھائی سید محمد خاں نے غالباً ۱۸۳۶ء یا ۱۸۳۷ء میں دہلی سے "سید الاخبار" جاری کیا۔ سر سید نے سب سے پہلے اس میں مضامین لکھنا شروع کیا۔ اس وقت ان کی عمر سترہ اٹھارہ برس کی ہوگی۔ اسکے بعد انھوں نے ۱۸۵۷ء تک متعدد کتابیں لکھیں۔ ان سب کا اسلوب تحریر قدیم ہے یعنی الفاظ کی بے محل تقدیم و تاخیر یا قواعد سے بے پروائی۔ مولانا

حالی لکھتے ہیں: "وہ تحریر یا تقریر کی روانی گرامر کی کچھ پروا نہ کرتے تھے، وہ ان قیدوں سے جو شاعروں اور منشیوں نے مقرر کی ہیں، بالکل آزاد تھے"۔ اس سے یہ مقصود نہیں ہے کہ یہ بے پروائی و آزادی فی نفسہ پسندیدہ، ضروری اور قابل تقلید ہے بلکہ سر سید کے زمانے میں قواعد زبان کی پابندی سخت نہ تھی، الفاظ کی بے ترتیبی عام تھی اردو فقروں پر اکثر دھوکا ہوتا تھا کہ فارسی کا ترجمہ ہیں۔ مضاف الیہ کو اکثر مضاف کے بعد لکھتے بولتے تھے، متعلقات فعل کو فعل کے بعد رکھ دیتے تھے بعض فارسی اسلوب اور فارسی محاورات کے ترجمے اس زمانے میں مستعمل تھے جو اب نہیں ہیں۔ یہ سب باتیں سر سید کی تحریر میں بھی ہیں۔ لیکن یہ بات نہیں کہ ان کو اس کا احساس نہ تھا۔ اصل میں عادت یوں ہی تھی۔ ان کے ہم عمروں میں کوئی ایسا نہ تھا جس کو یہی عادت نہ ہو۔ غالب کے رقعے خالص ادبی ٹکڑے ہیں لیکن وہاں بھی غالب کی اس عادت کی یادگاریں موجود ہیں۔ یہ عادت رفتہ رفتہ چھوٹی ہے۔ سر سید کے "رسالہ اسباب بغاوت" میں جا بجا ایسے فقرے ہیں، تہذیب الاخلاق کے مضامین میں بہت کم ہیں۔ "اسباب بغاوت" کا ایک فقرہ ہے جس کی (انگریزی گورنمنٹ کی) ابتدا ۱۷۵۷ء وقت شکست کھانے سراج الدولہ کے پلاسی پر سے شمار ہوتی ہے"۔ یہ تعقید لفظی بعد کو تقریباً جاتی رہی۔ "وہ" کی جگہ "وے" انھوں نے بعد کو بہت کم کر دیا تھا۔ "کر کے" کی جگہ "کر کر" آخر تک لکھتے بولتے رہے۔ ان لفظوں میں بھی یہ بات نہ تھی کہ التزام کے ساتھ بولتے تھے۔ بلکہ جیسا چاہا کہہ دیا۔ اسی طرح "چونکہ" کی جگہ "جو کہ" لکھتے تھے۔

اسباب بغاوت ہند کی تحریر کا نمونہ یہ ہے:۔

> یجس لیٹف کونسل میں ہندوستانیوں کے شریک نہ ہونے سے صرف اتنا ہی نقصان نہیں ہوا کہ گورنمنٹ کو اصلی مضرت قوانین و ضوابط کی جو جاری ہوتے

بخوبی معلوم نہیں ہو سکی، اور اغراض عام رعایا جس کا لحاظ رکھنا گورنمنٹ
کو واجبات سے تھا ملحوظ نہیں رہیں اور رعایا کو اس مضرت کے رفع کرنے اور اپنے
مطلب کے پیش کرنے کی فرصت اور قدرت نہیں ملی، بلکہ بہت بڑا نقصان یہ ہوا کہ
رعایا کو منشا اور اصلی مطلب اور دلی ارادہ گورنمنٹ کا معلوم نہوا۔ گورنمنٹ
کی ہر تجویز پر رعایا کو غلط فہمی ہوئی۔ جو تجویز گورنمنٹ کی ہوئی تھی، ہندوستانیوں
کو بسبب اسکے کہ وہ لوگ اس میں شریک نہ تھے اور علم اُس تجویز سے واقف نہ تھے
اس کی بنیاد معلوم نہوئی اور ہمیشہ یہی سمجھے کہ بات ہمارے اور ہمارے ہم وطنوں
کو خراب اور برباد اور ذلیل اور بے دھرم کرنے کو ہے۔ اور وہ بعضی باتیں جو
درحقیقت گورنمنٹ سے برخلاف رواج اور مخالف طبیعت اور طینت ہندوستانیوں کے
صادر ہوئی تھیں قطع نظر اس سے کہ وہ فی نفسہٖ اچھی تھیں یا بُری، زیادہ تر ان کے
غلط خیالات کو تقویت دیتی تھیں۔ رفتہ رفتہ یہ نوبت پونہچ گئی کہ رعایائے ہندوستان
ہماری گورنمنٹ کو میٹھے زہر اور شہد کی چُھری اور ٹھنڈی آنچ کی مثال دیا کرتی تھی،
اور پھر اس کو اپنے دل میں سچ سمجھتی، اور یہ جانتی تھی کہ اگر ہم آج گورنمنٹ کے
ہاتھ سے بچے ہوئے ہیں تو کل نہیں، اور کل ہیں تو پرسوں نہیں۔ اور کوئی شخص انکے
حالات کا پوچھنے والا اور کوئی تدابیر انکے اس خیال کو دور کرنے والی نہ تھی۔ جبکہ
رعایا گورنمنٹ کے ساتھ یہ حال موجودلی دشمن کے ساتھ ہونا چاہیے، تو پھر کیا توقع
ہو سکتی ہے وفاداری کی ایسی گورنمنٹ کو ایسی رعایا سے، اور جبکہ ہماری گورنمنٹ
درحقیقت ایسی نہ تھی تو اُن غلط خیالات کا ہندوستانیوں کے دل میں جمنا اور جو
رنج کہ ان کے دل پر تھا اس کا علاج نہونا صرف اسی سبب سے تھا کہ لیجس لیٹف
کونسل میں ہندوستانی شریک نہ تھے۔ اگر ہوتے تو سب باتیں رفع ہوتی جاتیں۔ اب
اگر غور سے دیکھا جائے تو صرف یہی ایک بات ہے جس نے اپنی بہت شاخیں پیدا کر کر

تمام ہندوستان میں بیجا فساد کر دیا۔"

اس اقتباس میں سر سید کے طرز تحریر کے علاوہ ان کا نرم و گرم بیان، صاف گوئی، جرأت اور صحت رائے بھی قابل دید ہے۔ اس مضمون کے لکھنے کا وہ زمانہ ۱۸۵۸ء ہے جب نتائج و مواخذات غدر سے امن بھی نہ ہوا تھا۔ اور یہ وہ تحریر ہے جو سیدھی ولایت بھیجنے کے لئے چھپوائی گئی تھی۔ چنانچہ سب سے پہلے لندن کی گورنمنٹ نے دیکھی، ترجمہ کرائی اور اس پر رائے زنی کی۔ ۱۸۵۸ء کے بعد سر سید نے اپنی زندگی میں اس کو دوبارہ نہیں چھپوایا۔ پھر ۴۵ برس بعد علی گڑھ کالج کی "ڈیوٹی بک ڈپو" نے ۱۹۰۳ء میں مطبع مفید عام آگرہ میں چھپوایا۔ وہی اشاعت ہمارے پیش نظر ہے

آثار الصنادید کا اقتباس یہ ہے:۔

نشیمن ظلّ الٰہی یا سنگین تخت

اس مکان کے بیچوں بیچ میں شرقی دیوار سے ملا ہوا سنگ مرمر کا تخت ہے چار گز کا مُربع اور اس پر چار ستون لگا کر بنگلے کے طور پر اس کی چھت بنائی ہے، اور آدمی کے قد سے زائد کرسی دی ہے، اسکے پیچھے ایک طاق ہے سنگ مرمر کا بنا ہوا، سات گز لنبا اور ڈھائی گز چوڑا، اس پر ہر ہر قسم کے چرند و پرند کی تصویریں عجب عجب رنگین پتھروں کی بنی ہوئی ہیں۔ اور اس میں ایک آدمی کی تصویر ہے جو دوتارہ بجا کر گا رہا ہے۔ ملک اٹلی میں جو فرنگستان میں واقع ہے، آرفیوس کلاونت کی کہانی یوں مشہور ہے کہ وہ علم موسیقی میں اپنا نظیر نہیں رکھتا تھا، اور ایسا خوش آواز تھا کہ جب گانے بیٹھتا تو چرند پرند اسکی آواز سن کر مست ہو جاتے تھے، اور اس کے گرد آ بیٹھتے تھے۔ اسی ملک میں رفیل ایک مصور تھا کہ تصویر کھینچنے میں اپنا مثل نہیں رکھتا تھا۔ اس مصور نے آرفیوس کے گانے کی جو کہانی مشہور تھی اس کے مطابق اپنے خیال سے ایک مرقع کھینچا تھا، اور چرند پرند اسکے گرد گانا سننے کو بیٹھے ہوئے بنائے تھے۔ یہ مصور ۱۵۲۰ء میں مرا

مگر یہ مرقع اس کا بنایا ہوا ملک اٹلی اور ولایت فرنگستان میں بہت مروج اور نہایت مشہور ہے، اور اب تک اسکی نقلیں موجود ہیں۔ وہی مرقع اس طاق میں پتھر کی پچیکاری میں کھودا ہے۔ پس یہ تصویر اسی آرفیوس کی ہے، اور چونکہ اس مرقع کا سوائے فرنگستان کے اور کہیں رواج نہ تھا۔ اس سببسے یقین پڑتا ہے کہ اس قلعہ کے بنانے میں کوئی نہ کوئی انگریز اٹلی کے ملک کا شریک تھا۔ اس محراب کی بغل میں دروازہ ہے، اور اندر سے بھی آنے کا رستہ ہے۔ بادشاہ اس تخت پر دربار عام کے دن اجلاس کرتے تھے۔ اس تخت سے آگے ایک تخت سنگ مرمر کا بچھا ہوا ہے۔ اُمرا میں سے جس کسی کو عرض کرنا ہوتا تھا، اس تخت پر چڑھ کر بادشاہ سے عرض کرتا تھا۔ یہ تخت اتنا اونچا ہے کہ اس تخت کے چڑھنے پر بھی آدمی کا گلا تخت تک پونہچتا ہے۔"

یہ تحریر "اسباب بغاوت" سے چار سال پہلے (۱۸۵۴ء) کی ہے۔ اور اسی اسلوب کی ہے

(۲) دور جدید۔ غدر کے بعد جب سرسید نے اپنا مقصد حیات، مسلک زندگی اور لائحہ عمل متعین کر لیا، اور تحریر و تقریر کے ذریعہ سے قومی و ملکی، مذہبی و معاشرتی اصلاح و اخلاقی علمی و تعلیمی خدمات شروع کیں، اس وقت سے انکے فکر و قلم اور زبان و بیان کا اصلی جوہر اور حقیقی کمال نمایاں ہوا۔ ان سے پہلے کسی ایک شخص کے زبان و قلم سے اس قدر گوناگوں مضامین ادا نہ ہوئے تھے۔ سرسید کی مختلف موضوعات کی کتابیں اخبار و رسالہ کے مضامین، پبلک تقریریں اور پرائیویٹ خطوط شاہد ہیں کہ ہر نوع کی بہتر سے بہتر تحریر کی بنیاد ڈالنے والے سب سے پہلے سرسید ہیں۔

سرسید کی تحریر میں زبان و محاورہ کی لطافت، بیان کی سادگی و صفائی، استعارہ و تشبیہ اور دیگر صنائع کا اعتدال و بے ساختگی، بیان کا جوش، طرز ادا کی روانی، استدلال کا زور، محاکات و منظر کشی، حسب موقع متانت و ظرافت

اس قدر کثرت، صحت اور موزونیت کے ساتھ ہے کہ ان سے پہلے کہیں نہ تھی، انکے
ساتھیوں میں ان سے بہتر نہ تھی، اور انکے ہم زمانہ لوگوں میں اکثر انہی کے اتباع کی بدولت
تھی۔ سر سید پیچیدہ سیاسی مسائل، باریک مذہبی نکات اور دشوار اصلاحی مباحث کو
نہایت صفائی، سادگی، بے تکلفی اور زور و قوت کے ساتھ بیان کر سکتے تھے۔ ان کی
برجستہ تقریروں اور قلم برداشتہ تحریروں میں بھی وہی انداز پیدا ہے، جو غور و فکر سے
لکھی ہوئی کتابوں اور مضامین میں ہے۔ حسب موقع اسلوب بیان اختیار کرنا، شوخی و
سنجیدگی سے برمحل کام لینا، جذب و اثر پیدا کرنا ان کے لئے بالکل فطری و طبعی بات تھی
کسی خاص کوشش و ارادہ کو دخل نہ تھا۔ گویا ان کو خبر بھی نہ ہوتی تھی اور صحیح انداز خود بخود
پیدا ہو جاتا تھا۔ جن الفاظ و محاورات کے بولنے کی ان کو عادت تھی بے تکلف ان کو
استعمال کر دیتے تھے، یہ خیال نہیں کرتے تھے کہ اہل زبان یا اہل دہلی کیا اور کس طرح
بولتے ہیں۔ دقیق علمی، فلسفیانہ، سائنٹفک، تنقیدی مضامین اس قدر سلجھا کر بیان
کرتے تھے کہ اس فن میں گویا ان کو اولیت حاصل تھی۔ بعض مضامین میں علمائے
یورپ کی فکر و رائے پر تنقید و تبصرہ کیا ہے۔ فضلائے عرب و عجم کی تحقیق پر نقد و نظر کی
ہے، اپنے زمانے کے اہل قلم اور اپنے مخالفوں کے مباحث کی تنقیح کی ہے۔ خود سر سید کی
تصانیف میں تاریخ و سیرت، مذہب و اخلاق، سیاست و حکمت وغیرہ موضوعات
شامل ہیں، ہر جگہ سر سید کا جوش بیان اور زور قلم نمایاں ہیں۔ اور انھوں نے اردو
زبان میں ہر قسم کے مضامین ادا کرنے کی قابلیت ثابت کر دی ہے۔ جہاں ان کو
اصابت رائے حاصل نہیں ہے وہاں بھی ان کا خلوص و دلسوزی ناقابل انکار ہے

مزاح و ظرافت سر سید کا فطری رنگ تھا۔ لیکن یہ موقع و محل پر صرف ہوتا تھا
خصوصاً پرائیویٹ خطوط میں یا مخالفوں کے مباحثہ میں اس رنگ کی شوخی نہایت
دلچسپ اور کارگر ہے۔ جذب و اثر پیدا کرنے کے موقع پر کوئی روحانی قوت انکے

اندر کام کرتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ اب انکے مختلف اسالیب بیان کے نمونے ان کی تصانیف، لکچروں اور خطوں سے پیش کئے جاتے ہیں۔

(۱) تبیین الکلام (تفسیر توراۃ وانجیل) مطبوعہ ۱۸۶۲ء کے مقدمۂ تاسعہ میں لکھتے ہیں:-

"اگر ایسا اتفاق ہوتا ہے کہ ایک لفظ یا ایک فقرہ کئی معنی رکھتا ہے اور اس کے مقابلہ میں دوسری زبان کا ایسا لفظ نہیں ہوتا جس سے وہ سب معنی حاصل ہوں اس لئے بمجبوری یا تو اس کا ترجمہ کسی ایک پہلو پر کرتا ہے، یا صرف بموجب اپنی رائے اور اپنے اعتقاد اور اپنے مسلمات کے اس کا ترجمہ کر دیتا ہے جو درحقیقت کلام الٰہی کی وسعت کو ناواجب تنگی میں ڈالتا ہے، کیونکہ ہر شخص یہ حق رکھتا ہے کہ جب تک بذریعہ الہام کے کوئی خاص معنی کسی کلام الٰہی کے مقرر نہوتے ہوں اس وقت کلام الٰہی سے جس قدر مطالب ہوں ان سب کو سمجھے اور سب پر غور کرے اور جو مطلب حق اور صحیح ثابت ہو اسکو اختیار کرے۔ پس جبکہ مترجم نے اس کلام الٰہی کو جس میں متعدد پہلو تھے ایک پہلو پر جو اس کے اعتقاد کے مطابق تھا۔ ترجمہ کر دیا تو اس نے ایک عام حق تلفی کی خصوصاً اس صورت میں جبکہ اسکا اعتقاد جس کے بموجب اس نے ترجمہ کیا۔ درحقیقت غلط ہو۔ ان وجوہات سے ہم مسلمانوں کے ہاں ضرور ہے کہ جس زبان میں مذہب کی اصلی کتابیں ہوں اس زبان سے واقف ہونا چاہئے، اور جب تک اصل زبان سے واقفیت نہو صرف ترجمہ پر اعتقادیات میں اعتماد نہیں ہو سکتا۔ دیکھو کیسی غلطی کی کتنے بڑے مترجم ایکویلا اور تھیوڈوشن اور سیمکس نے کہ کتاب اشعیاہ باب ۷، درس ۱۴ میں جو "علمہ" کا لفظ عبرانی زبان کا تھا، اس کا ترجمہ بجائے "کنواری" کے "جوان عورت" کر دیا اس لئے ہمارے مذہب میں یہ حکم ہے کہ جب تک بخوبی صحت نہو جاوے، اس وقت تک

ترجموں کی نہ تصدیق کرنی چاہیے نہ تکذیب کرنی چاہیے بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ جو کچھ خدا نے اُتارا ہے، اس پر ہم ایمان رکھتے ہیں۔"

(۲) خطبات احمدیہ میں "تعدد ازدواج" پر بھی نہایت طویل و مُدلل بحث کی ہے۔ اس حصے کا مختصر نمونہ یہ ہے:۔

"اب ہم کہتے ہیں کہ اسلام نے تمام مذہبوں سے بڑھ کر تعدد ازدواج کو نہایت خوبی سے روکا ہے، اور صرف ایک ہی بیوی کرنے کو پسند کیا ہے، اور تعدد کو صرف ایک نہایت محدود خاص حالت میں جائز رکھا ہے۔ ہم کو کچھ شبہہ نہیں کہ سچا مسئلہ سچے مذہب کا جو اس کی مرضی کے موافق ہو جس نے مرد و عورت کو جوڑا پیدا کیا، ضرور ایسا ہوگا، جو قانون قدرت کے تو برخلاف نہ ہو اور معاشرت میں کوئی نقصان نہ پیدا کرے اور وہ یہی ہو سکتا کہ عموماً کثرت ازواج کی ممانعت، اور صورت ہائے خاص اور حالاتِ مستثنیٰ میں اجازت ہو۔ اور یہی مسئلہ ٹھیٹ اسلام کا ہے۔ قرآن مجید نے اس نازک معاملہ اور دقیق اور پُرپیچ مطلب کو نہایت فصیح و بلیغ دو لفظوں میں بیان کر دیا ہے جہاں فرمایا ہے فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةً[1] (یعنی اگر تم کو خوف ہو کہ متعدد جوروؤں میں عدل نہ کر سکو گے تو صرف ایک ہی جورو رکھنی چاہیے) اس آیت کے اگر وہی ظاہری معنی لئے جائیں جیسے کہ اکثر فقہا اور علما نے لئے ہیں تو بھی یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ شارع نے تعدد ازدواج کو گویا بالکل روک دیا ہے، کیونکہ جو سچا دیندار ہوگا وہ بغیر اشد ضرورت کے کبھی تعدد ازدواج کی جو ایسی سخت شرط کے ساتھ مشروط کیا گیا ہے، جرأت نہیں کریگا۔ لیکن اگر اس آیت کے الفاظ کو بہ تعمق نظر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ تعدد کو شاذ و نادر صورتوں کے سوا قطعاً ناجائز ٹھہرایا گیا ہے۔ کیونکہ یہ نہیں کہا گیا کہ إِنْ لَّمْ تَعْدِلُوا بلکہ یہ فرمایا گیا ہے کہ

[1] یعنی اگر عدل نہ کر سکو۔

اِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا[1] بس اگر یہ ممکن بھی ہو کہ مرد متعدد عورتوں میں عدل کر سکے تو بھی عدل نہ ہو سکنے کا اندیشہ کبھی زائل نہیں ہو سکتا۔"

(۳) تفسیر القرآن میں "سورۂ توبہ" کی تفسیر میں مسئلہ جہاد پر بحث کرتے ہوئے آنحضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے غزوات (لڑائیوں) کی نسبت لکھتے ہیں

"تمام انبیا جبکہ قوم کی اصلاح اور انکی درستی کو کھڑے ہوتے ہیں تو ابتدا میں عموماً انکے دشمن چاروں طرف ہوتے ہیں۔ اگر وہ مخالفوں سے محفوظ رہنے کی کوشش نہ کرتے تو دنیا میں نہ آج یہودی مذہب کا وجود ہوتا اور نہ کسی اور مذہب کا، اور نہ عیسائی مذہب کا نام باقی رہتا اگر بعد حضرت مسیح کے اس کیلئے ایسا زمانہ نہ آتا جس میں اسکے پیرووں کی مخالفین سے حفاظت کی گئی اور بزور حکومت اسکو ترقی دی گئی پس یہ کہنا کہ انبیا کو ایسی لڑائیاں نازیبا ہیں، ایک ایسا قول ہے جس کو قانون قدرت مردود ٹھہراتا ہے۔ لوگ حضرت موسیٰ کے کاموں کو تو بھول جاتے ہیں اور غریبی اور مسکینی اور مظلومی کی مثال میں حضرت مسیح کو پیش کرتے ہیں۔ مگر حضرت مسیح نے جب اپنے تئیں خلقت کے سامنے پیش کیا اس وقت سے ان کی وفات تک نہایت قلیل زمانہ قریب تین برس کے گزرا تھا، اور صرف ستر آدمیوں کے قریب (اس عرصہ میں) ان پر ایمان لائے تھے۔ انکو مطلق ایسی قوت جس سے وہ اپنے دشمنوں کو دفع کر سکیں، حاصل نہیں ہوئی تھی، اور اسی سبب سے کالوری کے پہاڑ پر وہ افسوس ناک واقعہ (یعنی مصلوب ہونا) واقع ہوا اس کے بعد اگر اس کے (یعنی دین مسیحی کے) ایسے حامی نہ پیدا ہو جاتے جو دشمنوں کو دفع کر سکے تو آج دنیا میں ایک بھی گرجا اور ایک بھی خانقاہ نہ دکھائی دیتی۔"

---

[1] یعنی اگر تم کو خوف ہو کہ عدل نہ کر سکو گے۔

(۴) تہذیب الاخلاق کے ذریعہ سے سر سید نے جو خدمت قوم و مذہب کے ساتھ اردو زبان و ادب کی انجام دی اس کے نتائج و فوائد نہایت وسیع و جلیل اور زود اثر و دور رس ثابت ہوئے۔ سر سید کے مخالف کثرت سے تھے جو ان کی ہر اصلاح و تحریک اور ہر تجویز و رائے کی مخالفت کرتے تھے، خواہ وہ قومی ہو یا مذہبی یا تعلیمی سر سید حسب ضرورت ان کا جواب لکھتے تھے۔ اس طرح سر سید کی جولانی قلم کے لئے میدان بڑھ گیا، اور دوسرے مخالف مصنفوں اور رسالوں نے بغیر ارادہ وہی سادہ و صحیح اسلوب بیان اختیار کر لیا جو سر سید نے شروع کیا تھا۔ مضامین سر سید کے چند نمونے درج کئے جاتے ہیں۔

(الف) تہذیب الاخلاق پہلی مرتبہ ۱۸۷۰ء ۱۲۸۷ھ میں جاری ہوا تھا۔ اس کے سب سے پہلے پرچے میں سر سید نے اسکے جاری کرنے کا مقصد بیان کیا ہے۔ لکھتے ہیں:۔

"اس پرچہ کے اجراء سے مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو کامل درجہ کی سویلزیشن یعنی تہذیب اختیار کرنے پر راغب کیا جاوے، تاکہ جس حقارت سے سویلزڈ و مہذب قومیں انکو دیکھتی ہیں وہ رفع ہووے، اور وہ بھی دنیا میں معزز و مہذب قومیں کہلاویں۔ سویلزیشن انگریزی لفظ ہے جس کا تہذیب ہم نے ترجمہ کیا ہے مگر اسکے معنی نہایت وسیع ہیں۔ اس سے مراد ہے انسان کے تمام افعال ارادی، اخلاق اور معاملات اور معاشرت اور تمدن اور طریقۂ تمدن اور صرف اوقات اور علوم اور ہر قسم کے فنون و ہنر کو اعلیٰ درجہ کی عمدگی پر پہنچانا، اور ان کو نہایت خوبی و خوش اسلوبی سے برتنا جس سے اصلی خوشی اور جسمانی خوبی ہوتی ہے اور تمکین و وقار اور قدر و منزلت حاصل کی جاتی ہے اور وحشیانہ پن اور انسانیت میں تمیز نظر آتی ہے۔"

(ب) اس سے تین سال بعد نئے سال ہجری کے پہلے پرچے میں جو "افتتاحیہ"

سرسید نے لکھا ہے، اس سے ان کی شوخی تحریر، ظرافت وطنز، اور مخالفین کو جواب دینے کا انداز معلوم ہوگا۔ فرماتے ہیں :۔

"الحمد للہ کہ ۱۸۹۰ء نوے پورا ہوا اور ۱۸۹۱ء اکیانوے شروع ہوگیا۔ ہمارے اس پرچہ کو جاری ہوئے سوا تین برس ہوگئے۔ پچھلا سال بھی خندۂ گل و نالۂ بلبل سے خالی نہیں گیا، ہمارے آہ و نالہ نے بدستور غلغلہ رکھا، اور ہمارے ناصحانِ شفیق کا بھی شور و شغب کم نہ ہوا ۔

حسن شہرت عشق رسوائی تقاضا می کند ‍ ‍ ‍ جرم معشوق و گناہ عاشق بیچارہ نیست

ناصحانِ شفیق نے ہم کو کبھی کچھ کہا اور کبھی کچھ آخر کار ہم کو کافر و ملحد ٹھہرا ہی دیا، دور و نزدیک کے مولوی صاحبوں سے کفر کے فتووں پر مہریں چھپوا ہی منگوائیں، اور ہمارے اور ہمارے ناصح شفیق جناب مولوی حاجی سید امداد العلیٰ صاحب نے ایک رسالہ چھاپ ہی دیا اور "امداد الآفاق" اس کا نام رکھا۔ بھلا اور کچھ ہوا یا نہ ہوا، بیچارے غریب چھاپہ والے کو تو فائدہ ہوگیا۔ اسی سال میں ہماری تحریرات کی تردید میں مولانا علی بخش خاں صاحب بہادر نے (جو امید ہے کہ اب تک حاجی بھی ہوگئے ہوں گے اور انشاء اللہ تعالیٰ آیندہ سے انکو بھی حاجی لکھا کریں گے) دو رسالے تحریر فرمائے جن میں سے ایک کا نام شہابِ ثاقب اور دوسرے کا نام تائید الاسلام لتبارک میں نور الانوار اپنا نور عالم میں برساتا ہی تھا۔ مگر اس سے ایک اور پرچہ انکے گھر کا اُجالا مسمّی بہ "نور الآفاق لامع ظلمۃ النفاق" پیدا ہوا ہے، جو نہایت ہی دلچسپ ہے، اور ہمارے اس پرچہ "تہذیب الاخلاق" کے جواب میں نکلا ہے۔ اسکے مضامین بظاہر تو جناب حاجی مولوی سید امداد العلی صاحب بہادر کے طبع زاد معلوم ہوتے ہیں مگر بعض لوگ ان مضامین کو لے پالک بتلاتے ہیں۔ بہرحال ہم کو اس سے کیا کہ وہ میاں نذیر کے ہیں یا میاں بشیر کے، کسی کے ہوں مگر دلچسپ ہیں۔ خدا

ان کی عمر دراز کرے۔"

(ج) اسی سلسلے میں ایک اور اقتباس بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ مولوی علی بخش خاں (سب آرڈینیٹ جج گورکھپور) سر سید کے شاید سب سے بڑے مخالف تھے۔ سب سے زیادہ تردیدی کتابیں اور مضامین انہی نے لکھے ہیں۔ یہاں تک کہ مکۂ مکرمہ اور مدینۂ طیبہ کے علمائے سے سر سید کے کفر کے فتوے لکھوا کر لائے۔ ان کی مذکورۂ بالا کتاب "تائید الاسلام" کے جواب میں سر سید نے ایک مضمون "دافع البہتان" لکھا۔ اس مضمون کو ذیل کے فقرے پر ختم کیا ہے۔ شوخی و ظرافت قابل دید ہے:-

"جو کوئی میری اس تحریر کو دیکھے گا تعجب کرے گا کہ جناب سید الحاج (یعنی مولوی علی بخش خاں) نے کیوں ایسے سخت اور محض غلط بہتان مجھ پر کئے ہیں؟ ظاہر اس کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ جناب سید الحاج نے جب یہ رسالہ لکھا ہے قریب اسی زمانے کے حج کو تشریف لیجانے والے تھے۔ انھوں نے خیال کیا ہوگا کہ لاؤ حج کو تو جاتے ہی ہیں جتنے گناہ کرنے ہیں سب کر لیں۔ حج کے بعد تو سب پاک ہی ہو جاویں گے جیسے کہ بعض آدمی جب مسہل لینا چاہتے ہیں تو خوب بد پرہیزی کرتے ہیں، اور سمجھتے ہیں کہ مسہل سے سب کھایا پیا نکل جاوے گا۔ مگر جناب سید الحاج کو معلوم کرنا چاہئے کہ گو حج میں سب گناہ آپ کے معاف ہو گئے ہوں، اور شبلی و جنید کے مرتبہ پر آپ پونہچ گئے ہوں، مگر حق العباد نہ حج سے بخشے جاتے ہیں، نہ کسی بشارت سے، آپ نے جو اتہام مجھ پر کئے ہیں، جب تک میں ہی نہ معاف کروں معاف نہیں ہو سکتے۔ پس مقتضائے ایمانداری یہ ہے کہ آپ حج دراحمد کا احرام باندھیے اور گناہوں کی معافی چاہئے، ورنہ روز جزا اپنے کرتوتوں کا مزا آپ کو معلوم ہو جائے گا۔"

(د) سر سید نے "آزادی رائے" پر ایک اخلاقی و اصلاحی مضمون عالمانہ تحقیق کے

رنگ میں لکھا ہے۔ اس میں انھوں نے ایک انگریز محقق کے مقالے سے استفادہ کیا ہے، جیسا کہ آغاز مضمون میں ذکر کرتے ہیں کہ "ہم اپنے اس آرٹیکل کو ایک بڑے لائق اور قابل زمانۂ حال کے فیلسوف کی تحریر سے اخذ کرتے ہیں"۔ اس کا ایک فقرہ (پیراگراف) یہ ہے:-

"اگرچہ رسم و رواج بھی اُس کے برخلاف رایوں کے اظہار کیلئے ایک بہت قوی مزاحم کار گنا جاتا ہے لیکن مذہبی خیالات، مخالف مذہب رائے کے اظہار اور مشتہر ہونے کے لئے نہایت قوی مزاحم کار ہوتے ہیں۔ اس قسم کے لوگ صرف اسی پر اکتفا نہیں کرتے کہ اس مخالف رائے کا اظہار ہونا ان کو ناپسند ہے بلکہ اسی کے ساتھ جوش مذہبی اُمنڈ آتا ہے، اور عقل کو سلیم نہیں رکھتا، اور اس حالت میں ان سے ایسے افعال و اقوال سرزد ہوتے ہیں جو انھیں کے مذہب کو جس کے وہ طرفدار ہیں مضرت پونہچاتے ہیں۔ وہ خود اس بات کے باعث ہوتے ہیں کہ بسبب پوشیدہ رہنے ان اعتراضوں کے انھیں کے مذہب کے لوگ انکے حل پر متوجہ نہوں، اور مخالفوں کے اعتراض بلا تحقیق کئے، اور بلا دفع کئے باقی رہ جاویں۔ وہ خود اس بات کا باعث ہوتے ہیں کہ ان کی آئندہ نسلیں، بسبب نا تحقیق باقی رہ جانے ان اعتراضوں کے جس وقت ان اعتراضوں سے واقف ہوں، اسی وقت مذہب سے منحرف ہو جاویں۔ وہ خود اس بات کا باعث ہوتے ہیں کہ وہ اپنی نادانی سے تمام دُنیا پر یہ بات ظاہر کرتے ہیں کہ اس مذہب کو جس کے وہ پیرو ہیں، مخالفوں کے اعتراضوں سے نہایت ہی اندیشہ ہے، اگر انہی کے مذہب کا کوئی شخص بغرض حصول اعتراض مذکورہ ان کو پھیلانا چاہے تو اس کو خود معترض کی جگہ تصوّر کرتے ہیں، اور اپنی نادانی سے دوست کو دشمن قرار دیتے ہیں"۔

یہ مضمون بھی سرسید کے طویل محققانہ مقالات میں سے ہے۔ اسطرح کے اخلاقی مقالے مختلف عنوانات سویلزیشن، سیلف ریسپکٹ، رسم و رواج، خوشامد، ریا وغیرہ پر

بڑی کثرت سے لکھے۔ یہ فن مقالہ نگاری سرسید کے زمانے سے پہلے اردو میں داخل نہ ہوا تھا۔ اخبارات ورسائل کے جاری ہونے سے اس کا آغاز ہوا۔ سرسید کے اخبار سوسائٹی گزٹ" اور رسالہ "تہذیب الاخلاق" سے پہلے اور بہت سے اخبار اور رسالے جاری تھے اور ان میں مذہبی، اخلاقی، علمی مقالات شائع ہوتے تھے، لیکن سرسید نے نئے نئے مفید دلچسپ عنوانوں پر مضامین لکھے، بڑی کثرت سے لکھے، اور نہایت صحیح اسلوب بیان اختیار کیا۔ اس لئے اوّلیت وافضلیت کا سہرا سرسید ہی کے سر ہے۔

(۵) مقالات کی ایک قسم تمثیلی یا رمزیہ ہے، جس کو انگریزی میں "ایلیگوری" کہتے ہیں اس طرز نگارش میں مستقل کتابیں، "سب رس"، "اخوان الصفا" "بستانِ حکمت" وغیرہ پہلے بھی اردو میں لکھی گئی ہیں، جن کا ذکر آچکا ہے لیکن مختلف و متفرق موضوعات پر مختصر مقالاتِ تمثیل لکھنے کا رواج سرسید کے زمانے سے، بلکہ انہی کے قلم سے شروع ہوا اگرچہ ان کے ساتھ ہی ساتھ اور لوگ بھی شریک کار ہو گئے۔ آزاد کے مضامین "نیرنگ خیال" محسن الملک کی "موجودہ تعلیم و تربیت کی شبیہ" حالی کی "زبان گویا" اور ان سب سے بڑھ کر شرر لکھنوی کے مضامین "دلگداز" اردو کی قابل قدر یادگاریں ہیں۔

سرسید کی تمثیل نگاری کا ایک نادر نمونہ ان کا مضمون "امید کی خوشی" ہے۔ اس کے مختلف مقامات کے اقتباسات سرسید ہی کے الفاظ میں مسلسل کر کے لکھے جاتے ہیں۔

> "او نورانی چہرے والے یقین کی اکلوتی خوبصورت بیٹی امید! اے خدائی روشنی تیرے ہی ساتھ ہے۔ تو ہی ہماری مصیبتوں کے وقتوں میں ہم کو تسلی دیتی ہے تو ہی ہمارے آڑے وقتوں میں ہماری مدد کرتی ہے تیری ہی بدولت نہایت دور دراز خوشیاں ہم کو نہایت ہی پاس نظر آتی ہیں۔ تیرے ہی سہارے سے زندگی کی مشکل مشکل گھاٹیاں ہم طے کرتے ہیں۔ تیرے ہی سبب سے ہمارے خوابیدہ خیال جاگتے ہیں۔ تیری ہی برکت سے خوشی خوشی کے لئے تمام آدمی تمام آدمی کے

لئے، بہادری بہادری کے لئے، فیاضی فیاضی کے لئے، محبت محبت کے لئے نیکی نیکی کے لئے تیار ہے۔ انسان کی تمام خوبیاں اور ساری نیکیاں تیری ہی تابع اور تیری ہی فرماں بردار ہیں۔

وہ پہلا گنہگار انسان، جبکہ شیطان کے چنگل میں پھنسا، اور تمام بدیوں نے اسے گھیرا، تو صرف تو ہی اسکے ساتھ رہی، تو نے اس ناامید کو ناامید ہونے نہیں دیا۔ تو نے ہی اس موت میں پھنسے ذلیل کو مرنے نہیں دیا۔ تو نے ہی اسکو ذلت سے نکالا، اور پھر اس کو اعلیٰ درجہ پر پونہچایا، جہاں کہ فرشتوں نے اسے سجدہ کیا تھا۔

وہ پہلا ناخدا، جبکہ طوفان کی موجوں میں بہا جاتا تھا، اور بجز مایوسی کے اور کچھ نظر نہیں آتا تھا، تو تو ہی اس طوفان میں اس کی کشتی کھینے والی، اور اس کا بیڑا پار لگانے والی تھی۔ تیرے ہی نام سے جودی پہاڑ کی مبارک چوٹی کو عزت ہے

وہ دلاور سپاہی لڑائی کے میدان میں کھڑا ہے، کوچ پر کوچ کرتے کرتے تھک گیا ہے۔ ہزاروں خطرے درپیش ہیں، مگر سب میں تقویت تجھی سے ہے ملڑائی کے میدان میں جب کہ بہادروں کی صفیں کی صفیں چپ چاپ کھڑی ہوتی ہیں اور لڑائی کا میدان ایک سنسان کا عالم ہوتا ہے، دلوں میں عجب قسم کی خوف ملی ہوئی جرأت ہوتی ہے، اور جبکہ لڑائی کا وقت آتا ہے، اور لڑائی کے بگل کی آواز بہادر سپاہی کے کان میں پونہچتی ہے، اور وہ آنکھ اٹھا کر نہایت بہادری سے بالکل بے خوف ہوکر لڑائی کے میدان کو دیکھتا ہے، اور جبکہ بجلی سی چمکنے والی تلواریں اور سنگینیں اس کی نظر کے سامنے ہوتی ہیں۔ اور بادل کی سی کڑکنے والی اور آتشیں پہاڑ کی سی آگ برسانے والی توپوں کی آواز سنتا ہے اور جبکہ اپنے ساتھی کو خون میں لتھڑا ہوا زمین پر پڑا ہوا دیکھتا ہے، تو اے

بہادروں کی قوتِ بازو، اور اے بہادری کی ماں، تیرے ہی سبب سے فتحمندی کا خیال ان کے دلوں کو تقویت دیتا ہے ان کا کان نقارہ میں سے تیرے نغمہ کی آواز سُنتا ہے۔

وہ[1] قوم کی بھلائی کا پیاسا اپنی قوم کی بھلائی کی فکر کرتا ہے، دن رات اپنے دل کو جلاتا ہے جن کی بھلائی چاہتا ہے انھیں کو دشمن پاتا ہے، دوست آشنا دیوانہ کہتے ہیں، عالم فاضل کفر کے فتووں کا ڈر دکھاتے ہیں۔ بھائی بند، عزیز اقارب سب سمجھاتے ہیں۔ اور پھر یہ شعر پڑھ کر چپ ہو رہتے ہیں:۔

وہ بھلا کس کی بات مانے ہیں بھائی سیّد تو کچھ دوانے ہیں

ساتھی ساتھ دیتے ہیں مگر ہاں ہاں کرکر، محنت اور دلسوزی سے دور رہ کر، بہت سے ہمدردی کرتے ہیں، پر کوٹھی کٹھلے سے الگ کر کر، مگر اے بیقرار دلوں کی راحت اور اے شکستہ خاطروں کی تقویت۔ تو ہی ہر دم ہمارے ساتھ ہے۔ اور ہمارے دل کی عزیز، اور ہمارے پیارے مہدی[2] کی پیاری "امید" تو ہمیشہ ہمارے دل کی تسلّی رہ۔

اے ہمیشہ زندہ رہنے والی امید، جبکہ زندگی کا چراغ ٹمٹماتا ہے، اور دنیاوی حیات کا آفتاب لب بام ہوتا ہے، ہاتھ پاؤں میں گرمی نہیں رہتی، رنگ فق ہو جاتا ہے، منھ پر مُردنی چھا جاتی ہے۔ ہوا ہوا میں، پانی پانی میں، مٹی مٹی میں ملنے کو ہوتی ہے تو تیرے ہی سہارے سے وہ کٹھن گھڑی آسان ہوتی ہے۔ اس وقت اس زرد چہرے اور آہستہ آہستہ ہلتے ہوئے ہونٹوں، اور بے خیال بند ہوتی ہوئی آنکھوں، اور غفلت کے دریا میں ڈوبتے ہوئے دل کو

---

[1] یہاں سرسید خود اپنی مثال دیتے ہیں۔ [2] یعنی نواب محسن الملک سید مہدی علی خاں

تیری یادگاری ہوتی ہے، تیرا نورانی چہرہ دکھائی دیتا ہے، تیری صدا کان میں آتی ہے، اور ایک نئی روح اور تازہ خوشی حاصل ہوتی ہے، اور ایک نئی لازوال زندگی کی، جس میں ایک ہمیشہ رہنے والی خوشی ہوگی، امید ہوتی ہے۔

ہماری آنکھوں سے چھپی ہوئی دوسری دنیا! جس میں ہم کو ہمیشہ رہنا ہے، جہاں سورج کی کرن اور زمانہ کی لہر بھی نہیں پہونچتی، تیری راہ تین چیزوں سے طے ہوتی ہے۔ ایمان کے توشہ اور امید کے ہادی، اور موت کی سواری سے مگر ان سب میں جس کو سب سے زیادہ قوت ہے وہ ایمان کی خوبصورت بیٹی ہے جس کا پیارا نام اُمید ہے

لوگ کہتے ہیں کہ بے یقینوں کو موت کی کٹھن گھڑی میں کچھ امید نہیں ہوتی، مگر میں دیکھتا ہوں کہ تیری بادشاہت وہاں بھی ہے۔ قیامت پر یقین نہ کرنے والا سمجھتا ہے کہ تمام زندگی کی تکلیفوں کا اب خاتمہ ہے، اور پھر کسی تکلیف کے ہونے کی توقع نہیں ہے۔ وہ اپنے اس بے تکلف آنے والے زمانہ کی امید میں نہایت بُردباری سے اور رنجوں کے زمانہ کے اخیر ہونے کی خوشی میں نہایت بشاشت سے یہ شعر پڑھتا ہوا جان دیتا ہے۔

بقدر ہر سکوں راحت بود، بنگر تفاوت را
دویدن رفتن استادن، نشستن خفتن مردن

(و) سر سید نے بعض مضامین "مکالمہ" کے طرز میں لکھے ہیں۔ اردو میں یہ روش مرزا غالب کی ایجاد ہے۔ لیکن سر سید کی مقالہ نگاری کے دور میں مکالمہ ڈرامے کا انداز اور لوگوں نے بھی شروع کر دیا تھا۔ "تہذیب الاخلاق" کے جاری ہونے سے پہلے مولوی نذیر احمد دہلوی کی "مرآۃ العروس" شائع ہوگئی تھی جس میں افراد قصہ کی گفتگو پرانی داستانوں کی طرح نہیں، بلکہ نئے ناولوں کے انداز میں تھی۔ پھر

"تہذیب الاخلاق" کے دوسرے دور میں اخبار اودھ پنچ لکھنؤ مجریہ ۱۸۷۷ء چلنے لگا تھا، اور اس میں مزاحیہ مضامین مکالمہ کے طرز میں بھی لکھے جاتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی ۱۸۷۸ء سے پنڈت رتن ناتھ سرشار نے "اودھ اخبار" میں اپنا فسانۂ آزاد شائع کرنا شروع کر دیا تھا۔ ان سب کے انداز تحریر سے سر سید باخبر تھے، تاہم ان کے طرز مکالمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے غالب کا اتباع کیا ہے۔ ایک نمونہ درج کیا جاتا ہے۔ انھوں نے عجائبات مذہب یا معجزات کے انکار میں ایک مضمون عجائبات کا ڈھول اور قبول لکھا ہے۔ اس کو مکالمہ کے رنگ میں شروع کرتے ہیں۔

"ہیں! تم نے یہ کیسی متضاد باتیں کیں"؟

"حضرت میں کیا کروں، انسان کی جبلّت ہی ایسی متضاد باتوں پر واقع ہوئی ہے"

"اس متضاد جبلّت کے سبب بڑے بڑے بزرگوں یہاں تک کہ انبیا کو بھی نہایت مشکلیں پیش آئی ہیں۔ مذہب سی عمدہ چیز کا بھی اسی جبلّت نے ستیاناس کر دیا"۔

"حضرت اب تک تو ہماری سمجھ میں یہ معمّا نہیں آیا۔ اگر آپ کچھ تفصیل سے بتا دیں تو شاید سمجھ میں آجاوے"۔

"میاں سمجھو! دنیا میں قدرتی عجائبات اس قدر ہیں کہ انسان نہ ان کو سمجھ سکتا ہے نہ گن سکتا ہے۔ دن کا ہونا، رات کا آنا، چمکدار سورج کا نکلنا، باریک چاند کا دکھائی دینا، اور پھر بڑھتا جانا، بدر ہونا، اور اپنی چاندنی سے اندھیری دنیا کو روشن کرنا، پھر گھٹتا جانا، اور پہلی طرح باریک سا ہو کر چھپ جانا۔ کیا عجائبات قدرت سے نہیں ہے؟"

(اسکے بعد بہت سے عجائبات قدرت، کالی گھٹا کا اٹھنا، درختوں کا اُگنا، پرندوں کا ہوا میں اڑنا، شہد کی مکھی کے کرتب بیان کرتے ہیں۔ اور

ہر بات پر کہتے ہیں کہ کیا یہ عجائبات قدرت نہیں ہیں۔ اس کے بعد لکھتے ہیں)

"مگر چونکہ یہ باتیں روزمرہ دیکھنے میں آتی ہیں۔ ان کا عجیب بلکہ عجیب تر ہونا انسان کے خیال میں نہیں رہتا۔ اور اس سے ذہول (فراموشی یا غفلت) ہو جاتا ہے، مگر انسان جب کسی مذہب پر اعتقاد لاتا ہے، یا کسی شخص کو مقدس سمجھتا ہے، تو عجائبات کو اس کے ساتھ لگاتا ہے، اور جو عجائبات اس کے ساتھ لگائے گئے ہیں، ان سب کو قبول کرتا ہے، بلکہ بغیر ان عجائبات کے مذہب کی حقیقت یا اس شخص کے تقدس کو تسلیم نہیں کرتا۔ (اس کے بعد حضرت نوح سلیمان، موسیٰ، یونس عیسیٰ علیہم السلام کے معجزات کا ذکر کر کے لکھتے ہیں)

یہی خیال اولیاء اللہ تک بھی پہنچ گیا۔ جب تک ان میں کرامتیں نہ پائی جائیں، اور ان پر یقین نہ کیا جائے کہ ولیوں نے مُردوں کو بھی زندہ کر دیا ہے، اور برسوں کی ڈوبی ہوئی برات کو دریا میں سے زندہ نکال دیا، اور چنیں اور چناں کیا، اس وقت تک انکے ولی ہونے پر بھی یقین نہیں ہوتا . . . .

رفتہ رفتہ لوگوں کے خیال میں یہ بات جم گئی کہ عجائبات کے بغیر نہ مذہب چلتا ہے، نہ لوگ ایسے مذہب کو جس میں کچھ عجائبات نہ ہوں، قبول کرتے ہیں مگر یہ سخت غلطی ہے۔ کوئی مذہب جو سچا ہے اور سچا ہونے کا دعویٰ کرتا ہے، اس میں کبھی ایسے عجائبات نہیں ہوتے جو فطرت کے خلاف ہوں، عقل انسانی کے خلاف ہوں، اور کوئی سمجھدار آدمی ان کو تسلیم نہ کرے، بلکہ اصلی اور سچا مذہب ایسے عجائبات، خلاف فطرت اور خلاف عقل سے بالکل پاک اور خالی ہوتا ہے گو کہ بعد کو اسکے ماننے والوں نے عجائبات پرستی کی راہ سے اس میں بہت سے عجائبات شامل کر دئے ہوں، اس میں جس قدر حصہ عجائبات کا ہے، وہ ان عجائبات پرستوں کا شامل کیا ہوا ہے، جو قدرت کے عجائبات کو ذہول کرتے ہیں، اور

خلاف قدرت اور خلاف عقل عجائبات کو قبول کرتے ہیں۔ خدا ان عجائب پسندوں سے بچائے ۔"

(س) سرسید کو حسب موقع جدید اسالیب بیان پیدا کرنے اور ہر موضوع کو قوت و قدرت کے ساتھ بیان کرنے کا خاص ملکہ حاصل تھا۔ مثلاً بقول مولانا حالی کے "واقعات و حالات کے حسن و قبح کی تصویر اس طرح کھینچتے تھے کہ جو برائیاں بسبب الف و عادت کے دلوں میں کھب گئی ہوں، ان کی برائی، اور جو خوبیاں سوسائٹی کے اثر سے نظروں سے چھپ گئی ہوں اُن کی خوبی، فوراً دلوں پر نقش ہو جائے"۔ یہ کمال جو سرسید کی تحریریں دیکھا جاتا ہے، ان سے پہلے نہ تھا۔ اور انکے بعد کی تحریروں کے مقابلے میں بھی ان کی انفرادیت آج تک قائم ہے۔ اسکی مثالیں خاص کر "تہذیب الاخلاق" کی قدیم و جدید جلدوں میں بکثرت موجود ہیں۔ جن میں سے بہترین نمونہ سرسید کا مضمون "بحث و تکرار" ہے اس کا اقتباس درج کیا جاتا ہے۔

"جب کتے آپس میں مل کر بیٹھتے ہیں تو پہلے تیوری چڑھا کر ایک دوسرے کو بری نگاہ سے آنکھیں بدل بدل کر دیکھنا شروع کرتے ہیں۔ پھر تھوڑی تھوڑی گونجیلی آواز انکے نتھنوں سے نکلنے لگتی ہے، اور پھر تھوڑا سا جبڑا کھلتا ہے، اور دانت دکھائی دینے لگتے ہیں، اور حلق سے آواز نکلنی شروع ہوتی ہے۔ پھر باچھیں چر کر کانوں سے جا لگتی ہیں، اور ناک سمٹ کر ماتھے پر چڑھ جاتی ہے، داڑھوں تک دانت باہر نکل آتے ہیں، منہ سے جھاگ نکل پڑتے ہیں، اور عنیف آواز کے ساتھ اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں، اور ایک دوسرے سے چمٹ جاتے ہیں۔ اس کا ہاتھ اُسکے گلے میں اور اس کی ٹانگ اس کی کمر میں۔ اس کا کان اس کے منہ میں، اور اس کا ٹینٹوا اس کے جبڑے میں۔ اس نے اس کو کاٹا، اور اُس نے اس کو پچھاڑ کر بھنبھوڑا۔ جو کمزور ہوا دم دبا کر بھاگ نکلا۔

نامہذب آدمیوں کی مجلس میں بھی آپس میں اسی طرح تکرار ہوتی ہے۔ پہلے صاحب سلامت کرکے آپس میں مل بیٹھتے ہیں، پھر دھیمی دھیمی بات چیت شروع ہوتی ہے۔ ایک کوئی بات کہتا ہے۔ دوسرا بولتا ہے واہ یوں نہیں یوں ہے وہ کہتا ہے واہ تم کیا جانو۔ وہ بولتا ہے تم کیا جانو۔ دونوں کی نگاہ بدل جاتی ہے تیوری چڑھ جاتی، رُخ بدل جاتا ہے، آنکھیں ڈراؤنی ہو جاتی ہیں۔ باچھیں چڑھ جاتی ہیں، دانت نکل پڑتے ہیں، تھوک اڑنے لگتا ہے، باچھوں تک کف بھر آتے ہیں، سانس جلدی چلتا ہے، رگیں تن جاتی ہیں، آنکھ، ناک، بھوں ہاتھ عجیب عجیب حرکتیں کرنے لگتے ہیں۔ عنیف عنیف آوازیں نکلنے لگتی ہیں آستین چڑھا، ہاتھ پھیلا، اِس کی گردن اُس کے ہاتھ میں، اور اُس کی داڑھی اس کی مٹھی میں، لپا ڈگی ہونے لگتی ہے۔ کسی نے بیچ بچاؤ کرکے چھڑا دیا۔ تو غرّاتے ہوئے ایک اِدھر چلا گیا اور ایک اُدھر۔ اور اگر کوئی بیچ بچاؤ کرنے والا نہ ہوا، تو کمزور نے پٹ کر کپڑے جھاڑتے، سر سہلاتے اپنی راہ لی۔

جس قدر تہذیب میں ترقی ہوتی ہے اسی قدر اس تکرار میں کمی ہوتی ہے کہیں غرفش ہو کر رہ جاتی ہے، کہیں تُو تکار تک نوبت آجاتی ہے، کہیں آنکھیں بدلنے اور ناک چڑھانے اور جلدی جلدی سانس چلنے ہی پر خیر گذرتی ہے۔ مگر ان سب میں کسی نہ کسی قدر کُتّوں کی مجلس کا اثر پایا جاتا ہے۔ پس انسان کو لازم کہ اپنے دوستوں سے کُتّوں کی طرح بحث و تکرار کرنے سے پرہیز کرے۔

انسانوں میں اختلاف رائے ضرور ہوتا ہے، اور اسکے پرکھنے کے لئے بحث و مباحثہ ہی کسوٹی ہے۔ اور اگر سچ پوچھو تو بے مباحثہ اور دل لگی کے آپس میں دوستوں کی مجلس بھی پھیکی ہے۔ مگر ہمیشہ مباحثہ اور تکرار میں تہذیب، شائستگی، محبت اور دوستی کو ہاتھ سے دینا نہ چاہیے"

(۵) سرسید کی تقریر۔ بقول مولانا حالی کے ہندوستان میں انیسویں صدی سے پہلے قومی اور ملکی مجمعوں میں اسپیچ یا لکچر دینے کا رواج نہیں پایا جاتا۔ سید احمد خاں پہلے شخص ہیں جنھوں نے اپنی ملکی زبان میں پبلک اسپیکنگ کی راہ نکالی ہے مولانا حالی سرسید کے سیرت نگار کرنل گریہم کی رائے نقل کرتے ہیں کہ وہ (یعنی سرسید) ایک پیدائشی اوریٹر (مقرر) ہیں۔ جب وہ اپنے خاص مقصد کے متعلق جوش میں بھری ہوئی تقریر کرتے ہیں تو انکی طرز تقریر مسٹر گلیڈ سٹن سے مشابہ ہوتی ہے۔ اس جوش کے ضبط کرنے کی کوشش میں انکے ہونٹ کانپنے لگتے ہیں، آواز دردناک ہو جاتی ہے اور چہرہ متغیر ہو جاتا ہے، اور یہ تمام درد و غم کی علامتیں ان کے سامعین پر بجلی کی طرح اثر کرتی ہیں۔

مولانا حالی کہتے ہیں کہ "اس کا تماشا ہم نے خود اپنی آنکھ سے دیکھا ہے سرسید نے پنجاب کا پہلا سفر ۱۸۷۳ء میں کیا تھا۔ جبکہ تہذیب الاخلاق کو جاری ہوئے پورے تین برس گزر چکے تھے۔ اس وقت راقم بھی لاہور میں موجود تھا..... ۲۹ دسمبر کو جو لکچر کہ سرسید صاحب نے راجہ دھیان سنگھ کے دیوان خانے میں، جہاں کئی ہزار آدمیوں کا مجمع تھا، دیا، اس کا سماں مجھ پر ہمیشہ یاد رہے گا۔ سامعین پر ایک سکتہ کا سا عالم تھا۔ کوئی مسلمان ایسا نہ ہوگا جو زار و قطار نہ روتا ہو۔ اور جو اپنی بساط سے زیادہ دینے پر آمادہ نہ ہو... خصوصاً مندرجہ ذیل الفاظ نے تمام حاضرین کی حالت دگرگوں کر دی تھی"۔

"اے بزرگان پنجاب، میں فرض کرتا ہوں کہ میں بدعقیدہ ہوں، مگر میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ اگر ایک کافر مرتد آپ کی قوم کی بھلائی پر کوشش کرے تو کیا آپ اسکو اپنا خادم اپنا خیرخواہ نہ سمجھیں گے۔ آپ کی دولت سرا بنانے میں جسمیں آپ آرام فرماتے ہیں اور آپ کے بچے پرورش کرتے ہیں، آپ کیلئے مسجد بنانے

میں جس میں آپ خدائے واحد ذوالجلال کا نام پکارتے ہیں؟ چوہڑے، چمار، قلی، کافر بت پرست، بدعقیدہ، سب مزدوری کرتے ہیں۔ مگر آپ نہ کبھی اس دولت سرا کے دشمن ہوتے ہیں اور نہ کبھی اس مسجد کے منہدم کرنے پر آمادہ ہوتے ہیں۔ بس آپ مجھ کو بھی اس مدرستہ العلوم کے قائم کرنے میں ایک قلی، چمار کی مانند تصور کیجئے اور میری محنت اور مشقت سے اپنے لئے گھر بننے دیجئے، اور اس وجہ سے کہ اس کا بنانے والا یا اس میں مزدوری کرنے والا ایک قلی چمار ہے اپنے گھر کو مت ڈھائیے۔ کیا آپ صاحب مجھ بدبخت نامہ سیاہ کی شامت اعمال سے اپنی تمام قوم کو اور انکی اولاد کو نسلاً بعد نسلٍ ڈبونا اور خراب وخستہ حالت میں ڈالنا چاہتے ہیں؟ اگر آپ سب صاحب میری حالت کو بدتر جانتے ہو، اس سے عبرت پکڑو اور برائے خدا اپنی قوم کی، اپنی اولاد کی بھلائی و بہتری کی فکر کرو۔"

(ب) اوپر کی تقریر سے گیارہ برس بعد ۱۸۸۴ء میں سرسید نے بمقام گورداسپور خاتونانِ پنجاب کے ایڈریس کے جواب میں تقریر کی تھی۔ یہ ایڈریس مسلمان عورتوں کی طرف سے سرسید کی خدمت میں پیش کیا تھا جس کی بانی سردار محمد حیات خاں بہادر کی بیگم صاحبہ تھیں، مگر اس کے نیچے بعض ہندو اور عیسائی عورتوں کے بھی دستخط تھے۔ ہندوستان کی تاریخ میں یہ پہلی تقریر تھی جس میں شریف ہندو، مسلمان، عیسائی عورتوں کو مخاطب کیا گیا تھا۔ سرسید کے چند فقرے تھے:

اے میری بہنو! آج کی رات میرے لئے شب قدر سے کچھ کم قدر کی نہیں ہے جو ایڈریس تمہاری طرف سے مجھ کو دی گئی[1] ہے وہ میرے لئے ایسی عزت ہے جو آج تک

---

[1] سرسید نے ایڈریس کو مؤنث کہا ہے۔ لیکن اب مذکر بولنا فصیح مانا جاتا ہے۔

ہندوستان میں کسی کو نصیب نہیں ہوئی میں تمہاری اس شفقت کا دل سے شکر گذار ہوں۔

اے میری بہنو! میں اپنی قوم کی مستورات کی بہت زیادہ قدر کرتا ہوں۔ ہماری قوم کے مردوں نے اپنے باپ دادا کی بزرگی کو خاک میں ملا دیا ہے مگر خدا کے فضل سے تم میں ہمارے باپ دادا کے بزرگ نشان بدستور موجود ہیں یہ سچ ہے کہ ہم مردوں میں شبلیؒ اور جنیدؒ موجود نہیں ہیں۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ تم میں ہزاروں لاکھوں رابعہ بصری موجود ہیں۔

تمہاری نیکی، تمہاری بُردباری، تمہاری محبت، ہر قسم کی مشکلات کی برداشت اور اس پر صبر، بچوں کی پرورش، گھر بار کا انتظام، ہمارے فخر کا باعث ہے۔ اگر کوئی قوم تمام دنیا میں اپنے تئیں کسی قسم کا فخر دے سکتی ہے تو ہم اپنی قوم کی مستورات کو دنیا کی قوموں پر فخر دے سکتے ہیں۔ یہ ہمارا فخر تمہارے ہی سبب سے ہے۔

میں نے تمہارے لڑکوں کی تعلیم پر جو کوشش کی ہے اس سے تم یہ نہ سمجھو کہ میں اپنی پیاری بیٹیوں کو بھول گیا ہوں، بلکہ میرا یقین ہے کہ لڑکوں کی تعلیم پر کوشش لڑکیوں کی تعلیم کی جڑ ہے۔ پس جو خدمت میں تمہارے لڑکیوں کے لئے کر رہا ہوں درحقیقت وہ لڑکوں لڑکیوں دونوں کے لئے ہے۔

میری یہ خواہش نہیں ہے کہ تم ان مقدس کتابوں کے بدلے جو تمہاری دادیاں نانیاں پڑھتی آئی ہیں، اس زمانے کی مروجہ نامبارک کتابوں کا پڑھنا اختیار کرو جو اس زمانے میں پھیلتی جاتی ہیں مردوں کو جو تمہارے لئے روٹی کما کر لانے والے ہیں زمانے کی ضرورت کے مناسب کچھ ہی علم یا کوئی سی زبان سیکھنے اور کیسی ہی نئی چال چلنے کی ضرورت پیش آتی ہو مگر ان تبدیلیوں سے جو

ضرورت تعلیم کے متعلق تم کو پہلے تھی، اس میں کچھ تبدیلی نہیں ہوئی۔

اے میری ہندو اور عیسائی بہنو! تم نے جو اپنی محبت اور وطنی یگانگت سے اپنی مسلمان بہنوں کے ساتھ اس ایڈریس میں اور اس امداد میں، جو مدرستہ العلوم کے غریب طالب علموں کو دی گئی ہے شرکت کی، وہ ایک نمونہ تمہاری محبت یگانگت کا ہے۔ میں دل سے اس کے لئے تمہارا شکر ادا کرتا ہوں اور دعا دیتا ہوں کہ تم پر بھی خدا تعالیٰ کی برکت ہو، اور ہر طرح کی ترقی اور خوشی تم کو نصیب ہو۔ آمین"

(ج) سر سید نے اپنے پوتے سید مسعود کی بسم اللہ کی تقریب میں (غالب ۱۸۹۴ء میں) بمقام علی گڑھ ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسوں کے بعد تمام ممبروں کے سامنے ایک تقریر کی تھی اس کے چند آخری فقرے یہ تھے۔

اے حضرات، گو میں نے اس وقت قوم ہی کا گیت گایا ہے، مگر اس سے نہ سمجھا جائے کہ ہم کو اور قوموں سے محبت اور برادرانہ محبت نہیں ہے۔ ہماری قوم خراب حالت میں ہے اس لئے اسی کا گیت گایا جاتا ہے، ورنہ ہم اور قوموں سے بھی ایسی ہی محبت رکھتے ہیں جیسی اپنے عزیزوں سے۔ اس وقت اس کے دو علانیہ ثبوت موجود ہیں۔ ایک یہ کہ سید محمود اور مسٹر راس سے نہایت دوستی اور برادرانہ اور عزیزانہ محبت ہے۔ جب سید مسعود پیدا ہوا تو مسٹر راس اور ان کی میم صاحبہ نے موافق انگریزی رسم کے، جو نہایت محبت پر دلالت کرتی ہے، اپنا نام اس مولود مسعود کو دیا، اور ہم نے نہایت خوشی سے ان کا نام اس کے نام کے ساتھ شامل کیا، اور اسی سبب سے اس کا نام سید راس مسعود قرار پایا۔ دوسرا نمونہ (راجہ جے کشن داس بہادر، سی، ایس، آئی کی طرف نہایت خوش محبت کے ساتھ اشارہ کر کے کہا) ہمارا یہ داڑھی منڈا دوست یہاں

موجود ہے اور سید راس مسعود کو اپنی بغل میں بٹھائے ہوئے ہیں۔ ان کو میں اپنا معز زادہ محسن بھائی سمجھتا ہوں، اور سید محمود ان کو چچا کہتے ہیں، اور سید راس مسعود "دادا راجہ" بس ہم اپنے دوستوں سے محبت کرنے میں کچھ فرق نہیں کرتے۔"

(۶۸) سرسید کے خطوط۔ خطوط میں بھی سرسید کی طرز تحریر اور افتاد طبع کی تمام خصوصیات نمایاں ہیں۔ القاب غالب کی طرح مختصر لکھتے ہیں: "بھائی" "مخدومی" وغیرہ۔ ظرافت جو غالب کی طرح سرسید کی بھی طبیعت ثانیہ ہے جا بجا چمکتی ہے۔ سرسید کے لائق پوتے سر راس مسعود مرحوم (متوفی ۱۹۳۷ء) نے "خطوط سرسید" کا مجموعہ شائع کر دیا ہے۔ چند خطوں کا اقتباس بطور نمونہ درج کیا جاتا ہے۔

(الف) سرسید کے کسی نہایت عزیز دوست کو ایک زمانے میں ایسے افسر سے سابقہ پڑا جو نماز پڑھنے پر تعرض کرتا تھا، اور اس امر کی اطلاع انھوں نے سرسید کو بھی کی تھی اس کے متعلق سرسید ان کو لکھتے ہیں:۔

"بھائی..... کل میں سارے دن متردد رہا کیونکہ تمہارا کوئی خط نہیں آیا تھا آج خط آیا اور حال معلوم ہوا۔ گو میں کسی وقت کی نماز پڑھتا ہوں اور کسی وقت کی نہیں پڑھتا۔ اور وقت بے وقت کا بھی خیال نہیں کرتا۔ دو دو اکٹھی بھی ملا کر پڑھ لیتا ہوں۔ ریل میں جتنا سفر ہو مجھ سے ادا نہیں ہو سکتی، یہ سب باتیں مجھ میں ہیں اور نالائقی اور شامت اعمال سے ایسی سستی نماز میں ہے۔ مگر تم سے اس معاملے میں جو پیش آیا نہایت بُرا کیا۔ نماز جو خدا کا فرض ہے، اس کا ہم اپنی شامت اعمال سے، جس خرابی سے ہو، ادا کریں یا قضا کریں، لیکن اگر کوئی شخص یہ کہے تم نماز نہ پڑھو، اس کا صبر ایک لمحہ بھی نہیں ہو سکتا، یہ بات

سنی بھی نہیں جا سکتی۔ میری سمجھ میں نماز نہ پڑھنا صرف گناہ ہے جس کے بخشے جانے کی توقع ہے، اور کسی شخص کے منع کرنے سے نہ پڑھنا یا سستی میں ڈالنا میری سمجھ میں کفر ہے جو کبھی بخشا نہ جائے گا۔ تم کو یا تو پہلے ہی خود اپنی شامت اعمال سے ایسا طریقہ اختیار کرنا تھا جو کبھی اس قسم کی بحث نہ آتی، اور جب ایسا طریقہ اختیار نہیں کیا تھا تو پھر لجلجانا اور گڑگڑانا، اور حضور رخصت ہی دیں، تنخواہ کاٹ لیں، کہنا واہیات تھا۔ تڑاق سانی استعفا دے دینا تھا، صاف کہہ دینا تھا کہ میں اپنے خدائے عظیم الشان قادر مطلق کے حکم کی اطاعت کروں گا نہ آپ کی۔ کیا ہوتا؟ نوکری نہ میسر ہوتی۔ فلتے مر جاتے۔ نہایت اچھا ہوتا۔ والسلام

(ب) خان بہادر مولوی سید زین العابدین خاں سے سر سید کو خاص محبت و یگانگت تھی، اور اسی خصوصیت کے سبب سے ان پر سب سے زیادہ خفگی اور ناراضی بھی رہتی تھی۔ جب خان بہادر صاحب ریاست رامپور کی اسٹیٹ کونسل کے جوڈیشل ممبر ہو کر رامپور چلے گئے تو سر سید نے اپنی علالت کے زمانے میں (غالباً ۱۸۹۷ء میں) ان کو یہ خط بھیجا تھا:۔

"مکرمی زینو! ابھی تمہارا خط پہنچا، کچھ شبہ نہیں کہ تم کو مجھ سے جدا ہونے کا ایسا ہی رنج ہے جیسا کہ تم نے لکھا، مگر تم تو اس رنج کو کسی قدر لکھ بھی سکے، مگر مجھ کو تمہارے چلے جانے سے جو رنج ہے وہ لکھا بھی نہیں جا سکتا۔ زبان کھجلاتی ہے اور کوئی یہاں نہیں ہے کہ اس کو برا کہوں، دل میں غصہ آتا ہے اور ....

...... کوئی یہاں نہیں ہے جس پر غصہ نکالوں، ہاتھ کھجلاتے ہیں اور کوئی یہاں نہیں ہے جس کو ماروں۔ حقیقت میں تمہارے جانے سے مکان سونا نہیں ہوا بلکہ دل سونا ہو گیا۔ صبح کو اٹھ کر خدا یاد نہیں آتا مگر تم یاد آتے ہو سے ۔۔۔ ئے کہ ہرگز فراموشت نکنم ؛ کا نقشہ ہو گیا ہے۔"

سرسید کی تحریر کی خصوصیات

(۱) سرسید کی تحریر میں جو طرز قدیم کا اثر اور متروک الفاظ کا استعمال ہے، وہ کوئی عیب نہیں۔ اس زمانے کے سب لوگ ایسا ہی لکھتے تھے۔ البتہ یہ بات ضرور محسوس ہوتی اور ذرا گراں گزرتی ہے کہ کبھی کبھی ان کے فقرے زیادہ طویل اور پیچدار ہو جاتے ہیں اگر ان کو چھوٹے چھوٹے جملوں میں تقسیم کر دیا جائے تو زیادہ سلیس ہو جائیں الفاظ کی بے قاعدہ تقدیم و تاخیر بھی کہیں کہیں الجھن پیدا کر دیتی ہے اس کے علاوہ اور کوئی کمی ان کی تحریر میں نہیں ہے۔

(۲) سرسید نے مختلف موضوعات و مضامین پر قلم اٹھایا ہے۔ اور کمال یہ ہے کہ ہر موضوع اور ہر موقع کے لئے اس کے مناسب زبان و بیان اختیار کیا ہے۔ کسی دعوے پر دلیل لاتے ہیں تو ایسی قوت کے ساتھ کہ اس سے بہتر کا امکان نظر نہیں آتا جذبات سے اپیل کرتے ہیں تو ایسی ہی تاثیر کے ساتھ۔ کسی مسئلے کی تحقیق کرتے ہیں تو اس کے کسی جزو کو نہیں چھوڑتے، کوئی منظر د واقعہ بیان کرتے ہیں تو تصویر کھینچ دیتے ہیں، ظرافت و مزاح کا موقع ہوتا ہے تو بے اختیار ہنسا دیتے ہیں۔ الفاظ کی متانت، لطافت، شوخی و رنگینی کو حسب موقع صرف کرنے پر حیرت ناک اختیار رکھتے تھے۔ اس صفت کے بغیر کوئی شخص ادیب نہیں بن سکتا۔ اور یہ صفت سرسید سے پہلے ان سے بہتر کسی تنہا مصنف میں نہیں پائی جاتی۔

(۳) سرسید کی تحریر و تقریر ان کے مسلک و مشن کے سبب سے نہایت دور رس اور وسیع الاثر تھی۔ اس لئے ان کے دوستوں کے ساتھ انکے دشمنوں نے بھی نادانستہ و بے اختیار وہی طرز و روش اختیار کر لی، اور اس طرح دوسروں کی

تصانیف اور اخبارات و رسائل کی زبان میں بھی سلاست و صفائی پیدا ہو گئی۔

(۴) سر سید کی بعض تصانیف مثلاً "خطبات احمدیہ" اور اکثر مضامین تہذیب الاخلاق ایسے موضوعوں پر اور اس قدر خوش اسلوبی کے ساتھ لکھے گئے ہیں کہ ان سے پہلے اردو کیا، عربی و فارسی میں بھی ان کی نظیر نہیں ملتی۔ سر سید کی کتابوں سے زیادہ ان کے مضامین مفید ہیں، جن سے اردو میں فن مقالہ نگاری پیدا ہو گیا۔

(۵) سر سید کے مذہبی عقائد اور قومی و تعلیمی مشاغل کو بہت سے مسلمان ناپسند کرتے تھے اور ان کی مخالفت میں کتابیں لکھتے تھے، اخبار نکالتے تھے، مضامین شائع کرتے تھے۔ اس ذریعہ سے اُردو میں بڑا لٹریچر پیدا ہو گیا۔ یہ بھی بالواسطہ سر سید ہی کا احسان تھا۔

(۶) سر سید کی براہ راست تربیت سے، اور ان کی تصنیف و تحریر کے اثر سے ملک میں نامور مصنف پیدا ہو گئے۔ مولوی وحید الدین حلیم نے سالہا سال اور مولانا شبلی نے چند سال سر سید کو ان کی "تفسیر قرآن" کی ترتیب میں مدد دی ہے، سر سید کو دیکھ کر ان بزرگوں میں صاحب قلم بننے کا ذوق و سلیقہ پیدا ہوا۔ شبلی کا علم کلام کی طرف رجحان سر سید ہی کی تفسیر اور خطبات سے پیدا ہوا۔ مولانا حالی اور نواب محسن الملک بھی سر سید کے زیر اثر اور پیش نظر رہتے تھے۔ مولوی چراغ علی، نواب وقار الملک، نواب حاجی محمد اسمٰعیل سر سید ہی کی تحریر و صحبت کے اثر سے مضمون نگار و مصنف بنے۔ مولوی عبد الحلیم شرر لکھنوی کی تحریر پر سر سید کی مقالہ نگاری کا اثر پڑا۔ مولوی عزیز مرزا، خواجہ غلام الثقلین، ظفر علی خاں، خوشی محمد خاں ناظر سر سید سے اثر پذیر اور تربیت یافتہ ہیں۔

ان اعتبارات سے سر سید اپنے دور کے مُنفرد شخص ہیں۔ ان کی سب سے پہلی تصنیف "آثار الصنادید" (۱۸۴۷ء) سے ان کی زندگی کے ۵۰ برس میں بلکہ پوری

اُنیسویں صدی میں، کوئی دوسرا مصنف ایسا نہیں ہے جس نے تعداد میں اتنی زیادہ مضامین میں اتنی مختلف، ضخامت میں اتنی گراں، خوبیوں میں اتنی اعلیٰ فوائد میں اتنی کثیر، اثر میں اتنی وسیع تصانیف کی ہوں۔

(۷) لیکن سر سید کی یہ جو کچھ اوّلیت و اولویت ہے صرف تاریخی ہے۔ سر سید ہندوستان میں انیسویں صدی کے بہت بڑے رہبر و مُصلح تھے۔ مذہب، اخلاق معیشت، تعلیم، سیاست، زبان و ادب، سب میں اصلاح کرنا چاہتے تھے اور موجودہ جمود کی حالت سے نکالنا چاہتے تھے۔ لیکن خود بڑی حد تک قدامت پسند تھے۔ اس لئے زبان و ادب میں باوجود جدّت و وسعت پیدا کرلنے کے اپنی طبعی و فطری قدامت کو ترک نہ کرسکے۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ ان کی رہبری و اصلاح اصل میں ملکی و قومی حالات و ضروریات کی جانب متوجہ تھی، اس لئے ان کا طرزِ تحریر بیشتر "صحافتی" ہے۔ اور ایسا ہونا غالباً ناگزیر تھا۔ ان کی زندگی سراسر عمل اور جدّ و جہد تھی، انھوں نے حالیؔ و شبلیؔ کی طرح کوئی "شوقیہ" کتاب نہیں لکھی۔ ان کی تمام تصانیف "مقصدی" تھیں۔ اور مقصد تھا مناظرہ و مباحثہ، اصلاح اعمال و اخلاق، اشاعت علم و تعلیم، فلاح قوم و مذہب، اس لئے تقریباً ہر جگہ ان کی تحریریں خطابت و صحافت نمایاں ہیں۔ اور ہر جگہ ان کی قدامت جلوہ گر ہے۔

پھر بھی تاریخی حیثیت سے سر سید کی تحریر رفتارِ اردو میں ایک ضروری "موڑ" ہے اور ان کی اس اہمیت و عظمت سے کبھی انکار نہ ہو سکے گا۔

اِس دَور کے غیر مشہور مصنفین

سر سید کے زمانۂ تصنیف یا غدر سے پہلے بھی مختلف اطرافِ ہند میں مصنف

پیدا ہوگئے تھے جیسا کہ صفحہ ۱۶۳ و صفحہ ۲۰۴ اور صفحہ ۲۰۵ کی فہرستوں سے معلوم ہوا
سر سید کے زمانے میں انیسویں صدی کے آخر تک اتنی کثرت سے اور ایسے اعلیٰ درجے
کے مصنف پیدا ہوئے کہ ان کی تصانیف پر آج تک اردو زبان و ادب کو فخر ہے
اور ہمیشہ رہے گا۔ بعض کتابیں اردو میں بالکل نئی ایجاد تھیں، اور بعض ایسی
تھیں کہ موضوع و مضمون یا زبان و طرز بیان کے اعتبار سے آج تک ان سے
بہتر نہ لکھی جا سکیں، جب تصانیف و اہل تصنیف کی اتنی کثرت ہو تو ادب اردو
کے مورخ کے لئے بجز اس کے چارۂ کار نہیں کہ ان میں سے انتخاب کر کے چند
ممتاز ہستیوں کا تذکرہ کر دے۔ یہی راہِ عمل ہم بھی اختیار کرتے ہیں، لیکن
ناظرین کے اندازے کے لئے چند غیر مشہور لیکن ممتاز مصنفوں اور ان کی تصانیف
کی فہرست درج کرتے ہیں، اور ان میں بعض کے حالات اور نمونے بھی۔

(۱) تواریخ راسلس مترجمہ سید محمد میر لکھنوی (سنہ ۱۸۳۹ء)

(۲) عجائبات فرنگ سفرنامہ یوسف خاں کمبل پوش (سنہ ۱۸۴۷ء)

(۳) نجات قاسم مصنفہ شاہ محمد قاسم ابوالعلائی داناپوری (سنہ ۱۸۵۷ء)

(۴) تذکرۃ المشاہیر مرتبہ منشی سداسکھ لال (سنہ ۱۸۶۰ء)

(۵) تصویر شعرا مرتبہ مفتی اکرام اللہ صدیقی گوپاموی (سنہ ۱۸۶۱ء)

(۶) ترجمہ سہ دفتر ابوالفضل مرتبہ مولوی قمرالدین اکبرآبادی (سنہ ۱۸۶۱ء)

(۷) تذکرہ شعر و سخن مرتبہ نیاز علی پریشاں (سنہ ۱۸۶۹ء)

(۸) گلستان بےخزاں مرتبہ حکیم سید قطب الدین خاں باطن اکبرآبادی (سنہ ۱۸۶۱ء)

(۹) آثار شعرائے ہنود مرتبہ دیبی پرشاد (سنہ ۱۸۸۵ء)

(۱۰) سفرنامہ یورپ مرتبہ مرزا نثار علی بیگ اکبرآبادی (سنہ ۱۸۸۵ء)

(۱۱) زبدۃ الحکمۃ مصنفہ مولانا عبدالحق خیرآبادی۔

(۱۲) خلاصۃ المنطق مصنفہ منشی دیبی پرشاد بدایونی (۱۸۷۲ء)

(۱۳) منہاج المنطق مترجمہ مولوی محمد رضا خاں لکھنوی (۱۸۸۱ء)

(۱۴) انتخاب یادگار مرتبہ منشی مفتی امیر احمد مینائی (۱۸۷۳ء / ۱۲۹۰ھ)

(۱۵) البرہان (سرسید کی تفسیر قرآن کا رد) مصنفہ مولوی محمد علی تحصیلدار بچھرایونی (۱۸۸۰ء کے بعد)

(۱۶) آئینۂ وکالت مصنفہ پنڈت ہرراج کشور دت منصف ایٹہ (۱۸۸۹ء / ۱۳۰۶ھ) [۱]

ان میں پہلی دو کتابیں غدر سے پہلے کی ہیں۔ باقی انیسویں صدی کے نصف آخر کی ہیں۔ یہ فہرست بہت طویل ہو سکتی تھی لیکن یہاں اُن چند کتابوں کا نام لیا گیا ہے جو بلحاظِ موضوع یا باعتبار مصنفین ممتاز ہیں اور اردو ادب کیلئے اضافہ۔ اِن میں سے بعض کا نمونہ درج کیا جاتا ہے۔

سید محمد میر لکھنوی ان کا حال دریافت نہیں ہوا۔ ۱۸۳۹ء میں ایک انگریزی کتاب کا ترجمہ کیا ہے۔ کتاب کے سرورق پر نام ونشان اس طرح درج ہے:۔

"تواریخ راسلس شہزادۂ حبش کی، جس کو عالم متبحر جانسن صاحب (سیموئل جانسن ایل ایل ڈی) نے تصنیف کیا سید محمد میر لکھنوی نے آگرہ اسکول بک سوسائٹی کے واسطے اردو زبان میں اس کا ترجمہ کیا، اور پادری جان جیمس مور صاحب نے منشی محمد فتح اللہ خاں اکبرآبادی کی استعانت

---

[۱] ان کتابوں میں سے کچھ خاکسار مؤلف کے پاس ہیں اور اکثر جناب مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی کے کتب خانہ میں ہیں۔

سے تصحیح کرکے گرین دے صاحب کے چھاپے خانے میں چھپوایا۔ ۱۸۳۹ مسیحی

اسکا مختصر دیباچہ یہ ہے:۔

عاصی کمال الدین حیدر عرف محمد میر حسنی الحسینی نے واسطے صاحبان عالی شان آگرہ اسکول بک سوسائٹی کے تاریخ راسلس شہزادے کی، کہ جسے ڈاکٹر جانسن صاحب نے بکمال فصاحت اور بلاغت تحریر کیا ہے اور صاحبان عالی شان بھی اس رسالے کو بہت عزیز رکھتے ہیں، زبان اردو میں ترجمہ کیا کہ صاحبان فہم و فراست کو تہذیب اخلاق بخوبی دریافت ہو۔

ترجمہ کا نمونہ یہ ہے:۔

شہزادی نے جواب دیا کہ میں نے بہت مجرد لوگوں سے ملاقات کی جو اس ہی سبب سے بغیر شادی کے اپنی زندگی کو عالم تجرید میں بسر کرتے ہیں لیکن کبھی نہ دیکھا کہ ان کی تمیز و فراست اور لوگوں کے حسد کرنے کے لائق ہو۔ انکی زندگی بغیر دوستی و محبت کے مثل خواب خیال کے گزرتی ہے۔ ہر ایک روز ان کو بے فائدہ اور بار خاطر معلوم ہوتا ہے۔ اس واسطے کہ بیکار اور بے شغل بیٹھے یا روئیا در پڑے رہتے اور خستگی دل سے رہائی کے لیے بیہودہ مشغلوں اور خطاؤں میں مشغول ہوتے ہیں۔ انکے چلن ان شخصوں کے موافق ہیں جو اپنے تئیں پست رتبوں میں جانتے ہیں۔ اسی سبب سے دل حسد اور بغض سے بھر جاتے ہیں اور زبان پر لوگوں کی غیبت اور عیب جوئی جاری ہوتی ہے۔ گھر میں بدمزاج رہتے ہیں اور باہر بدظن، جیسے چور و قزاق جو شرع سے باہر ہو کر ہی چلتے ہیں۔ کہ صحبت انسانی کو برہم کریں اس رشک سے کہ اس کی منفعت سے آپ محروم رہتے ہیں۔

یہ ترجمہ بہت صاف و سلیس ہے۔ اُس زمانے میں لوگوں نے فارسی زبان کے

بھی ایسا اچھا ترجمہ مشکل سے کیا ہے۔

یوسف خاں کمبل پوش

حیدر آباد وطن اصلی تھا، سیر و سیاحت کے لئے گھر سے نکلے، تمام ہندوستان کی سیر کر کے انگلستان کا سفر کیا، یورپ کے دوسرے مقامات اور مصر وغیرہ کی بھی سیر کی۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ہندوستانی سیاحوں میں سب سے قدیم تھے ۱۸۲۸ء سے سیاحت شروع کی، ۱۸۳۷ء میں ولایت کا سفر کیا۔ حالات سفر لکھتے گئے، جن کو ۱۸۴۷ء میں دہلی میں چھپوایا۔ پھر دوبارہ ۱۸۷۳ء میں مطبع نول کشور میں چھپا۔ عجائبات فرنگ اس کا نام ہے۔ یہ اردو میں سب سے پہلا سفر نامہ ہے۔ اور بڑی خوبی یہ ہے کہ محض ایک سیاح کا سفر نامہ ہے جس کی کوئی قومی و ملکی یا تعلیمی غرض نہ تھی۔ اور سب لوگوں کے سفر مثلاً مولوی مسیح الدین، سر سید احمد خاں، راجہ موہن رائے وغیرہ کے اس سے بعد کے ہیں، اور لبغرض سیر و سیاحت نہ تھے۔ پھر انیسویں صدی کے آخر میں اور بیسویں صدی میں بھی لوگوں نے یورپ کے سفر نامے لکھے ہیں۔

یوسف خاں کمبل پوش ۲۰ مارچ ۱۸۳۷ء کو کلکتہ سے انگلستان روانہ ہوئے تھے اور ۲۵ جولائی ۱۸۳۸ء کو واپس کلکتہ پہنچے۔ سفر کے حالات بقید تاریخ لکھے ہیں۔ راستے کے ہوٹلوں اور لندن وغیرہ کے محلوں کے نام اور نمبر تک درج کئے ہیں۔ اپنا مذہب سلیمانی بتایا ہے، ہر جگہ اس کا ذکر کیا ہے، اصول مذہب بھی لکھے ہیں اور اس کو حضرت سلیمان علیہ السلام کا مذہب بتایا ہے۔ "سلیمانی" نام کا یہی سبب ہے۔ شراب پیتے تھے، بڑی بے تکلفی سے اس کا ذکر کرتے ہیں۔ بلکہ ایک جگہ کمال جسارت سے شراب کو جائز بتا دیا ہے، لکھتے ہیں:۔

"وہاں کے مالک نے بہت اخلاق سے ملاقات کی اور شراب انگوری ہم کو پلائی عجب ذائقہ کی تھی کہ کبھی دل سے نہیں بھولتی۔ ایک شخص قوم ملائی سے میرا نوکر تھا، اس نے مجھ سے کہا۔ تم مذہب مسلمانی رکھتے ہو، شراب کیوں پیتے ہو، میں نے جواب دیا کہ حضرت پیغمبرؐ نے شیرۂ انگور کو منع نہیں کیا"۔

انگریزوں کے اخلاق کی بیحد تعریف کرتے ہیں، سفر میں جن مصائب میں انگریزوں نے ان کی مدد کی ہے ان کا ذکر بڑی احسان مندی سے کرتے ہیں اور ہندوستانیوں کے اخلاق سے ان کا مقابلہ کرتے ہیں۔ یورپ و لندن کے حسن و جمال کے نہایت مدّاح ہیں۔ ہر جگہ اپنے تاثرات بیان کرتے ہیں۔ حسین عورتوں سے اپنی محبت کا حال لکھتے ہیں، اور ساتھ ہی یہ بھی کہدیتے ہیں "مگر خالی اغراض نفسانی سے تھی"۔ وہاں کی بدکاری کے چشمدید واقعات بیان کرتے ہیں۔ غرض کمبل پوش صاحب نے سفر اور سفرنامہ دونوں کا حق ادا کر دیا ہے۔

اس عجائبات فرنگ کی زبان بالکل وہی ہے جو سوا سو برس پہلے کی ہونی چاہیے قافیہ پیمائی بھی کی ہے۔ لیکن دلچسپ واقعات اور ذاتی تاثر کے سبب سے فسانہ و ناول کا سا لطف پیدا ہو گیا ہے۔ مختصر اقتباسات یہ ہیں۔ شروع میں لکھتے ہیں۔

آغاز حال مولف۔ یہ فقیر بیچ سن اٹھارہ سو اٹھائیس (۱۸۲۸) عیسوی مطابق سن بارہ سو چوالیس (۱۲۴۴) ہجری کے حیدرآباد وطن خاص اپنے کو چھوڑ کر عظیم آباد، ڈھاکہ، مچلی بندر، مہندراج گورکھپور، نیپال، اکبرآباد، شاہجہان آباد وغیرہ دیکھتا ہوا بیت السلطنت لکھنؤ میں پونچا۔ یہاں بمددگاری نصیبے اور یاوری کپتان ممتاز خاں منکس صاحب بہادر کے ملازمت نصیر الدین حیدر بادشاہ سے عزت پانے والا ہوا۔ شاہ سلیمان جاہ نے ایسی عنایت اور خاوندی میرے حالِ پُراختلال پر مبذول فرمائی، کہ ہرگز نہیں تاب بیان اور یارائے گویائی، رسالہ خاص سلیمانی میں عہدہ جماعہ داری کا دیا۔ بعد

چند روز کے صوبہ داری اسی رسالے کی دے کر ورماہہ بڑھایا۔ بندہ چین سے زندگی بسر کرتا، اور شکرانہ منعم حقیقی کا بجالاتا، ناگہاں شوق تحصیل علم انگریزی کا دامنگیر ہوا۔ بہت محنت کر کے تھوڑے دنوں میں اسے حاصل کیا۔ بعد اسکے بیشتر کتابوں تاریخ کی سیر کرتا، دیکھنے حال شہروں اور راہ ورسم ملکوں سے محظوظ ہوتا۔ ایکبارگی سن اٹھارہ سو چھتیس [۱۸۳۶] عیسوی میں دل میرا طلبگار سیاحی جہاں خصوص ملک انگلستان کا ہوا۔ شاہ سلیمان جاہ سے اظہار کر کے رخصت دو برس کی مانگی۔ شاہ گردوں بارگاہ نے بصد عنایت وانعام اجازت دی۔ عاجز تسلیمات بجالایا۔ اور راہی منزل مقصود کا ہوا۔ تھوڑے دنوں بعد دارالامارہ کلکتہ میں پونہچا۔ پانچ چھ مہینے وہاں کی سیر کرتا رہا۔ بعد ازاں جمعرات کے دن تیسویں تاریخ مارچ کے مہینے سن اٹھارہ سو سینتیس عیسوی میں جہاز پر سوار ہو کر بیت السلطنت انگلستان کو چلا۔ نام جہاز کا ازابیلہ، کپتان کا ڈیوڈ براؤن صاحب مع اپنی بی بی کے تھا۔ جہاز وزن میں چھ سو ٹن کا کنارے گنگا پر آ لگا تھا۔

پیرس کی سیر میں لکھتے ہیں :-

پندرھویں دن ایک مکان میں گیا۔ وہاں صدہا آدمی قالیچے شطرنجیاں بن رہے تھے، بناوٹ میں تصویر عمدہ کھینچتے۔ دریافت ہوا کہ وہ سب مصور تھے، تصویریں قالین اور دریوں پر ایسی معلوم ہوتیں کہ کسی مصور کامل نے تصویریں کاغذ پر کھینچی ہیں، ان کی کاریگری دیکھ کر متحیر ہوا۔ حال ان کا پوچھا، ظاہر ہوا کہ اسلئے فرش دیوان عام شاہ فرانسیس کے بنتے ہیں، اور کہیں نہیں بیچتے۔ زبان فرانسیسی میں اس کام کو ٹپسٹری کہتے ہیں۔ اسکے بعد کونسل کے مقام پر گیا۔ ایک مکان فلک بنیاد دیکھا۔ ستون سنگ مرمر کے ایکڈال راست اس میں لگے۔ صاحبان کونسل اپنے رتبے کے موافق جا بجا بیٹھے۔ ہر ایک کے نمبر لکھے۔ اس مکان کی

شکست و ریخت کے لئے مزدور لگے تھے. میں حال دیکھ کر باہر نکلا، پانی برسنے لگا،
سارے کپڑے تر ہو گئے، مگر گرتے پڑتے گھر چلے، راہ میں دو رنڈیاں[1] ایک خوبصورت
دوسری کریہ الہیئت ملیں۔ میری وضع خلاف اس شہر کے دیکھ کر ترک ترک کہتی تماشا
دیکھتی پیچھے دوڑی آئیں، اکبارپانو پھسلا، دونو لڑکھڑا کر گریں۔ میں نے قریب
جا کر زن جمیلہ کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا، بدشکل کو دیسے ہی چھوڑا، وہ بڑی محنت سے
اُٹھ کر اپنی بولی میں کچھ کہنے لگی، مگر اس زبان سے مجھ کو آگہی نہ تھی۔ آخر اس نے
ایک دھکا دیا مجکو زمین پر گرا دیا۔ دوسری عورت خوبصورت نے جس کو میں نے
اٹھایا تھا، میری طرف ہو کر اس سے مقابلہ کیا۔ میں جان بچانی غنیمت سمجھا وہاں
سے بھاگا۔ لڑکے کیچڑ بھرے ہوئے کپڑے اور بیگانہ وضع دیکھ کر تالیاں دیتے
میرے پیچھے دوڑتے آتے۔ بہزار خرابی بھاگتے بھاگتے سرا میں پونہچا، میرا حال دیکھ کر
ہمراہی ہنسنے لگے، میں سخت نادم و شرمندہ ہوا۔ پانو میں چوٹ آئی تھی اس
سبب سے دو ایک دن قیام کیا۔"

شاہ محمد قاسم داناپوری

سید شاہ محمد قاسم ابوالعلائی ابن سید تراب الحق داناپور کے ایک ذی علم صوفی خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور اپنے سلسلہ ابوالعلائیہ کے سجادہ نشین تھے۔ لیکن آپ کو اس شغل سے زیادہ ملازمت کرنے کا شوق تھا چنانچہ کچھ دنوں کچہری صدر دیوانی الہ آباد میں رہے پھر صدر دیوانی الہ آباد سے آگرہ کو منتقل ہوئی تو ۱۸۲۵ء / ۱۲۶۱ھ میں شاہ محمد قاسم بھی آگرہ آگئے۔ صدر نظامت میں "مسل خواں" تھے۔ ایک مرتبہ انگریز حاکم کے سامنے

---

[1] اس زمانے میں عورت کو رنڈی کہتے تھے۔ یہاں کسبی عورتیں مراد نہیں ہیں۔

مسل پڑھ رہے تھے، واقعات مقدمہ نے ان کے دل پر ایسا اثر کیا کہ یکایک جذب پیدا ہو گیا، زور سے "اللہ" کا نعرہ مارا، اور مسل پھینک کر نکل گئے۔ بہت دنوں تک کچہری کا رخ نہ کیا۔ لیکن انگریز حاکم ان سے بہت خوش تھا۔ پھر بلایا اور اپنے دفتر والوں سے کہا کہ آیندہ ان کو کوئی "اللہ والی" مسل نہ دی جائے۔

آگرہ کے صدر نظامت میں بیشتر حکام و وکلار مسلمان تھے مفتی انعام اللہ خاں بہادر گوپاموی وکیل صدر تھے۔ ان سے شاہ محمد قاسم کے خاص تعلقات ہو گئے مولوی غلام امام شہید بھی دفتر نظامت آگرہ میں ملازم تھے مولوی کریم اللہ خاں[۱] صدر الصدور (سب جج) تھے۔ ان سب کی نشست مفتی انعام اللہ کے مکان پر رہتی تھی اس زمانے کا یہ عجیب واقعہ یادگار ہے کہ نواب چیناپٹن (میسور) کے برادر زادہ سید شاہ احمد علی قادری عرف ضیار الدین دلاور جنگ کو جہاد کا شوق پیدا ہوا، اور میسور سے چل کر آگرہ آئے۔ بخت و اتفاق سے مفتی انعام اللہ کے مہمان ہوئے۔ یہاں آگرہ کے اکثر علمار، و روسا کا مجمع رہتا تھا۔ سب نے سید احمد علی صاحب کے عزم جہاد کی تائید کی اور امداد بہم پونہچائی۔ سید میسوری اپنے مریدوں اور رفیقوں کو لیکر شاہجہاںپور کی طرف روانہ ہوئے، پوربیوں سے جہاد کیا۔ اور راجہ پوائیں شاہجہانپور کے ہاتھ سے شہید ہوئے۔ اس واقعہ کے بعد آگرہ کے بعض وکلار و حکام و روسار پر رشوت ستانی کا مقدمہ برپا ہو گیا جس میں مفتی انعام اللہ، مولوی غلام امام شہید، شاہ محمد قاسم وغیرہ متہم گردانے گئے۔ اس مقدمہ کی سماعت کیلئے مسٹر ڈلسن جج مراد آباد خاص طور پر

---

[۱] مولوی کریم اللہ خاں ابن قاضی فقیر اللہ نیاز مند مؤلف کے بزرگوں میں تھے صدر الصدور ہونے کے بعد سے نام کے ساتھ "خاں" لکھا جاتا تھا۔ پھراؤں ضلع مراد آباد وطن تھا ۱۲۱۸ھ ۱۸۰۳ء میں پیدا ہوئے ۱۲۷۲ھ ۱۸۵۵ء میں وفات پائی۔

متعین کر کے بلائے گئے۔ مفتی انعام اللہ کے داماد خواجہ غلام غوث خان بہادر، جو اس وقت لفٹننٹ گورنر کے میر منشی تھے، لیکن وہ بھی اپنے خسر کی مدد یا سفارش نہ کر سکے۔ آخر مقدمہ کا ثبوت بہم نہ ہو سکا۔ تمام حضرات میں سے صرف شاہ محمد قاسم کو ۶ ماہ کی سزا کا حکم ہوا تھا، وہ بھی اپیل میں منسوخ ہو گیا۔ یہ ہنگامہ آگرہ میں "ڈلسن گردی" کے نام سے مشہور ہو گیا تھا۔

اس مقدمے کا سبب رشوت ستانی نہ تھا۔ مولوی غلام امام شہید وغیرہ رشوت سے بالاتر ہستیاں تھیں، چنانچہ اس کا کوئی ثبوت بہم نہ پہنچ سکا۔ اصل میں انگریزوں کو اس پر غصہ تھا کہ ان عالموں، مفتیوں، صوفیوں نے سید احمد علی شاہ میسوری کے جہاد کی حمایت کی۔ اس کا انتقام انگریزی حکومت کو لینا تھا۔ لیکن اعانت جہاد کے جرم کا کوئی ثبوت نہ تھا۔ صرف اس قدر معلوم و مشہور تھا کہ سید میسوری مفتی انعام اللہ کے مکان پر مقیم تھے۔ باقی تمام کارروائی نہایت خفیہ ہوتی تھی۔ اس واقعہ سے بیس برس پہلے (۱۸۲۸ء میں) مولوی سید احمد بریلوی اور مولوی اسمٰعیل دہلوی سکھوں سے جہاد کر چکے تھے "ترغیب جہاد" وغیرہ کتابیں لکھی جا چکی تھیں۔ مسلمانوں کے جوش کا اندازہ ایسٹ انڈیا کمپنی کو تھا۔ لیکن یہ واقعۂ جہاد اس طرح پیش آیا کہ سید احمد علی میسوری کو روکنا انگریزوں کے اختیار سے باہر تھا۔ سید مجاہد جلد شہید ہو گئے ان کا لشکر منتشر ہو گیا۔ اس لئے انگریزوں نے ان لوگوں سے انتقام لیا جو ان کے بس میں تھے۔ اور اس کام کے لئے ۱۸۴۷ء میں "ڈلسن گردی" برپا کردی۔ اسی سال تمام وکلاء و عہدہ دار جو ڈلسن گردی کے لپیٹ میں آئے، ترک وکالت و ملازمت کر کے صدر سے علیحدہ ہو گئے۔ شاہ محمد قاسم بھی آگرہ سے اپنے وطن داناپور چلے گئے۔ وہیں وفات پائی۔

شاہ محمد قاسم صاحب تصانیف ہیں۔ اسرار قاسمی اور اعجاز غوثیہ فارسی میں

لکھیں اسرار قاسمی کا اردو ترجمہ مفتی انعام اللہ نے کیا ہے۔ شاہ صاحب نے اردو میں نجات قاسم تصنیف کی ہے جس میں حضرت سیدنا امیر ابوالعلا کے حالات و کرامات کا ذکر ہے ۱۲۷۴ھ ۱۸۵۷ء میں بمقام نینی تال لکھی ہے، اور مطبع اشرف الاخبار آگرہ میں اسی سال چھاپی گئی ہے۔

نجات قاسم کا نمونہ مختلف مقامات سے یہ ہے:۔

"یہ کاتب گنہگار جب پہلے پہل شہر اکبرآباد میں حاضر ہوا ہے تو سال بارہ سو اکسٹھ ہجری تھا جس وقت روضۂ منورہ پر حاضر ہو کر بعد قدم بوسی اور فاتحہ کے آنکھیں بند کر کے پائیں مزار شریف کے بیٹھا معاً کانوں میں یہ آواز آئی کہ کوئی شخص کہتا ہے کہ حضرت کے انتقال کے پورے دو سو برس کے بعد تو زیارت سے مزار انور کے مشرف ہوا۔"

"جس روز یہ کاتب عاصی صدر دیوانی کی کچہری کے ساتھ بلدہ متبرکہ اکبرآباد میں پونہچا اس کی صبح کو مکان فرودگاہ سے بہ تمنائے زیارت روضۂ منورہ اپنے پیشوا حضرت امیر ابوالعلا قدس اللہ سرہٗ کے چلا، مگر جو کہ اس وقت تلک شہر کے محلوں اور سواد شہر سے محض نابلد تھا، اور جو آدمی ہمراہ تھے وہ بھی بالکل ناواقف تھے، گونہ تردد ہوا۔ پھر یہ خیال کیا کہ شہر سے باہر نکل کر کسو سے راستہ درگاہ شریف کا پوچھ لیں گے۔ جب چار سو دروازے سے آگے بڑھا ہنوز نوبت پوچھنے کی کسو سے نہیں پونہچی تھی کہ دو لڑکے نہ معلوم کدھر سے آکے میری پالکی کے ساتھ ہوئے اور خود بخود پوچھنے لگے کہ تم ابوالعلا کی درگاہ پر جاؤ گے (فائدہ)

۱؎ حضرت سیدنا امیر ابوالعلا، رحمۃ اللہ علیہ کا وصال ۱۰۶۱ھ ۱۶۵۱ء بزمانہ شاہجہاں ہوا ہے حضرت کی ولادت ۹۹۰ھ ۱۵۸۲ء میں بعہد شہنشاہ اکبر ہوئی۔

داخل ہو کر شہر اکبرآباد کے بازاری لوگ اور سب لڑکے ہمارے حضرت کو
ابُولالا کہتے ہیں، اور یہ لفظ ان کی زبان سے اتنا پیارا معلوم ہوتا ہے کہ
لطف اس کا تحریر میں نہیں آسکتا......"

حضرت امیر ابوالعلاؒ کے حالات میں لکھتے ہیں :-

جاننا چاہئے کہ جب حضرت خواجہ فیضی قدس سرہٗ کسو لڑائی میں شہید ہوگئے۔
تب راجہ مان سنگھ نے اس عہدۂ نظامت پر بردوان کے جناب حضرت
امیر ابوالعلا قدس سرہٗ کو مقرر کر کے منصب سہ ہزاری ذات اور سہ ہزاری
سوار کا بادشاہ کے حضور سے دلوایا۔ آپکے پاس اسباب تجمل اور شوکت کا
از قسم ہاتھی گھوڑے اور اونٹ اور رتھ وغیرہ سامان اُمرائی بہت تھا۔
چنانچہ نقل ہے کہ بعد ترک دنیا اور جلوہ افروزی مسند فقر و درویشی کے بھی
یہ حال تھا کہ جب کبھی آپ شکار کو تشریف لیجاتے تو بیالیس نفر صرف
بازوار ہم رکاب فیض انتساب کے ہوتے تھے، اور سامان کو اسی پر قیاس
کرنا چاہئے۔ الغرض راجہ مان سنگھ باوصف ایسے احتشام ظاہری کے کہ
تمام قلمرو بنگالہ کا مالک اور حاکم تھا، حضرت کی اس قدر تعظیم اور تکریم کرتا
تھا کہ اپنی مجلس میں جمیع امرا بلکہ اپنے فرزندوں سے بھی بالاتر جگہ آپ کو
دیتا تھا۔

مفتی اکرام اللہ صدیقی

مفتی انعام اللہ خاں صدیقی گوپاموی کے فرزند رشید تھے ۱۲۵۱ھ/۱۸۳۵ء میں پیدا
ہوئے۔ اپنے والد اور علمائے عصر سے اکتساب علم کیا۔ ڈاکٹر مکند لال اکبرآبادی
سے ڈاکٹری پڑھی۔ پھر مختاری کا امتحان پاس کر کے الہ آباد میں مختار رہے

تصنیف وتالیف کا بہت شوق تھا۔ متعدد کتابیں فارسی وار دو میں لکھیں۔ مثلاً علمائے اودھ، اخبار واصلین، تذکرۂ مصنفین، قواعد اردو وفارسی جدید مفید الطلاب ــــ

ان میں تصویر شعرا خاص چیز ہے۔ اس زمانے میں آگرہ شعرائے شہر و بیرون شہر کا اچھا خاصا مرکز بن گیا تھا۔ اکثر شعر وشاعری کے چرچے رہتے تھے۔ مولوی غلام شہید رحمتہ اللہ علیہ کی ذات بابرکات نے اس میں عجیب روح پھونک دی تھی۔ چنانچہ ۱۲۷۷ھ/۱۸۶۱ء میں بابو بینی پرشاد وکیل صدر کے مکان پر ایک مشاعرہ منعقد ہوا۔ اس مشاعرے کے سخنوروں کے کلام وحالات مفتی اکرام اللہ نے مرتب کئے، اور اس گلدستہ کا تاریخی نام "تصویر شعرا" (۱۲۷۷ھ) رکھا۔ ۱۸۶۱ء میں مرزا علی حسین قیصر کے مطبع حیدری میں طبع ہوا۔ اس کی تمہید مختصر کر کے درج کی جاتی ہے :۔

بشنو از انصاف اگر مُقبلی	شعر بُود حجت روشن دلی
در شرف شعر رسولؐ خدا	گفت بسے قول بمدح و ثنا
شعر کہ اصحاب نبیؐ گفتہ اند	چوں دُر و یاقوت گہر سفتہ اند
شعر علیؑ گفت و حسینؑ و حسنؑ	کعبؓ و انسؓ گفت و اویسؓ قرن
شعر کہ حسانؓ عرب گفتہ است	سید کونین پذیر فتہ است
منع ز اشعار نکرد ش نبیؐ	تائب ازاں کار نکرد ش نبیؐ
بلکہ براد کرد ہزار آفریں	سید کونین رسولؐ امین

سخنوران معنی آفریں پر واضح اور آشکار ہے کہ سخن کی قدر افزائی کیلئے طبع سلیم اور ذہن فہیم درکار ہے۔ سخنور کو ہمیشہ سخنداں کی جستجو ہے، کس واسطے کہ گوہر کی جوہر شناسی سے قدر اور آبرو ہے۔

زسد ہیچ کمالے بہ سخن سنجیدن — کہ سخن را صلۂ نیست بجز فہمیدن

جو لوگ اس قاعدے کو نہیں مانتے ہیں، وہ آپ اپنی قدر نہیں جانتے ہیں۔ بیشک
سخن کی تمیز کے لئے مخاطب معنی فہم درکار ہے۔ اپنی ستائش اپنی زبان سے کب
سزاوار ہے۔ شاعر جب تک سخن فہم سے داد نہ پائے گا، اپنے مونہہ میاں مٹھو
کہنے سے سخن گو نہ ہو جائے گا۔ بیت

طوطی ز معنی سخن خویش غافل است — ہر کس سخنور است سخنداں نمی شود

اس نظر سے شعرائے فخر البلاد اکبرآباد کو اہل جوہر جوہر شناس کی جستجو اور سخنور سخن
فہم کی آرزو رہتی ہے۔ الحمد للہ کہ دعائے باطنی نے دعائے دلی کی صورت دکھائی
اور بعد عرصہ دراز کے مرادان کی باحسن وجوہ بر آئی کہ جن دنوں بحسن اتفاق جناب[1]
برگزیدۂ آفاق جوہر آئینۂ کمال، صورت گر حسن و جمال، معنی آفریں نازک خیال
نکتہ سنج عدیم المثال، استاد یکتا، امام الشعرا فاضل وحید حضرت مولانا غلام امام
شہید مدظلہم اور سخنور شیریں مقال، معنی سنج نازک خیال برادر گرامی قدر منشی
غلام غوث صاحب بیخبر میر منشی نواب مستطاب لفٹنٹ گورنر بہادر اس شہر میں
رونق افروز ہوئے۔ ہر طرف مقدم سعید سے عید ہو گئی، خاص و عام فیض یاب
اور مسرت اندوز ہوئے معنی پروران سخنور نے موقع وقت غنیمت سمجھ کر اس بات کا
ارادہ کیا کہ کلام ہمدگر سے چاشنی گر مذاق ہوں، اور جوہر طبع آزمائی دکھائیں۔ یہ بات
سنتے ہی انجمن آرائے سخن و معانی، رموز شناس اسرار سخندانی مرد فرار ارباب ہنر
جوہر شناس صاحب جوہر، نوباوۂ گلشن مراد بابو بینی پرشاد صاحب عالی قدر وکیل
عدالت صدر زاد حشمتہ نے اپنے دولت خانہ فیض کاشانہ کو فروش منقش اور
مصفا اور کنول جھاڑ مردنگیاں دیوار گیریاں فانوس اور مرآت حیرت افزا سے

---

[1] چار پانچ سطریں مدحیہ الفاظ کی تھیں۔ وہ چھوڑ دی ہیں۔

جسے دیکھ کر آفتاب و مہتاب پھر ڈک جاوے اور پردہائے رنگارنگ گل ہائے بوقلموں عطریات گوناگوں سے جس کی خوشبو سے چمن زار بہشت مہک جاوے پیراستہ کر کے صلائے عام دی اور ارباب ذوق و شوق کو خبر کی کہ نکتہ وران صحیح نفس اور سخن سنجان دقیقہ رس تشریف لاویں، ہم کو مرہون منت فرمادیں۔ پس تمام شہر میں اس مشاعرہ کی شہرت ہوئی عجب طرح کی رنگین صحبت ہوئی ..... یہ مجموعہ اس مجمع کا جامع کلام ہے "تصویر شعرا" اس کا تاریخی نام ہے۔

کلام شعرا کا بھی نمونہ دکھایا جاتا ہے۔ طرحی و غیر طرحی غزلوں کے علاوہ چار پانچ شاعروں نے بانی مشاعرہ بابو بینی پرشاد صاحب کی مدح میں رُباعیاں بھی پڑھی تھیں ان میں سے مرزا عباس ملیح اکبر آبادی کی رُباعی درج کی جاتی ہے:۔

بابو کا ہے دل حُبِّ علی سے آباد ہے دوستی علی سے ہر دم دل شاد
اس "دوستیِ علیؑ" کے گن لو اعداد ہے ہم عدد اس سے "بابو بینی پرشاد"
۵۹۰

طرحی غزلوں کا مختصر انتخاب یہ ہے:۔

اسیر۔ میر گلزار علی خلف و جانشین میاں نظیر اکبر آبادی

سا گیا ہوش میں آ ظرف کو دیکھ آنکھیں کھل ان تنک ظرفوں کو آتا نہیں بھر دیتے ہیں
آنکھ اپنی سر محفل نہیں ملنے پاتی دیکھتے ہیں وہ کدھر جام کدھر دیتے ہیں

باطن۔ حکیم سید قطب الدین اکبر آبادی:۔

راز داران حقیقت کے لبوں پر ہے مہر خود خبر دار ہیں وہ، کس کو خبر دیتے ہیں

بہادر۔ بابو رتن بہادر سنگھ

اے مسیحا ترے بیمار شب ہجراں کو جام خورشید میں تبرید بھر دیتے ہیں
دل بھرا آتا ہے اب خبر نہیں عالم کی آج طوفاں کی خبر دیدۂ تر دیتے ہیں

راجہ۔ مہاراجہ بلوان سنگھ بہادر راجہ کاشی:۔

یار کے حسن پر آشوب کی ہے دل میں جگہ | یہ وہ دریا ہے جسے کوزے میں بھر دیتے ہیں
راجہ یہ شوقِ اسیری ہے کہ مرغانِ قفس | اپنے منقار سے پر اپنے کتر دیتے ہیں

صغیر۔ لالہ گنگا سہائے :۔

اُڑ گئے ہجر کی شب۔ وصل کے دشمن میرے | آج آواز نہیں مرغ سحر دیتے ہیں

مہر۔ میرزا حاتم علی بیگ مہر شاگرد ناسخ :۔

یہ نئی طرز مسیحائی ہے، سبحان اللہ | جان آجاتی ہے، وہ دم بھی اگر دیتے ہیں
ہم تو اللہ کو بھی یوں نہیں کرتے سجدہ | اے صنم سر کو ترے پاؤں پہ دھر دیتے ہیں

حکیم قطب الدین باطن

حکیم میر محمدی طاہر کے فرزند، محلہ تاج گنج آگرہ میں رہتے تھے۔ غالباً ۱۲۲۶ھ (مطابق ۱۸۱۱ء) میں پیدا ہوئے، اس لئے کہ تذکرہ "شعر و سخن" مرتبہ نیاز علی پریشاں میں (جو ۱۲۸۶ھ میں لکھا گیا ہے، اور جس کا ذکر اس کے بعد آتا ہے) حکیم باطن صاحب نے اپنی عمر ۶۰ سال بتائی ہے۔ حکیم صاحب کے اسلاف طبیب شاہی رہے ہیں۔ انھوں نے عربی فارسی میاں نظیر اکبر آبادی سے حاصل کی۔ شاعری میں بھی انھیں کے شاگرد تھے۔ حکیم صاحب کے دادا حکیم سید داجد علی اکبر آبادی حضرت مولانا فخر الدین قدس سرہٗ کے خلیفۂ خاص تھے۔ اور حکیم صاحب خود حضرت سید غلام نصیر الدین دہلوی عرف "میاں کالے"[1] کے مرید تھے۔ اپنے پیشۂ آبائی طبابت کے سلسلے میں صاحبزادہ محمد لٰسین خلف ٹیپو سلطان شہیدؒ کی سرکار سے وظیفہ پاتے تھے۔

باطن صاحب نے چار دیوان، ایک مثنوی اور مختلف منظومات یادگار چھوڑی ہیں

---

[1] حکیم مومن خاں دہلوی نے میاں صاحب کے نام کا کیا خوب سجع کہا ہے: "ہر دم نام میاں کالے"

اور ایک عجیب و غریب پُر گوئی کا ثبوت یہ دیا ہے کہ تمام مثنوی میر حسن کا خمسہ کر دیا ہے۔ اور اس کا نام "اعجاز رقم"[1] رکھا ہے۔ یہ سب نظم کی تصانیف ہیں۔ ایک نثر کی تصنیف تذکرہ گلستان بےخزاں ہے، جو نواب مصطفٰے خاں شیفتہ کے گلشن بے خار کے جواب میں لکھی ہے۔ چنانچہ حکیم باطن اپنے تذکرہ کی تاریخ میں لکھتے ہیں۔

خامہ نے جب دیا جواب سوال	رو برو رکھ کے "گلشن بے خار"
منصفان زمانہ کہنے لگے	ہے "گلستان بےخزاں" میں بہار
بلبل فکر پھر تو اے باطن	چہچہایا یہ کھول کر منقار
نام تاریخی اس شگوفے کا	"نغمۂ عندلیب" کہہ اے یار
	۱۲۶۱ھ

---

[1] مثنوی اعجاز رقم پہلی بار ۱۲۹۵ھ میں انعام اللہ خاں کے اہتمام سے مطبع ریاض ہند آگرہ میں چھپی ہے۔ بڑی تقطیع کے ۱۵۲ صفحے ہیں۔ مثنوی میر حسن میں تقریباً دو ہزار شعر ہوں گے۔ حکیم باطن نے ہر شعر کا خمسہ کیا ہے۔ مسلسل داستان کو اس طرح تضمین کرنا کہ تضمین بھی اصل مثنوی کی طرح مسلسل و مربوط داستان بن جائے، نہایت مشکل کام ہے۔ باطن کی تضمین میں بھی ہر جگہ تسلسل نہیں رہا، صرف ایک شعر کی تضمین ہو گئی ہے۔ اوپر نیچے سے سلسلہ نہیں ملا لیکن جہاں تسلسل قائم رہا ہے اور تضمین اچھی ہو گئی ہے وہاں حکیم باطن کا کمال نظر آتا ہے۔ مثنوی کے سب سے پہلے شعر کی تضمین یہ ہے:-

پے فکر بیٹھا ہوں میں صبحدم   مہیا ہے سامان سب بیش و کم   لکھوں پہلے نعت رسول امم

کروں پہلے توحید یزداں رقم   جھکا جس کے سجدے کو اول قلم

حمد کے ایک شعر کے قافیے مشکل تھے۔ تضمین خوب نکالی ہے:-

تو اخلاص سے پڑھ کے گلشن میں قُل   مچا اس کی وحدت کا ہر سمت غل   دوئی کا کہیں تو نہ کھا جائے جُل

چمن میں ہے وحدت کے یکتا وہ گل   کہ مشتاق ہیں جس کے یاں جزو و کل

(باقی صفحہ ۳۸۱ پر دیکھئے)

نواب شیفتہ کے ساتھ حکیم باطن کی مخالفت کا سبب یہ تھا کہ شیفتہ نے اپنے تذکرہ "گلشن بے خار" میں میاں نظیر اکبر آبادی کے متعلق یہ رائے لکھی ہے ۔
"اشعار بسیار دارد کہ بر زبان سوقیین جاری ست و نظر بر آں ابیات در اعداد شعراء نشاید ش شمرد"۔ یعنی میاں نظیر کے اشعار بازاری لوگوں کی زبان پر جاری ہیں۔ ان اشعار کی بنا پر نظیر شاعروں میں شمار ہونے کے لائق نہیں۔ میاں نظیر حکیم باطن کے استاد تھے۔ اس لئے حکیم صاحب کو شیفتہ کی رائے نہایت ناگوار ہوئی۔ شیفتہ کے تذکرے کے مقابلے میں اپنا تذکرہ لکھ ڈالا اور اس میں جہاں موقع پایا شیفتہ کو شیفتہ کے استاد مومن کو، شیفتہ کے احباب آزردہ وغیرہ کو خوب برا بھلا کہا۔ شیفتہ نے آزردہ کی بڑی تعریف کی ہے۔ اسلئے باطن نے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۸۰)

یہ تضمین بھی بہت خوب ہے:-

شہان جہاں سرفرو ہیں یہیں کسے تاب ہاں کر سکے یا نہیں وہ عالم میں ہے احکم الحاکمین
وہ ہے مالک الملک دنیا و دین ہے قبضے میں اسکے زمان و زمین

نعت شریف میں میر حسن نے حضور سرور کائنات کا سایہ نہ ہونے کے متعلق بے نظیر اشعار لکھے ہیں اور ان میں اکثر مسلسل ہیں۔ حکیم باطن نے بعض اشعار کی تضمین خوب کی ہے:-

ہوئے یوں تو پیدا بہت مرسلین لے آدم سے تا عیسی پاک دیں یقین جان لو اسکو اے مومنین
محمدؐ کی مانند جگ میں نہیں ہوا ہے نہ ایسا نہ ہوگا کہیں

جو نور مجسم کوئی شے ہو اب تو خورشید ساں سایہ افگن ہو کب ہے تا دل طبعی سنو اسکو اب
نہونے کا سایہ کے تھا یہ سبب ہوا صرف پوشش میں کعبے کی سب

نظر روح کا کس کو آتا ہے تن وہ تھا امر رب تن کامت لا تخن سمجھنے کی ہے بات اے جان من
وہ قد اسلئے تھا نہ سایہ فگن کہ تھا کل وہ اک معجزے کا بدن

(باقی حاشیہ صفحہ ۴۸۲ پر)

آزردہ کی ہجو ملیح و صریح دونوں لکھیں۔ ان کے اشعار میں اصلاحیں دیں انکے بعض الفاظ کو غلط بتایا اور اس پر بڑا طومار لکھ ڈالا۔ آزردہ نے ایک جگہ لفظ حرکت کو بسکون را نظم کیا ہے:۔

اس شوخ سے مربوط بہت سہل سے ہوتے
گر ہم بھی سبک حرکت نا اہل سے ہوتے

اس کے متعلق حکیم باطن مولوی صدر الدین آزردہ کو خطاب کر کے لکھتے ہیں:۔

مولوی صاحب! مضارع امر کن میں مصدر ایسے افعال کا ہونا، شعرائے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۸۱)

تجلی میں ظلمت کا ہے کام کیا　اجالا ہے خود قدرتی نور کا　قدم کے تلے پس کے کیا رہ گیا
خوش آیا نہ سایہ کو ہونا جدا　اسی نور حق کے رہا زیر پا

داستان کی تضمین کا یہ نمونہ ہے، بادشاہ کا اور اس کی بے اولادی کا تذکرہ ہے:۔

چھلکتا مے عیش کا واں ایاغ　شب و روز خورشید و مہ تھے چراغ　سدا راحت و خرمی سے فراغ
ہمیشہ خوشی رات دن سیر باغ　نہ دیکھا کسی دل پہ جز لالہ داغ

حصول ہر طرح کی تھی فرحت اسے　میسر ہر اک مال و نعمت اسے　کہاں عیش و عشرت کی فرصت اسے
سدا ماہ رویوں کی صحبت اسے　سدا جامہ زیبوں سے رغبت اسے

ندیمان ذی ہوش کا اژدہام　وزیران دانا کا تھا اہتمام　کنیزان خوش رو سے ہر لحظہ کام
ہزاروں پری پیکر اسکے غلام　کمر بستہ خدمت میں حاضر مدام

خدا کی عبادت بغل میں صنم　خزف ریزہ تھا اسکے کف میں درم　میسر خوشی عیش و عشرت بہم
کسی طرح کا وہ نہ رکھتا تھا غم　مگر ہاں اک اولاد کا تھا الم

اسی غم سے اسکو نہ ہوتا فراغ　اسی رنج میں رہتا تھا بد دماغ　اسی فکر سے پھر رہا تھا ایاغ
اسی بات کا اسکے دل پر تھا داغ　نہ رکھتا تھا وہ اپنے گھر کا چراغ

ماضی وحال کو مجہول جانتا، استقبال اپنے اسم کا معروف کرنا، اپنے کلمے کو سب کے فعل سے اپنے ضمیر میں مستقبل سمجھنا، اور فعل جدید کا فاعل ہونا..... مضموم کو مکسور، مکسور کو مفتوح کہکر پیش آنا اور پھر اپنے تئیں دائرۂ عقل سے خارج نہ گننا، اور ساکن کو متحرک، متحرک کو ساکن بولنا اور عالم متبحر کہلانا اور اس لن ترانی سے ساکن نہ ہونا، زبردستی سے کلام کو زیر و زبر کرنا سبحان اللہ ......! زبانی ذی علموں کی گوش گذار ہے کہ لفظ صحیح حرکت برقرار ہے متحرک نہ ساکن ہر شہر و دہر واماکن۔ اور مولوی صاحب باوصف علم و فضل کیا غلط لفظ فرماتے ہیں۔ بایں فضیلت و مکرمت کیا کلمۂ لغو زبان پر لاتے ہیں ؎

گرہم کبھی سبک حرکت نا اہل سے ہوتے۔ تو تصریح ساکن اسی مصرعہ میں ناموزوں بندھا.....!

اس عبارت کے آغاز میں حکیم صاحب نے گرامر کی اصطلاحوں کو بطور ایہام کے استعمال کیا ہے۔ یہی اسلوب تمام تذکرے کا ہے۔

حکیم صاحب نے گلستان بے خزاں میں بے مزہ عبارت آرائی اور قافیہ پیمائی کی ہے۔ اس لئے طویل نمونہ درج کرنا بے لطف ہوگا۔

حمد باری تعالیٰ عزّ اسمہٗ صنعت براعۃ الاستہلال یا تلازمۂ شعر و شاعری کے ساتھ لکھتے ہیں :۔

"مطلع انوار انواع صفات حسن مطلع تجلیات غزل کائنات، حمد اس شاعر یکتا کی ہے جس نے بے مدد استاد، بوقلموں مضامین، بیت الغزل عالم میں حسن حسن مقطع از مطلع تا مقطع ساتھ ایک فکر کے بیاض عدم سے لا کر قلم قدرت سے صفحۂ دیوانِ وجود پر لکھیں۔"

تذکرہ میں حکیم مومن خاں دہلوی کا حال اس طرح شروع کرتے ہیں :۔

"مومن تخلص، مومن خاں نام، ساکن شاہجہاں آباد، شاگردان سخن کے استاد
اگر نو باف سحر بیاض فکر دیکھے تو صحن خانہ سے کوچ کر جائے کشش الفاظ سے
اسکے ہوش میں خرابی پائی جائے۔ رشتۂ جاں تار تار ہو، رشک مضمون سے ہر
شاعر ہاتھ مل مل کے بیقرار ہو۔ کلام میٹھا ایسا گاڑھا کہ جس کی حیرت سے شیریں
زباں شل کوہ کن کے شور مچائیں۔ نشہ شراب الفاظ سے مخموران خمخانۂ سخن دستار
کو ہوا میں اڑائیں۔"

تذکرے کے اعتبار سے یعنی انتخاب کلام اور حالات و تنقید میں حکیم باطن کا تذکرہ بالکل
ہیچ و پوچ ہے تاہم اگلے زمانے کی یادگار ہے اور بہر حال اس میں بعض ایسے شاعروں
کا تذکرہ ہے جو گلشن بے خار میں نہیں ہے۔

نیاز علی پریشاں

خلف شیخ رجب علی۔ شیخ صدیقی تھے۔ انکے اسلاف قدیم دہلی کے تھے۔ جو سعادت خاں برہان الملک کے ساتھ دہلی سے
اودھ گئے اور سندیلہ کو مسکن بنایا لیکن پریشاں کے قریبی بزرگ آگرہ آگئے ان کی
ولادت و تربیت آگرہ ہی کی ہے۔ پریشاں مرزا حاتم علی بیگ مہر کے شاگرد تھے۔
مثنوی، واسوخت، غزل، قصیدہ سب کچھ کہا ہے۔ لیکن ان کی بہترین یادگار تذکرہ
شعر و سخن ہے۔ اس کی ترتیب ان کو بالیقین حکیم قطب الدین باطن کے تذکرہ کو دیکھ
سن کر سوجھی ہوگی لیکن اس پر بہت اضافہ کیا، اور ترتیب کے لئے بڑا اہتمام کیا
یعنی ۱۶؍ اکتوبر ۱۸۶۹ء (مطابق ۱۰؍ رجب ۱۲۸۶ھ) کو آگرہ میں ایک عظیم الشان مشاعرہ
منعقد کرنے کا ارادہ کیا، اور کئی مہینے پہلے اس کا اعلان تقسیم کیا اور اخباروں میں
چھپوایا، یہاں تک کہ ہندوستان سے باہر بھی اس کی خبر پہونچ گئی۔ چنانچہ فرانسیسی
مستشرق پروفیسر گارساں دتاسی نے اپنے خطبہ ۱۸۶۹ء میں اس مشاعرے کا

ذکر کیا ہے۔ لکھتا ہے:۔

"ایک بڑا مشاعرہ آگرہ میں ۱۶ اکتوبر ۱۸۶۹ء کو ہونے والا تھا۔ اودھ اخبار مورخہ ۲۸ ستمبر ۱۸۶۹ء میں ان شعرا کے لئے ہدایات کا اعلان شائع ہوا ہے جو اس مشاعرے میں شرکت کرنا چاہتے ہیں۔"

(از خطبات گارساں دتاسی ص۴۵۶ مطبوعہ انجمن ترقی اردو)

پریشان نے مشاعرے کے اشتہار میں ایک نقشہ درج کیا تھا، اور شرکائے مشاعرہ سے اسکی خانہ پری کی درخواست کی تھی، خانے یہ تھے۔ نام شاعر، تخلص، ولدیت، نام استاد، مدت شاعری، استاد زندہ ہیں یا نہیں، سکونت قدیم وجدید، حالات۔ اشتہار میں مشاعرے کی غرض پریشان نے یہ لکھی ہے:۔

"غرض اس جلسہ دلچسپ سے یہ ہے کہ اکثر بڑے بڑے شہروں یا قصبوں کے شاعروں کا حال مفصل ایک خاص تذکرے میں واسطے یادگاری کے لکھا جاوے تاکہ طرح واحد کے ذریعہ سے ان کی فکر کا نتیجہ ظاہر ہو۔"

یہ مشاعرہ مہاراجہ بلوان سنگھ راجہ کاشی کے مکان واقع کشمیری بازار آگرہ میں منعقد ہوا۔ اس کا حال پریشان لکھتے ہیں:۔

"اسی شاعروں نے اپنی اپنی غزلیں بعد ایک دوسرے کے بہت صفائی کے ساتھ پڑھیں۔ مرزا حاتم علی بیگ صاحب مہر جب پڑھ چکے تو خلیفہ سید گلزار علی صاحب اسیر نے پڑھ کر لوگوں کو محظوظ کیا۔ اس کے بعد جناب راجہ صاحب بہادر نے کلام دلآویز سنایا۔ آفتاب طلوع ہو گیا تھا۔ مشاعرہ برخاست ہوا۔"

دیباچہ میں لکھتے ہیں:۔

"اب سنئے کہ ایک روز جی نے چاہا کہ کوئی ایسا کام کیجے جس سے نام باقی رہے مگر یہ فقیر بادشاہ نہ تھا کہ رعایا پر رحم کرتا۔ غنی نہ تھا کہ محتاجوں کو مال وزر دیتا۔

زور آور نہ تھا کہ رستم کی طرح گرز اٹھاتا۔ سپاہی نہ تھا کہ تیر و شمشیر کے وار دکھاتا
صاحب کرامت نہ تھا کہ کشف سے کرشمے ظاہر کرتا۔ عالم نہ تھا کہ جھگڑے چکاتا،
سخی نہ تھا کہ ایثار کرتا۔ حکیم نہ تھا کہ معالج ہوتا۔ شاعر تھا۔ جھوٹ سچ بکتا تھا
پھر کونسی صورت نام باقی رہنے کی تھی۔ غزل، رباعی، مثنوی، واسوخت، مخمس،
مسدس وغیرہ کہنے والے کہہ گئے۔ کسی نے کوئی بات اٹھا نہ رکھی۔ مضمون آرائی
نظم و نثر کی صفائی مجھ سے کب بن پڑتی ہے بالفرض دو چار شعر مرمٹ کر کہے تو
کیا کہے۔ اس پر فخر کرنا نرالا چھچھورا پن ہے۔ دنیا میں دھبا لگتا ہے۔ سب سے قطع نظر
کر کے یوں ٹھہرائی کہ ایک تذکرہ نئی طرز کا تالیف ہو تو کیا خوب ہو۔ پھر یہ بھی خیال
ہوا کہ تذکرے تو بہت سے ہیں، محمد نیاز علی تم کیا تدبیر کرو گے بھئی ایسا کرو کہ
تذکرہ بطور مشاعرے کے مرتب ہو جس میں زمانہ حال کے سخنوروں کا کلام خواہ
فارسی خواہ اردو۔ ایک ہی طرح پر لکھا جاوے۔ نیز نشہ نیا پہلو یہ نکالا کہ طرح
زیر طبیعت کی آزمانے کی کسوٹی ہوتی ہے۔ کھرا کھرا پرکھا جاتا ہے۔ قافیہ اور
ردیف کی نشست۔ بندش اور ترکیب کی خوبی۔ الفاظ اور معانی کی درستی۔
مضمون اور محاورہ چستی معلوم ہو جاتی ہے۔ خیر ان باتوں کو سوچ سمجھ کر استاد
نامدار جناب مرزا اسد حسب گردون وقار سے کہا۔ انھوں نے فرمایا۔ ہاں بات تو ٹھیک
ہے۔ نثر در تہہ یہ کرو۔ لاؤ طرح کہدیں، شاعر پسند کریں۔ چنانچہ مصرع طرح
اردو کا فرمایا۔ ع

تری دیوار کے سایہ تلے آ کر ہما ٹھہرے

دوسرا مصرع فارسی کا بڑے مہربان مولوی محمد خان صاحب تخلص ہوتی
نے تجویز کیا اور یہ ہے:-

در سرم از نکہت زلف است سودائے دگر

فارسی کا مصرع کیا شگفتہ ہے، اور اردو کا بہت پہلودار، قافیہ وسیع، بحر رواں تمام حسن رکھتا ہے۔ ایک اشتہار میں دونوں مصرع معہ ایک نقشہ مجوّزہ موٴلف کے لکھ کر جابجا بھیجے گئے۔

پریشان کو تذکرہ کا تاریخی نام شعر دسخن (۱۲۸۰ھ) خوب ہاتھ آیا ہے۔ اس تذکرہ میں شعرائے آگرہ کی فارسی و اردو غزلیں ایک سو ایک ہیں۔ باہر کے شاعروں میں الہ آباد کی ۱۴ غزلیں درج ہیں۔ جن میں اعظم علی اعظم شاگرد خواجہ آتش لکھنوی اور منیر شکوہ آبادی ممتاز ہیں۔

شعرائے آگرہ میں بعض سن رسیدہ و کہنہ مشق ہیں۔ لیکن اکثر نوجوان و کمسن ہیں بعض شاعروں نے غالب کو اپنا استاد بنایا ہے: مثلاً مدد علی تپش، شیخ عبدالمجید رسوا رسوا نے اپنے حال میں لکھا ہے کہ "ایک مدت جناب میرزا اسداللہ خاں صاحب غالب کی خدمت میں رہ کر نظم و نثر فارسی کی مہارت کی"۔ یہ مشاعرہ غالب کے انتقال سے آٹھ مہینے بعد ہوا ہے۔

مولانا عبدالحق خیرآبادی

مولانا عبدالحق کے دادا مولوی فضل امام خیرآبادی تھے جن کی تصنیف سُلّم منطق میں آج تک شامل درسیات ہے۔ بہت سی کتابیں تصنیف کی ہیں۔ ریاست پٹیالہ میں ملازمت کی۔ پھر دہلی میں صدر الصدور رہے۔ ۱۲۵۹ھ/۱۸۴۳ء میں وفات پائی۔ ان کے فرزند مولانا فضل حق خیرآبادی تھے۔ جو ۱۲۱۲ھ/۱۷۹۷ء میں پیدا ہوئے۔ مرزا غالب کے بالکل ہم عمر تھے اور بڑے مخلص اور بے تکلف دوست۔ علوم معقول اپنے والد سے حاصل کیے۔ اور علم حدیث حضرت شاہ عبدالقادر دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سے۔ دہلی میں سررشتہ دار رہے۔ پھر جھجر، الور، ٹونک کی ریاستوں میں ممتاز عہدوں پر رہے۔ لکھنؤ میں (؟)

صدر الصدور رہے۔ ریاست رامپور میں نواب یوسف علی خاں نے بلایا اور تلمذ اختیار کیا نواب کلب علی خاں نے بھی کچھ پڑھا۔ بڑے عالم متبحر تھے اور عربی کے اعلیٰ پایہ کے شاعر ہندوستان میں ان کا جواب نہ تھا، بلکہ عرب کے شعرائے معاصرین سے بھی تحسین حاصل کی۔ کثیر التصانیف تھے، عربی میں درجنوں کتابیں اور حاشیے لکھے ہیں۔

مولوی فضل حق کے قیام لکھنؤ کے زمانے کا ایک لطیفہ[1] بہت دلچسپ ہے جو حضرت قبلۂ عالم مولانا الحاج پیر سید جماعت شاہ صاحب امیر الملت محدث علی پوری رحمۃ اللہ علیہ نے بیان فرمایا کہ جس زمانے میں مولوی فضل حق صاحب لکھنؤ میں مقیم تھے منشی نولکشور نے انکی خدمت میں درخواست کی کہ اوقات فرصت میں مطبع کی عربی کتابوں کی صحت کتابت فرمایا کریں۔ مولانا فضل حق نے قبول کرلیا، ایک مرتبہ مجتہد العصر لکھنؤ کی ایک مناظرہ کی کتاب مطبع نولکشور میں طبع ہونے کے لئے آئی اسکی کاپیاں تصحیح کے لئے مولانا فضل حق کے پاس آئیں۔ آپ کتاب کی تصحیح بھی کرتے جاتے تھے اور مجتہد صاحب کے اعتراضات کا جواب بھی حاشیہ پر لکھتے جاتے تھے۔ جب کتاب چھپ کر مجتہد العصر کے پاس پونہچی تو انھوں نے سر پیٹ لیا کہ تمام عمر کی کمائی برباد گئی۔ اور منشی نولکشور سے دریافت کیا، انھوں نے اصل واقعہ بیان کردیا آخر مجتہد صاحب نے کتابوں کے انبار میں آگ لگوادی۔

سر سید احمد خاں نے "آثار الصنادید" میں اور منشی امیر احمد مینائی نے "انتخاب یادگار" میں مولانا فضل حق کے عربی قصائد کا انتخاب درج کیا ہے ۱۸۵۹ء میں جب غدر کے بعد انگریزوں کا تسلط ہوگیا تو اور لوگوں کے ساتھ مولانا فضل حق پر بھی جرم بغاوت عائد کیا گیا۔ اور حبس دوام بعبور دریائے شور کا حکم صادر ہوا لیکن

---

[1] ماخوذ از فضلائے ہند مرتبہ مفتی انتظام اللہ صاحب

مولانا کے فرزند ثانی اور منشی غلام غوث بےخبر نے مقدمہ کی پیروی جاری رکھی، اور اور آخر رہائی کا حکم حاصل کر لیا، لیکن "تا تریاق از عراق" والا مضمون صادق آیا۔ جس وقت پروانۂ آزادی رنگون پونہچا۔ اسی وقت مولانا کا جنازہ نکل رہا تھا ۱۸۶۱ء/۱۲۷۸ھ میں وفات پائی، اور رنگون میں سپرد خاک ہوئے۔

مولانا عبدالحق ان کے فرزند اکبر تھے۔ ۱۸۲۸ء/۱۲۴۴ھ میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ والد سے تحصیل علوم کی۔ ۱۶ سال کی عمر میں سند فضیلت حاصل کر کے درس و تدریس مشغول ہو گئے کچھ دنوں ٹونک میں رہے۔ پھر نواب کلب علی نے رامپور بلا لیا۔ اور اپنے پوتے نواب حامد علی خاں کا اتالیق مقرر کیا۔ ۱۸۶۵ء/۱۲۸۱ھ سے ۱۸۸۶ء/۱۳۰۴ھ تک یعنی نواب کلب علی خاں کی تمام مدت حکومت رامپور رہے۔ نواب صاحب کے انتقال کے بعد کلکتہ گئے وہاں حاکم مرافعہ اور مدرسہ عالیہ کے افسر رہے۔ شمس العلماء کا خطاب پایا۔ وہاں سے ۱۸۹۶ء/۱۳۱۴ھ میں نواب حامد علی خاں نے رامپور بلا لیا اور خود تلمذ اختیار کیا۔ یہاں سے بیمار ہو کر وطن خیرآباد گئے اور ۱۸۹۹ء میں انتقال کیا۔

مولانا عبدالحق خیرآبادی اپنے زمانے میں امام فلسفہ تھے۔ آپ کے شاگردوں میں سے متعدد نامور علماء نکلے۔ مولانا نے ۲۰ کے قریب کتابیں تصنیف کیں۔ ان میں سے ایک کتاب زبدۃ الحکمۃ اردو میں لکھی۔ یہ منطق کی قدیم کتابوں میں ہے، اور ایک کامل فن کے قلم سے نکلی ہے۔ اس سے پہلے منطق کی ایک اور کتاب کا پتا چلتا ہے، یعنی "ترجمۂ شمسیہ" مرتبہ سید محمد مطبوعہ دہلی ۱۸۴۴ء لیکن وہ ترجمہ ہے اور اب ناپید۔ مولوی عبدالحق کی کتاب کے تقریباً ساتھ ہی ساتھ مولوی نذیر احمد دہلوی نے بھی ایک کتاب "مبادی الحکمۃ" کے نام سے لکھی ہے۔ اسی زمانے میں اور لوگوں نے بھی منطق کے رسالے لکھے ہیں۔ ان کا نمونہ اس کے بعد دیا جاتا ہے۔

زبدۃ الحکمۃ میں مولوی عبدالحق صاحب نے علمائے سابق کا اختلاف اور

ان پر اپنا محاکمہ بھی لکھا ہے مختصر نمونہ یہ ہے۔

"جاننا چاہیے کہ علم دو قسم کے ہیں۔ ایک تصور، دوسرے تصدیق۔ اس واسطے کہ جو چیز جانی جاوے بغیر حکم کے یعنی اثبات یا نفی اسکے ساتھ نہ ہو، بلکہ صرف معنی اور مفہوم اس چیز کا ذہن میں حاصل ہو، اس کو تصور کہتے ہیں۔ جیسا کہ ادراک زید کا یا قائم کا بغیر اس کے کہ حکم کیا جاوے زید پر ساتھ قائم کے۔ اور اگر جانی جاوے اس طور پر کہ حکم ہو اس پر اثبات یا نفی کا۔ اس کو تصدیق کہتے ہیں۔ جیسے جاننا زید "قائم" کے معنی کا اور یقین کرنا اس کا۔ اور تصدیق کی حقیقت میں اختلاف ہے۔ حکماء کے نزدیک تصدیق صرف حکم کا نام ہے اور تصور موضوع محمول کا اور ایسا تصور نسبت حکمیہ کا اس کی تحقیق کی شرط ہے، یہ تصورات اس کی حقیقت میں داخل نہیں ہیں۔ اس تقدیر پر تصدیق ادراک بسیط کا نام ہے"

منشی دیبی پرشاد سحر بدایونی[1]

منشی دیبی پرشاد سحر بدایوں کے کایستھ خاندان سے تھے۔ اپنے زمانے کے مشہور ڈپٹی انسپکٹر مدارس تھے۔ ۱۸۹۵ء میں اسی خدمت پر بدایوں میں متعین تھے۔ وہیں ۱۸۹۶ء میں پنشن لی اور مولوی محمد زکریا خاں ذکی دہلوی (تلمیذ غالب) سب ڈپٹی انسپکٹر کو چارج دیا۔ نہایت ذی جوہر، صاحب ذوق آدمی تھے۔ پنشن لیکر اپنے وطن بدایوں میں مستقل قیام اختیار کیا تو مرتے دم تک ارباب علم و ادب ہی سے صحبت رہی۔ ان کے مکان پر بھی ادیبوں اور شاعروں کا مجمع رہتا تھا۔ خود بھی شاعر

---

[1] منشی دیبی پرشاد کے یہ حالات ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی (الہ آباد یونیورسٹی) نے اور جناب سلیمان صاحب بدایونی (مہاجر کراچی) نے خطوط میں لکھ کر مؤلف کو آگرہ بھیجے تھے۔

تھے۔ ملکہ وکٹوریا کے جلسۂ تعزیت میں ایک مرثیہ لکھ کر پڑھا۔ "سحر سامری" دیوان ان کی یادگار ہے۔ غالباً ۱۹۰۲ء میں انتقال کیا۔

دیوان غزلیات کے علاوہ مختلف مضمونوں پر بہت سی اور بہت اچھی کتابیں لکھی ہیں۔ ادب کے تمام فنون سے اچھی طرح واقف تھے۔ خوش نویسی، نیرنگی ارژنگ چین اور نظم پروین اردو میں بہترین کتابیں ہیں۔ بار بار شائع ہو چکی ہیں اور اب بھی ملتی ہیں۔ ایک کتاب املا اور رسم خط پر ہے "معیار الاملا" (دوسری اشاعت ۱۸۹۷ء) ایک تالیف معیار البلاغت ہے جو ۱۸۶۶ء میں لکھی گئی تھی جب سے کئی بار چھپی۔ اس میں معانی، بیان، بدیع، عروض، قافیہ، اقسام نظم و نثر کے بیان میں چھ باب ہیں۔ سحر کی دوسری تصانیف مرآت العلوم، رکاز الفیوض، خلاصۃ المنطق، تعلیم الاطفال، سفینۂ سحر، جرعۂ سحر، دیوار قہقہہ، تفاول ہندی، مرآۃ الصفا، رسالہ قیافہ، خلاصۂ جغرافیہ، دلائل المشائیین، غواص الحساب، محیط المساحت، تلخیص الحساب، بڑھاپا نامہ (مسدس)، حل رسالہ معمائے جامی ہیں۔

"خلاصۃ المنطق" ۱۸۶۹ء میں لکھا گیا۔ اور ۱۸۷۲ء میں مطبع نول کشور میں چھپا۔ اس کا نمونہ یہ ہے :-

فصل چہارم بحث حجت میں حجت تین قسم ہے۔ اول قیاس اور وہ استدلال ہے حال کُلی کا حال جزئی پر۔ جیسے کل انسان حیوان ہیں اور کل حیوان جسم ہیں پس قیاس ہوا کہ کل انسان جسم ہیں۔ پس حال کُلی یعنی حیوان سے حال جزئی یعنی انسان پر دلالت ہوئی۔ دوم استقرا یعنی استدلال حال جزئی سے حال کُلی پر۔ جیسے ہر انسان و طیور و بہائم کھانے کے وقت نیچے کا جبڑا ہلاتا ہے پس معلوم ہوا کہ سب حیوانات کھانے کے وقت نیچے کا جبڑا ہلاتے ہیں۔

یہاں حال جزئیات یعنی انسان وطیور وبہائم سے حال کلی حیوان پر دلالت کی گئی۔ سوم تمثیل وہ دلالت کرنا۔ ہے حال جزئی سے حال جزئی پر بسبب اشتراک کسی امر کے اُن میں، جیسے کہیں کہ بنگ حرام ہے کیونکہ شراب حرام ہے اور دونوں جزئی ہیں مسکر کے یعنی دونوں میں نشہ ہے۔ مگر واضح ہو کہ استقرا و تمثیل مفید ظن ہیں، اور قیاس مفید یقین)۔

مولوی محمد رضا لکھنوی علماء فرنگی محل کے خاندان سے تھے۔ قطب شہید فرنگی محلی ان کے اجداد میں ہیں۔ ان کے والد مولوی غلام یحییٰ خاں بنارس میں صدر الصدور رہے۔ اور ساتھ ہی تدریس کا سلسلہ جاری رکھا۔ مولوی محمد رضا بدایوں میں ڈپٹی کلکٹر رہے طبیب حاذق تھے۔ مطب بھی کرتے تھے۔ پنشن کے بعد بھوپال میں ملازم ہو گئے تھے۔

جس وقت رسالہ منہاج المنطق لکھا ہے، مولوی محمد رضا خاں اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر ضلع کھیری تھے۔ یہ کتاب ڈاکٹر بیلنٹین کے انگریزی رسالہ منطق کا اردو ترجمہ ہے۔ دیباچے میں لکھتے ہیں۔

"بجائے مصطلحات والفاظ متداولہ منطق انگریزی کے بجنسہٖ مصطلحات و الفاظ مستعملہ منطق عربی داخل ترجمہ کئے، اور التزام اس امر کا رکھا کہ محاورۂ زبان اردو بھی ساقط نہ ہو اور ترجمہ بھی لفظاً بلفظ ہو۔"

یہ ترجمہ ~~۱۸۸۰ء~~ ۱۲۹۸ھ میں مرتب ہوا اور ۱۸۸۱ء میں مطبع نول کشور میں طبع ہوا۔

انگریزی میں کتب منطق کی ترتیب اور پڑھانے کا طریقہ عربی کے مقابلے میں زیادہ دلچسپ ہے یہی فرق اوپر کے دو مصنفوں کی تالیفات اور مولوی

محمد رضا خاں کے ترجمہ میں ہے، اگرچہ ترجمہ کی زبان ان دونوں کے مقابلے میں کچھ زیادہ صاف نہیں ہے۔ منہاج المنطق کا نمونہ یہ ہے :-

۲۶۔ قضیہ صادقہ کا عکس کچھ ضرور نہیں کہ صادق ہی ہو۔ مثلاً کل گھوڑے حیوان ہیں قضیہ صادق ہے مگر اس کا عکس کہ کل حیوان گھوڑے ہیں کاذب ہے۔ اصل قضیہ میں ہم نے سب گھوڑوں کا ذکر کیا ہے نہ سب حیوانات کا، اس لئے اسکے عکس میں ہم کو کل حیوان کے ذکر کرنے کے بجائے صرف بعض حیوانات کا ذکر کرنا چاہئے، اور اصل قضیہ میں اس بات کا ایما نہیں پایا جاتا کہ کل حیوان گھوڑے ہیں، البتہ بعض کے ہونے کا پایا جاتا ہے۔

۲۷۔ یہ اقوال جو دفعہ ۲۲ سے ۲۶ تک مذکور ہوئے، بواسطہ اشکال کے بخوبی بیان ہو سکتے ہیں۔ پہلے یہ قضیہ لو کل گھوڑے حیوان ہیں۔ اور فرض کرو کہ سب گھوڑے ایک مثلث میں گھیرے جاویں، اور سب حیوان ایک دائرے میں۔ پس اس صورت میں اگر قضیہ مذکورہ صحیح ہے تو بالکل مثلث دائرے کے اندر گھر جائے گا، اس طور پر ⑤ اور بالکل مثلث کے دائرہ میں گھر جانے کی وجہ یہ ہے کہ گھوڑے کے کل افراد پر حکم ہے، اور چونکہ گھوڑے کے سوا اور بھی حیوان ہیں، اس لئے مثلث دائرہ کی تمام سطح پر محیط نہیں۔ اور اگر ہم اصل قضیہ کو منعکس کریں تو اس صورت میں کل حیوان تو محکوم علیہ ہو ہی نہیں سکتے مگر چند۔ پس ہم کو حیوان کے ساتھ لفظ بعض کی بھی قید لگانی ضرور ہوگی، اور ہم شکل میں بھی دیکھتے ہیں کہ دائرہ کی بعض سطح مثلث کے ساتھ منطبق ہے حالانکہ بالکل مثلث بعض دائرہ کے ساتھ منطبق ہے۔"

مولوی محمد علی تحصیلدار

بچھراؤں ضلع مراد آباد وطن تھا۔ ۱۸۱۷ء مطابق ۱۲۳۲ھ میں پیدا ہوئے۔ ملازمت کی ابتدا ۱۸۳۳ء میں

سررشتہ داری صدالصدور سے ہوئی۔ صیغۂ نظامت اور سررشتہ داخل خارج میں رہے۔ حدود تحصیلات قائم کرنے پر مامور رہے۔ رجسٹرار دیوانی رہے۔ پھر ۱۸۴۹ء میں تھانہ بھون ضلع مظفر نگر میں تحصیلدار ہوئے۔ تبادلے ہوتے رہے۔ بلاری ضلع مراد آباد سے جون ۱۸۷۶ء میں پنشن پائی۔ اور ۱۸۸۸ء (۱۳۰۵ھ) میں رحلت فرمائی۔ مولوی عبدالرشید صاحب نے قطعۂ تاریخ کہا:-

جناب محمد علی حامی دین	بہ معقول و منقول فرد یگانہ
بگویم سن رحلتش با دلائل	مفسر محدث فقیہ زمانہ

۱۳۰۵ھ

مصرع تاریخ کے اعداد (۱۲۳۰) میں دلائل کے اعداد (۷۵) جمع کرنے سے ۱۳۰۵ھ سال وفات نکلتا ہے۔

سرسید کی مذہبی تحریروں نے علمائے ہند کو نہایت مضطرب کر دیا تھا ہر طرف سے انکی مخالفت میں کتابیں اور اخبار و رسائل شائع ہو رہے تھے۔ حد اعتدال کو قائم رکھنا عالم و جاہل دونوں کے لئے دشوار ہوتا ہے، چنانچہ جوش مخالفت میں سرسید پر کفر کے فتوے لگا دئے گئے پھر جب ۱۸۸۰ء سے سرسید نے تفسیر قرآن کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا تو مخالفت اور بڑھ گئی۔ ان مخالفوں میں ایک زبردست مخالف مولوی محمد علی صاحب بھی تھے۔ انھوں نے سرسید کے ایک ایک فقرہ ایک ایک بات کا جواب لکھنا شروع کر دیا، اور تقریباً ڈیڑھ ہزار صفحوں کی کئی جلدیں تصنیف کیں۔ یہ مجلدات البرہان کے نام سے مشہور ہیں۔ پورا نام یہ ہے:- اَلْبُرْهَانُ عَلیٰ تَجْهِیْلِ مَنْ قَالَ بِغَیْرِ عِلْمٍ فِی الْقُرْاٰنِ اب نہ سرسید کی تفسیر کوئی پڑھتا ہے نہ اس کا رد دیکھنے کی کسی کو ضرورت ہے۔ لیکن اس قسم کا لٹریچر بھی انیسویں صدی کی عجیب و غریب پیداوار ہے۔ مولوی محمد علی صاحب بڑے عالم اور باخبر بزرگ تھے۔ اُس زمانے

میں ایک طرف عیسائی اسلام پر حملے کر رہے تھے۔ دوسری طرف سر سید اور مولوی چراغ علی نے عیسائیوں کی تردید اور اسلام کی تائید میں اسلام کے بعض مسلّم قوانین و اصول کی توجیہ اور رائے زنی شروع کر دی۔ ایسے معرکہ آرا میں مطابق حدیث شریف اِخْتِلَافُ اُمَّتِیْ رَحْمَۃٌ۔ (میری اُمت کا اختلاف رائے و اجتہاد بھی رحمت ہے)، کبھی ایک فریق حق پر ہوتا ہے، کبھی دوسرا۔ بہرحال مولوی محمد علی صاحب نے عیسائیوں اور (بقول خود) نیچریوں، دونوں کے جواب لکھے۔ ۱۸۷۲ء میں کانپور سے ایک رسالہ نور الآفاق اسی مذہبی مناظرے اور مناقشے کے لئے جاری ہوا تھا۔ اس میں مولوی صاحب نے مضامین لکھے۔

مولوی محمد علی صاحب کی متعدد غیر مطبوعہ تصانیف کے علاوہ مطبوعہ کتابیں یہ ہیں:۔

(۱) رَدُّ الشِّقَاقِ فِی جَوَازِ الاسْتِرْقَاقِ، سر سید کے رسالہ "ابطال غلامی" کا جواب
اسلام میں لونڈی غلام بنانے کے رواج کو جائز ثابت کیا ہے۔ مطبوعہ نظامی پریس کانپور ۱۸۷۴ء / ۱۲۹۱ھ

(۲) ظفر مبین۔ مسٹر اینڈرسن کے اعتراضات کا جواب

(۳) سوط اللہ الجبار۔ یہ بھی اینڈرسن کا جواب ہے۔

(۴) البرہان۔ اس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ مطبوعہ مطبع گلزار احمدی مراد آباد

مولوی محمد علی نے اپنی تصنیف البرہان میں سر سید کی ہر قسم کی غلطیاں قرآن فہمی و عربی دانی کے متعلق صرف و نحو، علم زبان، علم کلام، اصول تفسیر کے حوالوں کے ساتھ بیان کی ہیں۔ زبان میں قدامت کا اثر ایسا ہی ہے جیسا سر سید کی تحریر میں۔ سر سید کو ہر جگہ "سید الطائفہ" یا "سید الطائفۃ النیچریہ" لکھا ہے۔ اول لفظ قَالَ لکھ کر سر سید کی تفسیر کا حصہ نقل کیا ہے۔ پھر قُلْتُ لکھ کر اپنا جواب لکھا ہے۔ نمونہ یہ ہے:۔

قال. جب بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ سے کہا کہ ہم علانیہ خدا کو دیکھنا چاہتے ہیں تو وہ بجز اسکی قدرت کاملہ کے ایک عظیم الشان کرشمے کے ان کو نہیں دکھا سکتے تھے۔ پس وہ قریب اس پہاڑ کے لے گئے جس کی آتش فشانی اور گڑگڑاہٹ اور زور و شور کی آواز اور پتھروں کی آواز کے خوف سے بیہوش ہو گئے۔

قُلتُ۔ بیان واقعہ میں کس قدر مغالطہ کو کام میں لا رہے ہیں۔ قرآن مجید میں یہ کلمات ہیں۔ لَن نُّؤمِنَ لَکَ حَتّٰی نَرَی اللّٰہَ جَھرَۃً یعنی ہم تجھ پر ایمان نہ لاویں گے جب تک اللہ کو عیاناً نہ دیکھ لیں گے۔ اس گستاخی اور کفر کی سزا میں ان پر یہ عذاب نازل ہوا تھا اگر یہ کہتے کہ ہم خدا کو دیکھنا چاہتے ہیں تو ان پر یہ عذاب نازل نہ ہوتا۔ بلکہ حضرت موسیٰ ان کو سمجھا دیتے کہ تم خدا کو اس دار دنیا میں نہیں دیکھ سکتے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو سمجھا دیا تھا کہ (لَن تَرَانِی) اور چونکہ بقول سید الطائفہ کے وہ پہاڑ آتش فشاں تھا، اور آتش فشاں پہاڑوں کا حال جو کچھ ہے وہ کوئی عجائبات سے نہیں ایک معمولی بات ہے۔ اس سے تو بدرجہا زائد عجائبات وہ دیکھ چکے تھے کہ ان کی نظروں کے سامنے بحر قلزم پھٹ گیا۔ اور پانی کے تودے کو دہائے عظیم کے برابر ان کے دائیں بائیں کھڑے ہو گئے، اور وہ خشکی میں ان تودوں کے درمیان عین قعر دریا میں ہو کر نکل گئے عصا کی کیفیت دیکھ چکے تھے کہ اژدہا ہو کر ساحروں کی لاٹھیوں اور رسیوں کو نگل گیا۔ مقام رفیدیم میں ایک سنگ خارا سے بارہ چشمے پانی کے جاری کر دئے۔ ان عجائبات کے مقابلہ میں ایک ایسے امر کو کہ دستور مستمر کے موافق ظہور اس کا ہمیشہ ہوتا

لے یہاں شاہ عبدالعزیز صاحب کی تفسیر عزیزی سے ایک طویل فارسی عبارت اپنے قول کی تائید میں نقل کی ہے۔ وہ حذف کر دی گئی۔

رہتا ہے وہ لوگ کس طرح پر عجائبات اور کرشمہ سمجھ سکتے تھے، اور ایسا امر معمولی
کہ اس میں موسیٰ علیہ السلام کی نہ کچھ خصوصیت ظاہر ہوتی ہے، نہ ان کی عظمت
نہ ان کی نبوۃ و تقرّب پر دلالت کرتا ہے، کسی طرح پر باعث اس کا نہیں ہوسکتا
کہ وہ اپنے اس مقولۂ کفریہ سے کہ (لَن نُّؤمِنَ لَکَ) رجوع کریں، بلکہ یہ
امر تو موجب ازدیاد کفر اور بدگمانی کا تھا کہ قوم کو دھوکا دیا۔ خدا کے دکھانے
کا تو اظہار کیا اور کوہ آتش فشاں میں لیجا کر ان کی مٹی خراب کی۔ اور کیا سید الطائفہ
کے نزدیک وہ لوگ سبکے سب اندھے بہرے نادان ایسے مسلوب الحواس تھے
کہ دور سے نہ گڑگڑاہٹ کی آواز سنی نہ آگ کے شعلے دیکھے نہ آگ کی گرمی انکو
محسوس ہوئی، اپنی موت ان کو نظر نہ آئی یہاں تک کہ اس مقام سے کہ جہاں سے
یہ امور محسوس ہوسکتے تھے آگے تک بڑھے چلے گئے، یہاں تک کہ ایسے قریب
پہنچ گئے کہ مرنے تک کی نوبت پہونچ گئی۔ ۔ ۔ ۔ پس کسی طرح عقل باور نہیں
کرتی کہ ایسے لوگ موسیٰ علیہ السلام کے کہنے سے دیدہ و دانستہ آتش فشاں پہاڑ کے
قریب اپنی جان کھونے کو چلے جاتے اور ان سے یہ جھگڑا نہ کرتے کہ ہم تو اللہ
تعالیٰ کے دکھانے کے تجھ سے خواہاں تھے تو ہمیں آتش فشاں پر مار ڈالنے
کے واسطے لئے جاتا ہے۔"

منشی امیر احمد مینائی

حضرت امیر مینائی لکھنوی شاعر کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ مشاہیر مصنفین نثر میں ان کا شمار نہیں ہوتا لیکن اُنھوں نے بھی نثر کی چند کتابیں لکھی ہیں، جن میں سے ایک تذکرۂ شعرا ہے، اس لئے اہم اور قابل ذکر ہے۔ دوسری اردو لغت کی کتاب (امیر اللغات) ہے۔ یہ اردو کی بہترین خدمت تھی اگر مکمل ہوجاتی لیکن ناتمام بھی حضرت امیر مینائی

کا کارنامہ ہے۔ یہ راہ پہلے انھیں نے نکالی جن اصول پر لکھنا شروع کیا تھا
ان پر چل کر اور لوگوں نے کامیابیاں حاصل کیں۔

امیر مینائی مولوی کرم محمد کے فرزند رشید تھے۔ حضرت مخدوم شاہ مینا لکھنوی
رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد میں تھے۔ نصیر الدین حیدر شاہ اودھ کے عہد حکومت میں ۱۸۳۲ء/۱۲۴۴ھ
میں پیدا ہوئے درسیات کی تکمیل مفتی سعد اللہ رامپوری اور علمائے فرنگی محل سے
کی، شاعری کا بچپن سے شوق تھا، منشی مظفر علی اسیر سے تلمذ حاصل کیا۔ اس زمانے
میں آتش و ناسخ کے شاگردوں کے باہم معرکے اور انیس و دبیر کے مقابلے زور
شور پر تھے۔ جرح و قدح اور نقد و نظر کا بازار گرم تھا۔ اس لئے کسی ادنیٰ شاعر کو
فروغ حاصل ہونا ممکن نہ تھا۔ یہ دیکھ کر حضرت امیر مینائی نے شروع ہی سے شاعری
پر محنت کی اور تھوڑے ہی دنوں میں یہ شہرت حاصل کرلی کہ ۱۸۵۲ء/۱۲۷۰ھ میں جبکہ
امیر صاحب کی عمر بیس سال کی تھی واجد علی شاہ نے ان کو طلب کیا اور کلام سنا
بادشاہ کے حکم سے دو کتابیں ارشاد السلطان اور ہدایت السلطان لکھ کر پیش کیں
اور دربار شاہی سے خلعت پایا۔ غدر کے بعد ۱۸۵۸ء/۱۲۷۵ھ میں نواب یوسف علی خاں نے
امیر کو اپنا استاد بنالیا۔ ان کے بعد نواب حامد علی خاں نے قدر منزلت کی۔ ۴۲ برس
ریاست رامپور میں بڑی عزت و راحت سے رہے پھر نواب مرزا داغ نے
امیر صاحب کو حیدرآباد بلایا۔ حضور نظام کا ایما پہلے ہو چکا تھا۔ امیر حیدرآباد گئے
لیکن جاتے ہی بیمار ہو گئے اور ۱۹۰۰ء/۱۳۱۸ھ میں انتقال کیا۔

(۱۳۱۸)
خاکسار مولف نے تاریخ وفات کہی تھی "آں قدح بشکست وآں ساقی نماند"
یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ جب حضرت امیر مینائی سفر دکن پر جانے لگے تو اپنا یہ شعر پڑھا

اب نہ ٹھہروں جو کہے میری خوشامد بھی وطن
کہ پکارا ہے غریب الوطنی نے مجھ کو

اس میں لفظ غریب الوطنی سے ان کا سال وفات (۱۳۱۸ھ) نکلتا ہے۔

امیر مینائی بڑے عالم، مفتی، عابد و زاہد اور صاحب عرفان تھے۔ سلسلۂ چشتیہ صابریہ میں رامپور کے ایک عارف کامل حضرت امیر شاہ قدس سرہٗ کے مرید اور صاحب اجازت تھے۔ باوجود مشاغل شعر و ادب اور خدمت سلاطین کے ریاضت روحانی میں فرق نہ آتا تھا۔ دیانت کا یہ حال تھا کہ جس زمانے میں امیر صاحب رامپور میں عدالت دیوانی کے حاکم تھے، نواب خلد آشیاں کلب علی خاں ولی عہد تھے ایک مرتبہ ولی عہد بہادر کے کسی خادم خاص کا مقدمہ حضرت امیر مینائی کی عدالت میں پیش ہوا۔ ولی عہد نے امیر صاحب سے اس کی سفارش کہلا بھیجی۔ لیکن انھوں نے انصاف و دیانت کو ہاتھ سے نہ دیا اور روئداد مقدمہ کے لحاظ سے اس شخص کے خلاف فیصلہ کر دیا۔ اس وقت ولی عہد کو یہ بات ناگوار گذری لیکن جب خود تخت نشین ہوئے اور مصالح عدالت و سیاست پر نظر پڑی تو ایک دن خود امیر صاحب سے فرمایا کہ اب آپ کی اس کارروائی کا مجھ سے زیادہ قدر شناس کوئی نہیں۔

حضرت امیر مینائی عربی و فارسی کے عالم ہونے کے علاوہ ہندی و سنسکرت بھی خوب جانتے تھے۔ طب بھی پڑھی تھی۔ علم جفر میں بھی مہارت رکھتے تھے جفر میں دو کتابیں، "امور غیبیہ" اور "رموز غیب" بھی لکھی تھیں۔ امیر مغفور کی تصانیف مطبوعہ و غیر مطبوعہ کثرت سے ہیں۔ ۲۵ سے کم نہیں ہیں۔ لیکن اکثر نظم کی ہیں۔ جن میں دو دیوان عشقیہ، مرآۃ الغیب (۱۲۹۵ھ) اور صنم خانۂ عشق (۱۳۰۶ھ)، ایک دیوان نعتیہ محامد خاتم النبیین (۱۳۰۰ھ)، ایک مجموعہ واسوخت مینائے سخن،

لے ممکن ہے یہ نام تاریخی ہوں۔ پہلے سے ۱۲۹۵ھ اور دوسرے سے ۱۳۰۶ھ نکلتے ہیں۔ امیر مرحوم کی اکثر کتابوں کے نام تاریخی ہیں اس لئے یہ قیاس ہوتا ہے۔

(جو بعد وفات شائع ہوا) خاص چیزیں ہیں۔ نثر میں رسالہ میلاد شریف خیابانِ آفرینش (۱۳۰۵ھ) نمانہ کے اسرار، زاد الامیر، امیر اللغات اور انتخاب یادگار مطبوعہ یادگاریں ہیں۔ امیر مرحوم کی وفات کے بعد ان کے شاگرد رشید مولوی احسن اللہ خاں ثاقب اکبر آبادی مرحوم (سابق پروفیسر وکٹوریا کالج گوالیار) نے مکتوبات امیر مینائی کے نام سے مجموعہ خطوط شائع کر دیا ہے۔

امیر مینائی کے مکان رامپور میں ۱۸۹۹ء میں آگ لگ گئی تھی۔ جس سے انکے کتب خانہ کا بڑا حصہ جل گیا[۱]۔ یہ حضرت امیر کے ذاتی نقصان کے علاوہ ملک و قوم اور زبان و ادب کا اتنا بڑا نقصان تھا جس کی کوئی تلافی ممکن نہ تھی کتنی غیر مطبوعہ تصانیف خاک سیاہ ہو گئیں۔ جن میں ان کے دوسرے دیوان کے بعد کا کلام بھی تھا جس کے متعلق خود حضرت امیر کا بھی خیال تھا کہ "صنم خانہ" سے بہتر ہے "صنم خانہ عشق" کو وہ اپنا بہترین کلام نہ سمجھتے تھے۔

امیر مرحوم کی تصانیف نثر میں انتخاب یادگار (۱۲۹۰ھ) سب سے قدیم ہے۔ یہ تام تاریخی ہے۔ ۱۸۷۳ء ۱۲۹۰ھ میں مرتب ہوا۔ اس میں صرف اُن شاعروں کا حال و کلام درج ہے جو رامپور کے رہنے والے یا دربار رامپور سے تعلق رکھنے والے تھے نواب

[۱] بعض تذکروں میں آگ لگنے کا سال ۱۸۹۵ء درج ہے۔ اگر ایسا ہے تو ممکن ہے وہ آگ پہلے لگی ہو۔ ۱۸۹۹ء میں آگ لگنا خود مجھے یاد ہے۔ میں رام پور میں حضرت امیر مینائی کے محلے میں ان کے مکانات سے قریب ہی رہتا تھا۔ میرا لڑکپن کا زمانہ تھا۔ آگ ایسے غضب کی تھی کہ اگرچہ مکان آتش زدہ سے میرا مکان فاصلے پر تھا۔ پھر بھی وہاں سے جلے ہوئے کاغذ اُڑ کر میرے گھر آتے تھے۔ اس حادثہ سے ہم سب پر عجیب ہیبت چھائی ہوئی تھی۔ امیر صاحب اور جلیل صاحب کو دیکھنا اچھی طرح یاد ہے۔ بعض تقریبیں جن میں شریک ہوا یاد ہیں۔ (قادری)

خلد آشیان کلب علی خاں بہادر کے حکم سے لکھا گیا۔ امیر مرحوم دیباچے میں لکھتے ہیں۔

ایک دن بندگان حضور کو خیال آیا کہ ایک تذکرہ شعرائے ماضی وحال کا ایسا بنایا ہو کہ اس سے خاص اس دارالریاست کے متوطن اور متوسل شاعروں کی مختصر کیفیت سخن گوئی کی حقیقت نقش صفحہ روزگار ہو۔ اسی ضمن میں اعزاز اس ہیچمداں کا بھی منظور ہوا، لہٰذا یہ ہیچمیرز اس خدمت پر مامور ہوا اور محض باقتضائے عطوفت خسروانی آغاز سے انجام تک برابر حضور نے التفات فرمایا۔ تب یہ تذکرہ ایک سال میں تمامی پر آیا"

چھ سو صفحے کے قریب ضخامت ہے۔ اور چار سو سے زیادہ شاعروں کا حال ہے شروع میں ۱۶۰ صفحوں میں تمام والیان ریاست رامپور کا مفصل حال لکھا ہے، اور ان میں سے جو شاعر تھے ان کا کلام بھی۔ اس کے بعد عام شعرا کا تذکرہ حروف تہجی کی ترتیب سے ہے۔ عربی، فارسی، اردو، ہندی، جس زبان کا جو مسلمان یا ہندو شاعر ہے اس کا تھوڑا یا بہت تذکرہ ضرور ہے۔ عربی اور ہندی کے تمام اشعار کا اردو ترجمہ بین السطور میں لکھ دیا ہے۔

انتخاب یادگار میں چونکہ شعرائے رامپور کا احاطہ کرنا تھا، اس لئے ہر قسم کے شاعر شامل کرلئے گئے، بہر حال یادگار ہونے میں شک نہیں۔ کتنے اچھے شاعر ایسے بھی ہیں جو اور کسی تذکرے میں نہ مل سکتے۔ "خم خانۂ جاوید" جیسے تذکروں کو انتخاب یادگار سے بہت مدد ملی۔

اس کی طرز تحریر میں کوئی خاص بات نہیں۔ جس زمانے میں امیر مغفور نے یہ کتاب لکھی ہے۔ مقفےٰ عبارت کا رواج تقریباً ختم ہو چکا تھا۔ سرسید کی صاف ورواں تحریریں شائع ہو رہی تھیں، مولوی نذیر احمد دہلوی کی "مرآۃ العروس" وغیرہ مشہور ہو گئی تھیں عام کتابوں اور رسالوں میں قافیہ کی آرائش باقی نہ رہی تھی۔ لیکن غالباً کچھ تو حضرت امیر کی اپنی پسند کچھ یہ خیال کہ شاہی فرمان سے کتاب لکھی جاتی ہے تو اس پر محنت بھی ہونی چاہیئے اور کچھ خصوصیت اور زیب وزینت بھی۔ انتخاب یادگار کی اس خاص طرز کے

باعث تھے۔ مختصر نمونہ یہ ہے:۔

حیاؔ، صاحب عالم مرزا رحیم الدین خلف صاحب عالم مرزا محمد کریم الدین رساؔ، اٹھتر برس کا سن ہے، جیسا ظاہر ہے ویسا ہی باطن ہے۔ نہایت خوش طبیعت نیک خصال ہیں، آفرینش سخن میں بڑے ذی کمال ہیں، شطرنج بھی خوب کھیلتے ہیں، وطن قدیمی ان کا دہلی ہے مگر مدت سے اسی سرکار فیض آثار میں تعلق ہے، مع اہل وعیال یہیں رہتے ہیں، مشق کا یہ عالم ہے کہ مواجی طبیعت سے دریا کی طرح بہتے ہیں زبان اچھی، مذاق اچھا ہے، فکر بلند ذہن رسا ہے، شاہ نصیر دہلوی کے شاگرد رشید ہیں اشعار ان کے قابل دید ہیں۔

تھے اک نگاہ میں مرے عقدے تمام حل ۔۔۔ اتنا سا کام آپ کو دشوار ہو گیا

تڑپنا میرا نہ دیکھا گیا، یہ محض غلط ۔۔۔ نہ بیٹھنے کا مگر ان کو اک بہانہ ہوا

دشمن صد چاک دامن اور سودا عشق کا ۔۔۔ یہ بھی کیا میں ہو گیا، میرا گریباں ہو گیا

چین کیا آئے شب غم موت بھی آتی نہیں ۔۔۔ یاں تو دم کا بھی نکلنا دل کا ارماں ہو گیا

ہاتھ ہے دل پر پس مرگ اس لئے ۔۔۔ درد نکل جائے نہ دم کی طرح

یہ میدان محشر ہے، دنیا نہیں ہے ۔۔۔ کہ ٹکڑے اڑاؤ گے گھر سے نکل کر

امیر صاحب نے حیا کے بہت سے شعر درج کئے ہیں، یہاں امیر کی پسند اور انتخاب کی خوبی دکھانے کے لئے چند شعر نقل کر دئے گئے ہیں۔

امیر مینائی مرحوم کا دوسرا کارنامہ امیر اللغات ہے۔ ان سے پہلے بھی اردو لغات[1]

---

[1] اردو لغات ماہ دور کی چند قدیم لغت کا ذکر یورپین مصنفین کے ذکر میں آچکا ہے۔ اہل یورپ کی لغات اردو سے پہلے ملا عبدالواسع ہانسوی نے غرائب اللغات لکھی تھی جس کو (باقی حاشیہ صفحہ ۴۰۳ پر)

کی کتابیں بہت لکھی گئیں۔ لیکن ایسی جامع کتاب کوئی نہ تھی۔ امیر مرحوم نے اردو محاوروں کا احاطہ اور سند کے اشعار کا اضافہ بڑی کاوش کے ساتھ کیا ہے۔ لیکن صرف دو جلدیں الف ممدودہ و الف مقصورہ کے الفاظ کی ۱۸۹۱ء اور ۱۸۹۲ء میں شائع ہوئیں۔ تکمیل نہ ہو سکی۔

امیر اللغات کا دیباچہ امیر صاحب نے نہایت سلیس و رواں اردو میں لکھا ہے قافیہ پیمائی نہیں ہے اس کا اقتباس درج کیا جاتا ہے جس سے "امیر اللغات" کی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۰۲)

سراج الدین علی خاں آرزو نے دوبارہ صحت کے ساتھ نوادر الالفاظ کے نام سے مرتب کیا تھا۔ اسکے بعد کسی ہندوستانی نے کوئی قابل ذکر لغات کی کتاب نہیں لکھی۔ یورپ والوں کو ہندوستان میں آکر اردو زبان سیکھنے کے سلسلے میں اردو کی فرہنگ کی ضرورت پیش آئی۔ چنانچہ سب سے پہلے ایک مشنری ایم۔ ٹی ڈیلیس نے ۱۷۰۴ء میں اردو لغات مرتب کئے۔ پھر ۱۷۷۳ء میں فرگیس نے ہندوستانی انگریزی لغت لکھی۔ پھر ڈاکٹر جان گلکرائسٹ نے ۱۷۹۲ء میں انگریزی ہندوستانی ڈکشنری شائع کی، اسکے بعد اہل یورپ نے کثرت سے اردو لغت لکھیں جن میں یہ کتابیں ممتاز ہیں (۱) کپتان ٹیلر کی اردو انگریزی لغت (۱۸۰۰ء) (۲) گلیڈون کی ڈکشنری (۱۸۰۹ء) (۳) کپتان روبک کی "لغت جہاز رانی" (۱۸۱۱ء) (۴) جان شیکسپیر کی اردو لغت ۱۸۱۲ء (۵) ڈنکن فوربس کی ہندوستانی لغت ۱۸۴۷ء (۶) فرانسیس برٹرنڈ کی اردو لغت ۱۸۵۸ء (۷) ڈاکٹر فیلن کی چار اردو ڈکشنریاں عام الفاظ کی الگ اور قانونی الفاظ کی الگ ۱۸۷۳ء سے ۱۸۸۰ء تک۔ (۸) بلیٹ کی اردو ہندی ڈکشنری ۱۸۸۴ء۔

اہل ہند نے بھی لغت نویسی کی طرف توجہ کی (۱) میر اوحد الدین بلگرامی نے اردو لغات اور محاورے "نفائس اللغات" میں جمع کئے۔ کتاب فارسی میں لکھی ہے۔ عربی مترادف الفاظ بھی لکھے ہیں۔ محمد علی شاہ اودھ کے عہد حکومت (تا ۱۸۴۲ء) میں مرتب ہوئی (باقی حاشیہ صفحہ ۴۰۴ پر)

داستانِ تالیف بھی معلوم ہو گی:۔

میں نے ہوش سنبھالا، آنکھیں کھولیں تو یہ دیکھا کہ اچھے اچھے اہل زبان اور زباندان سرزمین سخن کے فرمانروا ہیں۔ انھیں صحبتوں میں اردو زبان کی چھان بنان کا شوق مجھے بھی ہوا، اور اسی زمانے میں یہ آرزو پیدا ہوئی اور بڑھ کر بے چین کرنے لگی کہ اردو الفاظ کے بکھرے ہوئے موتیوں کی ایک خوشنما لڑی بناؤں اتنے میں لکھنؤ کی سلطنت مٹ گئی، اور غدر ہو گیا۔ وطن کی تباہی اور گھر بار کے لٹنے سے چندے حواس ہی جمع نہ ہو سکے، الفاظ کیسے! لیکن اس آرزو کی آگ دل میں سلگتی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۰۲)

(۲) اس کتاب میں جو لغت رہ گئے تھے۔ ان کو شامل کر کے محبوب علی رامپوری نے منتخب النفائس کے نام سے نئی ترتیب کے ساتھ مرتب کی، یعنی تمام لغت جدولوں میں لکھی ہے۔ تین خانے بنائے ہیں پہلے خانے میں اردو لفظ، اس کے سامنے دوسرے خانے میں فارسی مترادف اور تیسرے میں عربی۔ متن میں کوئی عبارت نہیں، لغات کے اعراب تشریح، سند کے اشعار وغیرہ سب حاشیے میں لکھے ہیں۔ یہ کتاب ۱۲۶۲ھ میں امجد علی شاہ اودھ (عہد حکومت تا ۱۸۴۷ء) کے زمانے میں مرتب ہوئی۔ اور ۱۸۰۷ء میں مطبع نظامی کانپور میں چھپی۔ مصنفین لغت میں علی اوسط رشک مرزا چھو بیگ عاشق، حکیم ضامن علی جلال، لالہ چرنجی لال اور مولوی سبحان بخش کے نام بھی قابل ذکر ہیں۔ (۳) مولوی سید احمد دہلوی کی "فرہنگ آصفیہ" ۱۸۹۲ء (۴) امیر اللغات، (۵) فصیح اللغات مولانا احسن مارہروی نے مرتب کرنی شروع کی تھی، حضرت داغ دہلوی سے اسکے سند کے اشعار لکھوائے تھے لیکن ناتمام رہ گئی۔ (۶) نواب عزیز جنگ کی "آصف اللغات" یہ ڈکشنری کیا انسائیکلوپیڈیا تھی۔ لیکن ناتمام رہ گئی تقریباً ۸ ہزار صفحوں میں حرف (ت) تک نوبت پہونچی تھی۔ (۷) اس اعتبار سے اردو کی اب تک سب سے عظیم لغت نور اللغات ہے جو مولوی نور الحسن علوی نیر کاکوروی نے ۱۹۳۰ء میں (باقی صفحہ ۴۰۵ پر)

رہی یہاں تک کہ فردوس مکاں نواب محمد یوسف علی خاں بہادر والی رامپور نے مجھے طلب فرما کر عزت کا خلعت اور اطمینان کا سرمایا دیا۔ اب میں پھر اپنی تمنا کے سلسلے کو بڑھانے لگا۔ مگر اس زمانے میں رامپور کی عدالت دیوانی میرے متعلق تھی۔ نواب فردوس مکاں اپنے کلام میں بھی مشورہ فرماتے تھے، اور فن شاعری کے مشغلے جو نئی نئی شکلوں سے پیش آتے تھے وہ یوں بھی کم فرصتی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔ اتنی مہلت تو میں نہ پا سکا کہ اپنے ارادے کو پورا کردوں تاہم کچھ کچھ شغل چلا گیا۔ جب خلد آشیاں نواب کلب علی خاں بہادر کا عہد آیا تب فرصت کی کمی اور بڑھی، لیکن کچھ ہی ہوا یہاں وہی دُھن بندھی رہی۔ جب ۱۸۸۴ء میں علوم کے قدردان، سر الفرڈ لائل صاحب بہادر (لفٹنٹ گورنر ممالک مغربی و شمالی و چیف کمشنر اودھ) نے نواب خلد آشیاں طاب ثراہ سے اردو کے ایک جامع لغت کی فرمائش کی۔ نواب خلد آشیاں نے مجھے حکم دیا۔ یہاں تو یہ تمنا ہی تھی، فوراً "آنکھ" کے لفظ کا ایک نمونہ تیار کیا جسے نواب خلد آشیاں نے جنرل محمد اعظم الدین خاں بہادر (سابق سفیر ریاست و حال وائس پریسیڈنٹ کونسل آف ریجنسی) کے ذریعے سے سر الفرڈ لائل صاحب بہادر کے پاس بھیجا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۰۴)

مکمل کر کے شائع کی (۸) اس کے بعد پنجاب سے جامع اللغات مولوی عبدالمجید نے شائع کی۔ یہ نوراللغات سے زیادہ ضخیم ہے۔ ان بڑی کتابوں کے علاوہ خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی، مرزا عزیز لکھنوی، مولوی فیروزالدین وغیرہ نے مختلف اردو لغات شائع کی ہیں۔ (۹) انگریزی لغات کے اردو معانی کے لئے اب تک کوئی مکمل و مستند ڈکشنری نہ تھی یہ کمی ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب نے پوری کر دی۔ "اسٹینڈرڈ انگلش اردو ڈکشنری" کے نام سے نہایت ضخیم لغت انجمن ترقی اردو کی طرف سے شائع کر دیا ہے۔

آگے کا قصہ یہ ہے کہ لفٹنٹ گورنر نے نمونہ پسند کیا اور سرپرستی و امداد کی امید دلائی۔ لیکن وہ چلے گئے اور نواب خلد آشیاں کا انتقال ہو گیا۔ امیر اللغات کا کام رُک گیا۔ آخر نواب حامد علی خاں کے عہد میں اس کی اشاعت شروع ہوئی۔ امیر اللغات کا نمونہ یہ ہے

آنکھوں کی سوئیاں نکالنی رہ گئی ہیں یہ مثل اس جگہ بولتے ہیں جہاں کسی کام میں بہت کچھ محنت و مشقت ہو چکے، تھوڑی سی کوشش باقی رہے۔ داغ سے

جو میٹھیں آنکھیں تو پلکیں بھی کوئی پل کی ہیں — رہی ہیں بس یہی آنکھوں کی سوئیاں باقی

اس مثل کی نسبت ایک کہانی مشہور ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ کسی عورت نے ایک شخص کو دیکھا کہ مردہ سا پڑا ہے اور تمام بدن میں سوئیاں چبھی ہوئی ہیں۔ سمجھی کہ کسی نے اس پر جادو کیا ہے، اس لئے کہ بقول مشہور ایک قسم کے جادو میں سوئیاں بھی چبھوتے ہیں وہ سوئیاں نکالنے لگی۔ سارے بدن کی سوئیاں نکال لیں، صرف آنکھوں کی باقی رہ گئی تھیں کہ ایک عورت وہاں اور آگئی۔ اس سے اس نے کہا کہ اب آنکھوں کی سوئیاں نکالنی باقی ہیں تو یہاں ٹھہری رہ میں ابھی آتی ہوں۔ یہ کہہ کر وہ کسی ضرورت کو گئی۔ اس عورت نے اس کی آنکھوں کی سوئیاں نکال لیں۔ اور وہ شخص سحر سے نجات پا کر اُٹھ بیٹھا۔ محبت اور ہمدردی اس عورت کی ثابت ہوئی جس نے آنکھوں کی سوئیاں نکالی تھیں "

امیر مینائی کے خطوط بھی ان کی عمدہ یادگار ہیں۔ بعض میں شعر و ادب کے مسائل بیان کئے ہیں بعض پرائیویٹ خط بہت دلچسپ ہیں۔ اس طرح کا ایک خط حضرت داغ دہلوی کو لکھا ہے۔ ۱۸۹۱ء میں مرزا داغ کو حضور نظام دکن نے "استاد السلطان" کا خطاب دیا۔ اخباروں میں اس کا تذکرہ چھپا، امیر صاحب نے بھی دیکھا۔ انھیں دنوں مرزا داغ کا خط امیر کے پاس آیا لیکن انھوں نے اپنے خطاب و اعزاز کا ذکر نہ لکھا تھا۔ اس خط کے جواب میں امیر لکھتے ہیں:۔

مصدر لطف اتم قدیمی کرم سلامت۔ سلام مسنون اخلاص مقرون۔ مدت کے بعد نوازش نامہ آیا، ممنون یاد آوری فرمایا۔ بندہ نواز! مجھے یاد نہیں کہ میں نے کسی خط کا جواب قلم انداز کیا ہو۔ یہ میرے مقدر کی نارسائی کہ خط نہ پہنچا ہو، بہر کیف جرم ناکردہ کا عذر خواہ ہوں۔ اخبار گورکھپور میں ریاض نے آپ کا مخاطب بخطاب استاد السلطان ہونا اور سات سو روپیہ مشاہرہ مقرر ہونا چھاپا۔ یہ دیکھ کر نہایت مسرور ہوا تھا، مگر اس تحریر میں ان دونوں اعزازوں کا ذکر نہ تھا۔ اس وجہ سے وہ سرور کیت گیا عزت افزائی جو سرکار دولت مدار نے تلمذ سے فرمائی وہ میرے سرور آئندہ ترقیوں کی امیدوں کو بڑھا رہے ہیں۔ خدا جلد ظہور میں لائے شکایت جو آپ نے ”صنم خانۂ عشق“ دیوان دوم کے نہ پہنچنے کی لکھی ہے، وہ دیوان چھپا کہاں، ورنہ ممکن تھا کہ نہ پہنچتا۔ تالیفات کہنہ کا حضور میں آپ کے واسطے سے نہ پہنچنا معاذ اللہ اس وجہ سے نہ تھا کہ آپ رشک وحسد سے نہ گزاریں۔ افسوس کہ اتنی مدت تک یکجائی اور میری طبیعت کی صفائی دیکھ کر بھی آپ کو بدگمانیاں باقی ہیں میاں بوڑھے ہو گئے ہو، یہ شیوہ چھوڑ دو کہ زبردستی رکاوٹ کے لئے ایک بات قرار دی ہے۔

(داغ نے امیر کے خطاب کے متعلق استفسار کیا ہو گا، اس کا جواب اسی خط میں دیتے ہیں) اول تو میں خطاب لینے ہی کے قابل اپنی قابلیت کو نہیں سمجھتا، اور اور پھر درخواست دے کر خطاب مانگنا یہ تو بالکل پسند نہیں۔ میاں اب تو وہ وقت آ گیا کہ مرحوم ومغفور کا خطاب بارگاہ شہنشاہ حقیقی سے عطا ہو۔ کوئی اور حوصلہ نہیں ہے۔

آپ کا تازہ کلام دیکھ کر جی خوش ہو جاتا ہے۔ میں کہتا کیا ہوں جو سمجھوں جی افسردہ رہتا ہے کبھی کسی گندہ ستے والے کے اصرار سے کچھ بکتا ہوں تو وہ چھپ جاتا ہے

بہ فراغت چشم بد دور آپ کے واسطے ہیں کہ شعر کے سوا کوئی فکر نہیں خدا جمعیت خاطر بڑھائے (اسی خط کی آخری سطروں میں کس بے تکلفی اور خلوص سے لکھتے ہیں)

اے یار استاد السلطان ہونے کی مٹھائی تو لائیے یا استاد یا استاد" برسوں کہا کیا ہے۔ اب جو وہ وقت آیا تو استاد کی شیرینی ندارد۔ امید ہے کہ کبھی کبھی رسم رسل و رسائل رہے۔ میں ابتدا سے تمہارا دوست اور خیر خواہ ہوں میری طرف سے گمان فاسد نہ کیا کرو۔ زیادہ کیا لکھوں۔

امیر فقیر ۲۱ مارچ ۱۸۹۱ء

یہ خط مکتوبات امیر مینائی میں شامل نہیں ہے۔ رسالہ[1] نیرنگ دہلی کے امیر نمبر سے نقل کیا گیا ہے اس لئے نادر یادگار ہے۔

---

[1] مولوی عزیز اللہ خاں رامپوری مرحوم نے غالباً ۱۹۲۷ء میں ریاست رامپور سے نیرنگ جاری کیا گھر کا چھاپہ خانہ انکے والد مغفور سعید اللہ خاں صاحب عیش رامپوری کا قائم کردہ (مطبع سعیدی) موجود تھا۔ سعید اللہ خاں بھی بڑے صاحب ذوق تھے۔ ایک رسالہ تہذیب نام مدتوں نکال چکے تھے۔ بعض نادر کتابیں اپنے مطبع سے شائع کیں۔ منیر شکوہ آبادی کے کئی دیوان چھاپے۔ منشی امیر اللہ تسلیم لکھنوی کا دیوان شائع کیا منشی احمد علی شوق قدوائی کی نظموں کا مجموعہ (گنجینہ) کے نام سے شائع کیا انکے فرزند رشید عزیز اللہ خاں نے نیرنگ کو علمی و ادبی شان کے ساتھ جاری رکھا۔ بعض خاص نمبر بڑے اہتمام سے شائع کیے جن میں میر نمبر اور امیر نمبر ممتاز ہیں۔ عزیز اللہ خاں بیمار رہنے لگے تو انکے دوست عشرت رحمانی صاحب رامپوری نے ہاتھ بٹایا اور نیرنگ کا اہتمام اپنے ذمہ لیکر دہلی سے نکالنا شروع کیا۔ عزیز اللہ خاں کی بے وقت جوان موت نے ایسا صدمہ پہنچایا کہ نیرنگ دہلی میں بھی اس کا متحمل نہ ہو سکا۔ اور کچھ عرصہ جاری رہ کر بند ہو گیا۔

ایک اور خط حکیم عابد علی کوثر خیرآبادی کے نام یہ ہے:۔

۸ رمارچ ۱۸۹۸ء

مجی حکیم صاحب

سلام مسنون و دعا مشحون۔ مہربانی نامے نے پونہچ کر شکر گذار یاد آوری کیا اب تک آپ کا فائز مرام نہونا سخت افسوس کا باعث ہے۔ اللہ تعالیٰ آپکو حسب دلخواہ کامیاب فرمائے۔ یہ داعی خیر دعا سے کسی وقت غافل نہیں ہے۔

بھانا پسند آنا کے معنی میں اگلی زبان ہے اب میرے نزدیک بھی مستحسن الترک ہے۔ مہیں (میں ہی) کی جگہ بول چال میں چاہے آجاتا ہو، مگر کسی معتبر کلام میں ابتک نظر سے نہیں گزرا۔ سکم اس کے استعمال کا نہیں دیا جا سکتا۔ حضرت امیر مرحوم کی نظر سے آپ کے شعر میں نہیں معلوم کیونکر رہ گیا۔ اور میں نے بھی اسے دیکھا ہے تو سوا اپنے سہو نظر کے اور کیا کہا جائے۔ انکھڑیاں چشم معشوق کے لئے مخصوص ہے۔ اور یہ لفظ مجھے پسند نہیں ہے۔ بھدنا لفظ نہیں ہے، بدھنا ہے اور سرایت کرنے کے معنی میں مستعمل ہے۔ صبا ؎

شور جس کا ہے وہ ہے عشق جنوں زا دل میں

بدھ گیا ہے نمکیں حسن کا سودا دل میں

ایجاد مذکر ہے۔ سند کے واسطے شعر ذیل میں دیکھئے۔ آجکل اس لفظ کی تذکیر و تانیث میں بحث چھڑی ہوئی ہے۔ اخباروں میں مضامین دیکھے جاتے ہیں اور جا بجا سے میرے پاس استفتے آگئے ہیں۔ سنا جاتا ہے کہ نواب مرزا خاں صاحب داغ کا قول ہے کہ دلی میں مؤنث ہے۔ مگر کلام میں مونث کا پتا نہیں چلتا۔ اگر ایک معتبر شاعر نے بھی مؤنث کہا ہوتا تو کہا جاتا کہ مختلف فیہ ہے اور بغیر کلام میں آئے ہوئے کہیں بول چال میں ہونا کافی نہیں۔ نسیم دہلوی ؎

قبر پر آیا ہے دینے کو مبارک بادِ مرگ — یہ نیا ایجاد ہے میرے ستم ایجاد کا

میر ؎

یہ تازہ لگا ہونے ایجاد گلستاں میں — زاغوں کو لگا رہنے صیاد گلستاں میں

اگرچہ اس شعر میں ایجاد کا لفظ جس صورت میں آیا ہے وہ سند کے لیے پورے
طور سے کافی نہیں ہو سکتا، مگر دیوان میں اسی طرح چھپا ہے اور ثقات کو
اسی طرح پڑھتے سنا ہے۔ غافل لکھنوی ؎

اتنی بینائی کہاں دیکھیں جو سیر جزو و کل — عالم ایجاد میں تو سیکڑوں ایجاد ہیں

دشنام زیادہ مونث ہے۔ مگر ظفر نے ایک جگہ مذکر لکھا ہے۔ لہٰذا مختلف
فیہ کہا جا سکتا ہے ناسخ ؎

کسی نے جو حیدر کو دشنام دی — تو گویا پیمبر کو دشنام دی

ولہ ؎

بارہا میں گیا ہوں نزد امام — کبھی مجھکو نہ دی کوئی دشنام

ظفر ؎

ہم کو پوشیدہ ہیں پیغام کسو کے آتے — خط پہ خط روز ہیں بے نام کسو کے آتے
ہوس بوسہ اگر کھینچ نہ لاتی ہم کو — کاہے کو سننے کو دشنام کسو کے آتے

سب بندہ زادے اور جلیل حسن بالتخصیص تسلیم گذار و سپاس گذار ہیں۔

امیر فقیر

پنڈت گرراج کشور دت

ان کا مفصل حال معلوم نہیں۔ آگرہ کے رہنے والے تھے، سینٹ جانس کالج آگرہ میں تعلیم پائی
مختلف مقامات پر منصف رہے۔ سب ججی سے پنشن لیکر آگرہ میں قیام کیا۔ اپنے پرانے

کالج کی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے پریزیڈنٹ رہے۔

پنڈت صاحب متعدد قانونی کتابوں کے مصنف و مترجم ہیں۔ جن میں سے ایک کتاب آئینۂ وکالت ہے جو ۱۸۸۹ء ۱۳۰۶ھ میں اورینٹیل جوب پریس آگرہ سے شائع ہوئی۔ پنڈت جی اس کتاب کے دیباچے میں ان کتابوں کا ذکر کر کے جن سے اسکی تالیف میں مدد لی ہے، لکھتے ہیں:-

"اگرچہ کتاب ہذا کی نسبت کسی قسم کی اختراع کا دعویٰ کرنا منجانب میرے ایک قسم کی گستاخی ہوگی۔ مگر اس قدر میں جرأت کر کے کہہ سکتا ہوں کہ نصف سے زیادہ مضمون کتاب ہذا کا میرے ذاتی تجربہ اور فکر کا نتیجہ ہے۔"

پنڈت گرراج کشور صاحب سے پہلے قانون کی بہت کتابیں لکھی گئی تھیں۔ تمام قوانین اردو میں منضبط ہو گئے تھے۔ اور اس قسم کی کتابیں برابر مرتب و شائع ہوئی تھیں۔ اس سلسلے میں سب سے بڑا کام الہ آباد کا مطبع نظائر قانون ہند کر رہا تھا جس نے شاید کوئی ایکٹ اور کوئی نظیر اردو میں منتقل کرنے سے نہ چھوڑی تھی۔ بقول خود اہل مطبع کے "مہر چہار عدالت ہائے ہائی کورٹ واقع ہند" یعنی کلکتہ و مدراس و بمبئی و الہ آباد کے نظائر قانونی کا لفظ بلفظ ترجمہ ضخیم جلدوں میں شائع کر دیا تھا۔ مسٹر جسٹس سید محمود جج ہائی کورٹ الہ آباد کے قانون شہادت کی شرح اسی مطبع نے شائع کی تھی۔

لیکن پنڈت گرراج کشور کی تصنیف آئینۂ وکالت اپنی وضع کی خاص کتاب ہے۔ پنڈت جی نے مقدمہ کی پیروی، استغاثہ، اپیل، جرح و جواب دہی کے قانون اور طریق کار بتانے کے علاوہ وکیلوں کو ایسے اصول سمجھائے ہیں جو ایک تجربہ کار اور ہمدرد حاکم ہی سمجھا سکتا تھا۔ قانون جیسے خشک موضوع کو مثالوں اور تمثیلوں سے دلچسپ بنانے کی کوشش کی ہے۔ زبان میں البتہ پرانا پن موجود ہے۔ دکیل کے

ذاتی اخلاق کی بحث میں ایک جگہ لکھتے ہیں :۔

خودی اور طمع سے ہمیشہ وکیل کو سخت پرہیز کرنا چاہیے ..... خودی یا غرور ایسی بُری چیز ہے کہ جس شخص میں یہ ہوتی ہے وہ اپنے آپ پر نامناسب اور بیجا طور پر فخر اور ناز کرتا ہے، اگر بالعموم لوگ اس کو ناپسند کرتے ہیں اور اپنے دل میں کچھ اس کی وقعت نہیں سمجھتے ہیں..... طمع ایسی بُری شے ہے کہ یہ انسان کی طبیعت سے نیکی اور بالعموم عمدہ اور پسندیدہ صفات کی بیخ کنی کرتی ہے.... ایک مشہور مصنف فارسی نے کیا خوب کہا ہے۔

مصرعہ "طمع را سہ حرف است وہر سہ تہی" یعنی طمع کے تین حروف ہیں، اور تینوں خالی ہیں۔ اور ایک انگریزی مصنف نے طمع کے مندر کا ذکر کیا ہے اور مندر کا طمع کو دیوتا قرار دیا ہے، اور طمع کی صورت اور اس کے تعلقات[1] کا فوٹو اس طرح پر کھینچا ہے کہ اندر مندر کے طمع کا دیوتا بیٹھا تھا اور اس کی غلیظ[2] لمبی داڑھی تھی، اور ضعیفہ چہرہ بھوک کا مارا ہوا تھا، اور اس کے چاروں طرف روپیوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ اور اس کے دو مصاحب یعنی داہنی طرف ظلم صاحب اور بائیں طرف بخل صاحب تشریف رکھتے تھے اور پانچ چھ افسران منتظم میاں بے ایمانی اور رشوت ستانی اور استحصال بالجبر اور فریب وغیرہ تھے، اور وہاں بہت سے بڈھے اشخاص قریب المرگ[3] روپیوں کی

[1] تعلقات کا لفظ متعلقات کی جگہ ہے۔ [2] غلیظ سے مراد "گھنی"۔ یہ استعمال درست ہے اگرچہ ہندوستان میں رائج نہیں ہے۔ غلیظ کے معنی سخت اور موٹے کے ہیں۔ نجس اور گندے کے نہیں ہیں۔ قرآن مجید میں ہے۔ مِیثَاقًا غَلِیظًا (یعنی سخت اور پکا عہد)

[3] قریب المرگ کی غلط ترکیب اس قدر مستعمل ہے کہ اسکو علمائے زبان دادؔ کے سوا سب ہی بولتے ہیں

تھیلیوں پر تکیہ لگائے لیٹے ہوئے تھے، اور جوں جوں ان کی حالت جانکنی کی ہوتی تھی
اتنی ہی حسرت کے ساتھ وے روپیوں کی تھیلیوں کو اپنے ہاتھوں سے جلدی پکڑ
لیتے تھے۔ مگر وے سب ایک بڑے زبردست جن سے جس کا نام افلاس ہے بہت
کانپتے تھے۔ بعد اس طور پر صورت طمع اور اور اس کے تعلقات کے بیان کرنے کے
ہمارے مصنف صاحب فرماتے ہیں کہ جس وقت اس مقام پر افلاس داخل ہوا،
سب لوگ خوف سے کانپنے لگے، مگر ہم نے آگے بڑھ کر اس سے اس طور پر التجا کی
اے افلاس تو مجکو کبھی دکھلائی نہ دینا، اگر تو بہ میری عرض قبول نہ کرے تو اس
بات کا خیال رہے کہ تیری دھمکی اور گیدڑ بھپکی سے مجھ میں کوئی بات ناشکرے
پن یا غیر منصفی کی نہ آوے ..... اور اگر دولت میرے پاس مع اپنے ہمراہیان
خودی اور طمع کے آوے تو اے افلاس تو جلدی سے آکر مجکو بچا اور اپنے ساتھ
اپنی دو بہنوں یعنی آزادی اور بے گناہی کو لا جن کی صحبت میں تو ہمیشہ
خوش رہتا ہے۔

اس دَور کے مشاہیرِ ادب

اوپر جن مُصنفوں کا ذکر کیا گیا ان میں امیر مینائی کے علاوہ اور کسی کا تذکرہ کسی بڑے
چھوٹے تذکرہ و تاریخ میں نہیں ملتا۔ اس طرح کے بے شمار مصنف ہیں، لیکن یہ سب لوگ
کچھ خاص صاحب طرز نہیں ہیں۔ ان کے ساتھ سر سید کے اثر سے اور انکے رفیقوں میں
جو مصنف پیدا ہوئے، وہ اردو ادب میں خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ ان میں سے چند
مشاہیر کا ذکر کیا جاتا ہے۔

نواب محسن الملک

سید مہدی علی نام۔ میر ضامن علی کے خلف رشید۔ سادات بارہہ کے ایک شیعہ خاندان کے فرد تھے۔ اٹاوہ وطن و مولد ہے۔ یہ ان لوگوں میں تھے جو محض اپنے جوہر ذاتی سے مرتبۂ کمال پر پہنچ جاتے ہیں۔ چنانچہ دس روپیہ کی تنخواہ سے تین ہزار روپیہ ماہوار تک ترقی کی۔ اور گمنامی سے بیرون ہند تک نام پایا۔ ۱۸۳۷ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اٹاوہ میں حاصل کی پہلے کلکٹری میں ملازم ہوئے۔ مسٹر ہیوم کلکٹر تھے (جو انڈین نیشنل کانگرس کے محرک و بانی تھے) انھوں نے ان کے جوہر پہچانے اور اہلمد کر دیا۔ پھر غدر کے بعد پیشکار اور سررشتہ دار بنا دیا۔ ۱۸۶۱ء میں تحصیلدار ہو گئے۔ تحصیلداری کے زمانے میں انھوں نے اردو میں دو کتابیں لکھیں "قانون مال" اور "قانون فوجداری" اسی زمانے میں انھوں نے اپنے شیعہ سے سنّی ہونے کا اعلان کیا۔ اور اس کے بعد ان اختلافات عقائد کے متعلق ایک کتاب آیاتِ بینات کے نام سے لکھنی شروع کی۔ ۱۸۶۳ء میں ڈپٹی کلکٹری کے امتحان مقابلہ میں اعلیٰ کامیابی حاصل کی۔ ۱۸۶۷ء میں مرزاپور میں ڈپٹی کلکٹر مقرر ہوئے۔ ان فرائض کے ساتھ بعض ریاستوں کا انتظام و مشورہ بھی ان کے سپرد رہا۔ حیدرآباد کے وزیر اعظم سر سالار جنگ نے شہرت سُنی، پھر اتفاق سے کلکتہ جاتے ہوئے مرزاپور میں وزیر کی ان سے ملاقات بھی ہو گئی۔ سر سالار جنگ نے ۱۸۷۴ء میں ان کی خدمات حیدرآباد کے لئے لے لیں۔ وہاں اول بارہ سو روپیہ ماہوار تنخواہ پر ناظم بندوبست اور انسپکٹر جنرل صیغۂ مال مقرر ہوئے۔ پھر چند روز میں پندرہ سو روپیہ تنخواہ ہو گئی اور کمشنر بندوبست ہو گئے۔ اور نواب منیر نواز جنگ بہادر کا خطاب ملا۔ ۱۸۷۶ء میں ریونیو سکرٹری (اعلیٰ معتمد مال) ہوئے۔ ۱۸۸۳ء میں سر سالار جنگ کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد فینانشل اور پولٹیکل سکرٹری بنائے گئے۔ سہ ہزاری منصب اور تین ہزار روپیہ ماہوار تنخواہ مقرر ہوئی اور خطاب میں محسن الدولہ

محسن الملک کا اضافہ ہوا۔ اس کے بعد ریاست کے معدنیات کے متعلق کچھ معاملات حکومت اعلیٰ اور پارلیمنٹ سے طے کرنے کے لئے انگلستان بھیجے گئے محسن الملک نے یہ خدمت نہایت حسن وخوبی اور کامیابی کے ساتھ انجام دی اور وہاں کے مشاہیر سے بھی ملے۔ جن میں سے وزیر اعظم برطانیہ مسٹر گلیڈ اسٹن سے خاص تعلقات قائم ہو گئے کہ بعد کو بھی رسم مراسلت جاری رہی۔

آخر بیس سال ریاست کی خدمت نیک نامی سے انجام دینے کے بعد آٹھ سو روپیہ ماہوار پنشن پر رخصت ہوئے۔ سرسید سے تعلقات قائم ہو چکے تھے۔ شروع میں تو سرسید کے مذہبی عقائد اور آزاد خیالی سے بہت بیزار تھے۔ لیکن ملازمت مرزاپور کے زمانے میں سرسید کو قریب سے دیکھا اور سمجھا تو پھر محسن الملک سے زیادہ سرسید کا عاشق کوئی نہ تھا۔ چنانچہ حیدر آباد سے آکر سرسید کے ساتھ علی گڑھ میں قیام کیا، اور باقی زندگی قومی خدمت کے لئے وقف کر دی۔ سرسید کے انتقال (۱۸۹۸ء) کے بعد سرسید کی وصیت وتمنا کے مطابق ان کے صاحبزادہ سید محمود علی گڑھ کالج کے سکرٹری ہوئے۔ پھر ۳۱ جنوری ۱۸۹۹ء کو محسن الملک سکرٹری منتخب ہو گئے۔ ۱۶ اکتوبر ۱۹۰۷ء/۱۳۲۵ھ کو شملہ میں انتقال کیا۔ وہاں سے علی گڑھ لاکر سرسید کے قریب دفن کئے گئے۔[۱]

---

[۱] خاکسار مؤلف نے آیۂ کریمہ سے تاریخ وفات کہی "اُولٰئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ يُرْزَقُوْنَ فِيْهَا۔ (سورہ مومن۔ رکوع ۵۔ پارہ ۲۴) ۱۳۲۵ھ نکلتے ہیں۔ وہ زمانہ میری طالب علمی کا تھا۔ میں نے نواب صاحب کا ایک مرثیہ بھی بصورت ترکیب بند اُسی وقت لکھا تھا اسکے چند شعر یہ ہیں

تیرگی ملک پہ چھائی ہے سیہ بختی کی　　　قوم کا ڈوب گیا آج ستارا افسوس

(باقی حاشیہ صفحہ ۴۱۶ پر)

جس وقت کالج کا انتظام نواب محسن الملک کے ہاتھ میں آیا، کالج کی حالت بہت نازک تھی۔ سرسید کے آخری دنوں میں ایک لاکھ روپیہ کا غبن ہو جانے کے سبب سے کالج پر قرضہ کا بار گراں آپڑا تھا۔ اس کے علاوہ اب تک کالج پر ملک و قوم کو پورا اعتماد نہ تھا۔ نواب محسن الملک نے اپنے خلوص، ہمت، کوشش اور اثر سے چند سال میں تمام مشکلیں حل کر دیں، اتنا چندہ جمع ہو گیا کہ تمام قرضہ ادا کر دیا گیا۔ کثرت سے طلبا داخل ہونے لگے، اور اعتماد قائم ہو گیا۔ نواب صاحب کی تقریر نہایت پُرجوش اور مؤثر ہوتی تھی۔ ان کے خلوص کا خاص طور پر اثر پڑتا تھا۔ اور ان کی تدبیریں نہایت کارگر ہوتی تھیں نواب صاحب نے سرسید کی زندگی میں اور ان کے بعد اپنی جیب سے ہزار ہا روپیہ چندوں میں دئے۔ جب لندن میں سرسید کو روپیہ کی سخت ضرورت پیش آئی تو نواب محسن الملک نے اپنی ایک مہینے کی پوری تنخواہ بھیج دی۔

نواب محسن الملک نے کثرت سے کتابیں تصنیف نہیں کیں۔ وہ قانونی کتابوں

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۱۵)

اور کیا اس سے سوا ہوگی تباہی اے قوم — محسن الملک کریں تجھ سے کنارا افسوس

ان سے وابستہ تھیں امیدیں ہزاروں اپنی — قوم کا ٹوٹ گیا آج سہارا افسوس

مولانا حالی نے اس موقع پر نہایت دردناک قطعہ کہا تھا اور دسمبر ۱۹۰۷ء میں کانفرنس کے اجلاس کراچی میں (جس کے خود مولانا حالی پریسیڈنٹ تھے) سنایا تھا۔ اس کے چند شعر یہ ہیں:-

وہ ملک کا محسن، وہ مسلمانوں کا غمخوار — سر کر کے مہم، قوم کے کام آگیا آخر

سید کا بدل قوم کو مشکل سے ملا تھا — اس کو بھی وہی قوم کا غم کھا گیا آخر

یوں جیتے ہیں یوں مرتے ہیں قوموں کے فدائی — دنیا کو تماشا یہ، وہ دکھلا گیا آخر

مہدی کے لئے قوم عزادار ہے ساری — کہرام ہے کشمیر سے تا راس کماری

(مؤلف)

(جن کا پہلے نام لیا گیا ہے) اور دو تین مذہبی کتابوں کے علاوہ انکی یادگار ادبی ان کے مضامینِ تہذیب الاخلاق اور لکچر اور خطوط ہیں، لیکن ان میں ایک خاص شانِ ادب پائی جاتی ہے۔ جوش و خلوص ان کی ہر تحریر کے نمایاں عنصر ہیں۔ طرزِ تحریر نہایت صاف، مدلّل اور موثر ہے۔ بعض مضامین خالص ادبیانہ رنگ اور شاعرانہ تخئیل کے ساتھ لکھے ہیں۔ زبان و بیان میں کچھ قدامت کا اثر ضرور ہے۔ بعض تحریروں کے نمونے پیش کئے جاتے ہیں:۔

(۱) آیات بینات: خالص مذہبی کتاب ہے۔ سب سے پہلے اس کی پہلی جلد ۱۸۷۰ء میں مرزا پور کے مشن پریس میں ٹائپ میں چھپی۔ پھر لیتھو کے مطبع میں بھی چھاپی گئی۔ اس کی تحریر کا سلسلہ جاری تھا کہ نواب صاحب کے تعلقات سرسید سے قائم ہو گئے وہ خدمت قومی کی طرف متوجہ ہو گئے۔ آیات بینات کا موضوع اس مسلک کے خلاف تھا اس لئے تین جلدیں لکھ کر اس کو ناتمام چھوڑ دیا۔ اس کتاب میں نواب محسن الملک نے فرقۂ مخالف کے تمام عقائد و اعمال سے طویل بحث کی ہے۔ اور مدلّل تردید کی ہے۔ وہی حصے قابل نقل و اقتباس ہیں، لیکن ان کو مصلحتہً چھوڑ کر دیباچہ سے چند سطریں بطور نمونۂ عبارت درج کی جاتی ہیں:۔

"پس ہم لوگوں کو فقط اسلام کے نام پر خوش ہونا اور صرف توحید اور نبوت کے اقرار پر اپنے کو ناجی سمجھنا نہ چاہئے۔ بلکہ ہر عقیدے کی تحقیق کرنا اور ہر اعتقادی مسئلے کی تطبیق کتاب اللہ اور کتاب الرسول سے دینا ضرور ہے۔ اور یہ ممکن نہیں کہ جو شخص اپنے سچے اور صاف دل سے صرف اپنی نجات کی امید پر خدا کی کتاب کو دیکھے اور تعصب اور عناد کو دخل نہ دے، وہ حق اور باطل میں تمیز نہ کر سکے اور ایسے حق کے طالب کو خدا گمراہی میں پڑا رکھے۔ ہاں جو کوئی پہلے سے سچائی کا طالب نہ ہو اور مذہبی تعصب میں گرفتار ہو، اور سوائے مجادلے اور مکابر

کے اسے کچھ منظور نہ ہو اور اپنے آبائی دین و مذہب کو تقلیداً سچ جانتا ہو، وہ
بے شک اپنی گمراہی میں پڑا رہے گا، اور اپنے دل کو باطل عقیدوں سے
کبھی پاک و صاف نہ کر سکے گا۔"

(۲) مضامین تہذیب الاخلاق۔ یہ مضامین نواب محسن الملک کا ادبی کارنامہ ہیں۔ سر سید نے ۱۸۷۰ء میں رسالہ تہذیب اخلاق جاری کیا اس میں نواب صاحب نے بھی مذہبی، اخلاقی، تعلیمی، تاریخی اصلاحی مضامین لکھے جن کا مجموعہ بعد کو شائع ہو گیا ہے۔ ایک مضمون تمثیلی رنگ میں بہت دلچسپ لکھا ہے۔ اس قسم کی طرز نگارش کا ذکر سر سید کے مضامین کے سلسلے میں آچکا ہے۔ نواب محسن الملک کے مضمون (موجودہ تعلیم و تربیت کی شبیہ) کے مختلف اقتباسات انہی کے الفاظ میں مسلسل کیے جاتے ہیں:۔

موجودہ تعلیم و تربیت کی شبیہ۔ ایک روز خیال نے مجھے عالم مثال تک پہنچایا
اور اس طلسم کدے کو جہاں سب چیزوں کی شبیہ اور تمام حالتوں کی تصویر
مصور قدرت نے کھینچ رکھی ہے، دکھایا، درحقیقت میں نے اسے ویسا ہی پایا
جیسا سنا کرتا تھا۔ بلا شبہ وہ ہماری حالتوں کا آئینہ اور ہمارے خیالوں کی
تصویر کا مرقع ہے۔

جب میں اس طلسم خانہ کی مغربی جانب پہنچا تو ایک چار دیواری دیکھی جو میرے
خیال سے بھی زیادہ مضبوط تھی ..... میں نے وہاں ایک رفیق پایا جس کا نام
خرد تھا اس سے حقیقت اس کی پوچھی تو اس نے کہا کہ اس کے اندر ایک ایسا
پر فضا باغ ہے جسے جنت عدن بھی دیکھے تو شرمندہ ہو..... میں چندے اس
باغ میں رہا، پر مجھ کو اپنی صورت کا کوئی رفیق نہیں ملا جس سے دل بہلاتا
..... آخر بعد چند سال کے مشرق کی طرف مجھے ایک چار دیواری نظر پڑی

جس کی صورت بھی ویسی ہی تھی اور چشمہ بھی ویسا ہی تھا جہاں سے میں نکلا
تھا مگر دروازہ کھلا ہوا اور دیوار شکستہ...... میں نے اپنے رہنما سے پوچھا
...... اس نے کہا یہ وہ باغ نہیں ہے، دوسرا ہے۔ پہلے اسی باغ کی طرح
آراستہ تھا، خزاں کی ہوا نے اس کو سکھا دیا اور زمانے کے انقلاب نے پامال
کر دیا...... جب میں نے ان چشموں کا حال پوچھا تو خرد نے تحقیق نامی رفیق
کو میرے ساتھ کر دیا...... اس کے ساتھ میں ان دونوں چشموں کی حقیقت
دریافت کرنے چلا...... تب تاریخ نامی ایک روشن ضمیر ملا اس نے کہا کہ
ہزار برس ہوتے ہیں تب میں اس باغ میں آیا تھا۔ نہایت تر و تازہ سبز و شاداب
تھا جیسا وہ باغ جو تم نے اول دیکھا ہے۔ اس باغ کی نہروں میں صاف
چشمہ کا پانی آتا تھا، اور گندے چشمے پر پتھر رکھا ہوا تھا۔ مگر سرکتے سرکتے اب
وہ چشمہ پر آگیا ہے۔ تب تو میں نے خیال کیا، اس پتھر کو ہٹا دوں۔ چنانچہ میں ہمت
کو ساتھ لیکر چلا، مگر چند خونخوار وحشی درندوں نے مجھ پر حملہ کیا، اور پتھر سرکانے پر
مجھ کو موت کا خوف دلایا۔ میں جان بچا کر ہٹا...... میں نے چاہا کہ اس خیال کو
چھوڑ دوں اور یہ پتھر جیسا ہے ویسا ہی رہنے دوں، پر استقلال نامی ایک رجز
خواں نے میرا دل بڑھایا، اور مجھے ایک تدبیر بتائی۔ اس نے کہا، میں نے ایمان نامی
فقیر سے سُنا ہے کہ اس چشمے کا ایک کھودنے والا ہے: وہ سب مشکل حل کر سکتا ہے
مگر بڑی مشکل سے انسان کی رسائی اس تک ہو سکتی ہے۔ اس کی راہ میں اوّل تو
مصیبت کا ایک بڑا میدان لق و دق ملتا ہے جس میں سوائے آنکھ کے پانی کے
پینے کو بھی کچھ نہیں، اگر اس سے بچ گئے تو رسوائی اور بدنامی کے سات سمندر ملتے
ہیں، جہاں صبر کی ٹوٹی پھوٹی کشتی کے سوا عبور کا کوئی ذریعہ نہیں، تب دروازہ
اس کا ملتا ہے جہاں اخلاص کی نذر پیش کرنی پڑتی ہے۔ اور دعا کے پاک صاف

ہاتھوں کے ذریعے سے پہنچائی جاتی ہے۔ تب وہ نذر قبول ہوتی ہے اور اجابت کا خلعت ملتا ہے..... پس اگر تم کو اس پتھر کے سرکانے کی خواہش ہے تو وہاں تک جاؤ۔ اگر اس تک تمہاری رسائی ہوئی اور اس نے تمہاری نذر لے لی تو وہ اقبال کو تمہارے ساتھ کرے گا۔ جب تم اس کو لوگوں کے سامنے لاؤ گے، سب کی آنکھیں کھل جائیں گی جو اب بند ہو رہی ہیں۔ تب وہ اپنے سوکھے ہوئے باغ کو دیکھ کر تعجب کریں گے اور تمہارے ساتھ پتھر سرکانے پر مستعد ہوں گے......

جب میں عالم مثال سے لوٹا اور لوگوں سے قصہ کہا تو وہ سب ایک ایک لفظ کی حقیقت مجھ سے پوچھنے لگے۔ میں صرف یہ کہکر "جو باغ ہرا بھرا میں نے مغرب میں دیکھا وہ علوم و فنون جدیدہ کا باغ ہے، جسکے پھل پھول ہم اپنی آنکھ سے دیکھتے ہیں، پر ہمارا دل بہلانے والا وہاں کوئی نہیں ہے، اور جو باغ خشک میں نے مشرق میں دیکھا وہ ہمارے ہی علوم قدیمہ کا باغ ہے، جس کی ویرانی اور خزاں کی کیفیت ہمارے سامنے ہے۔ وہ پتھر جو سرچشمہ پر آگیا ہے جہالت ہے۔ وہ ندی نالے گندے پانی کے رسم و رواج کی پابندی، نیکی نما تعصب، علم نما نادانی، جھوٹا زہد، جھوٹی شیخی، جاہلانہ تقریر، عامیانہ غلامی، ضرر انگیز حرارت، وحشیانہ تعلیم و تربیت ہے جس کا نتیجہ مسخ انسانیت ہے جو اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں، اور جس کا علاج اب ہم سوائے دعا کے کچھ نہیں پاتے"! چپ ہو رہا۔

(۳) مسلمانوں کی تہذیب، نواب صاحب کا اصلاحی و اخلاقی مضمون ہے اس کا موضوع پہلے ہی فقرے میں بیان کرتے ہیں :۔ "میرا یہ مضمون مسلمانوں کی تہذیب پر ہے کہ وہ پہلے کیسی تھی اور اب کیسی ہے اور آئندہ کیسی ہوگی"۔ بڑی تحقیق کے ساتھ لکھا ہے۔ قدیم مسلمانوں کی مکمل تہذیب کا خاکہ کھینچا ہے۔ تمام علوم و فنون میں مسلمانوں اور عربوں کی ادبیات اور کارنامے بیان کئے ہیں۔ اور پھر مسلمانان ہند کی موجودہ

حالت کو بیان کرتے وقت اُن ہی علوم و فنون میں سے ایک ایک کی حالت الگ الگ لکھتے ہیں۔ اور اس میں ظریفانہ پیرایہ اختیار کرتے ہیں۔ نواب محسن الملک کی تحریر کا مزاحی پہلو عام طور پر معلوم و مشہور نہیں ہے۔ اس لئے کہ یہ رنگ کم اور ہلکا ہے۔ لیکن جہاں ہے، دلچسپ ہے۔ ان فقروں کو دیکھئے۔

طبیعات جاننے والا مسلمانوں میں کوئی نہیں رہا۔ ہاں چند مسائل کا بیان اس زمانے کے عالم اس طرح پر کرتے ہیں کہ عناصر چار ہیں، خاک، باد، آب، آتش۔ یہ چاروں بسیط ہیں۔ خاک کے اوپر آب اور آب کے اوپر باد اور باد کے اوپر آگ ہے اور وہ بہت بڑا ناری کرہ ہے۔ آسمان کی حرکت سے مشتعل رہتا ہے، مگر چونکہ قطبین کی طرف حرکت کم ہے، اس لئے وہاں مشتعل بھی کم ہے۔ اور اس سبب سے اس کی شکل اہلیلجی ہو گئی ہے۔ جب شاگرد پوچھتا ہے کہ اہلیلجی کی کیا شکل ہے تو استاد اپنی سرمہ دانی نکال کر دکھلاتے ہیں کہ ایسی بیچ سے موٹی، دونوں طرف سے پتلی۔ پس اس زمانے میں عالموں کی یہ طبیعات رہ گئی ہے جس پر ہر کوئی ہنستا ہے۔"

"ہندسہ و حساب کچھ باقی ہے۔ اقلیدس کا ایک مقالہ اور خلاصۃ الحساب کی تحصیل اربعہ یا جذر تک فضیلت کی پگڑی بندھوا دیتی ہے، مگر طالب علم یہ سوچتے ہیں کہ تحریر اقلیدس کے پڑھنے اور ان ٹیڑھی سیدھی شکلوں کے بنانے میں کیا فائدہ ہے۔"

"علم نباتات کی تحقیقات اعلیٰ درجہ پر پہنچ گئی ہے۔ اچھے پڑھے لکھے مسلمانوں نے لکھا ہے کہ سراندیپ میں ایک درخت ہے جس پر کلمہ لکھا ہوا ہے، نہ زمین پر اس کا پتّا گرتا ہے، نہ کوئی جانور اسے کھا سکتا ہے۔ ہمیشہ تر و تازہ رہتا ہے بڑے بڑے عالموں کا اس پر یقین ہے کہ بعضی بوٹیاں ایسی ہیں جن سے سونا

چاندی بن سکتا ہے!!

علم حیوانات میں بلا شبہ بڑی ترقی ہے۔ کیونکہ ہم اپنے ہاں کے بڑے بڑے عالموں کو تقریر کرتے سنتے ہیں کہ اگر بکری کُتّے سے بچہ پیدا ہو تو اس کا کھانا درست ہے یا نہیں"۔

شادی بیاہ کے دستور کو لکھتے ہیں:۔

"نہ مرد عورت کو دیکھنے پاتا ہے، نہ عورت مرد کو، يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ پر نکاح کا مدار آرہا ہے"۔

(۴) مسلمانوں کی ترقی اور ان کے تنزّل کے اسباب۔ یہ مضمون بہت طویل ہے مسلمانوں کی ترقیوں کو تاریخی حوالے کے ساتھ بیان کرکے انکے تنزّل کے پانچ سبب بتلائے ہیں اور تفصیلی بحث کی ہے۔ پانچواں سبب غلط مذہبی خیالات کو بتایا ہے۔ یہ حصہ بہت پرجوش لکھا ہے۔ قرآن و حدیث سے خوب خوب استدلال کیا ہے۔ آخر میں لکھتے ہیں:۔

"غرضکہ سارا قرآن اور ساری تعلیم ہمارے ہادی کی یہی ہے کہ وہ استعداد جو بدو فطرت میں خدا نے رکھی ہے، وہ کام میں لائی جاوے، اور دنیا و دین کی ساری نعمتیں حاصل کی جاویں۔ قرآن مسر ولیم کی سمجھی ہوئی وہ زنجیر نہیں ہے جس میں ہم دنیاوی ترقیات کے لئے جکڑے ہوئے ہیں، بلکہ برخلاف اسکے وہ ان بندوں کو توڑنے والے ہیں جو عیسائیت نے یا عیسائیوں نے انسانوں پر اس سے روکنے کے لئے لگائے تھے۔ غور کرو خدا کی اس جھڑکی پر جو رہبانیت اور جوگی بننے کے لئے ہے۔ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ (کس نے خدا کی وہ نعمت حرام کی جو خدا نے بندوں کے لئے پیدا کی)۔ پڑھو خدا کی یہ آیت جو دنیاوی لذتوں سے متمتع ہونے کیلئے ہے۔ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا۔

(اچھی چیزیں جو ہم نے روزی کی ہیں، کھاؤ اور اچھے کام کرو) ...... دیکھو
کیسا عام اجازت نامہ ہے خدا کا، دنیا کمانے کے لئے۔ فَانْتَشِرُوْا فِی الْاَرْضِ
وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ۔ (زمین میں پھیل جاؤ اور خدا کی روزی تلاش کرو)
پھر خدا اپنے اچھے بندوں کو کیا دعا سکھاتا ہے۔ رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً
وَّفِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً۔ (اے خدا ہم کو دنیا اور آخرت میں بھلائی دے)
یعنی دنیا اور دین دونوں کی بھلائی۔ جبکہ قرآن کے یہ احکام ہوں اور طلب
معیشت اور تجارت اور کسب حلال کے لئے صاف صاف ترغیبیں اور بشارتیں
جیسا کہ ہمارے ہادی نے طلب معیشت کے لئے فرمایا ہو۔ اِنَّ مِنَ الذُّنُوْبِ
ذُنُوْبًا لَا یُکَفِّرُهَا اِلَّا الْهَمُّ فِیْ طَلَبِ الْمَعِیْشَةِ (بعض ایسے گناہ ہیں جن کا
کفارہ صرف یہ ہے کہ معاش کی فکر میں رنج اٹھایا جائے۔ اور تجارت کیلئے ارشاد
کیا ہو کہ۔ اَلتَّاجِرُ الصَّدُوْقُ یُحْشَرُ یَوْمَ الْقِیَامَةِ مَعَ الصِّدِّیْقِیْنَ وَالشُّهَدَاءِ
(سچا سوداگر قیامت کے دن صدیقوں اور شہیدوں کے ساتھ اٹھے گا) اور
طلب دنیا کے لئے صاف صاف لفظوں میں یہ خوشخبری سنائی ہو کہ
مَنْ طَلَبَ الدُّنْیَا حَلَالًا تَعَفُّفًا عَنِ الْمَسْئَلَةِ وَسَعْیًا عَلٰی عِیَالِهٖ وَتَعَطُّفًا
عَلٰی جَارِهٖ لَقِیَ اللّٰهَ وَجْهُهٗ کَالْقَمَرِ لَیْلَةَ الْبَدْرِ (جو شخص دنیا کو
بطریق حلال تلاش کرتا ہے اور جس کا مقصد سوال کرنے سے بچنا اور آل
اولاد کے لئے کوشش اور ہمسایہ پر مہربانی کرنا ہوتا ہے اس کا منہ خدا کی
ملاقات کے وقت چودھویں رات کے چاند کا سا ہوگا) تو کیا ایسا مذہب
دنیاوی خوشیوں کے حاصل کرنے کے لئے انسان کے پاؤں کی زنجیر ہے؟
ہرگز نہیں، بلکہ وہ ان کے لئے خط آزادی ہے"

(۵) ایک کھلا خط نواب محسن الملک نے ۱۰ اکتوبر ۱۸۹۶ء کو بمبئی سے

ایک خط سر سید کے نام لکھا ہے، جس میں ایجوکیشنل کانفرنس کی اصلاح و ترقی کے لئے چھ تجویزیں پیش کی ہیں، اور سر سید سے درخواست کی ہے کہ اس خط کو کانفرنس کے دوسرے اجلاس (منعقدہ ۲۹ دسمبر ۱۸۸۷ء بمقام لکھنؤ) کے منظور شدہ نوین رزولیوشن اور اس کی تائیدی تقریروں کے ساتھ شائع کر دیا جائے۔ چنانچہ اسی طرح بصورت کتاب چھاپا گیا ہے اس نوین تجویز کا خلاصہ یہ تھا: "ہر شہر و قصبہ میں کانگرس کے مقاصد کے لئے کمیٹیاں مقرر ہوں اور وہ کمیٹیاں مقرر کریں اور انجمن ہائے اسلامی جو بالفعل ہیں وہ اس کانگرس کے مقاصد کی تکمیل اپنے ذمہ لیں۔"

نواب صاحب کے خط کے چند فقرے یہ ہیں:۔

"...... پس باوجود ان تمام باتوں کے اس مجلس کا ترقی نہ کرنا بلکہ روز بروز اس میں تنزل ہونا ایک حیرت انگیز معاملہ ہے مگر میرے نزدیک کوئی اور بڑا قوی سبب اس کا سوائے اس کے نہیں ہے کہ وقت سے پیشتر مجلس کے مقام اور مجلس کی کارروائی سے لوگوں کو اطلاع نہیں ہوتی۔ جب بہت ہی تھوڑا وقت رہ جاتا ہے۔ تب لوگوں کو اطلاع ہوتی ہے کہ فلاں مقام پر اس کا

۱؎ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس ۱۸۸۶ء میں بنگالیوں کی انڈین نیشنل کانگرس کے جواب میں قائم کی گئی تھی اس لئے اسکے نام میں بھی "کانگرس" کا لفظ رکھا گیا تھا۔ اس کے بعد رفع اشتباہ کیلئے کانفرنس کا لفظ تجویز کیا گیا اور پورا نام محمڈن اینگلو اورنیٹل ایجوکیشنل کانفرنس رکھا گیا، پھر اینگلو اورینٹل کی جگہ آل انڈیا کر دیا گیا۔ پھر پہلی جنگ عظیم کے بعد بیداری ہند کے اثر سے لفظ محمڈن کی ناموزونیت محسوس ہوئی۔ یہ لفظ اہل یورپ کی ساخت اور لفظ کرسچین کی تقلید تھی، اس لئے محمڈن کی جگہ مسلم کا لفظ [illegible] بلکہ تمام تحریروں اور [illegible] ہونے لگا۔

اجلاس ہوگا، اور چونکہ دوسرے لوگ اس کی اشاعت اور اس میں شریک ہونے کیلئے ترغیب دینے کی تدبیریں نہیں کرتے اس لئے سوائے چند پرانے ارکان اور چند مدرسے کے طلبہ اور چند وزیٹر کے باہر سے نئے لوگ نہیں آتے، اور بوجہ اسکے رزولیوشن بہت کم پیش کئے جاتے ہیں اور ان پر تنگی وقت سے بحث کی نوبت نہیں آتی، لوگوں کے دل سرد ہوتے اور ان کے ولولے اور جوش ٹھنڈے پڑتے جاتے ہیں اور نظم اور قصائد نے اس مجلس کو بزم مشاعرہ بنا دیا ہے اور واہ واہ قاہ قاہ کی آواز نے اس مجلس کو بجائے قومی مجلس کے ایک دل لگی کا جلسہ کر دیا ہے۔"

(۶) تقریر نواب محسن الملک۔ کانفرنس کی تقریروں میں نواب صاحب کی آخری تقریر انیسویں اجلاس میں ۳۱ر دسمبر ۱۹۰۶ء کو ہوئی تھی۔ آیندہ اجلاس سے پہلے ان کا انتقال ہوگیا۔ یہ تقریر بہت طویل اور نہایت پُرجوش ہے۔ اس کا مختصر اقتباس یہ ہے:-

"حضرات، کانفرنس کے اب تک کامیاب نہ ہونے کا اصل سبب یہ ہے جو میں نے بیان کیا۔ رہی قوم کی حالت، اس میں بھی کسی قسم کی ترقی نظر نہیں آتی، نہ ان کی صلاح و فلاح کے آثار معلوم ہوتے ہیں۔ بلکہ روز بروز ان کا افلاس بڑھتا جاتا ہے اور ان کی قوتیں دن بدن منتشر اور ضائع ہوتی جاتی ہیں۔ اس کا سبب کچھ پوشیدہ نہیں ہے اس لئے کہ قوموں کی صلاح و فلاح دو فرقوں پر منحصر ہے اول علماء دوسرے اُمراء، مگر علماء اپنے اصلی فرائض کا خیال نہیں رکھتے اور زمانے کی رفتار اور زمانے کی ضرورتوں کو نہیں دیکھتے........ مثلاً اگر کسی عالم سے کہا جائے کہ اس زمانے میں جبکہ مسلمان مفلس اور تباہ ہو رہے ہیں اور علوم و فنون اور صنعت و حرفت سے ناواقف ہیں، ان کو علوم و فنون جدید اور سائنس کی تعلیم کی ہدایت

کیجئے، اور صنعت و حرفت سیکھنے کی ترغیب دیجئے، تو وہ یہ کہہ کر کہ سائنس اسلام کے مخالف ہے اور صنعت و حرفت دنیا داروں کا کام ہے، ہماری بات کو نہایت نفرت سے سنیں گے، اور اَلدُّنیا جِیفَۃٌ وَّطَالِبُھَا کِلَابٌ[1] کہہ کر مسلمانوں کو اور نفرت دلائیں گے۔ حالانکہ یہ باتیں اور اس قسم کی ہدایت و نصیحت اس زمانے میں اُن پر فرض کفایہ ہے اور اس کے ادا نہ کرنے سے وہ خود گنہگار ہوتے ہیں، اور ساری قوم کو عذاب میں مبتلا کر رہے ہیں۔ وہ دیکھتے ہیں کہ بوجہ ناواقفیت علوم اور نہ جاننے صنعت و حرفت کے وہ دنیا کی اور قوموں کے مقابلے میں ذلیل و خوار ہیں، مگر وہ ہرگز اس کی ہدایت نہ کریں گے، اور بجز نماز جنازہ اور دفن میت اور جواب سلام وغیرہ کے ان باتوں کو فرض کفایہ نہ سمجھیں گے۔

ہمارے زمانے کے ایک مصری عالم نے اس افسوس ناک حالت کو دیکھ کر نہایت رنج و غم سے یہ لکھا ہے کہ انہیں علما کا فرض کفایہ سے ناواقف ہونا اصلی سبب اس کا ہے کہ ساری قوم صنعت و حرفت کے فوائد سے محروم ہو گئی ہے......

اس کی تائید میں وہ عالم لکھتا ہے کہ اس وقت جو شخص مسلمانوں میں کسی صنعت کے زندہ کرنے یا آلہ کے ایجاد کرنے یا کوئی کمیٹی قائم کرنے یا صنعتی مدرسہ جاری کرنے کیلئے آمادہ ہو جائے گا، تو شریعت کے حکم کے مطابق اس نیک کام کا 'ادم قیامت تک اس پر عمل کرنے والوں کا اجر ملے گا، اور یہ شخص قوم میں اعلیٰ درجے کا مُصلح اور مُجدِّد ہو گا۔ اسے لکھ کر وہ عالم صاف صاف کہتا ہے کہ مغربی علوم میں جو قرآن مجید کے سمجھنے کا ذریعہ ہیں اور اسلامی علوم میں کچھ فرق نہیں ہے، کیونکہ وہ بقائے زندگی کا ذریعہ ہے، اور یہ روحانی زندگی قائم رکھنے کا وسیلہ ہے۔ بغیر ان

---

[1] دُنیا مُردار ہے اور اس کے طالب سگ مردار خوار۔

دونوں کے اسلام اور ایمان کی تکمیل نہیں ہو سکتی۔

حضرات! کتنے ایسے عالم اس وقت ہم میں ہیں جو ان باتوں کو سن کر غصے میں نہ آویں گے، اور ان باتوں کو نیچریانہ کلام سمجھ کر اس سے متنفر نہ ہوں گے اور یہ سن کر کہ صنعت و حرفت کا سکھانا اور اس کی ہدایت کرنا اصل عبادت ہے، کہنے والے کو نیچری اور کافر نہ کہیں گے۔ جب کہ ہادیان طریقت کا یہ حال ہو اور وہ خود سیدھی راہ سے بھٹکے ہوئے ہوں، تو قوم اور اُمت کیونکر منزل مقصود پر پہنچ سکتی ہے؟"

نواب وقارالملک

مشتاق حسین[1] نام۔ امروہہ (ضلع مراد آباد) کے رہنے والے۔ ۱۸۳۹ء ۱۲۵۷ھ میں پیدا ہوئے، والد کا نام شیخ تفضل حسین ہے۔ ان کے اجداد میں ایک بزرگ دیوان عبدالمومن خاں تھے جو شاہجہاں بادشاہ کے عہد میں دیوان تن کے عہدے پر ممتاز تھے۔ یہ عہدہ وزارت سے کم نہ تھا۔ شاہی بجٹ اور منصب و جاگیر کی عطا و ترقی اسی عہدے سے متعلق تھی۔ نواب صاحب کنبوہ خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ والد کا انتقال ان کی شیر خوارگی کے زمانے میں ہو گیا تھا۔ والدہ نے

---

[1] مرزا محمد عسکری صاحب لکھنوی بی اے نے اپنے ترجمہ تاریخ ادب اردو میں نواب وقارالملک کو خلافت علی گڑھ کا خلیفۂ ثانی لکھا ہے۔ اس تشبیہ کا ایسی کتاب میں جس کا مناظرہ و مظاہرۂ مذہبی سے تعلق نہیں، کوئی محل نہ تھا خاص کر جبکہ ترتیب صحیح کی بنا پر غلط بھی ہے۔ یعنی علی گڑھ کالج کے سکرٹریوں میں نواب وقارالملک کا چوتھا نمبر ہے۔ یاد رہے کہ سر سید کے بعد سید محمود باقاعدہ سکرٹری ہوئے تھے اگرچہ چند روز کے بعد ہی ان کو دست کش ہونا پڑا۔ اس لئے سید محمود کو شمار سے حذف نہیں کر سکتے۔

تربیت کی۔ رسمی تعلیم سے فارغ ہو کر سب سے پہلے اسی سرکاری مدرسے میں جہاں خود تعلیم حاصل کی تھی ۱۸۵۹ء میں ملازم ہوئے۔ ۱۸۶۰ء میں سخت قحط پڑا۔ جا بجا محتاج خانے قائم ہوئے۔ امروہہ کے محتاج خانے کا انتظام ان کے سپرد ہوا۔ اس کے بعد عدالت صدر الصدور علی گڑھ میں سررشتہ دار اور پھر منصرم ہوئے ۱۸۶۳ء میں تحصیلداری کا امتحان پاس کر کے نائب تحصیلدار ہوئے۔ گورنمنٹ نے علی گڑھ کی میونسپلٹی کا ممبر بھی مقرر کر دیا۔ ۱۸۶۴ء میں سرسید کے ساتھ گورکھپور، بستی وغیرہ کے قحط کا انتظام کیا۔

نواب صاحب سرکاری ملازمت کے علاوہ سرسید کے ساتھ قومی کام بھی کرتے رہے۔ ۱۸۶۶ء میں سائنٹفک سوسائٹی کے ممبر منتخب ہوئے۔ ۱۸۶۷ء میں ایک مدرسہ مفید الخلائق جاری کیا۔ ۱۸۶۹ء میں سررشتۂ تعلیم کے ممبر ہوئے اور مدارس ضلع کے نگراں رہے اسی سال نواب صاحب نے بطور خود چندہ جمع کر کے ایک یونانی شفاخانہ اور دوا خانہ جاری کرایا۔ ۱۸۷۰ء میں تہذیب الاخلاق جاری ہوا تو اس میں مضامین لکھے اور اکثر لکھتے رہے۔ ۱۸۷۱ء میں جب سرسید نے کمیٹی خواستگار تعلیم مسلمانان کی طرف سے ایک مضمون لکھوانے کا اعلان کیا (جس کا ذکر سرسید کے حال میں ص ۳۰۷ پر آچکا ہے) تو نواب وقار الملک نے بھی مضمون لکھا اور اس پر دوسرے نمبر کا انعام دیا گیا۔ سوسائٹی اور اس کے پریس اور تہذیب الاخلاق کا انتظام بھی نواب صاحب کے سپرد تھا۔

۱۸۷۴ء میں حیدر آباد کے مدار المہام سر سالار جنگ اوّل کو سلطنت دکن کے انتظام کے لئے بہترین مدبروں کی تلاش ہوئی۔ سرسید سے بھی مشورہ کیا۔ انہی کی سفارش سے نواب محسن الملک کے بعد نواب وقار الملک بھی حیدر آباد گئے۔ اس سے پہلے یہ واقعہ پیش آیا کہ نواب وقار الملک نماز کے نہایت پابند تھے۔ کچہری میں جب ظہر کی نماز کا وقت آتا، اٹھ کر نماز پڑھنے چلے جاتے۔ علی گڑھ میں جب یہ صورت پیش آئی

تومسٹر کالون کلکٹر نے رد کیا۔ نواب صاحب نے نہ مانا، کلکٹر نے ضد کی۔ انھوں نے استعفا دیدیا لیکن اس قصور پر برخاست کرنا مصلحت کے خلاف تھا، چھ مہینے کی رخصت دیدی اس عرصے میں اللہ تعالیٰ نے رزق کا دوسرا دروازہ کھول دیا۔ ۱۸۷۵ء کے شروع میں نواب صاحب حیدر آباد بلالئے گئے۔

نواب وقار الملک دو مرتبہ حیدر آباد گئے پہلی بار ۱۸۷۵ء سے ۱۸۷۹ء تک رہے حیدر آباد میں مدار المہام (سر سالار جنگ) صدر المہام (سر آسماں جاہ) امیر کبیر (نواب رشید الدین خاں) اور ریزیڈنٹ (سر رچرڈ میڈ) کے باہم تعلقات خوشگوار نہ تھے، اور نواب صاحب کو انہی افسروں سے سابقہ پڑتا تھا۔ نواب صاحب دیانت، فرض شناسی اور اخلاقی جرأت میں ایسا مضبوط کیرکٹر رکھتے تھے کہ دنیا کی کوئی طاقت انکو مرعوب نہ کر سکتی تھی۔ ایک مرتبہ سر سالار جنگ نے چاہا کہ نواب صاحب اپنی اصلی رائے کے خلاف سر آسماں جاہ کے سامنے رائے ظاہر کریں۔ نواب صاحب نے انکار کر دیا۔ سر سالار جنگ اس پر ناخوش ہو گئے، نواب صاحب نے فوراً استعفا بھیج دیا اور لکھ دیا کہ میں کل ہی اپنے وطن جانا چاہتا ہوں۔ لیکن جیسے نواب وقار الملک متدین اور راستباز تھے ایسے ہی سر سالار جنگ فراخدل اور قدر شناس تھے۔ استعفا دیکھ کر نواب صاحب کو بلایا صاف طور پر اپنی غلطی کا اعتراف کر لیا کہ بیشک مجھے کوئی حق نہ تھا کہ غلط بیانی پر مجبور کرتا۔ اس ملاقات میں دونوں پر رقت کا عالم طاری تھا۔ نواب صاحب نے استعفا واپس لے لیا لیکن امیر کبیر اور ریزیڈنٹ نواب صاحب کے مخالف تھے، انھوں نے کچھ عرصہ بعد موقع پا کر سر سالار جنگ پر زور ڈالا کہ اگر مولوی مشتاق حسین برخاست نہ کئے گئے تو ہماری آپ کی دوستی میں فرق آجائے گا۔ نواب صاحب اُس وقت رخصت پر وطن آئے ہوتے تھے، ان کو اس بات کا علم ہوا تو فوراً سر سالار جنگ کو لکھا کہ میں نہیں چاہتا کہ میرے سبب سے آپ لوگوں میں نااتفاقی ہو اور ریاست کے

کاروبار میں خلل آتے، آپ بے تامل مجھے خدمت سے سبکدوش کر دیجئے میں خوش ہوں گا کہ یہ بھی مجھ سے اپنی سرکار کی ایک عمدہ خدمت ادا ہو گی۔ چنانچہ نواب صاحب کو علیحدہ کر دیا گیا، لیکن سر سالار جنگ نے سیکرٹ سروس فنڈ سے چار سو روپیہ ماہوار مقرر کر دیا۔ اور نواب وقار الملک علی گڑھ میں بیٹھے ہوئے سرکار نظام کی خدمت انجام دینے لگے۔ اس عرصے میں قانون مال گذاری مرتب کیا اور دفتروں کے قواعد و ضوابط بنائے۔

ساڑھے تین سال کے بعد جب امیر کبیر کا انتقال ہو گیا اور سر رچرڈ میڈ ریزیڈنٹ چلے گئے تو سر سالار جنگ نے نواب صاحب کو پھر بلا لیا۔ اس موقع پر سر سالار جنگ نے اپنے قلم سے خط لکھا (مرقومہ ۲۰ رجمادی الاول ۱۲۹۹ھ مطابق ۱۸۸۲ء) فارسی میں خط ہے نواب صاحب کو "عدالت پناہ" القاب لکھا ہے۔ نواب صاحب فوراً چلے گئے اور پھر دس بارہ سال خدمت کر کے سات سو روپیہ ماہوار پنشن پر واپس آئے۔

نواب وقار الملک نے حیدر آباد میں فلاح ملک، اصلاح سلطنت اور استحکام سیاست کے سلسلے میں جو عظیم الشان خدمات انجام دیں وہ نواب محسن الملک کی شاندار خدمات سے کم نہ تھیں۔ کسی دوسرے ہندوستانی کا توان سے مقابلہ ہی نہیں ہو سکتا۔ ان خدمتوں کے صلے میں اعلیحضرت نظام الملک آصف جاہ سادس میر محبوب علی خاں بہادر (مرحوم) نے نواب صاحب کو ۱۸۹۰ء ۱۳۰۸ھ میں "وقار الدولہ وقار الملک" کے خطابات عطا کئے۔ پھر حکومت ہند کی طرف سے بھی "نواب" کا خطاب ملا۔ لارڈ منٹو نے اپنے ہاتھ سے سند دی۔

نواب صاحب حیدر آباد میں سر سید کے قومی کاموں میں اعانت اور خاص کر علی گڑھ کالج کے استحکام میں امداد کرتے رہے۔ ہزاروں روپے اپنے پاس سے دئے جب ان کی تنخواہ میں اضافہ ہوتا تھا تو پہلے مہینے کا اضافہ سر سید کو بھیج دیتے تھے۔

جب سر سید ۱۸۹۱ء میں حیدر آباد گئے تو ان کے ساتھ دورہ کر کے وہاں کے امیروں سے چندہ دلوانے کے علاوہ ڈیڑھ ہزار روپیہ اپنی طرف سے بتقریب دورہ و دعوت پیش کیا۔ حیدرآباد سے آکر ہمہ تن کالج کی خدمت میں مصروف ہو گئے۔ کالج کی کوئی عمارت، کوئی شعبہ، کوئی مصرف ایسا نہ تھا جس میں نواب وقار الملک کی مالی مدد شامل نہ ہو۔

اسی طرح انتظامی معاملات نہایت خلوص و صداقت کے ساتھ انجام دیئے نواب صاحب حق گوئی میں اس قدر بے خوف تھے کہ سر سید کا احترام و محبت بھی انکو اپنی سچی رائے کے اظہار سے باز نہ رکھ سکتے تھے۔ چنانچہ جب ۱۸۸۹ء میں سر سید نے اپنے بعد سید محمود کو سکرٹری مقرر کرنے کی تجویز پیش کی تو نواب صاحب نے شدید مخالفت کی یہاں تک کہ سر سید کے دل میں انکی طرف سے کشیدگی پیدا ہو گئی لیکن نواب صاحب کا دل ویسا ہی صاف رہا، اور سر سید کی وہی محبت قائم رہی۔ آخر جب یہ تجویز منظور ہو گئی تو نواب صاحب نے بھی کثرت رائے کے فیصلہ کو تسلیم کر لیا۔ اور پھر جب سر سید کے انتقال کے بعد سید محمود سکرٹری ہوئے اور چند روز ہی میں انکی مخالفت اور انکی معزولی کی کوشش ہر طرف سے ہونے لگی: تو نواب وقار الملک پہلے شخص تھے جنھوں نے اُس فیصلے کے احترام کو پیش نظر رکھا اور خود سید محمود کے اصلاحِ حال و خیال کی کوشش کی تاکہ وہ سکرٹری کے عہدے پر قائم رہ سکیں۔

نواب محسن الملک کے سکرٹری ہونے پر ان کے دست و بازو بن کر کام کیا ۱۹۰۳ء میں حرمین شریفین کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کے قیام کی سرگرم کوشش کی اور اس کے پہلے سکرٹری منتخب ہوئے۔ لیکن جب نواب محسن الملک کے بعد کالج کے سکرٹری ہوئے تو مسلم لیگ کا عہدہ چھوڑ دیا۔ لیکن اس کے حامی و معاون رہے۔

سنہ ۱۹۱۰ء میں جب ہز ہائی نس سر آغا خاں نے ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس ناگپور میں علی گڑھ کالج کو مسلم یونیورسٹی بنانے کی تجویز پیش کی اور گورنمنٹ کی منظوری کی امید دلائی تو نواب صاحب نے اس کے لئے ایسی جان توڑ کوشش کی کہ ڈیڑھ سال میں تیس لاکھ روپیہ کے قریب چندہ جمع کر لیا۔ لیکن اس سخت جسمانی محنت سے ان کی صحت پر بہت بار پڑ گیا اور وہ اگست سنہ ۱۹۱۲ء میں ضعف و علالت کے سبب سے مستعفی ہو گئے۔ لیکن پھر بھی وہی دُھن لگی رہی۔ اور سنہ ۱۹۱۷ء تک ہر قومی و مذہبی تحریک و خدمت میں حصہ لیتے رہے۔ جنگ بلقان و طرابلس کے سلسلے میں مجروحین طرابلس کے لئے اپنے گاؤں کا ایک حصہ فروخت کر کے ایک ہزار روپیہ چندہ دیا تقسیم بنگال کی تنسیخ، کانپور کی مسجد مچھلی بازار کے انہدام، ایران میں روس کی مداخلت وغیرہ تمام واقعات پر بڑی آزادی اور دلیری کے ساتھ اظہار رائے کرتے رہے

آخر ۲۸ر جنوری سنہ ۱۹۱۷ء روز شنبہ کو امروہہ میں انتقال کیا۔ اور ہندوستان اسلام اور کالج کا محترم بزرگ بے ریا خادم اور دردمند رہنما اُٹھ گیا۔ علی گڑھ کالج کو یہ دو نواب، محسن الملک اور وقار الملک یکے بعد دیگرے ایسی ہستیاں ملیں کہ تمام ہندوستان میں سے ان سے بہتر انتخاب نہیں ہو سکتا تھا۔ اگرچہ دونوں کی افتاد طبع اور طریق عمل میں یک گونہ اختلاف تھا۔ لیکن منتہائے نظر اور منزل مقصود دونوں کی ایک تھی۔ اس لئے دونوں دو راستوں سے ایک ہی جگہ پہنچ جاتے تھے۔ نواب محسن الملک کا مسلک یہ تھا کہ "زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ بساز" اور نواب وقار الملک اس پر عامل تھے (بقول علامہ اقبال) کہ "زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ ستیز"

نواب وقار الملک اچھے لیڈر کے ساتھ اچھے ادیب بھی تھے۔ بے ریائی اور بے خوفی، سادگی اور صفائی ان کے دل، زبان اور قلم تینوں کے یکساں اور اٹل اصول تھے۔ انھوں نے کوئی مستقل کتاب تصنیف نہیں کی۔ سر سید کی قائم کردہ

سائنٹفک سوسائٹی کے ممبر و معاون تھے؛ اس کا مقصد علمی کتابیں ترجمہ و تالیف کرانا تھا۔ اس سلسلے میں نواب وقارالملک نے بھی ایک انگریزی کتاب "فرینچ ریوولیوشن اینڈ نپولین" (انقلاب فرانس اور نپولین) کا اردو میں ترجمہ سرگذشت نپولین بوناپارٹ کے نام سے کیا، جو ۱۸۷۱ء میں مطبع نول کشور سے شائع ہوئی، لیکن نواب صاحب اتنی انگریزی نہ جانتے تھے، اس لئے ان کے دو مددگار منشی گلزاری لال اور بابو گنگا پرشاد انگریزی کا ترجمہ سناتے تھے اور نواب صاحب اپنی عبارت میں لکھتے تھے۔ اس کے علاوہ نواب صاحب نے تہذیب الاخلاق میں کثرت سے مذہبی و قومی مضامین لکھے، اور آخر عمر تک مختلف اخباروں میں حسب ضرورت لکھتے رہے بعض تحریروں کے مختصر نمونے پیش کئے جاتے ہیں:۔

(۱) ۱۸۸۹ء میں سید محمود کے آئندہ سکریٹری بنانے پر جب نواب صاحب نے سرسید کی پُرزور مخالفت کی، تو اپنی رائے کے سلسلے میں لکھا تھا:۔

میری خود کبھی ہمت نہ پڑتی کہ میں اس آزادی سے اپنی رائے لکھتا اگر مجھ کو یہ خوف نہ ہوتا کہ ایک دن مرنا ہے اور خدا کے سامنے اپنے اعمال کا جواب بھی دینا ہے۔ اگر ایک خدا کا گناہ ہو جائے تو ممکن ہے کہ اس سے توبہ کریں اور وہ اپنی رحیمی سے بخش دے۔ انسانوں کے متعلق اگر ایک دو کی نسبت کچھ خطا ہو جائے تو ان سے معذرت کر کے صفائی حاصل کر سکتے ہیں، لیکن قوم اور ملک کا گنہگار کس کس سے اور کہاں کہاں تک اپنا گناہ بخشواتا پھرے گا۔ تمام عمر بھی اگر صرف ہو جائے تو عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔

(۲) جب ۱۹۱۱ء کے شاہی دربار دہلی کے موقع پر گورنمنٹ کی طرف سے تقسیم بنگال کو منسوخ کیا گیا، تو مسلمانوں کو حکومت کی پالیسی سے ایسی مایوسی ہوئی کہ کانگریس میں شامل ہو کر ہندوؤں کا ساتھ دینے کا ارادہ کرنے لگے۔ اس موقع

نواب وقار الملک نے یہ غلط قدم اٹھانے سے مسلمانوں کو روکا، اور گورنمنٹ کی بیدردانہ پالیسی کے متعلق اپنی بے لاگ رائے لکھی۔ فرماتے ہیں:-

"جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے یہ عام رائے سمجھنی چاہیے کہ یہ الحاق عام طور پر ناپسند کیا جاتا ہے، اور بعد اس کے کہ وزرائے سلطنت نے یکے بعد دیگرے الحاق کے خلاف امیدیں دلائی تھیں، الحاق کا عمل میں آنا گورنمنٹ کی کمزوری اور آئندہ اس کے قول و فعل کی بے اعتباری کی ایک وجہ قرار دی جائے گی۔"

آگے چل کر پھر اسی رائے کا اعادہ کرتے اور مسلمانوں کی ہمت بندھاتے ہیں۔

"یہ تو آفتاب نصف النہار کی طرح اب روشن ہے کہ ان واقعات کے دیکھنے کے بعد جو اب مشاہدہ میں آئے یہ مشورہ دینا کہ مسلمانوں کو گورنمنٹ پر بھروسا کرنا چاہیے، لاحاصل مشورہ ہے، اب زمانہ ایسے لاحاصل بھروسوں کا نہیں رہا۔ خدا کے فضل و کرم کے بعد جس چیز پر ہم کو بھروسا کرنا چاہیے وہ ہماری اپنی قوت بازو ہے، اور اس کی نظیر جو ہمارے قابل ابنائے وطن نے پیش کی ہے، ہمارے سامنے موجود ہے۔"

آخر میں پھر گورنمنٹ کی اسی پالیسی (دونوں بنگال کے الحاق) پر تنقید کرتے ہیں

"گورنمنٹ کی یہ پالیسی بمنزلہ ایک توپ خانے کے تھی جو مسلمانوں کی مردہ لاشوں پر سے گذر گیا، بدوں اس احساس کے کہ ان غریب لاشوں میں سے کسی میں کچھ جان بھی ہے اور ان کو اس سے کوئی تکلیف محسوس ہوگی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ کس کا مرا کو اور کس کی ٹرپولی، اور کہاں کا ایران، یہاں سرے سے اسلام ہی کا قلع قمع ہوا جاتا ہے۔"

مسلمانوں کو شرکت کانگریس سے روکتے ہوئے لکھتے ہیں:-

اس سے ہم کو قطعی اختلاف ہے کہ اپنے قومی شیرازہ کو منتشر کرکے ہم دوسرے
زبردست گروہ کے ساتھ اسی طرح شامل ہو جائیں جس طرح کوئی دریا سمندر
میں شامل ہو کر اپنی ہستی کو معدوم کر دیتا ہے۔ ہماری علیحدگی کانگریس وغیرہ سے
اس بنا پر نہیں کہ ہم کو گورنمنٹ کے ساتھ وفادار رہنا چاہیئے۔ وفاداری عرض
ہے، وہ جوہر نہیں ہے، اس کی بنیاد بھی کسی اور چیز پر قائم ہوتی ہے، اور جس
قدر اس بنیاد میں تزلزل ہوگا، وفاداری بھی لامحالہ متزلزل ہوگی۔ پس
مسلمان جو من حیث القوم نیشنل کانگریس سے اب تک علیحدہ ہیں، اس کی
بنیاد یہ ہے کہ کانگریس کے بعض اہم دعاوی مسلمانوں کے حق میں مضرت بخش
ہیں، ان کا سوراج مسلمانوں کے حق میں تباہ کن ہے.....؟

(۲) اگست ۱۹۱۳ء میں مسجد کانپور کی شکست کے سلسلے میں بقول نواب وقار الملک "ہنگامۂ محشر" برپا ہوا۔ یہی ان کے مضمون کا عنوان ہے جو انہوں نے اس واقعہ کے متعلق لکھا تھا، اس میں اپنی بے لاگ اور بے دھڑک رائے لکھتے ہیں۔

"بدمزاج سے بدمزاج حاکم بھی زیادہ عرصہ تک اپنی بدمزاجی پر قائم نہیں
رہ سکتا اگر رعایا اپنی آزادی کی حفاظت اعتدال و استقلال کے ساتھ کرتی
رہے۔ اب جو معاملات کانپور کے متعلق مسلمانان صوبہ متحدہ کے سامنے ہیں
یہ ایک ایسا موقع ہے کہ اگر ہم نے اس کو بغیر کافی توجہ کے ہاتھ سے جانے دیا تو
ایک ٹائکر نہیں، آئندہ ہم کو توقع رکھنی چاہیئے کہ ہر ایک سب انسپکٹر
ہمارے لئے ٹائکر ثابت ہوگا۔ اگر اس وقت ہم نے اعتدال و استقلال سے کام لیا تو
اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ کوئی بڑے سے بڑا حاکم بھی دفعتہً ہمارے جذبات کے
خلاف کارروائی کرنے میں بہت زیادہ احتیاط برتے گا۔ اور اب یہ ہمارے
ہاتھ میں ہے کہ اپنی آزادی و عزت کو برقرار رکھیں۔ یا پیروں کے تلے پامال

ہونے دیں۔[۱]

مولوی چراغ علی

نواب اعظم یار جنگ بہادر مولوی چراغ علی "خدا ساز اور خود آموز و خود افروز" ہستیوں میں تھے جو اپنے ذاتی جوہر اور کاوش و کوشش سے ممتاز و سربلند ہو جاتے ہیں۔ ان کے آبا و اجداد کا اصلی وطن کشمیر تھا۔ وہاں سے ان کا خاندان پنجاب آیا۔ اور پھر میرٹھ منتقل ہو گیا۔ ان کے والد مولوی محمد بخش میرٹھ و سہارنپور میں ملازم رہے۔ پھر ۱۸۴۹ء میں پنجاب و سرحد میں مہتمم بند و بست رہے۔ یہ منصب کلکٹر کے عہدے سے کم نہ تھا۔ اس سے مولوی محمد بخش کی قابلیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

مولوی چراغ علی ۱۸۴۶ء میں پیدا ہوئے[۲] اور دس برس کے تھے کہ والد عین طفولیت میں ۱۸۵۶ء میں رحلت کر گئے۔ مولوی صاحب کے تین بھائی اور تھے یہ سب میں بڑے تھے۔ ان کی تعلیم و تربیت میرٹھ میں ہوئی لیکن اردو، فارسی انگریزی کی معمولی تعلیم ہو سکی کوئی امتحان پاس نہ کر سکے۔ ابھی طالب علم تھے کہ ضلع بستی میں خزانے کے منشی ہو گئے۔ بیس روپیہ تنخواہ ہوئی۔ چند سال بعد غالباً ۱۸۷۲ء میں لکھنؤ میں ڈپٹی منصرم ہو گئے۔ اور پھر سیتاپور تبادلہ ہو گیا۔ اس زمانے میں سر سید لکھنؤ آئے تو مولوی چراغ علی سیتاپور سے لکھنؤ آکر اُن سے ملے، اور دونوں میں بڑا ارتباط پیدا ہو گیا۔ جس کا سبب یہ تھا کہ مولوی صاحب کی طبیعت کا

---

[۱] نواب وقار الملک کے حالات اور اقتباسات کی تحریر میں "بشیر پاشا سیریز" (اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ) کے شائع کردہ تذکرہ نواب وقار الملک (مرتبہ مولوی محمد امین زبیری) سے مدد لی گئی ہے۔

[۲] یہ حالات ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب کی کتاب (چند ہم عصر) سے لئے گئے ہیں۔

رجحان مذہب کی طرف تھا۔ اور اسلام کی فضیلت وحقانیت غیر مسلم اقوام خصوصاً عیسائی پادریوں کے سامنے پیش کرنے اور ثابت کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتے تھے، چنانچہ اس سے پہلے اس قسم کی کتابیں اور مضامین لکھ چکے تھے۔ سرسید بھی یہی کام کر رہے تھے۔ اور ان دونوں میں باہم خط وکتابت بھی ہوتی تھی۔ سرسید نے اس ملاقات کے بعد ان کو کچھ ترجمہ کا کام دیا جو حیدرآباد سے سرسید کے پاس آیا تھا اور اس کا معاوضہ بھی دلوایا۔ ۱۸۷۶ء میں مولوی صاحبؒ نے علی گڑھ رہ کر یہ کام کیا تھا۔ ۱۸۷۷ء میں سرسید نے مولوی چراغ علی کو سر سالار جنگ کے پاس بھیج دیا۔ وہاں ان کو مددگار معتمد مال گذاری کا عہدہ دیا گیا۔ چار سو روپیہ تنخواہ ہوئی۔ اسکے بعد سات سو روپیہ ہو گئے۔ پھر معتمد مال گزاری کے عہدے پر تقرر ہو گیا اور پندرہ سو روپیہ تنخواہ مقرر ہوئی۔ اس کے بعد ورنگل وگلبرگہ کے صوبہ دار ہوئے اور پھر معتمد مال وفینانس ہو گئے۔ یہ سب خدمات ایسی محنت، قابلیت اور دیانت کے ساتھ انجام دیں کہ صلے میں نواب اعظم یار جنگ بہادر کا خطاب ملا۔

مولوی چراغ علی نہایت مستقل مزاج، صائب رائے، بے لوث، غیر متعصب اور انتہا درجہ کے جفاکش آدمی تھے۔ جس زمانے میں فنانشل سکرٹری تھے، خبر ملی کہ مسٹر کرالی کنٹرولر جنرل ہو کر آ رہے ہیں۔ مولوی صاحب نے فنانس پر انگریزی کی سب اعلیٰ درجہ کتابیں منگالیں اور ان کا ایسا مطالعہ کیا کہ جب مسٹر کرالی سے ملاقات ہوئی اور اس موضوع پر گفتگو کا موقع پیش آیا تو وہ ان کی قابلیت اور وسعت معلومات پر حیران رہ گئے۔

مولوی چراغ علی کو ابتدائے عمر میں باقاعدہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا موقع نہ ملا تھا۔ لیکن اپنے شوق اور محنت سے سب کمی پوری کر لی۔ عربی وفارسی کے عالم تھے کلدانی، لاطینی اور یونانی زبانوں میں بھی مہارت پیدا کر لی تھی۔ انگریزی زبان پر

تو ایسی قدرت حاصل کی تھی کہ بڑے بڑے انگریزی اخبارات ان کی قابلیت کے معترف تھے۔ مطالعہ کا ایسا شوق تھا کہ گویا عمر بھر طالب علم رہے۔ ایسا انہماک ہو جاتا تھا کہ ایک بار تہہ خانے میں آگ لگ گئی۔ یہ شہ نشین میں بیٹھے پڑھتے رہے، خبر تک نہ ہوئی۔ ریاست کے ایسے سچے خیر خواہ اور دیانت دار امین تھے کہ اپنے اصول کے مقابلے میں کسی کی سفارش نہ سنتے تھے۔ ایک مرتبہ نواب وقار الامرا بہادر نے کسی کی سفارش کی۔ مولوی صاحب نے پہلے تو ٹالا، پھر اُدھر سے اصرار ہوا تو نواب صاحب سے صاف کہہ دیا کہ "آپ اس لئے وزیر نہیں بنائے گئے کہ سرکار کا خزانہ لٹا دیں، آپ کا کام خزانے کی حفاظت ہے"۔

بے تعصب ایسے تھے کہ کسی فرقہ و مذہب سے کوئی پرخاش نہ تھی۔ یہاں تک کہ اسلامی فرقوں میں سے بھی کسی سے کچھ تعلق نہ تھا۔ چنانچہ مردم شماری کے موقع پر "فرقہ" کے خانے میں اپنی بیوی کے نام کے سامنے تو "شیعہ" لکھ دیا اور اپنے اور اپنے بیٹوں کے نام کے آگے صفر لکھ دئے۔

۱۵ر جون ۱۸۹۵ء (مطابق ذی الحجہ ۱۳۱۲ھ) کو ۵۰ برس کی عمر میں مرض ذیابیطس کے آپریشن کے بعد یکایک بمبئی میں انتقال کیا۔ چراغِ حق (۱۳۱۲ھ) تاریخ ہے۔ جسٹس سید محمود (خلف سرسید) کو صنعت تاریخ گوئی بہت پسند تھی۔ انھوں نے ایک فقرۂ نثر میں عیسوی سن نکالے۔ مولانا حالی نے اس فقرے کو قطعہ میں موزوں کر دیا۔ ان تینوں بزرگوں کی یادگار کے طور پر اس کو نقل کیا جاتا ہے:-

زخمے از مرگ چراغ علی آمد بر دل | کہ از وفاتِ افکار بصد غم شاید جفت:

از خرد سال وفاتش چو بجستم محمود | شد نہاں حیف چراغ علی از دنیا گفت

۱۸۹۵ء

مولوی چراغ علی نے اس قدر کثیر و ضخیم کتابیں تصنیف کی ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔

کہ ایسا مصروف و کثیر الاشتغال انسان کیونکر اتنا وقت نکال سکتا تھا۔ ان کی اکثر کتابیں انگریزی زبان میں ہیں۔ مولوی صاحب کا پسندیدہ و محبوب موضوع اسلام و حقانیت اسلام تھا۔ لیکن ملازمت کے سلسلے میں قانون اور فنانس سے بھی کافی شغف پیدا ہو گیا تھا۔ چنانچہ زیادہ کتابیں اسی مضمون میں لکھی ہیں اسلام پر بھی چند ضخیم کتابیں بڑی تحقیق کے ساتھ مجتہدانہ شان کی لکھی ہیں جن کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ ہو گیا ہے۔ مثلاً

(۱) تحقیق الجہاد، عیسائیوں کے اس اعتراض کے جواب میں کہ اسلام بزور شمشیر پھیلا۔

(۲) اعظم الکلام فی ارتقاء الاسلام۔ اسلام کی سوشل اصلاحات کے متعلق۔ اس کے پہلے ۴۴ صفحوں کا ترجمہ مولوی چراغ علی نے کیا تھا۔

(۳) محمدؐ پیغمبر برحق۔ سیرت پاک پر محققانہ تالیف ہے۔ اس کا اردو ترجمہ غالباً نہیں ہوا۔

(۴) تعلیقات (اردو) ایک پادری کی کتاب "تاریخ محمدی" کے جواب میں۔ یہ رسالہ مولوی چراغ علی کی سب سے پہلی تالیف ہے مطبوعہ ۱۸۷۲ء۔

(۵) اسلام کی دنیوی برکتیں۔ نہایت دلچسپ کتاب ہے۔ بہت پسند کی گئی اور بار بار شائع ہوئی۔

(۶) قدیم قوموں کی مختصر تاریخ۔ قرآن مجید میں جن اقوام قدیمہ کا ذکر ہے ان کا حال قدیم تاریخوں سے تلاش کیا ہے۔ اور عیسائیوں کے اس اعتراض کو اٹھایا ہے کہ قرآن کی مذکورہ اقوام کا کوئی وجود کبھی نہ تھا۔

(۷) رسائل چراغ علی۔ مولوی صاحب نے بہت سے مضامین حیدر آباد آنے سے پہلے سیتاپور و لکھنؤ میں لکھے تھے۔ جو مسودے کی صورت میں رہ گئے۔ ان چھوٹے

بڑے ۵۴ رسالوں میں سے چار رسالہ مولوی عبداللہ خاں نے بڑی محنت سے مرتب و درست کرکے ۱۹۱۸ء ۱۳۳۶ھ میں کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد سے شائع کئے۔ مولوی چراغ علی کے ہر مسودے کے آخر میں ان کے دستخط اور مقام و تاریخ تحریر درج ہے۔ اس مجموعہ میں یہ رسالے ہیں :۔

(الف) تہذیب الکلام فی حقیقۃ الاسلام سب سے بڑا رسالہ ہے ۱۲۲ صفحوں میں شائع ہوا ہے آخر میں ۲۳ر اکتوبر ۱۸۷۵ء سیتاپور ملک اودھ درج ہے۔ اس میں مولوی سید محمد عسکری تحصیلدار لکھنؤ اور مولوی محمد علی بچھرایونی تحصیلدار بلاری ضلع مرادآباد کے چند اعتراضات کا جواب ہے۔

(ب) مجموعہ روایات استرقاق و لتسری۔ اس رسالے میں صحاح ستہ اور دیگر کتب احادیث و سیر و مغازی سے چند ایسی معتبر روایتیں جمع کی ہیں جن میں رسم غلامی کی بیخ کنی پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کے غزوات میں آپ کے عمل مبارک سے دکھائی ہے مارچ ۱۸۷۶ء میں بمقام سیتاپور لکھا گیا۔

(ج) تدبیر الاسلام فی تحریر الامتہ والغلام۔ مولوی محمد علی بچھرایونی کے ایک مضمون مطبوعہ نور الآفاق کا نپور کا جواب جس میں ثابت کیا ہے کہ فتح مکہ ۸ھ کے بعد غلام بنانا قطعاً موقوف کر دیا گیا۔

(د) تحقیق مسئلہ تعدد ازدواج۔ مولوی محمد حسین بٹالوی ایڈیٹر رسالہ "اشاعۃ السنۃ" کے ایک مضمون متعلق نکاح و طلاق پر تنقید۔ اس میں یوروپین مخالفین اسلام کے اعتراضات کے جواب بھی آگئے ہیں۔ یہ رسالہ ناتمام ہے۔ اس لئے تاریخ تحریر درج نہیں ہے۔

(۸) العلوم الجدیدہ والاسلام۔ یہ مولوی چراغ علی کی آخری تصنیف تھی لیکن اس کی صرف تمہید رسالہ "تہذیب الاخلاق" میں چھپی تھی کہ یکایک ان کا انتقال ہوگیا۔

مولوی چراغ علی صاحب کی فضیلت علمی اور کمال تحقیق کے سلسلے میں یہ ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ مولوی صاحب کے کاغذات میں مرزا غلام احمد قادیانی[1] کے چند خطوط نکلے ہیں، جن میں مرزا صاحب نے اپنی تصنیف "براہین احمدیہ" کی تیاری میں مولوی صاحب سے علمی اعانت چاہی ہے۔ ۱۸۷۸ء اور ۱۸۷۹ء میں مرزا صاحب نے کئی خط مولوی صاحب کو لکھے ہیں اور ان کی تحقیقات اور مضامین کا اشتیاق و انتظار ظاہر کیا ہے۔ چنانچہ ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"براہ عنایت بزرگانہ بہت جلد مضمون اثبات حقانیت فرقان مجید تیار کر کے میرے پاس بھیج دیں۔ اور میں نے ایک کتاب۔ جو دس حصے پر مشتمل ہے۔ تصنیف کی ہے، اور نام اس کا "براہین احمدیہ علی حقانیۃ کتاب اللہ القرآن والنبوۃ المحمدیۃ" رکھا ہے۔ اور صلاح یہ ہے کہ آپ کے فوائد جرائد بھی اس میں درج کروں، اور اپنے محقر کلام کو ان سے زیب و زینت بخشوں۔"

---

[1] مرزا غلام احمد قادیانی، قادیان ضلع گورداسپور (پنجاب) کے رہنے والے تھے ۱۸۴۰ء میں پیدا ہوئے شروع میں عیسائی اور آریہ مخالفین اسلام سے تحریری و زبانی مناظرے کئے۔ اور متعدد کتابیں اسی موضوع پر لکھیں ۱۸۸۰ء میں براہین احمدیہ شائع کی۔ اس کتاب میں سب سے پہلے اپنے مجدد ہونے کا دعویٰ کیا۔ اس سے پہلے سب مسلمان مرزا صاحب کے طرفدار تھے۔ اس دعوے سے سب چونک گئے اسکے بعد مرزا صاحب نے پے در پے قسم قسم کے دعوے کرنے شروع کر دئے۔ آخر نبوت کا دعویٰ کر دیا مسیح موعود اور مہدی معہود بن گئے۔ پھر کرشن اوتار ہونے کا بھی دعویٰ کر دیا۔ ۱۸۹۰ء میں اپنا فرقۂ احمدیہ الگ قائم کر لیا۔ مئی ۱۹۰۸ء میں لاہور میں انتقال کیا۔ قادیان میں دفن ہوئے مرزا صاحب بے شمار کتابوں کے مصنف ہیں انکے خیالات اور تحریروں پر سرسید کی آزادی رائے، تاویل آیات اور طرز استدلال کا بہت اثر پڑا ہے۔

مولوی چراغ علی کا طریقۂ استدلال وہی ہے جو سر سید کا ہے۔ ہر مسئلہ کے ایک ایک پہلو بلکہ حسب ضرورت ہر محاورہ و لفظ پر بحث کرتے ہیں۔ ہر ممکن ذریعہ عقلی و نقلی سے اس پر دلیل لاتے ہیں۔ جو بات لکھتے ہیں نہایت متانت و قوت سے لکھتے ہیں۔ طرز تحریر و زبان سر سید کے مقابلے میں زیادہ صاف و رواں اور بامحاورہ ہے۔ سر سید نواب محسن الملک مولوی محمد علی وغیرہ، اُس زمانے کے اکثر لکھنے والے الفاظ کی صحیح ترتیب کا خیال نہیں رکھتے۔ مولوی چراغ علی میں یہ بات نہیں ہے۔

نمونۂ تحریر یہ ہے:۔

(۱) اعظم الکلام کے ابتدائی صفحات جو خود مولوی چراغ علی نے اردو میں لکھے ہیں، ان کا مختصر اقتباس یہ ہے:۔

"جدید قانون زن و شو کی وجہ سے، جس کی پیغمبر خدا نے اپنے پیروؤں کو تلقین کی اور بعض دانشمندانہ، عادلانہ اور سخت قیود سے، آپنے طلاق کی سہولت کو بھی رفع کیا۔ یہ قیود بہت ہی معقول ہیں، اور ان میں طرفین کے فائدے کو مدنظر رکھا گیا ہے۔ قرآن میں اہل عرب کو نصیحت اور تاکید کی گئی ہے کہ وہ اپنی بی بیوں کے بارے میں خراب رسوم ترک کر دیں۔ آنحضرت صلعم نے غلامی کو موقوف کر کے لونڈیوں کے رکھنے کے رواج کو بھی موقوف کیا۔ اور اس وقت جو عورتیں غلامی کی حالت میں تھیں، ان سے عقد کر لینے کی تاکید کی، ورنہ وہ لونڈیاں بنا کر رکھی جاتیں۔ شیر خوار لڑکیوں کے ہلاک کرنے کے خلاف نہایت سخت اور شدائد احکام ہیں: اور اس جرم کے ارتکاب کرنے والوں کو ڈرایا گیا ہے کہ عقبیٰ میں اس کا بڑا عذاب ہوگا۔ اس طرح عرب اور دیگر اسلامی ممالک سے دختر کشی کی رسم بالکل اٹھ گئی۔ سب سے اول قرآن میں قانون وراثت ایسا قائم کیا گیا کہ اس میں عرب کی عورتوں کے حقوق کا بھی لحاظ رکھا گیا!!"

(۲) رسائل چراغ علی میں سے تیسرے رسالہ (تدبیر الاسلام فی تحریر الارقہ والغلام) میں اپنا جواب اس طرح شروع کرتے ہیں:۔

۱۔ مولوی محمد علی صاحب کی تقریر جو فاضلانہ تحریر کی پوری تصویر ہے۔ "نور الآفاق" نمبر (۵) مطبوعہ کانپور، مطبع نظامی میں چھپ کر میرے پاس پہنچی۔ جو تعلیم ہم مسلمانوں میں ان دنوں عمدہ اور کافی تصور کی جاتی ہے، اس کا یہ ٹھیک ٹھیک فوٹوگراف ہے۔

۲۔ آزاد اور خود مختار مخلوقات کا غلام بنانا ایک ایسی بدنامی اور ارباب دانش کی نظر میں حقارت و ذلت ہے جس کو ہر ایک شخص جو ادنیٰ سی بصیرت رکھتا ہو اچھی طرح معلوم کر سکتا ہے، اور اس میں کچھ شک ہی نہیں کہ خدا نے ہر ایک شخص کو آفرینش کی راہ سے ایک ہی سی حیثیت عقلی و جسمانی کا پیدا کیا ہے، اور تمام مخلوقات فطرت کی راہ سے باہم مساوی ہیں۔ پس اگر فطرت میں آزادی ہے تو سب کے سب آزاد ہونے چاہئیں یا اس کے بالعکس، ورنہ دراصل قدرتی فرق اور فطرتی تمیز آزاد اور غلام میں نہیں پائی جاتی۔

۳۔ لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰہِ۔ (روم ۳۰۔ آیت ۲۹) خدا کی بناوٹ میں ردوبدل نہیں ہو سکتا۔

ایک بڑی مضبوط اور قوی دلیل ہے اس بنائی ہوئی حالت اور جبری و قہری صورت کے بطلان کی، جو ابتدا میں ناملائم حرکات والی زبردست قوم نے اپنے مغلوب قیدیوں کو غلام بنا کر جبریہ ان کو فطرتی حقوق، قدرتی اختیار اور طبعی آزادی سے محروم رکھا تھا۔ پس غلام بنانا اور اس کی جان و مال پر تصرف کرنا خلقت الٰہی میں تغیر کرنا ہے، اور اسی بات کی پیشین گوئی

شیطان نے پہلے سے کی ہے۔

وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ (النساء ۴۔ آیت ۱۱۸) اور ضرور ان کو یہ سمجھاؤں گا کہ اللہ تعالیٰ کی بناوٹ بدل دیں۔

اور جب غلامی کی یہ صورت ہو تو کیونکر تسلیم کیا جائے کہ اسلام نے باوجود حق اور رحمۃ للعالمین ہونے کے، اور تمام جہاں کو تہذیب اور حکمت سکھلانے کے، پھر بھی ایسی رسم قبیح و مخالف فطرت کو کسی نہ کسی صورت میں جلا رکھا ہو۔ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ اسلام اور استرقاق (غلام بنانا) دونوں جمع ہو سکیں۔

۴۔ آغاز اسلام اور ابتدائے وحی سے غلاموں کی حالت میں اصلاح اور غلامی کے انسداد کے لئے کوشش، ترغیب، اور فکر و تدبیر کی گئی اور شروع ہی میں اخلاق اور موعظت کی راہ سے قیدیوں کی آزادی کی رغبت دلائی گئی۔

بعض تقصیرات کا کفارہ غلام آزاد کرنا قرار دیا گیا۔ مثلاً:۔

مَآ اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ ۔ فَكُّ رَقَبَةٍ	اے پیغمبر تم کیا سمجھے کہ گھاٹی کیا ہے؟
(البلد ۹۰۔ آیت ۱۳)	وہ کسی کی گردن کا چھڑا دینا ہے۔

(الف) کفارۂ قتل خطا میں ارشاد ہوا۔ فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ (النساء ۴۔ آیت ۹۲)

(ب) کفارۂ قسم میں ارشاد ہوا۔ اَوْ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ (المائدہ ۵۔ آیت)

(ج) کفارۂ ظہار میں ارشاد ہوا۔ فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ (المجادلہ ۵۸۔ آیت ۳)

(د) مسلم نے کئی اسناد سے یہ حدیث نقل کی ہے:۔

مَنْ لطم مملوكه او ضربه فكفارته	جو شخص اپنے غلام کو طمانچہ مارے یا

یعتقہا	زدوکوب کرے تو اس کا کفارہ یہ ہے
(مسلم ج ۲ ص۱۹۰ مصر ۱۲۹۰ھ وغیرہ)	کہ اس کو آزاد کردے۔

اور جو غلام ان تحریص و ترغیب پر بھی بے آزادی کے رہ جائیں ان کے لئے کتابتؒ کا حکم ہوا۔

(یہاں سورۂ نور ۲۴-آیت ۳۳ مع ترجمہ نقل کی ہے، جس کو ہم حذف کرتے ہیں) اور قیدیوں اور غلاموں کو مال دینے پر بھی ترغیب دی گئی:۔

وفی الرقاب - (البقرہ آیت ۱۷۲) اور غلامی وغیرہ کی قید سے لوگوں کی گردنوں (کے چھڑانے) میں۔

مکہ میں جب غلاموں کی آزادی کا بہت چرچا اسلام کی بدولت ہوا تو غلاموں کے مالکوں میں کھلبلی پڑ گئی۔ جیسی کہ اب غلامی کی حمایت کرنے والوں میں ہے۔

ڈاکٹر اسپرنگر صاحب نے "سیرت محمدی" میں لکھا ہے:۔

"جب محمد نے غلامی کی آزادی کا اعلان کیا تو ان میں بہت جوش پھیلا حتّٰی کہ عبداللہ بن جدعان نے جس کے پاس بہت سے (۱۰۰) غلام تھے بنا چاری انکو مکہ سے کہیں اور بھیج دیا کہ ایسا نہ ہو وہ سب کے سب مسلمان ہو جائیں"

(سیرت محمدی صفحہ ۱۵۹ مطبوعہ الہ آباد ۱۸۵۱ء)

سبحان اللہ اس زمانہ میں تو اس طرح قولاً، فعلاً، موعظۃً اور شرعاً غلاموں کی آزادی کا حکم دینے اور آزاد کر دینے سے اسلام کی نیک نامی اور غیر مسلم

لہ مالک غلام سے وعدہ کر لیتا تھا کہ اتنی رقم محنت مزدوری سے جمع کر کے دیدے تو پھر آزاد ہے اس کو کتابت و مکاتبت کہتے ہیں۔

اقوام کا حسن ظن حاصل کیا جاتا تھا، اور ایک یہ زمانہ ہے جس میں اگر کہیں ضمناً بھی غلامی کے عدم جواز کا ذکر آجائے تو بڑے بڑے مولوی صاحب اسلام کو بدنام کرنے کو مستعد ہو جاتے ہیں، اور نورالآفاق کے اوراق سیاہ کیے جاتے ہیں۔

پانچویں دَور کی نثر پر تبصرہ

(۱) زمانے کے لحاظ سے پانچواں اور چھٹا دور الگ الگ نہیں۔ دونوں کی ابتدا و انتہا تقریباً ساتھ ساتھ ہے۔ بلکہ یہ تفریق نثر نگاری کی خصوصیات کے سبب سے کی گئی ہے۔

(۲) پانچویں دور میں جن مصنفوں کا تذکرہ کیا گیا انھوں نے باعتبار موضوع و مضمون مختلف قسم کی کتابیں لکھیں جن میں بعض مضامین اپنی نوعیت میں ادبیت کا درجہ رکھتے ہیں۔ مثلاً سر سید، مولوی چراغ علی اور ان کے مخالفوں نے مذہبی مضامین جیسی جامعیت کے ساتھ لکھے، اس سے پہلے نہ لکھے گئے تھے۔ سر سید کی "آثار الصنادید اور مضامین تہذیب الاخلاق اردو میں انفرادی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس دور میں شعرا کے تذکرے بھی بجائے خود دلچسپ اضافے ہیں۔

(۳) لیکن زبان و بیان کے لحاظ سے اور ایجاد اسالیب کے اعتبار سے ان تمام مصنفوں میں، بجز سر سید کے، کسی کا کوئی خاص مرتبہ نہیں ہے طرز قدیم کا اثر سب میں ہے! کہیں قافیہ بندی کی حد تک، کہیں الفاظ کی بے ترتیبی اور زبان و محاورہ کی بے پروائی کی صورت میں۔ ان میں سے کوئی مصنف

صاحب طرز" نہیں کہا جا سکتا۔

(۴) اسی امتیاز کو نمایاں کرنے کی غرض سے انیسویں[۱۹] صدی کے دوسرے اہل قلم کو علیحدہ لکھا جاتا ہے جنھوں نے مختلف قسم کے بالکل جدید موزوں اور انفرادی اسالیب بیان پیدا کئے۔

(۵) چھٹے دور کے مصنف صرف طرز نگارش کے سبب سے ممتاز نہیں، بلکہ نئے نئے موضوعات تصنیف کے موجد بھی ہیں۔

(۶) اردو تصانیف میں اب تک جو کمی نظر آتی ہے وہ صحیح تنقید اور عالمانہ تحقیق و تدقیق کی ہے۔ کوئی مضمون و موضوع ہو زبان و ادب ہو یا تاریخ یا سیرت یا شاعری یا اور کچھ اس کے لکھنے کا حق اس وقت تک ادا نہیں ہو سکتا جب تک اس کے ہر پہلو پر غور نہ کیا جائے اور ہر ممکن ذریعے سے ایک ایک جزو ایک ایک رخ کی تحقیق و تنقید نہ کی جائے۔ یہ کام گذشتہ دور میں صرف مذہب کے متعلق کیا گیا ہے۔ تصنیف و تالیف کی اور کسی شاخ کے لئے ایسی کاوش نہیں کی گئی

(۷) یہ نقد و نظر، تحقیق و تنقیح، موازنہ و مقابلہ آئندہ مصنفین کی امتیازی و انفرادی خصوصیت ہے۔

نثر اردو کا
چھٹا دور

(غدر کے بعد سے بیسویں صدی کے شروع تک)

مولوی محمد حسین آزاد

والد کا نام مولوی محمد باقر ہے۔ شیعہ مجتہدین کے خاندان سے تھے۔ غالباً سنہ ۱۸۳۲ء[1] میں پیدا ہوئے

آزاد کے والد نے سنہ ۱۸۳۷ء میں "اردو اخبار" دہلی سے نکالا تھا۔ جو اردو کا پہلا اخبار نہیں تو دہلی کا پہلا اخبار ضرور تھا۔ ان کے والد کے استاد ذوق دہلوی سے بڑے تعلقات تھے۔ اسی سبب سے آزاد، ذوق کے شاگرد ہوئے، اور ان کے ساتھ دہلی کے مشاعروں میں بھی شرکت کی آزاد کو اپنے استاد سے جیسی محبت تھی اسکی مثال دنیا میں کم ملتی ہے۔ آزاد نے قدیم دہلی کالج میں بھی تعلیم پائی۔ جہاں مولوی نذیر احمد، مولوی ذکاء اللہ، ماسٹر پیارے لال آشوب ان کے رفقائے تعلیم تھے۔ استاد ذوق کے انتقال (سنہ ۱۸۵۴ء) کے بعد آزاد نے حکیم آغا جان عیش سے کچھ دنوں فیض سخن حاصل کیا۔

---

[1] جنوری سنہ ۱۹۱۰ء میں آزاد کا انتقال ۷۷ سال کی عمر میں ہوا ہے۔ اس سے سال ولادت نکالا گیا ہے اور کوئی ذریعہ اطلاع نہ تھا۔

غدر ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں آزاد کے والد بھی گرفتار کرلئے گئے۔ اور دہلی دروازے کے باہر ایک میدان میں باغیوں کے ساتھ محصور و نظر بند کردئے گئے۔ یہ حادثہ آزاد کے لئے کیا کم المناک و جاں گداز تھا کہ آزاد کو غایت محبت کے سبب سے اس حالت میں والد کی زیارت کا شوق ہوا۔ اس وقت دہلی کی ایسی فضا تھی کہ باہر چلنا پھرنا بھی خطرناک تھا۔ آخر آزاد کو فوج کے ایک سکھ جرنیل کا خیال آیا جو ان کے والد کا دوست تھا۔ اس کے پاس گئے اور اپنی آرزو بیان کی اس نے اس ارادے سے باز رکھنا چاہا۔ انھوں نے اپنے دل کی تڑپ کا اظہار کیا۔ آخر اس نے کہا کہ تم میرے سائیس کا لباس پہن کر میرے ساتھ چل سکتے ہو اور کوئی تدبیر نہیں۔ چنانچہ آزاد سائیس کے حلیے میں سکھ جرنیل کے گھوڑے کے ساتھ دوڑتے ہوئے اس میدان محشر میں پہنچے۔ جہاں قیدی اپنی زندگی کی آخری ساعتیں گذار رہے تھے۔ انہی لوگوں میں ایک طرف کو ایک مرد خدا عبادت میں مصروف تھا۔ چہرے پر اطمینان و سکون کے آثار تھے، یہی آزاد کے شفیق بڈھے باپ تھے۔ جن کی عمر اس وقت ستر سال سے زائد تھی۔ بہت دیر کے بعد نظر اٹھائی تو تھوڑے فاصلے پر اپنا پیارا لاڈلا پالا جگر گوشہ سائیس کے لباس میں کھڑا ہوا نظر آیا۔ ایک دم چہرے پر پریشانی کے آثار ظاہر ہوئے۔ آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ ادھر بھی حالت بیٹے پر گذری دنیا آنکھوں کے سامنے اندھیر ہوگئی۔ جب نظر نے یاوری کی، تو دیکھا کہ ہاتھ سے اشارہ کررہے ہیں کہ بس آخری ملاقات ہوگئی، اب رخصت ہو اور دیر نہ کرو۔ اس اشارے کے بعد انھوں نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھادئے۔ آزاد نے اس وقت لاکھ ضبط کیا لیکن نہ ہو سکا وہاں سے روتے ہوئے رخصت ہوئے اور اس وقت تک اس وفادار جرنیل کی حفاظت میں رہے جب تک شاہجہان آباد

کی یہ مظلوم رد حیں قفسِ عنصری میں قید رہیں۔" جب شہر میں یہ افواہ پھیلی کہ تمام قیدیوں کو گولی کا نشانہ بنا دیا گیا تو آزاد اسی سکھ جرنیل کی مدد سے باہر نکلے۔ بغل میں استاد ذوقؔ کی نظموں کا بستہ تھا جس کو جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔

جب غدر کی دار و گیر سے کچھ امن کی صورت نظر آئی تو آزاد مع اہل و عیال لکھنؤ چلے گئے۔ لیکن وہاں بھی گردشِ تقدیر ساتھ رہی، آخر ایک مدت بعد ۱۸۶۴ء میں لاہور پہنچے۔ اور پنڈت من پھول میر منشی لفٹنٹ گورنر پنجاب کی سفارش سے سررشتۂ تعلیم میں پندرہ روپیہ کے ملازم ہو گئے۔ اس زمانے میں میجر فلر ڈائرکٹر تعلیمات تھے۔ میجر صاحب بڑے علم دوست تھے اور ماسٹر پیارے لال آشوب دہلوی سے خاص اُنس رکھتے تھے۔ آزاد اور ماسٹر صاحب کے تعلقات نہایت دوستانہ مخلصانہ تھے۔ آزاد نے ماسٹر صاحب سے فرمائش کی کہ میجر صاحب سے ہمیں بھی ملوا دیجئے۔ ایک بار موقع مل گیا۔ میجر فلر نے کوئی اردو کی تحریر لکھی تھی وہ ماسٹر صاحب کو دکھائی۔ اس میں میجر صاحب نے ایجاد کو مؤنث لکھا تھا۔ ماسٹر صاحب نے اعتراض کیا کہ "ایجاد" مذکر ہے۔ میجر صاحب نے کہا کہ یہ تحریر مولوی کریم الدین صاحب سررشتہ دار کو دکھالی ہے۔ مولوی صاحب بلائے گئے۔ انھوں نے اعتراض

لہ یہ کیفیت بلکہ آخری سطریں (جو علامات اقتباس سے محدود ہیں) تقریباً بجنسہٖ رسالہ کتابی دنیا (شائع کردۂ کتاب گھر دہلی) کے ایک مضمون سے لی گئی ہیں۔ اس رسالے میں آزاد کے مکمل سوانح حیات" سے ماخوذ ہیں۔ یہ کتاب ۱۹۲۹ء میں پہلی مرتبہ شائع ہوئی ہے۔ اب تک آزاد کے مفصل حالات کہیں نہ ملتے تھے۔

جن کر کہا کہ مذکر بولنے کی سند درکار ہے۔

ماسٹر پیارے لال صاحب نے میجر صاحب سے کہا کہ آپ کے محکمہ میں جو مولوی محمد حسین دہلوی ہیں ان کو بہت سے شعر یاد ہیں۔ میجر نے آزاد کو بلا کر سوال کیا۔ آزاد نے فوراً سودا کا یہ شعر پڑھ دیا۔

ٹائے یہ کس بھڑوے کا ایجاد ہے

نسخہ میں معجون زرنباد ہے

میجر صاحب بہت خوش ہوئے اور آزاد کی قدر کرنے لگے۔ میجر فلر کے بعد کرنل ہالرائڈ ڈائرکٹر ہوئے۔ اس زمانے میں لاہور سے ایک سرکاری اخبار اتالیق پنجاب نکلتا تھا تھا۔ ماسٹر پیارے لال آشوب اس کے اڈیٹر تھے کرنل ہالرائڈ نے آزاد کو اس اخبار کا اسسٹنٹ ایڈیٹر بنا دیا اور ۷۵ روپیہ تنخواہ کر دی۔ پھر اتالیق پنجاب بند کرکے اس کی جگہ پنجاب میگزین جاری ہوا، تو آزاد اسکے بھی سب اڈیٹر رہے۔ آزاد کے بعد حالی نے بھی یہ خدمت انجام دی۔

آزاد ۱۸۶۰ء میں کسی سرکاری کام کے لئے کلکتہ گئے۔ اسی سال پنڈت من پھول کے ساتھ سرکاری سفارت کی غرض سے کابل و بخارا گئے۔ ایران کا بھی سفر کیا۔ دوبارہ ۱۸۸۳ء میں ایران گئے۔ ایران میں آزاد نے فارسی جدید میں مہارت پیدا کی۔ اور وہاں سے آکر ایرانی فارسی کے متعلق کچھ درسی کتابیں بھی مرتب کیں۔ آزاد ایک عرصہ تک گورنمنٹ کالج لاہور میں فارسی و عربی کے پروفیسر رہے۔ ۱۸۸۷ء میں ملکہ وکٹوریہ کے ۵۰ سالہ جشن تاجپوشی کے موقع پر آزاد کو شمس العلما کا خطاب ملا۔ ۱۸۸۹ء سے آزاد کے دماغ میں کچھ اختلال کے آثار شروع ہوئے۔ پھر یہ کیفیت بڑھ کر مستقل ہوگئی اور زندگی کے باقی بیس برس اس حالت میں گزرے کہ کبھی جذب و بیخودی نظر آتی تھی۔ کبھی جنوں کی شان پیدا ہو جاتی تھی۔ آخر ۲۲ جنوری ۱۹۱۰ء

(مطابق ۹ محرم ۱۳۲۸ھ) کو رحلت فرمائی۔

اردو شاعری پر آزاد کا احسان

جس زمانے میں آزاد پنجاب کے سررشتۂ تعلیم میں منسلک تھے، اور حالی بھی بک ڈپو کے اہتمام کے لئے وہاں ملازم ہو کر پہنچ گئے تھے، آزاد کی تحریک اور کرنل ہالرائڈ کی تائید سے جدید شاعری کا دور شروع ہوا۔ یعنی ایک بزم ادب انجمن پنجاب کے نام سے قائم ہوئی جس میں بجائے طرحی غزلوں کے مختلف موضوعات قومی و اخلاقی اور مناظر و حقائق کے متعلق نظمیں پڑھی جاتی تھیں چنانچہ آزاد کی مثنوی "زمستان" "ابر کرم" وغیرہ اور حالی کی "حب وطن" اور "برکھا رت" وغیرہ اُسی عہد کی یادگاریں ہیں۔ اس جدّت و ایجاد کا خیال سب سے پہلے آزاد کو آیا۔ اور انھوں نے خود کہہ کر اور دوسروں کو ترغیب دے کر جدید نظموں کو رواج عام دیا۔

لہ جدید اردو شاعری۔ اردو شاعری کی ابتدا سے شاعری کی جو قسمیں عام طور پر رائج رہیں وہ غزل، قصیدہ، مثنوی، مرثیہ، واسوخت وغیرہ تھے۔ یہ قدیم شاعری اور ادبیات قدیم (کلاسیکل لٹریچر) کہلاتی ہیں۔ ان اصناف سخن کا موضوع و مقصود حسن و عشق، مدح و ہجو، قصص و حکایات، اخلاق و تصوف تھا۔ انکے مقابلے میں جدید شاعری سے یہ مراد ہے کہ کسی جذبہ یا منظر یا حقیقت یا واقعہ کے متعلق چھوٹی یا بڑی مستقل نظم لکھی جائے۔ اس میں یہ اقسام شامل ہیں۔

(۱) تخییلی شاعری یعنی محبت، عداوت، مسرت، غم، ایثار، خودداری وغیرہ میں سے کسی جذبہ کی تصویر کشی (۲) منظر کشی یعنی کسی وقت، موسم، مقام یا اوضاع و احوال وغیرہ کی تصویر کشی۔ مثلاً صبح و شام، بہار، برسات، دریا، باغ، تیتری، کویل، اشنان، تیرتھ، دیوالی، عید وغیرہ کا منظر نظم میں بیان کرنا۔ (۳) بیانیہ شاعری۔ کسی خاص واقعہ کو نظم کرنا۔ مثلاً حاتم کی سخاوت، سکندر و قزاق کی گفتگو، رام چندر جی کا بن باس (۴) تمثیلی یا رمزیہ شاعری یعنی غیر ذی روح یا غیر ذی عقل چیزوں کو انسانی خواص و افعال دے کر ان کے (باقی صفحہ ۴۵۲ پر)

اس لئے یہ انقلاب شاعری آزاد کی اوّلیات میں شمار ہونے کے قابل ہے۔ انجمن پنجاب کا سب سے پہلا مشاعرہ ۸ مئی ۱۸۷۴ء کو ہوا تھا، اس میں آزاد نے (شام کی آمد اور رات کی کیفیت) پڑھ کر سنائی۔ یہ مشاعرہ صرف گیارہ مہینے جاری رہا۔

آزاد کی تصانیف

سررشتۂ تعلیم پنجاب کی ملازمت کے زمانے میں کرنل ہالرائڈ کی فرمائش سے آزاد نے اردو ریڈریں، قواعد اردو، قصص ہند (تاریخی کہانیاں) مرتب کیں۔ یہ اردو زبان میں اپنی نوع کی بہترین کتابیں ہیں۔ بچوں کی درسیات میں اس سے بہتر کتابیں موجود نہ تھیں۔ اور ان کے بعد بھی مولوی اسمٰعیل میرٹھی کے سوا کسی سے ان سے بہتر نہ بن سکیں۔ خصوصاً

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۵۲)

قصے یا مکالمات لکھنا جس سے کوئی اخلاقی پہلو ذہن نشین کرنا مقصود ہو جیسے نظیر اکبر آبادی کی نظم ہنس پریا مائی کا مناظرہ دولت و وقت یا تاجر و طوطی کا مشہور واقعہ (۵) وطنی و قومی، شاعری یعنی ملک و قوم کی اصلاح و فلاح کے متعلق نظمیں۔

مختصر تاریخ

(۱) پہلا دور۔ قدیم زمانے میں اس طرح کی نظمیں لکھنے کا عام رواج نہ تھا۔ قصیدوں کی تشبیب، مثنویوں مرثیوں کے ضمنی مناظر میں ان جدید نظموں کی مشابہت موجود ہے۔ اگر یہ ٹکڑے قصائد وغیرہ سے الگ کر لئے جائیں تو جدید شاعری کے ذیل میں آسکتے ہیں۔ لیکن انکے علاوہ قدیم زمانے میں بعض شاعروں نے الگ نظمیں بھی لکھی ہیں۔ مثلاً گولکنڈہ کے بادشاہ سلطان محمد قلی قطب شاہ (متوفی ۱۶۱۱ء) کے قلمی دیوان میں متعدد نظمیں پھول پھل، ترکاری، شادی بیاہ، شب برات، ہولی، بسنت وغیرہ پر موجود ہیں۔ ایک نظم میں صراحی و پیالہ کا مناظرہ ہے۔ ان نظموں کی زبان دکھنی اردو ہے۔ دکن کے اور شاعروں نے بھی ایسی نظمیں لکھی ہیں۔

(۲) دوسرا دور۔ اس سے سو برس بعد دہلی میں مرزا سودا (۱۳ا۔۱۷۸۰ء) باقی حاشیہ صفحہ ۴۵۴ پر

قصص ہند کی فصاحت و دلکشی اور لطف و تاثیر کا آج تک جواب نہ ہو سکا۔

قند پارسی بھی فارسی جدید کے متعلق آزاد کی مفید کتاب ہے۔ نصیحت کا کرن پھول اخلاقی و تعلیمی قصہ ہے جو لڑکیوں کے لئے آزاد نے تصنیف کیا ہے۔ ان سے زیادہ اور عظیم الشان آزاد کے علمی و ادبی و لسانی کارنامے یہ ہیں:۔

۱۔ آب حیات (تذکرۂ شعرا) ۲۔ نیرنگ خیال دو حصے (رمزیہ تمثیلی مضامین)
۳۔ دربار اکبری (شہنشاہ اکبر اعظم کے زمانے کی تاریخ) ۴۔ سخندان فارس (فارسی علم اللسان)
۵۔ نگارستان فارس (تذکرۂ شعرائے فارسی) ۶۔ دیوان ذوق (مع حالات و تشریحات)

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۵۳)

اور میر تقی میر (۱۷۲۴ء-۱۸۱۰ء) اور بعض دوسرے شاعروں نے مناظر قدرت، مظاہر صنعت اور واقعات و حوادث کے متعلق نظمیں لکھیں۔ خصوصاً میر کی نظمیں آج تک اپنے رنگ میں بے نظیر ہیں۔

(۳) تیسرا دور میر و سودا کے زمانے میں، لیکن ان سے عمر میں چھوٹے اور شاعری میں کم رتبہ ایک بے نظیر شاعر میاں نظیر اکبر آبادی (۱۷۴۰ء-۱۸۳۰ء) تھے۔ میاں نظیر اس جدید شاعری کے ایسے عجیب علم بردار تھے کہ ان کا نام سب سے الگ لکھنے کے قابل ہے۔ گویا وہ اپنے دور میں اکیلے ہیں۔ نظیر فن شاعری کے اصول و قواعد کی کچھ بہت پروا نہ کرتے تھے اور جو موضوع اپنی شاعری کے لئے پسند کیا تھا وہ مقبول و رائج نہ تھا اگرچہ شاعرانہ محاسن میں نظیر کا کوئی مرتبہ نہیں ہے تاہم انھوں نے صدہا نظمیں اپنے جذبات و تاثرات سے لکھیں جن میں قدرتی مناظر، فطری جذبات، اخلاق و نصائح، مشاغل حیات سب کچھ شامل ہے۔ آدمی نامہ، فقیر کی صدا، پیسہ نامہ، برسات کی بہاریں، تیراکی کا میلہ، ہولی، دیوالی، بسنت، عید، عرس وغیرہ پر عجیب و غریب نظمیں لکھی ہیں۔ جو اس رنگ میں نہ پہلے لکھی گئی تھیں۔ نہ آج تک لکھی گئی ہیں۔

(۴) چوتھا دور۔ غدر ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان کے علم و ادب (باقی حاشیہ صفحہ ۴۵۵ پر)

۷۔ نظم آزاد (قومی و اخلاقی نظموں کا مجموعہ) یہ سب کتابیں آزاد کی زندگی میں شائع ہوگئی تھیں۔ ان کی وفات کے بعد ان کے وُرثا نے قلمی مسودات سے بہت سی کتابیں مرتب کر کے شائع کی ہیں۔ وہ یہ ہیں۔

۸۔ تذکرۂ علما۔ (۴۰ مشاہیر ہند کا تذکرہ) ۹۔ سپاک دنماک (آزاد کی مجذوبانہ تحریر) ۱۰۔ کائنات عرب (جغرافیہ و احوال عرب) ۱۱۔ لغت آزاد (اردو الفاظ کے فارسی مترادفات) ۱۲۔ ڈراما اکبر (فسانہ جہانگیر و نور جہاں) ۱۳۔ سیر ایران (سفرنامہ) ۱۴۔ فلسفۂ الٰہیات (مجذوبانہ تصنیف) ۱۵۔ جانورستان (حالات حیوانات) ۱۶۔ مکتوبات آزاد (مجموعہ خطوط) ۱۷۔ بیاض آزاد (آزاد کے پسندیدہ اشعار) ۱۸۔ خمکدۂ آزاد (غزلیات و منظومات)

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۵۴)

تہذیب و تعلیم، فکر و تخیل کے انقلاب کے ساتھ شروع ہوتا ہے۔ نظم جدید کی اس تحریک و اشاعت کا مولوی محمد حسین آزاد اور خواجہ حالی کے سر سہرا ہے۔ ۱۸۷۴ء سے اردو میں یہ مستقل صنف شاعری شروع ہوگئی۔ حالی و آزاد کے ہم عصر انیسویں صدی کے بہترین شاعر مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی ہیں، جن کی نظمیں محاسن شاعری میں آزاد و حالی دونوں سے بہتر ہیں۔ متانت و اثر و کثرت میں حالی کو اسمٰعیل پر تفوق ہے۔ ان بزرگوں کے ساتھ اکبر الہ آبادی، بے نظیر شاہ، جوالا پرشاد برق، درگا سہائے سرور جہان آبادی، شوق قدوائی وغیرہ امتیاز خاص رکھتے ہیں۔

(۵) پانچواں دور بیسویں صدی کے ساتھ شروع ہوتا ہے جس کی رفتار ترقی میں بعض ماہوار رسالوں نے بڑی مدد دی، مثلاً رسالہ مخزن لاہور (جاری شدہ ۱۹۰۲ء) اور رسالہ زمانہ کانپور (جاری شدہ ۱۹۰۳ء)۔ ان کے علاوہ بیسویں صدی کے ان پچاس سال میں بے شمار رسالے جاری ہوئے اور ان کے ذریعہ سے ہزارہا جدید نظمیں شائع ہوگئیں۔ ہر مہینے بلا مبالغہ کئی سو نظموں کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس زمانے کے (باقی حاشیہ صفحہ ۴۵۶ پر)

آزاد کا طرزِ تحریر

اگر کسی شخص کو آزاد کے سوانحِ زندگی، انقلابات و مصائب، افتادِ طبع اور جذب و جنون کا حال معلوم نہ ہو، اور وہ ان کی آبِ حیات، نیرنگِ خیال، قصصِ ہند، دربارِ اکبری، سخندانِ فارس وغیرہ کتابیں جو آثارِ جنوں سے پہلے کی لکھی ہوئی ہیں۔ مطالعہ کرے، تو پڑھنے والا آزاد کے اسلوبِ تحریر کی جدت و دلکشی، اور آزاد کی ذہانت و لطافتِ طبع سے متاثر ہونے کے ساتھ یہ بھی محسوس کرے گا کہ یہ مصنف "خیالی بندہ" اور "عالمِ خیال" کا رہنے والا ہے۔ اس کی ذہنی فضا احساسات و تاثرات سے بھری ہوئی یا اس کے دماغ پر تخیل کے بادل چھائے ہوتے ہیں۔ جن میں اس کا دل اور دل کے ساتھ قلم اڑتا چلا جاتا ہے علامہ آزاد کی تمام تصانیف اس "نظریہ" کی دلیل ہیں۔ صرف نیرنگِ خیال کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۵۵)

چند ممتاز جدید شاعر یہ ہیں:۔ ڈاکٹر اقبال، مرزا عزیز لکھنوی، صفی لکھنوی، چکبست لکھنوی، امجد حیدرآبادی، ظفر علی خاں، دنانک پرشاد طالب بنارسی، تلوک چند محروم، نادر کاکوروی، سیماب اکبرآبادی۔ ان کے علاوہ اور بھی ہیں۔ یہاں صرف چند نام لکھدیئے گئے ہیں۔ لیکن ترجیح بلا مرجح نہیں ہے۔ یہ وہ شاعر ہیں جن کی جدید شاعری ۱۹۰۱ء سے کچھ پہلے یا کچھ بعد شروع ہوئی۔ اب ان میں کتنے رحلت فرما گئے اور جو زندہ ہیں ان میں سے کسی کی عمر ۶۰ سال سے کم نہوگی۔

(۶) چھٹا دور۔ ان جدید شاعروں کا ہے' جن کی شاعری جنگِ عظیم (۱۹۱۴ء) یا تحریکِ آزادی (۱۹۲۰ء) کے بعد منظرِ عام پر آئی ہے۔ ان میں نسبتاً قدیم شاعر جوش ملیح آبادی ہیں۔ جوش سے زیادہ مکمل، خوبصورت اور کثرت سے لکھنے والا کوئی نہیں۔ لیکن ان کے سوا دوسرے ایسے جوہرِ قابل بھی ہیں جن پر ارود کو ناز ہے۔ اگرچہ اس زمانے میں کثرت اس قدر ہوگئی ہے کہ اعلیٰ معیار کا قائم رہنا دشوار ہے۔

تمثیلی و رمزیہ (ایلیگوریکل) مضامین پر یہ قیاس قائم نہیں کیا گیا ہے۔ اس طرح کی مستقل کتابیں عربی و فارسی میں بھی لکھی گئی ہیں۔ اور اردو میں بھی۔ ایسے مضامین سرسید، محسن الملک، حالی وغیرہ نے بھی لکھے ہیں۔ اور وہ یقیناً "خیالی بندے" نہ تھے۔

نیرنگ خیال کے علاوہ آزاد کی "آب حیات" میں ہر دور کی تمہید و خاتمہ، آب حیات دربار اکبری، سخندان فارس، دیوان ذوق کے صدہا چھوٹے جملے اور بڑی عبارتیں آزاد کی اس ذہنیت کی شاہد ہیں۔ چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

(۱) سب سے پہلے اور سب سے زیادہ جو طرز نگارش سامنے آتی ہے، وہ یہ ہے کہ آزاد اپنے تخلص (آزاد) کو جا بجا ضمیر متکلم کی جگہ استعمال کرتے ہیں۔ یہ انداز کہیں کہیں قدیم مصنفوں میں بھی پایا جاتا ہے لیکن نہ اس کثرت سے اور نہ اس طور پر جیسے

(الف) "آزاد ہندی نہاد کے بزرگ فارسی کو اپنی تیغ زبان کا جوہر جانتے تھے۔"

(آب حیات کا سب سے پہلا جملہ)

(ب) ایک سحر البیان، دوسرے گلزار نسیم، اور تعجب یہ کہ دونوں کے رستے بالکل الگ الگ ہیں۔ اس واسطے آزاد کو واجب ہے کہ کچھ اور اہل سخن سے اپنی رائے کی صحت و سقم کا حال پوچھے۔" (آب حیات ذکر میر حسن)

(ج) استاد مرحوم یہ حسرت ساتھ لے گئے، والد میرے شہید آزردہ ہوتے ہیں بڈھا ہو گیا۔ اب خطر ہے کہ امانت رہے، اور آزاد کو مسافر خانہ سے کوچ کا حکم آجائے۔" (دیباچہ دیوان ذوق کی پہلی سطریں)

(د) ایک زمانہ تھا کہ بندہ آزاد کو سب یاد تھا۔ افسوس کہ نہ وہ رہے۔ نہ بیاض رہی۔" (دیوان ذوق صفحہ ۲۴۹)

(ہ) "آہ استاد، کہاں استاد۔ خیر آزاد، بہار زندگی کے لطف ہوتے ہیں...." (دیوان ذوق صفحہ ۳۵۲)

(و) آزاد نے جو کچھ کیا، نیک نیت اور پاک عقیدت سے کیا ہے: (دیوان ذوق ص۲۵۴)
(ز) کاغذی تختے گلزار نظر آتے ہیں، مگر آزاد تم سے کہتا ہے کہ اندر کچھ نہیں،
وہ حقیقت میں لفظوں کی بہار تھی اور معنوں کی خزاں۔ (سخندان فارس ص۶۷)
(ح) جب ان کے چراغ خاندان سید خورشید علی نفیس بھی شعاع توجہ دریغ فرمائیں
تو غیروں سے کیا امید۔ انھوں نے آزاد خاکسار کو آب حیات کی رسید سے بھی شاداب نہ کیا۔
(آب حیات تذکرۂ میر انیس)
نام کا یہ استعمال عجب آزادہ روی کی شان اور دلکشی رکھتا ہے۔
(۲) دوسرا جدید اسلوب یہ ہے کہ جا بجا استعارہ کا استعمال اس طرح کرتے
ہیں کہ دوسرے مصنفوں نے کہیں اتفاق ہی سے کیا ہوگا۔ مثلاً
(۱) قدر دانی نے ان کے کلام کو جوہر اور موتیوں کی نگاہوں سے دیکھا اور نام کو پھولوں
کی مہک بنا کر اڑایا۔ (آب حیات تذکرہ میر تقی میر)
(۲) فتحیاب اپنے صاحب ملک اور صاحب زبان تھے ان کی حب الوطنی اور بلند
نظری فارس کی زبان کو نئی لغت کے کانٹوں سے سنتی تو عجب نہ تھا۔ (سخندان فارس، فارسی
زبان میں انقلاب)
(۳) اقبال مندوں کے دربار میں علوم و فنون کے ساتھ انشا پردازی بھی امیدوار آئی
انھوں نے فقط امید کا پیٹ نہ بھرا، بلکہ ذوق شوق کو چمکا کر تصنیفات کے میدان کھلوا دیئے"
(سخندان فارس کا دوسرا مضمون)
(۴) دیکھو ملا صاحب نے ظرافت کا نشتر مارا تھا، وہاں سے سخاوت کا چشمہ بہہ نکلا
(دربار اکبری۔ تذکرہ بیرم خاں)
(۵) ایک مضمون میں اہل وطن کو "تم" اور "تمہارے" لفظوں سے خطاب کرتے
کرتے یکا یک تخاطب بدل کر فرماتے ہیں۔

اے خاک ہندوستان، اگر تجھ میں امرا لقیس اور لبید نہیں تو نہیں۔ کالیداس
ہی نکال، اے ہندوستان کے صحرا و دشت فردوسی اور سعدی نہیں تو کوئی
والمیک ہی پیدا کردو"۔ (لکچر انجمن پنجاب ضمیمہ نیرنگ خیال حصہ اول)

(۶) "خان خاناں اور خان اعظم کے ایوان ملک ملک کے صنائع و بدائع سے ایک
کامل نمایش گاہ بنے ہوئے تھے، جن کے در و دیوار فصل بہار کی چاندنی کو ہاتھوں پر پھیلائے
کھڑے تھے، اور ہر ستون ایک باغ کو بغل میں دبائے تھا"۔

(دربار اکبری جشن نوروزی جلال الدین اکبر)

(۷) استاد ذوق کو سرکار ولیعہدی سے چار روپیہ ماہوار تنخواہ ملنے کے ذکر پر لکھتے
ہیں:۔"ادھر تو شاعروں کے جگمٹ کی دل لگی لے اُدھر کھینچا، اُدھر قسمت نے آواز دی
کہ للعمر نہ سمجھنا، یہ ایوان ملک الشعرائی کے چار ستون قائم ہوتے ہیں"۔ (دیوان ذوق)
یہ شاعرانہ فقرے اور تخیلی انداز آزاد کی تمام تصانیف میں بڑی کثرت سے
ہے۔ لیکن بالکل آورد ہے یہ اسلوب مرزا غالب کے رقعوں میں کہیں پایا جاتا ہے
ز اس انداز سے کہ آورد نہیں معلوم ہوتا۔ لیکن دور اصلاح و ترقی یعنی سرسید اور انکے
بعد کے مصنفوں میں نہیں ہے۔ بہرحال آزاد کی خصوصیت ہے۔

(۳) علامہ آزاد کی طبیعت میں نازک خیالی اور لطافت و موزونیت خداداد
تھی۔ فارسی زبان کی محبت و شغف نے اس جوہر کو چمکا دیا تھا۔ ظہوری اور
نعمت خاں عالی کی نثر کو پسند کرتے تھے، اور ان کی نازک خیالیوں اور بلند پروازیوں
کا اثر دل و دماغ پر تھا۔ چنانچہ سخندان فارس میں لکھتے ہیں:۔

"ان کے نازک خیال، خوبصورت استعارے، نئی نئی تشبیہیں، خوشنما ترکیبیں
لفظوں کی تراشیں، خیالوں کی نزاکتیں، طبیعتوں کی بلند پروازیاں، صنعتوں
کے ہجوم، جواب نہیں رکھتے۔ ظہوری نے جس فقرہ کے ساتھ فقرہ جوڑا ہے

مجال نہیں کہ ایک کو اٹھا کر کوئی دوسرا فقرہ اس کی جگہ رکھ سکے۔ ذرا دیکھنا، بادشاہ کی فصاحت کی تعریف میں کہتا ہے۔ نکتہ ہائے برجستہ غنچہ ہائے سربستہ (پھر کہتا ہے) ہر صفحش چمنے، ہر سطرے انجمنے، ہر حرفش فصلے، ہر فرش اصلے۔ (حسن کی تعریف کرتے کرتے کہتا ہے)" ابروان خجستہ، کلید دل ہائے بستہ"

اس کے بعد اس طرز تحریر کے استعمال کے متعلق ہدایت کرتے ہیں:۔

"بات یہ ہے کہ ان کتابوں کو بڑی غور اور احتیاط سے پڑھنا چاہئے۔ انھوں نے خوبی الفاظ، اور نزاکت خیال، اور زور طبع کو بے مطلب و بے مزہ خرچ کیا ہے۔ تم انھیں لو، اور بیان مطلب کے کام میں لاؤ۔ پھر دیکھو گے تمہاری عبارت کیا کیفیت اور کیا تاثیر پیدا کرتی ہے۔"

چنانچہ آزاد خود اپنی تصانیف میں اس سے کام لیتے ہیں۔ اوپر جو مثالیں متفرق جملوں کی لکھی گئی ہیں، ایسا ہی اسلوب نگارش آزاد کے ہاں طویل و مسلسل عبارتوں میں بھی ملتا ہے۔ نمونے دیکھئے:۔

(الف) "اردو کا درخت اگرچہ سنسکرت اور بھاشا کی زمین میں اُگا، مگر فارسی کی ہوا میں سرسبز ہوا، البتہ مشکل یہ ہوئی کہ بیدل اور ناصر علی کا زمانہ قریب گذر چکا تھا۔ اور انکے معتقد باقی تھے۔ اور استعارہ اور تشبیہ کے لطف سے مست تھے، اس واسطے گویا اردو بھاشا میں استعارہ و تشبیہ، کا رنگ بھی آیا اور بہت تیزی سے آیا۔ یہ رنگ اگر اسی قدر آتا کہ جتنا چہرہ پر اُبٹنے کا رنگ یا آنکھوں میں سرمہ، تو خوشنمائی اور بینائی دونوں کو مفید تھا۔ مگر افسوس کہ اس کی شدت نے ہماری قوت بیان کی آنکھوں کو سخت نقصان پہنچایا اور زبان کو خیالی باتوں سے فقط توہمات کا سوانگ بنا دیا۔"

(آب حیات، زبان اردو کی تاریخ صفحہ ۴۹)

(ب) "جب وہ صاحب کمال (استاد ذوقؔ) عالم ارواح سے کشور اجسام کی طرف چلا تو فصاحت کے فرشتوں نے باغ قدس کے پھولوں کا تاج سجایا، جس کی خوشبو شہرت عام بن کر جہاں میں پھیلی اور رنگ نے بقائے دوام سے آنکھوں کو طراوت بخشی، وہ تاج سر پر رکھا گیا تو آب حیات اس پر شبنم ہو کر برسا کہ شادابی کو کملاہٹ کا اثر نہ پہنچے۔ ملک الشعرائی کا سکّہ اس کے نام سے موزوں ہوا اور اس کے طغرائے شاہی میں یہ نقش ہوا کہ اس پر نظم اردو کا خاتمہ کیا گیا۔"

(آب حیات تذکرہ ذوقؔ)

(ج) "نظم اردو کی نقاشی میں مرزائے موصوف (یعنی مرزا سوداؔ) نے قصیدہ پر دستکاری کا حق ادا کر دیا ہے۔ ان کے بعد شیخ مرحوم (یعنی استاد ذوقؔ) کے سوائے کسی نے اس پر قلم نہیں اٹھایا، اور انھوں نے مرقع کو ایسی اونچی محراب پر سجایا کہ جہاں کسی کا ہاتھ نہیں پہنچا! انوری، ظہیر، ظہوری، نظیری، عرفی فارسی کے آسمان پر بجلی ہو کر چمکتے ہیں۔ لیکن ان کے قصیدوں نے اپنی کڑک دمک سے ہند کی زمین کو آسمان کر دیا۔"

(آب حیات و دیوان ذوقؔ، قصائد پر رائے)

(د) "حضرت عشق نے شادی کی تھی، اور محبت کے قاضی نے نکاح پڑھایا تھا۔ ہمایوں کو دم بھر کی جدائی گوارا نہ تھی۔ دن ایسے نحوست کے تھے کہ ایک جگہ قرار نہ ملتا تھا...... جو دھپور کا رُخ ہے کہ ادھر سے امید کی آواز آئی ہے۔ قریب پہنچکر معلوم ہوتا ہے کہ وہ امید نہ تھی، دغا آواز بدل کر بولی تھی۔ وہاں تو موت منھ کھولے بیٹھی ہے۔" دربار اکبری ص۲)

(ہ) اسی کے آگے اکبر بادشاہ کی ولادت کا ذکر کرتے ہیں:۔

اس عالم میں ایک دن ملازم نے آکر خبر دی کہ مبارک، اقبال کا تارا طلوع ہوا!

یہ ستارہ ایسے ادبار کے وقت جھلملایا تھا کہ کسی کی آنکھ ادھر نہ اٹھی، مگر تقدیر
ضرور کہتی ہوگی کہ دیکھنا، آفتاب ہو کر چمکے گا اور سارے ستارے اس کی
روشنی میں دھندلے ہو کر نظروں سے غائب ہو جائیں گے (دربار اکبری ص۶)

نثر میں شاعرانہ تخیل و اسلوب بیان کی ایسی دلکش و برجستہ مثالیں آزاد کے ہم عصروں
میں کہیں نہیں ملتیں۔ یہ بھی آزاد کے "عالم خیال" کی تصویریں ہیں۔

(۴) خیالی طرز ادا کی ایک اور دلچسپ صورت آزاد یہ اختیار کرتے ہیں کہ
تاریخی واقعات و قیاسیات، جن کو دوسرے مصنف واقعہ فرض کرکے واقعہ
کے طور پر بیان کرتے ہیں، ان کو آزاد قیاسی و احتمالی انداز سے لکھتے ہیں۔ مثلاً
زبانوں کی ساخت کے متعلق فرماتے ہیں۔

(الف) "مگر ایک زمانہ ضرور ہوگا کہ جس میں ان کی ایک زبان ہوگی۔ اسی
کے الفاظ ایک گھرانے کے آدمی ایک گھر میں رہ سہ کر بولتے ہوں گے اور ایک ہی
الفاظ گھروں کے کاروبار میں کام دیتے ہوں گے' یا یہ دونوں زبانیں ایک زبان
سے اس طرح نکلی ہوں گی جس طرح ایک ماں باپ کی دو بیٹیاں جدا ہو گئیں"
(سخندان فارس ص۱)

(ب) کوٹھی کے لفظ کی اصل اور اس کے رواج کی صورت بیان کرتے ہیں:۔
"ہندوستان میں صاحب لوگ لباس تجارت میں آئے تھے۔ چونکہ تاجروں کا رہنا
سہنا، ملنا جلنا، لین دین تاجروں ہی سے ہوتا تھا۔ اول اول معاملات بھی
بنگالہ کے تاجروں اور مہاجنوں ہی سے ہوں گے۔ عام مسافرت میں انھیں
لاکر چاکر درکار ہوئے ہوں گے۔ وہ بھی انھیں سے لئے ہوں گے عالی شان
مہاجنوں اور سوداگروں کی دکانوں کو کوٹھی کہتے ہیں۔ چونکہ صاحب لوگ
لباس تجارت میں تھے جب کسی سے ملتے جلتے ہوں گے کوٹھی پر جا کر ملتے ہوں گے

وہ پوچھتے ہوں گے آپ کی کوٹھی کہاں ہے، یہ پتا بتا دیتے ہوں گے، اور سمجھتے ہوں گے کہ کوٹھی گھر کو کہتے ہیں، کیونکہ مسافر تھے۔ ان کی دُکان اور کوٹھی ایک ہی تھی۔ انکے نوکر بھی کوٹھی ہی کہتے ہوں گے۔ کام کے موقع پر آپ کہتے ہوں گے، یہ چیز ہماری کوٹھی پر لے آؤ۔ اور لوگ کہتے ہوں گے، یہ چیز صاحب کی کوٹھی پر دے آؤ۔ مدت کے بعد تجارت کا پردہ اُٹھا دیا۔ وہی گھر دارالحکومت ہو گئے۔ جب سے کوٹھی کا نام جو محاورہ میں آگیا تھا، وہی رہا اور یہ نیک نیتی کا پھل ہے۔" (سخندان فارس)

(ج) عبدالرحیم خانخاناں کے بچپن کے مصائب کا ذکر کرتے ہیں:۔

"وہ تین برس کی جان (عبدالرحیم خانخانان) کیا کرتا ہوگا، سہم کر رہ جاتا ہوگا ماں کی گود میں دبک جاتا ہوگا، ڈرتا ہوگا، انّا کے پاس چھپ جاتا ہوگا انسوس وہ بچاریاں کہاں چھپالیں کہ آپ ہی چھپنے کو جگہ نہیں۔ الٰہی! تیری پناہ! عجب وقت ہوگا، شام غریباں اسی کو کہتے ہیں۔ رات قیامت کی رات گذری ہوگی، دن ہوا تو روزِ محشر۔" دربار اکبری ص۵۶

(د) "زبان اردو کی تاریخ" کے سلسلے میں ہندوستان کی قدیم تاریخ بیان کرتے ہیں:۔

فتح یابوں نے ہندو کش کے پہاڑ اُتر کر پہلے تو پنجاب ہی میں ڈیرے ڈالے ہوں گے، پھر جوں جوں بڑھتے گئے ہوں گے، اصلی باشندے کچھ تو لڑتے مرتے دائیں بائیں جنگلوں کی گود اور پہاڑوں کے دامن میں گھستے گئے ہوں گے، کچھ بھاگے ہوں گے، وہ دکن اور مشرق کو ہٹتے گئے ہوں گے۔ کچھ فتحیابوں کی غلامی اور خدمتگاری میں کام آئے ہوں گے، اور وہی شودر کہلائے ہوں گے، چنانچہ اب تک بھی ان کی صورتیں کہے دیتی ہیں

کہ یہ کسی اور بدن کی ہڈی ہیں"۔ (آبِ حیات صٰ۔)

(۵) اسی طرح جن شاعروں کا ذکر آئندہ کرنے والے ہیں۔ ان کے کلام کی خصوصیات جب خلاصہ کے طور پر پہلے بیان کرتے ہیں تو وہاں بھی وہی پرداز خیال دکھاتے ہیں۔ آبِ حیات کے ہر دور کی تمہید میں اس طرح کے فقرے لکھے ہیں۔ مثلاً "دورِ سوم" پر تنقید کرتے ہیں:۔

"تم دیکھنا، وہ بلندی کے مضمون نہ لائیں گے، آسمان سے تارے اتاریں گے، قدر دانوں سے فقط داد نہ لیں گے، پرستش لیں گے۔ لیکن نہ وہ پرستش کہ سامری کی طرح عارضی ہو۔ ان کے کمال کا دامن قیامت کے دن سے بندھا پاؤ گے۔ یہ اپنی صنعت میں کچھ کچھ تکلف بھی کریں گے، مگر ایسا جیسے گلاب کے پھول پر شبنم یا تصویر پر آئینہ سازی کا تکلف بھی اصلی لطافت پر کچھ لطف زیادہ کرے گا، اس کی خوبی پر پردہ نہ ہوگا۔ تم میر صاحب اور خواجہ میر درد کو دیکھو گے کہ اثر میں ڈوبے ہوں گے، سودا کا کلام باوجود بلندی مضمون اور چستی بندش کے تاثیر کا طلسم ہوگا"

(آبِ حیات تمہید دورِ سوم)

یہ اسلوبِ تحریر نہایت دلچسپ، لطیف اور پرتاثیر ہے۔ اور محاکات پیدا کرنے کا بالکل صحیح طریقہ۔ لیکن یہ بھی "خیالستانِ آزاد" کے جلوے ہیں، کوئی اور مصنف اس طرح نہیں لکھتا۔ آزاد کی ایجاد ہے۔

(۵) علامہ آزاد کی تحریر پر فارسی نثر کی کتابوں میں سے گلستانِ سعدی کی طرزِ تحریر کا اثر ہے۔ سخندانِ فارس میں ایک جگہ گلستاں کا ذکر لکھتے ہیں:۔

"عجائب اتفاقات سے یہ ہے کہ صدی کے ۶۵۶ھ میں شیخ سعدی کی زبان پر جوشِ محبت نے ایک چشمہ کھول دیا۔ اس میں فصاحت نے شربت اور

سلاست نے دودھ بہایا، اور گلستاں ایک ایسی کتاب سرسبز ہوئی جس کا آج
تک جواب نہیں...... چھوٹے چھوٹے فقرے ہیں اور کٹری کٹری عبارت ہے
مگر خدا نے اس کے بیان میں گھلاوٹ اور زبان میں ایسا لوچ دیا ہے کہ ریشم کے
لچھے مسلسل معلوم ہوتے ہیں صنائع و بدائع کی دستکاری نے اسے قلم نہیں لگایا
مگر سادگی کے منہ سے پھول جھڑتے ہیں، اس کے ننھے ننھے فقرے، آیت اور حدیث
کی طرح اب تک تقریروں اور تحریروں کو قوت دیتے ہیں، مزا یہ ہے کہ جو چٹخارا
زبان کو نظم پڑھنے میں آتا ہے، وہ اس کی نثر میں آتا ہے کیونکہ اسکی قدرتی فصاحت
نظم و نثر کو ایک قالب میں ڈھالتی ہے۔" (سخندان فارس، تیسرا لکچر ص ۶۲)

اگرچہ آزاد کی زبان کو صنائع بدائع کی دستکاری نے قلم لگایا ہے پھر بھی منہ سے پھول جھڑتے معلوم ہوتے ہیں۔ اگرچہ آزاد کے فقرے گلستاں کے فقروں کی طرح تقریروں اور تحریروں کو قوت نہیں دیتے، تاہم ان کے پڑھنے میں زبان کو نظم کا سا چٹخارا ملتا ہے۔

یہی وصف طرز آزاد کی سب سے بڑی خصوصیت اور بالکل انفرادی شان ہے جس میں کوئی دوسرا مصنف ان کا شریک نہیں ہے۔ چھوٹے چھوٹے فقرے، تشبیہ و استعارہ کی لطافت و برجستگی، بیان کی سلاست و روانی، الفاظ کی شیرینی اور موسیقیت سب مل کر سادگی و پُرکاری کا عجیب و نادر نمونہ پیش کرتے ہیں۔ اور یہ اسلوب علامہ آزاد کی ہر تحریر میں موجود ہے۔ اسی کو سہل ممتنع کہتے ہیں کہ بظاہر بہت آسان معلوم ہوتا ہے لیکن لکھ کر دیکھیے تو صفحہ دو صفحے لکھنے مشکل ہیں۔ آزاد اسی اسلوب بیان کے سبب سے صاحب طرز کہلاتے ہیں۔ مذکورۂ بالا سب چھوٹی بڑی عبارتیں اس کے نمونے ہیں۔ اس کے علاوہ اور نمونے آزاد کی تصانیف کے سلسلے میں آئندہ آتے ہیں۔

طرز آزاد کا نقص

علامہ آزاد نے مختلف موضوعوں پر کتابیں لکھی ہیں، خیالی و تمثیلی مضامین (نیرنگ خیال)، تذکرۂ شعرا (آب حیات)، تاریخ و سیرت

(دربار اکبری، فلسفۂ زبان، سخندانِ فارس، تاریخی کہانیاں، قصص ہند) وغیرہ ان میں سے ہر موضوع کے لئے الگ اسلوب بیان ہوتا ہے۔ لیکن آزاد نے ہر تصنیف اپنے خیالی رنگ میں لکھی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تاریخی واقعات جو تشبیہ و استعارہ میں بیان کئے گئے، وہ اگر صحیح واصلی تھے، تب بھی ان میں فسانہ کا رنگ آگیا۔ اور درست و واقعی تنقید بھی جب مبالغہ کے انداز میں لکھی گئی تو خیالی ہو گئی۔ ان کی آبِ حیات میں نیرنگِ خیال کا لطف ہے، اور دربارِ اکبری میں قصص ہند کا مزہ۔ اسی لئے کہیں کہیں آزاد کی تحقیق تحقیق نہیں معلوم ہوتی، اور تنقید تنقید نہیں رہتی۔ لیکن کچھ نہ رہنے پر بھی انشا پردازی کا عجیب لطف و اثر رہتا ہے۔ اسی بنا پر علامہ آزاد کے متعلق علامہ شبلی کی یہ رائے ہے:۔

"آزاد کی کتاب آئی، جانتا تھا کہ وہ تحقیق کے میدان کا مرد نہیں، تاہم اِدھر اُدھر کی گپیں ہانک دیتا ہے تو وحی معلوم ہوتی ہے۔"

آزاد کی طبیعت کا عجیب خاصہ علامہ آزاد مورخ بھی ہیں اور نقاد بھی۔ اور مورخ و نقّاد کا پہلا فرض صداقت، انصاف اور بے تعصبی ہے لیکن آزاد کی یہ عجیب عادت ہے کہ اپنی رائے کی تائید میں، یا اپنے مفروضات کو ثابت کرنے کے لئے یا اپنے پسندیدہ و ناپسندیدہ شخص کی مدح وذم کی خاطر، کبھی واقعات فرض کر لیتے ہیں، کبھی خلاف واقعہ نتائج اخذ کر لیتے ہیں۔ اس کام کے لئے اسلوب بیان بڑا دلچسپ و عجیب اختیار کرتے ہیں۔ مثلاً کسی کے حالات بیان کر رہے ہیں، اس کے جملہ محاسن و فضائل نہایت عقیدت و ارادت سے لکھتے ہیں گویا بے تعصبی کے ساتھ انصاف کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ لیکن لکھتے لکھتے کبھی درمیان میں، کبھی آخر میں چٹکی لے لیتے ہیں۔ آبِ حیات اور دربارِ اکبری میں، اس کا زیادہ موقع تھا۔ وہیں یہ باتیں خوب نظر آتی ہیں۔ بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ دربارِ اکبری تو صرف اسی غرض سے لکھی ہے۔ یہ تمام کتاب ملّا عبدالقادر بدایونی

کی تصنیف منتخب التواریخ پر مبنی ہے۔ بلکہ ملّا صاحب کی تردید و تضحیک کے لئے لکھی گئی ہے۔ علّامہ آزاد کو اکبر بادشاہ کی ذات و حکومت سے کوئی خاص تعلق و ہمدردی نہیں، اس کے اس لئے مدّاح ہیں کہ وہ ابوالفضل، فیضی، خانخاناں وغیرہ کا قدردان ہے۔ اور چونکہ ملّا عبدالقادر نے مشاہدہ و تجربہ کی بنا پر فیضی وغیرہ کی زمانہ سازی و اسلام کُشی کو صداقت و جوش اسلامی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اس لئے آزاد ملّا صاحب سے بیزار ہیں۔ آزاد کی تصانیف سے چند مثالیں یہ ہیں :۔

(۱) آبِ حیات دورِ سوم میں حضرت میرزا مظہر جانجاناں رحمۃ اللہ علیہ کی جو مذمّت آزاد نے کی ہے وہ صفحہ ۱۳۶ و ۱۳۸ پر درج ہے۔

(۲) آبِ حیات دورِ پنجم میں شاہ نصیر دہلوی کے حُسنِ اعتقاد کے سلسلے میں آزاد نے جو کچھ لکھا ہے اس سے آزاد کا حُسنِ ظن اور حُسنِ بیان مترشح ہے۔

(۳) آبِ حیات کی اشاعت اوّل میں آزاد نے حکیم مومن خان دہلوی کا حال اپنی ذاتی رنجش و کدورت کے سبب سے دانستہ ترک کر دیا تھا۔ ورنہ خلاف قیاس ہے کہ جب علّامہ آزاد ۲۵ برس کی عمر تک دہلی میں رہے تھے مومن خاں کو دیکھا تھا اور ان کے ساتھ مشاعروں میں شرکت کی تھی، ان کا کلام ان کی زبان سے سُنا تھا تو ان کے حالات سے اتنی آگاہی نہ ہوتی کہ "آبِ حیات" کے لئے ان کا تذکرہ مرتب کر سکتے۔

(۴) دربارِ اکبری میں علّامہ آزاد ہر موقع پر ملّا عبدالقادر بدایونی کو لعن و طعن کرتے ہیں اور اس طرح کرتے ہیں کہ دل کا بخار نکالنے کے سوا کوئی مقصد معلوم نہیں ہوتا مثلاً ملّا صاحب نے ابوالفضل کے حال میں ایک جگہ لکھا ہے :۔

"و تفسیر آیۃ الکرسی کہ دقائق و نکات قرآنی دراں خیلے درج شدہ می گویند کہ تصنیف والدش بود گذرانیدہ، عزِ تحسین یافت "و تفسیر اکبری" تاریخ آں شد"

منتخب التواریخ جلد دوم ص ۲۰۸

اس پر علامہ آزاد "دربار اکبری" (ص ۹۳) میں ملا عبدالقادر کے متعلق لکھتے ہیں :۔

"مگر بد روئے حسد سیاہ، تفسیر اکبری پیش کرنے کا حال اپنی کتاب میں لکھا تو بھی شوشہ لگا دیا کہ لوگ کہتے ہیں اس کے باپ کی تصنیف ہے۔ اچھا یہ ہی ہے تو اسکے باپ کا مال ہے۔ آپ کے باپ کا تو نہیں۔ اس کا باپ تو ایسا تھا۔ تمہارا تو باپ بھی ایسا نہ تھا۔"

یہ ایک مثال ہے جس کے نمونوں سے تمام دربار اکبری بھری پڑی ہے۔

(۵) دیوان ذوق میں آزاد لکھتے ہیں :۔

"۱۸۴۵ء میں نواب اصغر علی خاں کے ہاں رامپور کے بعض خوانین آئے۔ بڑی دھوم دھام سے مشاعرہ کیا تھا۔ اصغر علی خاں مومن خاں سے اصلاح لیتے تھے انھیں ساتھ لیکر استاد مرحوم (یعنی ذوق) کے پاس آئے۔ اور بڑے اصراروں سے مشاعرہ میں آنے کا اقرار لیا۔۔۔۔۔ ملاقات مذکورہ بالا کی باتوں میں استاد نے یہ بھی بیان کیا کہ مومن خاں نے مجھ سے کہا، کچھ ان دنوں کا کہا ہوا سنائیے مدتیں گذر گئیں آپ کے منہ سے کچھ نہیں سنا۔ میں نے کہا، حضور کی غزلیں فرصت کہاں دیتی ہیں؟ پھر کہا، پھر کہا، خیر میں نے دو شعر سنا دیے، انھیں دنوں میں ہوئے تھے :۔ ؎

خط بڑھا، کاکل بڑھے، زلفیں بڑھیں، گیسو بڑھے
حسن کی سرکار میں جتنے بڑھے ہندو بڑھے

بعد رنجش کے گلے ملتے ہوئے رکتا ہے دل
اب مناسب ہے یہی، کچھ میں بڑھوں کچھ تو بڑھے

والد نے کہا، انھوں نے بھی کچھ سنایا؟ فرمایا، نہیں، یہی کہتے رہے، نجوم کا مرض ایسا لگا ہے کہ ایک دم مفارقت نہیں کرتا، دل نہیں لگتا، چرچا جاتا رہا،

وغیرہ وغیرہ اس بیان سے بندہ آزاد کا یہ مطلب نہیں کہ وہ ایسا کہہ نہ سکتے تھے،
بے شک ان کے دیوان میں کئی ایسے مطلع موجود ہوں گے، مگر سخن سنج نکتہ شناس
تھے۔ سامع اس کے عاشق معشوق مزاج تھے۔ ایک ایسا شعر کہ مطلع ہو، اور
اس میں اثبات مضمون ہم گواہوں سے قائم ہو۔ اس پر غزلیت کے اوصاف سے
متّصف ہو وغیرہ وغیرہ۔ سامعے سُن کر جو پڑھتے تو اسی رُتبہ کا مطلع پڑھتے، وہ
زبان پر نہ دھرا تھا، اور وہ ان لوگوں میں نہ تھے کہ شعر سُنا اور شعر خوانی شروع
کر دی۔ بات کو سمجھتے تھے اور محل و مقام پہچانتے تھے۔"

دیکھئے علّامہ آزاد کس قدر خوبصورت طریقے سے مومن خاں کی تنقیص کرتے ہیں
کہ معلوم ہوتا ہے مدح کر رہے ہیں۔

آزاد کی سخن سنجی

عجیب بات ہے کہ علّامہ آزاد نثر کے لفظوں اور فقروں، ترکیبوں اور بندشوں کے تناسب و ترنم اور صفائی و سلاست کے متعلق اور
تخییل و طرزِ ادا کے لحاظ سے جس قدر ذوقِ صحیح اور طبعِ سلیم رکھتے تھے۔ نظم کی لفظی
و معنوی خوبیوں میں اس کے بالکل برعکس مذاق پایا تھا۔ ان کے خواص طبیعت
کے سلسلے میں اس کی بعض مثالیں دیکھئے۔

(۱) اوپر کی مثال میں ذوق کے مطلع کی اس قدر تحسین خود آزاد کی سخن سنجی کی
داد دے رہی ہے۔ اہلِ ذوق جانتے ہیں کہ اس مطلع کا اردو شاعری اور صنفِ غزل
میں کوئی مرتبہ نہیں۔ یہ مضمون اور اس کے اثبات کے چاروں گواہ نہ شاعری کا
شاہکار نہ ذوق کا کارنامہ۔

(۲) آزاد نے آبِ حیات پہلے لکھی ہے۔ دیوانِ ذوق اس کے ایک عرصہ بعد
مرتب کیا ہے۔ دیوان کی بعض غزلوں میں آزاد نے تصرّف کیا ہے۔ اس کی توجیہ
دیباچۂ دیوان کے آغاز ہی میں کرتے ہیں :-

"ان کے کلام کی ترتیب آسان کام نہیں۔ صدہا شعر ہیں کہ لوگوں کے پاس
کچھ لکھے تھے، دیوان مُروّجہ میں کچھ چھپے' اور ان کی زبان سے کبھی کچھ سنے پھٹے
پرانے سودے لڑکپن سے بڑھاپے تک کی یادگار ہیں۔ والد مرحوم کے ہاتھ
کی بہت تحریریں ہیں۔ بہت کچھ میری قسمت کے نوشتے ہیں کہ حاضر و غائب
لکھتا اور جمع کرتا تھا گرے پھٹے اشعار کا پڑھنا، مٹے حرفوں کا اُجالنا،
اس زمانہ کے خیالات کو سمیٹنا، حالتوں کا تصور باندھنا، بھولے بسرے الفاظ
و مطالب کو سوچ سوچ کر نکالنا، میرا کام نہ تھا، خدا کی مدد اور پاک روحوں
کی برکت شامل حال تھی۔ میں حاضر اور خدا ناظر تھا۔ راتیں صبح ہوگئیں، اور
دن اندھیرے ہوگئے جب یہ مہم سرانجام ہوئی ہے!"

یعنی علامہ آزاد کے جو کچھ جی میں آیا، اور جہاں جیسا مناسب سمجھا، لکھ دیا۔
آزاد کے مُرتبہ "دیوان ذوق" میں جو غزلیں دیوان مروّجہ سے علیحدہ ہیں،
ان کے متعلق تو کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن جو غزلیں خود آزاد "آب حیات" میں
درج کر چکے تھے، ان کو دیوان میں درج کرتے وقت جو حکّ و اصلاح کی ہے
اس سے آزاد کے ذوقِ سخن کا پتا چلتا ہے۔ مثلاً آب حیات میں ذوق کا مطلع ہے

مزے یہ دل کے لئے تھے، نہ تھے زباں کے لئے
سو ہم نے دل میں مزے سوزش نہاں کیلئے

اس کو آزاد نے "دیوان ذوق" میں اس طرح لکھا ہے۔

مزے تو دل کو ملے تھے، ہوئے زباں کے لئے
پہ ہم نے دل میں مزے سوزش نہاں کیلئے

ذوق سلیم جانتا ہے کہ آزاد کے تصرّف نے دونوں مصرعوں کو سست اور
مضمون کو پست کر دیا۔

اسی غزل کا ایک اور شعر آب حیات میں یوں ہے :۔

الٰہی کان میں کیا اُس صنم نے پھونک دیا

کہ ہاتھ رکھتے ہیں کانوں پہ سب اذاں کیلئے

اور دیوان میں اس طرح :۔

الٰہی کان میں ہے کیا صنم نے پھونک دیا

کہ ہاتھ رکھتے ہیں کانوں پہ سب اذاں کیلئے

اس ترمیم میں دو عیب پیدا ہو گئے ایک بندش کا ایک مضمون کا۔ اور تعجب ہے کہ آزاد کی نظر ان پر نہ پڑی۔ پہلے مصرع میں (ہے) کا لفظ آنے سے تعقید پیدا ہو گئی جبکہ (ہے) کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ اس کے علاوہ پہلی صورت میں (اُس صنم) سے اپنے اپنے محبوب کی تخصیص میں بہت لطف تھا جو دوسری صورت کی عمومیت سے جاتا رہا۔

اسی غزل کا ایک اچھا خاصا شعر تھا

نہیں ہے خانہ بدوشوں کو حاجت ساماں

اثاثہ چاہئے کیا خانۂ کماں کے لئے

اس کو آزاد نے اس طرح بدل کر مہمل کر دیا

قد خمیدہ پر اپنے ہیں بال زیب و بال

اثاثہ کچھ تو رہے خانۂ کماں کے لئے

استاد ذوق کے بہت سے اشعار میں اس طرح کے تصرفات کئے ہیں۔

(۳) آزاد خود اپنی نظموں میں بھی جا بجا تعقید کا عیب پیدا کر دیتے ہیں۔ آزاد کی نظم (شام کی آمد اور رات کی کیفیت) کے بعض شعر دیکھئے :۔

زاہد مراقبے کا ہے دم سب کو دے رہا

اور آپ مارے نیند کے جھونکے ہے لے رہا

سونے کو مہر بھی ہے بہ خواب عدم گیا
دریا بھی اب تو چلنے سے شاید ہو تھم گیا
دل دے رہا جو شیر محبت کے جام ہے
ماں دیکھو اپنی نیند کو کرتی حرام ہے

اوّلیاتِ آزاد

آزاد کا مرتبہ

آزاد با کمال "خداساز" ہستیوں میں تھے، ان کا ذہن زبان و محاورہ الفاظ و بندش کے انتخاب کے متعلق صحیح توازن و تناسب رکھتا تھا، اور ان کی طبیعت میں ندرت آفرینی و جدّت طرازی اعلیٰ درجے کی تھی۔ زبان و بیان کی شیرینی و نرمی میں کوئی ادیب ان کا شریک نہیں ہے اس لئے آزاد اپنے زمانہ کے پہلے صاحب طرز ہیں۔ آزاد کے طرز کو شاعرانہ و عاشقانہ زبان میں بیان کیا جائے تو کہہ سکتے ہیں کہ آزاد تنہا "طرحدار" ادیب ہیں۔ ان کی تحریر کا بانکپن، سچ یہ ہے کہ لفظوں میں بیان کرنا مشکل ہے۔ "گویا" مزے یہ دل کے لئے ہیں، نہیں زباں کے لئے"

اسی جدّت پسندی کا یہ نتیجہ ہے کہ علامہ آزاد نے طرز عبارت کی ایجاد کے علاوہ مضامین و موضوعات کی ترتیب و تالیف میں وہ جدّتیں پیدا کی ہیں جو ان سے پہلے موجود نہ تھیں، اور یہ اوّلیاتِ آزاد ہیں۔ مثلاً

(۱) شعرا کے تذکرے آزاد سے پہلے بھی بہت لکھے گئے، لیکن سب نہایت مختصر تھے، اکثر میں حروف تہجی کی ترتیب تھی، کسی میں زمانے کی تقدیم و تاخیر کا لحاظ رکھا گیا تو مجمل اور سرسری طور پر، کسی میں حالات و کلام کے متعلق تحقیق و تفصیل نہ تھی مقابلہ و موازنہ نہ تھا زبان و محاورہ اور طرز کلام کا تجزیہ و ارتقا نہ تھا۔

آزاد کو سب سے پہلے ان تمام اجزاء و لوازم کی تالیف کا خیال پیدا ہوا انھوں نے **آب حیات** میں یہ سب خامیاں رفع کر دیں۔ اور ایسی کتاب لکھدی کہ آج بھی

کوئی تذکرہ نویس آب حیات کے استفادہ سے بے نیاز نہیں ہے۔ پھر اس میں اگر کچھ غلط بیانیاں اور بیجا طرفداریاں بھی ہوں تو ان سے آزاد کے فضل تقدم اور آب حیات کی اولیت میں فرق نہیں آتا۔

(۲) زبان کی ساخت اور ارتقا کے متعلق آزاد کی "سخندانِ فارس" اور "مقدمۂ آبِ حیات" سے پہلے کوئی کتاب نہیں لکھی گئی۔ آزاد کی زباندانی، شوق تحقیق اور قوت ایجاد نے اردو میں اپنی نوعیت کی پہلی تصانیف پیدا کردی ہیں۔

(۳) رمزیہ و تمثیلی مضامین اور ان کے اسالیب نگارش کا اس قدر تنوع اور ایسا کمال آزاد کے "نیرنگِ خیال" سے پہلے نظر نہیں آتا۔ آزاد نے اس پیرایہ میں مسائل مذہبی و علمی و ادبی کی تحقیق بھی کی ہے اور نقد و تبصرہ بھی بلعن و طنز بھی کیا ہے اور اخلاق بھی سکھلائے ہیں۔

(۴) اگرچہ مولانا شبلی کی تاریخ و سیرت کی تصانیف الفاروق وغیرہ کے سبب سے علامہ آزاد کی "دربارِ اکبری" کو اولیت کا درجہ حاصل نہیں ہے، تاہم تاریخ میں ادبی شان پیدا کرنا اور افسانہ و ناول سے زیادہ دلچسپ بنا دینا آزاد ہی کا پہلا کمال ہے خصوصاً اکبر بادشاہ کے حالات خاص اہتمام سے لکھے ہیں۔ اگرچہ آزاد نے اکبر کی بے دینی اور علما کی توہین کو بہت سراہا ہے۔

اس لحاظ سے آزاد کا مرتبہ موجد کا بھی ہے، نقاد کا بھی، صاحب طرز کا بھی۔ آزاد سب سے پہلے انشا پرداز ہیں، پھر مورخ، تذکرہ نویس، سیرت نگار۔ ان کی تحقیق و تنقید سے اختلاف کیا جا سکتا ہے، لیکن ان کی انشا پردازی سے انکار نہیں ہو سکتا۔ اس لئے بقائے دوام کے اعتبار سے آزاد بہ حیثیت انشا پرداز کے زندۂ جاوید ہیں۔ زبان و بیان کی دلکشی میں ان کی ہر کتاب سدا بہار گلزار ہے۔ مطالعہ و حوالہ کے لئے ان کی ہر کتاب مفید و ضروری ہے۔ لیکن تحقیق و تنقید کی نظر میں

ان کی ہر کتاب پرانی ہو چکی ہے۔ آب حیات کے نظریے بدل چکے ہیں، اور بہتر تبصرے لکھے جا چکے ہیں۔ سخندان فارس کے تجزیے اور تقریظیں اب قول فیصل نہیں رہیں۔ دربار اکبری تاریخ کے طالب علموں اور استادوں کے لئے پہلے بھی کچھ عجوبہ نہ تھی اب تو بہت با اصول، مفصل و مکمل تاریخیں موجود ہیں۔ نگارستان فارس (تذکرۂ شعرائے فارسی) صرف آزاد کے شغف و عشق فارسی کا ایک چھینٹا ہے۔ لیکن اتنا ہلکا پڑا ہے کہ خود آزاد کی تالیفات میں بھی اس کا کوئی درجہ نہیں۔ قدیم تذکرات، تذکرۂ دولت شاہ سمرقندی، آتشکدۂ آذر، سرو آزاد، وغیرہ کے مقابلے میں بھی کچھ نہیں ہے۔ چہ جائیکہ مولانا شبلی اور پروفیسر براؤن کی تالیفات سے مقابلہ ہو سکے۔ نیرنگ خیال آزاد کی دوسری کتابوں سے زیادہ دیرپا ہے، اس لئے کہ یہ نہ تاریخ ہے، نہ تذکرہ، نہ سیرت، نہ فلسفۂ زبان، بلکہ صرف انشا ہی انشا ہے۔ اگرچہ یہ طرزِ رمز و تمثیل مستقل مقالہ نگاری کی صورت میں رائج نہیں ہے۔ لیکن یہ شانِ مجاز اور صرف استعارہ شعر و ادب کا جزوی عنصر ہے۔ اور اب بھی فسانے اور ناول مزاحیات و طنزیات، بلکہ تنقیدیں اور تبصرے اور ادبیات و علمیات بھی نیرنگ خیال کے رنگ تحریر کے نمونے ضمنی و جزئی طور پر اپنے اندر رکھتے ہیں۔

علامہ آزاد جدید شاعری کے پیش رو ہیں، اور جیسا کہ پہلے لکھا گیا ہے یہ چیز ان کی اولیات میں شامل ہے۔ لیکن ان کی شاعری کا تذکرہ و تبصرہ، ہماری کتاب کے "حصۂ نظم" کا حق ہے۔

تصانیفِ آزاد کے نمونے

علامہ آزاد کی مختلف تحریروں کے بہت سے چھوٹے بڑے نمونے پہلے پیش کئے جا چکے ہیں۔ وہ سب آزاد کے اسلوب خاص کا اندازہ کرنے کے لئے کافی ہیں تاہم ان کی تمام ممتاز تصنیفات سے ایک ایک دو دو اقتباسات ایسے درج کئے جاتے

ہیں، جن سے آزاد کی انشائے خصوصی کے علاوہ، مختلف مضامین و موضوعات میں ان کا طرز بیان اور قوت تحریر بھی نظر کے سامنے آجائے۔

(۱) آب حیات کا مقدمہ کافی طویل لکھا ہے، جو خود ایک مستقل تصنیف کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں "بھاشا پر فارسی کا اثر" دکھایا ہے۔ ایک جگہ اس مضمون کو بیان کرتے ہیں کہ "ہند کی تشبیہیں جاتی ہیں، فارسی اور عرب کی تشبیہیں اور خیالات ان کی جگہ قابض ہو گئے۔"

"دونوں زبانوں کے باب تشبیہات میں ایک نکتہ کہے بغیر مجھ سے نہیں بڑھا جاتا یعنی مختلف افراد انسان کے طبائع پر غور کرو کہ ہزاروں کوس پر پڑے ہوں اور مختلف طبیعت کے ملکوں میں ہوں، لیکن چونکہ طبیعت انسانی متحد ہے اس لئے دیکھو ان کے خیالات کس قدر ملتے جلتے ہوتے ہیں۔ چنانچہ یہاں بالوں کی تعریف میں ناگوں کے لہرانے اور بھونروں کے اُڑنے سے تشبیہ دیتے تھے، فارسی میں بھی زلف کی تشبیہ سانپ کے ساتھ آئی ہے، مگر بھونرے اڑ گئے۔ اور اس کی جگہ مشک، بنفشہ، سنبل، ریحان آگئے، جو کبھی یہاں دیکھے بھی نہیں۔ مگر عرب کا سادہ مزاج فصیح اپنی نیچر کا حق ادا کرتا ہے، اور زلف کو کوئلے سے تشبیہ دیتا ہے۔ سانولی رنگت کی تعریف میں شام برن اور میگھ برن کہتے تھے۔ اس سے کھلتا رنگ ہوتا تو چنبک برنی کہتے تھے۔ اب سمن رنگ اور سیم رنگ کے الفاظ حُسن کی بہار دیتے ہیں، مگر چندر مکھ اور ماہ رُخ مشترک ہے۔ آنکھ کی تعریف میں یہاں، مرگ کی آنکھ اور کنول کے پھول اور ممولے کی اچپلاہٹ سے تشبیہ دیتے تھے۔ اور دو میں آہو چشم رہے مگر ممولے ہوا ہو گئے۔ اور کنول کی جگہ ساغر لبریز اور نرگس شہلا آگئی جو کسی نے یہاں دیکھی بھی نہ تھی، بلکہ ترک چشم، شمشیر نگاہ سے قتل کرنے لگے۔

رفتار کے لئے بھاشا میں ہتنی اور ہنس کی چال ضرب المثل ہے۔ اب ہنس کے ساتھ ہاتھی بھی اڑ گیا۔ فقط کبک دری، شور محشر اور فتنۂ قیامت نے آفت برپا کر رکھی ہے"

پھر فارسی، اردو، اور ہندی کی انشا پردازی کا حال بیان کرتے ہیں۔ ایک طویل مضمون درمیان سے کچھ حذف کر کے آزاد ہی کے الفاظ میں مسلسل کر کے لکھا جاتا ہے:۔

"فارسی اور اردو کی انشا پردازی میں جو دشواری ہے، اور ہندی کی انشا میں آسانی ہے، اس میں ایک باریک نکتہ غور کے لائق ہے۔ وہ یہ ہے کہ بھاشا زبان جس شے کا بیان کرتی ہے، اس کی کیفیت ہمیں ان خط و خال سے سمجھاتی ہے، جو خاص اسی شے کے دیکھنے، سننے، سونگھنے، چکھنے یا چھونے سے حاصل ہوتی ہے۔ اس بیان میں اگرچہ مبالغہ کے زور یا جوش و خروش کی دھوم دھام نہیں ہوتی، مگر سننے والے کو جو اصل شے کے دیکھنے سے مزہ آتا وہ سننے سے آجاتا ہے۔ برخلاف شعرائے فارس کے کہ یہ جس شے کا ذکر کرتے ہیں، صاف اسی کی برائی یا بھلائی نہیں دکھا دیتے بلکہ اس کے مشابہ ایک اور شے جسے ہم نے اپنی جگہ اچھا یا برا سمجھا ہوا ہے، اسکے لوازمات کو شے اول پر لگا کر ان کا بیان کرتے ہیں۔ مثلاً پھول کو نزاکت رنگ اور خوشبو میں معشوق سے مشابہ ہے، جب گرمی کی شدت میں معشوق کے حسن کا انداز دکھانا ہو تو کہیں گے کہ مارے گرمی کے پھول سے رخساروں سے شبنم کا پسینہ ٹپکنے لگا۔ اور اسی رنگ میں شاعر کہتا ہے۔ خواجہ وزیر وزیر۔

ہوں وہ بلبل جو کرے ذبح خفا تو کر   روح میری گل عارض میں رہے بو ہو کر

یہ تشبیہیں اور استعارے اگر پاس پاس کے ہوں، اور آنکھوں کے سامنے ہوں

تو کلام میں نہایت لطافت اور نزاکت پیدا ہوتی ہے، لیکن اگر دور جا پڑیں اور بہت باریک پڑ جائیں تو دقت ہوتی ہے۔

ان خیالی رنگینیوں اور فرضی لطافتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو باتیں بدیہی ہیں اور محسوسات میں عیاں ہیں، ہماری تشبیہوں اور استعاروں کے پیچ در پیچ خیالوں میں آکر وہ بھی عالم تصویر میں جا پڑتی ہیں۔ کیونکہ خیالات کے ادا کرنے میں ہم اول اشیائے بے جان کو جاندار بلکہ انسان فرض کرتے ہیں، بعد اس کے جانداروں اور عاقلوں کے لئے جو باتیں مناسب حال ہیں، ان کو بے جانوں پر لگا کر ایسے ایسے خیالات پیدا کرتے ہیں، جو اکثر ملک عرب یا فارس یا ترکستان کے ساتھ قومی یا مذہبی خصوصیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ ہمارے نازک خیال کسی بادشاہ کے اقبال اور عقل کے لئے اس قدر تعریف پر قناعت نہیں کرتے کہ وہ اقبال میں سکندر یونانی اور عقل میں ارسطوئے ثانی ہے۔ بلکہ بجائے اس کے کہتے ہیں کہ اگر اس کا ہمائے عقل اوج اقبال سے سایہ ڈالے، تو ہر شخص کشور دانش و دولت کا سکندر اور ارسطو ہو جائے۔ بلکہ اگر اس کے سینے میں دلائل عقلی کا دریا جوش مارے تو طبقۂ یونان کو غرق کر دے۔ اوّل تو ہما کی یہ صفت خود ایک بے بنیاد فرض ہے اور وہ بھی اسی ملک کے ساتھ خاص ہے۔ اس پر اقبال کا ایک فلک الافلاک تیار کرنا، اور اس پر نقطۂ اوج کا دریافت کرنا دیکھئے، وہاں ان کے فرضی ہما کا جانا دیکھئے۔ پھر زمین پر اس خیالی آسمان کے نیچے ایک تدبیر کا یونان بسانا دیکھئے، پھر اس فرضی ہمائی برکت کا اس قدر عام کرنا دیکھئے جس سے دنیا کے جاہل اس خیالی یونان میں جا کر ارسطو ہو جائیں۔

بھاشا کا فصیح استعارہ کی طرف بھول کر بھی قدم نہیں رکھتا۔ جو جو لطف

آنکھوں سے دیکھتا ہے، اور جن خوش آوازیوں کو سنتا ہے، یا جن خوشبوؤں کو سونگھتا ہے اُنھی کو اپنی میٹھی زبان سے بے تکلف بے مبالغہ صاف صاف کہدیتا ہے۔ لیکن یہ نہ سمجھنا کہ ہندوستان میں مبالغہ کا زور تھا ہی نہیں۔ سنسکرت کا انشاپرداز ذرا بگڑ جائے تو زمین کے ماتھے پر پہاڑ تیوری کے بل ہو جائیں، اور دہانِ غار پتھر دل سے دانت پیسنے لگیں۔"

آبِ حیات میں شاعروں کے حالات تفصیل سے لکھے ہیں خصوصاً شاعرانہ نوک جھونک، ذاتی رنجشیں اور سیرت و اخلاق کے لطیفے کوشش و تلاش سے درج کئے ہیں ان میں ایسی باتیں بھی ہیں جو علامہ آزاد نے کتابوں سے دیکھ کر لکھی ہیں، اور ایسی بھی جو ان کو اپنے اُستاد یا بزرگوں سے سینہ بسینہ پہنچی ہیں۔

شیخ قلندر بخش جرأت کے حال میں لکھتے ہیں۔

"جرأت میاں جعفر علی حسرت[1] کے شاگرد تھے۔ علاوہ فن شاعری کے نجوم میں ماہر تھے اور موسیقی کا بھی شوق رکھتے تھے، چنانچہ ستار خوب بجاتے تھے۔ اول نواب محبت خاں خلف حافظ رحمت خاں نواب بریلی کی سرکار میں نوکر ہوئے۔ میر انشاء اللہ خاں کی اور ان کی صحبتیں بہت گرم رہتی تھیں چنانچہ حسب حال یہ شعر کہا تھا۔

بسکہ گلچیں تھے سدا عشق کے ہم بستاں کے ہوئے نوکر بھی تو نواب محبت خاں کے

---

[1] اس پر آزاد خود ہی یہ حاشیہ چڑھاتے ہیں "حسرت بھی نامی شاعر تھے، مگر اصلی پیشہ عطاری تھا، دیوان موجود ہے، پھیکے شربت کا مرہ آتا ہے مرزا رفیع (یعنی سودا) نے انھیں کی شان میں غزل کہی ہے، جس کا مطلع ہے:-

بہدنہ کا آندھی سے اُڑا ڈھیر ہوا پر ہر مرغ اسے کھا کے ہوا اسیر ہوا پر

اسی طرح ہجو کی آندھی میں ساری دکان کا خاکہ اُڑا دیا ہے (حاشیہ آب حیات صفحہ ۲۲۶)

سنہ ۱۲۱۵ھ میں لکھنؤ پہنچے، اور مرزا سلیمان شکوہ کی سرکار میں ملازم ہوئے۔ ایک دفعہ تنخواہ کو دیر ہوئی، حسن طلب میں ایک غزل کا مقطع لکھا:۔

جرأت اب بندہ ہے تنخواہ تو کہتے ہیں یہ ہم
کہ خدا دیوے نہ جب تک تو سلیمان کب دے

فارسی کی ضرب المثل ہے، "تا خداند ہد سلیمان کے دہد"۔

میاں جرأت کے حال میں، بلکہ ساری کتاب میں افسوس کی بات ہے تو یہ ہے کہ عین جوانی میں آنکھوں سے معذور ہو گئے۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ حادثہ چیچک سے ہوا، مگر استاد مرحوم (یعنی حضرت ذوقؔ) نے ایک دن فرمایا کہ ہر زمانہ کی دو آنکھیں ہیں، نیکی کی آنکھ نے ان کے کمال کو بڑی قدر دانی سے دیکھا، بدی کی آنکھ نہ دیکھ سکی، اور ایک بدنما داغ ان کے دامن پر دکھایا۔ مشہور کرتے ہیں کہ پہلے وہ اصل اندھے نہ تھے، بعض ضرورتوں سے کہ شوخی عمر کا مقتضا ہے خود اندھے بنے، رفتہ رفتہ اندھے ہی ہو گئے۔

تفصیل اجمال بہ عبرت احوال۔ بزرگوں کا قول ہے کہ شرافت و نجابت غریبی پر عاشق ہے، دولت اور نجابت آپس میں سوکن ہے۔ یہ حق ہے اور سبب اس کا یہ ہے کہ شرافت کے اصول و آئین غریبوں ہی سے خوب نبھتے ہیں۔ امارت آئی قیامت آئی دولت آئی شامت آئی، میاں جرأت کی خوش مزاجی، لطیفہ گوئی، مسخرے پن کی حد سے گزری ہوئی تھی، اور ہندوستان کے امیروں کو نہ اس سے ضروری کوئی کام، نہ اس سے زیادہ کوئی نعمت ہے۔ کہتے ہیں مرزا قتیلؔ، سید انشا کا اور ان کا یہ حال تھا کہ گھر میں رہنے نہ پاتے تھے۔ آج ایک امیر کے ہاں ہیں، دوسرے دن دوسرے امیر آئے، سوار کیا اور ساتھ لے گئے۔ ۴، ۵ دن وہاں رہے، کوئی اور نواب آئے وہاں سے وہ لے گئے، جہاں جائیں، آرام و

آسائش سے زیادہ عیش کے سامان موجود۔ رات دن قہقہے اور چہچہے۔ ایک بیگم صاحب نے گھر میں ان کے چٹکلے اور نقلیں سنیں، بہت خوش ہوئیں، اور نواب صاحب سے کہا، ہم بھی باتیں سنیں گے، گھر میں لاکر کھانا کھلاؤ۔ پردے یا چلمنیں چھٹ گئیں، اندر وہ بیٹھیں، باہر یہ بیٹھے، چند روز کے بعد خاص خاص بی بیوں کا برائے نام پردہ رہا، باقی گھر والے سامنے پھرنے لگے۔ رفتہ رفتہ یگانگی کی یہ نوبت ہوئی کہ آپ بھی باتیں کرنے لگیں۔ گھر میں کوئی دادا نانا، کوئی ماموں، چچا کہتا۔ شیخ صاحب کی آنکھیں دکھنے آئیں۔ چند روز ضعف بصر کا بہانہ کر کے ظاہر کیا کہ آنکھیں معذور ہو گئیں۔ مطلب یہ تھا کہ اہلِ حسن کے دیدار سے آنکھیں سکھ پائیں۔ چنانچہ بے تکلف گھروں میں جانے لگے۔ اب پردہ کی ضرورت کیا؟ یہ بھی قاعدہ ہے کہ میاں بیوی جس مہمان کی بہت خاطر کرتے ہیں، نوکر اس سے جلنے لگتے ہیں ایک دوپہر کو سو کر اُٹھے تو شیخ صاحب نے لونڈی سے کہا کہ بڑے آفتابے میں پانی بھر لا۔ لونڈی نہ بولی۔ انھوں نے پھر پکارا۔ اس نے کہا بیوی جائے ضرور میں لے گئی ہیں ان کے منہ سے نکل گیا کہ "غیبانی دردانی ہوئی ہے، سامنے تو رکھا ہے، دیتی کیوں نہیں۔" بیوی دوسرے دالان میں تھیں۔ لونڈی گئی اور کہا کہ" اری بیوی یہ موا کہتا ہے کہ وہ بندہ اندھا ہے، یہ تو خاصا سجکھا ہے، ابھی میرے ساتھ یہ واردات گذری۔" اس وقت یہ راز کھلا، مگر اس میں شبہ نہیں کہ آخر آنکھوں کو رو بیٹھے۔

مزن فالِ بد کآورد حالِ بد مبادا کسے کو زند فالِ بد"

آزاد نے آبِ حیات میں اپنے استاد ذوق کا حال سب سے طویل، ۶۰ صفحوں میں لکھا ہے۔ ان کے ساتھ آزاد کی محبت و عقیدت کا حال پہلے لکھا گیا ہے۔ اسی حسنِ ارادت کے ساتھ ہر بات کی تفصیل کی ہے۔ ابتدا اس طرح کرتے ہیں۔

"ملک الشعرا خاقانی ہند شیخ ابراہیم ذوق۔ جب وہ صاحب کمال عالم ارواح سے

کشورِ اجسام کی طرف چلا تو فصاحت کے فرشتوں نے باغِ قدس کے پھولوں کا
تاج سجایا جن کی خوشبو شہرتِ عام بنکر جہاں میں پھیلی، اور رنگ نے بقائے
دوام سے آنکھوں کو طراوت بخشی۔ وہ تاج سر پر رکھا گیا تو آبِ حیات اس پر شبنم
ہوکر برسا کہ شادابی کو کملاہٹ کا اثر نہ پہونچے۔ ملک الشعرائی کا سکّہ اس کے نام
سے موزوں ہوا، اور اسکے طغرائے شاہی میں یہ نقش ہوا کہ اس پر نظمِ اردو کا خاتمہ
کیا گیا۔ چنانچہ اب ہرگز امید نہیں کہ ایسا قادر الکلام پھر ہندوستان میں پیدا ہو۔
سبب اس کا یہ ہے کہ جس باغ کا بلبل تھا، وہ باغ برباد ہوگیا۔ نہ ہم صفیر رہے
نہ ہم داستان رہے۔ نہ اس بولی کے سمجھنے والے رہے جو خراب آباد اس زبان
کے لئے ٹکسال تھا وہاں بھانت بھانت کا جانور بولتا ہے۔ شہر چھاؤنی سے بدتر
ہوگیا۔ اُمرا کے گھرانے تباہ ہوگئے۔ گھرانوں کے وارث علم و کمال کے ساتھ روٹی
سے محروم ہوکر حواس کھو بیٹھے۔ وہ جادو کار طبیعتیں کہاں سے آئیں جو بات بات
میں دل پسند انداز اور عمدہ تراشیں نکالتی تھیں۔ آج جن لوگوں کو زمانہ کی فارغ البالی
نے اس قسم کے ایجاد و اختراع کی فرصتیں دی ہیں، وہ اور اور اصل کی شاخیں ہیں؛
انھوں نے اور پانی سے نشو و نما پائی ہے، وہ اور ہی ہواؤں میں اُڑ رہے ہیں۔
پھر اس زبان کی ترقی کا کیا بھروسہ...... ان کے تحریر حالات میں بعض باتوں
کے لکھنے کو لوگ فضول سمجھیں گے، مگر کیا کروں، جی یہی چاہتا ہے کہ کوئی حرف
اس گراں بہا داستان کا نہ چھوڑوں۔ یہ شاید اس سبب سے ہو کہ اپنے پیارے
اور پیار کرنے والے بزرگ کی ہر بات پیاری ہوتی ہے، لیکن نہیں اس شعر
کے پتلے کا ایک رونگٹا بھی بیکار نہ تھا۔ ایک صنعت کاری کی کل ہے، کون سے
پُرزے کو کہہ سکتے ہیں کہ نکال ڈالو، یہ کام کا نہیں، اور کونسی حرکت اسکی ہے
جس سے کچھ حکمت انگیز فائدہ نہیں پہونچتا ہے۔ اسی واسطے میں لکھوں گا اور

سب کچھ لکھوں گا۔ جو بات انکے سلسلہ حالات میں مسلسل ہو سکے گی، ایک

حرف نہ چھوڑوں گا۔"

چنانچہ آزاد نے استاد ذوق کے حالات کا ایک حرف نہیں چھوڑا۔ لیکن
بعض باتیں بڑی عجیب لکھی ہیں۔ ایک یہ کہ بہادر شاہ ظفر اور نواب الٰہی بخش
خاں معروف کے کلام کو ذوق کا کہا ہوا بتایا ہے۔ بادشاہ کے کلام کے متعلق
آزاد کا یہ دعویٰ مشہور ہے اور اس پر ردّ و قدح ہو چکی ہے معروف کے متعلق
آزاد لکھتے ہیں:۔

"ان کے اشعار کا ایک سلسلہ ہے جس میں ردیف وار ۱۰۱ مطلع ہے اور کوئی
سبزی کے مضمون سے خالی نہیں۔ اسی رعایت سے اس کا نام "تسبیح زمرد"
رکھا تھا۔ یہ تسبیح بھی استاد مرحوم نے پرونی تھی۔"

دوسرے ذوق کے مذہب کو چھپایا ہے اور اپنی لاعلمی ظاہر کی ہے۔ چنانچہ
فرماتے ہیں:۔

"فقرا اور بزرگان دین کے ساتھ انھیں ایسا دلی اعتقاد تھا کہ اس کی کیفیت
بیان نہیں ہو سکتی، علماء اور اساتذۂ سلف کو ہمیشہ باادب یاد کرتے تھے اور کبھی
ان پر طعن و تشنیع نہ کرتے تھے۔ اس واسطے ان کے مذہب کا حال کسی کو نہ کھلا۔"

حالانکہ آزاد کے والد اور استاد دونوں ہم عمر و ہم مکتب تھے۔ اور (بقول آزاد) "وہ
رابطہ ان کا عمروں کے ساتھ ساتھ بڑھتا گیا اور اخیر وقت تک ایسا نبھ گیا کہ
قرابت سے بھی زیادہ تھا۔" آزاد اکثر سارا سارا دن ذوق کی خدمت میں گذارتے
تھے۔ ان کے وضو، نماز، وظیفے سب کا ذکر کیا ہے۔ اس پر بھی آزاد کو اور اہل دہلی کو
ان کے مذہب کا حال نہ کھلا کہ سُنی تھے یا شیعہ!!

حالات ذوق کا ایک دلچسپ اقتباس یہ ہے:۔

"ایک دفعہ برسات کا موسم تھا۔ بادشاہ قطب میں تھے۔ یہ ہمیشہ ساتھ ہوتے تھے اسوقت قصیدہ لکھ رہے تھے۔ ع "شب کو میں اپنے سر بستر خواب راحت" چڑیاں سائبان میں تنکے رکھ کر گھونسلا بنا رہی تھیں، اور ان کے تنکے جو گرتے تھے انھیں لینے کو بار بار انکے آس پاس آ بیٹھتی تھیں۔ یہ عالم محویت میں بیٹھے تھے۔ ایک چڑیا سر پر آن بیٹھی۔ انھوں نے ہاتھ سے اڑا دیا۔ تھوڑی دیر میں پھر آن بیٹھی۔ انھوں نے پھر اڑا دیا۔ جب کئی دفعہ ایسا ہوا تو ہنسکر کہا کہ اس غیبانی نے میرے سر کو کبوتروں کی چھتری بنایا ہے۔ ایک طرف میں بیٹھا تھا، ایک طرف حافظ ویران بیٹھے تھے۔ وہ نابینا ہیں۔ انھوں نے پوچھا کہ حضرت کیا؟ میں نے حال بیان کیا۔ ویران بولے کہ ہمارے سر پر تو نہیں بیٹھتی استاد نے کہا کہ بیٹھے کیونکر؟ جانتی ہے کہ یہ ملّا ہے عالم ہے حافظ ہے۔ ابھی اُحِلَّ لَکُمُ الصَّیْدُ کی آیت پڑھ کر کُلُوا وَاشْرَبُوا، بسم اللہ اللہ اکبر۔ کر دیگا دیوانی ہے جو تمہارے سر پر آئے!!"

استاد ذوق کے کلام پر لوگ جو اعتراض کرتے تھے، ان کے ذکر میں آزاد لکھتے ہیں

"ایک دن میں اوج (عبداللہ خاں اوج) سے ملا، اور استاد کے مطلع کا ذکر آیا

مقابل اس رخ روشن کے شمع گر ہو جائے　　صبا وہ دھول لگائے کہ بس سحر ہو جائے

کئی دن کے بعد جو رستہ میں ملے تو دیکھتے ہی کھڑے ہو گئے، اور کہا

یاں جو برگ گل خورشید کا کھڑکا ہو جائے　　دھول دستار فلک پر لگے تڑکا ہو جائے

اور کہا کہ دیکھا! محاورے یوں باندھا کرتے ہیں میں سمجھ گیا کہ یہ طنز کرتے ہیں کہ سحر ہو جائے جو استاد نے باندھا ہے یہ جائز نہیں، مگر تجاہل کر کے میں نے کہا کہ ہاں حقیقت میں بات کے کھڑکے کا آپ نے خوب ترجمہ کیا، اور استعارہ میں لاکر میری طرف دیکھ کر ہنسے اور کہا کہ بھئی واہ! آخر شاگرد تھے، ہماری بات بھی بگاڑ دی۔"

دوسرے دن میں استاد مرحوم کی خدمت میں گیا، اور یہ ماجرا بیان کیا۔ فرمایا کہ
شمع کو صبح ہوتے ہاتھ مار کر بجھا دیتے ہیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ شمع اگر مقابلہ کرے
تو اس گستاخی کی سزا میں صبا اُسے ایسی دھول مارے کہ وہ بجھ جائے۔ اور
ایسی بجھے کہ وہی اس کے حق میں سحر ہو جائے، یعنی روشنی نصیب نہ ہو۔ کبھی
دوسری تیسری رات ہوئی ہوئی، نہوئی نہوئی، وہ اور بات ہے۔ اب یہ ایک
حسن اتفاق ہے کہ ہماری زبان میں اس کے مقابل ایک محاورہ بھی موجود
ہے کہ ایسی دھول لگی کہ تڑکا ہو گیا۔ خیر اگر ہوا تو کچھ لطف ہی پیدا ہوا،
بلکہ طرز بیان میں ایک وسعت کا قدم آگے بڑھا، قباحت کیا ہوئی۔ اور
یہ بھی دیکھو، وہ محاورہ تھا تو کیا تھا۔ بتذل، عامیانہ۔ اب ثقہ، متین اور
شریفانہ ہے"۔

اس عبارت کا آخری فقرہ علامہ آزاد کی انشا پردازی کا دلچسپ نمونہ ہے۔
بظاہر استاد کی زبان سے اوجؔ کے مضمون کو سراہتے ہیں، لیکن دراصل طعن و طنز
مقصود ہے، یعنی اوجؔ کا محاورہ دھول لگنے سے تڑکا ہو جانا بتذل و عامیانہ ہے
اس سے تو ذوقؔ ہی کا محاورہ "سحر ہو جانا" متین و ثقہ تھا۔ لیکن حقیقت میں آزاد نے استاد
کی طرف سے جو جواب دیا ہے، وہ صحیح نہیں۔ اس لئے کہ جب ہماری زبان میں پہلے سے
ایک محاورہ موجود ہے کہ "ایسی دھول لگی کہ تڑکا ہو گیا" تو پھر اس محاورے میں تڑکے کا
کوئی عربی و فارسی مترادف استعمال کرنا جائز نہیں۔ اگر "دھول لگنے" کا مضمون نہ ہوتا
تو جو چاہے سمجھتے۔ اب سحر ہو جانے کو ثابت کرنے کے لئے مضمون کو طول اور پیچ دینا بات
کی پیچ اور طول امل ہے۔

ذوقؔ کے حالات میں ایک اور جگہ لکھتے ہیں:۔

عادت تھی کہ سات آٹھ بجے مکان ضرور چلے جاتے تھے، اور تین چار چلمیں حقہ کی

وہاں بیٹھے تھے۔ میں چھٹی کے دن اس وقت جایا کرتا تھا، اور دن بھر وہیں رہتا تھا۔ مکان ضرور ڈیوڑھی میں تھا۔ پاؤں کی آہٹ پہچانتے تھے پوچھتے کہ تم ہو؟ میں تسلیم عرض کرتا۔ چھوٹی سی الگنائی تھی، پاس ہی چارپائی۔ وہیں بیٹھ جاتا۔ فرماتے اجی ہمارا وہ شعر اس دن تم نے کیا پڑھا تھا؟ ایک دو لفظ اس کے پڑھتے۔ میں سارا شعر عرض کرتا۔ فرماتے، ہاں اب اسے یوں بنالو۔ ایک دن ہنستے ہوئے پاخانے سے نکلے۔ فرمایا کہ لوجی ۲۲ برس کے بعد آج اصلاح دینی آئی ہے۔ حافظ ویران نے کہا حضرت کیونکر؟ فرمایا، ایک دن شاہ نصیر مرحوم کسی شاگرد کو اصلاح دے رہے تھے۔ اس میں مصرع تھا۔ ع "کھاتی کمر ہے تین بل اک گدگدی کے ساتھ" ابتدائے مشق تھی۔ اتنا خیال میں آیا کہ یہاں کچھ اور ہونا چاہیئے، اور جب سے اکثر یہ مصرع گنگناتا رہتا تھا۔ آج وہ نکتہ حل ہوا۔ عرض کی حضرت پھر کیا؟ فرمایا ع۔
"کھاتی ہے تین تین بل اک گدگدی کے ساتھ" کمر کو ادپر ڈالدو۔ عرض کی پھر وہ کیونکر؟ ۳، ۴ مصرع الٹ پلٹ کئے تھے۔ ایک اس وقت خیال میں ہے:۔

بل بے کمر کہ زلف مسلسل کے پیچ میں
کھاتی ہے تین تین بل اک گدگدی کے ساتھ"

(۲) **نیرنگ خیال**، ان خیالی دتمثیلی مضامین کے لکھنے کی تحریک پنجاب کے ڈائرکٹر تعلیمات کرنل ہالرائڈ نے علامہ آزاد کے سامنے پیش کی تھی۔ انگریزی میں سوئفٹ اور جانسن وغیرہ نے اس قسم کی مستقل کتابیں اور متفرق مضامین لکھے ہیں۔ قدیم یونانی ادبیات اور یورپ کی دوسری زبانوں میں بھی رمزیہ (ایلی گریکل) تصانیف موجود ہیں۔ اُن لوگوں کا مقصد مذہب، اخلاق یا حکومت کی اصلاح ہے۔ عقائد رائجہ یا سیاست حاضرہ پر در پردہ نقد و تبصرہ کیا ہے۔ علامہ آزاد کا جدت طراز و خیال آفریں دماغ اس موضوع کے لئے نہایت موزوں تھا۔ کرنل ہالرائڈ نے ان تحریروں

کے لئے خاکہ سا بتا دیا تھا۔ لیکن وہ اسلوب بیان یا موضوعات کے متعلق کچھ اشارے ہوں گے۔ مضامین اصل میں آزاد ہی کی اختراع بدیع ہیں۔ اور باوجود انگریزی نہ جاننے کے، آزاد نے ان مضامین میں ادبیات انگریزی کی جیسی شان پیدا کر دی ہے۔ وہ تنہا آزاد کا کمال ہے۔

سیاست کا موضوع تو آزاد کے زمانے میں خارج از بحث تھا۔ اس پر تنقید و تبصرہ آزاد سے متوقع نہ تھا۔ مذہب، اخلاق، علم و فن اور شعر و ادب پر آزاد نے بصیرت افروز تبصرہ کیا ہے، لطیف نکتے بیان کئے ہیں۔ اور عجیب عجیب پیرایے اختیار کئے ہیں صرف اتنی کمی نظر آتی ہے کہ آزاد نے رمز و تمثیل کی صرف ایک شکل پسند کی ہے اور ہر جگہ اسی سے کام لیا ہے۔ یعنی اشیائے بیجان اور قوائے اخلاق انسانی کو مجسم کر کے اپنے فسانوں کے اشخاص و کردار پیدا کئے ہیں۔ ہر جگہ ایمان، دل، عقل، نفس، انصاف، ظلم وغیرہ چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ ان کو بار بار دیکھ کر جی اکتا جاتا ہے۔ تاہم آزاد نے اپنی ذہانت سے واقعات اور ان کی صورتیں نئی نئی پیدا کی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ نیرنگ خیال ان کی فکر و خیال کی نیرنگیوں کا نادر نمونہ ہے۔

نیرنگ خیال کے دو حصے ہیں۔ حصہ اول میں تمہید کے طور پر ایک مضمون لکھا ہے، اردو اور انگریزی انشا پردازی پر کچھ خیالات" اس میں ماتھالوجی (اساطیر یا علم الاصنام) کا ذکر کیا ہے، جس پر مضامین نیرنگ خیال کی بنیاد ہے۔ لکھتے ہیں:۔

"فارسی اردو میں تم نے وقت کے باب میں دیکھا ہوگا کہ زمانہ یا زندگی کو عمر رواں یا آب گذراں کہتے ہیں۔ اسی طرح کہتے ہیں کہ زمانہ عمر کی کھیتی کو مار سن عمر کو کاٹ رہا ہے، اور یہ بھی کہ

گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں

اسی طرح غصے کے باب میں دیکھا ہوگا کہ اسے آتش غضب کہہ کر آگ سے تعبیر کرتے

ہیں. کبھی کہتے ہیں کہ "ہمچو مارِ سیاہ برخود پیچید" اور کبھی جوش غضب کے لئے کہتے ہیں کہ "آتش از چشمش پرید" "دود از نہادش برآمد"، "ہمچو سپند از جا بر جست"

پس انگریزی میں میتھالوجی ایک خاص علم ہے کہ اس میں ان سب قوتوں یا جذبوں کو ایک ایک مجسم دیبی یا دیوتا مقرر کیا ہے، اور انہی سامانوں سے سجایا ہے جو ان کے لئے لازم اور شایان شان ہیں. مثلاً

غصہ۔ ایک عورت ہے، کالا رنگ، ڈراؤنی صورت، تمام بدن پر بال کھڑے ہیں جیسے لوہے کی سلاخیں، سر پر اور بازوؤں پہ ہزاروں سانپ پھن اٹھائے لہرا رہے ہیں۔ اور آنکھوں سے خون برستا ہے۔

عشق۔ ایک موقع پر اسے نوجوان خوبصورت لڑکا فرض کیا ہے کہ خوش ہے، اور اپنے عالم میں اچھلتا کودتا ہے، مگر آنکھوں سے اندھا رکھا ہے۔ اس میں نکتہ یہ ہے کہ بھلائی برائی کو نہیں سوچتا۔ کبھی ایک جوان آدمی بنایا ہے اور ہاتھ میں چڑھی ہوئی کمان میں تیر جوڑا ہوا ہے کہ جدھر چاہتا ہے مار بیٹھتا ہے۔ اس کی پناہ نہیں......

افواہ یا شہرت۔ اس کی تصویر ایک بڑھیا عورت ہے کہ اس کے تمام بدن پر زبانیں ہی زبانیں ہیں۔ پہلے اس کے منہ میں زبان ہلتی ہے، ساتھ ہی ساری زبانیں سانپوں کی طرح لہرانے لگتی ہیں۔ اشارہ یہ ہے کہ جو بات اس کی زبان سے نکلتی ہے دنیا عالم میں ایک ایک زبان پر آتی ہے۔

انگریزی میں انہیں گاڈز کہتے ہیں۔ اور ہر ایک جذبۂ انسانی بلکہ خزاں اور بہار اور موسیقی وغیرہ وغیرہ کے لئے مختلف گاڈز تیار کئے ہیں۔ زمانے کی گردشوں نے ہمارے علوم کو مٹا دیا۔ اس لئے آج یہ باتیں نئی معلوم ہوتی ہیں، ورنہ سنسکرت میں بھی اکثر اشیا کے لئے ایک ایک دیبی یا دیوتا ہیں۔

مسلمانوں کے دماغ بھی اس خیال سے خالی نہیں تھے۔ ان کی تصنیفات میں فلاسفہ کا قول منقول ہے کہ اگر ایک مور کے پر کو دیکھیں اور اسکے صنائع بدائع کریں تو عقل حیران ہوتی ہے کہ کونسا صانع ہوگا جو ایسی دستکاری کر سکے پھر مور کے تمام جسم کو دیکھو اور اسی نسبت سے تمام عالم موجودات اور اس کے جزئیات دیکھو۔ پھر جب دیکھتے ہیں کہ اَلْوَاحِدُ لَا یَصْدُرُ عَنْہُ اِلَّا الْوَاحِدُ یعنی ایک فاعل سے ایک وقت میں ایک ہی کام ہو سکتا ہے، تو ضرور ہے کہ کائنات کے مختلف کارخانوں کے لئے ایک ایک **ربُّ النوع** فرض کیا جائے جو اپنے کارخانے کا سربراہ ہو، اور سب کا مالک **ربُّ الارباب** جامع جمیع صفات کمال۔ اہل شریعت نے اسی کو ہر ایک سلسلہ کا ایک ایک **فرشتۂ موکل** مانا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ فقط زبان کا فرق ہے، ورنہ وہی دیبی یا دیوتا، وہی گاڈز، وہی ربّ النوع وہی فرشتۂ موکل۔"

یہ وہی باتیں ہوں گی جو انگریزی علم اساطیر کے متعلق کرنل ہالرائڈ نے علامہ آزاد کے لئے بصورت خاکہ تیار کی ہونگی۔

ایک مضمون "سچ اور جھوٹ کا رزمنامہ" ہے۔ اس میں لکھتے ہیں:۔

"حکیموں نے جھوٹ سے متنفر ہونے کی بہت سی تدبیریں نکالی ہیں جس طرح بچوں کو کڑوی دوا مٹھائی میں ملا کر کھلاتے ہیں۔ اسی طرح الواع واقسام کے رنگوں میں اس کی نصیحتیں کی ہیں، تاکہ لوگ اسے ہنستے کھیلتے چھوڑ دیں واضح ہو کہ ملکہ صداقت زمانی سلطان آسمانی کی بیٹی تھی۔ جو کہ ملکہ دانش خاتون کے پیٹ سے پیدا ہوئی تھی۔ جب ملکہ موصوفہ نے ہوش سنبھالا اول تعلیم و تربیت کے سپرد ہوئی۔ جب انھوں نے اس کی پرورش میں اپنا حق ادا

کر دیا۔ تو باپ کے دربار میں سلام کو حاضر ہوئی۔ اسے نیکی اور نیک ذاتی کے ساتھ
خوبیوں اور محبوبیوں کے زیور سے آراستہ دیکھ کر سب نے صدق دل سے تعریف کی
عزت دوام کا تاج مرصع سر پر رکھا گیا اور حکم ہوا کہ جاؤ اولاد آدم میں اپنا نور
پھیلاؤ۔ عالم سفلی میں دروغ دیو زاد ایک سفلہ نابکار تھا کہ حمق تیرہ دماغ اس کا
باپ تھا اور ہوس ہوا پرست اس کی ماں تھی۔ اگرچہ اسے دربار میں آنے کی اجازت
نہ تھی۔ مگر جب کسی تفریح کی صحبت میں تمسخر اور ظرافت کے بھانڈ آیا کرتے تھے
تو ان کی سنگت میں وہ بھی آ جاتا تھا۔ اتفاقاً اس دن وہ بھی آیا ہوا تھا، اور بادشاہ
کو ایسا خوش کیا تھا کہ اسے ملبوس خاص کا خلعت مل گیا تھا۔ یہ منافق دل میں
سلطان آسمانی سے سخت عداوت رکھتا تھا۔ ملکہ کی قدر و منزلت دیکھ کر اسے
حسد کی آگ نے بھڑکایا، چنانچہ وہاں سے چپ چپاتے نکلا، اور ملکہ کے عمل میں
خلل ڈالنے کو ساتھ ساتھ روانہ ہوا۔"

اس قسم کے مضامین میں واقعات و کیفیات کی رنگینی اور رنگارنگی تو بہت ہے،
اور خوب ہے۔ بے شمار واقعات بیان کئے ہیں اور تقریباً تمام فضائل و رذائل
کو متشکل کر کے عبرت و بصیرت کا سامان مہیا کر دیا ہے۔ لیکن پیرایۂ تمثیل یہی ہے
جو اوپر دکھایا گیا۔

لیکن بعض مضامین میں زیادہ جدت و ندرت سے کام لیا گیا ہے۔ چنانچہ ایک
مضمون لکھا ہے: انسان کسی حال میں خوش نہیں رہتا۔ اس کو اس طرح شروع
کرتے ہیں:۔

"سقراط حکیم نے کیا خوب لطیفہ کہا ہے کہ اگر تمام اہل دنیا کی مصیبتیں ایک جگہ
لا کر ڈھیر کر دیں اور پھر سب کو برابر بانٹ دیں تو جو لوگ آپ اپنے تئیں بدنصیب
سمجھ رہے ہیں وہ اس تقسیم کو مصیبت اور پہلی مصیبت کو غنیمت سمجھیں گے۔

ایک اور حکیم اس لطیفہ کے مضمون کو اور بھی بالا تر لے گیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر ہم اپنی اپنی مصیبتوں کو آپس میں بدل بھی سکتے تو پھر ہر شخص اپنی پہلی ہی مصیبت کو اچھا سمجھتا۔

میں ان دونوں خیالوں کو وسعت دے رہا تھا اور بے فکری کے تکیے سے لگا بیٹھا تھا کہ نیند آ گئی۔ خواب میں دیکھتا ہوں کہ سلطان الافلاک کے دربار سے ایک اشتہار جاری ہوا ہے۔ خلاصہ جس کا یہ ہے کہ تمام اہل عالم اپنے اپنے رنج والم اور مصائب و تکالیف کو لائیں اور ایک جگہ ڈھیر لگائیں۔ چنانچہ اس مطلب کے لئے ایک میدان جو میدان خیال سے بھی زیادہ وسیع تھا، تجویز ہوا۔ اور لوگ آنے شروع ہوئے۔ میں بیچوں بیچ میں کھڑا تھا اور ان کے تماشے کا لطف اٹھا رہا تھا۔ دیکھتا تھا کہ ایک کے بعد ایک آتا ہے اور اپنا بوجھ سر سے پھینک جاتا ہے۔ لیکن جو بوجھ گرتا ہے مقدار میں اور بھی بڑا ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ مصیبتوں کا پہاڑ بادلوں سے بھی اونچا ہو گیا۔ (پھر اس انبار مصائب کی تفصیل لکھتے ہوئے کہتے ہیں)

اس عالم میں بھی چند شخصوں کی حالت ایسی نظر آئی کہ اس نے ذرا میرا دل بہلایا۔ صورت بہلاوے کی یہ ہوئی کہ دیکھتا ہوں کہ ایک شخص پرانے سے چکن کے جبے میں ایک بھاری سی گٹھری لئے آتا ہے۔ جب وہ گٹھری انبار میں پھینکی تو معلوم ہوا کہ افلاس کا عذاب تھا۔ اس کے پیچھے ایک اور شخص دوڑا آتا تھا۔ بدن سے پسینا بہتا تھا اور مارے بوجھ کے ہانپا جاتا تھا اس نے بھی وہ بوجھ سر سے پھینکا اور معلوم ہوا کہ اس کی جورو بہت بری تھی اس نے وہ بلا سر سے پھینکی ہے۔

اس کے بعد ایک بڑی بھیڑ آئی کہ جس کی تعداد کا شمار نہ تھا۔ معلوم ہوا کہ یہ عاشقوں کا گروہ ہے۔ ان کے سروں پر درد و آہ کی گٹھریاں تھیں کہ انہی میں

آہوں کے تیر خیالی اور نالوں کے نیزۂ وبالی دبے ہوئے تھے۔ اگرچہ یہ لوگ مارے بوجھ کے اس طرح درد سے آہیں بھرتے تھے کہ گویا اب سینے ان کے پھٹ جائیں گے لیکن تعجب یہ ہے کہ جب اس انبار کے پاس آئے تو اتنا نہ ہو سکا کہ ان بوجھوں کو سر سے پھینک دیں۔ کچھ جد و جہد سے سر ہلایا، مگر جس طرح لدے ہوئے آئے تھے اسی طرح چلے گئے“

دیکھئے آزاد نے عاشقوں کی کیا خوب لاج رکھی ہے۔ آگے لکھتے ہیں (درمیان سے عبارتیں حذف کردی گئی ہیں)

”بہت بڑھیاں دیکھیں کہ بدن کی جھریاں پھینک رہی تھیں۔ چند نوجوانوں نے کالی رنگت اچھے موٹے موٹے ہونٹ، اکثر ایسے میل جمے ہوئے دانت پھینکے تھے کہ جنھیں دیکھ کر شرم آتی تھی .... اتنے میں ایک عیاش کو دیکھا کہ اپنے گناہوں کا بوجھ اٹھائے بے پرواہ چلا آتا ہے۔ اس نے ایک گٹھری پھینک دی مگر جب دیکھا تو معلوم ہوا کہ گناہوں کے عوض اپنی عاقبت اندیشی کو پھینک گیا۔ ساتھ ہی ایک چھٹے ہوئے شہدے آئے۔ میں سمجھا کہ یہ شاید اپنی کوتاہ اندیشی کو پھینکیں گے۔ مگر وہ بجائے اس کے اپنی شرم و حیا کو پھینک گئے .....

ہم اس انبوہِ پُر آفات پر غور سے نظر کر رہے تھے اور اس عالم ہیولانی کی ایک ایک بات کو تاک کو دیکھ رہے تھے جو سلطان الافلاک کی بارگاہ سے حکم پہنچا کہ اب سب کو اختیار ہے، جس طرح چاہیں اپنے اپنے رنج و تکلیف کو تبدیل کرلیں اور اپنے اپنے بوجھ لیکر گھروں کو چلے جائیں ..... چنانچہ اس وقت چند باتیں جو میں نے دیکھیں وہ بیان کرتا ہوں۔

ایک پیر مرد کہ نہایت معزز و محترم معلوم ہوتا تھا درد قولنج سے جاں بلب تھا، اور لاولدی کے سبب اپنے مال و املاک کے لئے ایک وارث چاہتا تھا

اس نے درد مذکور پھینک کر ایک خوبصورت نوجوان لڑکے کو لیا مگر لڑکے نا بکار کو نافرمانی اور سرشوری کے سبب سے دق ہو کر اس کے باپ نے چھوڑ دیا تھا چنانچہ اس نالائق نوجوان نے آتے ہی جھٹ بڈھے کی داڑھی پکڑلی اور سر توڑنے کو تیار ہوا۔ اتفاقاً برابر ہی لڑکے کا حقیقی باپ نظر آیا کہ اب وہ درد قولنج کے مارے لوٹنے لگا تھا۔ چنانچہ بڈھے نے اس سے کہا کہ برائے خدا میرا درد قولنج مجھے پھیر دیجئے اور اپنا لڑکا لیجئے کہ میرا پہلا عذاب اس سے ہزار درجہ بہتر ہے، مگر مشکل یہ ہوئی کہ یہ مبادلہ اب پھر نہ سکتا تھا۔

عورتیں بچاری اپنے ادل بدل کے عذاب میں گرفتار تھیں۔ کسی نے تو سفید بالوں کو چھوڑا تھا مگر اب پاؤں میں ایک پھوڑا ہو گیا تھا کہ لنگڑاتی تھی اور ہائے ہائے کرتی چلی جاتی تھی .... کسی نے چہرے کی خوبصورتی لی تھی مگر اس کے ساتھ بے آبروئی کا داغ اور بدنامی کا ٹیکا بھی چلا آیا تھا غرض ان سب میں کوئی ایسا نہ تھا جسے پہلے نقص کی نسبت نیا نقص گراں نہ معلوم ہو رہا ہو۔ ان سب کی حالتوں کو دیکھ کر یہ میری سمجھ میں آیا کہ جو مصیبتیں ہم پر پڑتی ہیں، وہ حقیقت میں ہمارے سہارے کے بموجب ہوتی ہیں یا یہ بات ہے کہ سہتے سہتے ہمیں ان کی عادت ہو جاتی ہے .....

غرض وہ سارا انبار عورتوں اور مردوں میں تقسیم ہو گیا، مگر لوگوں کا یہ حال تھا کہ دیکھنے سے ترس آتا تھا۔ یعنی جان سے بیزار تھے اور اپنے اپنے بوجھوں میں دبے ہوئے اُدپر تلے دوڑتے پھرتے تھے۔ سارا میدان گریہ زاری نالہ و فریاد، آہ و افسوس سے دھواں دھار ہو رہا تھا۔ آخر سلطان الافلاک کو بیکس آدم زاد کے حال دردناک پر پھر رحم آیا، اور حکم دیا کہ اپنے اپنے بوجھ اُتار کر پھینک دیں۔ پہلے ہی بوجھ انھیں مل جائیں۔ سب نے خوشی خوشی

ان دوبالوں کو سرد گردن سے اُتار کر پھینک دیا۔"

ایک اور مضمون میں بھی پُر لطف جدت پیدا کی ہے یعنی "شہرت عام اور بقائے دوام کا دربار" قائم کیا ہے جس میں تاریخ عالم کے اکثر مشاہیر کو لا کر بٹھایا ہے چنانچہ کالی داس، محمود، فردوسی، نظامی، چنگیز خاں، امیر تیمور، بو علی سینا، اکبر، جہانگیر، سیواجی، مرزا سودا، ناسخ، آتش، ذوق، غالب کو قرینے سے دربار میں کرسیاں دی ہیں شروع میں لکھتے ہیں:-

"بقائے دوام دو طرح کی ہے۔ ایک تو وہی جس طرح روح فی الحقیقت بعد مرنے کے رہ جائے گی کہ اس کے لئے فنا نہیں۔ دوسری وہ عالم یادگار کی بقا جس کی بدولت لوگ نام کی عمر سے جیتے ہیں، اور شہرت دوام کی عمر پاتے ہیں۔ حق یہ ہے کہ اچھے سے اچھے کام اور بڑے سے بڑے کام جن جن سے ہوئے یا تو ثواب آخرت کے لئے یا دنیا کی ناموری اور شہرت کے لئے ہوتے رہے لیکن میں اس دربار میں انھیں لوگوں کو لاؤں گا جنھوں نے اپنی محنت ہائے عرق فشاں کا صلہ اور عزم ہائے عظیمہ کا ثواب فقط دنیا کی شہرت اور ناموری کو سمجھا۔ اسی واسطے جو لوگ دین کے بانی اور مذہب کے رہنما تھے۔ ان کے نام شہرت کی فہرست سے نکال ڈالتا ہوں۔"

دربار کے حال سے مختلف حصے اقتباس کر کے لکھے جاتے ہیں:-

جس وقت راجہ نے مسند پر قدم رکھا ایک پنڈت آیا، دونوں ہاتھ اٹھا کر اشیرباد کہی اور بقائے دوام کا تاج سر پر رکھ دیا۔ جس میں ہیرے اور پنے کے نو دانے ستاروں پر آنکھ مار رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ وہ راجہ بھوج تھے اور ۳۲ پریوں کا جمگھٹ وہی کتاب سنگھاسن بتیسی جو اُن کے عہد میں تصنیف ہوئی۔ اور جس نے تاج سر پر رکھا وہ کالی داس شاعر تھا جس نے اسکے

عہد میں تو کتابیں لکھ کر فصاحت و بلاغت کو زندگی جاوید بخشی ہے۔

...... دفعتہً سکندر نے آواز دی "انھیں لاؤ" جو شخص داخل ہوا وہ ایک پیر مرد بزرگ صورت تھا۔ کہ متیشی داڑھی کے ساتھ بڑھاپے کے نور نے اس کے چہرے کو روشن کیا تھا۔ ہاتھ میں عصائے پیری تھا جس وقت وہ آیا، سکندر خود اٹھا اس کا ہاتھ پکڑ کر لایا اپنے برابر کرسی پر بٹھایا، اور پانچ لڑی کا سہرا اسکے سر پر باندھا معلوم ہوا کہ یہ نظامی گنجوی ہیں اور اس سہرے میں خمسہ کے مضامین سے پھول پروئے ہوئے ہیں۔ سکندر پھر اٹھا اور تھوڑا سا پانی اس پر چھڑک کر کہا اب یہ کبھی نہ کملائیں گے۔

...... اس کے بعد ایک اور بادشاہ آیا جو اپنی وضع سے ہندوستانیہ معلوم ہوتا تھا وہ نشہ میں چور تھا۔ ایک عورت صاحب جمال اس کا ہاتھ پکڑے آتی تھی اور جدھر چاہتی تھی پھراتی تھی۔ وہ جو کچھ دیکھتا تھا اسی کے نورِ جمال سے دیکھتا تھا اور جو کچھ کہتا تھا اسی کی زبان سے کہتا تھا۔ اس پر بھی ہاتھ میں ایک جزو کاغذوں کا تھا اور کان پر قلم دھرا تھا۔ یہ سانگ دیکھ کر سب مسکرائے، مگر چونکہ دولت اس کے ساتھ تھی اور اقبال آگے آگے اہتمام کرتا آتا تھا اس لئے بدمست بھی نہ ہوتا تھا جب نشہ سے آنکھیں کھلتی تھیں تو کچھ لکھ بھی لیتا تھا۔ وہ جہانگیر تھا اور بیگم نور جہاں تھی۔

...... تھوڑی دیر ہوئی تھی جو ایک غول ہندوستانیوں کا پیدا ہوا۔ ان لوگوں میں بھی کوئی مرقّع بغل میں دبائے تھا۔ کوئی گلدستہ ہاتھ میں لئے تھا۔ تمیں دیکھ دیکھ کر آپ ہی آپ خوش ہوتے تھے اور وجد کرکے اپنے اشعار پڑھتے تھے۔ یہ ہندوستانی شاعر تھے۔ چنانچہ چند اشخاص انتخاب ہوئے۔ ان میں ایک شخص دیکھا کہ جب بات کرتا تھا اس کے منہ سے زنگار رنگ کے پھول جھڑتے تھے۔ لوگ

ساتھ ساتھ دامن پھیلائے تھے۔ مگر بعض پھولوں میں کانٹے ایسے ہوتے تھے
کہ لوگوں کے کپڑے پھٹے جاتے تھے۔ پھر بھی مشتاق زمین پر گرنے نہ دیتے تھے۔
کوئی نہ کوئی اٹھا ہی لیتا تھا۔ وہ مرزا رفیع سودا تھے۔"

مرزا سودا دہلوی کی ہجو گوئی کو پھولوں کے کانٹوں سے تشبیہ دیکر کیا
خوب نقشہ کھینچا ہے۔

(۳) **سخندانِ فارس** کے دو حصے یکجا ہیں پہلے میں فارسی زبان کی اصلیت
اور ساخت کو بیان کیا ہے۔ دوسرے حصے میں ایک درجن سے زیادہ لکچر ہیں، جو
کالج کے طلبا کے سامنے پڑھنے کے لئے تیار کئے گئے تھے۔ پہلا لکچر ۹ فروری ۱۸۷۲ء
کو دیا گیا ہے اور کئی سال میں یہ سلسلہ پورا ہوا ہے۔ اس حصے میں ایران کی قدیم زبان
اسلام کے بعد کی زبان، اس کے تغیرات، ایران کی معاشرت و تمدن اور ان کا زبان پر
اثر۔ انقلاباتِ ملکی اور ان کا علم و ادب پر اثر، مصنفوں اور شاعروں اور انکی تصانیف
کا حال، ہندوستان میں فارسی زبان و ادب کی کیفیت وغیرہ مختلف مضامین پر مفید و
دلچسپ معلومات فراہم کئے ہیں۔ بہ حیثیت مجموعی اس موضوع کی کوئی تصنیف اردو
کیا، فارسی میں بھی نہ تھی۔ علامہ آزاد کی رنگینی تحریر اس میں بھی قائم ہے۔ بعض اقتباسات
یہ ہیں:-

حصہ اوّل میں الفاظ کی ولادت و نسل اور نوعیت و ساخت بیان کرتے ہیں۔

"میرے دوستو، تم حیران ہوگے کہ لفظ کی ولادت اور نسل کیا؟ ہاں لفظ کی
بھی ولادت اور نسل ہوتی ہے، اور وہ اس طرح معلوم ہوتی ہے کہ فلسفی لفظ کے
جزو جزو کو الگ کرتا ہے، اور دیکھتا ہے کہ وقت بوقت ان کی اصل کس کس قوم میں
پہنچتی آئی ہے۔ ان میں کیا رشتے ہیں؟ اور کیونکر وہ رشتے پیدا ہوئے ہیں؟ در
ملک بملک ان کے معنوں یا حرفوں میں کیا تغیر پیدا ہوتے گئے؟ پھر اور زمانے

لحاظ سے اپنی باتوں پر غور کرتا ہے، ان کے نتائج کو بھی جانچتا ہے، اور مطابقت
اور مقابلہ کرتا ہے یعنی ایک زبان کے لفظ دوسری زبان سے کن کن باتوں میں
متفق ہیں، اور کونسی باتیں ہیں کہ ایک ہی کے لئے خاص ہیں پھر ان سببوں
کی جستجو کرتا ہے جو زبان میں تبدیلی کا عمل کر رہے ہیں، اور یہ غیر منقطع کام ہے
کبھی ترقی کے رنگ میں ہوتا ہے، کبھی تنزل میں مگر جاری ہمیشہ رہتا ہے، اور
اسی کو زبان کی اصل نسل کہتے ہیں۔ اب چند مثالیں توضیح مطلب کے لئے
لکھتا ہوں:۔

گریبان کو فلسفی زبان نے دیکھا۔ بان پر جوڑ معلوم ہوا۔ اس نے گر سے
کو دیکھا تو فارسی قدیم میں یعنی گلو پایا۔ سمجھ گیا کہ اس جزو لباس کا گلے پر قبضہ ہے
اس لئے اس کا نام گریباں رکھا ہوگا کہ مالک گلو ہے۔ سنسکرت میں دیکھا تو وہاں
گریوا انہی معنوں میں آیا ہے۔ اور بان سنسکرت میں والن ہے۔ ثابت ہو گیا
کہ ایک گھرانے کی نسل ہے۔ ملک اور مدت کے انقلاب سے آواز بدل گئی۔ یہاں
مر گیا وہاں جیتا ہے۔

کلابتون کو سب پہنتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں۔ فلسفی زبان اس کا بل کھولتا
ہے۔ اور دیکھتا ہے کہ کلابہ کلاوہ (سوت کا لچھا) آلتون ترکی میں سونے کو
کہتے ہیں۔ وہی سُنہرا لچھا۔" (سخندان فارس حصہ اول صفحہ ۱۵-۱۶)

ایران میں ساتویں صدی ہجری سے بارھویں صدی ہجری تک پانچ چھ
سو برس جو زبان و ادب کا رنگ رہا اس پر دیو لوکرتے ہیں:۔

۶۹۹ھ میں عبداللہ وصاف ابن فضل اللہ نے غازان خاں شاہزادہ چنگیزی
کے لئے تاریخ وصاف لکھی شروع کی۔ حقیقت میں بڑا زور مارا ہے اور فارسی
عربی زباندانی کا حق ادا کر دیا ہے۔ مگر فقط لفاظی اور لغت بازی ہے۔ عربی

فارسی، ترکی لفظوں کا حشر برپا ہے۔ استعارہ اور تشبیہ نظم میں تو برس پہلے رنگ دینے لگے تھے، نثر میں بہت کم تھے۔ انھوں نے اس قدر بہتات کی کہ مطلب گم ہو گیا عبارت کو مقفیٰ کیا اور ہر فقرے پر اس کا ہم معنی فقرہ اور سوار کیا۔ ہر صفحہ میں دو دو تین تین عربی شعر اور عربی عبارتیں، کہیں کہیں سطریں، آدھا صفحہ اور زیادہ بھی لکھ جاتے ہیں۔ اس کا سبب یہ تھا کہ غازان خان کی حکومت کنارۂ ایران سے سرحد مصر تک پھیلی ہوئی تھی۔ خاک عرب کا اثر ضرور ظاہر ہوتا تھا۔ ترکی الفاظ کیوں نہ آتے؟ ترک نحووں میں بیٹھ کر لکھتے تھے، اور ترک بادشاہ کے دربار میں کھڑے ہو کر سناتے تھے، اور چونکہ فاضل تھے، صاحب زبان تھے، آمد طبع کا دروازہ کھلا ہوا تھا، اسلئے کہیں چھوٹے کہیں بڑے بڑے فقرے لکھ کر لمبے لمبے ہاتھ مارتے تھے۔

میرے دوستو، یہ انشا پرداز منہ زور گھوڑوں کے شہسوار تھے کہ بے مطلبی کے میدانوں میں بے ارادہ کسی منزل کے خواہ مخواہ گھوڑے مارے چلے جاتے تھے اور حق پوچھو تو یہ بھی بڑا کمال ہے۔ ذرا سی بات کو بلکہ بے بنیاد معاملہ کو، مثلاً بادشاہ کی مدح کہ وہ بہت اچھا ہے، یا باغ کا حال کہ خوب شاداب ہے، یا بازاری کاندارد کی تعریف کو اس قدر لمبا اور چوڑا بنا بغیر دودھ کے اُبال اُٹھانا ہے۔ اور یہ انہی کا کام تھا مگر بے حاصل۔

ایک تیز قلم مصور نے نظر کے زور سے اور ہاتھ کی مشق سے ایک گلاب کی پتی پر فورٹ ولیم کی تصویر کھینچی، اور اس میں کوئی جز اس کی عمارت کا باقی نہ چھوڑا یا کسی نازک دستکار نے چنے کی دال کو جنگی جہاز تراشا، اس طرح کہ چھوٹے سے چھوٹا پرزہ بھی اصل جہاز کا دیکھو تو موجود پاؤ۔ بے شک دونوں نے بڑا کمال کیا، مگر اس قلعہ کے ایوان میں کونسا بادشاہ ملک رانی کرے، اور جہاز میں کونسا

لشکر سمندر پار اُترے"!

(۴) دربارِ اکبری میں اکبر بادشاہ کے ذاتی، درباری، آئینی حالات اور سلطنت کے خاص خاص ارکان، وُزرار، علمار، اُمرار کے سوانح بڑی تفصیل کے ساتھ مختلف تاریخوں سے جمع کیے ہیں، جن میں ملّا عبدالقادر بدایونی کی "منتخب التواریخ" کا عنصر غالب ہے۔ عمومًا صفحے کے صفحے اسی تاریخ سے ترجمہ کر دیتے ہیں۔ بعض مقامات کے مختصر نمونے یہ ہیں:-

"محبت کے ناز و نیاز۔ اکبر بادشاہ قوم کا ترک، مذہب کا مسلمان تھا۔ راجہ یہاں کے ہندی وطن اور ہندو مذہب تھے۔ اتفاق اور اختلاف کے مقدمے تو ہزاروں تھے، مگر میں ان میں سے ایک نکتہ لکھتا ہوں۔ ذرا آپس کے برتاؤ دیکھو، اور ان سے دلوں کے حال کا پتا لگاؤ۔ اسی ہنگامے میں (یعنی تیسری یلغار گجرات پر) راجہ جے مل (راجہ روپسی کا بیٹا تھا) اکبر کے برابر نکلا۔ اس کا بکتر بہت بھاری تھا۔ اکبر نے سبب پوچھا۔ اس نے کہا کہ اس وقت یہی ہے۔ زرہ رہیں رہ گئی۔ در دخواہ بادشاہ نے اسی وقت بکتر اُتروا دیا اور اپنے خاصے کی زرہ پہنوا دی۔ وہ سلام کر کے خوش ہوتا ہوا اپنے رفیقوں میں گیا۔ اتنے میں راجہ کرن (مالدیو راجہ جودھپور کے پوتے) کو دیکھا کہ اس کے پاس زرہ بکتر کچھ نہ تھا۔ بادشاہ نے وہی بکتر اسے دے دیا۔ جے مل اپنے باپ (روپسی) کے سامنے گیا۔ اس نے پوچھا بکتر کہاں ہے؟ جے مل نے سارا ماجرا سُنایا۔ روپسی کی جودھپور والوں سے خاندانی عداوت چلی آتی تھی۔ اسی وقت بادشاہ کے پاس آدمی بھیجا کہ حضور میرا بکتہ مرحمت ہو۔ وہ میرے بزرگوں سے چلا آتا ہے اور بڑا مبارک اور فتح نصیب ہے۔ اس وقت بادشاہ کو یاد آیا کہ ان کی کھٹک ہے۔ فرمایا کہ خیر، ہم نے اسی واسطے خاصے کی زرہ تمہیں دے دی ہے کہ ذرہ اتعر لے

اور اقبال کا گنگا ہے۔ اسے اپنے پاس رکھو۔ روپسی کے دل نے نہ مانا اور تو
کچھ نہ ہو سکا، اسلحۂ جنگ اتار کر پھینک دیے۔ اور کہا خیر میں میدان جنگ میں
یونہی جاؤں گا۔ اس نازک موقع پر اکبر کو بھی اور کچھ نہ بن آیا۔ کہا خیر ہمارے
جان نثار ننگے لڑیں تو ہم سے بھی نہیں ہو سکتا کہ زرہ بکتر میں چھپ کر میدان
میں لڑیں۔ ہم بھی برہنہ تیر و تلوار کے منہ پر جائیں گے۔ راجہ بھگوان داس اسی
وقت گھوڑا اڑا کر جے مل کے پاس گئے۔ اسے سمجھا بجھا کر دنیا کے رستے کا نشیب
فراز دکھایا۔ یہ بڈھا خاندان کا ستون تھا اس کا سب لحاظ کرتے تھے۔ اس نے
شرمندہ ہو کر پھر ہتیار سجے۔ راجہ بھگوان داس نے آکر عرض کی کہ حضور روپسی
نے بھنگ پی تھی، اس کی لہروں نے ترنگ دکھائی تھی اور کچھ بات نہ تھی۔ اکبر
سن کر ہنسنے لگا اور ایسا نازک جھگڑا لطیفہ ہو کر اڑ گیا۔"

تمام دربار اکبری آزاد کی انشاپردازی کا عجیب دلکش نمونہ ہے۔ بعض حصے اور
بعض واقعات خاص طور پر مؤثر ہیں۔ ان میں سے ایک خان زماں علی خاں شیبانی
کا حال ہے۔ اس میں سے کچھ اقتباس لیا جاتا ہے:۔

"غرض رات نے صبح کی کروٹ لی، ستارہ نے انکساری اور شفق خونی پیالہ بھر کر
مشرق سے نمودار ہوئی۔ نور کے تڑکے بادشاہی فوج کا ایک آدمی انکے خیمے
کے پیچھے جا کر بہ آواز بلند چلایا کہ مستو، بے خبرو، کچھ خبر بھی ہے؟ بادشاہ خود
لشکر سمیت آن پہنچے، اور دریا بھی اتر لئے۔ اس وقت خان زماں کے کان
کھڑے ہوئے، مگر جانا کہ آصف خاں کی چالاکی ہے: مجنوں خاں قاقشال
کو پھونس پتا بھی نہ سمجھتا تھا، کچھ پروا نہ کی ..... غرض نور کا تڑکا تھا کہ بادشاہی
نقارہ پر چوٹ پڑی۔ یہ آواز سن کر اٹھ کھڑے ہوئے اور لشکر کا بندوبست
کرنے لگے۔

۹۷۴ھ نو بجے پیر کا دن، عید قرباں کی پہلی تاریخ تھی منگروال (سنگروال)
علاقہ الہٰ آباد پر مقام تھا کہ میدان جنگ میں تلوار میان سے نکلی۔ دونوں بھائی
شیر ببر کی طرح آئے اور اپنے اپنے پرے جما کر پہاڑ کی طرح ڈٹ گئے۔ قلب میں
خان زماں قائم ہوا۔ ادھر سے اکبر نے ہاتھیوں کی صف باندھ کر فوج کے
پرے باندھے .... بادشاہ "بال سندر" ہاتھی پر سوار تھے اور مرزا عزیز کوکہ
خواصی میں بیٹھے تھے۔ ان کا خاندان گرد و پیش جما ہوا تھا۔ اکبر نے دیکھا کہ
میدان کا رنگ بدلا، بنظر احتیاط ہاتھی سے کود کر گھوڑے پر سوار ہوا، اور بہادروں
کو للکارا۔ اب دونوں بھائیوں (خان زماں اور بہادر خاں) نے پہچانا کہ ضرور
بادشاہ اس لشکر میں ہے .... اب انھوں نے مرنا دل میں ٹھان لیا اور
جہاں جہاں تھے وہیں قائم ہو گئے۔ مگر تنک کی مار کا حربہ کچھ اور ہی ضرب
دکھاتا ہے۔ بہادر خاں کے گھوڑے کے سینے میں ایک تیر لگا کہ چراغ پا ہو کر گر پڑا
اور وہ پیادہ ہو گیا۔ بادشاہ کو ابھی تک اس حال کی خبر نہ پہنچی تھی۔ سب کو
بدحواس دیکھ کر خود آگے بڑھا اور فوجداروں کو آواز دی کہ ہاتھیوں کی
صف کو علی قلی خاں کی فوج پر ریل دو کہ بہادر خاں کو ادھر متوجہ ہونا پڑے
دونوں لشکر تہ و بالا ہو رہے تھے۔ علی قلی خاں اپنی جگہ جما کھڑا تھا۔ بار
بار بہادر خاں کا حال پوچھتا تھا اور مدد بھیجتا تھا۔ ابھی کچھ خبر نہ تھی کہ
دونوں بھائیوں پر کیا گذری کہ اکبری بہادروں کو فتح کی رگ پھڑکتی معلوم
ہوئی اور کامیابی کے آثار ظاہر ہونے لگے۔

بات یہ ہوئی کہ اُدھر سے "ہیرانند" ہاتھی علی قلی خاں کی فوج پر جھکا۔ ادھر سے
مقابلہ میں "رودیانہ" ہاتھی تھا۔ ہیرانند نے قدم کاٹ کر اس طرح کلّہ کی ٹکر ماری
کہ رودیانہ سینہ ٹیک کر بیٹھ گیا۔ اتفاقاً ایک تیر قضا کے تیر کی طرح علی قلی خاں کے

لگ۔ دلاور بڑی بے پروائی سے نکال رہا تھا کہ دوسرا تیر گھوڑے کے لگا، اور ایسا بیڈھب لگا کہ ہرگز نہ سنبھل سکا، گرا اور سوار کو بھی لیکر گرا۔ ہمراہیوں نے دوسرا گھوڑا سامنے کیا اتنے عرصے میں کہ وہ سوار ہو، ایک بادشاہی ہاتھی باغیوں کو پامال کرتا ہوا بلا کی طرح اس پر پہنچا۔ خان زماں نے آواز دی فوجدار ہاتھی کو روکنا، میں سپہ سالار ہوں۔ زندہ حضور میں لے جا، بہت انعام پائے گا۔ اس کمبخت نے نہ سُنا، ہاتھی کو ہول ہی دیا۔ افسوس وہ خان زماں جس کے گھوڑے کی جھپٹ سے فوجوں کے دھوئیں اُڑتے تھے، اُسے ہاتھی روندکر ہوا کی طرح ادھر طرف نکل گیا، اور وہ خاک پر سسکتا رہ گیا اللہ اللہ! جس بہادر کو فتح و اقبال ہو لے گھوڑوں پر چڑھاتے تھے، جس عیش کے بندے کو ناز و نعمت مخملوں کے فرش پر لٹاتے تھے، وہ خاک پر پڑا دم توڑتا تھا، جوانی سرہانے کھڑی سر ملتی تھی، اور دلاوری زار زار روتی تھی۔ سارے ارادے اور حوصلے خواب خیال ہو گئے تھے۔ ہاں، خان زماں! یہ یہاں کا معمولی قانون ہے، تم نے ہزاروں کو خاک و خون میں لٹایا، آؤ بھائی، اب تمھاری باری ہے۔ اسی خاک پر تمہیں سونا ہوگا۔

سرِ لشکر کے مرتے ہی لشکر پریشان ہو گیا۔ فوج شاہی میں فتح کا نقارہ بج گیا۔ اکبر ادھر ادھر کمک دوڑا رہا تھا کہ اتنے میں نظر بہادر، بہادر خاں کو اپنے آگے گھوڑے پر سوار کر کے لایا، اور حضور میں پیش کیا۔ اکبر نے پوچھا "بہادر! چونی؟" کچھ جواب نہ دیا۔ اکبر نے پھر کہا۔ اس نے کہا "الحمدللہ علیٰ کلّ حال" بادشاہ کا دل بھر آیا۔ بچپن کا عالم اور ساتھ کا کھیلنا یاد آیا پھر کہا، "بہادر! ما بشما چہ بدی کردہ بودیم کہ شمشیر بر روے ما کشیدید" وہ شرمندہ شرمسار سر جھکائے کھڑا تھا۔ مارے خجالت کے کچھ جواب

نہ دے سکا۔ کہا تو یہ کہا۔ "الحمد للہ علیٰ کلّ حال کہ در آخر عمر دیدار حضرت بادشاہ، کہ ماحی گناہان است، نصیب شد" آفریں ہے اکبر کے حوصلے کو! گنہ بخش کا لفظ سنتے ہی آنکھیں نیچی کرلیں، اور کہا، "بحفاظت نگہدارید" اس نے پانی مانگا، اپنی چھاگل میں سے پانی دیا..... کوئی کہتا ہے بے اطلاع، کوئی کہتا ہے اکبر کے اشارے سے شہباز خاں کمبو نے بے نظیر بہادر کا نقش صفحۂ ہستی سے مٹادیا۔ مگر ملّا صاحب کہتے ہیں کہ شہنشاہ اس کے قتل پر راضی نہ تھے۔

بادشاہ میدان میں کھڑے تھے۔ نمک حرام پکڑے آتے تھے، اور مارے جاتے تھے بادشاہ کو بڑا خیال خان زماں کا تھا جو آتا تھا اس سے پوچھتے تھے..... حکم دیا کہ جو نمک حراموں کے سر کاٹ کر لائے، انعام پائے۔ ولایتی کے سر کے لئے اشرفی، ہندوستانی کے سر کے لئے روپیہ۔ ہائے کمبخت ہندوستانیو! تمہارے سر کٹ کر بھی سستے ہی رہے! لشکر کے لوگ بے سروپا اٹھ دوڑے گودیں بھر بھر کر سر لاتے تھے، اور مٹھیاں بھر بھر کر روپے اشرفیاں لیتے تھے۔ ہر سر کو دیکھتے تھے، دکھاتے تھے، اور پہچانتے تھے۔ افسوس انہی سروں میں خان زماں کا سر بھی ملا کہ ادبار کا سر ہو گیا۔ سبحان اللہ! جس سر سے فتح کا نشان جدا نہ ہوتا تھا، جس سے اقبال کا خود نہ اترتا تھا، جس چہرے کو کامیابی کی سرخی شگفتہ رکھتی تھی، اس پر خون نے سیاہ دھاریاں کھینچی تھیں، نحوست نے خاک ڈالی تھی، کون پہچانے؟ سب کو تردد تھا۔ ارزانی مل اس کا عامی اور معتبر دیوان بھی قیدیوں میں حاضر تھا۔ بلایا اور دکھا کر پوچھا۔ اس نے سر کو اٹھایا اپنے سر پر دے مارا، اور ڈاڑھیں مار کر رونے لگا۔ خواجہ دولت کہ پہلے اسکے حرم سرا کا خواجہ سرا تھا، وہاں سے آ کر حضور میں ملازم اور پھر دولت خاں

ہوگیا تھا، اس نے دیکھا، اور کہا، مرنے والے کو عادت تھی کہ ہمیشہ پان بائیں
طرف سے کھایا کرتا تھا، اس لئے ادھر کے دانت رنگین ہوگئے تھے۔ دیکھا تو
ایسا ہی تھا......

جب اکبر کو یقین ہوگیا کہ خان زماں کا بھی کام تمام ہوا، تو گھوڑے سے
اُتر کر خاک پر پیشانی کو رکھ دیا اور سجدۂ شکر بجالایا..... خان زماں! بل بے
تری ہیبت، اور واہ رے تیرا دبدبہ امرد ہو تو ایسا ہو! آزاد کو تیرے مرنے کا
افسوس نہیں، مرنا تو ایک دن سب کو ہے۔ تیری لاش اس سے بھی سوا خراب
وخوار ہوتی، مگر آقا کی جاں نثاری میں ہوتی تو آبِ زر سے لکھی جاتی۔ خدا حاسدوں
کا منھ کالا کرے، جنھوں نے دونوں بھائیوں کی سنہری سرخروئی کو روسیاہی
کردیا۔ آزاد بھی ایسے ہی بے لیاقت بداصالت حاسدوں کے ہاتھ سے داغ
داغ بیٹھا ہے پھر بھی شکر ہے کہ روسیاہی سے محفوظ رکھا۔ یہ نااہل خود کچھ
نہیں کرسکتے، اوروں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر لاتے ہیں اور مورچے باندھتے ہیں
موقع پاتے ہیں تو افسروں سے لڑاتے ہیں۔ خیر آزاد بھی پروا نہیں کرتا اپنے
تئیں خدا کے اور انھیں زمانے کے حوالے کردیتا ہے۔ ان کے اعمال ہی ان کو
سمجھا لیتے ہیں ؎

تو بدکنندۂ خود را بروزگار گذار   کہ روزگار ترا چاکریست کینہ گذار"

(۵) **مکتوبات آزاد**۔ علامہ آزاد کی اور چھوٹی تصانیف، "قصص ہند،
نصیحت کا کرن پھول" وغیرہ میں ان کا وہی اسلوب نگارش موجود ہے، بعض کتابیں مثلاً
تذکرۂ علما، اس قدر سادہ اور طرزِ آزاد سے علیحدہ ہے کہ ان کی تصنیف ہی نہیں
معلوم ہوتی۔ ایک ایک دو، دو صفحے کے نہایت مختصر و ناکافی حالات ہیں، جیسے کسی
بڑی کتاب کی تیاری کے لئے نوٹس اور اشارے لکھے گئے ہوں اسلئے باقی تصانیف

کے نمونے ترک کیے جاتے ہیں۔ مکتوبات آزاد البتہ دلچسپ چیز ہے۔

علامہ آزاد کے یہ سب خطوط صرف ایک شخص میجر ڈاکٹر سید حسن بلگرامی (برادر عزیز نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی) کے نام ہیں، جو انڈین میڈیکل سروس میں فوجی ڈاکٹر تھے، اور ایک زمانے میں بسلسلۂ ملازمت امرتسر میں رہے تھے۔ یہ مکتوبات اول ۱۹۰۶ء میں رسالہ مخزن لاہور میں بالاقساط اور پھر ۱۹۰۷ء میں بصورت کتاب شائع ہوئے تھے۔ اس مجموعہ کا دیباچہ سید جالب دہلوی نے لکھا تھا، جو اس زمانہ میں پیسہ اخبار لاہور کے دفتر ادارت میں تھے، اور پھر آخر میں روزنامہ ہمدم لکھنؤ نکالتے تھے۔

خطوط آزاد کی اہمیت کے متعلق سید جالب صاحب دیباچے میں لکھتے ہیں
ان مکتوبات کے ذریعے سے رسالہ مخزن نے نہ صرف مولانا کی بے تکلفانہ تحریر کا ایک دل آویز نمونہ شائقین اردو کو دکھایا ہے بلکہ بالواسطہ ان کی پُر حوادث مگر قیمتی زندگی کے حالات کا وہ دلچسپ حصہ بہم پونچایا ہے جس کا مہیا ہونا خود حضرت آزاد سے بھی نظر بحالات موجودہ سخت دشوار تھا"

ان مکتوبات میں کچھ خطوط کتابوں کی طباعت و اشاعت کے متعلق ہیں بعض میں ذاتی حالات ہیں چند کالج اور یونیورسٹی کے واقعات سے تعلق رکھتے ہیں۔ اسلئے اکثر سادہ درسی زبان میں لکھے ہیں۔ لیکن کہیں کہیں آزاد کا مخصوص اسلوب نگارش بھی ملتا ہے۔ القاب و آداب اکثر خطوں میں صرف "جناب من تسلیم" ہیں۔ کہیں "عالیجناب" کا لفظ ہے۔ بعض خطوط میں چھوٹے یا بڑے دعائیہ جملے بھی ہیں، مثلاً "ادام اللہ اقبالکم وضاعف اجلالکم" اپنا نام اکثر صرف "آزاد" لکھتے ہیں، اور کہیں پورا نام مع تخلص۔

نمونے کے لئے مکتوبات آزاد کا سب سے پہلا خط بجنسہ نقل کیا جاتا ہے۔ یہ اس

زمانے میں لکھا گیا ہے جب علامہ آزاد "دربار اکبری" مرتب کر رہے تھے اس کتاب کو سر سالار جنگ اوّل کے نام سے معنون کرنا چاہتے ہیں۔ خط میں اسی انتساب کی دو صورتوں کا ذکر ہے۔ پورا خط یہ ہے:۔

"عالیجناب مدام اجلالکم، تسلیم، عنایت نامہ باعث اعزاز ہوا۔ رات کو دس بجے میں گھر پونہچا۔ اس وقت خطوط اور کارڈوں کا انبوہ سامنے ہے، دل "دربار" میں ہے، اور دو، دو حرفوں میں سب کو ٹال رہا ہوں۔ آپ کی تحریر کا جواب فرصت چاہتا ہے مجھے کہاں؟ یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ "ماثر الامرا" اور سوانح اکبری کسی زمانہ میں دیکھی تھیں۔ یہاں تلاش تھی اور نہیں ملتی تھیں۔ چند مقاموں میں پرانی کتابوں کا پتا لگا تھا۔ ۲ دن میں بھاگا بھاگا اور دوڑا دوڑا آیا۔ جو کچھ ہاتھ لگا، اسے دیکھتا گیا، اور یادداشتیں لیتا گیا۔ ماثر الامرا بھی مل گئی۔ شکر کا مقام ہے کہ جو کچھ میں نے دانہ دانہ اور قطرہ قطرہ کرکے جمع کیا ہے، وہ ماثر الامرا سے بہت زیادہ نکلا۔ پھر بھی حق سے گذرنا کفر ہے ہر شخص کے حال میں تین تین چار چار نکتے مل گئے، اور اچھے مل گئے سب سے زیادہ یہ ہے کہ اب جو "دربار اکبری" کا مشاہدہ کرے گا، یہ نہ کہہ سکے گا کہ آزاد کو ماثر ہاتھ نہیں آئی۔

دونوں صورتوں کی تفصیل آپ اب پوچھتے ہیں۔ افسوس دیباچہ لکھنے کی نوبت ابھی کہاں آئی۔ خدا وہ دن کرے۔ دو صورتیں یہ کہ ایک تو وہی معمولی طریقہ کہ ایک نسخہ پہلے ممدوح کو بھیجا، اور استمزاج کیا۔ ممدوح نے منظور فرمایا مصنف نے شکریہ ادا کیا۔ دوسری صورت کا مضمون آئینۂ خیال میں ایک تصویر موہوم ہے، اور اس وقت فرصت مفقود۔ اچھا میں خلاصہ خلاصہ قلمبند تو کرتا ہوں، دیکھوں کچھ رنگ دیتا ہے یا نہیں۔

اس کا مضمون یوں تصور فرمایئے کہ جب اس موقع پر آب و رنگ اپنی دستکاری خرچ کر چکے تو عالم بالا کے پاک نہاد زمین پر اُتر آئے۔ دسول عقلیں، پانچوں حواس غور، فکر، وہم، خیال وغیرہ وغیرہ سے انجمن منعقد ہوئی۔ مانی و بہزاد کی روحوں نے اس کے سامنے ادب سے سر جھکایا۔ پہلا امر یہ پیش ہوا کہ یہ دربار کہاں سجایا جائے سب نے دور بینیں اٹھائیں۔ اور شش جہت میں نگاہیں دوڑائیں کہیں موقع کی جگہ نظر نہ آئی مگر وہ ایوان عالیشان وغیرہ غیرہ۔ وہم نے اعتراض کیا کہ جب تک ممدوح سے اجازت نہ حاصل ہو۔ ایسی جسارت زیبا نہیں آزاد نے کہا، سحر کا نور، شفق کی سرخی، صبح کا عالم جب نظر آتا ہے، اہل دل کہتے ہیں سبحان اللہ! صبا و نسیم پھولوں کی شمیم لاتی ہیں۔ دل کہتا ہے صلِّ علیٰ اس میں آفتاب سے اجازت۔ اور اس میں خسر و گل سے استمزاج کون کرتا ہے میں نے ایسا ممدوح پایا، اسی کے دامن اقبال سے وابستہ کیا۔ وغیرہ وغیرہ اسے سب نے تسلیم کیا۔ اب غائبانہ عرض کرتا ہوں کہ وغیرہ وغیرہ۔

میری دانست میں یہ بھی ایک نیا مضمون ہے، اور اس میں کچھ ہرج نہیں

۲۶ ستمبر ۱۸۸۲ء

محمد حسین عفی عنہ، آزاد

لاہور مستی دروازہ

جس زمانے کے یہ خطوط ہیں، اسی زمانہ (۱۸۸۲ء) میں پنجاب یونیورسٹی قائم ہوئی تھی، اور نظام تعلیمات میں رد و بدل ہو رہا تھا۔ علامہ آزاد کو اپنے کالج کے ٹوٹنے اور نوکری جاتے رہنے کا اندیشہ تھا۔ اس کے متعلق چند خطوں میں میجر سید حسن صاحب کو لکھتے ہیں۔ بعض فقرے مختلف خطوط سے نقل کئے جاتے ہیں۔

جناب من۔ تسلیم۔ آپ دیکھتے ہیں، یہ علم کی جُرائل (یونیورسٹی پنجاب) تعلیم

پنجاب کو ہضم کئے جاتی ہے۔ کالج کا بھی کلیجہ کھا چکی۔ چند مہینے میں میں بیچ گا کہ نگل گئی۔ باوجود اس کے کورس بنانے کے لئے ہم پکڑے جاتے ہیں....

کالج کے باب میں ابھی کچھ فیصلہ نہیں ہوا۔ میرا فیصلہ بھی اسی پر منحصر ہے ظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ سرکار مجھے کوئی نہ کوئی عہدہ دے گی، خواہ سررشتہ تعلیم میں خواہ سول لائن میں۔ اخیر درجہ پنشن کا ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ جس گھر میں ۱۵۰ روپے مہینہ آتا ہے، اس میں ۵۰ روپے آئیں گے، تو صورت حال کیا ہو گی، لیکن دل کی آزادی یہی کہتی ہے کہ قناعت کو رفاقت میں لو، تھوڑا کھاؤ، اور اپنی کتابوں کو پورا کرو۔ خدا کریم کارساز ہے۔ وہ دینا چاہے گا تو اس کے ہزاروں ہاتھ ہیں۔ عہدہ کے لئے کوشش نہ کرو۔ آپ کی کیا رائے ہے؟ (مرقومہ ۲ر فروری ۱۸۸۳ء)

"میرے بارے میں جو کچھ آپ نے تحریر فرمایا ہے، دل کو نہایت تشفی اور استقلال حاصل ہوا ہے۔ اپنے جد کے خانہ زادوں کی دستگیری آپ صاحب نہ فرمائیں گے تو اور کون ہے۔ پروردگار عالم اس خاندان کو اقتدار روزافزوں عطا فرمائے میں نے اپنے دل سے یہ قرار دے لیا ہے اگر اکسٹرا اسسٹنٹی دی تو اختیار کر لوں گا، ورنہ پنشن لوں گا۔ تھوڑے پر قناعت کروں گا۔ اپنی کتابوں کو پوری کوشش سے تیار کر کے پیشکش کرتا رہوں گا، اور دعائے دولت میں مصروف رہوں گا۔ ہاں جو خدمت فرمائیں گے، وہ بھی بجا لاؤں گا۔ کالج کا تغیر نہیں بھی ہوتا تو یہ سمجھ لیجئے کہ میں تو اب آپ صاحبوں کا ہو چکا ہوں۔

تم سُنو یا نہ سُنو۔ نالہ کئے جاؤں گا ۔۔۔ درد دل کہنے سے مطلب ہے اثر ہو کہ نہ ہو
حشر پر وعدۂ دیدار ہے میں ڈرتا ہوں ۔۔۔ بھیڑ ہووے گی رخِ یار ادھر ہو کہ نہ ہو

(مرقومہ ۱۰ر فروری ۱۸۸۳ء)

"...... نوکری کے باب میں دیکھتا ہوں کہ وہی مایوسی کے کلمے ہیں۔ یونیورسٹی پر آپ مجھے کیوں ڈھلتے ہیں۔ یہ ہے کیا تعجب! آپ کے جد کی سرکار تو ہے۔ حضرت! اس غلام زاد کو آزاد کر کے وہ دست بردار نہیں ہوگی۔ انشاء اللہ آپ دیکھیں گے اس سے بہتر صورت ہوگی، اور بدرجہا بہتر ہوگی...... خوشا بحال آزاد کہ ۵۰ روپے پنشن بھی ہو جائے تو ہزار ہزار شکر خدا کا بجالائے گا، اور بغلیں بجا بجا کر رقص کرے گا۔

حرص قانع نیست بیدل ورنہ اسباب جہاں

آنچہ ما در کار داریم اکثرے در کار نیست

آہا۔ پھر انشاء اللہ کیا خاطر جمع اور شگفتگی طبع کے ساتھ تصنیفات کو درست کروں"

(مرقومہ ۲۰ راپریل ۱۸۸۴ء)

"میرا حال یہ ہے کہ ڈائرکٹر صاحب نے گورنمنٹ کے حکم بموجب لکھ بھیجا ہے کہ یکم اکتوبر سے میری تنخواہ یونیورسٹی سے ملا کرے گی۔ گویا اس تاریخ سے میں ان کے ماتحت سمجھا جاؤں گا۔ یا قسمت! یا نصیب!"

(مرقومہ ۲۷ جولائی ۱۸۸۴ء)

سر سالار جنگ جن کے نام سے آزاد اپنی "دربار اکبری" کا انتساب کرنا چاہتے تھے، ان کا فروری ۱۸۸۳ء میں یکایک انتقال ہو گیا۔ اور آزاد کی وہ تجویز پوری نہ ہو سکی اس کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"...... مگر مشورت طلب یہ نکتہ ہے کہ آیا وہی ڈیڈیکیشن کا مقرری خاکہ رنگ بھر کر سجا دوں یا اُسے موقوف رکھ کر یہ لکھوں کہ ایسے شخص کے حادثہ جانکاہ پر عالم نے نالہ وزاری کے معمولی حق ادا کئے اور یادگار کیلئے تاریخیں اور نظمیں لکھیں۔ فقیر آزاد سے اور کچھ نہ ہو سکا۔ یہ کتاب ان کے نام پر لکھتا ہے کہ ان دنوں زیر قلم تھی۔

چہ کند بے نوا ہمیں دارد

مرزا تو اس کا جب تھا کہ خود لے کر جاتا اور بعض مقامات اس کے اپنی زبان
سے ان کے سامنے پڑھتا، اور دیکھتا کہ کس کس مقام پر دہ کیا فرماتے ہیں۔ ہائے
سر سالار جنگ! سارے ارمان دل کے دل میں رہے۔ ہائے سر سالار جنگ!
مولی اسد اللہ الغالب حاضر و ناظر ہیں کہ پھر آنسو آنکھوں میں بھر آئے آپ سے
کیا اپنا حال کہوں۔ میرا دل کچھ اور دل ہے۔

(مرقومہ ۲۰ر مارچ ۱۸۸۳ء)

"آپ انھیں پھر لکھ دیجئے گا کہ آپ سمجھ لیں میری کل تصنیفات مرحوم مغفور
کی ہو چکیں۔ خدا گواہ ہے۔ مجھے ان سے غائبانہ عشق تھا پہلے کہتا تو خوشامد تھی
اب تو خاص ان کے اور میرے درمیان میں معاملہ ہے۔ دیکھئے آج روح حالی
پر ان کا خیال کروں گا۔ یہ میں جانتا ہوں کہ اس کی باتیں قابل یقین ہرگز نہیں
لیکن اسے میں نے ایک بہلاوا اپنے دل کا کر رکھا ہے۔ رات کو ایک بجے دو بجے
بیٹھ کر باتیں کیا کرتا ہوں۔ اور یہ یقین آپ کریں کہ یہ ابنائے زماں اخوان
الشیاطین جو زندہ ہیں، ان سے تو ان کی باتیں بہر حال بہتر ہیں۔

بسکہ از برخورد عالم عکس مطلب دیدہ ام
میرم از آب داز آئینہ نہاں می شوم

(مرقومہ ۱۸ر مئی ۱۸۸۳ء)

علامہ آزاد کو عمر بھر پنجاب میں رہنے اور پنجابیوں سے گفتگو کرتے رہنے کے
سبب سے پنجابی بول چال کی عادت ہو گئی تھی، کبھی کبھی اپنی تحریریں بھی لکھ دیتے تھے
انھیں خطوط میں ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

"کیا میں نے پنجاب سے نکاح کیا ہوا ہے؟" دہلی میں کہیں گے "کر لیا ہے" دربار اکبری

میں بھی یہ بات نظر آتی ہے۔ آبِ حیات میں نہیں ہے۔

(۶) **فلسفۂ الٰہیات**۔ یعنی علامہ آزاد کے "وہ حکیمانہ جذبات جو عربی فارسی، سنسکرت سے اخذ کیے اور حالتِ بیخودی میں الہامی اردو کے انداز میں تحریر فرماتے"۔

شاید ساری دنیا کے مصنفوں میں تنہا آزاد کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ انھوں نے عالمِ جنوں میں بھی کتابیں تصنیف کی ہیں۔ ان کے اس دماغی اثر کا ذکر ان کے حالات میں آچکا ہے۔ فلسفۂ الٰہیات میں علامہ آزاد کے نبیرے آغا محمد طاہر صاحب نے آزاد کے ان حالات کے متعلق ایک دیباچہ شامل کیا ہے۔ اس کا اقتباس یہ ہے:-

"جب مشاغل سے فارغ ہوتے تو جس طرح زبانوں کے کھوج نکالتے ہیں اسی طرح روحانی فلسفہ کے سراغ کے درپے ہوتے، اور مختلف ممالک کے فلسفوں کو بڑی خوبی کے ساتھ ایک دوسرے سے پیوست کرتے۔ چنانچہ اس بات کا کچھ ثبوت ناظرین کو اسی کتاب میں ملے گا۔ مگر یہ باتیں اکثر اکیلے میں ہوتیں اور خاص اپنی ذات کے لئے مخصوص تھیں، اوروں سے اس کا کچھ واسطہ نہیں۔

ایک دفعہ ایک تختی لائے جو شاید اب بھی ملتی ہو۔ وہ روحوں کو بلاتی تھی۔ روحیں سوالات کا جواب پنسل سے لکھ دیتی تھیں، مگر یہ بہت ابتدائی باتیں ہیں۔ کچھ دنوں بعد اسے پھینک دیا، اور بغیر کسی خارجی مدد کے خود فرماتے کہ فلاں کی یا فلاں جگہ کی روح آئی ہے پہلے خود سوال کرتے، پھر تھوڑی دیر خاموش رہتے۔ بعد ازاں تعجب کے لہجہ میں اس بات کا جواب دیتے اور کہتے "اچھا، تو یوں ہے" معلوم ہوتا تھا کہ کوئی غیر شخص بہت ہی آہستگی کے ساتھ ان سے کچھ کہہ رہا ہے، یا دل و دماغ میں ان باتوں کا جواب اُتر رہا ہے، جس کو یہ اپنے دل و دماغ کا نتیجہ نہیں

سمجھتے بلکہ کسی اور قوت کا اثر سمجھتے ہیں۔ مگر یہ سب باتیں اس وقت کی ہیں جب گورنمنٹ کالج لاہور میں لکچرار تھے۔ احباب و آشنا سے ملتے تھے۔ سارے کام حسب معمول کرتے تھے۔ بایں ہمہ طبیعت میں ایک لنگ سی پیدا ہو چلی تھی، اور اکثر اوقات تنہائی میں آپ ہی آپ باتیں کیا کرتے تھے۔ اسی حال میں ۱۸۸۵ء کے آخر میں ایران کا سفر کیا، جہاں سے واپس آکر سخندان فارس مکمل کیا۔ سفرنامہ اور لغت کا مسودہ بنا کر لائے۔ یہ سب چیزیں تو دنیا والوں اور اہل ملک کیلئے تھیں اپنے لئے جو کچھ لائے وہ دماغ میں محفوظ تھا۔ پھر کالج میں آکر لکچر دینے لگے......

ظاہر میں یہ سب کچھ تھا، لیکن باطن میں دوسرا رنگ غالب آتا جاتا تھا۔ دریں آواں مولانا کی ایک چہیتی اور لاڈوں کی پالی فاضلہ بیٹی کا انتقال ہوگیا، جو بقول مولانا ان کے علمی مشاغل میں ان کی مشیر اور دست راست تھی۔ اس واقعہ نے قلب پر بہت اثر کیا، اور اس دنیا سے بالکل جی اُچاٹ ہوگیا......

آخر کار وہ دن آگیا جبکہ ساغر دل مختلف قسم کی شرابوں سے سرتاپا معمور ہو گیا ع "پیمانہ بھر چکا تھا، چھلکنے کی دیر تھی" سو اس کے لئے ایک بہانہ مل گیا قدرت نے وہ سامان بھی پیدا کر دیا۔ ۱۸۸۷ء کے لگ بھگ لاہور میں ایک درویش سید دھیان شاہ چشتی تشریف لائے جو کبھی سالک تھے اور کبھی مجذوب ...... مولانا کو بھی تقدیر ادھر لے گئی۔ بعد چندے راز و نیاز کی مجلسیں گرم ہونے لگیں۔ تخلیہ کی ان صحبتوں کا جو نتیجہ ہونا چاہئے تھا بہت جلد ظہور میں آگیا کہ مولانا باایں ہمہ علم و فضل دیوانگی و وارفتگی کے ہمدوش ہو کر محبت کے کوچہ و بازار میں رسوائی کا تمغہ لگائے پریشانی کا ٹیکا باندھے۔ جذب کامل کا علم ہاتھ میں لئے باآواز بلند یہ شعر پڑھتے ہوئے مارے مارے پھرے:۔

اگر ئی کا ہے گماں، شک ہے ملاگیری کا	رنگ لایا ہے دوپٹا ترا میلا ہو کر

ایک دن مولانا کالج سے پڑھا کر نکلے تو بجائے گھر آنے کے لزن گونٹ (سید صاحب کی جائے قیام) چلے گئے۔ ابھی چند قدم کا فاصلہ تھا کہ سید صاحب (سید دھیان شاہ چشتی) نے نظر اٹھا کر دیکھا، مسکرائے، اور فرمایا، جا محمد حسین جا، تیرے لئے دلی کا حکم آیا ہے، دلی چلا جا۔ خدا جانے اس اک نگہ ناز میں کیا جادو تھا، اور اس ایک فقرہ میں کیا تاثیر تھی، جس نے آزاد کو اپنا اسیر بنالیا۔

..... الغرض "بے سجادہ رنگیں کن گرت پیر مغاں گوید" والی بات ہو گئی۔ حضرت آزاد اسی وقت پیدل دلی کی طرف روانہ ہو گئے..... دلی پونچے مگر عجیب شان سے پونچے، سر سے پگڑی غائب، پیر میں جوتا ندارد۔ حال حیران پریشان ایک آناً فاناً میں تمام دلی میں شور مچ گیا۔ رشتہ دار منت سماجت کرتے کہ برائے خدا گھر چلئے، مگر یہاں کون سنتا تھا، کبھی قدم شریف، کبھی استاد ذوق کی قبر، کبھی شہر، کبھی جنگل، جہاں مستوں کا من کہتا، وہیں چلتے اور دن گذارتے..... آخر دلی سے خبر آئی تو والد ماجد مرحوم دہلی گئے۔ ڈھونڈا بہت کچھ سمجھایا ایک نہ مانی..... اس عرصہ میں جذبہ سکون کی طرف مائل ہو چلا تھا۔ ان کے بچپن کے دوست شمس العلما ذکاء اللہ صاحب مرحوم منا پر جا کر اپنے دولت خانہ پر لے آتے۔ تقریباً ایک سال تک مہمان رکھا، اور وہ وہ ناز برداریاں کیں کہ اس زمانہ کی دوستی اور محبت ان پر قربان ہے خود اور سارا گھر گویا ان کے حکم کے پابند تھے۔ اس عرصہ میں طبیعت نے بہت کچھ قرار پکڑ لیا تھا، اور سید دھیان شاہ والی کیفیت ہو گئی تھی، کبھی سالک تھے، کبھی مجذوب۔ چنانچہ والد صاحب دہلی گئے اور اپنے ساتھ لے آئے اب مولانا اپنے علیحدہ مکان میں رہنے لگے۔ آس پاس الماریوں میں کتب خانہ سجا دیا۔ درمیان میں پلنگ۔ ایک گوشہ میں چھوٹا سا بوریا، اس پر فرش۔ کاغذ

قلم دوات سب کچھ پاس رکھ کر بیٹھتے۔ صبح و شام وہی پیتے۔ چار پانچ میل سیر کو
جنگل یا باغوں میں جاتے، جہاں ہر پتا ان کا مخاطب تھا۔ ہر درخت ان سے
بات کرتا تھا نسیم کا ہر جھونکا ان کے لئے نئی خبریں لاتا تھا۔ پھولوں کی خوشبو
خدا جانے کس کا پتہ دیتی تھی۔ غرض کہ صبح و شام کی تفریح ان کی زندگی تھی۔
راہ میں کوئی ملتا اور سلام کرتا تو جواب دیتے اور کھڑے ہو کر اس کیلئے دعا کرتے
اور روانہ ہو جاتے۔ دونوں وقت گھر پر کھانا کھاتے۔ آم اور تربوز سے بہت
رغبت تھی...... یہ تمام کیفیات گویا مولانا کی ذہنیت کے ابتدائی مراحل سے
لیکر انتہائی معراج تک کی ایک مجمل مگر سبق آموز تاریخ ہے"۔

سید جالب دہلوی نے بھی "مکتوبات آزاد" کے دیباچہ میں حضرت آزاد کے
قلبی و دماغی میلان و رجحان کی طرف اشارے کئے ہیں۔ جن کا آخری نتیجہ مستقل بیخودی کی صورت
میں ظاہر ہوا۔ جالب صاحب لکھتے ہیں:-

"مولانائے موصوف نے سن رشد و تمیز کو پہنچتے ہی عملی فوائد پر خیالی دلچسپیوں کو
ترجیح دینی شروع کر دی تھی، اور اوائل شباب ہی میں اپنی طبیعت کا یہ نرالا رنگ
معاصرین و احباب پر ظاہر فرما دیا تھا، اور بیس بائیس سال کی عمر میں قدامت
پرستی کو کھلم کھلا اپنا شعار خاص قرار دے لیا تھا۔ نیز صوفیائے کرام کے معتقدات
میں جن دو عالموں جسمانی و روحانی یا سفلی و علوی کا الگ الگ آباد ہونا مذکور ہے
ان کی دیکھ بھال اپنے لئے ضروری ٹھہرائی تھی، اور اپنے اوقات گرامی کا ایک حصہ
روحانیات پر غور کرنے اور دونوں عالموں کے ظاہری و باطنی تعلقات کا پتہ لگانے
کیلئے مختص کر رکھا تھا، اور ویدانت اور تصوف میں جو ریاضتیں تزکیہ نفس و
تصفیہ باطن کے لئے مقرر ہیں، وہ جہنتوں اور درویشوں کی صحبتوں میں رہ کر سیکھی
تھیں۔ متعدد اشغال و اذکار کو اپنا لازمہ زندگی بنایا تھا۔ اور ذکر خفی و جلی اور

درد نادعلی میں وہ مشق بہم پونہچائی تھی کہ آپ کے سانس کی حرکات بعض اوقات پاس بیٹھنے والوں کو چونکا دیتی تھیں ۔۔۔ ایک طرف تو یہ خیالات تھے جنھوں نے سالہا سال کی پختگی سے عقائد کا درجہ حاصل کر لیا تھا، اور دوسری جانب وجہ معاش میں بھی آپ کو تعلیم و تحقیق السنہ ہی سے واسطہ پڑا تھا اور اس کام میں جو تین زبانیں فارسی، اردو اور ہندی آپ کا سرمایۂ امتیاز تھیں، ان کے لٹریچر کا دار و مدار صرف شاعری پر آکر ٹھہرا تھا۔ اس لئے آپ کی بود و باش زیادہ تر تخیل کی دنیا میں رہتی تھی، اور شعرائے ہند و فارس کے نتائج افکار ہر وقت آپ کے انیس خلوت ہوا کرتے تھے۔ اس لئے کوئی محل تعجب نہیں کہ جب ارباب زمانہ کی ناقدری و بے وفائی اور دنیائے دنی کے مصائب و آلام کا ساکنان عالم خیال کی دلجوئی و مدارات سے مقابلہ پیش آیا، تو آخر الذکر طمانیت و یکسوئی کا گلزار سراپا بہار دکھا کر اور سالہا سال بے غل و غش اس میں سیر کرنے کی امید دلا کر حضرت آزاد کی طبیعت کو اپنی طرف کھینچ لینے میں کامیاب ہو گئے، اور مولانائے موصوف جملہ تعلقات دنیاوی سے منہ موڑ کر اور عقل و خرد کے ساتھ ملکی لٹریچر کو روتا چھوڑ کر یہ شعر پڑھتے ہوئے دیار تصور کے گلشن بے خزاں میں پونہچے۔

زہشیارانِ عالم ہر کرا دیدم غمے دارد
دلا، دیوانہ شو، دیوانگی ہم عالمے دارد

خمخانۂ جاوید (تذکرۂ شعراء) میں علامہ آزاد کی اس کیفیت کے ذکر میں لکھا ہے:۔

رائے بہادر ماسٹر پیارے لال صاحب فرماتے ہیں کہ جنون کے شروع میں ایک دن آزاد مجھ سے ملنے آئے اور تقریباً دو ڈھائی گھنٹے باتیں کرتے رہے مگر ان الفاظ کے بجز اور کچھ زبان پر نہیں لائے کہ رائے صاحب آپ اس شعر کو

پڑھا کیجئے' اور اس کے معنی آپ جو چاہیں، سمجھ لیں۔

پردہ در کعبہ سے اٹھا دینا ہے آساں — پر پردۂ رخسار صنم اٹھ نہیں سکتا۔"

یہ تفصیل اس لئے لکھی گئی ہے کہ علامہ آزاد کی یہ حالت جذبات و بیخودی صرف مصائب و آلام کا نتیجہ نہ تھی بلکہ یہ مادہ ان کے آب و گل میں خمیر تھا، اور بقول سید جالب کے "آپ کی بود و باش زیادہ تر تخیل کی دنیا میں رہتی تھی"۔ یہ اللہ تعالیٰ کی نعمت و رحمت تھی کہ جب آخر کار انکی یہ حالت ہونے والی تھی تو پہلے ہی سے انکے دل و دماغ میں الٰہیات و تصوف کا شوق پیدا کر دیا تھا کہ اس عالم میں بھی بے کیف و بے فیض نہ رہیں۔ قاعدہ ہے کہ اس حالت سے پہلے جیسے خیالات دل و دماغ پر چھائے ہوتے ہیں، وہی اس عالم میں جم جاتے ہیں اور زبان سے نکلتے ہیں آزاد کو ہندوؤں کے فلسفہ و الٰہیات سے خاص شغف تھا۔ چنانچہ ان کی اس عالم کی تصنیف سپاک و نمک میں بھی اس کا اثر ہے، اور یہ فلسفۂ الٰہیات تو اول سے آخر تک اسی رنگ میں ہے۔

فلسفۂ الٰہیات کو غور سے پڑھ کر دیکھا جائے تو آزاد کی بے ربطی اجزائے حواس میں ایک قسم کی شیرازہ بندی نظر آتی ہے۔ زبان و انداز بیان سے قطع نظر کر کے دیکھیں تو مضمون موضوع کی صحیح ترتیب ہوش و حواس کا پتہ دیتی ہے۔ ابتدا میں تمہید ہے اس کے بعد سات باب ہیں، جن کا نام ملاپ رکھا ہے۔ ہر "ملاپ" کا ایک عنوان ہے کہیں عنوان کے نیچے موضوعِ باب کی تفصیل بھی لکھدی ہے۔ پہلا ملاپ اس طرح شروع کرتے ہیں:۔

پہلا ملاپ (اس میں ان چیزوں کا بیان ہے جنھیں ہم دیکھتے ہیں' اور وہ ہیں۔ اور سوچتے ہیں اور پلٹتے ہیں کہ ہیں)

پہلے ان میں مادہ ہے۔ وہ ہے' اور وہ معدوم نہیں ہوتا۔ اسے کیسا ہی گرد یا کاٹ کر چاہو کہ وہ ایسا ہو کہ بجھواب نہیں رہا، یہ نہ ہوگا ایسا ذرہ ہے۔

مبین ہو کر عالم اور آفاق میں پھیلا ہوا اڑ رہا ہے کہ ہمیں معلوم نہیں ہوتا،
اور وہ ہے! وہ کیا ہے؟ وہ ہیولیٰ۔ اس کے ذرے ایسے ننھے ننھے نہیں ہیں
کہ کسی قوۃ حسّی سے معلوم نہیں ہوتے۔ ان کو بھی چاہیں تو ایک کو دو اور
دو کو چار کر ڈالیں، تو وہ رہیں گے۔ یہ نہ ہوگا کہ کہیں اب معدوم ہو گئے اسی
کو ہم لے عرب میں کہا کہ ہر جزو مُتجزّی ہے، جزو نا مُتجزّی محال ہے۔ اچھا تم ایک
جزو نا مُتجزّی لاؤ، ہم دوسرا ویسا ہی اور لیں گے، اور دو کو ملائیں گے، اور
ایک تیسرا ویسا ہی اور لے کر ان دو کے اوپر رکھ دیں گے۔ ان دو کی درز
جہاں ملی ہوئی ہے، اوپر والے کی کسی جگہ پر ہوگی۔ وہیں سے کٹا اور دونوں
ٹکڑے موجود۔ انھیں پھر چاہو تو پھر اسی طرح کاٹ لو، اور کاٹتے چلے جاؤ
معدوم نہ ہوں گے۔ اچھا، قرعمبیق میں ڈال کر تحلیل کرو۔ وہ نہ رہے گا
اور صورۃ میں ظاہر ہوگا، معدوم نہ ہوگا۔ دھواں ہو جاتے گا، ہوا ہوگا
نظر نہ آئے گا، پر ہوگا!"

اس طویل عبارت میں کہیں بدحواسی نہیں محسوس ہوتی اسی باب اول کا
ایک دوسرا مسئلہ دیکھیے۔ کافی لمبا مضمون ہے اور بالکل مربوط۔ فرماتے ہیں

حرکۃ اسے نہیں کہتے کہ ہم ایک جگہ سے دوسری جگہ چلے، مسافۃ طے ہوئی
یا پرندہ اڑا، اور بلند ہوا، یا درخت اُگا اور بڑھتا چلا گیا، اور اسی طرح برعکس
حرکۃ ایک امر ہے معنوی کہ اندر ہے۔ وہ ظہور میں آتا ہے تب حرکۃ اسکی
معلوم ہوتی ہے ارسطو نے اسے اور طرح بیان کیا ہے، اور عرب نے
لیا ہے، اور کہا ہے، هُوَ الخُرُوجُ مِنَ القُوَّةِ اِلَى الفِعلِ یہ ہے حرکۃ۔
حرکۃ کو جب ہم سوچتے ہیں تو وہ ایک محرک کی محتاج ہے ہر وقت۔ اسی واسطے ہم
اپنے میں حرکۃ کے لئے ارادہ کو ضروری جانتے ہیں۔ اور یہ ان باتوں میں ہے جو

اپنے اختیار میں ہیں۔ جو اپنے اختیار میں نہیں اور اپنے میں نہیں ان میں
جو حرکت ہو حرکت بالغیر کہیں گے۔ محرک جب غیر ہو اور محسوس ہو تو قاسر
ہے۔ اور نہیں تو قدرۃ الٰہی ہے۔ وہ اگر عادۃ میں نہیں ہے تو الٰہی ہے۔ اور
نہیں تو طبیعی ہے۔ ہم طبیعی کو نہیں لیتے، اور قسری کو بھی نہیں لیتے ارادی
کو لیتے ہیں۔

ارادی حرکت ہماری دنیا کے کاموں میں ہمیشہ غیروں کی مُعاونت کو دیکھتی
ہے، کچھ بھی نہیں تو روپیہ اور پانی، اور ہوا، سردی میں گرمی، گرمی میں سردی
یہ ضروریات تو بہت محتاج الیہ ہیں کہ بے ان کے گذارہ نہیں۔ ہم اپنی ارادی
حرکت میں ایسے ایسے غیروں کے محتاج ہیں اگر ہم ایشور کی طرف متوجہ ہوں
تو ہمارے کام ہمارے اختیار میں ہوں، اور پھر جب ہم ایک طرف ہوں
تو ایشور کی طرف ہوں۔ اس وقت جانو کہ ہماری ارادی حرکت کدھر
کو ہونی چاہیے۔ بس وہ ارادہ ایشور کی طرف ہو۔ اس وقت ہم کو اپنی
طرف نہ دیکھنا چاہیے۔"

یہاں تک بالکل ہوش و حواس میں لکھنے کے بعد یکایک بہکنے لگتے ہیں۔ اس کے
بعد یہ انداز پیدا ہو جاتا ہے:۔

"اس وقت ہم کو اپنی طرف نہ دیکھنا چاہیے۔ ہم ہوں ادھر اور ادھر
اور ادھر وہ مقام نہیں معلوم ہوتا کہ ایشور کس درجہ سے دیا فرماتے ہیں۔ ہم کو
اُدھر کا دھیان اور ان کا دھیان، اُدھر کا دھیان اور ان کا دھیان، اُدھر کا
دھیان اور ان کا دھیان باندھنا چاہیے لدھر اور ادھر۔ وہ مقام پھر معلوم
نہیں کہ کس نقطہ سے میری نارائن کی دیا شروع ہوتی ہے۔ مگر ہوتی ہے
اور اعتقاد رکھنا چاہیے کہ ہوتی ہے۔ وہ ہوگا تو ہوگی۔ اور رہو گی۔ اور ہوگی"

پوری کتاب میں ویدانت کی اصطلاحات فلسفہ و تصوف کی تشریح ہے۔ جہاں جہاں خدا سے خطاب کرتے ہیں، ہر جگہ ایشور لکھتے ہیں۔ مسئلہ حلول و تناسخ کی طرف جابجا اشارے کرتے ہیں۔ اور اپنے آپ کو ایشور کا اوتار تصور کرتے ہیں۔ چنانچہ تمہید ہی میں لکھتے ہیں:۔

"ہم ہیں اپنے کام میں، تم ہوئے ناکام - دیکھو یہ ہے ہمارا کام۔ ہم ہیں کہ کرتے ہیں پورا فلسفہ الٰہی کو اور دیتے ہیں جس کو چاہتے ہیں۔ تھے ہم سری مہاراجہ جے چند ہوئے ہم پروفیسر آزاد۔"

کتاب کا خاتمہ عجیب لکھا ہے۔ بیخودی میں خودی شامل ہے۔ فرماتے ہیں:۔

"ہم نے پتا کا جامیا (اس کے معنی خود آزاد نے "راہِ آگاہی" بتلائے ہیں) کو یہاں ختم کیا۔ دیکھ سری جے چند تو ہے راجوں کا راجہ۔ مہاراجہ یہ ہم نے کیا ہے تجکو۔ آج ہے تو ایسا۔ جو حکم ہم دیتے ہیں، تو جاری کرتا ہے وہی ہوتا ہے آج سے چار ہزار برس بعد تو ہوگا پروفسر آزاد اسی کتاب کو تو لکھے گا اپنی زبان میں۔

اسے اردو کہیں گے اردو تیرا لشکر ہے۔ زبان کا نام یہ ہوگا۔ ہم نے جو کچھ بتایا ہے وہی تو نے لکھا ہے۔ ہم اس وقت ان سب کو ظہور دیں گے۔ پھر بھی کافر ایسے ہوں گے کہ ہماری قدرت کو نہ مانیں گے ..... اب ہم تجھے کہتے ہیں، تو ہے پروفسر آزاد۔ لکھ تو اپنی طرف سے سری مہاراج میں کیا عرض کروں، جو حضور سے ارشاد ہو وہی ہو۔ اچھا ہم کہتے ہیں اے میرے ایشور تو نے کہا، تو نے لکھوایا، مجھ میں کیا طاقت ہے۔ تو نے کہا بس، میں نے کہا بس، یہی خاتمہ ہوگیا (ہاں پروفیسر آزاد) لکھ آج ہے ۲۲ ماگھ بدی سمت ۱۸۵۲۔ جنوری کی پہلی سنہ ۱۸۹۶ عیسوی۔ ربیع الثانی کی ۲۶ سنہ ۱۳۱۶ ہجری۔

دن ہے بدھ کا۔ سنہ مہینے۔ مہینوں کی تاریخیں۔ دن کسی میں فرق نہیں
یہ ہے ہماری حکمت: جب ہم اپنا فلسفہ کام میں لائیں گے۔ ٹھیک وہی وقت
ہوگا۔ جو ہم وعدہ کر چکے۔ یہی ہے! یہی ہے! یہی ہے! یہی ہے! یہی ہے! بس!

مولوی ذکاءاللہ

والد کا نام ثناءاللہ ۱۸۳۲ء میں دہلی میں پیدا ہوئے بارہ برس کی عمر میں دہلی کالج میں داخل ہوئے یہاں مولوی محمد حسین صاحب آزاد اور ڈپٹی نذیر احمد صاحب کا ساتھ ہوگیا۔ اور ان تینوں میں بڑے تعلقات اتحاد پیدا ہوگئے۔ مولوی ذکاءاللہ کو ریاضی سے خاص مناسبت تھی۔ ماسٹر رام چندر (جن کا ذکر اور نمونہ تصنیف پہلے آچکا ہے) ریاضی کے استاد تھے اور اپنے اس لائق شاگرد پر خاص عنایت فرماتے تھے۔ ذکاءاللہ صاحب اکثر اوّل نمبر پر کامیاب ہوتے تھے اور قابلیت کے وظیفے حاصل کرتے تھے دو تمغے بھی اپنی اعلیٰ قابلیت کی بنا پر حاصل کئے۔ تعلیم سے فارغ ہوکر اسی کالج میں معلم ریاضی مقرر ہوگئے۔ پھر آگرہ کالج میں سات سال تک معلم فارسی وارد و رہے ۱۸۵۵ء میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس ہوگئے۔ گیارہ سال یہ فرائض انجام دے کر ۱۸۶۶ء میں نارمل اسکول دہلی کے ہیڈ ماسٹر ہوئے۔ تین سال کے بعد اورینٹل کالج کی لکچراری کے لئے پروانہ تقرر آیا لیکن اتفاق سے اسکے ساتھ ہی میور سنٹرل کالج الہ آباد کی پروفیسری بھی آپ کو پیش کی گئی۔ آپنے الہ آباد کو ترجیح دی۔ اور ۱۵ سال اس کالج میں پروفیسر فارسی رہ کر ۱۸۸۵ء میں پنشن حاصل کی۔ پھر عمر کے باقی ۲۴ سال خانہ نشین رہ کر تصنیف وتالیف میں گذار دئے اور ۷ نومبر ۱۹۱۰ء (۳ شوال ۱۳۲۸ھ) کو دہلی میں انتقال کیا!

مؤلف احقر نے آیۂ کریمہ سے تاریخ نکالی، وَاِنَّهٗ فِی الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِیْنَ۔

(۱۳۲۸ھ) سورۂ بقرہ۔ رکوع ۱۶۔

ان کی وفات کے بعد ڈپٹی نذیر احمد صاحب کا ایک مضمون ان کے متعلق رسالہ تمدن دہلی (بابت اگست ۱۹۱۱ئ) میں شائع ہوا تھا۔ اس میں مولوی ذکاء اللہ صاحب کے بعض خاص حالات لکھے ہیں۔ اس لئے "سیر المصنفین" سے اس مضمون کا اقتباس درج کیا جاتا ہے۔

بعض مسلمان یہ بھی پوچھ بیٹھتے ہیں کہ مسلم یونیورسٹی کس قسم کے عالم پیدا کرے گی جو پانچ یونیورسٹیاں آج تک پیدا نہ کر سکیں۔ آج کو مولوی ذکاء اللہ زندہ ہوتے تو میں انہیں کو پیش کر دیتا کہ مسلم یونیورسٹی درجہ تکمیل پر پہنچ کر، وَمَا ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ بِعَزِیْزٍ، ان جیسے عالم پیدا کرے گی، کریم النفس، وسیع الاخلاق، منکسر المزاج، روشن دماغ، متنوع، معلومات، کثیر التصانیف، خیر خواہ عامۂ خلق فیاض الطبع، برٹش گورنمنٹ کے قدر شناس، ارادتمند، راسخ الاعتقاد، صلح کل، مرنجان ومرنج۔

مولوی ذکاء اللہ کے ساتھ میرا ربط وضبط بچپن سے شروع ہوا جبکہ وہ دہلی کالج یا دش بخیر، کی فارسی جماعت میں تھے، اور میں عربی میں۔ بااین ہمہ ہم ریاضیات میں ہم سبق تھے، ماسٹر رام چندر کے شاگرد۔ مولوی ذکاء اللہ کی طبیعت کو ریاضیات کے ساتھ خداداد مناسبت تھی، اور وہ جماعت میں سب سے پیش پیش رہتے تھے، اور اسی وجہ سے وہ ماسٹر صاحب کے منظور نظر بھی تھے۔ اور چونکہ ماسٹر صاحب نے بڑے بڑے مباحثوں کے بعد عیسوی مذہب اختیار کر لیا تھا، ماسٹر صاحب کی ہمہ وقت کی ہم نشینی کے شبہ سے لوگ مولوی ذکاء اللہ کو مذہب کی طرف سے متہم بھی کرتے تھے۔ لیکن میں مولوی ذکاء اللہ کا سب سے پرانا ملاقاتی ہوں انکے معاصر جہاں تک مجھ کو معلوم ہے اکثر مر چکے ہیں۔ ایک میں گراں جاں کسی مصلحت سے ارذل العمر کی سختیاں جھیلنے کو بچا ہوں، لیکن تابکے، میں اب بھی

گواہی دیتا ہوں، اور مرکر بھی خدا کے حضور میں گواہی دوں گا کہ جہاں تک آدمی کو آدمی کے بطون کا علم ہو سکتا ہے، میرے علم میں مولوی ذکاء اللہ پکے مُوحّد تھے ایک صرف ایک خدا کے بجمیع صفات الکمالیہ قائل، خیر یہ معاملہ تو بینہ و بین اللہ ہے، میں مولوی ذکاء اللہ کی جس ادا کو ہمیشہ نظر استحسان سے دیکھتا رہا، وہ یہ تھی کہ حسد ان کو چھو تک نہیں گیا تھا۔ وہ علم ہی کو بڑی دولت اور بڑی حشمت سمجھتے تھے۔ انھوں نے ساری عمر جو عمر طبعی سے متجاوز ہوئی طالب علمی میں صرف کی، اور پھر بھی نفس واپسیں تک ان کو علم سے سیری نہیں ہوئی وہ علم کو علم ہی کے لئے حاصل کرتے یعنی علم ہی ان کا مقصود بالذات تھا نہ ان فائدوں کی طمع سے جو علم پر متفرع ہوتے ہیں۔ انھوں نے مدرسے سے نکل کر نوکری کی حالت میں، اور نوکری بھی سررشتہ تعلیم کی نوکری، از خود انگریزی کا شوق کیا، اور اپنے مطالعہ سے بے مدد استاد اس کو اس درجہ تک پونہچایا کہ گو وہ انگریزی بولنے میں بے مشقی کی وجہ سے جھجکتے تھے، مگر انکی ہر طرح کی معلومات، جو انھوں نے انگریزی کی بدولت جمع کی تھی، اتنی وسیع تھی کہ بی اے اور ایم اے کو نصیب نہیں ہوتی۔ مولوی ذکاء اللہ نے بعض ایسی مبسوط کتابیں لکھی ہیں کہ ان کے حجم کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ یہ شخص ایسی بڑی کتاب لکھنے کے لئے کیسے فرصت پاتا تھا۔ مولوی ذکاء اللہ کی ایک اور ادا جس میں وہ منفرد تھے ان کی مستقل مزاجی تھی کہ انھوں نے انگریزی کے اتنے تبحر پر بال برابر اپنی وضع کو نہیں بدلا۔ اور وہ باوجودیکہ سید احمد خاں کے گویا پٹھو تھے، مگر انھوں نے ساری عمر ترکی ٹوپی تک نہیں اوڑھی، انگریزی جوتی تک نہیں پہنی۔ میں جاڑے کے دنوں میں ان کو لوڑھے بنیے کی طرح کاروئی دار پاتجامہ پہنے دیکھتا اور ہنسا کرتا۔

غرض مولوی ذکاء اللہ کی وضع ظاہر با طرز ماند و بود یا گفتگو سے کوئی نہیں کہہ سکتا کہ انگریزی ان کو چھو بھی گئی ہے۔ ہم مسلمان ہیں تو مذہباً وہ بھی یقیناً مسلمان تھے، مگر ان کا دامنِ عقیدت لوث تعصب سے بالکل پاک تھا۔ وہ باہمی میل جول میں مذہب کو دخل ہی نہیں دیتے تھے۔ سب کے خلوص کے ساتھ ملتے اور حاضر و غائب سب کے ساتھ ایک طرح کا سلوک کرتے۔ یہ ان کے اس خلوص ہی کا نتیجہ تھا کہ مرتو رہے تھے مولوی ذکاء اللہ اور سکرات کی سی بیقراری پادری صاحب کو تھی (یعنی ریورنڈ سی ایف اینڈ ریوز کو) بہ ظاہر دونوں میں کسی ایک کی کوئی غرض دنیاوی دوسرے سے متعلق نہ تھی، مگر دونوں نے مذہب کی اصلیت کو سمجھا تھا، اور ان کی باہمی محبت الحبُّ لِلّٰہ کی قسم سے تھی "مودۂ اہل صفا، چہ در رُو و چہ در قفا"

تصانیف اور انکی قدردانی

مولوی ذکاء اللہ کو ابتداء سے تعلیم و تعلم اور خدمت علم و فن کا شوق تھا۔ اتفاق سے آپ کو ملازمتیں بھی اسی شغل اور اسی صیغہ کی ملیں۔ ریاضی سے سب سے زیادہ مناسبت تھی تو سب سے زیادہ اسی فن کی کتابیں لکھیں۔ چونکہ ان کے زمانے میں تعلیم اردو زبان میں تھی، اس لئے ذکاء اللہ صاحب کی ریاضیات و طبعیات کی کتابیں سرکاری نصاب تعلیم میں داخل ہوئیں۔ اور اس خدمت کے صلے میں گورنمنٹ سے پندرہ سو روپیہ کا انعام ملا اور شمس العلماء اور خان بہادر کے خطابات عطا ہوئے۔ ڈپٹی انسپکٹری کے زمانے میں تعلیم نسواں کی وسعت و اشاعت کے صلے میں گورنمنٹ نے خلعت بھی دیا تھا۔ ان کی اقسام تصانیف کی فہرست "سیر المصنفین" میں درج کی گئی ہے، اس سے نقل کی جاتی ہے۔

مضمون	تعداد تصانیف مطبوعہ	غیر مطبوعہ	جملہ
ریاضیات	۸۱	۶	۸۷
تاریخ وجغرافیہ	۱۷	۱	۱۸
علم وادب	۱۶	۰	۱۶
علم اخلاق	۶	۰	۶
طبعیات وہیئت	۷	۲	۹
سیاست مدن	۲	۵	۷
میزان	۱۲۹	۱۴	۱۴۳

ان میں سے تاریخ ہندوستان کے ۱۰ حصے ہیں جن کے مجموعی صفحات ۱۶۹، ہیں۔ اس کے علاوہ سوانحعمری ملکہ وکٹوریا، کرزن نامہ، سوانحعمری مولوی سمیع اللہ تاریخ عہد انگلشیہ، آئین قیصری بہت سی کتابیں ایسی تصنیف کیں کہ ان سے پہلے ان موضوعات پر کسی نے نہ لکھی تھیں۔

مستقل ضخیم کتابوں کے علاوہ مولوی ذکار اللہ نے مختلف رسالوں اور اخبارون میں بے شمار مضامین لکھے، تہذیب الاخلاق، انسٹی ٹیوٹ گزٹ علی گڑھ، مخزن لاہور، زمانہ کانپور، رسالہ حسن حیدرآباد وغیرہ مشہور پرچوں میں بھی لکھتے رہتے تھے اور شمس کلکتہ، صبح بہار میسور وغیرہ وغیرہ مشہور رسالوں کو بھی بے تامل لکھ کر بھیج دیتے تھے۔ کسی سے انکار نہ تھا۔

کثرت مطالعہ اور اس کام میں ضبط و استقلال کا یہ عالم تھا کہ اپنے دولت خانہ کوچہ چیلان میں ایک مخصوص جگہ پر دیوار سے تکیہ لگا کر بیٹھتے تھے، اور اتنی مدت اس

جگہ بیٹھے کہ دیوار میں گڑھا ہو گیا تھا۔ سنہ ۱۹۱۱ء میں میں نے بھی اس تکیہ گاہ علم و فضل کی زیارت کی تھی۔

مولوی ذکاء اللہ صاحب کے ہم عصروں میں کسی ایک مصنف نے اس قدر کثیر و ضخیم کتابیں نہیں لکھیں۔ لیکن یہ بخت و تقدیر کی عجیب ستم ظریفی ہے کہ اب ان کی تصانیف کی طباعت اشاعت، قدر دانی و فیض رسانی کم سے کم ہے۔ ان کی تصانیف ریاضی و سائنس ان کے زمانے میں شامل درسیات رہیں۔ پھر جب تمام اسکولوں اور یونیورسٹیوں کی تعلیم و امتحانات انگریزی میں ہونے لگے تو ان کی ضرورت نہ رہی۔ تاریخوں اور جغرافیوں کا بھی یہی حال ہوا۔ سوانحعمریاں ملکہ وکٹوریا، لارڈ کرزن وغیرہ ایسے اشخاص کی تھیں جن سے عام دلچسپی بھی نہ تھی، اور انگریزی میں ان سے بہتر موجود تھیں۔ ان کی تاریخ ہندوستان بے شک اپنی ضخامت و تفصیل و تحقیق کے سبب سے قابل قدر اور لائق مطالعہ تھی۔ لیکن اس کی طوالت و گرانی قیمت کے سبب سے عام لوگ اس سے مستفیض نہ ہو سکے۔ پھر ایک یہ بات بھی تھی کہ مولوی ذکاء اللہ صاحب کی اکثر کتابیں، خصوصاً یہ تاریخ نہایت معمولی کاغذ و کتابت و طباعت کے ساتھ شائع ہوئیں، اور حسن ظاہری میں دلکش و بصارت نواز نہ رہیں۔ اب صرف ان کے مضامین کہیں کہیں درسی کتابوں میں داخل نظر آتے ہیں، اور بس۔

مولوی ذکاء اللہ کا طرز تحریر مولوی ذکاء اللہ صاحب کی طبیعت میں اختراع و ایجاد کا مادہ بہت کم تھا۔ اس لئے ان کی تحریر میں بجز صفائی و روانی اور تفصیل و تجزیہ کے زبان و طرز بیان میں محاورۂ دہلی کا بھی مزہ نہیں ہے انکو غور و فکر اور تحقیق و تدقیق کی عادت تھی، اس لئے علمی، تاریخی، سیاسی، اخلاقی ہر قسم کے مضامین کو پوری وضاحت کے ساتھ لکھا ہے۔ لیکن مسرت و الم،

غصہ و نفرت، شوخی و ظرافت کے کسی موقع پر ان کے الفاظ سے ان کا جوش طبیعت بہت کم مترشح ہوتا ہے۔

ان کی اکثر تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی دوسری زبان سے ترجمہ کر رہے ہیں حالانکہ وہ مضامین ان کی ذاتی فکر اور آزادانہ تحریر کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ کہیں کہیں محاورۂ اردو کے خلاف فارسی محاوروں کا لفظی ترجمہ کر دیتے ہیں۔ مثلاً تاریخ ہندوستان میں راناادے پور کے سلسلۂ ذکر میں لکھتے ہیں۔

"سپاہ کشتہ و اسیر ہوئی، خویشوں نے مع منتسبوں کے اپنا سر پکڑا۔"

فارسی محاورہ ہے "سر خویشتن گرفتند" یعنی اپنا اپنا راستہ لیا۔ ساتھ چھوڑ گئے۔ کبھی عوام کی زبان کے الفاظ لکھ دیتے ہیں۔ مثلاً "عزت و ناموری" کے مضمون میں کہتے ہیں "اشرافوں کا ممتاز کرنے والا کمال ہے۔"

ایک جگہ لکھتے ہیں: حضرت اکبر بادشاہ نے پنجاہ سال سلطنت کی یہاں "پچاس" کا لفظ زیادہ فصیح تھا اسی مضمون میں شہزادے کے حال میں لکھتے ہیں: "بڑی پر فضا اور خوش جا ہے۔" یعنی خوش وضع جگہ ہے۔ کبھی غیر متعارف یا کم مشہور لفظ لکھ دیتے ہیں۔ مثلاً اسی بیان میں فرماتے ہیں:۔

"اس حسن خدمات کے جلدو میں رائے سندر داس کو رائے رایاں کا خطاب ملا۔"

"جلدو" کی جگہ انعام و صلہ اچھے خاصے لفظ تھے۔ ان مثالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مولوی ذکاء اللہ صاحب کو الفاظ اور عبارت کی طرف کوئی خاص توجہ نہ تھی۔ جو قلم سے نکل گیا۔

تاریخی کتابیں بڑی کاوش و تحقیق کے ساتھ لکھتے ہیں۔ چنانچہ خود اپنا طریق نگارش بیان کرتے ہیں:۔

"میرا قاعدہ ہے کہ میں سلاطین ہند کی تاریخ نویسی کے لئے وہ تواریخ لیتا ہوں

جن کے مؤلف عہد نویس ہوں اور وہ سب سے زیادہ معتبر و مستند بھی جاتی ہوں ان سے تاریخی حالات اخذ کرکے لکھتا ہوں، اور پھر انگریزی تاریخوں سے جن کا ایک انبار میرے پاس موجود ہے، بعض مضامین التقاط کرکے لکھتا ہوں۔"

(تاریخ ہندوستان جلد ہفتم احوال شاہجہاں)

یورپ کے مورخوں نے اپنی تواریخ ہند میں غلط بیانیاں کی ہیں۔ مولوی ذکاءاللہ نے بقول اپنے، "ان تاریخوں کا کہیں کہیں ذکر کیا ہے، اور ان کی غلطیوں کو بیان کیا ہے!" لیکن یہ تصحیح اغلاط زوردار الفاظ میں نہیں کرتے۔ انگریزوں کی خامیاں بیان کرنے میں جرأت سے کام نہیں لیتے۔

تصانیف کے نمونے

(۱) تاریخ ہندوستان جلد ہفتم ظفرنامۂ شاہجہاں میں رانا اودے پور سے محاربات شاہی کا حال لکھتے ہیں۔ ایک مقام کا مختصر اقتباس یہ ہے:۔

"رانا کا حال ایسا تنگ کیا کہ وہ ایک لحظہ کسی مقام میں آرام نہیں کر سکتا تھا۔ سورج مل اس کے بیٹے کے ساتھ، اہل و عیال اس کے، جا بجا پڑے پھرتے تھے خود تھوڑے آدمیوں کے ساتھ سرگرداں تھا۔ اور برسات کے موسم کا انتظار کرتا تھا کہ وہ راہوں اور گزرگاہوں کو پانی سے گھیر لے اور مجھے دشمنوں کی آگ سے بچا دے سلطان خرم نے کوہستان کی تنگناؤں میں تھانے بٹھا دئیے تھے کہ جہاں رانا کی خبر پائیں، وہاں فوراً اس کے پکڑنے کو لشکر روانہ ہو۔ محمد شاہ کو کلتگ کے تھانوں کی تخریب اور راجپوتوں کی تادیب کیلئے روانہ کیا۔ اس نے جاتے ہی تاراج شروع کی، اور بہت آدمیوں کو مارا اور قید کیا۔ رائے سندر داس سرزمین کی طرف گیا، وہاں رانا کے اہل و عیال کا نشان اس کو بتایا تھا، مگر اسکے پہنچنے سے پہلے چترمان رانا اہل و عیال کو دوسری جگہ لے گیا تھا۔ اس سرزمین میں

رائے سندر داس نے قتل و غارت اور اسیر کرنے اور منازل ہنود کے خراب کرنے میں کوئی چیز باقی نہیں چھوڑی۔ بت خانوں پر راجپوت بڑے دلیرانہ لڑے اور آخر کو جوہر کر کے مع اہل و عیال مرے۔ اس رائے نے بادشاہ کے حقوق کا پاس کیا اور اپنے آئین و کیش کا کچھ خیال نہیں کیا۔ بتوں کو جلایا اور بتخانوں کو ڈھایا۔

بدل با چناں مہرا و خانہ ساخت ۔ کہ ہندو بہ تخریب بت خانہ تاخت

اس حسن خدمات کے صلہ میں رائے سندر داس کو رائے رایاں کا خطاب ملا اور رفتہ رفتہ اس کا درجہ ایسا بڑھا کہ راجہ بکرماجیت کا خطاب مرحمت ہوا جس سے بڑھ کر راجاؤں کے واسطے کوئی خطاب نہیں ؛؛

شاہجہاں کے حال میں لکھتے ہیں :۔

"جب شاہ جہاں نے تخت شاہی پر جلوس کیا، تو اس کو مراسم ملت مصطفوی و شریعت محمدی کا جس میں کچھ خلل پڑ گیا تھا، ایسا پاس و لحاظ تھا کہ اول حکم اس نے یہ دیا کہ سجدہ کرنے کی تعظیم کا معبود حقیقی سزاوار ہے۔ اب آئندہ کوئی دوسرے کے لئے اپنی پیشانی کو خاک مذلت پر نہ رکھے، یعنی عہد اکبری میں بادشاہ کو جو سجدہ کرنے کا دستور تھا، وہ موقوف کیا۔ مہابت خاں خانخاناں نے معروض کیا کہ جہاں آفرین نے نظام عالم کے لئے اپنے بندوں کو مرتبہ نوازش و بزرگ داشت میں متفاوت پیدا کیا ہے۔ ایک کو اوج عزت و رفعت عنایت کیا، اور مرتبہ والا خداوندگاری اور پایۂ بلند فرماں گذاری پر پہونچایا، اور مسند کامگاری و تخیید پر متمکن کیا! اور دوسرے کو حکم پذیری اور فرماں برداری کے لئے پیدا کیا۔ اور ہر ایک کو استعداد کام کے اندازہ اور حالت روزگار کے موافق اس کے امور ضروریہ کے اتمام میں ممد و معاون بنایا۔ ایسے ہی مراتب تعظیم و تفاوت کو لوازم انتظام اور مراسم قوام عالم بنایا۔ اگر حضرت کو پرہیز گاری اور احکام الٰہی کی

اطاعت کے سبب سے سجدہ ناپسند ہے تو اس کی جگہ زمین بوس مقرر کیا جائے،
جس سے مخدوم خادم میں، اور رئیس مرؤس میں، اور سلطان و رعیت میں،
استقامت امور جمہور کے لئے امتیاز ہو۔ بادشاہ دین پناہ نے اس کی
ملتمس کو منظور کیا اور یہ قرار دیا کہ دونوں ہاتھ زمین پر لٹکا کے پشت دست پر
بوسہ دیں۔ اس کا نام "زمین بوس" رکھا گیا۔ مگر اس میں بھی سجدہ کے ساتھ
مشابہت ہوتی تھی، اس کو بھی موقوف کر کے تسلیم چہارم مقرر کی جس کا نام آگے
آئے گا۔ اور سادات کو کہ تعظیم و تکریم کے مستحق ہیں۔ اور فضلاء صلاح آثار
اور درویشان پرہیز گار اور زاویہ نشینان عبادت گذار کو اس زمین بوس
سے معاف کیا، اور یہ مقرر کیا کہ جس وقت بادشاہ سے ملاقات ہو تو "سلام علیکم"
کریں، اور جب رخصت ہوں تو فاتحہ پڑھیں۔"

(۲) تاریخ عہد انگلشیہ میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے گورنر جنرل
وارن ہیسٹنگز کے اخلاق و عادات بیان کرتے ہیں :۔

"اس نے اپنی سرکار کی خیر خواہی اور خیر اندیشی میں بھی کوئی دقیقہ فروگذاشت
نہیں کیا۔ مگر اس میں اس نے اخلاق کی نیکی پر خیال نہیں کیا۔ جس وقت سرکار
نے روپیہ مانگا، تو اس کے سرانجام کرنے میں کسی بات کا آگا پیچھا نہیں سوچا
از راہ ظلم و تعدی جو دولت کا سامان کیا، اہل انگلستان نے اس کو بے مرد
سامانی سمجھا۔ اس کی طبیعت کا خمیر ایسا تھا کہ وہ عدالت اور صداقت کو
ضرورت کے وقت کچھ چیز نہیں سمجھتا تھا، اور مروت و فتوت کو انسانیت میں
داخل نہیں جانتا تھا۔ "گر ضرورت بود روا باشد" پر عمل تھا۔ وہ خود رائی کے
سبب سے بر خود غلط اتنا تھا کہ اپنے سامنے افلاطون کی بھی حقیقت نہیں جانتا
تھا۔ ہر کام اس کا ایک راز سربستہ اور سر پوشیدہ تھا۔ کسی کام کی اصل و

حقیقت کھلنے ہی نہیں دیتا تھا۔ گو اس کے ظاہر ہو جانے سے نقصان نہ ہو، وجہ
اس کی یہ تھی کہ وہ ہر کام کو بڑے پیچ پاچ سے کرتا تھا۔ غرض اس میں جو خوبیاں
تھیں وہ تحسین کے قابل تھیں، اور جو برائیاں تھیں وہ نفرین کے لائق یوں
سمجھنا چاہئے کہ رعایا پروری، سپاہ کی دلداری، لوگوں کو اپنا کر لینا، رفاہیت
عباد اور معموری بلاد کا خیال، یہ سب خوبیاں اس میں ایسی تھیں کہ وہ ایک
طوطی خوش رنگ کی طرح خوشنما معلوم ہوتی تھیں۔ مگر اپنی سرکار کی نمک
شناسی کے سبب سے اس کی گنجینہ آمائی، دولت افزائی ایک ایسی بلّی اس میں
تھی کہ وہ اس طوطی خوش رنگ کو نوچے کھاتی تھی۔ مگر اس بلّی کے بھنبوڑنے
کے لئے اس کے پاس ایک کتّا بھی موجود تھا۔ جو اسکی خود پرستی و خود رائی
تھی۔ غرض یہ فضائل اور رذائل اس میں وہ کام کر رہے تھے، جو ایک بڑے
بند مکان میں طوطی اور بلّی اور کُتّا کام کریں۔"

یہ تشبیہ نہایت درست و موزوں پیدا کی ہے۔

(۳) مضامین ذکاء اللہ۔ یہ ادبی خدمت دوسری مستقل ضخیم تصانیف
سے کچھ کم در تیع دگراں قدر نہیں ہے۔ سرسید کی طرح مولوی ذکاء اللہؒ نے بھی مختلف
ضروری موضوعوں پر بے شمار مضامین لکھے ہیں۔ اور ہر مضمون اس قدر صحت فکر،
قوت استدلال اور تفصیل و تشریح کے ساتھ لکھا ہے کہ حقیقت میں حق ادا کر دیا ہے
بعض مضامین انگریزی سے تقریباً لفظی ترجمہ ہیں۔ بعض انگریزی مضامین سے
ماخوذ ہیں۔ لیکن اکثر ان کی اپنی فکر کا نتیجہ ہیں۔ ان کے بیان کی متانت و سلاست
جو اور تصانیف میں ہے، یہاں بھی ہے۔ بعض مضامین میں جدت تخیل اور
لطف بیان ایسا ہے جو ان کی تاریخوں میں نہیں ملتا۔ چند مضامین سے مختصر
اقتباسات درج کئے جاتے ہیں:۔

"(الف) **ادب**۔ ادب کے معنی اس ریاضت محمودہ اور کوشش وسعی کے ہیں جس سے کسب فضیلت ہو۔ ہر چیز کی نگہداشت کو اور ہر فعل محمودہ کی تعظیم کو بھی ادب کہتے ہیں۔

تو اپنے نفس کو وہ ادب سکھا کہ بے ادب اسے دیکھ کر با ادب ہو جائیں۔ جو ادب سکھانے کا ذوق رکھتا ہے، اور بے ادبوں کو اپنا ہی سا بنا لیتا ہے جیسے آہوے وحشی جو گھر میں دانہ کھاتا ہے، وہ اور آہوؤں کو پکڑلاتا ہے۔ جو اپنے اخلاق کی بنیاد ادب پر رکھتا ہے، اس کا فکر استاد ہو جاتا ہے۔ بزرگی کی جڑ ادب سے مستحکم ہوتی ہے تو لالہ وگل کی طرح تھوڑا سا خندہ کر کہ سب کو مطبوع ہو، نہ یہ کہ ایسے قہقہے لگائے کہ سب کو بیہودہ معلوم ہوں۔ بے خرد جس کو مزاح کہتے ہیں، وہ خردمندوں کے نزدیک نبرد سلاح ہے۔ اگر تمہاری داڑھی کوؤں کے پروں کی سی سیاہ ہو، تو بڈھوں کی بگلا کی سی سفید داڑھی کی ہنسی نہ اڑاؤ۔ اگر تم سمن عارض اور گل عذار ہو تو زنگی کے سامنے آئینہ رکھ کر اسے نہ چڑاؤ۔ کیونکہ کوئی بدصورت دنیا میں بے مصلحت نہیں ہوتا ایک چینی جس کا رنگ سرخ و سفید تھا، ایک زنگی پر ہنسا۔ تو زنگی نے جواب دیا کہ "میرا ایک نقطہ تیرے چہرے کے لئے زیب ہے، اور تیرا ایک نقطہ میرے لئے ایک عیب ہے۔"

یہ عبارت ایسی معلوم ہوتی ہے جیسے اخلاق کی کسی فارسی کتاب کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہو۔

(ب) ذیل کا مضمون انگریزی کے ایک مضمون سے ماخوذ ہے جو مشہور مصنف بیکن نے لکھا ہے: بلکہ جا بجا اس کا لفظی ترجمہ ہے۔

"**کتب کا مطالعہ**۔ مطالعہ تنہائی اور عزلت میں خوشی بخشتا ہے

گفتگو و تقریر میں حسن بیان پیدا کرتا، معاملات کے فیصلہ اور مقدمات میں رائے دینے کی قابلیت بڑھاتا ہے۔ بس مطالعہ سے حسن بیان اور قابلیت بڑھتی ہے۔ گو معاملات مقدمات کو تیز و چالاک آدمی بھی فیصلہ کر دیتے ہیں۔ مگر مقدمات و منصوبوں کی ترتیب اور عام اصلاح کی تدابیر جیسی چاہیے۔ عالم و فاضل ہی کرتے ہیں۔

تم اس واسطے نہ پڑھو کہ لوگوں کے خلاف باتیں کہیں گے اور ان کی باتوں کی تردید کریں گے یا سب باتوں کو یقین اور تسلیم کریں گے، یا ہم خود بہت باتیں بنائیں گے۔ بلکہ پڑھنے سے مقصودِ اعظم یہ ہو کہ ہم لوگوں کی باتوں کو تولیں گے اور سوچیں گے، پھر جو عمل کرنے کے قابل ہوں گی ان پر عمل کریں گے۔

بعض کتابوں کا صرف مزا چکھا جاتا ہے، یعنی ان میں سے کچھ کچھ پڑھا جاتا ہے بعض بالکل نگلی جاتی ہیں یعنی کل پڑھی جاتی ہیں مگر بے توجہی اور بے غوری سے بہت تھوڑی کتابیں ہیں جو چبا چبا کے ہضم کی جاتی ہیں یعنی اول سے آخر تک بڑی توجہ اور غور و خوض سے پڑھی جاتی ہیں۔ کتابوں کے انتخاب سے جو کتابیں بنتی ہیں، ان کا حال آب مقطر کا سا ہے۔

(ج) مولوی ذکاء اللہ کی انشا پردازی، قوت تخیل اور جدت آفرینی کا ایک دلچسپ نمونہ ذیل کا مضمون ہے۔ بعض حصے حذف کر کے شروع سے آخر تک نقل کیا جاتا ہے:۔

"آگ۔ اللہ جل شانہٗ نے اپنی مخلوق میں اپنی صفات کی نشانیاں عجب حیرت انگیز ادا سے دکھائی ہیں کہ انسان ان نشانیوں کو ذی نشان سمجھ کر اپنا معبود بناتا ہے، حقیقت تک عدم رسائی کی وجہ سے مجاز میں بالکل محو ہو جاتا ہے

ہندوؤں کی ازلی الٰہی کتاب میں آگ راگنی، کا بیان دیکھو تو تم کو معلوم ہوگا کہ نا ایک نشان کبریائی دکھا رہی ہے۔ معبود بنی بیٹھی ہے' آدمیوں کو اپنا بندہ بنا کر پوجا کرا رہی ہے۔ ہمہ دانی کی صفت سے اس کی ذات موصوف ہو رہی ہے یہ وہ صفت ہے کہ اللہ ہی کی ذات سے مخصوص ہے اس کی ذات کی نسبت وہ نکتے بیان ہو رہے ہیں کہ ان کے سمجھنے کیلئے اعلیٰ سے اعلیٰ درجے کی ذہانت کی ضرورت ہے۔

یہ مثل کہ "آگ میں مُوتو یا مسلمان ہو" ایسے محل پر بولی جاتی ہے جہاں ہر طرح سے کام کرنے میں بُرائی ہی بُرائی ہو۔ آگ ہندوؤں کی معبود ہے، اگر اس میں مُوتے تو نرگ میں پڑے، مسلمان ہو تو جہنم میں جائے۔ دونوں طرح سے خرابی ہی خرابی ہے۔ آگ ہندوؤں کی اصلی معبود ہے۔

زردشتیوں کی کتابوں میں آگ نور الٰہی کا ظہور دکھا رہی ہے۔ آدمیوں کے سر کو اپنے آگے سجدہ میں جھکا رہی ہے اپنی پرستش کے لئے آتشکدے بنوا رہی ہے جن میں بجنسہ درخشاں و تاباں رہتی ہے...... ارسطاطالیس نے استقرائے اربعہ بسائط عنصریہ، خاک باد، آب، آتش، قرار دئے۔ مگر عناصر کو بسیط حالت میں کوئی نہیں دیکھ سکا۔ آتش حالت بسیط میں زمین پر معدوم اور کرۂ نار میں موجود۔ انسان کرۂ نار میں پہنچ کر کیونکر دیکھ سکتا ہے۔ خاک حالت بسیط میں زمین کے طبقۂ اولیٰ اور طبقۂ طینیہ کے نیچے بیٹھی ہے۔ تحت الثریٰ میں جا کر اس کی زیارت ہو سکتی ہے جو انسان کے لئے ناممکن ہے۔ ہوا بسیط حالت میں کرۂ ہوا کے طبقۂ سیوم میں موجود ہے۔ انسان اگر پر لگا کے جائے تو اسکی قدم بوسی کر سکتا ہے، مگر یہ بھی ممکن نہیں۔ پانی تو کہیں حالت بسیط میں مل ہی نہیں سکتا۔

ارسطو کے نزدیک ان چاروں عنصروں کا مولد ایک ہی ہے۔ مگر محققین زمانہ

حال آگ کو ہیولیٰ سے خالی جانتے ہیں، اور اس کو مادّی نہیں مانتے. حرکت سے کہتے ہیں کہ حرارت پیدا ہوتی ہے۔ آگ بھی اس حرارت کی کیفیت ہے. ان مباحث میں ہنگامۂ سخن گرم کرنے سے مجھے اندیشہ ہے کہ قلم دیا سلائی بن کر میرے ہاتھ کو نہ جلائے......

آگ عجیب نامبارک اولاد ہے، پیدا ہوتے ہی ماں باپوں کو کھا جاتی ہے. جن لکڑیوں کی زناشوئی سے پیدا ہوتی ہے، انھیں کو جلا کر خاک کر دیتی ہے اور آپ ماں باپ کو مار کر زندہ رہتی ہے...... **آگ** ہماری دشمن جانسوز بھی ہے اور دوست دل افروز بھی. وہ گھر گھر مبارک مہمان ہے. مہربان دوست ایسی کہ ہماری راحت کے لئے ہماری رنج و تکلیف کے دور کرنے کیلئے، آسائش و آرام کے واسطے، صدہا ضروریات زندگی کے رفع کرنے کے واسطے وہ سامان مہیا کرتی ہے۔ ہمارے چولھے پر ماماگری کرتی ہے. اُپلے کنڈے جلا کر روٹی اور کھانا پکاتی ہے. آگ ہی نے انسان کو پکانا سکھایا ہے جس کے سبب سے وہ اور حیوانوں سے ممتاز ہوگیا ہے، جیسا انسان حیوان ناطق کہلاتا ہے، ایسا ہی پرندہ حیوان. کیونکہ کوئی حیوان اپنی ہنڈیا پکانے کے لئے آگ پر نہیں چڑھاتا. یہ تو حضرت انسان ہی عقل کے پورے ہیں کہ پھوکم پھوک کر کے آگ روشن کرتے ہیں، اور اپنی خوراک پکاتے ہیں اور اس کی دُھوئیں سے آنکھوں کو اذیت پونہچاتے ہیں ......

جن ملکوں میں سردی کی شدت ہے اور برف کثرت سے پڑتی ہے. وہاں بغیر آگ اور ایندھن کے آدمی کا جینا مشکل ہو جاتا ہے...... انگلستان ایک سرد ملک ہے۔ اس کے اندر ہر گھر میں ایک آتش دان ہوتا ہے جس کے گرد گھر والے آگ تاپنے بیٹھتے ہیں. بڑے چھوٹوں کو طرح طرح کے سبق سکھاتے ہیں. وہ بچپنے کی اُڑن کے ساتھ ایسے بنے جلتے ہیں کہ بڑھاپے تک ان کے تار و پود ٹوٹتے نہیں' دلوں پر

وہ نقش جاتے ہیں کہ عمر کی درازی ان کو مٹا نہیں سکتی، وہ پتھر کی لکیر ہوتے ہیں استداد زمانہ ان پر زنگ نہیں چڑھا سکتا۔ یونیورسٹی کے "آنرز" پانے والے بہت تھوڑے آدمی ہوتے ہیں، مگر آتشدانوں کے گریجویٹ سب ہوتے ہیں۔ یونیورسٹی میں جو علم تحصیل ہوتا ہے وہ ایک مدت کے بعد حافظہ میں پژمردہ و مردہ ہو جاتا ہے، مگر ان آتشدانوں کے گرد کا سبق پڑھا ہوا ہمیشہ زندہ و تازہ رہتا ہے۔

جاڑے کے موسم میں ہندوستان میں دیہات میں صبح شام رات کو دیکھو کہ ایک الاؤ جلتا ہے، جس کے گرد گنوار حلقہ باندھ کر خشک زمین پر آکر دل بیٹھتے ہیں، اور چلم میں بہت سی آگ بھر کر ایک حقہ پر رکھتے ہیں، اور اس کا دور لگاتے ہیں۔ ایک ایک دو، دو گھونٹ پی کر حقہ کی نے دوسرے منھ کی طرف کر دیتے ہیں اسوقت وہ اپنی اولاد کے بیاہ شادی کرنے کی، گائے بھینس کے بیلانے کی، بھیڑ بکری کے پالنے کی، اور کھیتی کے بگڑنے سنورنے کی باتیں کرتے ہیں۔ وہ عجیب دلچسپ اور دل رُبا ہوتی ہیں۔ اگر کوئی ان کو سنے تو اس کو وہ علم حاصل ہو جو کبھی کتابوں سے نہیں حاصل ہو سکتا۔

اب تک ہم نے **آگ** کی دوستی کا بیان کیا۔ اب اس کی دشمنی کا ذکر سنو کہ جب یہ مادر مہربان ہم سے خفا ہوتی ہے تو خدا کی پناہ! اس کے آتش ناک غصّہ کے سامنے ساری مخلوق بھاگتی ہے، مگر وہ بھلا کب اس کو چھوڑتی ہے۔ اس طرح پکڑ لیتی ہے جیسے بھاگتے ہوئے لشکر کو دشمن پکڑ لیتا ہے، اور فنا کر دیتا ہے جس چیز کو چھوتی ہے چاٹ کر سیاہ کر دیتی ہے۔ کھیتوں کو اس طرح کاٹتی ہے جیسے کہ نائی قینچی سے داڑھیوں کو تراشتا ہے۔ جب درختوں کی رگڑ سے وہ پیدا ہوتی ہے تو جنگل کے جنگل جلا کر خاک سیاہ کر دیتی ہے۔ جب وہ بھڑکتی ہے اور اپنے شعلے ہوا میں اُڑاتی ہے تو سمندروں کی لہروں کی کیفیت دکھاتی

ہے. سمندر میں بھی وہ فاسفورس کی روشنی کے جلوے خوب دکھاتی ہے جہاں
آگ ہو کر گذر جاتی ہے، وہ جگہ دھواں دھار ہو کر تاریک ہو جاتی ہے۔ وہ
دھوئیں کا تاج سر پر لگاکے اور شعلوں کے بال بنا کے تاریکی کو دور کر دیتی ہے
غرض **آگ** بھی عجیب چیز ہے کہ زمین پر ناسہے، آفتاب میں نور ہے، آسمان
پر بجلی ہے، لوہے اور چقماق میں شعلہ ہے۔ گرم ملک والوں نے جو جہنم بنایا
ہے اس میں وہ گنہگاروں کی تعزیر کے لئے ایک سخت عذاب ہے۔ سرد ملک
والوں نے جو جنت بنائی ہے، اس میں نکوکاروں کے تاپنے اور آرام کرنے کے
لئے جاں فزا ہے۔

خدانخواستہ اگر آتش دنیا سے معدوم ہو جائے تو بہت سے کام دنیا کے ٹھنڈے
ہو جائیں۔ نہ چونہ پکے کہ اینٹ پتھر کو جوڑے، نہ ریت سے منہ دیکھنے کا شیشہ
بنے۔ غرض عالم کے حسن کے بڑے حصے میں گرما گرمی اور دل فریبی نہ رہے
اس کا جوبن خاک میں مل جائے۔ اس کی بہار پر خزاں آجائے۔

آگ اپنے تئیں کھاتی ہے اگر اس کو کوئی چیز کھانے کو نہ ملے اَلنَّارُ
تَاکُلُ نَفْسَهَا اِنْ لَمْ تَجِدُ مَا تَاکُلُهٗ۔

آگ خاکستر ہو کر بہت آدمیوں کو کھلاتی ہے :۔

اَلنَّارُ کَثِیْرُ الرَّمَادِ لِاَنَّھَا تُطْعِمُ الْعِبَادَ۔

"آب و آتش را چہ آشنائی" آگ پانی کو بخار بنا کر اڑاتی ہے، اس طرح
اپنے دل کا بخار نکالتی ہے۔ خداتعالیٰ نے اپنے فضل کرم سے، اس لئے کہ
یہ عنصر انسان کے کاموں میں ہمیشہ زیادہ آئے، ہوا کو اس کا خدمت گار
مقرر کر دیا ہے کہ اس پر پنکھا جھلا کرے۔"

مولوی نذیر احمد

والد کا نام مولوی سعادت علی ہے۔ ۶ر دسمبر ۱۸۳۶ء (۲۳ جمادی الاول ۱۲۵۲ھ) کو پیدا ہوئے۔ وطن اصلی موضع ریہڑ تحصیل نگینہ ضلع بجنور ہے شاہ عبدالغفور اعظم پوری رحمتہ اللہ علیہ کی اولاد میں ہیں۔ اعظم پور ضلع بجنور میں ہے۔ شاہ صاحب اپنے وقت کے مشاہیر اولیاء اللہ میں تھے۔ مولوی نذیر احمد کی ننھیال بھی علماء کے خاندان میں تھی جو شاہی زمانے میں قاضی رہ چکے تھے۔ چار برس کی عمر میں والد کے ساتھ بجنور آ گئے۔

ابتدائی تعلیم

ابتدائی تعلیم کچھ مکتب میں اور کچھ والد سے حاصل کی۔ والد خود بڑے عالم تھے۔ ۹ برس کی عمر تک انھوں نے فارسی عربی پڑھائی۔ پھر مولوی نصراللہ خاں صاحب ڈپٹی کلکٹر بجنور سے پانچ سال تک عربی نحو، منطق فلسفہ پڑھا۔ ۱۴ برس کی عمر تھی کہ والد ان کو لے کر دہلی آئے۔ اور مدرسہ مسجد اورنگ آبادی کے فاضل مدرس مولوی عبدالخالق کے سپرد کر گئے، یہاں مولوی نذیر احمد نے بالکل طالب علمانہ زندگی بسر کی جس کا حال مرزا فرحت اللہ بیگ نے نذیر احمد صاحب کی زبانی اس طرح لکھا ہے۔

"پڑھنے کے علاوہ میرا کام روٹیاں سمیٹنا بھی تھا۔ صبح ہوتی اور میں چھبڑی ہاتھ میں لے گھر گھر روٹیاں جمع کرنے نکلا۔ کسی نے رات کی بچی ہوئی دال ہی دیدی کسی نے قیمے کی لگدی ہی رکھدی، کسی نے دو تین سوکھی روٹیوں ہی پر ٹرخایا۔ غرض رنگ برنگ کا کھانا جمع ہو جاتا۔ مسجد کے پاس ہی عبدالخالق صاحب کا مکان تھا۔ اچھے کھاتے پیتے آدمی ہیں۔ ان کے ہاں میرا قدم رکھنا مشکل تھا۔ ادھر میں نے قدم رکھا، اُدھر ان کی لڑکی نے ٹانگ لی۔ جب تک سیر دو سیر مصالحہ مجھ سے نہ پسوا لیتی۔ نہ گھر سے نکلنے دیتی نہ روٹی کا ٹکڑا دیتی۔ خدا جانے کہاں سے محلہ بھر کا

مصالحہ اٹھالاتی تھی۔ پیستے پیستے ہاتھوں میں گٹّے پڑگئے تھے۔ جہاں میں نے ہاتھ روکا اور اس نے بٹہ انگلیوں پر مارا۔ بخدا جان سی نکل جاتی تھی.... بہر حال مار ادھاڑی روز وہاں جانا پڑتا اور روز یہی مصیبت جھیلنی پڑتی:

(از مضمون مطبوعہ رسالہ اُردو)

دہلی کالج کی تعلیم — اس طالب علمی اور ٹکڑگدائی سے مولوی نذیر احمد خوش اور مطمئن نہ تھے لیکن طلب علم کی خاطر گوارا کرتے تھے۔ اسی زمانے میں ایک دن دہلی کالج میں تقسیم انعام کا جلسہ تھا۔ یہ بھی اتفاق سے اُدھر جانکلے۔ تماشائیوں کی بڑی بھیڑ تھی۔ یہ گر پڑے اور چوٹ لگ گئی۔ حسنِ اتفاق سے کالج کے پرنسپل نے دیکھ لیا، اور ان کو اٹھا کر بڑی ہمدردی و شفقت کی اور پوچھا، کیا پڑھتے ہو؟ انھوں نے کہا شرحِ مُلّا اور ابوالفضل پڑھتا ہوں۔ جلسے کے بعد پرنسپل کے کہنے سے مفتی صدرالدین خاں صاحب نے شرحِ ملّا میں مولوی نذیر احمد کا امتحان لیا۔ انھوں نے نہایت عمدہ جواب دئے۔ پرنسپل نے کالج میں داخل[1] کر لیا اور چار روپیہ ماہوار وظیفہ مقرر کر دیا۔ جو بڑھتے بڑھتے چوبیس روپیہ ماہوار ہو گیا۔ اس وظیفے کے متعلق وہ خود بیان کرتے ہیں۔

لہ نذیر احمد صاحب کے کالج میں داخل ہونے کا سال ۱۸۴۵ء ان کی سوانح عمری "حیات النذیر" میں اور اس سے "سیر المصنفین" وغیرہ تذکروں میں درج کیا گیا ہے۔ اور بہت تذکروں نے ان کا سال ولادت بھی ۱۸۳۶ء لکھا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ ۹ برس کی عمر تک والد سے اور اُسکے بعد ۵ سال مولوی نصر اللہ خاں سے تعلیم پاکر بجنور سے دہلی آئے۔ اس حساب سے دہلی آنے کے وقت ان کی عمر ۱۴ سال کی ہوتی ہے۔ تو ولادت کے سال مذکور کے حساب سے ۱۸۵۰ء میں دہلی آئے پھر ۱۸۴۵ء کالج میں داخل ہونے کا سال کیونکر ہو سکتا ہے (باقی حاشیہ صفحہ ۵۳۸ پر)

"مجھ کو مرحوم دہلی میں اپنا وظیفہ پانا یاد ہے جس دن سے وظیفہ شروع ہوا
میں نے اور نہ صرف میں نے بلکہ ہمارے خاندان نے اس کو سلسلۂ ملازمت
کا آغاز سمجھا"

دہلی کالج میں مولوی ذکاء اللہ ان کے ہم جماعت تھے۔ مولانا نذیر احمد کو ریاضی اور تاریخ سے دلچسپی نہ تھی لیکن وظیفہ کی خاطر پڑھتے تھے۔ کالج میں داخل ہوئے تھوڑا عرصہ ہوا تھا کہ والد کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد مولانا اور محنت سے پڑھنے لگے۔ آخر ۱۸۵۴ء میں آٹھ سال کی تعلیم کے بعد کالج چھوڑا۔ کالج کی تعلیم کے متعلق خود لکھتے ہیں:۔

"معلومات کی وسعت، رائے کی آزادی، ٹالریشن (درگذر) گورنمنٹ کی سچی
خیر خواہی، اجتہاد علی البصیرۃ، یہ چیزیں جو تعلیم کے عمدہ نتائج ہیں اور جو حقیقت
میں شرط زندگی ہیں۔ ان کو میں نے کالج ہی میں سیکھا اور حاصل کیا۔ اور
اگر میں نے کالج میں نہ پڑھا ہوتا تو میں بتاؤں کیا ہوتا، مولوی ہوتا تنگ خیال،

(باقی حاشیہ صفحہ ۵۳۷)

اس سال ان کی عمر ۳ سال کی ہوتی ہے۔ ان سنوں کی تاویل و تطبیق اس طرح ہو سکتی ہے کہ مولانا کا سال ولادت ۱۸۳۰ء ان کی بڑی عمر میں اور ملازمت کی حالت میں کسی پنڈت نے ان کا جنم پتر بنا کر بتایا تھا۔ خود ان کو اپنا سال ولادت ۱۸۳۳ء یاد تھا، اور یہی سال انھوں نے ڈپٹی کلکٹری کی درخواست میں لکھا تھا۔ قراین و حالات سے یہی درست معلوم ہوتا ہے۔ یہ سنہ ۱۲۴۸ھ اور ۱۲۴۹ھ کے مطابق ہوتا ہے۔ اس زمانے میں مسلمان عموماً ہجری سال سے واقعات کا حساب لگایا کرتے تھے۔ اس حساب سے مولانا جب ۱۴ سال کی عمر میں دہلی آئے تو ۱۲۶۱ھ یا ۱۲۶۲ھ ہو گا۔ اور یہ ۱۸۴۴ء کے مطابق ہے۔ اس طرح کالج میں داخل ہونے کا سال ۱۸۴۵ء ہو سکتا ہے۔

متعصب، اکمل کھرا، اپنے نفس کے احتساب سے فارغ، دوسروں کے عیوب کا متجسس، برخود غلط، مسلمانوں کا نادان دوست، تقاضائے وقت کی طرف سے اندھا۔"

جس زمانے میں نذیر احمد صاحب مولوی عبدالخالق صاحب سے پڑھتے اور ان کے گھر کا کام کیا کرتے تھے، ان کی خورد سال پوتی کو گود میں لئے پھرنا اور اسکی ٹہل کرنا بھی ان کے ذمّہ تھا۔ خوبیٔ تقدیر سے آخر بڑے ہو کر اسی لڑکی سے ان کی شادی ہوئی۔ مفتی صدرالدین صاحب نے نکاح پڑھایا اور گیارہ ہزار کا مہر باندھا گیا۔ پھر مولانا نے ایک اور نکاح اپنے کنبے میں والدہ کے اصرار سے کیا۔ لیکن اس سے نباہ نہ ہو سکا اور طلاق پر معاملے کو ختم کرنا پڑا۔

ملازمت

۱۸۵۴ء میں کنجاہ ضلع گجرات (پنجاب) میں چالیس روپیہ ماہوار کے مدرس ہوئے۔ دو برس بعد ڈپٹی انسپکٹر مدارس ہو کر کانپور آگئے یہاں انگریز انسپکٹر سے نہ بنی۔ اس لئے استعفا دیکر دہلی چلے گئے۔ ابھی دہلی پہنچے نہ تھے کہ ۱۸۵۷ء کا غدر برپا ہو گیا۔ یہ بھی غدر کے مصائب میں مبتلا رہے اتفاق سے اس ہنگامہ میں نذیر احمد صاحب نے ایک میم کی جان بچائی۔ غدر کے بعد اس خدمت کے صلے میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس الہ آباد مقرر ہوئے۔

الہ آباد میں نذیر احمد صاحب منشی عبداللہ خاں صاحب امین عدالت کے مکان پر مقیم ہوئے۔ منشی صاحب انگریزی جانتے تھے۔ ان کی ترغیب سے انھوں نے بھی انگریزی پڑھنی شروع کی۔ اور کافی قابلیت پیدا کر لی۔ مولانا نے ایک لکچر میں انگریزی پڑھنے کے سلسلے میں کہا تھا:۔

"میں ایسے باپ کا بیٹا ہوں کہ دہلی کالج کے پرنسپل نے ہر چند چاہا کہ میں انگریزی پڑھوں۔ والد مرحوم نے جو ایک غریب آدمی تھے مگر اپنے وقت کے

بڑے دیندار، صاف کہہ دیا کہ مجھے اس کا مرجانا منظور، اس کا بھیک مانگنا
قبول، مگر انگریزی پڑھنا گوارا نہیں"۔

اسی زمانے میں گورنمنٹ نے ان کو قانون انکم ٹیکس کے ترجمہ کی خدمت سپرد کی یہ ترجمہ بڑی قابلیت سے کیا۔ اسکے بعد تعزیرات ہند کے ترجمہ کا کام ملا۔ اور اسکے صلے میں کانپور کی تحصیلداری ملی۔ دو برس تحصیلدار رہے۔ ترجمہ ختم ہونے پر ۱۸۶۳ء میں ڈپٹی کلکٹر بنا دیے گئے۔ پھر ایک انگریزی علم ہیئت کی کتاب کا ترجمہ سموات کے نام سے کیا۔ اور یہ ترجمہ تنقید و نظر ثانی کی غرض سے ریزیڈنٹ حیدر آباد کے ذریعہ سے امیر کبیر مدار المہام ریاست کے پاس بھیجا گیا۔ امیر کبیر علم ہیئت و ریاضی کے بڑے ماہر تھے (اس داستان تاریخ اردو کے صفحہ ۲۷۰ پر ان کا ذکر آچکا ہے) مولوی نذیر احمد کا ترجمہ بہت پسند کیا گیا، اور انکی غیر معمولی ذہانت و قابلیت نے ایسا اثر پیدا کیا کہ سر سالار جنگ نے ان کو حیدر آباد بلا لیا۔

نواب عماد الملک مولوی سید حسین بلگرامی اور نواب محسن الملک کے خطوط مولوی نذیر احمد کے پاس آئے کہ سر سالار جنگ آپ کی خدمات حیدر آباد کے لئے منتقل کرانا چاہتے ہیں۔ پھر سر سید احمد خاں کے ذریعہ سے سرکار نظام کی طرف سے تحریر موصول ہوئی کہ بالفعل ۸۵۰ روپیہ اور پھر ایک ہزار بیس روپیہ ماہوار بحساب سکۂ انگریزی ملیں گے۔ مولانا اس وقت اعظم گڑھ میں ڈپٹی کلکٹر تھے۔ رخصت لیکر دہلی ہوتے ہوئے حیدر آباد چلے گئے۔ ۲۷ راپریل ۱۸۷۷ء کو وہاں پہنچ کر نواب محسن الملک کے پاس قیام کیا۔

حیدر آباد میں ترقی کرتے کرتے "بورڈ آف ریونیو" کے ممبر ہو گئے۔ بستر سو روپیہ ماہوار تنخواہ ہو گئی۔ سر سالار جنگ بیحد قدر و عزت کرتے تھے۔ اس زمانے میں میر محبوب علی خاں بہادر نظام دکن نابالغ تھے۔ ان کی تعلیم کے لئے سر سالار جنگ نے

مولوی نذیر احمد صاحب سے خاص طور پر نصاب تعلیم مرتب کرایا۔ لیکن یہ کتابیں شائع نہ کی گئیں۔

قیام حیدر آباد کے زمانے میں نذیر احمد صاحب کو قرآن مجید حفظ کرنے کا خیال ہوا۔ اور اپنے بے نظیر حافظہ کی مدد سے چھ مہینے میں پورا قرآن یاد کر لیا۔ سر سالار جنگ نے اپنے فرزند لائق علی خاں کو مولوی نذیر احمد کی شاگردی میں دیدیا۔ وہ اور مہاراجہ کشن پرشاد دونوں ان کے مکان پر پڑھنے کیلئے آتے تھے۔ ۱۸۸۳ء میں سر سالار جنگ کے انتقال کے بعد لائق علی خاں سالار جنگ ثانی ہوئے۔ چونکہ مولوی نذیر احمد ان کے استاد رہ چکے تھے۔ بعض لوگوں کو اندیشہ پیدا ہوا کہ مولوی صاحب شاگرد پر اپنا اثر نہ ڈالیں، اس لئے ان لوگوں نے استاد کی طرف سے شاگرد کے کان بھرنے شروع کئے۔ ان کے کان میں بھی اس کی بھنک پڑ گئی، موقع دیکھ کر پنشن لے کر دہلی چلے آئے۔ حیدر آباد میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ چھوٹ جانے کا بہت قلق تھا۔ اب یکسو ہو کر علمی مشاغل میں مصروف ہوگئے۔

انعامات و خطابات "مرآۃ العروس" اور "توبتہ النصوح" پر ایک ایک ہزار روپیہ انعام گورنمنٹ سے ملا۔ پہلی کتاب پر ایک گھڑی بھی ملی۔ ۱۸۹۷ء میں شمس العلما کا خطاب ملا۔ قرآن مجید کا ترجمہ چھپنے پر اس کی ایک جلد مولانا نے سر ولیم میور لفٹنٹ گورنر کو انگلستان بھیجی۔ اس عظیم الشان علمی خدمت کے اعتراف میں ۱۹۰۲ء میں ایڈنبرا یونیورسٹی نے ایل ایل ڈی کی ڈگری پیش کی۔ پھر ۱۹۱۰ء میں پنجاب یونیورسٹی نے ڈی۔ او۔ ایل کی ڈگری دی۔

شغل سود و تجارت مولوی نذیر احمد کی ابتدائی زندگی عسرت میں گزری تھی۔ اسلئے ان کی طبیعت میں کفایت شعاری کا مادّہ اور دولت کی قدر پیدا ہو گئی تھی۔ تجارت سے بھی لگاؤ تھا۔ اس لئے خود بھی تجارت میں روپیہ لگاتے تھے۔

اور دوسروں کو بھی یہی نصیحت کرتے تھے۔ بلکہ دوسروں کو محض اعتبار پر روپیہ دیدیتے تھے۔ خود انھوں نے ایک بار کہا تھا کہ "اس تجارت کے شوق میں تین لاکھ روپیہ کھو بیٹھا ہوں" اپنے روپیہ پر کھلم کھلا سود لیتے تھے۔ ایک روپیہ سیکڑہ شرح سود مقرر تھی اپنی تصنیف الحقوق والفرائض میں مسئلہ سود پر بحث کی ہے، اور اس کو جائز بتایا ہے۔

دلچسپ بات یہ تھی کہ ایک طرف تو وہ نہایت جز رس و کفایت شعار تھے۔ یہاں تک کہ بخیل مشہور ہو گئے تھے۔ اور دوسری طرف اس قدر سادہ مزاج اور صاحب مروت تھے کہ نہ جائداد کی نگرانی کرتے تھے۔ نہ تجارت کی دیکھ بھال، اور روپیہ بے تکلف قرض دیتے رہتے تھے۔ اس ترکیب سے بڑی دولت لوگوں نے اڑالی۔ چنانچہ وفات کے بعد امید سے کم روپیہ نکلا۔ حالانکہ صرف پنشن کا روپیہ ڈھائی لاکھ ہوتا ہے۔ بینک میں نقد روپیہ پچاس ہزار تھا۔ جائداد ملا کر ڈیڑھ لاکھ سے زیادہ کی مالیت نہ تھی۔

شوخی و ظرافت بچپن سے نہایت ذہین اور شوخ طبع تھے۔ یہی کیفیت آخر عمر تک رہی بچپن میں چلبلی طبیعت کے سبب سے ایک وقت میں ایک جگہ بیٹھ کر حجامت نہ بنوا سکتے تھے۔ تھوڑی دیر بیٹھے اور بھاگ گئے۔ پھر پکڑے آئے اور حجامت بنی لڑکپن میں مولوی عبد الخالق کے گھر کا مصالحہ پیسنے میں دق کیا کرتے تھے۔ پھر بڑے ہو کر نوکر ہوئے۔ اور قانون انکم ٹیکس کا ترجمہ سپرد ہوا تو اس میں بابو شیو پرشاد انسپکٹر مدارس شریک ہو گئے۔ مولانا خود ہی ترجمہ کرنا چاہتے تھے۔ لیکن بابو صاحب کے ماتحت تھے اور کچھ نہ کر سکے تو ان کو پریشان کرنا شروع کیا۔ بابو جی ترجمہ بولتے۔ یہ لکھتے۔ درمیان میں انھوں نے پوچھا "لکھ چکے" مولانا نے یہ لفظ بھی لکھ دیا۔ انھوں نے پڑھوا کر سنا تو یہ لفظ بھی پڑھ دیا۔ وہ خفا ہوئے اور کہا کہ "یہ داخل گستاخی ہے" انھوں نے یہ فقرہ بھی درج کر دیا۔ آخر انسپکٹر صاحب عاجز آ گئے۔

مولانا کے بعض لطیفے قابل ذکر ہیں :-

(۱) ایک مرتبہ سر سالار جنگ ثانی نواب لائق علی خاں بہادر شملے سے علی گڑھ جاتے تھے۔ مولانا غازی آباد کے اسٹیشن پر جاکر ملے ۔ انھوں نے باتوں میں یہ بھی کہا آپ ناحق حیدر آباد سے چلے آئے اب بھی وہیں چلئے ۔" مولانا نے فرمایا "نمک خوار سرکار ہوں، مگر معافی کا خواستگار ہوں۔ اب جس حال میں ہوں، وہی میرے لئے مناسب ہے ۔ ایک مرتبہ حیدر آباد جاکر تو پنشن پر نکالا گیا۔ اب دوسری مرتبہ جاؤں تو کہیں ایسا نہو کہ یہ پنشن بھی کھو آؤں ۔" سر سالار جنگ مسکرا کر خاموش ہو گئے ۔

(۲) حیدر آباد سے آکر دہلی میں قیام کیا تو انگریزی حکام ان کی خدمات اور کارناموں سے واقف نہ تھے ۔ ایک مرتبہ دہلی میں کوئی جلسہ ہوا۔ ڈپٹی کمشنر نے اہل دہلی کو بلانے کے لئے ایک معمولی فہرست گشت کرائی ۔ اس میں ان کا نام بھی تھا۔ انھوں نے فہرست کے حاشیے پر یہ لکھ دیا۔

"اگر یہ سرکاری طلبی ہے تو سمن یا وارنٹ آنا چاہیے ۔ دوستانہ بلاوا ہے تو چھٹی آنی چاہیے ۔ اور یہ دو صورتیں نہیں ہیں اور آنا نہ آنا میری مرضی پر منحصر ہے تو میں نہیں آسکتا۔"

ڈپٹی کمشنر اس تحریر کو دیکھ کر چونکا، اور تحصیلدار سے پوچھا۔ جب ان کا حال معلوم ہوا تو تحصیلدار سے کہا کہ تم نے پہلے مجھ سے کیوں نہ کہا کہ میں چٹھی لکھتا چنانچہ اس نے الگ خط لکھ کر بلایا۔ اور زبانی معذرت کی۔

(۳) مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس دہلی میں ہو رہا تھا۔ اور مولوی نذیر احمد تقریر کر رہے تھے ۔ اسی درمیان میں لارڈ کچنر کمانڈر انچیف افواج ہند جلسہ میں آئے تھوڑی دیر بیٹھے، کچھ تقریر کی اور رخصت ہو گئے ۔ ان کے اٹھتے ہی مولانا

پھر تقریر کرنے کے لئے کھڑے ہو گئے، اور ابھی لارڈ صاحب اسٹیج سے اُترے ہی تھے کہ انھوں نے فرمایا:۔ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا (حق آیا، باطل دور ہوا۔ ہاں باطل جلنے ہی والا تھا) یہ سُن کر سارا مجمع ہنس پڑا لارڈ کچنر مصر میں رہ چکے تھے۔ عربی خوب جانتے تھے۔ دل ہی دل میں اس پھبتی کا مزہ لیا ہو گا۔

(۴) اس کانفرنس کی صدارت ہز ہائی نس سر آغا خاں نے قبول کرلی تھی لیکن آنے میں دیر ہو گئی تھی اور جلسہ شروع ہو گیا تھا۔ مولوی نذیر احمد کا لکچر ہو رہا تھا کہ سر آغا خاں آ گئے۔ وہ ایسے خوبصورت اور شاندار جوان تھے کہ اپنے جمال و وجاہت سے تمام جلسے پر چھا گئے۔ نواب محسن الملک نے مولانا کا سر آغا خاں سے تعارف کرایا ان کے ہاتھ میں لکچر تھا۔ تعارف ہوتے ہی لکچر میز پر رکھ دیا، اور بڑی متانت کے ساتھ آغا خاں سے خطاب کر کے فرمایا۔

آفاق ہا گردیدہ ام، مہر بتاں ورزیدہ ام
بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری

تمام جلسہ یہ شعر سن کر پھڑک گیا۔ سر آغا خاں بھی منہ پر رومال رکھ کر ہنستے رہے۔ حاضرین نے مولانا سے بار بار پڑھوا کر سنا۔

(۵) ہز مجسٹی امیر حبیب اللہ خاں بادشاہ کابل ۱۹۰۶ء میں ہندوستان آئے۔ عید الفطر ۱۳۲۴ھ کی نماز دہلی میں پڑھی، جمعہ کا روز تھا۔ نماز کے بعد دربار کیا اور مخصوص مشاہیر دہلی و ہند کو ملنے کے لئے بلایا۔ انہیں مولوی نذیر احمد بھی تھے۔ یہ جب امیر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے تو ان کو دیکھتے ہی عرب شاعر متنبی کا یہ شعر پڑھا[1]

عِيْدٌ وَعِيْدٌ وَعِيْدٌ صِرْنَ مُجْتَمِعَه　　　وَجْهُ الْحَبِيْبِ وَيَوْمُ الْعِيْدِ وَالْجُمُعَه

---

[1] تین عیدیں ساتھ جمع ہو گئی ہیں، روئے حبیب، یوم عید اور جمعہ۔

(۶) حیدر آباد میں ایک ریونیو بورڈ قائم ہوا تھا۔ اس کے تین ممبر تھے مولوی دلیل الدین خاں، منشی اکرام اللہ خاں اور مولوی نذیر احمد۔ ان میں سے مولوی دلیل الدین خاں بسیار خور مشہور تھے۔ منشی اکرام اللہ خاں شوقین مزاج آدمی تھے، اور مولوی نذیر احمد کی کفایت شعاری بخل کی حد تک پہنچی ہوئی تھی۔ ایک مرتبہ سر سالار جنگ نے مولوی نذیر احمد سے بورڈ کے ممبروں کا حال دریافت کیا۔ انھوں نے کہا: "ہم ارکان ثلثہ کُلُوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا[1] کے مصداق ہیں۔"

(۷) نواب محسن الملک عربی کے بڑے عالم نہ تھے۔ اور مولوی نذیر احمد اور نواب صاحب میں بڑی بے تکلفی تھی۔ ایک روز حیدر آباد میں "مولویت" کا ذکر آگیا۔ کسی نے نواب صاحب کو "مولوی مہدی علی" کہا۔ مولوی نذیر احمد بولے کہ "اگر مہدی علی مولوی ہیں، تو یہ سامنے کھڑا ہے یہ بھی مولوی چاند خاں ہے۔" چاند خاں ان کا قدیم ملازم تھا۔ لمبی داڑھی تھی اور صوم و صلوٰۃ کا پابند تھا۔

قوت تقریر

حیدر آباد سے آکر مولوی نذیر احمد صاحب نے تصنیف و تالیف کے علاوہ قومی کاموں میں بھی حصہ لینا شروع کیا۔ اس وقت معلوم ہوا کہ قدرت نے انکو غیر معمولی قوت بیان عطا کی ہے۔ چنانچہ پہلی ہی تقریر نے وہ اثر پیدا کیا اور مقبولیت حاصل کی کہ پھر ان کے بغیر کوئی مجلس گرم نہ ہوتی تھی۔ آواز، لہجہ، انداز بیان سب ایسے پائے تھے کہ ان کے جادو سے تمام جلسہ مسحور ہو جاتا تھا۔ اہل مجلس کو ہنسانا، رُلانا، ان کے اختیار میں تھا۔ چندے کی اپیل اس طرح کرتے تھے کہ حاضرین کی جیبیں جھاڑ لیتے تھے کتنا ہی بڑا مجمع ہو ان کو چیخنے چلانے کی ضرورت نہ تھی، صرف بلند آواز سے تقریر کرتے، اور دور تک پہنچ جاتی۔ اکثر اپنی

---

[1] یعنی کھاؤ، پیو اور بیجا صرف نہ کرو۔

تقریر پہلے سے چھپوا لیتا اور اس کی مطبوعہ کاپی ان کے ہاتھ میں ہوتی، لیکن تقریر میں تحریر کے پابند نہ رہتے کہتے چلے جاتے اور سامعین کو بھی اپنی رو میں بہالیجاتے. سننے والے نفس مضمون سے زیادہ ان کے لب ولہجہ، فصاحت بیان اور طلاقت لسان کے گردیدہ ہوتے تھے۔ اور ان کے لطائف و ظرائف کے دلدادہ تھے چنانچہ نہ مولانا اپنی رو میں اصل مضمون کی طرف لوٹ کر آتے نہ سامعین اسکے منتظر رہتے۔ وقت ختم ہو جاتا۔ مولانا بیٹھ جاتے اور حاضرین کو حسرت رہتی کہ

"وہ کہیں اور سنا کرے کوئی"

یہ بات ان کے ہم عصروں میں سے کسی میں نہ تھی۔ سرسید اور نواب محسن الملک اصول تقریر اور فن خطابت کے اعتبار سے مولوی نذیر احمد سے بہتر تھے۔ لیکن مجمع عام کے لئے ان کی تقریر ان سے زیادہ شاندار اور دلکش ہوتی تھی۔ اس پر طرہ یہ کہ سرسید اور محسن الملک دونوں سے زیادہ، بلکہ تمام مقرروں سے زیادہ مولوی نذیر احمد اپنی تقریر میں عربی کے موٹے موٹے الفاظ اور محاورے. عربی کے فقرے، اشعار اور آیتیں جا بجا استعمال کرتے تھے۔ پھر بھی ان کے طرز ادا جوش بیان و فصاحت زبان کے سبب سے تقریر کی دلکشی میں فرق نہ آتا تھا۔ اس طرح انھوں نے اپنی اس خداداد قابلیت سے بھی ملک و قوم کی بڑی خدمت کی۔ مولانا طبعاً بیباک اور عادۃً دریدہ دہن واقع ہوئے تھے۔ صاف گوئی میں کبھی حد سے گزر جاتے تھے، اور تلخ گوئی پر اُتر آتے تھے۔ لیکن سامعین ان کی خاطر سے اس کو بھی گوارا کر لیتے تھے۔

وفات مرنے سے چند مہینے پہلے علالت کا سلسلہ شروع ہوا۔ کمزوری بڑھتی گئی۔ باہر آنا جانا، ملنا جلنا چھوڑ دیا، اور علاج کی طرف بھی توجہ نہ کی۔ سمجھتے تھے کہ وقت آگیا ہے۔ آخر فالج ہوا، اور چار پانچ روز بعد ۳ مئی.

۱۹۱۲ء کو جمعہ کے روز رحلت کی۔ خاکسار مؤلف نے قرآن مجید سے تاریخ وفات نکالی۔ لَهُمْ فِيهَا نَعِيمٌ مُّقِيمٌ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا

۱۳۳۰ھ (سورہ توبہ رکوع ۳)

ڈپٹی نذیر احمد کی تصانیف | ڈپٹی نذیر احمد صاحب نے مولوی ذکاء اللہ صاحب کی کثرت تصانیف پر تعجب ظاہر کیا ہے۔ وہ خود بھی بسیار نویسی اور زود نویسی میں کسی سے کم نہ تھے۔ مختلف موضوعات پر کتابیں لکھی ہیں۔ جن میں بعض ان کی اوّلیات میں شامل ہیں کہ ان سے پہلے اس طرز یا اس موضوع پر کسی نے قلم نہ اٹھایا تھا مثلاً زنانہ لٹریچر اور اس میں ناول کا طرز۔ ترجمہ قرآن مجید کی سلاست اور تسلسل۔ الحقوق والفرائض میں مضامین قرآن کی ترتیب قانونی کتابوں کے ترجمے۔ یہ سب ان کی بے نظیر جودت طبع اور جدت فکر کے شاہد ہیں۔

ڈپٹی نذیر احمد صاحب کی تصانیف کا سلسلہ بڑے دلچسپ طریقے سے شروع ہوا ہے۔ اس کے متعلق وہ خود لکھتے ہیں:۔

"میں اپنے بچوں کے لئے ایسی کتابیں چاہتا تھا کہ وہ ان کو چاؤ سے پڑھیں۔ ڈھونڈھا، تلاش کیا، کہیں پتا نہ لگا۔ ناچار میں نے ہر ایک کے مناسب حال کتابیں بنانی شروع کیں۔ بڑی لڑکی کے لئے مرآۃ العروس۔ چھوٹی کے لئے منتخب الحکایات بشیر کے لئے چند پند۔ یہ نہیں کیا کہ کتابیں سالم لکھ لیں، تب پڑھانی شروع کیں۔ نہیں، بلکہ ہر ایک کتاب کے چار چار پانچ پانچ صفحے لکھ کر ہر ایک کے حوالے کر دئے مگر وہ بچوں کو ایسی بھائیں کہ جس کو پاؤ صفحے کے پڑھنے کی طاقت تھی وہ آدھے

لہ قرآن مجید کا املا خلدین بغیر الف ہے۔ میں نے ایک عدد کا اضافہ کرنے کیلئے الف سے خالدین لکھ دیا ہے

صفحے کے لئے، اور جس کو ایک صفحے کی استعداد تھی، وہ ورق کے لئے مستعمل تھا
جب دیکھو ایک نہ ایک متقاضی کہ میرا سبق کم رہ گیا ہے۔ میں اسی وقت قلم برداشتہ
لکھ دیا کرتا۔ یوں کتابوں کا پہلا گھان تیار ہوا۔"

(دربار ی لکچر ڈپٹی نذیر احمد)

اس کے بعد نذیر احمد صاحب ان کتابوں کی شہرت واشاعت کا قصہ بیان کرتے ہیں، وہ بھی عجیب اتفاق اور پُر لطف واقعہ ہے یعنی ڈپٹی صاحب کے چھوٹے صاحبزادہ بشیر الدین کی ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم سے کہیں ملاقات ہوگئی۔ انھوں نے لڑکے سے پوچھا کہ تم کیا پڑھتے ہو۔ بشیر الدین نے مذکورۂ بالا کتابوں کا نام بتایا۔ ڈائرکٹر صاحب نے تعجب سے کہا کہ اردو میں ان ناموں کی تو کوئی کتابیں نہیں ہیں۔ لڑکے نے کہا کہ یہ کتابیں ابا نے میرے اور آپا کے لئے لکھی ہیں۔ صاحب نے کہا اچھا دوڑ کر انھیں لے آؤ۔ بشیر دوڑا ہوا گھر گیا اور مرآۃ العروس، منتخب الحکایات اور چند پند کے قلمی نسخے لے آیا۔ ڈائرکٹر صاحب نے ان کتابوں کو دیکھا اور مرآۃ العروس کو بہت پسند کیا اور گورنمنٹ سے اس پر انعام دئے جانے کی سفارش کی۔ چنانچہ اس پر ایک ہزار روپیہ نقد اور ایک قیمتی گھڑی انعام میں ملی۔ اس کے بعد تصانیف کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ ڈپٹی نذیر احمد صاحب کی تصانیف حسب ذیل ہیں:۔

(۱) ناول (زنانہ لٹریچر)

(۱) مرآۃ العروس مطبوعہ ۱۸۶۹ء

(۲) بنات النعش (مرآۃ العروس کا دوسرا حصہ) جس میں لڑکیوں کو دستکاری اور علمی زندگی کی ترغیب دی ہے۔ مطبوعہ ۱۸۷۲ء

(۳) توبۃ النصوح جس میں سچی اسلامی زندگی کی تعلیم ہے۔ اس پر بھی ایک ہزار روپیہ انعام ملا۔ مطبوعہ ۱۸۷۷ء

(۴) محصنات یا فسانۂ مبتلا مطبوعہ ۱۸۸۵ء

(۵) ابن الوقت مطبوعہ ۱۸۸۸ء۔ غدر کے زمانے کا قصہ۔ انگریزی اور ہندوستانی واسلامی معاشرت کا مقابلہ

(۶) رویائے صادقہ۔ دہلی کے قدیم شریف خاندان کی زندگی۔

(۷) ایامی۔ جس میں بیوہ عورتوں کے نکاح ثانی کی ضرورت و فوائد بیان کئے ہیں۔

(۲) اخلاق

(۱) منتخب الحکایات۔ (۲) چند پند۔ (۳) موعظہ حسنہ

(۳) مذہب

(۱) ترجمہ قرآن مجید

(۲) الحقوق والفرائض۔ ۳ حصے ۱۹۰۶ء میں لکھی۔

(۳) الاجتہاد۔ عقائد اسلامی کا عقلی ثبوت ۱۹۰۸ء ۱۳۲۶ھ میں لکھی

(۴) امہات الامہ۔ ازواج مطہرات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات

(۵) ادعیۃ القرآن۔ اس میں قرآن مجید کی تمام دعائیں یک جا کر دی ہیں اور ان پر مفید حاشیے لکھے ہیں۔

(۴) منطق

(۱) مبادی الحکمت۔ اس رسالے میں علم منطق کی تعلیم کا جدید و دلچسپ طریقہ اختیار کیا ہے، جو منطق کی مروجہ درسی کتابوں سے مختلف ہے۔ مثالیں بھی نئی نئی تلاش کی ہیں۔ جن سے کتاب کی دلچسپی میں اضافہ ہو گیا ہے

مصنفہ ۱۸۷۱ء ۱۲۸۸ھ

---

(۵) علم ہیئت

(۱) سموات۔ اس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ انگریزی کتاب کا ترجمہ ہے۔ گورنمنٹ نے اس پر ایک ہزار روپیہ انعام دیا۔ ۱۸۷۶ء / ۱۲۹۳ھ میں ترجمہ کی۔

(۶) قواعد

(۱) مایغنیک فی الصرف (۲) صرف صغیر۔ عربی قواعد کے متعلق لکھیں۔

(۷) متفرق

(۱) رسم الخط (۲) نصاب خسرو (۳) افسانۂ غدر (۴) مجموعۂ لکچر (۵) نظم بے نظیر نذیر۔ (ان کی نظموں کا مجموعہ)

قانونی کتابوں کے ترجمے ان کے علاوہ ہیں۔ آخر عمر میں مطالب القرآن کے نام سے ایک ضخیم تصنیف کا آغاز کیا تھا لیکن تمام نہ کر سکے۔

ڈپٹی نذیر احمد کا طرز تحریر

علامہ آزاد کی طرح مولانا نذیر احمد بھی صاحب طرز خاص ہیں، اور ان کا طرز تحریر بھی سب سے الگ اور نرالا ہے کہ چند سطروں سے پتا چل جاتا ہے کہ یہ ڈپٹی صاحب کی تحریر ہے۔ خالص دہلی کی زبان اور محاورے استعمال کرتے ہیں۔ زنانہ ناولوں میں شریف مستورات کی بہترین زبان اور انداز اختیار کیا ہے۔ طرز بیان نہایت صاف، واضح اور زوردار ہوتا ہے۔ روانی اور بے ساختگی ہر جگہ نمایاں ہے۔ بات کو سمجھانے کے نئے نئے طریقے پیدا کرتے ہیں۔ اگرچہ آزاد کی سی رنگین عبارت نہیں لکھتے لیکن حسب موقع کبھی استعارہ و تشبیہ سے بھی کام لیتے ہیں۔ ان کے اسلوب میں ایک اجتماع اضداد عجیب ہے کہ ایک ہی تحریر میں کہیں نہایت مغلق و گراں عربی کے الفاظ و تراکیب و محاورات لکھتے ہیں اور دوسری جگہ ٹھیٹ ہندی کے الفاظ لکھ دیتے ہیں۔ اسی کے ساتھ ہی خاص کر لکچروں میں انگریزی کے الفاظ اور محاورے بھی جا بجا آتے

ہیں، اگرچہ یہ اکثر بیجا ہوتے ہیں۔

ڈپٹی نذیر احمد کے طرز تحریر کی ایک نمایاں خصوصیت، جس میں ان کا کوئی ہم عصر شریک نہیں ہے، ان کی ظرافت ہے۔ ظریفانہ رنگ کا ناولوں اور تقریروں میں زیادہ موقع تھا۔ وہیں ہے اور بہت دلچسپ و خوشگوار ہے۔ ظرافت کو حدِ اعتدال سے بڑھنے نہیں دیتے۔ اور صحیح موقع پر صرف کرتے ہیں۔

طرز نذیر احمد کی بے اعتدالی

ڈپٹی نذیر احمد بڑے ذہین و طبّاع تھے۔ بچپن سے طالب علمی شروع کر دی تھی۔ بلا کا حافظہ پایا تھا۔ اخذ کرنے اور محفوظ رکھنے کی عادت تھی۔ زبان و محاورہ اور ادب و انشا سے فطری مناسبت و دلچسپی تھی، اس کے ساتھ ہی چونکہ اصلی دہلوی نہ تھے اور دہلی کو وطن بنایا تھا، اس لئے دہلی کی زبان کو اہل زبان کی طرح حاصل کرنا چاہتے تھے۔ لڑکپن اور آغاز شباب ہی میں پہلے طالب علمی اور پھر شادی کے سبب سے دہلی کے شریف خاندانوں میں آمد و رفت اور ارتباط پیدا ہو گیا۔ ان کی ہمہ گیر طبیعت نے زبان دہلی کے تمام لوازم و محاسن بہت جلد حاصل کر لئے پھر تصانیف کے سلسلے میں اتفاق سے سب سے پہلے اپنی لڑکیوں کے لئے زنانہ فسانے لکھے، اور ان میں ہو بہو، زنانہ زبان لکھی۔ یہ زنانہ لٹریچر عرصہ تک پے در پے تیار کرتے رہے۔ ہندی کی چندی اور بال کی کھال نکالنے کا طبعاً شوق تھا۔ لڑکیوں کی تعلیم و تربیت کے لئے ہر کتاب میں ایک ایک بات کو نہایت تفصیل و وضاحت کے ساتھ بیان کرنے کی ضرورت تھی۔

ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ ڈپٹی صاحب کی طبیعت و تحریر دونوں میں صاف بیانی، گھریلو روزمرہ، زنانہ انداز بیان اور ٹھیٹ زبان راسخ ہو گئی۔ اور رفتہ رفتہ یہ احساس جاتا رہا کہ یہ طرز تحریر ہر تصنیف کے لئے موزوں نہیں ہے۔ چنانچہ اس کے بعد جب انھوں نے قرآن مجید کا ترجمہ کیا۔ مذہبی کتابیں، سیرت و

سوانح مرتب کئے. تو ان میں بھی عامیانہ بول چال، محاورے کہاوتیں لکھ دیں. اور ایسا اسلوب بیان اختیار کیا جو کہیں اُس موضوع و فن کے مناسب نہ رہا، اور کہیں بزرگان دین، نبی کریمؐ، اصحاب کرام، اہل بیت اطہار (رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین) کی شان کے خلاف ہو گیا. اس کی چند مثالیں یہ ہیں:-

(۱) الحقوق والفرائض میں سب سے پہلا فقرہ یہ لکھتے ہیں:-

"کسی نے کیا اچھی تُکی ہوئی، باون تولے پاؤ رتی بات کہی ہے کہ:-

مَنْ عَرَفَ نَفْسَهُ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهُ (جس نے اپنے آپ کو پہچانا تو اس نے اپنے پروردگار ہی کو پہچانا. یعنی اپنے نفس کی معرفت خدا کی معرفت کی دلیل ہے."

اس اقتباس کا پہلا جملہ حقوق و فرائض جیسے سنجیدہ موضوع کے لئے مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے لیکن ہمارے نزدیک زیادہ قابل اعتراض نہیں ہے اس کی یہ تاویل ہو سکتی ہے کہ ڈپٹی نذیر احمد نے اس تمام کتاب میں عقائد و اعمال، حقوق اللہ و حقوق العباد اپنے اسی بے تکلف اور زبان و محاورہ میں لکھے ہیں، جس میں اسطرح کے مضامین زنانہ ناولوں میں فسانہ کے بڑے بوڑھے مردوں اور عورتوں کی زبانی لڑکوں لڑکیوں کے لئے بیان کئے ہیں. یہ انداز متانت موضوع کے لحاظ سے درست نہ سہی، لیکن اگر کوئی شخص ساری کتاب اسی رنگ میں لکھے تو اعتراض ہلکا ہو جاتا ہے. بہر حال فقرۂ مندرجہ میں کوئی سوء ادب نہیں. لیکن ڈپٹی صاحب کو یہ طرز بے محل اختیار کرنے میں بھی باک نہ تھا. مثلاً

(۲) الاجتہاد میں تذکرۂ ہجرت میں لکھتے ہیں:-

"خدا کا کرنا، پیغمبر صاحب کو عین وقت پر معلوم ہو گیا. اندھیرے میں چپکے گئے."

(۳) اسی کتاب میں پھر لکھتے ہیں:۔

"اب تم ان حالات حقۂ صحیحہ کو حاضر فی الذہن رکھ کر ٹھنڈے دل سے انصاف سے تجویز کرو کہ پیغمبر صاحب جھوٹا دعویٰ رسالت کرکے کسی مفاد کی توقع کر سکتے تھے۔ اسی دعوے نے تو ان کی یہ گت بنوائی تھی کہ ؎

جھڑکی تو مدتوں سے مسادات ہو گئی گالی کبھو نہ دی تھی سو اب بات ہو گئی

باقی ہے مار کھانی تو سن لوگے ایک دن اسکی گلی میں اپنی یہ اوقات ہو گئی

اسی دعوے نے ان کو شہر بدر کرایا" (الاجتہاد ص۱۳۳)

(۴) امہات الامۃ میں اخلاقِ نبی کریم اور اسباب نکاح کے تذکرے میں ہجرت کے متعلق یہ فقرہ لکھتے ہیں۔

"..... تقویت اور حمایت اور حفاظت نہ ہوتی تو رسالت کی بیل ایک گھڑی بھی منڈھے چڑھنے والی نہ تھی۔ مگر صداقت کے بھروسے پر پیغمبر صاحب تیرہ برس دشمنوں کے نرغے میں چھاتی پر پڑے مونگ دلوایا کئے۔ یہاں تک کہ آخر کو پائے ثبات جگہ سے اُکھڑ گئے اور بھاگ کر مدینے جا پناہ لی"۔

اس بے ادبی و گستاخی کی کوئی تاویل نہیں ہو سکتی یہ سٹک گئے "گت بنوائی تھی" "چھاتی پر پڑے مونگ دلوایا کئے" جیسے محاوروں کا اور اس قطعے کے چسپاں کرنے کا یہ محل نہ تھا۔ لیکن ڈپٹی نذیر احمد کے ذہن سے فرقِ مراتب اٹھ گیا تھا۔ یہ بات نہ تھی کہ ان کو ادب ملحوظ نہ تھا یا قصداً بے حرمتی کی۔ بلکہ اپنے طرزِ تحریر کی عادت کے سبب سے ان محاوروں کو ایسے موقع پر بھی وہ ادب و احترام کے منافی نہ سمجھے تھے، اور یہی ان کے نفس و عقل کا دھوکا تھا۔ ان رکیک اور سوقیانہ الفاظ سے اس ذاتِ گرامی کو ارفع و اعلیٰ، اقدس و اطہر سمجھنا چاہئے تھا۔

ہر سخن موقع و ہر نکتہ مقامے دارد

اس طرح کے الفاظ، محاورے اور امثال جب ڈپٹی صاحب نے ناولوں کے فرضی اشخاص کے یا اپنے متعلق لکھے ہیں تو ناموزوں اور ناگوار نہیں معلوم ہوتے مثلاً ایک لکچر کے آغاز میں اپنا حال بیان کرتے ہیں :-

"نہ مجھ کو شعر گوئی کا شوق ہے اور سلیقہ، مگر وہ جو کہتے ہیں کہ رانڈ تو بیٹھا بیٹھنا چاہتی ہے مگر رنڈوے نہیں بیٹھنے دیتے۔ جب جب کوئی صاحب مجھے لکچر دینے بلاتے ہیں، اور بلانے والے تو بہت ہیں، اس لئے کہ انجمنوں اور سالانہ جلسوں اور لکچروں کا دزبہ کھل پڑا ہے۔ مگر میں اپنے لکچروں کی ہوا نہیں اکھڑنے دیتا کہ گلیوں گلیوں کام بڑھئی پکارتا پڑا پھروں"

(لکچر ایجوکیشنل کانفرنس ۱۹۰۳ء بمقام ریاست رامپور)

یا مثلاً الاجتہاد میں اپنے آپ کو خطاب کر کے لکھتے ہیں :-

"تم اپنی ہستی کو کیوں بھولتے ہو، تو گدھی کمہار کی تجھے رام سے کو تھ کہاں راجہ بھوج، کہاں بھوا تیلی"

لیکن جب ایسی باتیں خدا اور رسولؐ کی زبان سے نکلواتے ہیں تو نہایت نازیبا ہو جاتی ہیں۔ جیسے توبۃ النصوح میں اللہ تعالیٰ کا قول نصوح کے لئے لکھا ہے :-

"نہ خر نا شخص کہ ہم تو دیں لزن، وہ کہے میری آنکھیں پھوٹیں"

اسی طرح کی بے اعتدالیاں قرآن مجید کے ترجمہ میں کی ہیں۔ اس طرز تحریر میں ایک ذرا سی بات تھی جس کو ملحوظ رکھنے سے یہ تمام تصنیفات بے عیب ہو جاتیں، اور جس کا خیال نہ کرنے سے یہ اعتراضات واقع ہوئے۔ ڈپٹی نذیر احمد اپنی ہر نوع کے موضوع کی کتاب اپنے مخصوص بے تکلف اسلوب میں لکھنا چاہتے تھے۔ اس اصول پر اعتراض سہی، لیکن بے اصولی کے علاوہ کوئی اعتراض نہ ہو سکتا اگر احترام و ادب کے موقع پر صرف سادگی و صفائی کو قائم رکھتے، ابتذال و سوقیت

نہ برتتے۔ اور خدا و رسول اور بزرگان دین کے متعلق رکیک محاورے نہ لکھتے۔
انھوں نے ہر جگہ اور ہر موقع پر ایسے الفاظ استعمال نہیں کئے ہیں۔ نفقرے کے
نفقرے، صفحے کے صفحے بزرگوں کے تذکرے میں ایسے بھی لکھے ہیں جن میں قابل اعتراض
زبان نہیں ہے تو ممکن و سہل تھا کہ وہاں بھی نہ ہوتی جہاں ہے۔ اس سے ان کے
اسلوب خصوصی میں کوئی فرق نہ آتا۔ لیکن بات وہی ہے کہ ڈپٹی صاحب کو
اس کا احساس ہی نہ رہا تھا۔

دوسرا پہلو بے اعتدالی کا یہ ہے کہ ڈپٹی نذیر احمد انگریزی کے الفاظ بڑی
کثرت سے بالکل بے ضرورت استعمال کرتے ہیں۔ یہ بات لکچروں میں زیادہ ہے
اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ طریقہ بھی انھوں نے سامعین کی دلچسپی اور دل لگی کے لئے
اختیار کیا تھا۔ اگرچہ ان کی تقریر اس کے بغیر بھی ہمیشہ دلکش ہوتی تھی۔ انگریزی الفاظ
کا استعمال سب سے پہلے سر سید نے شروع کیا تھا، لیکن ان کے ہاں ناگوار کثرت
نہ تھی۔ مولانا حالی نے بہت زیادہ استعمال کئے، اور مولانا نذیر احمد نے تو انتہا
کر دی۔ سر سید کچھ شُدبُد انگریزی جانتے تھے۔ حالی اتنی بھی نہیں۔ نذیر احمد اچھے
خاصے ماہر تھے۔ ان کو اس نئی زبان سے نئی دلچسپی پیدا ہوئی تھی، اسکی اشاعت
و ترغیب ان کے کانفرنسی لکچروں کا مقصود تھا انگریزوں اور انگریزی دانوں
کو خوش کرنے کا بھی شوق تھا۔ غرض انھوں نے اپنے ابتدائی لکچروں ہی سے
انگریزی الفاظ کا استعمال شروع کر دیا۔ اور پھر اس کو اتنا بڑھایا کہ مفرد الفاظ
کے علاوہ، مرکبات، محاورے، جملے، ضرب الامثال بھی بے تکلف بولنے لگے
یہ ذکر بے ضرورت، بلاوجہ اور غیر مشہور الفاظ کا ہے۔ مثلاً۔

ا۔ محمڈن کالج کو انیٹی[1] یا کوالیٹی[2] کسی اعتبار سے بھی مسلمانوں کے درد کی

---

[1] کمیّت ، [2] کیفیت

کافی دوا نہیں۔

۲۔ یہ ایسا زبردست ثبوت ان کی فیوز میں ہے۔

۳۔ جن صفتوں کے مجموعے کا نام اسلام ہے نیچر کی اس بات کے متقضی ہیں

۴۔ اس امام کے ہاتھ پر فارکلی بیعت کرد۔

۵۔ انگریزوں کی طرح کی ہائی لائف نہ رکھیں

۶۔ انگلشن شیبش کا منہ چڑانے لگے ہیں۔

۷۔۔۔۔۔ مقلد ہیں، غیر مقلد ہیں، اور دی لاسٹ بٹ ناٹ دی لیسٹ بڑے

غل غپاڑے بڑے جوش و خروش کے نئی قسم کے مسلمان نیچری ہیں۔

(جملہ اقتباسات از لکچر ایجوکیشنل کانگریس منعقدہ دسمبر ۱۸۸۹ء

بمقام علی گڑھ)

۸۔ اپنے تئیں خیر الاخلاف بعد الاسلاف وردھی آف دیر فورفادرز بنانے

کی کوشش کریں

۹۔ آڈینس قرآن سے اُوور ڈوسڈ ہو گیا ہے۔ (لکچر ۱۹۰۰ء بمقام رامپور)

اسی طرح عربی کے الفاظ و مرکبات بالکل بے ضرورت اپنے شوق و عادت

لہ حمایت   ۲ طبعاً یا فطری طور پر   ۳ حسب آئین

۴۔ اونچی شاندار زندگی   ۵ انگریزی طریقے اور عادتیں

۶۔ سب سے آخری اگرچہ سب سے کم وقعت نہیں۔

۷۔ یہ انگریزی پہلی عربی کی مترادف ہے۔ یعنی اپنے اسلاف کی شان کے لائق

۸ مجمع حاضرین   ۹ وہ مریض جس کو مقدار سے زیادہ دوا پلادی گئی ہو

یعنی حاضرین جلسہ کو ضرورت سے زیادہ قرآن سنایا گیا ہے۔

کے سبب سے بے تکلف لکھتے ہیں۔ آیات قرآنی یا عربی امثال واشعار کا ذکر نہیں۔ وہ تو ڈپٹی صاحب کی تحریر کا خاص جوہر ہیں۔ بلکہ وہ عربی کے الفاظ و محاورات اجزائے جملہ کے طور پر استعمال کرتے ہیں کہ بغیر ان کے جملہ پورا نہیں ہوتا۔ اور سمجھ میں نہیں آتا۔ مثلاً

۱۔ جس کے افراد کے دلوں میں وللاکثر حکم الکل[1] منافست کی ذراسی گدگدی بھی نہو، میں نہیں سمجھتا کہ ایسی قوم کا کوئی شخص بھی کسی بات پر بھی فخر کرسکتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ ہم مسلمانوں میں بالنسبۃ الی اقوام اُخر[2] شخصی عزتیں بہت کم ہیں، مگر ہیں۔

۲۔ پھر اس طرح کا بڑھاوا آگیا ہے کہ اس زمانے کے اسلام اور خوشدلی میں مانعۃ الجمع کی سی نسبت قائم ہوگئی ہے بعضٌ وقلیلٌ ماھُم[3] جن کو خوش ہونے کا موقع ہے، خدا کا فرمودہ اِنَّمَا المُؤمِنُونَ اِخْوَۃٌ ان کو بھی چین سے نہیں رہنے دیتا۔

۳۔ یا ایک چھوٹا سا ضلع کیفَ مَا اتّفقَ[4] اختیار کرکے اور تحقیقات کرکے ایسے لوگوں کی فہرست بنائے جو صاحب زکوٰۃ ہیں۔ (جملہ اقتباسات از لکچر ۱۸۸۹ء)

تیسری بات یہ کہ ڈپٹی صاحب مضمون کی تکرار بہت کرتے ہیں، اور بات کو پیچ دیکر فقرے کو بہت طویل کر دیتے ہیں۔ یہ انداز خطیبانہ ہے۔ خطبوں اور لکچروں کے لئے موزوں ہو سکتا لیکن ڈپٹی صاحب اپنی ہر تصنیف میں یہ طرز برتتے ہیں۔

چوتھے: ہر قسم کی تصانیف میں محاورات و امثال کی کثرت کے سبب سے

---

[1] اور اکثر کے لئے کُل کا حکم ہے۔

[2] دوسری اقوام کے مقابلے میں

[3] بعض لوگ اور وہ تھوڑے ہیں

[4] جو کوئی ہو۔ یعنی کوئی ضلع ہو۔

متانت و وقار قائم نہیں رہتا۔ یہ چیزیں جہاں شوخی و بے ادبی کی حد تک نہیں پہنچتیں، وہاں بھی عبارت و اسلوب کا وقار کھو دیتی ہیں۔ یہ انداز روزمرہ کی بے تکلف گفتگو کا ہے، اس لئے ناولوں کے علاوہ کسی کتاب میں اختیار کرنے کا نہ تھا حد یہ ہے کہ ترجمہ قرآن بھی کہیں کہیں پایۂ متانت سے گر گیا ہے۔

لیکن جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں، اس طرزِ عبارت پر ایک دوسرے پہلو سے بھی نظر ڈالی جا سکتی ہے، اور وہی اس کی تاویل ہے۔ وہ یہ کہ نذیر احمد صاحب نے دینی کتابیں مورخ و سیرت نگار اور مفتی و مفسر کی حیثیت سے نہیں لکھیں بلکہ ادیب و انشا پرداز کی حیثیت کو پیشِ نظر رکھا ہے۔ اس لئے ان کے ناول و قصص اور ترجمہ و سیرت سب کا ایک رنگ بیان ہے۔ یہی توجیہ و معذرت مولوی محمد حسین آزاد کے طرزِ تحریر کے لئے پیش کی جا سکتی ہے۔ لیکن اس صورت میں دونوں صاحبوں کا مرتبہ صرف زباندان و انشا پرداز کا رہ جاتا ہے۔ مورخ و محقق کی شان باقی نہیں رہتی۔

ڈپٹی نذیر احمد کی اوّلیات اور مرتبہ

(۱) ڈپٹی صاحب سے پہلے کا تمام اردو لٹریچر ہمارے سامنے ہے۔ عورتوں کی تعلیم و تربیت کی کتابیں مفقود ہیں۔ نذیر احمد پہلے مصنف ہیں جنہوں نے زنانہ لٹریچر اس اہتمام و کثرت کے ساتھ مہیا کیا۔ یہ کتابیں اپنی جامعیت و حسن ترتیب میں اردو زبان اور نذیر احمد کی اوّلیات میں داخل ہیں۔ اور نصف صدی سے زیادہ گزرنے کے بعد بھی آج تک بے مثال و ناگزیر ہیں۔ نذیر احمد کے بعد صرف راشد الخیری نے قدیم تہذیب و معاشرت کو اپنی زنانہ تصانیف میں زندہ رکھا ہے۔ اب عورتوں کی دنیا ہی بدل گئی ہے۔

(۲) اردو کے پہلے ناول نگار ڈپٹی صاحب ہیں۔ بعید از قیاس داستانوں کی

جگہ اصلی واقعات اور صحیح معاشرت کو قصہ کی صورت میں پیش کرنے کا انہی کے سر سہرا ہے۔ اردو کے دوسرے ناول نگار پنڈت رتن ناتھ سرشار ہیں۔ ان کا فسانہ آزاد دسمبر ۱۸۷۸ء سے اودھ اخبار میں بالاقساط شائع ہونا شروع ہوا ہے اور ۱۸۸۰ء میں بصورت کتاب چھپا ہے۔ لیکن نذیر احمد صاحب کا پہلا ناول مرآۃ العروس فسانۂ آزاد سے دس برس پہلے ۱۸۶۹ء میں شائع ہو چکا تھا۔ اور دوسرا ناول بنات النعش بھی سرشار کے فسانہ سے پہلے ۱۸۷۲ء میں شایع ہوا تھا

(۳) ترجمۂ قرآن مجید ایسی سلاست، شگفتگی اور تسلسل کے ساتھ نذیر احمد کی ایجاد ہے۔ اور ترجمہ کو مقابل کے صفحے پر چھاپنا دلچسپ جدت۔ اب صرف ترجمہ کے صفحے کے صفحے بے تکلف پڑھتے چلے جائیے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک مسلسل مربوط کتاب پڑھ رہے ہیں۔ یہ بات کسی قدیم ترجمہ میں نہ تھی۔ بعد کے ہر ترجمہ میں ہے اور یہ نذیر احمد صاحب کا فیضان ہے۔

(۴) عقائد و مسائل اسلامی کا استنباط و ترتیب قرآن و حدیث سے جس طرح نذیر احمد صاحب نے الحقوق وغیرہ میں کیا ہے، یہ بھی انھیں کی اختراع ہے بعد کو اس کی بھی تقلید ہوئی اور ہو رہی ہے۔

(۵) زبان و انشا پردازی کا جو لطف و مزہ ان کی تمام تصانیف میں ہے وہ ڈپٹی صاحب کا انفرادی و امتیازی رنگ ہے۔ اور شوخی و ظرافت کے وہ تنہا مالک ہیں۔

اس لئے ڈپٹی نذیر احمد بھی موجد و صاحب طرز کا مرتبہ رکھتے ہیں۔ اور ان کے احسانات اردو زبان و ادب پر نہایت گراں بہا ہیں۔

نمونۂ تصانیف

(۱) **مرآۃ العروس**، نذیر احمد کا پہلا مکمل زنانہ ناول ہے دہلی کے شریف خاندان کی معاشرت کا ہوبہو نقشہ کھینچا ہے۔ یہ فسانہ

اس قدر مشہور و مقبول ہوا کہ اس کے افراد قصہ اصغری، اکبری اور ماما عظمت آج تک زبان زد ہیں اور مثال میں پیش کئے جاتے ہیں۔

مرآۃ العروس کی مقبولیت کا ذکر ڈپٹی صاحب نے بنات النعش کے دیباچے میں کیا ہے:۔

"مرآۃ العروس کو پہلے پہل چھپے ہوئے اب تیسرا برس ہے، اور جہاں تک مجھ کو معلوم ہوا ہے اسی دو سوا دو برس میں اس کی کوئی آٹھ نو بلکہ دس ہزار جلدیں فروخت ہو چکی ہیں، اور ہر سمت سے طلب اور ہر طرف سے مانگ چلی آرہی ہے ایک بابو صاحب اپنی بنگالی زبان میں ترجمہ کر رہے ہیں۔ ایک پنڈت جی مہاراج بھاکا میں۔ اور نہ میری استدعا و فرمائش سے بلکہ اپنی آرزو و خواہش سے پسند و قبول کی اس سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہو گی۔"

ان فسانوں میں مکالمہ کا طرز تحریر قدیم داستانوں سے جداگانہ ہے اور نذیر احمد صاحب نے اس کو پہلی مرتبہ اردو میں پیدا کیا ہے۔ یہ اسلوب انگریزی میں ناول کا نہیں بلکہ ڈرامے کا ہے کہ کسی فرد قصہ کا نام آغاز سطر میں لکھ کر اس کے آگے اس کی گفتگو لکھی جائے۔ انگریزی ناول کا طرز مکالمہ نذیر احمد صاحب کے زمانے میں انگریزی زبان و ادب سے ناآشنا لوگوں میں مقبول ہونا دشوار تھا۔ اس لئے ڈرامے کا انداز اختیار کرنا مناسب تھا۔ یہ چیز ایسی مقبول ہوئی کہ شرر و سرشار سے لیکر اب تک اسی کی تقلید ہو رہی ہے۔ بیسویں صدی کے ادب جدید میں مختصر فسانے اور بعض ناول انگریزی مکالمے کے طرز میں البتہ لکھے گئے ہیں۔ اور اب عادت کے سبب سے نامانوس نہیں رہا۔

نذیر احمد صاحب کی ایک وضع خاص یہ بھی ہے کہ ناولوں میں طویل اخلاقی وعظ و تقریر ضرور داخل کرتے ہیں۔ مرآۃ العروس بھی اس سے خالی نہیں۔ اس کا

مختصر نمونہ یہ ہے:-

"لڑکوں اور لڑکیوں کو ضرور سوچنا چاہئے کہ ماں باپ سے الگ ہوئے پیچھے
ان کی زندگی کیونکر گذرے گی دنیا میں بہت بھاری بوجھ مردوں کے سر پہ ہے
دنیا میں کھانا کپڑا اور روزمرہ کے خرچ کی سب چیزیں روپیہ سے حاصل ہوتی
ہیں اور یہ سب کھڑاگ روپیہ کا ہے۔ عورتوں کو بڑی خوشی کی بات ہے کہ اکثر
کمانے اور روپیہ پیدا کرنے کی محنت سے محفوظ رہتی ہیں دیکھو مرد کیسی کیسی
سخت محنت کرتے ہیں کوئی بھاری بوجھ سر پر اٹھاتا ہے کوئی لکڑی ڈھوتا ہے
سنار۔ لہار۔ ٹھٹھیرا۔ کسیرا۔ کندلہ گر۔ زرکوب۔ دبکیہ۔ تارکش۔ ملمع ساز۔ جڑیا
سلمہ ستارے والا۔ بٹیہ۔ بدرساز۔ مینا ساز۔ قلعی گر۔ سادہ کار۔ صیقل گر۔
آئینہ ساز۔ زردوز۔ منہیار۔ نعلبند۔ نگینہ ساز۔ کامدانی والا۔ سان گر۔ نیاریا۔
ڈھلیا۔ بڑھئی۔ خرادی۔ ناریل والا۔ کنگھی ساز۔ بنس پھوڑ۔ کاغذی۔ جلاہہ
رفوگر۔ رنگریز۔ چھیپی۔ درزی۔ دستار بند۔ علاقہ بند۔ نیچہ بند۔ موچی۔ جہرگن
سنگتراش۔ حکاک۔ معمار۔ دیگر۔ کمہار۔ حلوائی۔ تیلی۔ تنبولی۔ رنگساز۔ گندھی
وغیرہ جتنے پیشہ والے ہیں سب کے کاموں میں برابر درجے کی تکلیف ہے۔ اور
یہ تمام تکلیف روپیہ کمانے کے واسطے مرد سہتے اور اٹھاتے ہیں لیکن اس بات
سے یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ عورتوں سے سوائے کھانے اور سو رہنے کے کوئی کام
دنیا کا متعلق نہیں ہے۔ بلکہ خانہ داری کے تمام کام عورتیں کرتی ہیں مرد اپنی
کمائی عورتوں کے آگے لا کر رکھ دیتے ہیں اور عورتیں اپنی عقل سے اس کو ایسے بندو بست
اور سلیقے کے ساتھ اٹھاتی ہیں کہ آرام کے سوائے عزت اور نام پر حرف نہیں
آنے پاتا۔ بس اگر غور سے دیکھو تو دنیا کی گاڑی جب تک ایک پہیہ مرد کا اور دوسرا
پہیہ عورت کا نہ ہو چل نہیں سکتی مردوں کو روپیہ کمانے کے بعد اتنا وقت

نہیں بچتا کہ اس کو گھر کے چھوٹے کاموں میں صرف کریں۔ اے لڑکو وہ بات سیکھو
کہ مرد ہو کر تمہارے کام آئے اور اے لڑکیو! وہ ہنر حاصل کرو کہ عورت ہونے
پر تم کو اُس سے خوشی اور فائدہ ہو بیشک عورت کو خدا نے مرد کی نسبت کسی قدر
کمزور پیدا کیا ہے لیکن ہاتھ پاؤں کان۔ آنکھ عقل۔ سمجھ۔ یاد سب مرد کے برابر
عورت کو دیتے ہیں لڑکے اُنھیں چیزوں سے کام لے کر عالم۔ حافظ۔ حکیم۔ کاریگر۔
دستکار ہر فن میں طاق اور ہر ہنر میں مشاق ہو جاتے ہیں لڑکیاں اپنا وقت
گڑیاں کھیلنے اور کہانیاں سننے میں کھوتی ہیں بے ہنر رہتی ہیں اور جن عورتوں
نے وقت کی قدر پہچانی اور اس کو کام کی باتوں میں لگایا وہ مردوں کی طرح
دنیا میں نامور اور مشہور ہوئی ہیں۔ جیسے نور جہاں بیگم۔ زیب النسا بیگم یا ان
دنوں نواب سکندر بیگم یا ملکہ وکٹوریہ یہ وہ عورتیں ہیں جنھوں نے ایک
چھوٹے سے گھر اور کنبے کا نہیں بلکہ ملک اور جہاں کا بندوبست کیا۔"

(۲) بنات النعش، اس کا موضوع خود مصنف اسکے دیباچے میں
بتاتے ہیں:۔

"یہ کتاب اسی مرآۃ العروس کا گویا دوسرا حصہ ہے۔ وہی بولی ہے، وہی
طرز ہے۔ مرآۃ العروس سے تعلیم اخلاق و خانہ داری مقصود تھی۔ اس سے وہ
بھی ہے مگر ضمناً۔ اور معلومات علمی خاصتہً!"

چنانچہ بنات النعش میں حساب کی دلچسپ باتیں، تاریخ، جغرافیہ، علم ہیئت
جسمانی ریاضت، حفظان صحت وغیرہ مختلف معلومات فراہم کی ہیں اور فسانہ
کے اندر اشخاص کے دورانِ گفتگو میں سمجھائی ہیں۔ مثلاً

(الف) حسن آرا۔ خیر اب وہ زمین کا گول ہونا ثابت کیجئے۔ کیا آپ
اس بات کو ٹالنا چاہتی ہیں۔

محمودہ۔ ہاں تو۔ یہ انگنائی پچاس گز لمبی ہے اس سرے سے اُس سرے
تک پینتیس یعنی پانچ کم دو بیسی پھیرے کرو تو ایک میل ہو اور دو
میل کا ایک کوس ہوتا ہے۔

حسن آرا۔ او فو اتنا بڑا میل اور اتنا بڑا کوس ہوتا ہے۔

محمودہ۔ اب قطب صاحب کی لاٹ کو فرمایئے کہ کے ہزار کوس لمبی ہے

حسن آرا۔ میں تو جانتی ہوں کہ اس حساب سے پوری میل بھی لمبی نہ ہوگی

محمودہ۔ بیشک میل کیا میل کا دسواں حصّہ بھی نہیں اور زمین تباؤ ل
میلوں کے حساب کتنی بڑی ہے چوبیس ہزار میل اس کا دَور ہے
مرَدوں میں بارہ کوس کی منزل مقرر ہے یعنی مرد لوگ جو سفر کرتے
ہیں تو بارہ کوس روز چلے جاتے ہیں اور واقع میں آرام کے ساتھ
سفر کیا جائے تو بارہ کوس دن بھر کے چلنے کو بہت ہے اس حساب سے
اگر کوئی آدمی ناک کی سیدھ چلنا شروع کرے تو پانچ برس میں
جہاں سے چلا تھا وہیں آکر کھڑا ہوگا اور اس کا صرف ایک پھیرا
پورا ہوگا۔

حسن آرا۔ اللہ اکبر اب جو میں خیال کرتی ہوں تو زمین بہت ہی بڑی
ہے بھلا تم نے کیونکر جانا کہ چوبیس ہزار میل دَور ہے۔

محمودہ:۔ کتابوں سے جانا ہمت والے لوگوں نے محنت اٹھا کر برسوں
سفر کیا اور تمام دَور ناپ ڈالا خشکی کی راہ تو سیدھا چلنا مشکل ہے
کہیں کہیں بڑے بڑے دو دو تین تین کوس کے اونچے بہینوں
کی چڑھائی کے دشوار گزار پہاڑ ہیں کہیں سیکڑوں کوس کے
جنگل ہیں جن میں نہ کہیں ٹھہرنے کا ٹھکانا ہے نہ پانی کا آسرا نہ

نہ راہ نہ سڑک سمندر سمندر جہازوں پر لوگوں نے سفر کیا ہے اور
قطب نما کے سہارے سے سیدھ لگائے چلے گئے اور آخر کو وہیں
آموجود ہوئے جہاں سے چلے تھے۔ کیا اب بھی زمین کے گول ہونے
میں کچھ شک و شبہ ہے؟"

(ب) بنات النعش کے اصل قصّہ کے آخری حصّہ کا اقتباس یہ ہے:۔

مجب اس کے بیاہ کی تاریخ قریب پونچی تو ہر چند گھر والوں نے اسکو مکتب
جانے سے روکا مگر اس کو مکتب سے ایسا کچھ انس ہو گیا تھا کہ ایک لمحہ مکتب سے
جدا رہنا اس کو شاق تھا حسب دستور مکتب میں آتی رہی یہاں تک کہ مایوں
بیٹھنے میں صرف تین دن باقی رہ گئے تھے تب ناچار سلطانہ بیگم خود استانی
اصغری خانم کے پاس گئیں۔ سلام دعا اور مزاج پرسی کے بعد سلطانہ بیگم
بولیں استانی جی تم میں ایسا جی پڑا تھا کہ ہر روز کہتی تھی آج جاؤں کل جاؤں
لیکن تمہاری اس لونڈی کے بیاہ برات کی فکر میں ایک دم کی چھٹی نہیں
ملتی۔ سیتی میں نہیں پروتی میں نہیں مگر کام ہے کہ سمٹنے ہی میں نہیں آتا آخر
آج میں زبردستی نکل کھڑی ہوئی سو کام کاج کا حرج کیا اور میں نے کہا کہ
چلوں ذرا کھڑے کھڑے استانی جی سے تو مل آؤں۔

استانی جی۔ درست ہے یہی تو کام کا وقت ہے آپ نے ناحق تکلیف
کی مجھی کو بلا بھیجا ہوتا۔ میں بھی دن رات آپ ہی کے کام میں
لگی لپٹی رہتی ہوں جوڑے جو میں نے سینے اور مصالح ٹانکنے کو
آپ سے منگوائے تھے سب تیار ہیں۔ پہلے تو میرا جی ڈرتا تھا کہ
جوڑے ماشاء اللہ بہت بھاری ہیں اور خدا کے فضل سے امیر گھر
جانے والے ہیں ایسا نہ ہو کہ یہ لڑکیاں کہیں بگاڑ دیں مگر نہیں

حسن آرا بیگم کی محبت سے لڑکیوں نے خوب ہی جی لگا کر سیا اور مصالح
بھی بہت ہی صفائی سے ٹانکا اس جوڑی گلبدن کے پائجامے میں جو
میں نے پرسوں سلوا کر بھیجا ہے ذرا کلیوں کا گوکھرو کھنچ زیادہ گیا
ہے بہتیرا شہر بانو کہتی رہی کہ استانی جی لاؤ ادھیڑ کر پھر ٹانک دوں
میں نے کہا خیر رہنے بھی دو ادھیڑنے سے گوکھرو خراب ہو جائے گا
آیندہ اس کا خیال رکھنا۔

سلطانہ بیگم۔ وہ جوڑا میں نے اپنے یہاں کی مغلانیوں کو دکھایا تھا پھڑک
گئیں اور کہنے لگیں پھر کہاں مردوں کی چستی اور کہاں عورتوں کی۔

میں۔ اری مردوں کا یہاں کیا مذکور۔

مغلانیاں۔ اے حضور یہ جوڑا میاں علی جان کے کارخانے کا ٹنکا ہوا معلوم
ہوتا ہے اسی لئے ٹانکا ایسا درست بیٹھتا چلا گیا ہے تو لونڈیوں کے
عرض کرنے کا یہ مطلب ہے کہ عورتوں کا کام کیسا سجل کیوں نہ ہو
مردوں کے کام کو نہیں پا سکتا۔

میں۔ کہاں کے علی جان اور کیسے مرد یہ جوڑا تو میری استانی جی کے
مکتب کی لڑکیوں نے سیا اور انھیں نے اس میں مصالح ٹانکا ہے
یہ سن کر مغلانیاں بار بار جوڑے کو کھول کھول کر بغور دیکھتی تھیں
اور کہتی تھیں حضور فرماتی ہیں تو ہم کو یقین ہے لیکن عورتوں کے
ہاتھ میں یہ صفائی اور یہ ستھرا پن ہم نے تو نہیں دیکھا۔

استانی جی۔ خیر اور جوڑوں کی سلائی مجھ کو بھی پسند ہے۔ پھر آپ نے
حسن آرا بیگم کے جوڑے بھی بھیج دیئے ہوتے لڑکیاں تو خوشی
خوشی سی دیتیں۔

سلطانہ بیگم۔ اور یہ سارا جہیز کس نے بیا اور کس نے ٹانکا مغلانیوں سے تو میں نے صرف موٹا کام لیا چاندنیاں ہوئیں گھڑیاں ہوئیں دسترخان ہوئے، سوزنیاں ہوئیں موباف کستنے، غلاف، تکیے توشک، لحاف اس طرح کی چیزیں البتہ مغلانیوں نے سی ہیں یا ہاں شب خوابی کے کپڑے اکثر تو مکتب میں اور کچھ تھوڑے باجی اما کے یہاں سے پرو ئے گئے۔

استانی جی۔ الٰہی خیر سے حسن آرا بیگم کو ایک یہ ہزاروں اور گھس پس کر پرانے ہوں۔

سلطانہ بیگم (ٹھنڈا سانس بھر کر) ہاں استانی جی دعا کیجے اللہ نصیب کرے۔ بیٹیوں کا بھی کچھ عجیب نازک معاملہ ہے کن کن مصیبتوں سے پالو پرورش کرو اور پھر دشمن پرایا کا پرایا۔ کیا کروں کچھ بن نہیں پڑتی ورنہ میں حسنا کو اپنی نظروں سے دور نہونے دیتی شہر میں ایک سمدھیانہ کرکے وہ وہ آفتیں اٹھائیں کہ میں نے آگے کو توبہ کی اور کان اینٹھا ورنہ حکیم صاحب بیچارے کا کچھ قصور نہیں کیسی کیسی باتیں حسنا کے واسطے منگوائیں ایک سے ایک بڑھی چڑھی میں نے کہا حاشا ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے گی شہر میں اب بیٹی نہ دوں گی کالا منھ ایسے شہر کا جس میں یہ کچھ رسوائی اور فضیحت ہے۔ سو اُستانی جی اب دیہات والوں سے معاملہ کیا ہے خدا کے ہاتھ شرم ہے۔

اُستانی جی۔ حُسن آرا بیگم سے آپ مطمئن رہئے اول تو ججو والے خود بڑے رئیس ہیں دوسرے خاک چاٹ کر کہتی ہوں آپ انشاء اللہ دیکھ

لیجئے گا کہ بیاہ کے دوسرے تیسرے ہی مہینے حسن آرا بیگم تمام
ریاست کے سیاہ و سفید کی مالک نہ بن بیٹھیں تو مجھ کو اُلٹا
اُلاہنا دیجئے گا کیا آپ کو حسن آرا بیگم کے مزاج میں کچھ فرق
نہیں معلوم ہوتا۔

سلطانہ بیگم ۔ فرق آپ کی عنایت سے زمین آسمان کا ہے آپ کے
فیضان تعلیم نے خاک کو اکسیر، تانبے کو کندن، ذرے کو خورشید
پتھر کو لعل ۔ سفید حیواں کو آدم حسنا کو ماشاء اللہ حسن آرا بیگم
بنا دیا اس کی خوبی تقدیر کی یہی ایک بڑی نشانی ہے کہ وہ شاگرد
اور آپ جیسی اس کی استانی ہے یہ ایسا احسان آپ نے ہم سب
گھر والوں پر کیا کہ جب تک جئیں گے آپ کے مرہون منت رہیں
گے مگر جب سے حسنا نے بیاہ کی طیاری ہوتے دیکھی ہے کچھ سہم سی
گئی ہے یوں ہی گھر میں اس کا جی نہیں لگتا تھا اور بھی دل اُچاٹ ہو گیا
ہے نہ کھاتی ہے نہ پیتی ہے نہ کسی سے بولتی اور بات کرتی ہے ارادہ
تھا کہ پورے مہینے بھر مایوں بٹھاؤں گی اس کی حالت دیکھ کر
میں نے کہا کہ مایوں سے بدتر تو یہ خود ہوتی جاتی ہے رنگت
زرد ہو گئی ہے آنکھوں میں حلقے پڑ گئے ہیں چہرہ دیکھو اداس
صورت دیکھو غمگین ۔ میں کہتی ہوں کہ اتنی عمر میں تو لڑکیوں
کو دلہن بننے کی بڑی خوشی ہوتی ہے ۔

استانی جی ۔ حسن آرا بیگم اور لڑکیوں کی طرح نادان نہیں ہیں ماشاء اللہ
بڑی فہمیدہ اور زیرک لڑکی ہے ۔ یہی کچھ گھر کے چھوٹنے کا
خیال ہوگا ۔

سلطانہ بیگم ۔ گھر کی تو اُس کو مطلق پروا نہیں البتہ مکتب اس کی جان ہے دیکھئے کیونکر بچی کا دل بہنے گا۔

استانی جی ۔ میں بہلا دوں گی اور یوں آدمی اپنے پیاروں سے جدا ہوتا ہے تو رنج ہوتا ہی ہے ؛؛

(۳) توبتہ النصوح' ان فسانوں میں بہترین کتاب ہے اسکا موضوع ومقصود تعلیم دینداری ہے۔ اس کا قصہ، واقعات کا تسلسل، کردار اشخاص کی موزونیت مکالمات کا تناسب و برجستگی؛ سب کچھ نہایت خوبصورت و دلکش ہے۔ یہ کتاب سب سے زیادہ مقبول ہوئی۔ اس کے اقتباسات مدارس کے نصابات میں ہمیشہ شائع ہوتے ہیں۔ اس کے بعض حصّے خاص طور پر مؤثر و دلچسپ ہیں۔ ایک نصوح کا خواب، دوسرے کلیم اور مرزا ظاہر دار بیگ کا معاملہ۔ دونوں بہت طویل ہیں۔ اس لئے صرف دوسرے کو یہاں نقل کیا جاتا ہے۔ قصہ یہ ہے کہ نصوح کا بڑا لڑکا کلیم ماں باپ سے روٹھ کر گھر سے نکلتا ہے اور اپنے ایک دوست کے گھر جاتا ہے۔

کلیم اور مرزا ظاہر دار بیگ

کلیم شیخ چلی کے سے منصوبے سوچتا ہوا اپنے دوست مرزا کے مکان پر پہونچا ہر چند ابھی کچھ ایسی بہت رات نہیں گئی تھی لیکن مرزا جیسے نکھے بیفکرے کبھی کے لمبی تان کر سو چکے تھے۔ کلیم نے جو دروازے پر دستک دی تو جواب ندارد اس مقام پر مرزا کا تھوڑا سا حال لکھ دینا مناسب معلوم ہوتا ہے اس شخص کی کیفیت یہ تھی کہ شاید اس کا نانا دہ بھی حقیقی نہیں ابتدائے عملداری سرکار میں

صاحب رزیڈنٹ کی اردلی کا جمعدار تھا۔ اول تو عالی جاہ سرکار دوسرے باعتبار منصب اردلی کا جمعدار تیسرے اُن دنوں کی بے عنوانی اس پر خود اُس کی رشوت ستانی بہت کچھ کمایا۔ یہاں تک کہ اُس کا اعتداد دہلی کے ریٔداروں میں ہوگیا۔ مرزا کی ماں اوایل عمر میں بیوہ ہوگئی۔ جمعدار نے باوجودے کہ دور کی قرابت تھی حسبتہً للہ اس کا تکفل اپنے ذمے لیا۔ جمعدار اپنی مین حیات میں تو اتنا سلوک کرتا رہا کہ مرزا کو یتیمی اور اس کی ماں کو بیوگی بھول کر بھی یاد نہ آئی ہوگی لیکن جمعدار کے مرنے پر اس کے بیٹے پوتے لڑاے کثرت سے تھے انھوں نے بے اعتنائی کی۔ اور اگرچہ جمعدار بہت کچھ وصیت کر کے مرے تھے مگر ان کے ورثا نے بہ ہزار دقت محل سرائے کے پہلو میں ایک بہت چھوٹا سا قطعہ ان کے رہنے کو دیا۔ اور سات روپیہ مہینہ کی کرایہ کی دُکانیں مرزا کے نام کردیں۔

یہ تو حال تھا کہ مرزا۔ مرزا کی ماں مرزا کی بیوی تین تین آدمی اور سات روپیہ کی کل کائنات اس پر مرزا کی شیخی اور نمود یہ مسخرہ اس ہستی پر چاہتا تھا کہ جمعدار کے بیٹوں کی برابری کرے جن کو صدہا روپیہ ماہوار کی مستقل آمدنی تھی۔ اگرچہ جمعدار والے اس کو منہ نہیں لگاتے تھے مگر یہ بے غیرت زبردستی اُن میں گھستا تھا۔ یہ کسی کو بھائی جان، کسی کو ماموں جان، کسی کو خالو جان بناتا اور وہ لوگ اس کے ادّعا رشتوں ناتوں سے جلتے اور دق ہوتے۔ اونچی حیثیت کے لوگوں میں بیٹھنا اس کے حق میں اور بھی زبوں تھا۔ اُن کی دیکھا دیکھی اس نے تمام عادتیں امیر زادوں کی سی اختیار کر رکھی تھیں مگر امیر زادگی نبھتی تو کیسے نبھتی جو کائیں گِروی ہوتی جاتی تھیں۔ ماں بیچاری بہتیرا بکتی مگر کون سنتا تھا۔

مرزا کو جب دیکھو پاؤں میں ڈیڑھ حاشئے کی جوتی۔ سر پر دوہری بیل کی بھاری کامدار ٹوپی۔ بدن میں ایک چھوڑ دو دو انگرکھے اوپر شبنم یا ہلکی سی تنزیب نیچے کوئی طرحدار کاساڈھاکے کا نینو۔ جاڑا ہوا تو بانات مگر سات روپیہ گز سے کم کی نہیں۔ خیر یہ تو صبح شام اور تیسرے پہر کا شالی مخمل کی آسف خانی جس میں حریر کی سنجاف کے علاوہ گنگا جمنی کمخواب کی عمدہ بیل ٹکی ہوئی سُرخ نیفہ کا پائجامہ اگر ڈھیلے پائچوں کا ہوا تو کلی دار اور اس قدر نیچا کہ ٹھوکر کے اشارے سے دو دو قدم آگے اور اگر تنگ مہری کا ہوا تو نصف ساق تک چوڑیاں اور اوپر جلد بدن کی طرح مڑھا ہوا ریشمی ازاربند گھٹنوں میں لٹکتا ہوا اور اُس میں بے قفل کی کنجیوں کا گچھّا۔ غرض دیکھو تو مرزا صاحب اس ہیئت کذائی سے چھیلا بنے ہوئے سر بازار چھم چھم کرتے چلے جا رہے ہیں۔

کلیم سے اور مرزا سے محفل مشاعرہ میں تعارف پیدا ہوا۔ شدہ شدہ مرزا صاحب کلیم کے مکان پر تشریف لانے لگے۔ یہاں تک کہ چند روز سے تو دونوں میں ایسی گاڑھی چھننے لگی تھی گویا ایک جان دو قالب تھے۔ کلیم کو تو مرزا کے مکان پر جانے کا کبھی کبھی اتفاق نہیں ہوا مگر مرزا شام کو تو کبھی کبھی لیکن صبح کو بلاناغہ آتے اور تمام دن کلیم کے پاس رہتے۔ مرزا نے اپنا حال اصلی کلیم پر ظاہر نہیں ہونے دیا۔ کلیم یہی جانتا تھا کہ جمعدار کا تمام ترکہ مرزا کو ملا اور وہ جمعدار کی محل سرا کو مرزا کی محل سرا اور جمعدار کے دیوان خانے کو مرزا کا دیوان خانہ اور جمعدار کے بیٹے پوتوں کے نوکروں کو مرزا کے نوکر سمجھتا تھا اور اسی غلط فہمی میں وہ گھر سے نکلا تو سیدھا جمعدار کی محل سرائے کی ڈیوڑھی پر جا موجود ہوا بار بار کے پکارتے اور کنڈی کھڑکھڑانے سے

دو لونڈیاں چراغ لئے ہوئے اندر سے نکلیں اور اُن میں سے ایک نے پوچھا کون صاحب ہیں اور اِتنی رات گئے کیا کام ہے۔

کلیم - جاؤ مرزا کو بھیج دو۔

لونڈی - کون مرزا۔

کلیم - مرزا ظاہر دار بیگ جن کا مکان ہے اور کون مرزا۔

لونڈی - یہاں کوئی ظاہر دار بیگ نہیں ہے۔

اتنا کہہ کر قریب تھا کہ لونڈی پھر کواڑ بند کرلے کہ جلدی سے کلیم نے کہا کیوں جی کیا یہ جمعدار صاحب کی محل سرا نہیں ہے؟

لونڈی - ہے کیوں نہیں۔

کلیم - پھر تم نے یہ کیا کہا کہ یہاں کوئی مرزا ظاہر دار بیگ نہیں۔ کیا ظاہر دار بیگ جمعدار کے وارث اور جانشین نہیں ہیں؟

لونڈی - جمعدار کے وارثوں کو خدا سلامت رکھے۔ موا ظاہر دار بیگ جمعدار کا وارث بننے والا کون ہوتا ہے۔

دوسری لونڈی - ارے کمبخت یہ کہیں مرزا بانکے کے بیٹے کو نہ پوچھتے ہوں وہ ہر جگہ اپنے تئیں جمعدار کا بیٹا بتایا کرتا ہے (کلیم کی طرف مخاطب ہو کر) کیوں میاں وہی ظاہر دار بیگ نا جن کی رنگت زرد، زرد ہے۔ آنکھیں کرنجی۔ چھوٹا قد دُبلا تیلا اپنے تئیں بہت بنائے سنوارے رہا کرتے ہیں۔

کلیم - ہاں ہاں وہی ظاہر دار بیگ

لونڈی - تو میاں اس مکان کے پچھواڑے اُپلوں کی ٹال کے برابر ایک چھوٹا سا کچا مکان ہے وہ اُس میں رہتے ہیں۔

کلیم نے وہاں جا کر آواز دی تو کچھ دیر بعد مرزا صاحب ننگ دھڑنگ جانگھیا پہنے ہوئے باہر تشریف لائے اور کلیم کو دیکھ کر شرمائے اور بولے اہا آپ ہیں معاف کیجئے گا میں سمجھا کوئی اور صاحب ہیں۔ بندے کو کپڑا پہن کر سونے کی عادت نہیں۔ میں ذرا کپڑے پہن آؤں تو آپ کے ہمرکاب چلوں۔

کلیم۔ چلئے گا کہاں میں آپ ہی کے پاس تک آیا تھا۔

مرزا۔ پھر اگر کچھ دیر تک تشریف رکھنا منظور ہو تو میں اندر پردہ کرا دوں

کلیم۔ میں آج شب کو آپ ہی کے یہاں رہنے کی نیت سے آیا ہوں۔

مرزا۔ بسم اللہ۔ تو چلئے اسی مسجد میں تشریف رکھئے۔ بڑی فضا کی جگہ ہے میں ابھی آیا۔

کلیم نے جو مسجد میں آکر دیکھا تو معلوم ہوا کہ ایک نہایت پرانی چھوٹی سی مسجد ہے وہ بھی مسجد ضرار[1] کی طرح ویران وحشت ناک نہ کوئی حافظ ہے نہ مُلّا نہ طالب علم نہ مسافر۔ ہزار ہا چمگادڑیں اس میں رہتی ہیں کہ اُن کی تسبیح بے ہنگام سے کان کے پردے پھٹے جاتے ہیں۔ فرش پر اس قدر بیٹ پڑی ہے کہ بجائے خود کھرنجے کا فرش بن گیا ہے۔ مرزا کے انتظار میں کلیم کو چار ناچار اسی مسجد میں ٹھہرنا پڑا مرزا آئے بھی تو اتنی دیر کے بعد کہ کلیم مایوس ہو چکا تھا۔ قبل اس کے کہ کلیم شکایت کرے مرزا صاحب بطور دفع دخل مُقدّر فرمانے لگے

---

[1] پیغمبر صاحبؐ کے وقت میں بعض لوگوں نے ضد میں آکر دوسری مسجد کو اُجاڑنے کے لئے ایک مسجد بنائی تھی پیغمبر صاحبؐ نے اُسے ڈھوا دیا۔

کہ بندے کے گھر میں کئی دن سے طبیعت علیل ہے خفقان کا عارضہ اختلاج قلب کا روگ ہے اب جو میں آپ کے پاس سے گیا تو ان کو غشی میں پایا اس وجہ سے دیر ہوئی پہلے یہ تو فرمائیے کہ اِسوقت بندہ نوازی فرمانے کی کیا وجہ ہے۔ کلیم نے باپ کی طلب اپنا انکار بھائی کی اِلتجا ماں کا اصرار تمام ماجرا کہہ سُنایا۔

مرزا - پھر اب ارادہ کیا ہے؟

کلیم - سوائے اِس کے کہ اب گھر لوٹ کر جانے کا ارادہ تو نہیں ہے اور جو آپ کی صلاح ہو۔

مرزا خیر نیت شب حرام صبح تو ہو۔ آپ بے تکلّف استراحت فرمائیے میں جا کر بچھونا وغیرہ بھیجے دیتا ہوں اور مجھ کو مریضہ کی تیمارداری کے لئے اجازت دیجئے کہ آج اُس کی علالت میں اشتداد ہے۔

کلیم - یہ ماجرا کیا ہے تم تو کہا کرتے تھے کہ ہمارے یہاں دوہری محل سرائیں متعدد دیوان خانے۔ کئی پائیں باغ ہیں۔ حوض اور حمام اور کٹرے اور گنج اور دُکانیں اور سرائیں۔ میں تو جانتا ہوں عمارت کی قسم سے کوئی چیز ایسی نہ ہوگی جس کو تم نے اپنی مِلک نہ بتایا ہو یا یہ حال ہے کہ ایک متنفس کے واسطے ایک شب کے لئے تم کو جگہ میسّر نہیں۔ جو جو حالات تم نے اپنی زبان سے بیان کئے ان سے ثابت ہوتا تھا کہ جمعدار کے تمام ترکہ پر تم قابض اور متصرف ہو لیکن میں اُس تمام جاہ و حشمت کا ایک شمّہ بھی نہیں دیکھتا۔

مرزا - آپ کو میری نسبت سخن سازی کا احتمال ہونا سخت تعجب کی بات ہے اتنی مدّت مجھ سے اور آپ سے صحبت رہی مگر افسوس ہے

آپ نے میری طبیعت اور میری عادت کو نہ پہچانا۔ یہ اختلافِ حالت جو آپ دیکھتے ہیں اس کی ایک وجہ ہے۔ بندے کو جمعدار صاحب مرحوم مغفور نے متبنیٰ کیا تھا اور اپنا جانشین کر مرے تھے۔ شہر کے کل رؤسا اس سے واقف اور آگاہ ہیں۔ ان کے انتقال کے بعد لوگوں نے اس میں رخنہ اندازیاں کیں بندے کو آپ جانتے ہیں کہ بکھیڑے سے کوسوں بھاگتا ہے صحبت ناملائم دیکھ کر کنارہ کش ہوگیا۔ لیکن کسی کو انتظام کا سلیقہ بندوبست کا حوصلہ نہیں۔ اسی روز سے اندر باہر واویلا مچی ہوئی ہے اور اس بات کے مشورے ہو رہے ہیں کہ بندے کو منا لے جائیں۔

کلیم ۔ لیکن آپ نے کبھی اس کا تذکرہ بھی نہیں کیا۔

مرزا ۔ اگر میں آپ سے یا کسی سے تذکرہ کرتا تو استقلال مزاج سے بے بہرہ اور غیرت اور حمیت سے بے نصیب ٹھیرتا۔ اب آپ کو کھڑے رہنے میں تکلیف ہوتی ہے اجازت دیجئے کہ میں جاکر بچھونا بچھوا دوں اور مریضہ کی تیمار داری کروں۔

کلیم ۔ خیر مقام مجبوری ہے لیکن پہلے ایک چراغ تو بھیج دیجئے تاریکی کی وجہ سے طبیعت اور بھی گھبراتی ہے۔

مرزا ۔ چراغ کیا میں نے تو لیمپ روشن کرانے کا ارادہ کیا تھا لیکن گرمی کے دن ہیں پروانے بہت جمع ہو جاویں گے اور آپ زیادہ پریشان ہو جیئے گا اور اس مکان میں ابابیلوں کی بہت کثرت ہے۔ روشنی دیکھ کر گرنے شروع ہوں گے اور آپ کا بیٹھنا دشوار کر دیں گے تھوڑی صبر کیجئے کہ ماہتاب نکلا آتا ہے۔

کلیم۔ جب گھر سے نکلا تو کھانا تیار تھا لیکن وہ اس قدر طیش
میں تھا کہ اُس نے کھانے کی مطلق پروا نہ کی اور بے کھائے نکل کھڑا ہوا۔
مرزا سے ملنے کے بعد وہ منتظر تھا کہ آخر مرزا خود ہی پوچھیں گے تو کہہ دوں گا۔
مرزا کو ہر چند کھانے کی نسبت پوچھنا ضرور تھا کیونکہ اول تو کچھ ایسی رات
زیادہ نہیں گئی تھی دوسرے یہ کہ اس کو معلوم ہو چکا تھا کہ کلیم گھر سے لڑ کر
نکلا ہے۔ تیسرے دونوں میں بے تکلفی نہایت درجہ کی تھی لیکن مرزا قصداً
اُس بات سے متعرض ہی نہ ہوا اور کلیم بیچارے کا بھوک کے مارے یہ حال
کہ مسجد میں آنے سے پہلے اُس کی انتڑیوں نے قل ہو اللہ پڑھنی شروع کر دی
تھی جب اس نے دیکھا کہ مرزا کسی طرح اس پہلو پر نہیں آتا اور عنقریب
تمام شب کے واسطے رخصت ہوا چاہتا ہے تو بیچارے نے بے غیرت بن کر
خود کہا کہ سنو یار میں نے کھانا ابھی نہیں کھایا۔

مرزا۔ سچ کہو۔ نہیں جھوٹ بہکاتے ہو۔

کلیم۔ تمہارے سر کی قسم میں بھوکا ہوں۔

مرزا۔ مرد خدا تو آتے ہی کیوں نہیں کہا اب اِتنی رات گئے کیا ہو سکتا
ہے دُکانیں سب بند ہو گئیں اور جو دو ایک دُکان کھلی بھی ہیں
تو باسی چیزیں رہ گئی ہوں گی۔ جن کے کھانے سے فاقہ بہتر۔ گھر
میں تو آج آگ تک نہیں سلگی۔ مگر ظاہراً تم سے بھوک کی سہار
ہونی مشکل معلوم ہوتی ہے ورنہ اشتہا کو زیر کرنا بڑی ہمت
والوں کا کام ہے۔ ایک تدبیر سمجھ میں آتی ہے کہ جاؤں چھدامی بھڑبھونجے
کے یہاں سے گرما گرم خستہ چنے کی دال بنوا لاؤں۔ بس ایک
دھیلے کی مجھ کو اور تم کو دونوں کو کافی ہو گی۔ رات کا وقت ہے۔

ابھی کلیم کچھ کہنے بھی نہیں پایا تھا کہ مرزا جلدی سے اُٹھ باہر گئے اور چشم زدن میں چنے بھنوا لائے۔ مگر دھیلے کے کہہ کر گئے تھے یا تو کم کے لائے یا راہ میں دو چار پھنکے لگائے اس واسطے کہ کلیم کے رُو برو دو تین مُٹھی چنے سے زیادہ نہ تھے۔

مرزا۔ یار ہو بڑے خوش قسمت کہ اس وقت بھاڑ مِل گیا۔ ذرا واللہ ہاتھ تو لگاؤ دیکھو تو کیسے گُلگُس رہے ہیں اور سوندھی سوندھی خوشبو بھی عجب ہی دلفریب ہے کہ بس بیان نہیں ہو سکتا۔ تعجب ہے کہ لوگوں نے خس اور مٹی کا عطر نکالا مگر بھنے ہوئے چنوں کی طرف کسی کا ذہن منتقل نہیں ہوا۔ کوئی فن ہو کمال بھی کیا چیز ہے دیکھئے آتی تو رات گئی ہے مگر چھدامی کی دُکان پر بھیڑ لگی ہوئی ہے۔ بندے نے تحقیق سنا ہے کہ حضور والا کے خاصہ میں چھدامی کی دُکان کا چنا بلا ناغہ لگ کر جاتا ہے اور واقعہ میں ذرا آپ غور سے دیکھئے کیا کمال کرتا ہے کہ بھوننے میں چنوں کو سڈول بنا دیتا ہے بھئی تمہیں میرے سر کی قسم سچ کہنا۔ ایسے خوبصورت خوش قطع سڈول چنے تم نے پہلے بھی کبھی دیکھے تھے۔ دال بننے میں اُسکو یہ کمال حاصل ہے کہ کسی دانہ پر خراش تک نہیں۔ ٹوٹنے پھوٹنے کا کیا مذکور اور دالوں کی رنگت دیکھئے کوئی بسنتی ہے کوئی پستئی غرض دونوں رنگ خوشنما یوں صدہا قسم کے غلّے اور پھل زمین سے اُگتے ہیں لیکن چنے کی لذّت کوئی نہیں پاتا۔ آپ نے وہ ایک ظریف کی حکایت سُنی ہے۔

کلیم۔ فرمایئے۔

مرزا ۔ چنا ایک مرتبہ حضرت میکائیل کی خدمت میں جن کو ارزاقِ عباد کا اہتمام سپرد ہے فریاد لیکر گیا کہ یا حضرت میں نے ایسا کیا قصور کیا ہے کہ جیوں جیوں مَیں نے زمین سے سر باہر نکالا تیرِ ستم چلنے لگا۔ ماکولات اور بھی ہیں مگر جیسے جیسے ظلم مجھ پر ہوتے ہیں کسی پر نہیں ہوتے۔ نشو ونما کے ساتھ تو میری قطع و برید ہونے لگتی ہے۔ میری کونپلوں کو توڑ کر آدمی ساگ بناتے اور مجھے کچے کو کھاجاتے ہیں۔ جب بار آور ہوا تو خدا جھوٹ نہ بلوائے آدمی بکرے بن کر لاکھوں من بوٹ چرجاتے ہیں۔ اس سے نجات ملی تو ہولے کرنے شروع کئے۔ پکا تو شاخ و برگ بھُس بن کر بیلوں اور بھینسوں کے دوزخِ شکم کا ایندھن ہوا۔ رہا دانہ اس کو چکّی میں دلیں گھوڑوں کو کھلائیں بھاڑ میں بھونیں بیسن بنائیں۔ کھولتے ہوئے پانی میں اُبالیں گھونگھنیاں پسائیں۔ غرض شروع سے آخر تک مجھ پر طرح طرح آفتیں نازل رہتی ہیں۔ چنے کا حضرت میکائیل کے دربار میں اس طرح پر بیباکانہ چرپٹر بولنا سن کر حاضرین دربار اس قدر ناخوش ہوئے کہ ہر شخص اس کے کھانے کو دوڑا چنانچہ یہ ماجرا دیکھ کر بے انتظار حکم اخیر رخصت ہوا۔ سو حضرت یہ چنے ایسے لذت کے بنے ہیں کہ فرشتوں کے دندان آز بھی ان پر تیز ہیں۔ انسوس کہ اس وقت نمک مرچ بہم نہیں پہونچ سکتا ورنہ میر مدد کے کبابوں میں یہ خستگی اور یہ سوندھا پن کہاں۔

غرض مرزا نے اپنی چرب زبانی سے چنوں کو گھی کی تلی دال بنا کر اپنے دوست کلیم کو کھلایا۔

کلیم بھوکا تو تھا ہی اس کو بھی ہمیشہ سے کچھ زیادہ مزیدار معلوم ہوتے

مرزا نے گھر جا کر ایک میلی دری اور ایک کثیف سا تکیہ بھیج دیا۔ وہی گھڑی میں کلیم کی حالت کا اس قدر متغیر ہو جانا عبرت کا مقام ہے یا تو خلوت خانے اور عشرت منزل میں تھا یا اب ایک مسجد میں آکر پڑا اور مسجد بھی ایسی جس کا حال ہم نے تھوڑا سا اوپر بیان کیا۔

گھر کے الوانِ نعمت کو لات مار کر نکلا تھا تو پہلے ہی وقت چنے چبانے پڑے نہ چراغ نہ چارپائی نہ بہن نہ بھائی نہ مونس نہ غمخوار نہ نوکر نہ خدمت گار۔ مسجد میں اکیلا ایسا بیٹھا تھا جیسے قید خانے میں حاکم کا گنہگار یا قفس میں مرغ نوگرفتار اور کوئی ہوتا تو اس حالت پر نظر کر کے تنبیہہ پکڑتا اپنی حرکت سے توبہ اور اپنے افعال سے استغفار کرتا اور اُسی وقت نہیں تو سویرے مجرم باپ کے ساتھ نمازِ صبح میں جا شریک ہوتا۔ لیکن کلیم کو اور بہت سے مضمون سوچنے کو تھے۔ اُس نے رات بھر میں ایک قصیدہ تو مسجد کی ہجو میں تیار کیا اور ایک مثنوی مرزا کی شان میں۔

صبح ہوتے آنکھ لگ گئی تو نہیں معلوم مرزا یا محلّے کا کوئی اور عیار لوٹ لی جوتی، رومال چھڑی تکیہ دری یعنی جو چیز کہ کلیم کے بدن سے منفک اور اسکے جسم سے جُدا تھی لے کر چمپت ہوا۔

یوں بھی کلیم بہت دیر کو سو کر اُٹھتا تھا اور آج تو ایک وجہ خاص تھی۔ کوئی پہر سوا پہر دن چڑھے جاگا تو دیکھتا کیا ہے کہ فرش مسجد پر پڑا ہے اور نیند کی حالت میں جو کروٹیں لی ہیں تو سیروں گرد کا بھبوت اور چمگادڑوں کی بیٹ کا ضماد بدن پر تھپا ہوا ہے۔ حیران ہوا کہ قلبِ ماہیت ہو کر میں کہیں بھتنا تو نہیں بن گیا۔ مرزا کو ادھر دیکھا اُدھر دیکھا کہیں پتہ نہیں۔

مسجد تھی ویران اس میں پانی کہاں۔ صبر کر کے بیٹھ رہا کوئی اللہ کا بندہ

اِدھر کو آنکلے تو اُس کے ہاتھ مرزا کو بلواؤں۔ یا مُنہ ہاتھ دھو کر خود مرزا تک جاؤں۔

اس میں دوپہر ہونے آئی بارے ایک لڑکا کھیلتا ہوا آیا جوں ہی زینہ پر چڑھا تو کلیم اس سے غرض مطلب کرنے کے لئے لپکا وہ لڑکا اس کی ہیئت کذائی دیکھ ڈر کر بھاگا خدا جانے اس نے اس کو بھوت سمجھا یا سڑی خیال کیا۔ کلیم نے بہتیرا پکارا اس لڑکے نے پیٹھ پھیر کر نہ دیکھا۔ ناچار کلیم نے بہ ہزار مصیبت دوسرے فاقہ سے شام پکڑی اور جب اندھیرا ہوا تو اُلو کی طرح اپنے نشیمن سے نکلا سیدھا مرزا کے مکان پر گیا آواز دی تو یہ جواب ملا کہ وہ تو بڑے سویرے کے قطب صاحب سدھارے ہیں۔

کلیم نے چاہا کہ اپنا تعارف ظاہر کر کے ممکن ہو تو مُنہ دھونے کو پانی مانگے اور مرزا کی پھٹی پرانی جوتی اور ٹوپی تاکہ کسی طرح گلی کوچے میں چلنے کے قابل ہو جائے۔

یہ سوچ کر اس نے کہا کہ کیوں حضرت آپ مجھ سے بھی واقف ہیں۔ اندر سے آواز آئی ہم تمھاری آواز تو نہیں پہچانتے اپنا نام و نشان بتاؤ تو معلوم ہو۔

کلیم ۔ میرا نام کلیم ہے۔ اور مجھ سے اور مرزا ظاہر دار بیگ سے بڑی دوستی ہے۔ بلکہ میں شب کو مرزا صاحب ہی کی وجہ سے مسجد میں تھا

گھر والے ۔ وہ دری اور تکیہ کہاں ہے جو رات تمھارے سونے کیلئے بھیجا گیا تھا۔

تکیہ دری کا نام سُن کر تو کلیم بہت چکرایا اور ابھی جواب دینے میں متامل تھا کہ اندر سے آواز آئی مرزا زبردست بیگ دیکھنا یہ مردوا کہیں

چل نہ دے۔ وہ ڈر کر تکیہ دی تو اس سے لو۔

کلیم یہ بات سن کر بھاگا۔ ابھی گلی کے نکڑ تک نہیں پہنچا تھا کہ زبردست نے چور چور کر کے جالیا۔

ہر چند کلیم نے مرزا ظاہر دار بیگ کے ساتھ اپنے حقوق معرفت ثابت کئے مگر زبردست کا ٹینگا سر پر اس نے ایک نہ مانی اور پکڑ کر کوتوالی لے گیا۔"

(۴) رویائے صادقہ، یہ ناول واقعات کے اعتبار سے بالکل سادہ ہے کوئی خاص دلچسپی نہیں رکھتا۔ لیکن نوعیت میں عجیب ہے "اس کتاب میں یہ بات ثابت کی گئی ہے کہ سچا اسلام بالکل عقل کے مطابق ہے، اور اس میں شکوک اور اشتباہات کو دخل نہیں ہو سکتا۔" قصہ صرف اتنا ہے کہ ایک لڑکی سچے خواب دیکھا کرتی ہے۔ جو دیکھتی ہے وہی پیش آتا ہے۔ اس لئے گھر اور باہر کے سب لوگ اس سے ڈرتے ہیں اور اس پر کوئی غیبی اثر سمجھتے ہیں۔ بالآخر اس کی شادی ہو جاتی ہے۔ شوہر کے گھر جا کر وہ ایک طویل مذہبی خواب دیکھتی ہے۔ (جو کتاب کے ... صفحوں میں سمایا ہے) کتاب کا مقصد یہی خواب ہے جو سوال و جواب کی صورت میں لکھا گیا ہے۔ لیکن قصہ کی دلچسپی خواب سے اوپر تک رہتی ہے آگے تو بس ایک مذہبی کتاب رہ جاتی ہے۔

رویائے صادقہ کی پہلی فصل بطور نمونہ نقل کی جاتی ہے:-

پہلی فصل تمہید کے طور پر صادقہ کی تقریب اور اسکی خواب دیکھنے کی عادت

لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم کیا دھوکا ہوا ہے۔ ہم مدت تک اسی

خیال میں رہے کہ صادقہ اور یوسفی دو سگی بہنیں تھیں۔ اب تحقیق ہوا کہ ایک ہی عورت کے دو نام ہیں اور اصلی ایک بھی نہیں اُس کو میکے ہی میں لوگ **صادقہ** کہنے لگے تھے۔ اس واسطے کہ اُس نے ساری عمر نہ کبھی جھوٹا خواب دیکھا اور نہ اپنے جی سے بناکر کوئی خواب بیان کیا۔ بیاہی گئی تو سُسرال کی طرف سے یوسفی بیگم کا خطاب ملا۔ اس لئے کہ کثرت سے خواب دیکھتے دیکھتے اس کو تعبیر میں ایسا ملکہ ہو گیا تھا کہ اس کی لئے تیر بہدف ہوتی تھی یوں تو کوئی ایسا بندہ بشر نہیں جو سوتے میں خواب نہ دیکھتا ہو۔ بلکہ ہمارا خیال تو یہ ہے کہ آدمی کا دماغ ایک لحہ بھی بے کار نہیں رہ سکتا وہ ہمہ وقت کچھ نہ کچھ سوچا ہی کرتا ہے جیسا جاگتے میں ویسا سوتے میں۔ اتنا فرق ضرور ہوتا ہے کہ اکثر لوگوں کو خواب یاد نہیں رہتا۔ مگر تو بھی وہ جتنی دیر سوتے ہیں۔ خواب ہی دیکھتے رہتے ہیں۔ جانوروں میں سے اور جانوروں کا تو حال معلوم نہیں مگر گھوڑے کی جس کا جی چاہے آزمالے کہ تھان پر کھڑا سو رہا ہے۔ آنکھیں بند ہیں۔ خراٹوں کی آواز چلی آتی ہے۔ اور ایک خاص طور پر ہنہنایا ایسے موقع پر سائیس یا جو کوئی آدمی موجود ہوتا ہے "تھان ہے تھان ہے" کہہ دیا کرتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ گھوڑا بھی کسی نہ کسی طرح کے خواب دیکھتا ہے لوگوں نے بہت کچھ عقلیں دوڑائیں۔ مگر کسی کو ٹھیک پتہ نہیں ملا۔ کہ خواب ہے کیا چیز اور اس کی تعبیر کے اصول کیا ہیں۔ ہم بھی مدتوں اس خبط میں گرفتار رہے۔ جب سے صادقہ کا حال سُنا۔ یہ خیال ہی چھوڑ دیا اور سمجھ لیا کہ خواب بھی اسرار الٰہی میں سے ہے۔ ع

خدا کی باتیں خدا ہی جانے

اس عورت کا دماغ بھی خدا نے عجیب ہی طرح بنایا تھا وہ پرلے درجے کی

ذہین تھی۔ یوں بھی لڑکیاں بولنے اور بات چیت کرنے پر جلد قادر ہو جاتی ہیں۔ اور صادقہ تو پورے ڈھائی برس کی بھی نہ ہوگی کہ ہم نے اپنے کانوں اس کو مختلف اوقات میں مختلف مواقع پر مسلسل گفتگو کرتے سُنا۔ نہ لغزش نہ لکنت نہ رکاوٹ۔ اس کا حافظہ ایسا قوی تھا کہ اس کو اپنے بچپن کے ان وقتوں کی باتیں جب کہ اس کو اچھی طرح گفتگو بھی نہیں کرنی آتی تھی ایسے صاف طور پر یاد تھیں کہ گویا کل کی بات ہے۔ ایک دفعہ کا اُس نے مذکور کیا کہ میں جھولے میں لیٹی ہوئی تھی۔ اوپر سے گری چھپکلی۔ اور اتفاق سے اسوقت کوئی میرے پاس نہ تھا۔ میرے جی میں آیا کہ آواز دوں مگر بولنا نہیں آتا تھا ناچار رونے لگی۔ دوا نے مجکو آکر اُٹھا لیا۔ میں چپکی تو ہو گئی۔ مگر جب پھر اس نے جھولے میں لٹانا چاہا تو میں اکڑ گئی۔ دوا سمجھ تو گئی کہ جھولے میں لیٹنا نہیں چاہتی۔ مگر اُس کو سبب کون سمجھائے۔ آخر اماں جان کا ذہن منتقل ہوا۔ اور لگیں کہنے ارے ذرا ننھا بچے کو تو دیکھو۔ یوں ننھا بچہ اُٹھایا چھپکلی کو دیر جانہ جا۔ اماں جان نے مجھے گود میں لیکر پیار کیا۔ اور اسی وقت چھت گیری بندھوا دی۔ تب میرے دم میں دم آیا۔ وہ ایسی باتوں کے ایسے ٹھیک پتے دیتی تھی کہ تسلیم اور تصدیق کے سوائے کوئی چارہ ہی نہ تھا۔ غالباً اُس نے خواب بھی اسی زمانے سے دیکھنے شروع کئے ہوں گے۔ مگر اس کا چرچا گھر میں اس وقت سے ہونے لگا جب سے اُس کو بولنا آیا۔ جیسی اس کی عمر تھی جیسے اس کے خیالات تھے ویسے ہی اس کے اُن دنوں کے خواب بھی ہوتے تھے۔ مثلاً ایک دن اس کا بھائی کہ وہ بھی بچہ ہی تھا۔ اس سے کوئی دو سوا دو برس بڑا سو مرے اٹھ کھانے کے لئے ضد کرنے لگا۔ ماں نے کہا باسی کھچڑی تو میں تم کو دینے کی نہیں رہیں کچوریاں سو اول تو ابھی دُکانیں نہیں کُھلیں۔ اور دوسرے دہی ایسی کونسی خوبی بھری ہیں

گھی کا نام اور آدمے سے زیادہ تیل اور پھر ماش کی دال۔ نہیں صاحب ذرا دم لو۔
ابھی میں تم کو روغنی ٹکیا ڈلوائے دیتی ہوں پھر چاہنا کھانڈ سے کھانا یا مربّے
کی پھانک سے۔ مگر خدا کے لئے اوپر سے پانی نہ پی لینا۔ ایسا نہ ہو پھر رات کو
آپ بھی مارے کھانسی کے بے چین رہو اور ہم سب کی نیند بھی حیران کرو۔ یہ
سن کر صادقہ بولی۔ اماں جان مربّے کا مرتبان تو گر کر ٹوٹ گیا۔

ماں۔ یہ کب اور کیونکر

صادقہ۔ کب اور کیونکر تو میں جانتی نہیں مگر میں نے خواب میں دیکھا
ہے خواب کا نام سن کر سب لوگ ہنس پڑے۔ بات گئی گزری ہوئی ماں نے
جلدی جلدی کر کے توا چڑھایا ٹکیا پکائی۔ جوں مُربّے کے لئے کوٹھری کھولی ایک
چھوڑ دو، دو بلیاں نکل کر بھاگیں۔ اندر جا کر دیکھا تو واقع میں مرتبان زمین
پر لوٹتا پڑا ہے۔ دو چار بار تو لوگ خبر نہ ہوئے لیکن جب دیکھا کہ یہ ہر روز خواب
دیکھتی اور جو دیکھتی ویسا ہی ظہور میں آتا تو گھر والوں کو اچھا مشغلہ ہاتھ آیا۔
صبح ہوئے اور سب نے پوچھنا شروع کیا کیوں بی آج کیا خواب دیکھا۔ نہ کبھی
ایسا ہوا کہ صادقہ نے کوئی خواب نہ دیکھا ہو۔ اور نہ ایسا ہوا کہ دیکھا ہو اور
سچا نہ اُترا ہو۔ رفتہ رفتہ پہلے گھر میں پھر محلّے میں پھر تو سارے شہر میں ایک
غل سا مچ گیا۔ اِدھر تو صادقہ کی شہرت بڑھتی جاتی تھی۔ اُدھر عمر کے ساتھ
ساتھ وہ خوابوں میں ترقی کر رہی تھی۔ صادقہ کے خوابوں کے سلسلے سے
ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح کسی علم کے مبتدی کو پہلے آسان باتیں
سکھائی جاتی ہیں اور پھر بتدریج وہ مشکل کتابوں پر عبور کرتا ہے۔
اسی طرح صادقہ کو پہلے صاف صاف خواب دکھائی دیتے تھے یعنی جو بات
ہوئی جیسی کی تیسی اُس کو خواب میں دکھائی دے گئی۔ وہی خواب وہی تعبیر

لیکن آہستہ آہستہ اسکے خواب پیچدار ہوتے چلے جو بدوں تعبیر کے ہر ایک کی سمجھ میں
نہیں آتے تھے جیسے پہیلی یا معمہ یا چیستاں۔ مثلاً گھر میں کسی کو تپ آنے کو ہوتی تو
اس نے خواب میں دیکھا۔ بخار چڑھا ہوا ہے اور پڑے ہیں۔ پھولوں دیکھنے لگی
کہ دھوپ میں بیٹھے ہیں یا آگ سے تاپ رہے ہیں اور آخر آخر کو ایسا معلوم ہوا
کہ آگے دیگچی[1] رکھی ہے اس میں چار رنگ کے چاول ہیں مگر بُسے ہوئے۔ اکثر تو
ایسا ہوتا تھا کہ صادقہ کو خواب ہی میں اس کی تعبیر بھی معلوم ہو جاتی تھی۔
گویا تعبیر بھی جزو خواب تھی۔ اور کبھی خواب میں تعبیر معلوم نہ ہوئی تو اُس نے
بیداری میں آپ تعبیر دے لی۔ ایک عجیب بات اور تھی کہ صادقہ کبھی فرمایشی
خواب بھی دیکھتی تھی یعنی مثلاً ہم کو ایک بات کے معلوم کرنے کی ضرورت
ہے اور ہم نے اُس سے درخواست کی۔ جیسا کچھ ہونے والا ہوا۔ صادقہ نے
خواب میں دیکھ دیا۔ مگر یہ بات اس کے اختیار کی نہ تھی۔ بہتیری مرتبہ ایسا ہوا
کہ صادقہ نے خواب دیکھنا چاہا اور بھلا یا برا کچھ بھی دکھائی نہ دیا۔ صادقہ نے
سب تو نہیں مگر اپنے ہزوری اور معرکے کے خواب تعبیر سمیت روزنامچے
کے طور پر ایک کتاب میں جمع کر لئے تھے۔ اور اتفاق سے وہ اصل روزنامچہ
ہمارے ہاتھ آگیا ہے۔ اور ہم اس کو عنقریب چھپوانے والے ہیں جب
وہ روزنامچہ مشتہر ہوگا تو قابل دید ہوگا۔ نہایت دلچسپ۔ اُس روزنامچے
میں ایک بڑی خوبی تو یہ ہے کہ کودن سے کودن اور غبی سے غبی اس کو پڑھ لے
اور اُلجھی ہوئی باتوں کو آسانی کے ساتھ سلجھانے لگے۔ اور اس میں تو ذرا سا بھی

---

[1] دیگچی۔ معدہ چار رنگ کے چاول صفرا۔ خون۔ بلغم۔ سودا چار خلطیں۔ چاولوں کا بُسنا خلطوں کا فساد جس سے تپ آتی ہے۔

تامل نہیں کہ صادقہ کا روزنامچہ دیکھنے کے بعد اتنی بات چار و ناچار تسلیم کرنی پڑتی ہے کہ اس جہان کے علاوہ ایک عالم ارواح بھی ہے اور سوتے میں ہم کو اسکی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے۔ اور اگر ہم اس میں مشق و مہارت پیدا کریں تو تو بہت سے اسرار قدرت منکشف ہوں۔ اور یہی معمولی خواب جو ہم اکثر دیکھا کرتے ہیں اور کبھی ان کی پروا نہیں کرتے۔ ان میں سے ہر ایک میں بڑے بڑے مطالب پوشیدہ ہوتے ہیں۔ مگر ہم کو ان کے دریافت کرنے کا سلیقہ نہیں۔"

(۵) ابن الوقت، نذیر احمد صاحب کے دوسرے ناول محصنات اور شادیاں کرلے کی خرابیاں) ایامیٰ (بیواؤں کی دُکھ بھری کہانی) نہایت دلچسپ اور ان کی مخصوص زبان و بیان کے عمدہ نمونے ہیں۔ لیکن ابن الوقت بالکل نئی وضع کا ناول ہے۔ اس میں انگریزی معاشرت کی کورانہ تقلید کے نتائج دکھائے ہیں کہ "ازیں سو رانده وزاں سو درمانده" نہ ادھر کے ہوئے نہ اُدھر کے ہوئے۔ "ابن الوقت" قصہ کا ہیرو ہے جو ایک انگریز "مسٹر نوبل" کے زیر اثر آکر اپنی ہندوستانی و اسلامی معاشرت چھوڑ کر انگریزی وضع اختیار کرتا ہے۔ اگرچہ ڈپٹی صاحب نے الحقوق والفرائض میں لکھ دیا ہے کہ ابن الوقت سے مراد خود ڈپٹی صاحب ہیں اور یہ ان کا اپنا افسانہ ہے لیکن حقیقت میں نذیر احمد صاحب نے اپنی وضع اس حد تک نہ بدلی تھی کہ ابن الوقت ان کو سمجھا جا سکے۔ اس لئے لوگوں نے اس کو سرسید پر ڈھال لیا تھا۔ چنانچہ سید محمود نے ڈپٹی صاحب سے شکایت بھی کی کہ آپ نے یہ کتاب لکھ کر میرے والد کو بدنام کیا ہے۔ لیکن انھوں نے کہا کہ میں نے تو انگریزی وضع اختیار کرنے والوں کو گالیاں دی ہیں۔ اب جو چاہے اپنے اوپر لیلے۔ ابن الوقت کا مختصر اقتباس یہ ہے۔

"ہم نے تحقیق سے سُنا ہے کہ ابن الوقت نے بارہا اپنے رازداروں سے کہا

کہ میرے یہاں کے کھانے کی ساری چھاؤنی میں تعریف ہے مگر میرا حال یہ ہے
کہ انگریزی کھانا کھاتے ہوئے اتنی مدت ہوئی، سچ تو یہ ہے کہ ایک دن سیری
نہیں ہوئی اور میں اکثر خواب میں اپنے تئیں ہندوستانی کھانا کھاتے ہوئے
دیکھتا ہوں۔ ابن الوقت کے خاص خدمت گار کی زبانی معتبر روایت ہے
کہ ایک بار اسکو سخت تپ لاحق ہوئی اور عادت کے موافق لگا بہکنے۔ تو وہ
ہندوستانی کھانوں کے نام لے لے کر روتا تھا اور کھانے بھی پلاؤ، زردہ،
متنجن، بریانی نہیں بلکہ مونگ کی دال کا بھرتا، دھوئی ماش کی پھریری دال
امرودوں کے کچالو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ چٹپٹی چیزوں کو ترس گیا تھا

معلوم ہے کہ ابن الوقت ابتدائے تبدیل وضع سے گھر بار چھوڑ کر باہر
چھاؤنی میں جا رہا تھا۔ اس کے پاس اتنے نوکر چاکر تھے کہ اس کی کوٹھی کا احاطہ
بجائے خود ایک چھوٹا سا محلہ تھا لیکن اس کی زندگی ویسی ہی اداس تھی جیسی
ایک بیچلر[1] کی ہوتی ہے اور ہونی چاہئے۔ وہ نوکروں کے حق میں بڑا سیر چشم تھا
اسکے یہاں نوکروں کی ایسی بھاری تنخواہیں تھیں کہ دلی کی اتنی بڑی چھاونی میں
بس دو چار ہی جگہ اور ہوں گی اس لئے تمام نوکر سلیقہ مند اور مستعد تھے اور
حقیقت امر ہے کہ انہی نوکروں نے انگریزی سوسائٹی میں بات بھی بنا رکھی
تھی۔ مگر نوکر کیسے ہی ہوشیار کیوں نہ ہوں پھر بھی مالک کی تائید کی ضرورت
باقی رہتی ہے۔ انگریزی زندگی ایسے بکھیڑے کی زندگی تھی کہ ابن الوقت کو
جتنا وقت کچہری اور ملاقات سے بچتا تھا، صفائی کی نگرانی اور ہر چیز کی خبر
گیری کے لئے بہ مشکل وفا کرتا تھا۔ یہ سچ ہے کہ اس کے نوکر انگریزی مذاق سے

---

[1] کنوارا۔ غیر شادی شدہ

خوب واقف تھے مگر ابن الوقت سے خود صبر نہیں ہو سکتا تھا وہ اپنی طرف سے
ایسی خراش تراش ایجاد کرنے لگا تھا کہ خواہی نخواہی اس کو دیکھنا پڑتا تھا
دعوت ایسے مزے کی چیز ہے کہ کھلانے والا اور کھانے والا دونوں ہی خوش
ہوتے ہیں مگر ابن الوقت کے یہاں کی دعوت اس کے حق میں ایک مصیبت
ہوتی تھی کھانا تو کہیں جاکر رات کے نو دس بجے نصیب ہوتا اور اہتمام کی
آندھی صبح سویرے سے چلنی شروع ہو جاتی تھی۔ ہم کو تو کوئی ایسی دعوت
یاد نہیں کہ ابن الوقت تکان کی وجہ سے اس کے بعد علیل نہ ہوا ہو پھر
چھٹے چھ ماہے دعوت ہو تو خیر! یہاں ہر مہینے کچھ نہ ہو تو بڑے کھانے دو تین
بلکہ بعض اوقات تو ابن الوقت گھبرا کر بول بھی اٹھتا تھا کہ میں نے کہاں کا کھڑاگ
اپنے پیچھے لگا لیا ہے۔ ابن الوقت بیچارے مصیبت کے مارے کو ایک سے
ایک سخت مشکل درپیش تھی کہ وہ تو وہی ہٹ کا پورا تھا کہ ان آفتوں کو بری
طرح یا بھلی طرح جھیلتا رہا۔ دوسرا تو کبھی کا بھاگ کھڑا ہوا ہوتا اور پھر اس کا نام
نہ لیتا۔ "ہاتھیوں کے ساتھ گنے کھانا کچھ لڑکوں کا کھیل ہے۔"

ابن الوقت غدر سے پہلے بھی اچھا خاصہ خوش حال تھا قلعے کی تنخواہیں تو
تھوڑی تھیں مگر اوپر سے انعام واکرام وغیرہ ملا کر بہت کچھ پڑ رہتا تھا۔ ہمارے
اندازے میں ابن الوقت کی آمدنی پچاس روپیہ ماہوار سے ہرگز کم نہ تھی اور
غدر کے بعد سے تو کچھ پوچھنا ہی نہیں۔ نہ سو نہ سوا سو۔ ماشاءاللہ ایک دم سے
پانسو۔ اس آمدنی پر اچھے سے اچھا کھاتا۔ اچھے سے اچھا پہنتا، غرض امیرانہ خرچ
رکھتا۔ مگر ہندوستانیوں کا سا ہوتا تو چند سال کے عرصہ میں اس کے پاس
معتدبہ سرمایہ ہو جاتا لیکن اس نے کرنی چاہی انگریزوں کی ریس۔ پورا برس
خیریت سے گزرنے نہیں پایا کہ لگا ادھار کھانے۔ جس وقت اس کو جاں نثار نے

نہلا دھلا کر پہلے پہل انگریزی کپڑے پہنائے تو کوٹھی کا ساز و سامان اور اپنی
شان دیکھ کر اس کو اس قدر خوشی ہوئی تھی کہ اپنے آپے میں نہیں سماتا تھا۔ اور
ابھی اس خوشی کا اثر طبیعت پر باقی تھا کہ ایک چپراسی بڑا لمبا چوڑا لفافہ لئے ہوئے
برآمدے تک آیا۔ قاعدے کے مطابق بیرا بیرہ نے لفافہ کشتی میں رکھنے
صاحب کے حضور میں پیش کیا۔ کھولا تو جنرل سپلائر کا بل تھا۔ کتنے کا؟ کچھ اوپر
پانچ ہزار کا۔ پانچ ہزار کی رقم دیکھ کر قریب تھا کہ حواس مختل ہو جائیں۔ مگر
"سنگ آمد و سخت آمد" چون و چرا کرنے کا موقع نہیں "قہر درویش برجانِ
درویش" دینا ہی پڑا۔ مگر کیونکر؟ ہزار کا توڑا نوبل[1] صاحب کا دیا ہوا سر بند
رکھا ہوا تھا وہ لیا اور بہزار مشکل دو ہزار گھر میں سے فراہم کئے پھر بھی سوا دو ہزار
اور ہوں تو پنڈ چھوٹے بارے غدر سے پہلے نواب معشوق محل بیگم صاحبہ کی
سرکار میں ابن الوقت کی معرفت گردوالوں[2] کا لین دین تھا۔ ڈرتے ڈرتے انکو
رقعہ لکھا۔ اسامی تھی کھری اور جان دار انھوں نے بے تامل روپیہ حوالے کیا
یوں جنرل سپلائر کا پوت پورا ہوا۔ لیکن ابن الوقت نے خرچ کا ڈربا کھول دیا
تھا جس نسبت سے ان کی آمد بڑھی تھی اگر اسی نسبت سے خرچ بھی بڑھتا تو
چنداں حرج کی بات نہ تھی۔ پر اس نے لیٹنے کے ساتھ چادر کے باہر پاؤں پھیلا دئے
اول سرے گھر کے تہرے چوہرے مکان ہوتے ساتے چالیس روپیہ کا بنگلہ؛

---

[1] ایک انگریز جن کو ایام غدر میں ابن الوقت نے پناہ دی اور ان سے خلا ملا ہونے کے بعد ابن الوقت نے ہندوستانی تمدن کو چھوڑ کر یورپ کا تمدن اختیار کیا تھا۔ نوبل صاحب موصوف مسٹر ابن الوقت کے معاون و مددگار رہے۔

[2] دہلی کے مشہور ساہوکار تھے۔

پھر فٹن، ٹمٹم (ڈینڈم) بروم، پالکی گاڑی، چار قسم کی بگھیاں اور چار کے چار
گھوڑے اور ایک زین سواری کا، پانچ۔ دھوبی۔ سقہ، چوکیدار، فراش، شعلچی
باورچی، سائیس، گھاس کٹ، مہتر، مالی، بیرا، دو ڈھائی درجن کے قریب
شاگرد پیشہ، ان کی تنخواہوں کے علاوہ وردی، اس کی مناسبت سے دوسرے
مصارف، باستثناء میز کرسی کہ اس کا کچھ اندازہ ہی نہیں ہو سکتا۔ مہینے میں
اچھے جید دو کھانے بھی ہو گئے تو ساری تنخواہ پر پانی کا پھر جانا کچھ بات نہیں
ابن الوقت نے شروع میں شاید تین یا چار تنخواہیں وقت پر لی ہوں گی۔
اس کے بعد سے تو خزانچی کے ساتھ معاملہ ہو گیا۔ ایک چھوڑ دو دو مہاجن
دینے والے۔ جب ضرورت ہوئی جتنا چاہا منگا لیا۔ تنخواہ تو اوپرے اوپر
خزانچی لے لیا کرتا تھا اور زمینداری کا محاصل گڑ والوں کی کوٹھی میں چلا جاتا
تھا۔ ان بچا کو صاحب بننے کی دھن میں اتنی بھی خبر نہ تھی کہ سر پر کتنا قرضہ لدتا چلا
جا رہا ہے۔ غرض جس طرح ایک آدمی کو کسی بات کی رٹ نہیں لگ جاتی بس
ابن الوقت کو صاحب بننے کی رٹ تھی۔ شروع شروع میں تو اس کو مسلمانوں کے
حال پر بھی ایک طرح کی نظر تھی لیکن چند روز کے بعد اس کی ساری رفارم اسی
پر منحصر ہو گئی تھی کہ یورپ کے اوضاع و اطوار میں سے کوئی وضع اور کوئی
طرز چھوٹنے نہ پائے۔ بھلا کوئی پوچھے کہ تیرے پاس آنا پیسہ بھی ہے۔ جتنا انکے
پاس ہے؟ کمبخت آپ بھی برباد ہو رہا تھا اور اس کی دیکھا دیکھی کچھ ایسی ہوا
چلی کہ مسلمانوں کے نوجوان لڑکے خصوصاً جنھوں نے ذرا سی انگریزی پڑھ لی
تھی یا جو گھر سے کسی قدر آسودہ تھے، تباہی کے لچھن سیکھتے چلے جاتے تھے۔ اسکے
اندرونی حالات کی تو کسی کو خبر نہ تھی۔ ظاہر میں دیکھتے تھے کہ انگریزوں سے ملتا
جلتا ہے۔ جو بات کسی ہندوستانی عہدے دار کو نصیب نہیں، اس کو حاصل ہے

اور لوگوں کی نظر میں انگریزی وضع خدا کے فضل سے جو کسی ایک کو پھلی ہو۔
سبھی نے تو اپنی اپنی جگہ تھوڑا بہت نقصان اٹھایا اور شاید نقصان نہ بھی
اٹھایا تو کسی کو کسی قسم کا فائدہ تو ہوا نہیں۔ اور ہوتا کیسے؟ کوئی مفلس آدمی
مالداروں کے سے کام کرنے لگے تو وہ کیونکر پنپ سکتا ہے؟"

(۶) ترجمہ قرآن مجید؛ ڈپٹی نذیر احمد صاحب کی سب سے بڑی مذہبی خدمت
اور زنانہ ناولوں کے بعد اردو زبان و ادب کا عظیم الشان کارنامہ قرآن کریم کا
ترجمہ ہے۔ اس سے پہلے صرف دو لوں "شاہ بھائیوں" (شاہ رفیع الدین صاحب اور
شاہ عبدالقادر صاحب) کے اردو ترجمے تھے۔ ان کی زبان سو برس کی پرانی ہو چکی
تھی۔ ڈپٹی صاحب نے اپنے ترجمے میں نہایت ضروری اور مفید اضافے کئے۔

(۱) صرف زبان کو با محاورہ نہیں کیا، بلکہ خطوط ہلالی میں تشریحی الفاظ لکھ کر
عبارت کو مسلسل و مربوط کر دیا۔

(۲) حاشیے پر فائدے لکھے۔ ان میں شاہ عبدالقادر صاحب کی تفسیر
"موضح القرآن" سے مدد لی ہے۔ بلکہ جا بجا ان کی عبارتیں نقل کر دی ہیں۔

(۳) لغات عربی کی تشریح الگ لکھی یہ عربی داں قاریوں کو خاصکر مفید ہے۔

(۴) مضامین قرآن مجید کی فہرست حوالۂ آیات کے ساتھ ایسی تفصیل و تجزیہ کے
ساتھ مرتب کی کہ مطالب قرآنی کے اندازے کے ساتھ تنزیل الٰہی کی ضرورت و عظمت
بھی بیک نظر معلوم ہو جاتی ہے۔ یہ چیز بھی اردو میں عجیب و جدید تھی۔

نذیر احمد صاحب نے ترجمۂ قرآن بھی اپنی بے تکلف زبان و محاورہ میں
کیا ہے۔ مثلاً

(۱) ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ	پھر عرش پر جا براجا
(۲) قَالَ فَبِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ	(اس پر) شیطان بولا کہ جیسی تو نے میری

صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ
(اعراف پارہ ۸)

راہ ماری ہے، میں بھی تیرے سیدھے راستے پر بنی آدم کی تاک میں بیٹھوں تو سہی

(۳) وَنَادٰىهُمَا رَبُّهُمَآ اَلَمْ اَنْهَكُمَا عَنْ تِلْكُمَا الشَّجَرَةِ
(اعراف)

اور انکے پروردگار نے ان کو ڈانٹا کہ کیا ہم نے تم کو اس درخت (کے کھانے) کی مناہی نہیں کی تھی۔

(۴) قَالَ اَبُوْهُمْ اِنِّيْ لَاَجِدُ رِيْحَ يُوْسُفَ لَوْلَآ اَنْ تُفَنِّدُوْنِ
(یوسف پارہ ۱۳)

انکے باپ (یعقوب) نے کہنا شروع کیا کہ اگر مجھ کو سترا بہترا نہ بناؤ تو (ایک بات کہوں کہ) مجھ کو تو یوسف کی مہک آرہی ہے

(۵) فَصَبَّ عَلَيْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ اِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ
(فجر پارہ ۳۰)

تو اے پیغمبر تمہارے پروردگار نے ان (سب) پر عذاب کا کوڑا پھٹکارا بے شک تمہارا پروردگار نافرمانوں کی تاک میں (لگا رہتا) ہے۔

(۶) فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْۢبِهِمْ فَسَوّٰىهَا
(شمس پارہ ۳۰)

تو انکے پروردگار نے انکے گناہ کے بدلے ان پر ہلاکت لا نازل کی اور سب کو (مار کے) پٹڑا کر دیا۔

(۷) اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا
(بنی اسرائیل پارہ ۱۵)

کیونکہ نماز صبح کا وقت نور ظہور کا وقت ہے۔

اس آخری ترجمہ (نور ظہور کا وقت) پر نذیر احمد صاحب نے حاشیہ پر یہ فائدہ لکھا ہے:-

"مفسرین نے لفظ مشہود کے بہت سے معنی لکھے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ انتظام دنیا کے لئے جو فرشتے آتے ہیں، دن کے فرشتے الگ ہیں اور رات کے الگ ہیں،

اس وقت ان کی بدلی ہوتی ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ صبح کی نماز میں نمازی کثرت سے
جمع ہوتے ہیں۔ اور بعض کہتے ہیں کہ صبح کا وقت حضور قلب کا وقت ہے کہ نماز میں
جی خوب لگتا ہے اور اس کے سوا اور بہت سے اقوال ہیں۔ ان سب تفسیروں پر
نظر کر کے ہم نے ایک لگتا ہوا سا ترجمہ اختیار کر لیا ہے۔ اور قرآن الفجر کے معنی
تو ظاہر ہیں "صبح کا قرآن" مگر اس سے مراد نماز صبح ہے۔"

ترجمہ کے نمونے میں انھی آیتوں کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے جن کا شاہ صاحبان
کے ترجمہ سے اقتباس ہو چکا ہے اور اس کتاب کے صفحہ ۶۵ پر درج ہے تاکہ اسلوبِ
زبان کا باہم مقابلہ آسان ہو:۔

(۱) "اے ہمارے پروردگار اگر ہم بھول جائیں یا چوک جائیں تو ہم کو (اسکے وبال میں)
نہ پکڑ اور اے ہمارے پروردگار جو لوگ ہم سے پہلے ہو گزرے ہیں جس طرح
ان پر تو نے (ان کے گناہوں کی پاداش میں احکام سخت کا) بار ڈالا تھا
ویسا بار ہم پر نہ ڈال۔ اور اے ہمارے پروردگار اتنا بوجھ جس (کے اٹھانے)
کی ہم کو طاقت نہیں ہم سے نہ اٹھوا اور ہمارے قصوروں سے درگذر اور
ہمارے گناہوں کو معاف کر اور ہم پر رحم فرما۔ تو ہی ہمارا حامی و مددگار
ہے۔ تو ان لوگوں کے مقابلے میں جو کافر ہیں ہماری مدد کر۔"

(سورۂ بقرہ کی آخری آیت)

(ب) "(پھر ہم جنات اور بنی آدم دونوں سے مخاطب ہو کر پوچھیں گے کہ) اے
گروہ جن و انس کیا تمہارے پاس تمہیں میں کے پیغمبر نہیں آئے کہ تم سے
ہمارے احکام بیان کریں اور تمہارے اس روز (قیامت) کے پیش آنے
سے تم کو ڈرائیں۔ وہ عرض کریں گے ہم اپنے اوپر آپ ہی گواہی دیتے ہیں
(یعنی اپنے گناہ کا اقرار کرتے ہیں) اور (واقع میں) دنیا کی زندگی نے ان کو

دھوکے میں رکھا اور (اب) انھوں نے آپ ہی اپنے اوپر گواہی دی (یعنی اقرار کیا)

کہ بے شک وہ کافر تھے۔"

ڈپٹی صاحب کے ترجمہ کی جدتوں اور خوبیوں سے بعد کے مترجمین نے بڑا فائدہ اٹھایا خطوط ہلالی کے تشریحی الفاظ تو بلا استثنا تمام مترجمین نے اپنے اپنے ترجموں میں بڑھائے۔ تفسیری حاشیے بھی اکثر نے لکھے۔ چند مشہور مترجم یہ ہیں: مولوی[1] فتح محمد جالندھری، مولوی[2] عاشق الٰہی، مولوی[3] احمد رضا خاں بریلوی، مولوی[4] اشرف علی تھانوی، مولوی[5] محمود الحسن دیوبندی۔ ان سب کے ترجمے اپنے اپنے دائروں میں مقبول ہیں۔ لیکن یہ سب مولوی نذیر احمد دہلوی سے مستفیض ہیں، اگرچہ سب نہیں تو ان میں سے اکثر وہ ہیں جنھوں نے نذیر احمد پر ترجمہ کی خامیوں اور زبان و محاورہ کی آزادیوں کے سبب سے کفر تک کے فتوے لگا دئے تھے۔ اس ہنگامہ آرائی کی حقیقت یہ ہے کہ ڈپٹی نذیر احمد باوجود وضع قدیم کے بہت کچھ آزاد خیال تھے، اور اس سے بڑھ کر یہ کہ اپنے آپ کو مجتہد سمجھتے تھے اسلئے انکے عقائد و اعمال میں بعض وہ باتیں بھی شامل تھیں جو مذہب جمہور کے خلاف ہیں۔ یہ بنائے فساد تھی اور اس بنا پر علمار کا ڈپٹی صاحب سے اختلاف بیجا نہ تھا۔ لیکن اصل یہ ہے کہ جن مترجموں کے نام اوپر لکھے گئے، ان میں سے بھی بعض بزرگ عقیدہ و مسلک کے اعتبار سے باہم تخالف و تضاد رکھتے ہیں۔ اور ایک کا ترجمہ دوسرے کے نزدیک نامعتبر ہے۔ اس قسم کا اختلاف ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا۔ ہم کو اس وقت ترجمہ کی جدتوں اور خوبیوں سے بحث ہے، اس میں ڈپٹی صاحب کا فضلِ تقدّم مسلم ہے۔

(۷) **الحقوق والفرائض**، ترجمۂ قرآن شریف کی مفصل فہرست مضامین بناتے وقت ڈپٹی نذیر احمد صاحب کو خیال آیا ہو گا کہ یہ مضامین الگ

کتاب کی صورت میں مرتب کر دیئے جائیں جن میں قرآن مجید کے علاوہ حدیث شریف کے حوالے بھی ہوں اور اپنی طرف سے ان مطالب کی تفسیر بھی۔ چنانچہ ایک ہزار صفحوں کے تین حصّے تیار کر دیئے۔ پہلا حصّہ حقوق اللہ، دوسرا حقوق العباد تیسرا اخلاق۔ تیسرے حصّے کے آخر میں "خاتمۃ الطبع" شامل ہے جو ڈپٹی صاحب نے یکم ستمبر ۱۹۰۶ء کو لکھا ہے۔ یعنی اس تاریخ تالیفِ کتاب ختم کی ہے۔ اس کے آغاز میں صورت تالیف یہ بیان کرتے ہیں :-

"جس چاؤ سے ہم نے اس کتاب کے جمع کرنے کا منصوبہ باندھا، اسی نے آخر کار ختم کی خوشی میں کمنڈٹ کی۔ ہم نے اس کو خدا کی خاص عنایت سمجھا کہ ہم نے ایسی کتاب کی ضرورت کا احساس کیا۔ ہر چند جستجو کی عربی، فارسی، اردو میں اس طرح کی کتاب کا کہیں پتہ نہ لگا۔ مجبور اپنے بوتے سے بڑھ کر آپ اس کا بیڑا اٹھایا۔ شوق متقاضی کہ جو کام برسوں میں ہونے کا ہے مہینوں میں سرانجام پلائے مہینوں کا دنوں میں، دنوں کا گھڑیوں میں، گھڑیوں کا پلوں میں۔ اور ایسا ہی ہوا کہ مسودے کی سیاہی سوکھنے نہیں پاتی تھی کہ چھپنے کے لئے دے دیا جاتا تھا، بلکہ بعض اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ چھاپے خانے والوں کے تقاضے سے مسودہ لکھا گیا ہے۔ ناظرین انصاف کریں کہ کہیں ایسی مہتم بالشان تصنیفیں اس عجلت سے بھی ہوئی ہیں۔ ہم نے بھی اپنی عمر کا معتدبہ حصہ اسی شغل میں گذارا ہے تو اطمینان سے برسوں میں مسوّدے کئے ہیں۔ برسوں مسودے زیر نظر رہے ہیں، اور اس پر بھی آخری پروف تک اصلاح و ترمیم ہوتی رہی ہے تب کہیں جا کر کتاب کو خلعۂ قبول حاصل ہوا ہے۔"[1]

---

[1] ڈپٹی صاحب کا یہ مضمون دیکھ کر اس نوٹ کے لکھنے کا خیال آیا۔ یہ میری (باقی حاشیہ صفحہ ۵۹۵ پر)

الحقوق والفرائض کی ترتیب اس طرح ہے کہ ہر عنوان کے نیچے قرآن وحدیث کے متعلقہ اقتباسات لکھے ہیں اور بالمقابل ان کا ترجمہ درج کیا ہے اور نیچے ضروری حاشیے دئے ہیں۔ پھر من المترجم لکھ کر اپنی تفسیر وتشریح لکھی ہے، جو کہیں چند سطریں ہیں کہیں طویل مضمون اور کہیں رسالہ کا رسالہ حقوق اور اخلاق وآداب کا ایسا احاطہ کیا ہے کہ اپنے نزدیک ادنیٰ سی بات بھی نہیں چھوڑی نمونے کے طور پر ایک چھوٹی سی فصل پوری نقل کی جاتی ہے:۔

حُقّے پان کے آداب

عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ — ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ جناب پیغمبر خدا!

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۹۴)

خامی وکوتاہی کا اظہار واقرار تو ہے، لیکن تصنیفی لطیفہ بھی ہے کہ میری یہ تالیف داستان تاریخ اردو بھی اسی طرح لکھی اور چھاپی جارہی ہے کہ کبھی مسودے کے چند اوراق لکھتے ہی مطبع کو دیدئے گئے اور کبھی اہل مطبع کے تقاضے سے مسودہ لکھا گیا۔ لیکن مجھ میں اور ڈپٹی صاحب میں یہ فرق ہے کہ انھوں نے کتاب کو شروع کرنے کے بعد ختم کرکے دم لیا۔ اور مجھے لکھتے ہوئے چوتھا برس ہے۔ نہ لکھنا ختم ہوا نہ چھپنا۔ ۱۹۳۸ء میں لکھنی شروع کی اور کتاب [illegible] تاریخی نام بھی اُسی سال نکال لیا اسی سال کتاب چھپنی شروع ہوئی، لیکن ۱۹۳۹ء کے شروع میں تالیف وطباعت دونوں بند ہوگئیں۔ پھر آخر سال میں دونوں کام شروع ہوئے اور رک گئے۔ پھر ۱۹۴۰ء میں کتاب کے ۹۶ صفحے چھپنے کے بعد مسودہ ختم ہوگیا اور کام بند رہا۔ اب ۱۹۴۱ء کے وسط میں پھر لکھنا اور چھپنا شروع ہوا ہے اور ساتھ ہی ساتھ فہرست مضامین بھی چھپتی جاتی ہے۔ اسی سال ختم کرنے کے ارادے سے اختتام تالیف کی تاریخ بھی سرورق پر لکھوا دی ہے وما توفیقی الا باللہ یہ مضمون دیباچے میں لکھنے کا تھا لیکن یہیں سہی۔ — قادری

صَلَّى اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مِنْ حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْکُہٗ مَا لَا یَعْنِیْہِ (ترمذی)

صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، آدمی کا بہترین اسلام ان چیزوں کے چھوڑ دینے میں ہے جو اس کے کارآمد نہیں

(من المترجم۔ ہم اپنی جگہ اسی خیال میں ہیں کہ یہ کتاب احکام شریعۃ اسلامی کے قانون کا کام دے۔ بڑی چھوٹی کوئی بات اس سے رہ نہ جائے۔ ایک دن بیٹھے بیٹھے خیال آیا کہ کھانے پینے کی حرام حلال چیزوں پر ہم بہت کچھ لکھ چکے ہیں۔ بڑی بھول ہوئی کہ حقے پان تماکو کی نسبت کچھ نہیں لکھا، حالانکہ یہ چیزیں ہم مسلمانوں میں اس کثرت سے چل پڑی ہیں کہ اب ان ہی کی تواضع مدارات رہ گئی ہے۔ اور غالباً دو تہائی سے زیادہ ہی زیادہ مرد وزن اس بلا میں مبتلا ہیں۔ حقیقت میں تو حقہ پان تماکو ماکولات اور مشروبات کی قسم کے ہیں نہیں، اور اسی وجہ سے ہم نے کھانے پینے کی حرام حلال چیزوں کے بیان میں اُن کے حال سے تعرّض نہیں کیا۔ مگر بولنے میں حقے پان تماکو کو کھانے پینے ہی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ کثرت استعمال اور تعبیر کے لحاظ سے ہم نے ان کا جُداگانہ باب قائم کیا۔ فرضی حکایتوں میں سے ایک حکایت ہے کہ ایک چوہے کو کہیں سے ہلدی کی ایک گرہ مل گئی۔ وہ برخود غلط اسی گرہ کے برتے پر اپنے تئیں پنساری سمجھنے لگا۔ یہی حال آدمی کا ہے۔ خصوصاً ان وقتوں کے متزلزل العقیدہ مسلمانوں کا تا وقتیکہ عقل اجازت نہ دے۔ معاذ اللہ خدا رسول کسی کے کہنے کا یقین نہیں کرتے، تو یہ گویا وہی برخود غلط چوہے ہیں اور عقل انکی ہلدی کی گرہ۔ بے شک ہم کو عقل اسی لئے دی گئی ہے کہ ہم اس سے دنیا اور دین دونوں میں مدد لیں۔ اس کی ہدایت پر کاربند ہوں، اور عقل ہی کی وجہ سے ہم مکلف بالشرائع بھی ٹھہرائے گئے ہیں۔ مگر غلطی کیا ہوتی ہے کہ ہم (ہر کس را عقل خود بکمال وفرزند خود بجمال) اپنی عقل کو عقل کامل سمجھ کر اسکو معصوم عن الخطاء

مانے ہوئے ہیں۔ اور عقل سے فوق طاقت کام لیتے ہیں۔ جیسے کوئی شخص چشم سر سے پس دیوار یا مسافت بعیدہ پر دیکھنے کا قصد کرے۔ پس یہ ہے منشا گمراہی کا، اور اسی سے کہا گیا ہے کہ اَلْعِلْمُ حِجَابُ اَکْبَرُ۔ اب یہی معاملہ کھانے پینے کی حرام حلال چیزوں کا ہے۔ ہم نے سوچ کر حرمتہ کی دو وجہیں پیدا کیں۔ مَا اُھِلَّ لِغَیْرِ اللّٰہِ بِہٖ کے لئے ممانعتِ شرک، اور باقی محرمات کیلئے ان کا از روئے طب انسان کی جسمانی، دماغی، اخلاقی صحت کے حق میں اوپر سوپر مضر ہونا۔ اس پر بھی اگر کسی خاص چیز کی حرمت کی وجہ شافی سمجھ میں نہ آئے تو قصور فہم کا اعتراف کر کے ہم کو چاہئے کہ حکم شارع کو بے چون و چرا تسلیم کریں سلہ ایسا بھی ہے کہ بعض چیزوں میں شارع نے بنظر مزید اہتمام و احتیاط تضییق بھی کی ہے۔ تو وہ بھی مبنی بر مصلحت ہے۔ جیسے شراب کہ حد سکر کو نہ بھی پہنچے تو بھی حرام ہے۔ تِلْکَ حُدُوْدُ اللّٰہِ فَلَا تَقْرَبُوْھَا۔ وَمَنْ یَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰہِ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الظّٰلِمُوْنَ۔ حقّے پان تماکو میں حقے کا تو کچھ قصور نہیں کہ ایک آلہ ہے اور نہ پان کا کہ وہ پتا ہے قصور جو کچھ ہے تماکو کا ہے۔ تو مولویوں کے جھگڑے میں کون پڑے۔ کوئی اس کو حرام بتاتا ہے، کوئی مکروہ تحریمی، کوئی مکروہ تنزیہی۔

لہ یہ اللہ کی (باندھی) حدیں ہیں تو ان کے پاس بھی نہ پھٹکنا۔ اسی طرح اللہ اپنے احکام لوگوں سے کھول کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ وہ (خلاف حکم کرنے سے) بچیں۔ مہ

مہ الحقوق کے اس حاشیے میں جو ترجمہ درج ہے، اس میں اوپر کی دوسری آیت کا ترجمہ نہیں ہے غلطی سے کسی اور آیت کا ترجمہ لکھ دیا گیا ہے۔ اس آیت (ومن یتعد.....) کا ترجمہ ہے "اور جو لوگ اللہ کی حدوں سے تجاوز کریں وہی ظالم ہیں" (م)

اور بعض اس کی حلت کے بھی قائل ہیں۔ ہم تو اتنا ہی کہتے ہیں کہ اپنے پیچھے ایک لت لگا لینے کی تو بات ہی اور ہے۔ تماکو کھایا جائے یا پیا جائے یا سونگھا جائے عادت سے پہلے لایعنی تو ضرور ہے۔ اور مِنْ حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْكُهُ مَا لَا يَعْنِيهِ کی رو سے تماکو کا استعمال کسی طرح بھی ہو پرہیزگاری کی شان سے بعید جتنے کا تماکو ملک میں خرچ ہوتا ہے، صوبے صوبے میں یونیورسٹی (دار العلوم) بنا دینے کا تو میں ٹھیکہ لیتا ہوں۔ لیکن اگر خدا کسی قوم کی عقلیں گدی میں لگا دے تو وہ کیا فلاح پا سکتی ہے۔ مولوی بیچارے حرمت نہیں کفر انتہا درکے فتوے بھی دیں تو تماکو کا رواج رک نہیں سکتا کہ اب شرط زندگی ہو گیا ہے "

نذیر احمد صاحب نے من المترجم میں جو کچھ لکھا ہے، اس سے ان کا طول کلام کا شوق ظاہر ہے۔ اسی طرح ہر جگہ بات کو بڑھا کر کہتے ہیں۔ لیکن کمال یہی ہے کہ ان کا "درازترہ" کہنا بھی "لذیذ" ہوتا ہے۔

(۸) الاجتہاد یہ ڈپٹی نذیر احمد کے آخری زمانے کی کتاب ہے جو ۱۹۰۶ء (۱۳۲۴ھ) میں تصنیف کی ہے۔ اور ان کے اُسی مخصوص رنگ کی کتاب ہے صرف وجہ تالیف کی چند سطریں نقل کی جاتی ہیں۔

"ایک دن بیٹھے بیٹھے مجھے یہ خیال آیا کہ "میں کیوں مسلمان ہوں؟" یہ خیال کچھ ایسا پیچھے پڑا کہ ہر چند میں اس کو ٹالنا چاہتا تھا۔ ٹلنے کا نام نہیں لیتا تھا۔ یہاں تک کہ کئی سال متواتر میں اسی خیال میں غلطاں پیچاں رہا۔ خیال نے ایسی وسعت پکڑی کہ تھا تو میں ایک، مگر ایسا معلوم ہوا کہ ایک سے دو ہو گیا ہوں۔ ایک حیثیت سے سائل اور دوسری حیثیت سے مجیب۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ ایسا خیال کبھی دوسرے مسلمانوں کو بھی آتا ہے یا نہیں، مگر آنا چاہیے۔ بلکہ مسلمانوں کی خصوصیت نہیں، میں تو کہتا ہوں کہ ہر ایک شخص کو جو مذہب کی

ضرورت کو سمجھ کر کسی خاص مذہب کا معتقد ہو، کبھی نہ کبھی اپنے نفس سے پوچھنا
چاہئے کہ وہ کیوں مثلاً ہندو یا عیسائی یا یہودی یا پارسی یا کیا کیا ہے۔ ایسا
خیال کرنے سے قوی امید ہے کہ وہ حق کو دریافت کرے گا۔"

چنانچہ الاجتہاد میں سوال و جواب کی صورت میں تمام عقائد مذہبی و اسلامی سے بحث کی ہے، اور اسلام کو عقل کے مطابق ثابت کیا ہے۔

(۹) مبادی الحکمۃ، علم منطق کا رسالہ ہے اور نذیر احمد صاحب کی قدیم تصانیف میں ہے۔ سنہ ۱۸۷۱ء (سنہ ۱۲۸۸ھ) میں لکھا گیا۔ اس کا سبب تالیف یہ بیان کرتے ہیں:۔

"اب وقت وہ پہنچا اور وہ زمانہ آگیا کہ مشکل سے مشکل مضمون اور پیچیدہ مطلب
پر بھی ہم اپنی ہی زبان میں مباحثہ اور مناظرہ کرتے رہیں۔ پس کیا ایسی حالت میں
زبان اردو منطق کی حاجت مند نہیں، بہ سخت حاجت مند ہے۔ دعوے کا اثبات
حق کا مطالبہ، استحقاق کی حفاظت، دلیل کی استواری، مطلب کی تائید، اعتراض
کی تردید، الزام کا دفعیہ، فریب کی پردہ دری، مغالطے کا افشا، حتیٰ کہ احقاق حق،
وابطال باطل، منطق نہیں تو کچھ نہیں۔ یہی حاجت دیکھ کر میں نے اس رسالہ
اردو میں ضروری مسائل علم منطق جمع کئے۔ باتیں وہی قطبی اور اس سے فرو تر
کتابوں کی ہیں۔ طرز ادا میرا ہے۔ اور ایک انگریزی رسالہ منطق جناب افضل الحکما
ایم کیسن صاحب بہادر دام اقبالہم نے عنایت فرمایا تھا، کچھ اس سے اخذ کیا ہے
یوں عربی اور انگریزی مل کر ایک شان خاص پیدا ہو گئی ہے۔"

اردو میں اس سے پہلے بھی منطق کی کتابیں لکھی گئی ہیں، جن میں سے بعض کے نمونے پہلے آچکے ہیں۔ مولوی عبدالحی منطقی خیرآبادی نے اپنا رسالہ منطق بالکل قدیم اصول و طرز پر لکھا ہے۔ اور لوگوں نے کوئی جدت پیدا کی تو اختصار مضمون اور سلاست زبان

کے سبب سے اس میں لُطف پیدا نہ ہوا۔ مولوی نذیر احمد نے اپنی جدّت طرازی سے کام لیا۔ اور اردو میں بالکل نئی چیز پیدا کر دی لیکن علماء و مدرسین کی قدامت پرستی نے نذیر احمد صاحب کے "مبادی الحکمۃ" سے فائدہ اٹھانا گوارا نہ کیا۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں بھی منطق کی تعلیم جاری ہے، لیکن وہ انگریزی زبان میں ہے۔ اس لئے ڈپٹی صاحب کی یہ کتاب آگے نہ چل سکی۔ ان کے بعد مولوی سجاد مرزا بیگ دہلوی مرحوم نے ایک منطق کی کتاب الاستدلال کے نام سے لکھی اور اچھی لکھی۔ اس میں عربی و انگریزی دونوں اصطلاحیں لکھی ہیں اور طرز بیان شگفتہ و دلچسپ ہے۔ مبادی الحکمۃ کا مختصر نمونہ یہ ہے:۔

"حدّ اوسط۔ قیاس کے دو مقدموں میں حدّ اوسط کا مکرر ہونا استاج (نتیجہ دینا) کے لئے شرط اعظم ہے۔ اس میں کبھی کبھی مغالطہ بھی واقع ہوتا ہے، اور اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ بادی النظر میں تو حدّ اوسط مکرر معلوم ہوتی ہے۔ جو لفظ صغریٰ میں ہے وہی کبریٰ میں ہے۔ مگر ایک میں اس لفظ کے حقیقی معنی مراد ہوتے ہیں دوسرے میں مجازی۔ یا ایک میں لغوی دوسرے میں منقول۔ یا یہ کہ وہ لفظ مشترک ہے ایک میں کچھ دوسرے میں کچھ۔ مقولات شعرا تمام تر اسی طرح کے مغالطات سے بھرے ہوتے ہیں۔ مثلاً

مکن در خانہ سازی طول۔ اندک عرض من بشنو

کہ ایں را قصر می نامند۔ باید مختصر کردن

شاعر اپنے مخاطب کو تقلیل عمارت کی رائے دیتا ہے۔ اور اس کی دلیل یہ بیان کرتا ہے کہ یہ قصر ہے اور جتنے قصر ہیں ان کو اختصار لازم ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اس عمارت کو اختصار لازم ہے۔ یہاں لفظ قصر منشائے مغالطہ ہے کہ اسکے معنی لغوی بے شک کم کرنے کے ہیں، مسافر کا قصر، صلوٰۃ کا قصر، بالوں کا قصر

بلکہ قصور بمعنی خطا، سب اسی مادّے سے ہیں۔ لیکن قصر کے دوسرے معنی
حویلی اور محل کے بھی ہیں۔ پس لفظ قصر مشترک ہوا۔ صغریٰ میں ایک
معنی مراد لئے اور کبریٰ میں دوسرے۔ یا مثلاً

گر اب کے پھرے شیخ جی کعبے کے سفر سے
تو جانو پھرے شیخ جی اللہ کے گھر سے

پھرنا مراجعت اور واپس آنا ایک معنی تو یہ ہیں، اور ایک چیز سے بدعقیدہ ہو جانا
دوسرے معنی یہ ہیں۔ اور اللہ کے گھر سے پھرنا مہلکے سے نجات پاکر سلامت
نکل آنا تیسرے معنی یہ ہیں۔ یا مثلاً

ہوس میں کعبہ کی کیوں شیخ بت خانے گم رہے
یہاں تو کوئی صورت بھی ہو واں اللہ ہی اللہ ہے

"اللہ ہی اللہ ہے"۔ دو معنوں میں مستعمل ہوتا ہے۔ ایک یہ کہ سوائے خدا کے اور
کچھ نہیں، دوسرا یہ کہ کچھ بھی نہیں۔

(۱۰) **اُمّہات الامّہ** (معنی اُمت کی مائیں) اس کے دو ایک فقرے
مولوی نذیر احمد صاحب کی بے اعتدالیوں کی مثال میں پہلے درج کئے گئے ہیں، اس
کتاب میں اُمّہات المومنین، ازواجِ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے حالات اور تعددِ
ازواج کے دواعی واسباب بیان کئے ہیں۔ مقصد یہ تھا کہ اس ضمن میں معترضینِ
اسلام کو جواب دیا جائے۔ یہ مقصد صحیح و درست تھا۔ سرسید نے بھی کسی عیسائی
کی کتاب "اُمّہات المومنین" کا جواب لکھا تھا لیکن بدقسمتی سے نذیر احمد صاحب نے
اپنی حسب عادت اس کتاب میں بھی وہی بے تکلف زبان واسلوب اختیار کیا
اور ازواجِ مطہرات و اہل بیت کے تذکرے میں "تریا چرتر" "سوکنوں کی باہمی کتا پتی"
"کہیں یہاں پانی مرتا ہو" وغیرہ عامیانہ و مبتذل محاورے استعمال کئے اس سے پہلے

ڈپٹی صاحب کی تحریروں میں بے ادبی کی ایسی صریح مثالیں نہ تھیں اُمہات الامہ کے شائع ہوتے ہی عام پبلک کی طرف سے اور خاص کر علمار کی جانب سے اعتراض و احتجاج کا ہنگامہ برپا ہو گیا اور کفر و بیدینی کے فتوے صادر ہونے لگے۔ اول تو مولانا ہنس ہنس کر ٹالتے رہے، لیکن جب مولویوں نے حملہ کر دیا اور کتاب کی تمام جلدیں حوالے کرنے اور جلانے کا مطالبہ کیا، تو بہت حیلے بہانے تاویلیں کیں، سیکڑوں ہزاروں روپیہ کا نقصان ہوا جاتا تھا۔ مگر آخر کو مان لینے ہی میں رفع شر نظر آیا۔ گھر پر اور مطبع میں جتنی کتابیں تھیں سب علمار نے قبضے میں کر لیں۔ اور دلی کے جلسۂ عام میں پیش کیں۔ اس کا حال نواب صدر یار جنگ مولوی حبیب الرحمٰن خاں صاحب شیروانی نے لکھا ہے کہ ایک رات کو ۲ بجے تک اس کتاب پر مباحثہ ہوتا رہا۔ آخر بکثرت رائے سوختنی قرار پائی۔ چنانچہ سب جلدیں ایک جگہ ڈھیر کی گئیں۔ مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب خود اُٹھ کر مٹی کے تیل کی بوتل لائے کتابوں پر چھڑکا اور دیا سلائی لگا دی۔

بعد کو عرصے تک اس واقعہ پر موافق و مخالف رائے زنی اور داد فریاد ہوتی رہی ان میں اکثر نئی تہذیب کے آزاد خیال نوجوان تھے، لیکن تعجب ہے کہ سب سے زیادہ مولوی عبدالحق صاحب سکریٹری انجمن ترقی اردو برہم و برافروختہ ہوئے۔ ہم نے یہ کتاب شائع ہوتے ہی ہنگامہ آرائی سے پہلے دیکھ لی تھی۔ ۳۰ برس سے زیادہ ہو گئے جب سے اب تک یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی کہ ایک مسلمان زبان و ادب کی محبت کو رسولؐ و آل رسولؐ کی محبت پر کیونکر مقدم رکھ سکتا ہے۔

ایک عرصے بعد ڈپٹی صاحب کے صاحبزادہ مولوی بشیرالدین صاحب نے اُمہات الامہ کو دوبارہ شائع کیا۔ اور بعض قابل اعتراض الفاظ نکال دیئے۔ مختصر نمونہ یہ ہے:۔

"لوگ بی بیان کرنے میں جو اعتراض مدنظر رکھتے ہوں، ہمارا دل تو گواہی دیتا ہے

اور ہمارا دل کیا گواہی دیتا ہے، ہر ایک منصف کا دل گواہی دے گا کہ پیغمبر صاحب نے جو بی بی کی، اسلام کا مفاد مدِّ نظر رکھ کر کی۔ کیسی نفسانی خواہش اور کیسا حسنِ جمال اور کیسی دولت، ان کو اسلام کے آگے کچھ سوجھتا ہی نہ تھا۔ ہم اسکی ضرورت تو سمجھتے نہیں کہ مناکحت کو خلاف شان پیغمبری سمجھ کر پیغمبر صاحب میں نقدانِ قوت کے قائل ہوں۔ ایسا سمجھنا انکے کمال انسانیت کو بٹّا لگانا ہے۔ پس سچی اور سیدھی بات یہ ہے کہ پیغمبر صاحب کی مناکحت میں اس قوت کو بھی دخل ضرور تھا۔ مگر اسلام کی دھن کے آگے پیغمبر صاحب کی تمام بشری خواہشیں، بشری اغراض مغلوب تھیں۔ ہر نکاح میں اول اور اقدم اسلام، اور اسلام کی رد کھن میں دوسری اغراض۔ اور یہی وجہ تکثیر ازواج کی بھی ہوئی کہ دامادی کے دباؤ سے سارے سسرالی قبیلے کو جھکنا پڑتا ہے، اور اسی کی اسلام کی اشاعت کے لئے بڑی ضرورت تھی۔ یہاں تک کہ جب اسلام کو خدا نے غلبہ دیا اور اعوان و انصار کے بہم پونہچانے کی ضرورت نہ رہی تو لَا یَحِلُّ لَکَ النِّسَاءُ مِنْ بَعْدُ[1] سے تکثیر کو روک دیا۔"

(۱۱) ڈپٹی نذیر احمد کے لکچر، انکی قوت تقریر اور کمال خطابت کا پہلے ذکر کیا گیا۔ لکچروں کا بڑا مجموعہ شائع ہو گیا ہے۔ نمونہ کے طور پر دو لکچروں میں سے اقتباس کیا جاتا ہے۔

(الف) آغازِ اسلام کے بزرگوں کا ذکر کر رہے ہیں:۔

"اُن کے زمانے میں اور ان کی کوششوں سے اسلام کا ترقی پانا۔ یہ ایسا زبردست ثبوت ان کی فیوض[2] میں ہے کہ کسی احتمال مخالف کو جمنے ہی نہیں دیتا

---

[1] (اے پیغمبر اس وقت کے) بعد سے دوسری عورتیں تم کو درست نہیں۔ [2] حمایت، طرفداری۔

جس طرح انسان اشرف المخلوقات ہے، اسی طرح مسلمان کامل افضل الناس ہے صرف دین کے اعتبار سے نہیں، بلکہ میرا نہایت مستحکم عقیدہ ہے کہ جن صفتوں کے مجموعے کا نام اسلام ہے نیچرتاً اس بات کی مقتضی ہیں کہ دنیا میں بھی مسلمانوں ہی کو فضیلت اور برتری ہو بلکہ میں تو دنیاوی ترقی و تنزل کو اسلام یعنی دین اسلام کے کامل و ناقص ہونے کا معیار قرار دیتا ہوں۔ وہ مسلمان بڑی غلطی پر ہیں، اور افسوس ہے کہ ایسے بہت ہیں جو خیال کرتے ہیں کہ پیغمبر صاحب کی رسالت کا مقصود یہ تھا کہ ہندو جوگیوں اور سنیاسیوں یا عیسائی راہبوں کی قسم کا ایک گروہ تیار کیا جائے، نرے خدا پرست دنیا سے بے نصیب محض، اگر پیغمبر صاحب کا یہ مقصد رہا ہو اور میں کہتا ہوں کہ نہیں رہا، وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ نہیں رہا، ہرگز نہیں رہا، تو معاذ اللہ پیغمبر صاحب کی رسالت کی نسبت فیلیور ٹوٹل فیلیور کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے۔ پیغمبر صاحب نہیں چھوڑ کر مرے خدا پرست جوگی، خدا پرست سنیاسی، خدا پرست راہب، خدا پرست آجکل کے سے ٹکر گدے بھک منگے، علما اور مشائخ۔ بلکہ خدا پرست امپررز (شاہنشاہ) خدا پرست کنگز (بادشاہ)، خدا پرست منسٹرز (وزیر)، خدا پرست ایڈمنسٹریٹرز (مدبران ملک)، خدا پرست کمانڈرز (سپہ سالار) خدا پرست ججز، خدا پرست آریٹرز (فصحار) خدا پرست مرچنٹس (سوداگر) خدا پرست دنیادار آف اوری کالنگ اینڈ پروفیشن (ہر ایک پیشے اور ہر ایک مشغلے کے) اُولٰٓئِکَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا لَهُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَمَغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ"

(لکچر ایجوکیشنل کانگریس اجلاس چہارم منعقدہ دسمبر ۱۸۸۹ء بمقام علی گڑھ)

لہ قدرتی طور پر۔ ؎ ناکامی، پوری ناکامی۔

ان چند سطروں میں انگریزی الفاظ برتنے کا شوق قابل دید ہے۔ یہ تقریر نذیر احمد صاحب کے ابتدائی لکچروں میں اور مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے زمانۂ آغاز کی تقریروں میں ہے، جب کہ اس کے نام میں کانفرنس کی جگہ کانگریس کا لفظ ہندوؤں کی انڈین نیشنل کانگریس کی تقلید میں تھا۔ اسی لکچر کا دوسرا اقتباس یہ ہے:۔

(ب) "ہم یہ کہنے کو تو موجود ہیں کہ "مسکین این ندارد آن ندارد" مگر کرنے کے نام میرے دیکھتے میں تو اتنا ہوا ہے کہ سید احمد خاں کے غل شور مچانے سے قومی مرثیہ خوانوں کا ایک گروہ پیدا ہو گیا ہے۔ جب تک لکھنؤ میں نوابی رہی مرثیہ خوانی کا بڑا زور و شور تھا اور اسی طرز خاص کو انیس اور دبیر نے حقیقت میں معجز بیانی کی حد تک پونہچا دیا۔ نہ کسی نے ان جیسا کہا اور نہ کوئی ان جیسا کہہ سکے گا۔ اب جو نئی قسم کے مرثیہ خواں چلے تو اس کے موجد ہوئے ہمارے مولوی الطاف حسین صاحب حالی۔ انھوں نے ایک بڑی دھوم کا مُسدّس لکھ کر کچھ ایسا بگل پھونکا کہ جہاں جہاں موزوں طبع تھے سب لگے ان ہی کی لے میں گانے اور گنگنانے۔ گنگنانے والوں میں یہ آپ کا نیاز مند بھی ہے کہ شعر تو نہیں کہہ سکتا، مگر تک سے تک ملایا کرتا ہے میں نہیں سمجھتا کہ مولوی الطاف حسین نے مُسدّس اس غرض سے کہا تھا کہ ایشیائی شاعری میں ایک طرز جدید داخل کریں۔ بلکہ ان کی غرض اصلی یہ تھی کہ سوتی ہوئی قوم جاگے، اور دیکھے کہ تباہی کا سیلاب ان کے سروں پر آپونہچا۔ مگر قوم نے جاگنا تو درکنار کروٹ تک بھی تو نہ لی۔ اور ان کے مُسدّس کا ایک کھیل بنا کر ٹال دیا۔ کوئی اس کو اس لئے نہیں پڑھتا کہ سمجھے اور عمل کرے۔ نظر پڑتی ہے تو وہی محاسن شاعری پر۔ اور سید احمد خاں صاحب بُرا مانیں تو مانیں، قریب قریب

یہی حال ہے اس کانگرس کا۔ اکثر تو تماشائی ہوں گے بعض اس کو ایک طرح کی محفل مشاعرہ سمجھ کر شریک ہوئے ہوں گے۔ کہ سر سید لکچر دیں گے، مولوی الطاف حسین، مولوی شبلی، منشی احمد علی شوق اپنے اپنے افکار تازہ پڑھیں گے۔ ذرا چل کر سنیں تو سہی کیا کہتے ہیں۔ بعض صرف سید احمد خاں کے لبیکی ہوں گے۔ اور بعض شہدا ہوں گے، لڑنے بھڑنے کے نہیں لہو لگا لینے کے جو چاہتے ہیں کہ محض کانفرنس میں شریک ہونے کی وجہ سے ان کا نام دردمندان قوم کی فہرست پر چڑھ جائے جتنے صاحب شریک محفل ہیں سب سے بدتر ہیں ہوں کہنے کو آندھی کرنے کو خاک جب آدمی خود ایک بات کا عامل نہیں دوسرے پر اس کا اثر کیا ہو۔ غرض کیا مستمع کیا لکچرار ہیں سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے، بھلا پھر ایسے مجمعوں سے کیا فلاح ہونی ہے۔ روتے آئے مرتے کی خبر لیکر چلے۔ قوم کا تو یہ حال ہے کہ ایک ایک منٹ اور ایک ایک سکنڈ کی دیر میں، برسوں نہیں عمروں کا نقصان ہو رہا ہے، اور یہاں ہنوز روز اول ہے"

(ج) یہ ڈپٹی صاحب کا اکتالیسواں لکچر ہے جو ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس منعقدہ دسمبر ۱۹۰۰ء بمقام ریاست رامپور میں پڑھا گیا۔ یہ لکچر نذیر احمد صاحب کی زبان سے سننے کا شرف ہم کو بھی حاصل ہے۔ شروع میں ایک طویل نظم اور اس کی بین الاشعار تشریح ہے۔ نظم کا مطلع یہ ہے:۔

الٰہی دے مسلمانوں کو توفیقِ مسلمانی ۔۔۔ کہ پھر آجائے کشتِ مُردۂ اسلام میں پانی

اور مقطع یہ ہے:۔

تم اپنی نثر لو اور نظم کو چھوڑو نذیر احمد ۔۔۔ کہ اسکے واسطے موضوع ہیں حالی و نعمانی

یعنی شبلی

نظم کے بعد فرماتے ہیں:۔

عِبَادَ اللّٰہِ رَحِمَکُمُ اللّٰہ، میں نے نظم میں آپ کا بہت سا وقت لے لیا ہے کہ آڈیئنس[1] قرآن سے اوور ڈوسڈ ہو گیا ہے، یعنی عادت سے زیادہ قرآن سنایا گیا ہے۔ اس لئے کہ مجھکو تمام آیتوں کا ترجمہ بھی کرنا پڑا۔ اب اس کی تلافی سوائے اس کے کچھ میرے اختیار میں نہیں کہ نثر میں کمی کروں۔ کہنا تو بہت ہے، مگر میں تعلیم کے متعلق صرف چند باتیں کہہ کر بس کروں گا۔ سب سے پہلے یہ بات دیکھنے کی ہے کہ تعلیم کی غرض و غایت کیا ہے ...... پس تعلیم کے مفید و نامفید ہونے کا معیار ٹھہرا انسان کی آسایش، انسان کی عافیت۔ تو تعلیم کی دو شاخیں ہو گئیں جو تعلیم انسان کے قوائے عقلی کو ڈولپ[2] کرے اس کو ہم دنیاوی تعلیم کہیں گے، اور جو تعلیم انسان کی تمدنی حالت کی اصلاح کرے اس کو دینی۔ یہ امر داخل بداہت ہے کہ اہل یورپ کے قوائے عقلی بڑے زوروں پر ہیں، اور ریل اور اسٹیمر اور تار برقی اور انواع و اقسام کی مشینیں ان ہی زوروں کے آثار ہیں۔ دو چار سیدھی سادھی کلیں دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ خدا علیم ہے کہ ان کا کانسٹرکشن[3] سمجھ میں نہیں آتا کیسے ذہن ہوں گے جنھوں نے ان کو ایجاد کیا ہوگا۔ اچھا تو یہ زور ان کے قوائے عقلی ہیں۔ یہ انتقال ان کے ذہنوں میں کہاں سے آیا۔ آب و ہوا کا خواص تو کہہ نہیں سکتے۔ کیونکہ جب سے زمین و آسمان پیدا ہوئے ہیں، آب و ہوا تو وہی ہے جو پہلے تھی لیکن تاریخ بتا رہی ہے کہ اب سے زیادہ نہیں چار ساڑھے چار سو برس پہلے ہمارے ملک کے گونڈوں اور بھیلوں کی طرح اہل یورپ بھی وحشیانہ زندگی بسر کرتے تھے، یا اور بہت سے ملک ہیں جن کی آب و ہوا یورپ کی

---

[1] مجمع حاضرین

[2] ترقی دے، بڑھائے

[3] ترکیب و ساخت

آب و ہوا سے ملتی جلتی ہے، اور وہاں کے باشندے کندۂ ناتراش ہیں، ہو نہ ہو یہ ترقی یہ عروج جو اہل یورپ کو ہے، سائنس کی تعلیم کا نتیجہ ہے، جو یورپ میں تکمیل کے ساتھ دی جا رہی ہے۔ اور گورنمنٹ نے کمال فیاضی سے اس کی ابجد نیٹوز[1] کو پڑھانی شروع کی ہے فَمِنْهُمْ مَنْ اٰمَنَ بِهٖ وَمِنْهُمْ مَنْ صَدَّ عَنْهُ، صدعنہ میں کم نصیب بدبخت مسلمان ہیں، جو اب تک اس جدید تعلیم کی طرف سے پس و پیش میں پڑے ہیں۔ پس اس کو تو خدا کی طرف سے فیصل شدہ مجھو کہ دنیاوی بہبود و فلاح تو بدون سائنس کی تعلیم کے ہوتی نہیں ان شخصیا شخصی دان قومیا نفوسی مگر سائنس کے خزانے انگریزی کے صندوقوں میں بند ہیں۔ پہلے ان صندوقوں کا کھولنا سیکھو تب خزانے کو ہاتھ لگاؤ۔ اور نہیں سیکھتے تو سلطنتیں کھو کر رعیت بنے ہو، آگے اپنے ابنائے جنس کی غلامی کرو، جھڑکیاں سنو جوتیاں کھاؤ، اگلوں کا ڈھکا سینا ہو چکے تو بھیک مانگو۔ مگر میری صلاح مانو تو سب سے آسان طریقہ یہ ہے کہ مجھے بھی اپنے ساتھ لیکر ڈوب مرو۔

قسمت میں قوم کے ہے لکھی صبح و شام موت
بے حرمتی کے جینے سے بہتر حرام موت

نذیر احمد صاحب کی ایک صنف تحریر ان کے خطوط بھی ہیں، لیکن ان میں کوئی خاص "مکتوباتی جدت" نہیں ہے۔ ان کا ایک مجموعہ "موعظۂ حسنہ" ہے، جو انھوں نے اپنے صاحبزادہ مولوی بشیر الدین کو ان کی تعلیم کے زمانے میں لکھے ہیں۔ ان خطوط میں تعلیمی ناصحانہ رنگ غالب ہے۔

---

[1] دیسی ہندوستانی لوگ

[2] لوگوں میں کوئی اس (کتاب) پر ایمان لانا اور کوئی اس سے ٹھٹک رہا۔

خواجہ الطاف حسین حالی

اُردو میں مشاہیر مصنفین کے خود نوشت حالات شاذ و نادر ملیں گے۔ سب سے زیادہ مرزا غالب نے اپنے رقعات میں اپنے حالات لکھے ہیں، مگر یک جا نہیں، جابجا منتشر ہیں۔ تاہم ایسے ہیں کہ جمع و مرتب کرنے سے غالب کی خود نوشت سوانحعمری بن سکتی ہے۔ ان کے بعد کسی کی ایسی تحریریں نہیں پائی جاتیں۔ اتفاق سے مولانا حالی کے حالات ان کے قلم کے لکھے ہوئے موجود ہیں۔ نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی نے ۱۹۰۱ء میں خواجہ صاحب سے فرمائش کی تھی، اس کی تعمیل میں لکھے گئے تھے۔ ہم اس تحریر کو ذیل میں نقل کرتے ہیں:

"میری ولادت تقریباً ۱۲۵۳ھ ہجری مطابق ۱۸۳۷ء میں بمقام قصبہ پانی پت جو شاہجہان آباد سے جانب شمال ۵۳ میل کے فاصلہ پر ایک قدیم بستی ہے، واقع ہوئی۔ اس قصبہ میں کچھ کم سات سو برس سے قوم انصار کی ایک شاخ جس سے راقم کو تعلق ہے آباد چلی آتی ہے۔ ساتویں صدی ہجری اور تیرھویں صدی عیسوی میں جب کہ غیاث الدین بلبن تختِ دلی پر متمکن تھا شیخ الاسلام خواجہ عبد اللہ انصاری معروف بہ پیرِ ہرات کی اولاد میں سے ایک بزرگ خواجہ ملک علی نام جو علومِ متعارف میں اپنے تمام معاصرین سے ممتاز تھے، ہرات سے ہندوستان میں وارد ہوئے تھے جن کا سلسلۂ نسب ۲۸ واسطہ سے

حضرت ابو ایوب انصاری رضی تک اور ۱۸ واسطوں سے شیخ الاسلام تک
اور دس واسطہ سے ملک محمود شاہ انجو ملقب بہ آق خواجہ تک
جو غزنوی دور میں فارس اور کرمان و عراق عجم کا فرماں رَوا
تھا پہنچتا ہے۔

چونکہ غیاث الدین اِس بات میں نہایت مشہور تھا کہ وہ
قدیم اشراف خاندانوں کی بہت عزت کرتا ہے اور اس کا بیٹا
سلطان محمد علمار و شعرار و دیگر اہلِ کمال کا حد سے زیادہ
قدر دان تھا اِس لئے اکثر اہلِ علم اور عالی خاندان لوگ
ایران و ترکستان سے ہندوستان کا قصد کرتے تھے اِسی
شہرت نے خواجہ ملک علی کو سفرِ ہندوستان پر آمادہ کیا تھا
چنانچہ سلطان غیاث الدین نے انھیں عمدہ اور سیر
حاصل دیہات پرگنہ پانی پت میں ——————
—————— اور معتدبہ اراضی سواد قصبۂ پانی پت میں
بطور مددِ معاش کے اور بہت سی زمین اندرون آبادی قصبۂ
پانی پت واسطے سکونت کے ان کو عنایت کی اور منصب قضاو
صدارت و تشخیص نرخ بازار اور تولیتِ مزاراتِ ائمہ جو سوادِ
پانی پت میں واقع ہیں اور خطابتِ عیدین ان سے متعلق
کردی۔ پانی پت میں جو اب تک ایک محلہ انصاریوں کا مشہور
ہے وہ انھیں بزرگ کی اولاد سے منسوب ہے۔ میں باپ کی طرف سے
اِسی شاخ انصار سے علاقہ رکھتا ہوں اور میری والدہ سادات
کے ایک معزز گھرانے کی جو یہاں سادات شہد اپور کے

نام سے مشہور ہے، بیٹی تھیں۔

اگرچہ خواجہ ملک علی کی اولاد میں سے بہت سے لوگوں نے اوّل سلطنتِ مغلیہ کے عہد میں اور پھر شاہانِ اودھ کے دربار میں نہایت درجہ کا امتیاز حاصل کیا تھا مگر زیادہ تر یہ لوگ اسی ملک و مددِ معاش پر قانع رہے جو سلاطینِ اسلام کی طرف سے وقتاً فوقتاً اُن کو عطا ہوتی رہی۔ میرے آبا و اجداد نے جہاں تک معلوم ہے ظاہرا کوئی خدمت دلّی یا لکھنؤ میں اختیار نہیں کی۔ سب سے پہلے میرے باپ[1] نے سرکار انگریزی کی نوکری سررشتۂ پرمٹ میں اختیار کی تھی۔

میری ولادت کے بعد میری والدہ کا دماغ مختل ہو گیا تھا۔ اور میرے والد نے سنِ کہولت میں انتقال کیا جبکہ میں نو برس کا تھا۔ اس لئے میں نے ہوش سنبھال کر اپنا سرپرست بھائی بہنوں کے سوا کسی کو نہ پایا۔ انھوں نے اوّل مجھ کو قرآن حفظ کرایا۔ اس کے بعد اگرچہ تعلیم کا شوق خود بخود میرے دل میں حد سے زیادہ تھا مگر باقاعدہ اور مسلسل تعلیم کا کبھی موقعہ نہ ملا۔ ایک بزرگ سید جعفر علی مرحوم جو میر ممنونؔ دہلوی کے بھتیجے اور داماد بھی تھے بوجہ تعلق زناشوئی کے پانی پت میں مقیم تھے اور فارسی لٹریچر اور تاریخ وطب میں ید طولےٰ رکھتے تھے، ان سے دو چار فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں اور ان کی صحبت میں فارسی لٹریچر سے ایک نوع کی مناسبت پیدا ہو گئی۔ پھر عربی کا شوق پیدا ہوا۔

[1] والد کا نام خواجہ ایزد بخش ہے محکمہ نمک میں ملازم تھے۔

انھیں دنوں میں مولوی حاجی ابراہیم حسین انصاری مرحوم لکھنؤ
سے امامت کی سند لے کر آئے تھے۔ ان سے صرف و نحو پڑھی
مگر چند روز بعد بھائی اور بہن نے جن کو میں بمنزلہ والدین کے
سمجھتا تھا تاہل پر مجبور کیا اُس وقت میری عمر سترہ برس کی
تھی اور زیادہ تر بھائی کی نوکری پر سارے گھر کا گذارا تھا کہ
یہ جُوا میرے کندھے پر رکھا گیا۔ اب بظاہر تعلیم کے دروازے
چاروں طرف سے مسدود تھے سب کی خواہش تھی کہ میں
نوکری تلاش کروں مگر تعلیم کا شوق غالب تھا اور بیوی کا
میکہ آسودہ حال تھا۔

میں گھر والوں سے رُوپوش ہو کر دلی چلا گیا اور قریب
ڈیڑھ برس کے وہاں رہ کر کچھ صرف و نحو اور کچھ ابتدائی کتابیں
منطق کی مولوی نوازش علی مرحوم سے جو وہاں ایک مشہور واعظ
اور مدرس تھے پڑھیں۔ اگرچہ اس وقت قدیم دہلی کالج خوب
رونق پر تھا مگر جس سوسائٹی میں میں نے نشو و نما پائی تھی وہاں
علم صرف عربی اور فارسی زبان پر منحصر سمجھا جاتا تھا۔ انگریزی تعلیم
کا خاص کر پانی پت میں اول تو کہیں ذکر ہی سُننے میں نہ آتا تھا
اور اس کی نسبت لوگوں کا کچھ خیال تھا تو صرف اس قدر کہ
سرکاری نوکری کا ایک ذریعہ ہے، نہ یہ کہ اس سے کوئی علم حاصل
ہوتا ہے بلکہ برخلاف اس کے انگریزی مدرسوں کو ہمارے علماء
جہلے[1] کہتے تھے۔ دلی پہنچ کر جس مدرسے میں مجھے روز و شب

---

[1] مدرسہ کے مقابلہ میں مجہلہ یعنی جہالت خانہ۔

رہنا پڑا وہاں سب مدرسہ اور طلبار کالج کے تعلیم یافتہ لوگوں کو محض جاہل سمجھتے تھے۔ غرض کبھی بھول کر بھی انگریزی تعلیم کا خیال دل میں نہ گذرا تھا۔ ڈیڑھ برس دلی میں رہنا ہوا۔ اس عرصہ میں کبھی کالج کو جا کر آنکھ سے دیکھا تک نہیں اور نہ کبھی اُن لوگوں سے ملنے کا اتفاق ہوا جو اُس وقت کالج میں تعلیم پاتے تھے، جیسے مولوی ذکاراللہ و مولوی محمد حسین آزاد وغیرہ۔

میں نے دلی میں شرحِ سُلّم ملا حسین اور میبذی پڑھنی شروع کی تھی کہ سب عزیزوں اور بزرگوں کے جبر سے چار و ناچار مجھ کو دلی چھوڑنا اور پانی پت واپس آنا پڑا۔ یہ ذکر ۱۸۵۵ء کا ہے دلی سے آ کر ڈیڑھ برس تک پانی پت سے کہیں جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔ یہاں بطورِ خود اکثر بے پڑھی کتابوں کا مطالعہ کرتا تھا۔

۱۸۵۶ء میں مجھے حصار میں ایک قلیل تنخواہ کی اسامی بر صاحب کلکٹر کے دفتر میں مل گئی۔ لیکن ۱۸۵۷ء میں جبکہ سپاہ باغی کا فتنہ ہندوستان میں برپا ہوا اور حصار میں بھی اکثر واقعات ظہور میں آئے اور سرکاری عملداری اُٹھ گئی تو میں وہاں سے پانی پت چلا آیا اور قریب چار برس کے پانی پت میں بے کاری کی حالت میں گذارے۔ اِس عرصہ میں پانی پت کے مشہور فضلار مولوی عبدالرحمٰن ، مولوی محب اللہ اور مولوی قلندر علی مرحوم سے بغیر کسی ترتیب اور نظام کے کبھی منطق یا فلسفہ کبھی حدیث کبھی تفسیر پڑھتا رہا اور ان میں سے جب

کوئی پانی پت میں نہ ہوتا تھا تو خود بغیر پڑھی کتابوں کا مطالعہ کرتا تھا
اور خاص کر علمِ ادب کی کتابیں۔ شرح اور لغات کی مدد سے اکثر دیکھتا
تھا اور کبھی کبھی عربی نظم اور نثر بھی بغیر کسی اصلاح یا مشورے کے
لکھتا تھا مگر اس پر اطمینان نہ ہوتا تھا۔ میری عربی اور فارسی
تحصیل کا مُدعا صرف اسی قدر ہے جس قدر اوپر ذکر کیا گیا۔

جس زمانے میں میرا دِلّی جانا ہوا تھا، مرزا اسداللہ
خاں غالبؔ مرحوم کی خدمت میں اکثر جانے کا اتفاق ہوتا تھا
اور اکثر اُن کے اُردو اور فارسی دیوان کے اشعار جو سمجھ میں نہ
آتے تھے، ان کے معنی ان سے پوچھا کرتا تھا اور چند فارسی قصیدے
انھوں نے اپنے دیوان میں سے مجھے پڑھائے بھی تھے۔ ان کی عادت
تھی کہ وہ اپنے ملنے والوں کو اکثر فکرِ شعر کرنے سے منع کرتے
تھے مگر میں نے جو ایک آدھ غزل اُردو یا فارسی کی لکھ کر ان کو
دکھائی تو انھوں نے مجھ سے یہ کہا کہ اگرچہ میں کسی کو فکرِ شعر کی
صلاح نہیں دیا کرتا لیکن تمھاری نسبت میرا یہ خیال ہے کہ
اگر تم شعر نہ کہو گے تو اپنی طبیعت پر ظلم کرو گے۔ مگر اس زمانہ
میں ایک دو غزل سے زیادہ دلّی میں شعر کہنے کا اتفاق
نہیں ہوا۔

غدر کے بعد جب کئی برس پانی پت میں بیکاری کی
حالت میں گذر گئے تو فکرِ معاش نے گھر سے نکلنے پر مجبور کیا
حُسنِ اتفاق سے ۱۸۶۳ء میں نواب مصطفیٰ خاں مرحوم رئیس
دہلی و تعلقہ دار جہانگیر آباد ضلع بلند شہر سے جو فارسی میں

حسرتیؔ اور اُردو میں شیفتہ تخلص کرتے تھے اور شاعری کا اعلیٰ درجہ کا مذاق رکھتے تھے، شناسائی ہو گئی اور آٹھ برس تک بطور مصاحبت کے ان کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا۔ نواب صاحب جس درجہ کے فارسی اور اُردو کے شاعر تھے اس کی بہ نسبت اُن کا مذاقِ شاعری بمراتب بلند تر اور اعلیٰ تر واقع ہوا تھا۔ انھوں نے ابتدا میں اپنا فارسی اور اردو کلام مومنؔ خاں کو دکھایا تھا مگر اُن کے مرنے کے بعد وہ مرزا غالبؔ سے مشورۂ سخن کرنے لگے تھے۔ میرے وہاں جانے سے اُن کا پُرانا شعر و سخن کا شوق جو مدت سے افسردہ ہو رہا تھا تازہ ہو گیا اور ان کی صحبت میں میرا طبعی میلان بھی جو اَب تک مکروہات کے سبب اچھی طرح ظاہر نہ ہونے پایا تھا چمک اُٹھا۔ اسی زمانے میں اُردو اور فارسی کی اکثر غزلیں نواب مرحوم کے ساتھ لکھنے کا اتفاق ہوا۔ اُنھیں کے ساتھ میں بھی اپنا کلام مرزا غالبؔ کے پاس بھیجتا تھا۔ مگر در حقیقت مرزا کے مشورہ و اصلاح سے مجھے چنداں فائدہ نہیں ہوا بلکہ جو کچھ فائدہ ہوا وہ نواب صاحب مرحوم کی صحبت سے ہوا۔ وہ مبالغہ کو ناپسند کرتے تھے اور حقائق و واقعات کے بیان میں لطف پیدا کرنا اور سیدھی سادی اور سچی باتوں کو محض حسنِ بیان سے دلفریب بنانا اسی کو منتہائے کمالِ شاعری سمجھتے تھے۔ چھچھورے اور بازاری الفاظ و محاورات اور عامیانہ خیالات سے شیفتہؔ اور غالبؔ دونوں متنفر تھے۔ نواب شیفتہؔ کے مذاق کا اندازہ اس واقعہ سے بخوبی ہو سکتا ہے کہ ایک روز انیسؔ کا ذکر ہو رہا تھا، انھوں نے انیسؔ کے مرثیہ کا یہ

پہلا مصرع پڑھا "آج شبیر پہ کیا عالمِ تنہائی ہے" اور کہا کہ انیس نے ناحق مرثیہ لکھا یہی ایک مصرع بجائے خود ایک مرثیہ کے برابر تھا۔ اُن کے خیالات کا اثر مجھ پر بھی پڑنے لگا۔

نواب شیفتہ کی وفات کے بعد پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو میں ایک آسامی مجھ کو مل گئی جس میں مجھے یہ کام کرنا پڑتا تھا کہ جو ترجمے انگریزی سے اُردو میں ہوتے تھے اُن کی عبارت درست کرنے کو مجھے ملتی تھی۔ تقریباً چار برس میں نے یہ کام لاہور میں رہ کر کیا۔ اس سے انگریزی لٹریچر کے ساتھ فی الجملہ مناسبت پیدا ہو گئی اور نامعلوم طور پر آہستہ آہستہ مشرقی لٹریچر اور خاص کر عام فارسی لٹریچر کی وقعت دل سے کم ہونے لگی۔ لاہور ہی میں کرنل ہالرائڈ ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن پنجاب کے ایما سے مولوی محمد حسین آزاد نے اپنے پُرانے ارادہ کو پورا کیا۔ یعنی ۱۸۷۴ء میں ایک مشاعرہ کی بنیاد ڈالی جو ہندوستان میں اپنی نوعیت کے لحاظ سے بالکل نیا تھا اور جس میں بجائے مصرع طرح کے کسی مضمون کا عنوان شاعروں کو دیا جاتا تھا کہ اس مضمون پر اپنے خیالات جس طرح چاہیں نظم میں ظاہر کریں۔ میں نے اسی زمانے میں چار مثنویاں، ایک برسات پر، دوسری اُمید پر تیسری رحم و انصاف پر اور چوتھی حُبِ وطن پر لکھیں۔

نظم کے سوا نثر میں چند کتابیں لکھی ہیں۔ سب سے پہلے غالباً ۱۸۶۰ء میں ایک کتاب تریاقِ مسموم نبوکر سچین

کی کتاب کے جواب میں جو میرا ہموطن تھا اور مسلمان سے عیسائی ہوا تھا، لکھی تھی۔ جس کو اسی زمانے میں لوگوں نے مذہبی میگزینوں میں شائع کر دیا تھا۔ اس کے بعد لاہور میں ایک عربی کتاب کا جو جیولوجی میں تھی اور فرنچ سے عربی میں کسی مصری فاضل نے ترجمہ کی تھی، اردو میں ترجمہ کیا اور اس کا کاپی رائٹ بغیر کسی معاوضہ کے پنجاب یونی ورسٹی کو دیدیا چنانچہ ڈاکٹر لائٹنر کے زمانے میں یونیورسٹی نے چھاپ کر شائع کر دیا تھا۔ مگر اول تو وہ اصل کتاب پچاس ساٹھ برس کی لکھی ہوئی تھی جب کہ جیولوجی کا علم ابتدائی حالت میں تھا۔ دوسرے مجھ کو اس فن سے محض اجنبیت تھی اس لئے اصل اور ترجمہ دونوں غلطیوں سے خالی نہ تھے۔ لاہور ہی میں ایک کتاب عورتوں کی تعلیم کے لئے قصہ کے پیرایہ میں موسوم بہ مجالس النساء لکھی تھی۔ جس پر کرنل ہالرائڈ نے ایک ایجوکیشنل دربار میں بمقام دہلی مجھے لارڈ نارتھ بروک کے ہاتھ سے چار سو روپے کا انعام دلوایا تھا اور جو اودھ اور پنجاب کے مدارسِ نسواں میں مدت تک جاری رہی اور شاید اب بھی کہیں کہیں جاری ہو۔ پھر دلی میں سعدی شیرازی کی لائف اور ان کی نظم و نثر پر ریویو لکھ کر شائع کیا جس کا نام حیاتِ سعدی ہے۔ جس کے دس بارہ ایڈیشن اب سے پہلے شائع ہو چکے ہیں۔ پھر شاعری پر ایک مبسوط "ایسے" (مضمون) بطور مقدمہ کے اپنے دیوان کے

ساتھ شائع کیا۔ اِس کے بعد مرزا غالب مرحوم کی لائف جس میں ان کی فارسی اور اُردو نظم و نثر کا انتخاب بھی شامل ہے اور نیز اُن کی شاعری پر ریویو بھی کیا گیا ہے اور اَب سَر سَیّد احمد خاں مرحوم کی لائف موسوم بہ حیاتِ جاوید جو تقریباً ہزار صفحہ کی کتاب ہے جو امید ہے کہ مارچ یا اپریل میں شائع ہو جائے گی۔ اِس کے سوا بھی اور بعض کتابیں فارسی گریمر وغیرہ میں لکھی ہیں جو چنداں ذکر کے قابل نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ تیس بتیس مضمون بھی مختلف عنوانوں پر مختلف اوقات میں لکھے جو تہذیب الاخلاق علی گڈھ گزٹ اور دیگر اخبارات یا رسائل میں شائع ہوئے ہیں نیز اردو کے علاوہ فارسی میں کسی قدر زیادہ اور عربی میں کم میری نظم و نثر موجود ہیں جو ہنوز شائع نہیں ہوئی۔ جب سے ان دونوں زبانوں کا رواج ہندوستان میں کم ہونے لگا ہے اس وقت سے ان کی طرف توجہ نہیں رہی۔ میری سب سے اخیر فارسی نظم وہ ترکیب بند ہے جو سر سید کی وفات پر میں نے ۱۸۹۸ء میں لکھا تھا۔ اور اُردو میں سب سے اخیر وہ نظم ہے جو حال میں ایمپرس وکٹوریہ کی وفات پر لکھی ہے اور علی گڈھ گزٹ میں شائع ہو چکی ہے۔

۱۳۰۵ھ ہجری میں جب کہ میں اینگلو عربک اسکول دہلی میں مدرس تھا نواب سر آسمان جاہ بہادر مرحوم مدار المہام سرکار عالی نظام اثنائے سفرِ شملہ میں علی گڈھ

محمڈن کالج کے ملاحظہ کے لئے سر سید احمد خاں مرحوم کی کوٹھی
واقع علی گڈھ میں فروکش ہوئے تھے اور میں بھی اس
وقت علی گڑھ گیا ہوا تھا۔ نواب صاحب ممدوح نے بصیغۂ
امدادِ مصنفین ایک وظیفہ پچھتّر روپے ماہوار کا میرے لئے
مقرر فرمایا اور ۱۳۰۹ھ میں جب کہ سر سید مرحوم کے ہمراہ
بشمول دیگر ممبران ڈپوٹیشن ٹرسٹیان محمڈن کالج
علی گڑھ، حیدر آباد گیا تھا۔ اِس وظیفہ میں پچیس رُوپے
ماہوار کا اضافہ کر کے سَو روپے سکہ حالی کا وظیفہ میرے
لئے مقرر کر دیا جو اَب تک مجھ کو ماہ بماہ سرکارِ عالی سے
ملتا ہے اور اسی وقت سے میں نے اینگلو عربک اسکول کا
تعلق قطع کر دیا ہے۔"

مولانا حالی کے باقی حالات و اخلاق ہم ڈاکٹر مولوی عبد الحق
دہلوی کے مضمون مطبوعہ "چند ہم عصر" سے مختصر کر کے نقل کرتے
ہیں:-

"ایک واقعہ جو میری آنکھوں کے سامنے پیش آیا، اور
جس کا ذکر میں نے کسی دوسرے موقع پر کیا ہے یہ ۱۹۰۵ء
کا ذکر ہے جب کہ غفراں مآب اعلیٰ حضرت مرحوم کی جوبلی بلدۂ
حیدر آباد اور تمام ریاست میں بڑے جوش اور شوق سے
منائی جا رہی تھی۔ مولانا حالی بھی اِس جوبلی میں سرکار کی
طرف سے مدعو کئے گئے تھے اور نظام کلب کے ایک حصہ
میں ٹھہرائے گئے۔ زمانۂ قیام میں اکثر لوگ صبح سے شام

تک اُن سے ملنے کے لئے آتے رہتے تھے۔ ایک روز کا ذکر ہے کہ ایک صاحب جو علی گڈھ کالج کے گریجویٹ اور حیدر آباد میں ایک معزز عہدے پر فائز تھے، مولانا سے ملنے آئے۔ ٹم ٹم پر سوار تھے۔ زینہ کے قریب اُترنا چاہتے تھے سائیس کی جو شامت آئی تو اُس نے گاڑی دو قدم آگے جا کر کھڑی کی۔ یہ حضرت اِس ذرا سی چوک پر آپے سے باہر ہو گئے اور سارڑ سارڑ کئی ہنٹر اُس غریب کے رسید کر دیئے۔ مولانا یہ نظارہ اوپر برآمدے میں کھڑے دیکھ رہے تھے۔ اِس کے بعد وہ کھٹ کھٹ سیڑھیوں پر سے چڑھ کر اوپر آئے مولانا سے ملے، مزاج پرسی کی اور کچھ دیر باتیں کر کے رخصت ہو گئے۔ میں دیکھ رہا تھا مولانا کا چہرہ بالکل متغیر تھا، وہ برآمدے میں ٹہلتے جاتے تھے اور کہتے تھے "ہائے ظالم نے کیا کیا" اُس روز کھانا بھی اچھی طرح نہ کھا سکے۔ کھانے کے قیلولے کی عادت تھی وہ بھی نصیب نہ ہوا۔ فرماتے تھے "یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا وہ ہنٹر کسی نے میری پیٹھ پر مارے ہیں" اِس کیفیت سے جو کرب و درد مولانا کو تھا وہ شاید اُس بدنصیب سائیس کو بھی نہ ہوا ہوگا۔

مولانا کی سیرت میں یہ دو ممتاز خصوصیتیں تھیں ایک سادگی اور دوسری دردِ دل۔ اور یہی شان ان کے کلام میں ہے۔ ان کی سیرت اور ان کا کلام ایک ہے یا یوں سمجھئے کہ ایک دوسرے کا عکس ہیں

خاکساری اور فروتنی خلقی تھی۔ اِس قدر بڑے ہونے پر بھی
چھوٹے بڑے سب سے جُھک کر اور خلوص سے ملتے تھے جو کوئی
ان سے ملنے آتا خوش ہو کر جاتا اور عمر بھر اُن کے حُسنِ
اخلاق کا مدّاح رہتا تھا۔ اُن کا رتبہ بہت بڑا تھا اگر انھوں
نے کبھی اپنے آپ کو بڑا نہ سمجھا۔ بڑوں کا اَدَب اور چھوٹوں
پر شفقت تو وہ کرتے ہی تھے لیکن بعض اوقات وہ اپنے
چھوٹوں کا بھی اَدب کرتے تھے۔

ہندی اُردو کا جھگڑا اُن کے زمانے میں پیدا ہو چکا تھا
اور اُس نے ناگوار صورت اختیار کر لی تھی۔ لیکن باوجود اس
کے کہ انھوں نے عمر بھر اُردو کی خدمت کی اور اپنی تحریروں
سے اُردو کا رتبہ بہت بلند کر دیا۔ وہ انصاف کی بات کہنے
سے کبھی نہ چُوکے۔ چنانچہ خمخانۂ جاوید کے تبصرے میں لکھتے ہیں:

"کون نہیں جانتا کہ مسلمان باوجودیکہ تقریباً ایک
ہزار برس سے ہندوستان میں آباد ہیں مگر اس طویل مدت میں
انھوں نے چند مستثنیات کو چھوڑ کر کبھی سنسکرت یا برج بھاشا کی
طرف باوجود سخت ضرورت کے آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھا جس سنسکرت
کو یورپ کے محقق لاطینی و یونانی سے زیادہ وسیع اور زیادہ
باقاعدہ بتاتے ہیں اور جس کی تحقیقات میں عمریں بسر کر دیتے
ہیں مسلمانوں نے عام طور پر کبھی اس کو قابلِ التفات نہیں
سمجھا۔ اگر یہ کہا جائے کہ سنسکرت کا سیکھنا کوئی آسان کام
نہیں ہے تو برج بھاشا جو بمقابلہ سنسکرت کے نہایت سہل

انو مول ہے اور جس کی شاعری نہایت لطیف، شگفتہ اور فصاحت بلاغت سے لبریز ہے اس کو بھی عموماً بیگانہ وار نظروں سے دیکھتے رہے۔ حالانکہ جو اُردو ان کو اس قدر عزیز ہے اس کی گرامر کا دار مدار بالکل برج بھاشا یا سنسکرت کی گرامر پر ہے۔ عربی فارسی سے اُس کو صرف اس قدر تعلق ہے کہ دونوں زبانوں کے اسما، اُس میں کثرت سے شامل ہو گئے ہیں، باقی تمام اجزائے کلام جن کے بغیر کسی زبان کی نظم و نثر مفیدِ معنی نہیں ہو سکتی، برج بھاشا یا سنسکرت کی گرامر سے ماخوذ ہیں سچ یہ ہے کہ مسلمانوں کا ہندوستان میں رہنا اور سنسکرت یا کم سے کم برج بھاشا سے بے پروا یا متنفر ہونا بالکل اپنے تئیں اس مثل کا مصداق بنانا ہے کہ "دریا میں رہنا اور مگرمچھ سے بیر۔"

یہ بات بعض لوگوں کو بہت ناگوار گزری اور بعض اُردو اخباروں نے اس کی تردید بھی چھاپی، لیکن جو سچی بات تھی وہ کہہ گذرے۔ اِس خیال کا اظہار انھوں نے کئی جگہ کیا ہے کہ جو شخص اُردو کا ادیب اور محقق ہونا چاہتا ہے اُسے سنسکرت یا کم سے کم ہندی بھاشا کا جاننا ضروری ہے۔

ایک بار جب اُردو لغت کی ترتیب کا ذکر اُن سے آیا تو فرمانے لگے کہ اُردو لغات میں ہندی کے وہ الفاظ جو عام بول چال میں آتے ہیں یا جو ہماری زبان میں کھپ سکتے ہیں بلا تکلف کثرت سے داخل کرنے چاہئیں۔ خود

اپنی نظم و نثر میں وہ ہندی الفاظ ایسی خوبصورتی سے لکھ جاتے
تھے کہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا وہ اسی موقع کے لیے وضع ہوئے
تھے۔ انھوں نے بہت سے ایسے ہندی الفاظ اُردو ادب
میں داخل کیے جو ہماری نظر سے اوجھل تھے اور جن کا آج
تک کبھی کسی اُردو ادیب یا شاعر نے تو کیا ہندی ادیبوں
اور شاعروں نے بھی استعمال نہیں کیا تھا۔ لفظ کا صحیح
اور برمحل استعمال جس سے کلام میں جان پڑ جائے اور لفظ
خود بول اُٹھے کہ لکھنے والے کے دل میں کیا چیز کھٹک رہی
رہی ہے، ادب کا بڑا کمال ہے اور یہ کوئی حالی سے سیکھے
دلوں میں گھر کر لینے کے جو گُر ادب میں ہیں، اُن میں سے
یک یہ بھی ہے۔

اُن کا ذوقِ شعر اعلیٰ درجہ کا تھا جیسا کہ حیاتِ
سعدی، یادگارِ غالب اور مقدمہ شعر و شاعری سے
ظاہر ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ صحیح ذوق پیدا کرنے
میں انھوں نے بڑا کام کیا ہے لیکن وہ خواہ مخواہ اس کی
نمائش نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ہاں جب کوئی پوچھتا یا
اتفاق سے بات آ پڑتی تو وہ کھُل کر اُس کے نکات بیان
کرتے تھے۔

سرسیّد تو خیر اُس زمانے میں موردِ لعن وطعن
تھے ہی اور ہر کس و ناکس اُن پر مُنہ آتا تھا۔ لیکن اس کے
بعد جس پر سب سے زیادہ اعتراضات کی بوچھاڑ پڑی وہ حالی

تھے۔ ایک تو وہ ہر شخص جس کا تعلق سیّد احمد خان سے تھا، یوں ہی مردود سمجھا جاتا تھا، اُس پر ان کی شاعری جو عام رنگ سے جُدا تھی اور نشانۂ ملامت بن گئی تھی۔ اور مقدمہ شعر و شاعری نے تو خاصی آگ لگا دی۔ اہلِ لکھنؤ اِس معاملے میں چھوئی موئی سے کم نہیں، وہ معمولی سی تنقید کے بھی روادار نہیں ہوتے۔ انھیں یہ وہم ہو گیا تھا کہ یہ ساری کارروائی اُنھیں کی مخالفت میں کی گئی ہے۔ پھر کیا تھا ہر طرف سے نکتہ چینی اور طعن و تعریض کی صدا آنے لگی۔ اَوَدھ پنچ میں ایک طویل سلسلۂ مضامین ''مقدمہ'' کے خلاف مدت تک نکلتا رہا جو اَدبی تنقید کا عجیب و غریب نمونہ تھا۔ وہ صرف بے تکے اور مہمل اعتراضات ہی کا مجموعہ نہ تھا بلکہ پھکڑ اور پھبتیوں تک نوبت پہنچ گئی تھی۔ جن مضامین کے عنوان ایسے ہوں، جیسے:

ابتر ہمارے حملوں سے حالؔی کا حال ہے
میدانِ پانی پت کی طرح پائمال ہے

تو اِس سے سمجھ لیجیے کہ اِس عنوان کے تحت کیا کچھ خرافات نہ بکی گئی ہوگی۔ مولانا یہ سب کچھ سہتے رہے لیکن کبھی ایک لفظ زبان سے نہ نکالا۔

کیا پوچھتے ہو کیونکر سب نکتہ چیں ہوئے چُپ
سب کچھ کہا انھوں نے پر ہم نے دم نہ مارا

لیکن آخر ایک وقت آیا کہ نکتہ چینوں کی زبانیں بند ہو گئیں اور وہی

دگ جو انھیں شاعر تک نہیں سمجھتے تھے، اُن کی تقلید کرنے لگے

غل تو بہت یاروں نے مچایا پر گئے اکثر مان ہیں

مولانا نے دنیاوی جاہ مال کی کبھی ہوس نہیں کی جس حالت میں تھے اس پر قانع تھے اور خوشی خوشی زندگی بسر کرتے تھے اور اس میں اَوروں کی بھی مدد کرتے تھے۔

اُن کی قناعت کا ثبوت اِس سے بڑھ کر کیا ہو گا کہ انھیں ینگ اسکول میں ساٹھ روپے ماہانہ تنخواہ ملتی تھی۔ جب حیدر آباد میں اُن کے وظیفے کی کارروائی ہوئی تو اُنھوں نے ساٹھ سے زیادہ طلب نہ کئے جس کے تخمیناً پچھتر حالی ہوتے۔ ایک مدت تک پچھتر ہی ملتے رہے، بعد میں پچیس کا اضافہ ہوا۔ ریاست حیدر آباد سے معمولی معمولی آدمیوں کو بیش قرار وظیفے ملتے ہیں وہ چاہتے تو کچھ مشکل نہ تھا مگر انھوں نے کبھی زیادہ کی ہوس نہ کی اور جو ملتا تھا اُس کے لئے وہ بہت شکر گذار تھے۔

غالباً سوائے ایک آدھ کے انھوں نے کبھی اپنی کسی کتاب کی رجسٹری نہ کرائی۔ جس نے چاہا چھاپ لی۔ اُن کی تصانیف مالِ یغما تھیں۔ مسدّس تو اتنا چھپا کہ شاید ہی کوئی کتاب چھپی ہو۔ یہ کیسی سیر چشمی اور عالی ظرفی کی بات ہے خصوصاً ایسے شخص کے لئے جس کی آمدنی محدود اور بڑھتی ہوئی ضرورتوں سے کم ہو۔

اسی طرح طبیعت میں حیا بھی تھی۔ جس سال حیدر آباد تشریف لائے، سر سیّد کی برسی کا جلسہ بھی انھیں کی

موجودگی میں ہوا۔ ان سے خاص طور سے درخواست کی گئی کہ اس جلسہ کے لئے سرسیّد کی زندگی پر کوئی مضمون پڑھیں۔ نواب عمادُالملک بہادر صدر تھے۔ مولانا نے اس موقع کے لئے بہت اچھا مضمون لکھا تھا، مضمون ذرا طویل تھا پڑھتے پڑھتے شام ہوگئی، اس لئے آخری حصّہ چھوڑ دیا۔ قیام گاہ پر واپس آکر فرمانے لگے کہ میرا گلا بالکل خشک ہوگیا تھا اور حلق میں کانٹے پڑ گئے تھے، اچھا ہوا اندھیرا ہوگیا ورنہ اس سے آگے ایک لفظ نہ پڑھا جاتا۔ میں نے کہا وہاں پانی شربت وغیرہ کا سب انتظام تھا آپ نے کیوں نہ فرمایا اسی وقت پانی یا شربت حاضر کر دیا جاتا کہنے لگے اتنے بڑے جمع میں پانی مانگتے ہوئے شرم معلوم ہوئی۔

جب کسی ہونہار تعلیم یافتہ نوجوان کو دیکھتے تو بہت خوش ہوتے تھے اور حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ قدر دانی[۱] کا یہ حال تھا کہ جہاں کوئی اچھی تحریر نظر سے گذرتی تو اُس کی فوراً داد دیتے اور خط لکھ کر لکھنے والے کی ہمّت بڑھاتے تھے۔ پیسہ اخبار جب روزانہ ہوا تو سب سے پہلے مولانا نے مُبارک باد کا تار دیا۔ مولوی ظفر علی خاں کی کارگذاریوں سے

---

[۱] سنہ ۱۹۰۲ء میں جب شیخ عبدالقادر صاحب نے لاہور سے رسالہ "مخزن" جاری کرنے کا اعلان کیا تو مولانا حالی پہلے شخص تھے جنھوں نے خبر سنتے ہی اپنا سالانہ چندہ دفترِ مخزن کو بھیجدیا۔ شیخ صاحب نے لکھا تھا مولانا پر یہ شعر صادق آتا ہے:

اوّل آں کس کہ خریدار شدش من بودم
باعثِ گرمیِ بازار شدش من بودم

(مؤلف)

خوش ہو کر اُن کی تعریف میں نظم لکھی۔ ہمدرد اور مولانا محمد علی کی مدح سرائی کی اور جب کبھی کوئی ایسی بات دیکھتے جو قابلِ اعتراض ہوتی تو بڑی ہمدردی اور شفقت سے سمجھاتے اور اُس کا دوسرا پہلو سُجھاتے۔ ان کے خطوں میں ایسے بہت سے اشارے پائے جاتے ہیں۔ اُن کے بعض ہم عصر اس بات سے بہت ناراض ہوتے تھے کہ مولانا داد دینے اور تعریف کرنے میں بہت فیاضی برتتے تھے جس سے لوگوں کا دماغ پھر جاتا ہے۔ ممکن ہے یہ صحیح ہو لیکن اس کا دوسرا پہلو بھی تو ہے۔ ان کی ذرا سی داد سے دل کتنا بڑھ جاتا تھا اور آئندہ کام کرنے کا حوصلہ ہوتا تھا۔

ہم عصروں اور ہم چشموں کی رقابت پُرانی چیز ہے اور ہمیشہ سے چلی آرہی ہے۔ جہاں تک مجھے ان سے گفتگو کرنے کا موقع ملا اور بعض اوقات چھیڑ چھیڑ کر اور کُرید کُرید کر دیکھا اور اُن کی تحریروں کے پڑھنے کا اتفاق ہوا مولانا اس عیب سے بری معلوم ہوتے ہیں۔ محمد حسین آزاد مولانا شبلی کی کتابوں پر کیسے اچھے تبصرے لکھے ہیں اور جو باتیں قابلِ تعریف تھیں اُن کی دل کھول کر داد دی ہے مگر اِن بزرگوں میں سے کسی نے مولانا کی کسی کتاب کے متعلق کچھ نہیں لکھا۔ آزاد مرحوم تو ان کا نام تک سُننے کے روادار نہ تھے۔ اِس معاملے میں ان کی طبیعت کا رنگ بعینہٖ ایسا تھا جیسے کسی سوت کا ہوتا ہے۔ لاہور میں کرنل

ہالرائڈ کی زیر ہدایت جو جدید رنگ کے مشاعرے ہوتے ان میں دونوں نے طبع آزمائی کی۔ برکھارت، حبِ وطن، نشاطِ امید، اسی زمانے کی نظمیں ہیں۔ مولانا کی اِن نظموں کی جو تعریف ہوئی تو یہ امر حضرت آزاد کی طبعِ نازک پر گراں گزرا۔ اُس وقت سے انکا رُخ ایسا پھرا کہ آخر دم تک یہ پھانس نہ نکلی۔ آزاد اپنے رنگ کے بے مثل نثار ہیں مگر شعر کے کوچے میں اُن کا قدم نہیں اُٹھتا۔ لیکن مولانا کی انصاف پسندی ملاحظہ کیجیے، کیسے صاف لفظوں میں اِس نئی تحریک کا سہرا آزاد کے سر باندھتے ہیں:

> "۱۸۷۴ء میں جب کہ راقم پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو سے متعلق اور لاہور میں مقیم تھا۔ مولوی محمد حسین آزاد کی تحریک اور کرنل ہالرائڈ ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم پنجاب کی تائید سے انجمنِ پنجاب نے ایک مشاعرہ قائم کیا تھا جو ہر مہینے ایک بار انجمن کے مکان میں منعقد ہوتا تھا۔"

بات میں بات نکل آتی ہے۔ جب حیاتِ جاوید شائع ہوئی تو مولانا نے تین نسخے مجھے بھیجے، ایک میرے لیے، ایک مولوی عزیز مرزا کے لیے اور تیسرا ایک محترم بزرگ اور ادیب کے لیے جو اُس وقت اتفاق سے حیدرآباد میں وارد تھے۔ میں نے لیجا کر یہ کتاب اُن کی خدمت میں پیش کی۔ شکریہ تو رہا ایک طرف، دیکھتے ہی فرمایا کہ "یہ کذب و افترا کا آئینہ ہے" وہاں اور بھی کئی صاحب موجود تھے۔ میں یہ سُنکر دم بخود رہ گیا۔ یوں بھی کچھ کہنا سوءِ ادب تھا، لیکن جہاں پڑھنے سے پہلے ایسی رائے

کا اظہار کر دیا گیا ہو، وہاں زبان سے کچھ نکالنا بے کار تھا۔

اب اس کے مقابلہ میں ایک واقعہ سُنیے۔ قیام حیدرآباد میں ایک روز مولوی ظفر علی خاں مولانا سے ملنے آئے۔ اس زمانے میں وہ "دکن ریویو" نکالتے تھے۔ کچھ عرصہ پہلے اس رسالے میں ایک دو مضمون مولانا شبلی کی کسی کتاب یا رسالے پر شائع ہوئے تھے، اُن میں کسی قدر بے جا شوخی سے کام لیا گیا تھا۔ مولانا نے اس کے متعلق ظفر علی خاں صاحب سے ایسے شفقت آمیز پیرایے میں نصیحت کرنی شروع کی کہ اُن سے کوئی جواب نہ بن پڑا اور سر جھکائے آنکھیں نیچی کیے چُپ چاپ سُنا کیے۔[۱] مولانا نے یہ بھی فرمایا کہ میں

---

[۱] اس پر اضافہ یہ ہے کہ مولانا حالی اپنے خط میں ایک صاحب کو جو رسالہ افسر کے ایڈیٹر رہ چکے تھے، لکھتے ہیں:

"جن لوگوں کو آپ نے اس غرض سے انتخاب کیا ہے کہ ان کے کلام پر آرٹیکل (تنقیدی مضامین) لکھے جائیں ان میں ایک شخص کا نام ہونے سے اور ایک کا نہ ہونے سے نہایت تعجب ہوا (جس شخص کا نام ہے اُس کے متعلق اپنی رائے لکھنے کے بعد مولانا لکھتے ہیں) اور اس سے بھی زیادہ تعجب شمس العلما مولوی شبلی نعمانی کا نام چھوڑ دینے پر ہے۔ اس فروگذاشت کو سوا اس کے کہ آپ کو انتخاب کرتے وقت ان کا خیال نہ آیا ہو، میں اور کسی بات پر محمول نہیں کر سکتا۔"

یہ مثال مولانا حالی کی انصاف پسندی کے علاوہ اُن کے حُسن ظن کی بھی ہے۔ یہ قرینِ قیاس نہیں کہ ایڈیٹر افسر، انتخاب کے وقت مولانا شبلی کو بھول گئے ہوں لیکن مولانا حالی گمانِ نیک سے کام لے کر بڑی نرمی سے اپنے مکتوب الیہ کو مولانا شبلی کی طرف توجہ دلاتے ہیں۔ (مؤلف)

تنقید سے منع نہیں کرتا، تنقید بہت اچھی چیز ہے اور اگر آپ لوگ تنقید نہ کریں گے تو ہماری اصلاح کیوں کر ہوگی، لیکن تنقید میں ذاتیات سے بحث کرنا یا ہنسی اُڑانا منصب تنقید کے خلاف ہے۔

مولانا انگریزی مطلق نہیں جانتے تھے۔ ایک آدھ بار سیکھنے کا ارادہ کیا نہ ہو سکا۔ لیکن حیرت یہ ہے کہ مغربی تعلیم و تہذیب کے منشا کو جیسا وہ سمجھتے تھے، اُس وقت بہت سے انگریزی تعلیم یافتہ بھی نہیں سمجھتے تھے۔ اُن کا کلام اور ان کی تصانیف اس کی شاہد ہیں اور جو سمجھتے تھے وہ کر کے دِکھا دیا۔ آج سینکڑوں تعلیم یافتہ موجود ہیں لیکن اُن میں سے کتنے ہیں جنھوں نے اس کا عُشرِ عشیر بھی کیا ہو۔ پھر یہی نہیں کہ ہمارے شاعروں اور مصنّفوں کی طرح وہ بالکل خیالی شخص تھے بلکہ جو کہتے اور سمجھتے تھے اُس پر عامل بھی تھے۔ آدمی مفکر بھی ہو اور عملی ہو، ایسا شاذ ہوتا ہے۔ تاہم مولانا نے اپنی بساط کے موافق عملی میدان میں بھی اپنی دو یادگاریں چھوڑی ہیں۔ ایک تو انھوں نے اپنے وطن پانی پت میں مدرسہ قائم کیا جو اب حالی مسلم ہائی اسکول کے نام سے موسوم ہے اور ایک پبلک اور ینٹل لائبریری قائم کی، جو پانی پت میں سب سے بلند اور پُر فضا مقام پر واقع ہے اس میں کتابوں کا اچھا خاصا ذخیرہ ہے جس سے پانی پت والے مُستفید ہوتے ہیں۔

جن لوگوں نے صرف اُن کا کلام پڑھا ہے شاید وہ سمجھتے ہوں گے کہ مولانا ہر وقت روتے اور بسورتے رہتے ہوں گے اِس میں شک نہیں کہ ان کا دل درد سے لبریز تھا اور ذرا سی ٹھیس سے چھلک اُٹھتا تھا، مگر ویسے وہ بڑے شگفتہ مزاج اور خوش طبع تھے۔ خصوصاً اپنے ہم صحبت یاروں میں بڑی ظرافت اور شوخی کی باتیں کرتے تھے۔ اُن کے کلام میں بھی کہیں کہیں ظرافت اور زیادہ تر طنز کی جھلک نظر آتی ہے۔

اُن کی بڑی خواہش تھی کہ اُردو زبان میں اعلیٰ درجہ کے ناول خصوصاً ڈرامے لکھے جائیں اور اِس بات پر افسوس کرتے تھے کہ یورپین زبانوں سے بہترین ناولوں اور ڈراموں کا اُردو میں ترجمہ نہیں کیا گیا تاکہ وہ نمونے کا کام دیں۔ یہ گفتگو انھوں نے کچھ اِس ڈھنگ سے کی جس سے مترشح ہوتا تھا کہ ان کا جی چاہتا ہے کہ خود کوئی ڈراما لکھیں لیکن اسٹیج سے واقف نہ ہونے اور کوئی عمدہ نمونہ سامنے نہ ہونے سے مجبور ہیں۔"

(اقتباس از "چند ہم عصر")

مولانا حالی کو ۱۹۰۴ء میں شمسُ العلماء کا خطاب ملا۔ جس کے وہ سالہا سال سے مستحق تھے۔ یہ تاخیر اس لئے ہوئی کہ وہ طبعاً جاہ پسندی اور نمود و نمائش سے بے نیاز تھے۔ ۳۱ دسمبر ۱۹۱۴ء (مطابق ۱۳۳۲ ہجری) کو اپنے وطن پانی پت میں انتقال فرمایا۔ مؤلف احقر

حامد حسن قادری نے یہ تاریخِ وفات کہی:

"تاریخ از کلامِ پاک" فَبَشِّرْهُ بِمَغْفِرَةٍ (سورہ یٰسین)

۱۳۳۳ھ ۱۹۱۴ء

دوسری تاریخ سنہ ہجری میں نکالی:

حُسْنُ الْعَاقِبَةِ عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُتَّقِيْنَ

۱۳۳۳ھ

مولانا حالی کی تصانیفِ نثر | مولانا حالی اُردو کے عناصرِ خمسہ[۱] میں وہ ضروری عنصر تھے جس کے بغیر مزاجِ اُردو صحیح و معتدل نہیں رہتا، بلکہ جو علم و ادب کی نفسِ حیات کا جزوِ لاینفک ہے۔ حالی اور ان کے ہم عصروں نے ۳۰، ۴۰ برس کے اندر وہ لٹریچر پیدا کر دیا جس کے بغیر کسی زبان کی تکمیل نہیں ہو سکتی، اور جس کا کوئی نمونہ پہلے سے موجود نہ تھا۔ حالی کی تصانیف سے پہلے سرسید مذہبی و اصلاحی مقالات، آزاد تذکرہ و تاریخ، نذیر احمد ناول شروع کر چکے تھے۔ سیرت و سوانح اب تک کسی نے نہ لکھے تھے۔ حالی پہلے سیرت نگار ہیں۔ تنقیدِ شعر و ادب بھی اب تک اُردو میں نہ آئی تھی۔ حالی پہلے تنقیدی مصنف بھی ہیں۔ شبلی نے سیرت و تنقید دونوں میں بڑا کام کیا، لیکن حالی کے بعد شروع کیا۔ حیاتِ سعدی پہلی با اصول سیرت ہے۔

مولانا حالی نے اپنے حالات میں بعض تصانیف کا ذکر کیا ہے، ان کی تصانیف بہ ترتیبِ تصنیف یہ ہیں:

(۱) تریاقِ مسموم: حالی کی سب سے پہلی تصنیف ہے کسی عیسائی

---

[۱] سرسید۔ آزاد۔ نذیر احمد۔ حالی۔ شبلی۔

کے جواب میں۔ (۱۸۶۷ء / ۱۲۸۴ھ) اب ناپید ہے۔

(۲) طباق الارض : فرنچ زبان کی تصنیف "علم الارض" (جیالوجی) کا عربی زبان سے اردو ترجمہ۔ پنجاب یونی ورسٹی نے ۱۸۶۸ء میں چھاپا، لیکن اب نہیں ملتا۔

(۳) اصولِ فارسی : فارسی زبان کے قواعد۔ (۱۸۶۸ء)

(۴) مولود شریف : طرزِ قدیم کی کتاب محفلِ میلاد میں پڑھنے کے لئے۔ غالباً ۱۸۷۰ء سے کچھ پہلے لکھی اور بعدِ وفات شائع ہوئی۔

(۵) تاریخِ محمدی پر منصفانہ رائے : اُسی عیسائی کی کتاب کی تنقید (۱۸۷۲ء / ۱۲۸۹ھ) اب نایاب ہے۔

(۶) شواہد الالہام۔

(۷) مجالس النساء (دو حصے) : لاہور میں ۱۸۷۴ء میں عورتوں کے لئے اخلاقی قصہ لکھا۔ گورنمنٹ سے چار سو روپے انعام ملا۔

(۸) سوانح عمری حکیم ناصر خسرو : (۱۸۸۲ء / ۱۲۹۹ھ) اب نایاب ہے۔

(۹) حیاتِ سعدی : (۱۸۸۳ء / ۱۳۰۱ھ)۔

(۱۰) مقدمہ شعر و شاعری : (۱۸۹۳ء / ۱۳۱۰ھ) میں اپنے دیوان کے ساتھ یہ مقدمہ شامل کیا۔ لیکن یہ خود ایک مستقل تصنیف تھی، اِس لئے ۱۹۲۰ء میں علیحدہ کتابی صورت میں شائع کیا گیا۔

(۱۱) یادگارِ غالب : (۱۸۹۷ء / ۱۳۱۵ھ)

(۱۲) حیاتِ جاوید : سرسید کی مفصل سوانح عمری (۱۹۰۱ء / ۱۳۱۸ھ) میں شائع ہوئی۔

(۱۳) سوانح عمری مولانا عبدالرحمٰن : یہ مولانا حالی کے استاد تھے۔

(۱۴) مضامینِ حالی: (۱۸۷۵ء/۱۲۹۲ھ) سے (۱۹۰۱ء/۱۳۱۸ھ) تک کے مضامین تہذیب الاخلاق، علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، کالج میگزین، معارف[۱]، روئدادِ ندوۃ العلماء وغیرہ سے جمع کرکے مولوی وحید الدین سلیم پانی پتی نے مرتب کئے اور پنجاب نیشنل ایجنسی پانی پت نے ۱۹۰۴ء میں شائع کئے۔

(۱۵) مقالاتِ حالی: مضامینِ حالی کے بعد دو حصوں میں انجمنِ ترقیِ اردو نے شائع کئے۔

(۱۶) مکتوباتِ حالی: خطوطِ حالی دو حصوں میں۔ مولانا کے صاحبزادے سجاد حسین صاحب نے ۱۹۲۵ء میں شائع کئے۔ مولوی عبد الحق صاحب کا مقدمہ شامل ہے۔

تصانیفِ نظم مولانا حالی کی شاعری اس تاریخِ نثر کے مبحث میں داخل نہیں ہے لیکن مولانا کے تذکرۂ کمالات کے سلسلے میں مختصر طور پر اس کا ذکر کیا جاتا ہے۔ مولانا فنِ شاعری اور نقدِ شعر میں اعلیٰ پایہ کے صاحبِ نظر و باکمال تھے۔ ان کے دیوانِ غزلیات میں مومن و غالب کی نزاکت و لطافت کا اثر بھی ہے، اور درد و مصحفی کی سادگی و جاذبیت بھی۔

جدید شاعری کا آغاز اگرچہ آزاد کی کوشش و کاوش سے ہوا، لیکن اُن کے رفیقِ کار بلکہ شریکِ غالب حالی تھے۔ لاہور کے مشاعرے میں حالی نے چار نظمیں پڑھیں اور غالباً اتنی ہی آزاد نے، لیکن حالی کی صرف دو نظمیں برکھارُت اور حبِّ وطن، آزاد کی سب نظموں پر بھاری تھیں۔

---

[۱] یہ "معارف" مولوی سید سلیمان ندوی کے رسالہ معارف اعظم گڈھ سے بہت پہلے کا ہے۔ مولوی وحید الدین سلیم کی ادارت میں علی گڈھ سے نکلتا تھا۔

اس کے بعد حالی نے جو نظمیں لکھیں انھوں نے شاعری میں انقلاب پیدا کر دیا۔

مسدّس حالی (مصنفہ ۱۸۷۹ء) کی عظمت، قبولیت، تاثیر اور اشاعت کو انیسویں صدی کی کوئی دوسری نظم نہیں پہنچی۔ مناجاتِ بیوہ (۱۸۸۶ء) خاص کر ہندوستان کی معاشرت و مذاق کی چیز ہے۔ اور مولانا حالی کی عظمتِ شاعرانہ تسلیم کرانے کے لئے یہ نظم تنہا کافی ہے — نشاطِ امید (۱۸۷۴ء)۔ رحم و انصاف (۱۸۷۵ء)۔ شکوۂ ہند، (۱۸۸۶ء)۔ چُپ کی داد (۱۹۰۵ء) بھی اپنے اپنے رنگ کی پہلی نظمیں ہیں باقی چھوٹی بڑی نظمیں جو ایک ضخیم مجموعہ کی قدر ہیں اور چند بار علیحدہ د یکجا شائع ہو چکی ہیں۔ مولانا کا عظیم الشان کارنامہ ہیں۔ رباعیاتِ حالی اُردو میں ایجادِ جدید ہیں۔

مولانا حالی باوجود ماہرِ فن ہونے کے قواعدِ شاعری یا ضوابطِ استادی کے کچھ بہت پابند نہ تھے۔ شاعری کا سب سے مکروہ عیب تعقیدِ لفظی ہے۔ لیکن تعجب ہے کہ آزاد و حالی دونوں اس کو قابلِ احتراز نہیں سمجھتے اگر آزاد کے اُستاد (ذوق) اِس عیب سے اجتناب نہ کرتے تھے تو حالی کے اُستاد (غالب و شیفتہ) کے ہاں تو شاذ و نادر بھی نہ ملے گا۔

حالی کا شاعرانہ کمال زبان و محاورہ کی صحت، طرزِ بیان کی جدت و موزونیت، لب و لہجہ کا لوچ اور لطافت ہے۔ الفاظ کا انتخاب اِس قدر صحیح و برمحل ہوتا ہے کہ ایک ایک لفظ شعر میں جان ڈال دیتا ہے۔

مولانا حالی کی قدردانی | اپنے ہم عصروں کی طرح مولانا حالی نے

بھی اپنی تصانیف کی کامیابی و قدر دانی اپنی آنکھوں سے دیکھ لی خاص کر ان کی نظموں اور نظموں میں بھی ایک مسدّس کو جو قبولِ عام حاصل ہوا، وہ تمام اردو شاعری میں کسی دوسری نظم کو میسّر نہیں آیا لیکن اس خاص قدر شناسی میں مولانا واحد و منفرد ہیں کہ ان کا جشنِ صد سالہ عظیم الشان پیمانہ پر منایا گیا۔ سنہ ہجری کے حساب سے سنہ ۱۳۵۳ھ میں مولانا کی ولادت کو پورے سو برس ہو گئے۔ ۲۰ رجب سنہ ۱۳۵۴ھ (۲۶ اکتوبر سنہ ۱۹۳۵ء) کو مولانا کے وطن پانی پت میں جشن ہوا جس کی صدارت نواب صاحب بہادر بھوپال نے کی، اور حالی میموریل اسکول پانی پت کو بیس ہزار روپے عطا فرمائے۔ دوسرے قدر شناس اصحاب کے علاوہ گورنمنٹ پنجاب نے بھی ایک ہزار روپے دیئے۔

ڈاکٹر اقبال نے اس جشن کے موقع پر اس قطعہ میں خراجِ تحسین ادا کیا تھا:

آں لالۂ صحرا کہ خزاں دید و بیفسرد ۔۔۔ سیّد دگر اور انمی از اشکِ سحر داد

حالی ز نواہائے جگر سوز نیاسود ۔۔۔ تا لالۂ شبنم زدہ را داغِ جگر داد

نیاز مند مؤلف نے ایک قطعۂ فارسی میں چند تاریخیں مرتب کیں ایک تاریخ عربی کہی: وَلِلّٰهِ ذٰلِكَ فَوْزٌ عَظِيْمٌ ۱۹۳۵ء دوسری تاریخیں یہ ہیں:

پیشکش اخلاص
۱۳۵۴ھ

سالِ میلادیِ[۱] جشنِ حالی است ۔۔۔ "منظرِ ملکِ عقیدت آئیں" ۱۹۳۵

سالِ ہجری چو بخواہند، بگو ۔۔۔ "کہ ہم از احباب خراجِ تحسیں" ۱۳۵۴ھ

[۱] فارسی جدید میں سنہ عیسوی کو سنہ میلادی کہتے ہیں۔

اِس جشنِ صد سالہ کی یادگار میں رسالہ زمانہ کانپور وغیرہ نے حالی نمبر شائع کئے۔

مولانا حالی کا طرزِ تحریر

مولانا کی سب سے پہلی تصانیف "تریاق مسموم" وغیرہ مفقود ہیں کہ ان کے اسلوبِ تحریر کا اندازہ ہو سکے۔ سب سے قدیم کتابیں مولود شریف اور مجالس النساء (۱۸۷۴ء) موجود ہیں۔ ان میں "مجالس النساء" خاص چیز ہے، یعنی عورتوں کے لئے اخلاقی و تعلیمی مسائل فسانہ کے پیرایہ میں لکھے ہیں۔ اس سے پہلے مولانا نذیر احمد کی مرآۃ العروس (۱۸۶۹ء) وغیرہ شائع و عام ہو چکی تھی۔ اِس لئے ان کو دیکھ کر مولانا حالی کو لکھنے کا خیال آیا ہوگا۔ چنانچہ وہی اندازِ بیان اور دہلی کے شریف گھرانوں کی زبان لکھی ہے۔ لیکن نہ مولانا نذیر احمد کے مغلق الفاظ ہیں نہ عامیانہ محاورات و امثال۔

اس سے دس برس بعد حیاتِ سعدی (۱۸۸۴ء)، اور اس کے دس برس بعد مقدمۂ شعر و شاعری لکھا۔ ان میں مولانا کی اصلی شانِ تحریر نظر آتی ہے۔ زبان و محاورہ کی صحت، طرزِ بیان کی بے تکلفی اور لب و لہجہ کی نرمی اور لوچ نمایاں ہے۔ ان کے ہاں سرسیّد کا جوش، آزاد کی رنگینی، نذیر احمد کا زور و شور اور ظرافت نہیں ہے، لیکن قوتِ بیان اور فصاحت و روانی بہتر سے بہتر ہے۔ حالی کا طرز سرسیّد سے زیادہ مشابہ ہے۔ حالی نے سرسیّد کے اسلوب اور زبان کی قدامت کو زبانِ حال کے مطابق کر دیا ہے۔ لیکن سرسیّد کے جوشِ بیان، تیزیٔ طبع، ملکۂ ایجاد اور تنوعِ اسالیب کی حالی کے ہاں کمی ہے۔ مولانا حالی واقعی مولانا تھے۔ صاحبدل

درویش مزاج، خاموش، متین۔ اُن کے علم و فضل میں وسعت اور ذہن و فکر میں روشنی تھی، لیکن دل اور مزاج میں گرمی اور تیزی نہ تھی۔ انھوں نے غور و فکر کے ساتھ اردو زبان اور ادب کا جائزہ لیکر، اس کی خامیوں کو دیکھ کر، ضرورتوں کو سمجھ کر، دوسری زبانوں سے مقابلہ کرکے، جدید موضوعات کی کتابیں لکھ دیں، لیکن اپنی تحریر و اسلوب کے لئے کوئی روش خاص پیدا نہ کرسکے۔ صاحب طرز بننے کے معنی ہیں تقلید کو چھوڑ کر مُوجد بننا، موجودہ روش سے بغاوت کرنا اور اپنی راہ الگ نکالنا۔ یہ اُس وقت ہوتا ہے، جب کسی ادیب و مصنف کے اندر فطری اُپج ہو اور اس کی ایک دُھن، شوق، جوشش ہو۔ انشاء اللہ خاں، مرزا غالب، سرسیّد، آزاد، نذیر احمد، شبلی کی ایجادیں اور اختراعیں اسی صفت کے مظاہر و آثار ہیں۔ اور اسی صفت کے نہ ہونے سے مولوی ذکاء اللہ اور مولانا حالی "صاحبِ طرز" نہیں ہیں۔ لیکن اس طرح کا "صاحب طرز" ہونا ادیب کی ذات تک محدود رہتا ہے۔ جیسا غالب، آزاد اور نذیر احمد کے طرز کے ساتھ ہوا۔ نہ ان طرزوں کی بعد کو تقلید ہوگی نہ ضرورت تھی۔

مولانا حالی کی تحریروں میں موضوع و مضمون کی جدت، بیان کی صداقت، زبان کی صحت، اسلوب کی صفائی، دلائل کی قوت، تمثیلات کی برجستگی سب کچھ ہے اور اکثر بے عیب ہے، بلکہ بعض جگہ نادر و جدید بھی ہے، لیکن ان کی عبارت پڑھنے سے ادبی مسرت حاصل نہیں ہوتی انشا پردازی کا نشاط و اہتزاز پیدا نہیں ہوتا۔ تاہم ان کی جچی تلی تحریر کا اثر

ہوتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بعد کو رواج پانے کے لئے حالی اور شبلی ہی کا مِلا جُلا طرز تھا۔

اسلوبِ حالی کی ایک لطیف خصوصیت انتخابِ الفاظ ہے خصوصاً ہندی الفاظ کا استعمال اور ان کی بے ساختگی و برجستگی۔ مثلاً :

(۱) "جس زمانے میں کہ پہلی بار راقم کا دِلّی جانا ہوا، اس باغ میں پت جھڑ شروع ہو گئی تھی، کچھ لوگ دلّی سے باہر چلے گئے تھے اور کچھ دُنیا سے رخصت ہو چکے تھے" (یادگارِ غالب)

یہاں لکھ سکتے تھے کہ "اس باغ میں خزاں شروع ہو گئی تھی" اور مفہوم وہی رہتا۔ لیکن پت جھڑ کا لفظ اپنے لفظی مفہوم (پتّوں کا جھڑ کر منتشر ہونا) کے اعتبار سے آئندہ فقرے کے کس قدر مناسب ہے کہ "کچھ لوگ دلّی سے باہر چلے گئے تھے اور کچھ دُنیا سے رخصت ہو چکے تھے"

(۲) "قدیم اسلوب جو کانوں میں رچ گئے ہیں، ان کو بدستور قائم رکھا جائے" (مقدمۂ شعر و شاعری)

(۳) "اس طلسم کو جو قدما باندھ گئے ہیں ہرگز نہ ٹوٹنے دے، ورنہ وہ بہت جلد دیکھے گا کہ اس نے اپنے منتر میں وہی اَنگھر بھلادئیے ہیں جو دلوں کو تسخیر کرتے تھے" (مقدمۂ شعر و شاعری)

ہندی کے الفاظ اور محاورے حالی کی نظموں میں نثر سے بھی زیادہ تاثیر پیدا کرتے ہیں۔

لیکن ایک بے اعتدالی سے حالی بھی نہ بچ سکے۔ یعنی انگریزی الفاظ کا غیر ضروری استعمال حالی بھی نذیر احمد سے کم نہیں کرتے، حالانکہ یہ انگریزی زبان سے محض ناآشنا تھے۔ چند مثالیں یہ ہیں :

(۱) "اس کے ایک بند میں ایک پوائنٹ[1] عمدگی سے بیان ہو سکتا ہے'
لیکن ہر پوائنٹ کی وسعت یکساں نہیں ہوتی۔"
(مقدمۂ شعر و شاعری)

(۲) "ان کے بچپن میں جسمانی صحت اور فزیکل[2] قابلیت میں کوئی
ایسی خصوصیت نہیں پائی جاتی تھی۔" (حیاتِ جاوید)

(۳) "جس کو پالیٹیکس[3] کے لحاظ سے کسی نے ٹائم سرور سمجھا ہے تو
کسی نے نہایت راست باز لبرل[4] جانا ہے۔" (حیاتِ جاوید)

(۴) "اپنی جنرل انفورمیشن[5] کو وسعت دے۔" (مضامین حالی)

اسی طرح میٹیریل (مواد، مسالہ)۔ ایمیجنیشن (تخیل)۔ ورکس (تصانیف)۔ ججمنٹ (فیصلہ) وغیرہ بکثرت وبے تکلف لکھتے ہیں۔ یہ روش سب سے پہلے سرسید نے نکالی تھی۔ پھر حالی و نذیر احمد زیادہ اور عبدالحلیم شرر[6] لکھنوی کم، اسی راہ پر چل نکلے۔ ان بزرگوں میں سرسید تو "انگریز و انگریزی پرستی" کی دھن میں کسی بات کی اچھائی برائی پر نظر نہیں کرتے تھے۔ مذہب، معاشرت، زبان، تعلیم سب کو اسی رنگ میں رنگنا چاہتے تھے۔ نذیر احمد کوئی با اصول آدمی نہ تھے۔ انھوں

---

[1] نکتہ۔ خاص بات [2] جسمانی [3] سیاست

[4] زمانہ ساز [5] آزاد خیال [6] عام معلومات

[7] شرر لکھنوی کے فقرے ہیں: (۱) اس کے حالات فی الحال بالکل ایک اسی قسم کی مسٹری (راز) معلوم ہوتے ہیں۔ (مضامین شاعرانہ ص۱۵۳)

(۲) فردوسی و نظامی نے بزم عالم کی غزل خوانی کا چارج (منصب) اپنے ذمہ لے لیا۔ (مضامین شاعرانہ ص۲۰۰)

نے مولوی ذکاء اللہ کے لئے لکھا ہے کہ "وہ سید احمد خاں کے پٹھو تھے" لیکن یہی لقب خود ڈپٹی نذیر احمد پر بھی صادق آتا ہے۔ پھر نذیر احمد ظریف طبع بلکہ "مسخرے" تھے۔ اور انگریزی کی بھرمار بھی ان کے مسخرے پن کی ایک ادا تھی۔ حالی جیسے متین و با اصول ادیب کے لئے اس طرز کو اختیار کرنے کا بجز تقلید سرسید کوئی سبب نہ تھا۔ لیکن اسی جذبہ نے ان کو نہ سوچنے دیا کہ وہ اور ان کا زمانہ ادبیاتِ جدید کے لئے پیشوا اور رہنما ہیں ان کو وہ اسلوب اختیار کرنا چاہیئے جو باقی اور جاری رہنے کے قابل ہو۔

علامہ آزاد اور مولوی ذکاء اللہ تو قدامت پسند تھے۔ ان کا انگریزی الفاظ استعمال نہ کرنا کسی غور و فکر اور پیش بینی کی بنا پر نہ تھا۔ البتہ علامہ شبلی کے ذوقِ صحیح اور نباضیِ ادب و انشاء کی داد دینی چاہیئے کہ انھوں نے اِس کجروی کو سمجھ لیا اور اس سے بچکر چلے۔

مولانا حالی پر اعتراضات

سرسید کے رفقا محض جرمِ رفاقت و ہمنوائی کے سبب سے موردِ طعن و اعتراض گردانے گئے۔ ان میں مولانا حالی بھی تھے۔ ان کے مسدس کو اسلام سے بغاوت اور مسلمانوں کی توہین سمجھا گیا۔ اور ان پر بھی کفر و گمراہی کے فتوے لگائے گئے۔ ہم کو اِس قسم کے اعتراضات سے بحث نہیں۔ یہ فوری جوش تھا جس غلغلے کے ساتھ اُٹھا تھا ایسا ہی بیٹھتا چلا گیا۔ ۱۸۷۹ء میں مسدس لکھا گیا۔ ۱۸۸۰ء میں تمام ملک میں پھیل گیا اور اس پر غدر برپا ہونے لگا۔ لیکن ۱۸۸۶ء میں جب مولانا نے مسدس پر دوسرا دیباچہ لکھا ہے، تو اُس میں لکھتے ہیں:

"بعض قومی مدرسوں میں اس کا انتخاب بچوں کو پڑھایا جاتا ہے۔ مولود
شریف کی مجلسوں میں ان کے بند پڑھے جاتے ہیں۔ اکثر لوگ اس
کو پڑھ کر بے اختیار روتے اور آنسو بہاتے ہیں۔ اس کے بہت سے
بند ہمارے واعظوں کی زبان پر جاری ہیں۔"

ہمارا مبحث مولانا کے موضوعاتِ تصنیف اور اسالیبِ نظم و نثر کی نکتہ چینیاں ہیں۔ اُن کی حقیقت یہ ہے کہ مولانا حالی کے بڑے کارنامے دو ہیں: (۱) سیرت۔ اور (۲) تنقید۔ ان دونوں موضوع پر اُردو میں کوئی با اصول تصنیف موجود نہ تھی۔ سوانح سعدی و غالب و سرسید اور مقدمہ شعر و شاعری، اُردو اور حالی دونوں کی اوّلیات ہیں۔ ان دونوں کی فنی خصوصیات اور مراتبِ تکمیل سے "اردو نویس" اور "اُردو خواں" دونوں ناآشنا تھے۔ انگریزی زبان میں یہ علوم بالکل مکمل نہیں تو اعلیٰ پایہ پر موجود و مدوّن تھے۔ لیکن حالی انگریزی نہ جاننے کے سبب سے بلا واسطہ ان علوم کو حاصل نہ کر سکتے تھے۔ ترجموں کے ذریعہ سے انھوں نے یورپ کے اصولِ تنقید دریافت کئے اور اُن کو اپنے موضوع "مقدمہ" اور ہندوستان و اردو زبان کے مناسب حال مرتب کیا۔ اس لئے حالی کی کوتاہیاں ان کے لئے عیب نہیں، بلکہ محض "مقدمہ" کا لکھ دینا ہی ان کا ہنر ہے۔ اس لئے پروفیسر کلیم الدین احمد کا یہ لکھ دینا:

"خیالات ماخوذ، واقفیت محدود، نظر سطحی، فہم و ادراک معمولی
غور و فکر ناکافی، تمیز ادنیٰ، دماغ و شخصیت اوسط، یہ ہے
حالی کی کائنات۔ سارے خیالات جن پر یہاں بحث کی گئی ہے وہ

سب مغرب سے لے گئے ہیں۔ دوسرے خیالات مشرقی ہیں اور مقدمۂ
شعر و شاعری میں مغربی و مشرقی خیالات ایک جگہ مضحک طور پر
جمع ہو گئے ہیں۔"

نقادیِ ادب اور ادبِ نقادی دونوں کے لئے زیبانہ تھا۔ مقدمۂ حالی
تنقید کی فنی کتاب نہیں ہے، بلکہ تنقید کا نمونہ و مذاق پیدا کرنے کی
پہلی کوشش ہے، جس کی نظیر اردو کیا فارسی و عربی میں بھی نہ تھی۔ اس
میں خامیاں ضرور ہیں اور وہ بعد کی بہتر تنقیدوں کے مقابلے میں
زیادہ نمایاں ہو جاتی ہیں۔ لیکن اتنی وسعت اور جامعیت کی بھی کوئی
کتاب اِن پچاس برس میں پیدا نہ ہو سکی۔

حالی کی تصنیفاتِ سیرت (حیاتِ سعدی، یادگارِ غالب اور
حیاتِ جاوید) پر یہ اعتراض ہے کہ مولانا نے ان کی سیرت نہیں لکھی
بلکہ ہیرو مان کر ان کے کارنامے بیان کئے ہیں۔ مولانا شبلی نے
"حیاتِ جاوید" کی صورت دیکھ کر، کھولنے اور پڑھنے سے پہلے ہی
فرما دیا تھا کہ "یہ کذب و افترا کا آئینہ ہے" اور پڑھ کر فرمایا کہ "سرسید
کی مدلل مداحی کی ہے"

پھر اور لوگوں نے کہا کہ:

"یہ کتاب شروع سے اخیر تک ایک اعتذار (اپالوجی) کا پہلو
لئے ہوئے ہے"

یعنی مولانا حالی نے سرسید کی طرف سے گویا صفائی پیش کی ہے مولانا
نے کسی دعوی علم و فن کے ساتھ یہ کتابیں نہیں لکھیں۔ یہ "ناموران اسلام"
یا "مشاہیرِ ہند و عجم" کے سلسلے میں شامل نہیں ہیں۔ بلکہ ان تینوں

ہستیوں کے جوشِ محبت میں لکھی گئی ہیں۔

سعدی کے حالات سعدی کی مقبولیت اور اُن کے عجیب و گوناگوں سوانح کے سبب سے لکھے۔ غالب کا تذکرہ صرف اپنے استاد کی یادگار قائم کرنے کے لئے لکھا۔ سر سید کی سیرت اُن کی عظیم الشان شخصیت اور ان کے مہتم بالشان کارناموں کو پیش کرنے کے لئے مرتب کی۔ لیکن یہ تینوں چیزیں ایسی لکھ دیں کہ ایران میں بھی ایسی سیرتِ سعدی موجود نہ تھی۔ وہاں حالی کی حیاتِ سعدی کا فارسی جدید میں ترجمہ کیا گیا۔ غالب کے سوانح نگار آج بھی "یادگارِ غالب" کے استفادہ سے بے نیاز نہیں ہیں۔ "حیاتِ جاوید" سر سید کے موافق و مخالف دونوں گروہوں کے لئے معلومات کا واحد ذریعہ ہے۔ اِن تصانیف کی اہمیت اور مولانا کا کمال سب سے بڑھ کر یہی ہے۔

حیاتِ سعدی پر ایک عجیب اعتراض یہ بھی ہے کہ مولانا نے شیخ سعدی کے لئے صیغہ واحد غائب لکھا ہے: "شیخ کہتا تھا"۔ "شیخ لکھتا ہے" اور اس کو سُوءِ ادب سمجھا گیا ہے۔ یہ اعتراض اوّل تو مورخ پر نہیں ہو سکتا۔ تاریخ میں تاریخی ہستیوں کے لئے یہ طرز جائز رکھا گیا ہے۔ دوسرے شیخ سعدی کے شیخِ طریقت اور ولی اللہ ہونے کی حیثیت اس قدر مشہور نہیں ہے، جتنا ان کا مصنف، شاعر، انشاپرداز اور ظریف ہونا؛ اور ان میں سے ہر حیثیت کو پیشِ نظر رکھ کر ان کو اس طرح سے لکھا جا سکتا ہے۔ چنانچہ علامہ آزاد نے بھی "سخندانِ فارس" میں شیخ سعدی کے لئے ضمیر واحد استعمال کی ہے: "اُس کے ننھے ننھے فقرے"۔ "اُس کی نثر"۔ "اُس کی قدرتی فصاحت" (اِس

(داستانِ اردو کا صفحہ ۶۵۴ دیکھئے)۔ تیسرے شیخ سعدی اسی امر میں خاص طور پر قابلِ استثنار ہیں۔ ان کی مقبولیت و شہرت نے ان کے اندر ایک شانِ محبوبیت پیدا کردی ہے اور وہ بے تکلفی کا سبب ہو سکتی ہے۔ یہ بات خسرو، حافظ، جامی کسی میں سعدی کے برابر نہیں ہے۔

علامہ شبلی کا کارنامہ سیرت و تنقید میں مولانا حالی سے افضل و وسیع تر ہے، لیکن ہیرو پرستی و رجحان پسندی اور اپنے ناپسندیدہ شخص کی ہنر پوشی و عیب کوشی بھی مولانا شبلی کی طبیعت میں ہے[۱] جس کا ذکر ان کے حالات میں آئے گا۔ علامہ آزاد بھی اس سے بری نہیں ہیں۔ مولوی ذکار اللہ پر بھی "انگریز پرستی" کا الزام ہے۔ مولوی عبد الحلیم شرر بھی جانب داری سے خالی نہیں ہیں۔ یعنی ہندوستان کے سیرت نگاروں کو تحقیق و تدقیق اور تجزیہ و تنقیح کا سلیقہ تو آگیا ہے، لیکن بے لاگ اظہارِ رائے کی اخلاقی جرأت پیدا نہیں ہوئی۔ مولانا حالی تو بالطبع نہایت بامروّت، صلح پسند "ہنر پاش و عیب پوش" تھے۔ انھوں نے اگر غالب و سر سید کی عیب جوئی نہیں کی تو علامہ آزاد اور علامہ شبلی کی کوتاہیوں پر بھی پردہ ڈالا ہے اور ان کی تاویلیں کی ہیں، جیساکہ "مضامین حالی" کے ذکر میں آتا ہے۔

تصانیفِ حالی کے نمونے | (۱) مجالس النّسار: یہ کتاب مولانا

---

[۱] تنقیدیتِ شعر العجم جو مختلف نقادوں نے لکھی ہیں، دیکھنی چاہئیں۔ ہم نے اپنی تالیف تاریخ مرثیہ گوئی (مطبوعہ ۱۹۳۳ء) میں مفصل لکھ دیا ہے کہ مولانا شبلی نے میر انیس کو ہیرو مان کر ان کے مقابل پہلوان مرزا دبیر کی خوبیوں سے کس طرح چشم پوشی کی ہے (مؤلف)

حالی کی تصانیف میں اپنی قسم کی ایک ہی ہے، اور ان کا کوئی بڑا کارنامہ نہیں ہے۔ صرف ان کی قدرتِ زبان اور لطفِ محاورہ کے نمونے کے لئے مختصر اقتباس درجِ ذیل کیا جاتا ہے:

"آتو جی — ہے ہے لوگو، اشراف زادیوں نے کیسا لکھنا پڑھنا چھوڑ دیا، کیسی ان گھروں پر جہالت چھا گئی۔ کیسا اُلٹا زمانہ آگیا محمودی بیگم! ذرا سوچنے کی بات ہے۔ ہمارے ملک کے ہندو مسلمان جو اشراف کہلاتے ہیں، سب کے ہاں قدیم سے یہ دستور چلا آتا ہے کہ بیٹی کو کچھ پڑھائیں یا نہ پڑھائیں، پر بیٹے کو ضرور پڑھواتے ہیں کیا غریب اور کیا امیر، ہر شخص اپنی بساط کے موافق بیٹے کی تعلیم میں ضرور کوشش کرتا ہے۔ پر میں نہیں جانتی اِس ملک کی برکت کہاں اُڑ گئی؟ جب دیکھا یہی دیکھا کہ سَو میں سے دو چار بچے جو ایسے ہی صاحبِ نصیب اور ہونہار ہوتے، وہ تو لکھ پڑھ کر کسی قابل ہو گئے اور باقی وہی کودن کے کودن رہے۔ ہاں اب اب کر کے سرکاری مدرسوں میں پڑھنا لکھنا بے شک زیادہ ہو گیا ہے، پر آدمیت سی چیز وہاں بھی جی جم آتی ہے۔"........

"تم اپنے جی میں کہو گی تو سہی کہ بڑھاپے میں عورت کی عقل جاتی رہی ہے، پر مجھ سے جو پوچھو تو یہ یوں کہ خدا بیٹیوں کا بدلا لیتا ہے۔ ماں باپ نے یہ سمجھا تھا کہ بیٹوں کی کمائی میں تو ہمارا ساجھا ہے اور بیٹیوں سے ہم کو کچھ لینا نہیں۔ آؤ جہاں تک ہو سکے بیٹوں کو پڑھائیں جو کل کو ہمارے بھی کام آئے۔ خدا کو یہ بات ناپسند آئی۔ اُس نے بیٹوں کو بیٹیوں سے بھی بدتر کر دیا۔ وہ تو

عورت ہو کے آن پڑھ رہی تھیں، یہ مرد ہو کے جاہل رہے۔"

(۲) حیاتِ سعدی: یہ سیرت تحقیق، جامعیت، حُسنِ ترتیب کے لحاظ سے اردو میں پہلی تصنیف ہے۔ مولانا حالی نے ہر ممکن ذریعہ سے حالات جمع کئے ہیں۔ سعدی کی تصانیف سے حالات لئے ہیں۔ ابتدا میں سعدی کے وطن شیراز کا مختصر ذکر کیا ہے۔ پھر سعدی کے حالات تفصیل کے ساتھ لکھے ہیں۔ ان کے لئے ہر جگہ صرف شیخ کا لفظ لکھتے ہیں۔ حالات کے بعد سعدی کی تصانیف پر نظر ڈالی ہے۔ دوسروں سے مقابلہ کیا ہے۔ گلستاں اور بوستاں کا ان کی جوابی تصانیف کے ساتھ موازنہ کیا ہے۔ چند مقامات سے مختصر انتخابات لکھے جاتے ہیں:

(۱) شیراز کے حال میں لکھتے ہیں:

"بہت سی خصوصیتیں ایسی ہیں جن سے انسان کے قُویٰ میں شگفتگی اور بالیدگی پیدا ہوتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ فارس کے اکثر شہر مردم خیز سمجھے گئے ہیں، جیسے یزد، میبذ، گازرون، فیروز آباد، بیضا، شیراز وغیرہ۔ ان شہروں میں کثرت سے علماء و فضلا اور ادیب و شاعر پیدا ہوتے ہیں۔ جن کی تصنیفات مسلمانوں میں اب تک موجود ہیں۔ خصوصاً شیراز جو کہ صدہا سال ایران کا پایۂ تخت رہا ہے۔ مسلمانان ایران نے جس طرح قم کو "دار المومنین" اور یزد کو "دار العبادۃ" کا خطاب دیا ہے، اسی طرح شیراز کو "دار العلم" کے لقب سے ملقب کیا ہے......

اِس میں شک نہیں کہ شہر کا قدرتی موقع اور آب و ہوا کی خوبی اور عمارات کی لطافت و خوش اسلوبی، باشندوں کے خیالات اور قویٰ پر عجیب اثر رکھتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ شیراز کے اکثر مشائخ اور علماء و شعرا پاکیزہ طبع اور لطیف و ظریف ہوئے ہیں۔ شیخ (یعنی شیخ سعدی) نے بھی بوستان کے دیباچہ میں اہلِ شیراز کو ان تمام اشخاص پر ترجیح دی ہے، جن سے وہ حالتِ سفر میں ملا تھا۔ شیراز سے جس قدر علماء و مشائخ و شعراء و مصنفین ابتدا سے آخر تک اُٹھے ہیں اور جن کا حال مسلمانوں کے تذکروں میں جابجا مذکور ہے اُن کی تعداد سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ اس شہر کی خاک علم و ہنر کے ساتھ کس قدر مناسبت رکھتی ہے، اور شیخ کے کلام کی بے نظیر شہرت اور مقبولیت سے ثابت ہے کہ شیخ کا وجود بھی شیراز کے لئے کچھ کم باعثِ افتخار نہ تھا۔

(ب) جس زمانے میں شیخ نظامیہ بغداد میں پڑھتا تھا۔ اگرچہ اس وقت حقیقت میں عباسیوں کی خلافت کا خاتمہ ہوچکا تھا۔ مگر ظاہری شان و شوکت ہارون اور مامون کے عہد کو یاد دلاتی تھیں۔ عباسیہ کا اخیر خلیفہ مستعصم باللہ سریر سلطنت پر متمکن تھا اور اس کے عہد میں گویا بغداد کی خلافت نے چند روز کے لئے سنبھالا لیا تھا۔ اطراف عالم کے اکابر و اشراف اور ہر علم و فن کے ماہر اور اربابِ حرفت و صنعت مدینۃ السلام بغداد میں جمع تھے۔ عیش و عشرت کے سامان

حد سے زیادہ ہر طرف چھیتا نظر آتے تھے۔ خلیفہ کی عظمت اور رعب داب سے بڑے بڑے جلیل القدر بادشاہ لرزتے تھے اور بڑے بڑے امرا اور فرماں روا بارگاہِ خلافت میں مشکل سے باریاب ہوتے تھے۔ قصرِ خلافت کے آستانہ پر ایک پتھر بمنزلۂ حجرالاسود کے پڑا ہوا تھا جس کو اُمرا اور اعیانِ سلطنت قصرِ خلافت میں داخل ہوتے وقت بوسہ دیتے تھے تہواروں میں جس راہ سے خلیفہ کی سواری نکلتی تھی، وہاں ایک مدت پہلے سے رستہ کے تمام منظر اور بالاخانے کرایہ داروں سے رُک جاتے تھے۔ الغرض عباسیہ کا یہ آخری جاہ و جلال شیخ نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور پھر اسی آنکھ سے اس دارالخلافہ کا بے چراغ ہونا جو چھ سو برس بوسہ گاہِ ملوک و سلاطین رہا تھا اور اس خاندان کی بربادی جس کا سایہ اقتدار یورپ اور افریقہ پر برابر پڑتا تھا اور خلیفہ اور اس کی اولاد اور ہزار ہا بنی عباس اور کئی لاکھ اہلِ لشکر اور رعیتِ بغداد کا تاتاریوں کی تیغِ بے دریغ سے قتل ہونا اور عرب کے سطوت اور اقتدار کا ہمیشہ کے لئے صفحۂ روزگار سے مٹ جانا مشاہدہ کیا تھا۔ شیخ نے وہ تمام اسباب بھی دیکھے تھے جو مستعصم باللہ کی تباہی اور عباسیہ کے زوال کا باعث ہوئے اور ظلم و ستم بھی اس کی آنکھوں کے رُو برُو گذرے تھے جو ہلاکو خاں کے خونخوار لشکر نے بغداد میں برپا کئے۔ اِن حوادث و واقعات کا تماشہ شیخ کے لئے ایک عمدہ

سبق تھا جس نے اُس کے دل میں قوم کی دل سوزی، بادشاہوں کی اصلاح، رعایا کی ہمدردی اور ہر طبقہ کے لوگوں کی بھلائی کا خیال پیدا کر دیا تھا اور اسی خیال کی بدولت اس نے اپنی تمام عمر ابنائے جنس کی نصیحت اور خیر اندیشی میں صرف کی۔

مستعصم باللہ کا نہایت دردناک مرثیہ شیخ نے اُس وقت لکھا ہے جب کوئی شخص اس کا رونے والا اور خود اسلام کے سوا کوئی اُس کا ماتم دار اور سوگوار دنیا میں باقی نہ تھا۔ اس مرثیہ کی چند ابیات اس موقع پر نقل کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

ابیات	ترجمہ
(۱) آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں بر زوالِ ملک مستعصم امیر المومنیں	(۱) آسمان کا فرض ہے کہ مستعصم کی تباہی پر زمین پر خون برسائے۔
(۲) اے محمدؐ گر قیامت می برآری سر ز خاک سر برآور، دیں قیامت درمیانِ خلق بیں	(۲) اے محمد صلعم اگر آپ قیامت ہی کو مرقد سے باہر نکلیں گے تو ابھی نکل کر قیامت دُنیا میں دیکھ لیجئے۔
(۳) نازنینانِ حرم را خونِ حلقِ نازنیں ز آستاں بگذشت و مارا خونِ دل از آستیں	(۳) محل کے نازپروردوں کے حلق کا خون ڈیوڑھی سے بہہ گیا اور ہمارے دل کا خون آستین سے ٹپک گیا۔

شیخ پر بعض امامیہ نے یہ اعتراض کیا ہے کہ مستعصم باللہ جیسے نالائق اور ناشدنی خلیفہ کا مرثیہ لکھنا شیخ کی شان سے نہایت بعید تھا اگرچہ اِس بات کا انکار نہیں ہو سکتا کہ مستعصم باللہ میں دانائی، نیکی اور انصاف بالکل نہ تھا تکبر اور غرور نے اُس کے دماغ کو مختل کر دیا تھا۔ غفلت اور بے پروائی کی نوبت یہاں تک پہنچی تھی کہ ایک بار اُس کے بیٹے ابوبکر نے اہلِ سنت کی حمایت اور طرف داری میں کرخ کے بنی ہاشم پر نہایت سخت ظلم اور تعدی کی جس کے بیان کرنے سے رُونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ مگر اس نالائق خلیفہ نے اس کا کچھ تدارک نہ کیا۔ لیکن اس سے شیخ کے مرثیہ لکھنے پر کچھ اعتراض نہیں ہو سکتا۔ مستعصم باللہ کو کیسا ہی نالائق اور قابلِ نفریں سمجھو مگر یہ ضرور ماننا پڑے گا کہ اس کے بگڑنے سے نہ صرف بنی عباس کی حکومت دنیا سے اُٹھ گئی بلکہ مشرق سے مغرب تک جہاں جہاں عرب کے قدم جمے ہوئے تھے ایکبارگی ان میں تزلزل آگیا اور چند روز میں ان کا اقتدار صفحۂ ہستی سے یک قلم محو ہو گیا۔ پس جس شخص کے رگ و پے میں عرب کے خون کا ایک قطرہ بھی ملا ہوا تھا یا جس کے دل میں ایک ذرہ برابر اسلام کی حمیت تھی اس کے لئے اس سے بڑھ کر اور کیا مصیبت ہو سکتی تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بنی عم کا خون تاتاری وحشیوں کے ہاتھ سے آبِ باراں کی طرح بہایا گیا اور جس عمارت کی بنیاد خلفائے

راشدین کے ہنرمند ہاتھوں نے ڈالی تھی۔ وہ چشم زدن
میں ایک خاک کا ڈھیر ہو گیا۔ شیخ نے حقیقت میں مستعصم باللہ
کا مرثیہ نہیں لکھا بلکہ اسلام کا مرثیہ لکھا ہے اور اگر اس موقع
پر حسان بن ثابت رضہ موجود ہوتے تو ان کو ایسا ہی مرثیہ
لکھنا پڑتا مستعصم کے حال پر یہ شعر صادق آتا ہے ؎

ہمارے بعد بہت روئے ہم کو اہلِ وفا
کہ اپنے مٹنے سے جہروفا کا نام مٹا

(ج) یہ واقعہ بوستان سے لے کر لکھا ہے۔ شیخ سعدی نے اپنے
سفر ہندوستان کی ایک حکایت لکھی ہے۔ اس طرح شروع کرتے
ہیں :-

بُتے دیدم از عاج در سومنات مرصّع چو در جاہلیت منات

مولانا حالی اس کا خلاصہ شیخ کی زبانی لکھتے ہیں :

"جب میں سومنات پہنچا اور ہزاروں آدمیوں کو دیکھا
کہ ایک بُت کی پرستش کے لئے دُور دُور سے وہاں آتے
ہیں اور اُس سے مُرادیں مانگتے ہیں تو مجھ کو تعجب ہوا کہ جاندار
ایک بے جان چیز کی کس لئے پرستش کرتے ہیں۔ اس بات کی
تحقیق کے لئے میں نے ایک برہمن سے ملاقات پیدا کی۔ ایک
روز اس سے پوچھا کہ یہ لوگ اس بے حس مورت پر کیوں
اس قدر فریفتہ ہیں؟ اور اُس کے سامنے مورت کی سخت
مذمت اور حقارت کی۔ برہمن نے مندر کے پجاریوں
کو خبر کر دی۔ سب نے مجھ کو آن کر گھیر لیا۔ میں نے مصلحتاً

اس کے سرگروہ سے کہا کہ میں نے کوئی بات بد اعتقادی سے نہیں کی، میں خود اِس مورت پر فریفتہ ہوں۔ لیکن چونکہ نو وارد ہوں اور اسرارِ نہانی سے واقف نہیں ہوں اس لئے اِس کی حقیقت دریافت کرنا چاہتا ہوں تاکہ سمجھ بوجھ کر اُس کی پُوجا کروں۔ اُس نے یہ بات پسند کی اور کہا کہ آج رات مندر میں رہ، تجھ کو اصل حقیقت معلوم ہو جائے گی۔ میں رات بھر وہاں رہا۔ صبح کے قریب تمام بستی کے مرد عورت وہاں جمع ہو گئے اور اس مورت نے اپنا ہاتھ اُٹھایا جیسے کوئی دُعا مانگتا ہے۔ یہ دیکھتے ہی سب "جے جے" پکارنے لگے۔ جب وہ لوگ چلے گئے تو برہمن نے ہنس کر مجھ سے کہا "کیوں اب تو کوئی شبہ باقی نہیں رہا؟" میں ظاہر داری سے رونے لگا اور اپنے سوال پر شرمندگی اور انفعال ظاہر کیا۔ سب برہمنوں نے مجھ پر مہربانی کی اور میرا ہاتھ پکڑ کر اس مورت کے سامنے لے گئے۔ میں نے مورت کے ہاتھ پر بوسہ دیا اور بظاہر چند روز کے لئے برہمن بن گیا۔"

(۳) مقدمۂ شعر و شاعری: مولانا حالی نے ۱۸۹۳ء میں یہ "مقدمہ" اپنے دیوان میں شایع کرنے کے لئے لکھا تھا۔ اس کے دو حصے ہیں۔ پہلے میں شاعری کی تعریف اور شعر و شاعری کے لوازم و خصائص سے بحث کی ہے۔ دوسرے حصے میں اردو شاعری اور شاعروں پر تنقید کی ہے۔ نمونے یہ ہیں:

(۱) کمالِ شاعری کے لئے ضروری شرائط: سب سے مقدم اور ضروری چیز جو شاعر کو غیر شاعر سے تمیز دیتی ہے قوت متخیلہ یا تخیل ہے۔ جس کو انگریزی میں امیجینیشن کہتے ہیں یہ قوت جس شاعر میں اعلیٰ درجہ کی ہوگی اسی قدر اس کی شاعری اعلیٰ درجہ کی ہوگی اور جس قدر ادنیٰ درجہ کی ہوگی اسی قدر اس کی شاعری ادنیٰ درجہ کی ہوگی۔ یہ وہ ملکہ ہے جس کو شاعر اپنے ساتھ ماں کے پیٹ سے لے کر نکلتا ہے اور جو اکتساب سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ اگر شاعر کی ذات میں یہ ملکہ موجود ہے اور باقی شرطوں میں جو کہ کمالِ شاعری کے لئے ضروری ہیں، کچھ کمی ہے تو اس کمی کا تدارک اس ملکے سے کر سکتا ہے۔ لیکن اگر یہ ملکۂ فطری کسی میں موجود نہیں تو اور ضروری شرطوں کا کتنا ہی بڑا مجموعہ اس کے قبضہ میں ہو وہ ہرگز شاعر کہلانے کا مستحق نہیں۔ یہ وہ طاقت ہے جو شاعر کو وقت اور زمانے کی قید سے آزاد کرتی ہے۔ ماضی و استقبال کو اس کے لئے زمانۂ حال میں کھینچ لاتی ہے وہ آدم اور جنت کی سرگذشت اور حشر و نشر کا بیان اس طرح کرتا ہے کہ گویا اس نے تمام واقعات اپنی آنکھ سے دیکھے ہیں اور ہر شخص اس سے ایسا ہی متاثر ہوتا ہے جیسا کہ ایک واقعی بیان سے ہونا چاہئے۔ اس میں یہ طاقت ہوتی ہے کہ وہ جن اور پری، عنقا اور آبِ حیواں جیسی فرضی اور معدوم چیزوں کو ایسے معقول اوصاف کے ساتھ متصف کر سکتا ہے، گو وہ منطق کے قاعدوں پر

منطبق نہیں ہوتے۔ لیکن جب اپنی معمولی حالت سے کسی قدر بلند ہو جاتا ہے تو وہ بالکل ٹھیک معلوم ہونے لگتے ہیں۔ مثلاً فیضی کہتا ہے سہ

سخت است سیاہی شب من
لختے زشب است کوکب من

اس پر منطقی قاعدے سے یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ رات کی تاریکی سب کے لئے یکساں ہوتی ہے پھر ایک خاص شخص کی رات سب سے زیادہ تاریک کیوں کر ہو سکتی ہے۔ اور تمام کواکب ایسے اجرام ہیں جن کا وجود بغیر روشنی کے تصور میں نہیں آسکتا۔ پھر ایک خاص کوکب ایسا مُظلم اور سیاہ کیوں کر ہو سکتا ہے کہ اس کو کالی رات کا ایک ٹکڑا کہا جا سکے؟ مگر جس عالم میں شاعر اپنے تئیں دکھانا چاہتا ہے وہاں یہ سب ناممکن باتیں ممکن بلکہ موجود نظر آتی ہیں۔ یہی وہ ملکہ ہے جس سے بعض اوقات شاعر کا ایک لفظ جادو کی فوج سامنے کھڑی کر دیتا ہے اور کبھی وہ ایسے خیال کو جو کئی جلدوں میں بیان ہو سکے ایک لفظ میں ادا کر دیتا ہے۔

(ب) زبان کی درستی اور اس کا تحفظ: جو لوگ اپنے تئیں اردو زبان کا مالک سمجھتے ہیں۔ یعنی اہلِ دہلی یا اہلِ لکھنؤ ان کو اس بات پر فخر نہیں کرنا چاہیئے کہ ہماری زبان کا لوگ اتباع کرتے ہیں اور ہماری روزمرہ کی پیروی کی جاتی ہے۔ ان کو یاد رکھنا چاہیئے کہ اگر وہ اپنی زبان کی خبر نہ لیں گے

ان کے محفوظ رکھنے کے وسائل بہم نہ پہنچائیں گے۔ اُس کے الفاظ
و محاورات کو نہایت احتیاط کے ساتھ فراہم اور مرتب نہ کریں
گے اور اس کی نظم و نثر کو زمانے کے مذاق کے ساتھ ترقی نہ
دیں گے تو ان کی زبان کا وہ حصہ جس پر اُن کو فخر ہے جو اُن
کی اور تمام ہندوستان کی اردو میں مابہ الامتیاز ہے
وہ حرفِ غلط کی طرح صفحۂ روزگار سے محو ہو جائے گا اور یہی
بُری بھلی اردو جو عام اخبارات اور جدید تصنیفات کے
ذریعہ ملک میں پھیل رہی ہے اور جس کو وہ اب تک حقارت
کی نظر سے دیکھتے رہے ہیں، زیادہ سے زیادہ نصف صدی
میں یہی ملک کی ٹکسالی زبان قرار پا جائے گی۔ کیا ان کو معلوم
نہیں کہ عرب میں جب انشا کی سرد بازاری ہوئی۔ اور
عربی نظم و نثر کے مالک غیر ملکوں کے باشندے ہو گئے رفتہ
رفتہ وہ کلیسکل[1] عربی جس پر عربوں کو ناز تھا لٹریری دنیا
سے رخصت ہو گئی اور وہی بچھڑی زبان جس کو عرب عربا[2]
حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ تمام عربی لٹریچر پر غالب
ہو گئی اور شام۔ روم۔ مصر و بربر اور سوڈان وغیرہ میں
عموماً پھیل گئی۔ یہاں تک کہ آج وہی زبان ٹکسالی اور فصیح
عربی سمجھی جاتی ہے۔ ایسا ہی انجام دلی اور لکھنؤ کی زبان کا
اگر اس کی خبر نہ لی گئی ہوتا نظر آتا ہے۔ دلی جس کو اُردو کے

---

[1] انگریزی کا لفظ ہے، یعنی مستند عربی۔

[2] خالص عرب۔

معلیٰ کا مسقط الراس اور جنم بھوم کہنا چاہیئے، وہاں مصنف اور ناظم و ناثر پیدا ہونے موقوف ہو گئے ہیں۔ پُرانے لوگوں میں سے چند نفوس جن کو چراغ سحری سمجھنا چاہیئے، باقی رہ گئے ہیں۔ ان کے بعد بالکل سناٹا نظر آتا ہے۔ لکھنؤ کا حال اگرچہ بظاہر ایسا نہیں معلوم ہوتا۔ وہاں شاعری کا چرچا دلّی سے بہت زیادہ سُننے میں آتا ہے۔ وہاں سے نوول[1] اور ڈراما برابر ملک میں شائع ہوتے ہیں مگر افسوس ہے کہ ان کا قدم زمانے کی رفتار کے متوازی نہیں اُٹھتا۔ جس قدر وہ آگے بڑھتے جاتے ہیں، اسی قدر ترقی کے رستے سے دُور ہوتے جاتے ہیں۔

اُردو پر قدرت حاصل کرنے کے لئے صرف دلّی یا لکھنؤ کی زبان کا تتبع ہی کافی نہیں ہے بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ عربی یا فارسی میں کم سے کم متوسط درجہ کی لیاقت اور نیز ہندی بھاشا میں فی الجملہ دستگاہ بہم پہنچائی جائے۔ اُردو کی بُنیاد جیسا کہ معلوم ہے ہندی بھاشا پر رکھی گئی ہے۔ اس کے تمام افعال اور تمام حروف اور غالب حصّہ اسما کا ہندی سے ماخوذ ہے اور اردو شاعری کی بنا فارسی شاعری پر جو عربی شاعری سے مُستفاد ہے، قائم ہوئی ہے۔ نیز اردو زبان میں بہت بڑا حصّہ اسما کا عربی اور فارسی سے ماخوذ ہے۔ پس اُردو زبان کا شاعر جو ہندی بھاشا مطلق نہیں جانتا اور محض عربی فارسی کی تان پر گاڑی چلاتا ہے، وہ گویا اپنی گاڑی بغیر پہیوں کے منزلِ مقصود

---

[1] یہ پنجاب کا تلفظ ہے یہاں "ناول" رائج ہے۔

تک پہنچانی چاہتا ہے اور جو عربی فارسی سے نابلد ہے اور
صرف ہندی بھاشا اور محض مادری زبان کے بھروسہ
اُس کا متحمل ہوتا ہے وہ ایک ایسی گاڑی ڈھیلتا ہے جس
میں بیل نہیں جوتے گئے۔"

اِس اقتباس میں مولانا حالی کا آخری مشورہ آج کل اردو ہندی کے قضیہ میں قابلِ توجہ ہے۔ مولانا اُردو شاعری کے لئے عربی و فارسی اور ہندی دونوں کو ضروری قرار دیتے ہیں اور خود اسی پر عامل ہیں۔ ان کے کلام میں ہندی کے وہ الفاظ اور محاورے پائے جاتے ہیں، جو دوسروں نے استعمال نہیں کئے اور ان سے مولانا کے کلام میں عجب لطف و اثر پیدا ہو گیا ہے۔

(۴) یادگارِ غالب: مولانا حالی نے یہ کتاب یہ سوچ کر لکھی ہے کہ اس عجیب و بے نظیر ہستی کی یادگار باقی رہنی چاہئے۔ غالب کے حالات اِس سے پہلے "آبِ حیات" میں مختصر طور پر تھے۔ نواب شیفتہ کے "گلشنِ بیخار" میں اتنے بھی نہ تھے۔ "رقعاتِ غالب" کے سوا اور کہیں ان کے حالات نہ مل سکتے۔ پھر مولانا حالی سے بہتر کون لکھ سکتا تھا۔ اِس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ غالب بہ حیثیت انسان، دوست، اُستاد، شاعر، انشا۔پرداز، ظریف، کے عجیب و غریب شخص تھے۔ اِس لئے کسی نوجوان نقاد کا یہ اعتراض:

"کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ مرزا غالب کی زندگی
ہندوستان کے نوجوانوں کے لئے کوئی سبق رکھتی ہے
یا مرزا کے خانگی حالات اور احباب کے تعلقات کا ذکر

حیاتِ انسانی میں کسی نئے باب کا اضافہ کرتے ہیں.........

مرزا کے حالاتِ زندگی، اخلاق و عادات، لطائف و امثال پر تصنیف کا بیشتر حصہ وقف کیا گیا ہے۔

صرف جوشِ مخالفت کی تراوش ہے۔ اگر کسی شخص کی زندگی کوئی سبق رکھ سکتی ہے، تو غالب کی زندگی بھی رکھتی ہے۔ بلکہ غالب کی زندگی وہ بابِ اخلاق وا کرتی ہے جو ہندوستان کے نوجوانوں کی مادّی اور "تجارتِ رنگ" زندگی پر بند ہے۔ غالباً اسی وجہ سے معترض کو مرزا کی وضعداری، سیرچشمی اور زندہ دلی میں کوئی سبق نظر نہیں آیا۔ اسی معترض کی یہ خواہش بیشک درست ہے:

"یادگارِ غالب کے مصنّف کا سب سے بڑا فرض یہ تھا کہ مرزا کی شاعری کے مختلف دَور، اُن کے معاصرین میں اُن کا درجہ، شاعری کے مختلف اصناف میں اُن کے کمالات پیش کئے جاتے۔"

لیکن مولانا حالی کو مرزا غالب کی ذات سے بحث تھی، اور اُن کے کمالاتِ سخن سے صرف اِس قدر کہ اُن کی عظمت فی الجملہ واضح ہو جائے۔ مولانا اس مسلک کے آدمی نہ تھے کہ مومن و ذوق اور رند و صبا پر یا فارسی میں قتیل و شہید اور شیفتہ و بیخبر پر رَدّ و قدح کرتے۔ بہرحال ایسا نہ ہونے سے موجودہ یادگارِ غالب مولانا کے یا اُردو کے لئے باعثِ ننگ و عار تو نہیں ٹھہرتی۔ لیکن معترض نے کچھ اسی رنگ میں اس کا ذکر کیا ہے۔

یادگارِ غالب کے مختصر نمونے یہ ہیں:

(۱) ناقدر دانی کی شکایت: وہ اس خیال سے کہ اُن کے کلام کی قدر کرنے والے بہت کم تھے، اکثر تنگ دل رہتے تھے، چنانچہ اس بات کی انھوں نے فارسی اور اُردو نظم و نثر میں جابجا شکایت کی ہے۔ ایک روز قلعے سے سیدھے نواب مصطفےٰ خاں کے مکان پر آئے اور کہنے لگے کہ "آج حضور نے ہماری بڑی قدر دانی فرمائی۔ عید کی مبارک باد میں قصیدہ لکھ کر لے گیا تھا، جب میں قصیدہ پڑھ چکا تو ارشاد ہوا کہ 'مرزا تم پڑھتے خوب ہو'۔" اس کے بعد نواب صاحب اور مرزا زمانہ کی ناقدر دانی پر دیر تک افسوس کرتے رہے۔ یہی وجہ تھی جب حُسنِ اتفاق سے ان کو کوئی سخن سنج اور سخن فہم میسر آجاتا تھا تو اس کو ایک نعمتِ غیر مترقبہ سمجھتے تھے۔

منشی نبی بخش حقیر تخلص جو ایک زمانے میں کول میں سررشتہ دار تھے، اور جن کی سخن فہمی اور سخن سنجی کی بڑے بڑے لوگوں سے تعریف سُنی گئی ہے۔ کہیں وہ دلّی میں آئے ہیں اور مرزا کے مکان میں ٹھہرے ہیں۔ ان کی نسبت منشی ہرگوپال تفتہ کو ایک فارسی خط میں لکھتے ہیں جس کا ماحصل یہ ہے کہ "خدا نے میری بیکسی اور تنہائی پر رحم کیا اور ایسے شخص کو میرے پاس بھیجا جو میرے زخموں کا مرہم اور میرے درد کا درماں اپنے ساتھ لایا اور جس نے میری اندھیری رات کو روشن کر دیا اس نے اپنی باتوں سے ایک ایسی شمع روشن کی جس کی روشنی میں

میں نے اپنے کلام کی خوبی جو تیرہ بختی کے اندھیرے میں خود میری نگاہ سے مخفی تھی دیکھی۔ میں حیران ہوں کہ اس فرزانۂ یگانہ یعنی منشی نبی بخش حقیر کو کس درجہ کی سخن فہمی اور سخن سنجی عنایت ہوئی ہے؟ حالانکہ میں شعر کہنا جانتا ہوں، مگر جب تک میں نے اس بزرگوار کو نہیں دیکھا یہ نہیں سمجھا کہ سخن فہمی کیا چیز ہے؟ اور سخن فہم کس کو کہتے ہیں؟ مشہور ہے کہ خدا نے حُسن کے دو حصّے کئے آدھا یوسف کو دیا اور آدھا تمام نوعِ انسان کو۔ کچھ تعجب نہیں کہ فہمِ سخن اور ذوقِ معنی کے بھی دو حصّے کئے گئے ہوں اور آدھا منشی نبی بخش کے اور آدھا تمام دُنیا کے حصّے میں آیا ہو گو زمانہ اور آسمان میرا کیسا ہی مخالف ہو میں اُس شخص کی دوستی کی بدولت زمانہ کی دشمنی سے بے فکر ہوں اور اِس نعمت پر دُنیا سے قانع ہوں۔"

اپنے عجز کا اقرار مرزا پر جب شعر کے متعلق کوئی ایسی فرمائش کی جاتی تھی جو اُن سے بآسانی سر انجام نہ ہو سکتی تھی تو وہ اِس بات کا کچھ خیال نہ کرتے تھے کہ میری شاعری کی شہرت و ناموری پر حرف آئے گا، بلکہ صاف لکھ بھیجتے تھے کہ میری طاقت سے باہر ہے۔ ایک بار غالباً مجتہد العصر سیّد محمد صاحب مرحوم و مغفور نے مرزا سے اِس بات کی خواہش کی کہ اُردو میں جناب سیّد الشہدار کا مرثیہ لکھیں۔ چونکہ مرزا اُن کی بہت تعظیم کرتے تھے اور ان کے سوال کو رَد کرنا نہیں

چاہتے تھے۔ اُن کے حکم کی تعمیل کے لئے مرثیہ لکھنے بیٹھے چونکہ اِس کوچہ میں کبھی قدم نہ رکھا تھا اور فرمائش ایسی چیز کی ہوئی تھی جس کو اور لوگ حدِ کمال تک پہنچا چکے تھے۔ اور قویٰ میں انحطاط شروع ہو گیا تھا مشکل سے مسدّس کے تین بند لکھے جن میں سے پہلا بند ہم کو یاد ہے اور یہاں نقل کیا جاتا ہے:

بند

ہاں! اے نفسِ بادِ سحر! شعلہ فشاں ہو ۔۔۔ اے دجلۂ خوں، چشمِ ملائک سے رواں ہو
اے زمزمۂ قُم! لبِ عیسیٰ پہ فغاں ہو ۔۔۔ اے ماتمیانِ شہِ مظلوم کہاں ہو

بگڑی ہے بہت بات بنائے نہیں بنتی
اب گھر کو بغیر آگ لگائے نہیں بنتی

ایک یہ اور دو بند اور لکھ کر مجتہد العصر کی خدمت میں بھیج دیئے اور صاف لکھ بھیجا کہ "یہ تین بند صرف امتثالِ امر کے لئے لکھے ہیں ورنہ میں اِس میدان کا مرد نہیں ہوں، یہ اُن لوگوں کا حصہ ہے جنہوں نے اِس وادی میں عمریں بسر کی ہیں۔ مجھ کو اُن کے درجے تک پہنچنے کے لئے ایک دوسری عمر درکار ہے۔ پس مجھے اِس خدمت سے معذور و معاف رکھا جائے۔" ان کا قول تھا کہ "ہندوستان میں انیسؔ اور دبیرؔ جیسا مرثیہ گو نہ ہوا ہے نہ آئندہ ہوگا۔"

(۲) مرزا نے بعض اُردو خطوں میں اور خاص کر اُردو تقریظوں میں مسجع عبارت لکھنے کا التزام کیا۔ اگرچہ

اس زمانے میں ایسا التزام تکلفِ باردہ میں شمار کیا جاتا ہے
خصوصاً اُردو جو بمقابلہ عربی یا سنسکرت وغیرہ کے نہایت
محدود زبان ہے۔ وہ اِس قسم کے تصنع اور ساختگی کی متحمل
نہیں معلوم ہوتی۔ مگر مرزا نے جس قسم کی مسجع عبارت اردو
خطوں یا تقریظوں وغیرہ میں لکھی ہے۔ اُس پر یہ گرفت
مشکل سے ہو سکتی ہے۔ عربی اور سنسکرت زبانوں کے
سوا اور زبانوں کی مسجع نثروں میں عموماً یہ عیب ہوتا ہے کہ
دوسرے فقرے کی رعایت سے خواہ مخواہ قافیہ تلاش کرنا
پڑتا ہے۔ تو اس میں تصنع اور آورد کا رنگ پیدا ہو جاتا
ہے اور اس لئے پہلے فقرے کے مقابلے میں دوسرا
فقرہ بہ سبب لزوم مالا یلزم کے کم وزن ہو جاتا ہے۔ مگر
مرزا کی مسجع نثر میں یہ بات بہت کم دیکھی جاتی ہے۔ دوسرے
فقرے میں تقریباً ویسی ہی بے تکلفی پائی جاتی ہے جیسی
پہلے فقرے میں۔ اور یہ بات اس شخص سے بن پڑتی ہے
جو باوجود خوش سلیقگی اور لطفِ طبیعت کے شاعری
میں غایت درجہ کا کمال رکھتا ہو۔ اور وزن و قافیہ کی جانچ
اور تول میں ایک عمر بسر کر چکا ہو۔ یہاں اِس کی مثالیں
لکھنے کی کچھ ضرورت نہیں۔ مرزا کے اردو رقعات میں
اس کی مثالیں بکثرت موجود ہیں۔ مگر یہ معلوم رہے کہ مقفیٰ
مرزا خاص کر اُن خطوط میں لکھتے تھے جن سے ہنسی، ظرافت
اور مخاطب کا خوش کرنا مقصود ہوتا تھا۔ ورنہ واقعات

کا بیان یا مصائب کا ذکر یا تعزیت یا ہمدردی کا اظہار
ہمیشہ سیدھی سادھی نثر عاری میں کرتے تھے۔ مثلاً سید
یوسف مرزا کو ان کے باپ کی تعزیت میں لکھتے ہیں:

"یوسف مرزا! کیوں کر تجھ کو لکھوں کہ تیرا باپ
مر گیا، اگر لکھوں تو آگے کیا لکھوں مگر صبر۔ یہ ایک
شیوۂ فرسودۂ ابنائے روزگار ہے تعزیت یونہی
کیا کرتے ہیں کہ صبر کرو! ہائے ایک کا کلیجہ کٹ گیا
ہے اور لوگ اسے کہتے ہیں کہ تو نہ تڑپ، بھلا
کیوں کر نہ تڑپے گا؟ صلاح اس امر میں نہیں
بتائی جاتی، دوا کا لگاؤ نہیں، پہلے بیٹا مرا پھر
باپ مرا۔ مجھ سے اگر کوئی پوچھے کہ بے سر و پا
کسے کہتے ہیں، تو میں کہوں گا یوسف مرزا کو---
تمہاری دادی لکھتی ہیں کہ رہائی کا حکم ہو چکا تھا
اگر یہ بات سچ ہے تو جواں مرد ایک بار دونوں
قیدوں سے چھوٹ گیا۔ نہ قیدِ حیات رہی نہ قیدِ فرنگ"

(۵) حیاتِ جاوید (سرسید کی سوانحِ عمری)؛ مطبوعہ
۱۹۰۱ء۔ اِس کے دیباچے میں مولانا حالی لکھتے ہیں:

"اگرچہ ہندوستان میں جہاں ہیرو کے ایک عیب
یا خطا کا معلوم ہونا اس کی تمام خوبیوں اور فضیلتوں پر
پانی پھیر دیتا ہے ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ کسی شخص
کی بائیوگرافی کرٹیکل طریقہ سے لکھی جائے اس کی خوبیوں

کے ساتھ کمزوریاں بھی دکھائی جائیں اور اس کے عالی خیالات کے ساتھ اُس کی لغزشیں بھی ظاہر کی جائیں۔ چنانچہ اسی خیال سے ہم نے جو دو ایک مصنفوں کا حال اِس سے پہلے لکھا ہے اس میں جہاں تک ہم کو معلوم ہو سکیں اُن کی اور اُن کے کلام کی خوبیاں ظاہر کی ہیں اور ان کے پھوڑوں کو کہیں ٹھیس نہ لگنے دی۔ لیکن اول تو ایسی بائیوگرافی چاندی سونے کے ملمع سے کچھ زیادہ وقعت نہیں رکھتی جنھوں نے اس موج خیز اور پُر آشوب دریا کی منجدھار میں اپنی ناؤ نہیں ڈالی اور کنارے کنارے ایک گھاٹ سے دوسرے گھاٹ صحیح سلامت جا اُترے، اُن کو سب نے بھلا جانا کیونکر ان کو کسی کی بھلائی یا بُرائی سے کچھ سروکار نہ تھا۔ وہ کہیں رستہ نہیں بھولے۔ کیونکہ انھوں نے اگلی پگڈنڈیوں کی لیک سے کہیں اِدھر اُدھر قدم نہیں رکھا۔ لیکن ہم کو اِس کتاب میں اس شخص کا حال لکھنا ہے جس نے چالیس برس برابر تعصب اور جہالت کا مقابلہ کیا ہے۔ تقلید کی جڑ کاٹی ہے۔ بڑے علماء و مفسرین کو للکارا ہے اماموں اور مجتہدوں سے اختلاف کیا ہے، قوم کے پکے پھوڑوں کو چھیڑا ہے اور اُن کو کڑوی دوائیں پلائی ہیں جس کو مذہب کے لحاظ سے ایک گروہ نے صدیق کہا ہے تو دوسرے نے زندیق خطاب دیا ہے۔ اور جس کو پالٹکس کے لحاظ سے کسی نے نائم سرور سمجھا ہے، تو کسی نے

راست باز لبرل جانا ہے۔ ایسے شخص کی لائف چپ چاپ
کیوں کر لکھی جا سکتی ہے۔ ضرور ہے کہ اُس کا سونا کسوٹی
پر کسا جائے اور اُس کا کھرا پن ٹھوک بجا کر دیکھا جائے وہ
ہم میں پہلا شخص ہے جس نے مذہبی لٹریچر میں نکتہ چینی کی
بنیاد ڈالی ہے۔ اِس لئے مناسب ہے کہ سب سے پہلے
اسی کی لائف میں اُس کی پیروی کی جائے اور نکتہ چینی کا کوئی
موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا جائے۔ اگرچہ سرسیّد کے معصوم
ہونے کا نہ ہم کو دعوٰے ہے نہ اس کے ثابت کرنے کا ہم ارادہ
رکھتے ہیں، لیکن اس بات کا ہم کو خود بھی یقین ہے اور ہم
چاہتے ہیں کہ اوروں کو بھی اِس کا یقین دِلائیں کہ سرسیّد
کا کوئی کام سچائی سے خالی نہ تھا اور اِس لئے ضرور ہے کہ ان کے
ہر ایک کام کو نکتہ چینی کی نگاہ سے دیکھا جائے کیونکہ سچ میں اور
صرف سچائی میں یہ کرامت ہے کہ جس قدر اُس میں زیادہ کرید
کی جاتی ہے اسی قدر اس کے جوہر زیادہ آب و تاب کے ساتھ
ظاہر ہوتے ہیں۔"

اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا حالی نے سرسیّد کے ہر ایک کام کو نکتہ چینی کی نگاہ سے دیکھا ہوگا۔ لیکن اُن کی نکتہ چینی اِس طرح کی ہے۔ (ایک مضمون کو درمیان سے کچھ حذف کر کے مولانا کے الفاظ میں مسلسل کر کے نقل کیا جاتا ہے):

"سرسیّد کی ترقی کے اسباب: اصل یہ ہے کہ ایشیائی
طرزِ حکومت جو ایک طاقت کو اعتدال سے زیادہ بڑھانے

والی اور اس کے سوا تمام طاقتوں کو مضمحل کرنے والی ہو اور جو ہندوستان میں بھی تمام ایشیائی ملکوں کی طرح آفرینش سے ایک عنوان پر چلی آتی تھی، اس نے ایشیا کی کسی قوم بلکہ کسی متنفس میں قومیت کی رُوح باقی نہیں چھوڑی .... جان اسٹوارٹ مل لکھتے ہیں کہ "اگر رعیت کو ایسا بنادو کہ وہ ملک کے لئے کچھ نہ کرسکے، تو اس کو ملک کی کچھ پروا نہ رہے گی .... البتہ مذہب ایک ایسی چیز ہے جو ہر ملک میں اور خاص کر ایشیائی ملکوں میں مذہبی آدمیوں کو نہایت استقلال کے ساتھ تمام عمر اپنے ارادوں پر ثابت قدم رکھ سکتا ہے .... مگر مذہب کیسا ہی سچّا اور خدا کا بھیجا ہوا ہو، طرزِ حکومت کا تابع ہوتا ہے۔ اس میں جتنی باتیں طرزِ حکومت کے مقتضا کے موافق ہوتی ہیں، وہ رواج پاتی ہیں اور باقی حصہ ناقابلِ عمل سمجھ کر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ مثلاً خود مختار سلطنت جس میں کوئی بات شخصیت سے خالی نہیں ہوتی اس میں مذہب بھی ذاتی اور شخصی بھلائیوں کے سوا اور کچھ نہیں سکھاتا۔ وہ صرف ایسی نیکیاں سکھاتا ہے جن سے نفع یا تو نیکی کرنے والے کی ذات پر ختم ہوجاتا ہے یا صرف خاص خاص شخصوں کو پہنچتا ہے وہ کبھی ایسی نیکیوں کی ترغیب نہیں دیتا جن سے بلاواسطہ تمام ملک یا بنی نوع کو فائدہ پہنچے۔ مذہب کی یہ حالت

ایسی پائدار اور مستحکم ہوجاتی ہے کہ خود مختار سلطنت کا دورہ ختم ہوجانے کے بعد بھی صدیوں تک وہ اسی حالت پر قائم رہتا ہے۔ پچھلے جس شاہراہ پر اگلوں کو چلتا دیکھتے ہیں، آپ بھی آنکھیں بند کرکے اسی شاہراہ پر ہو لیتے ہیں۔ دائیں بائیں آنکھ اٹھاکر نہیں دیکھتے مگر بعض اوقات زمانہ کی ضرورتیں خود مذہبی فرقہ میں کوئی ایسا شخص پیدا کر دیتی ہیں جس کو مذہب کی چھان بین کرنا پڑتی ہے اور مذہب کا وہ متروک حصہ جو موجودہ زمانہ کے موافق ہوتا ہے، اس پر عمل کرنا اور اس کو رواج دینا پڑتا ہے۔ زمانہ کی ضرورتیں اس کی آنکھیں کھولتی ہیں اور بانیِ مذہب کی محبت اور عقیدت اس کو مذہب کی حقیقت کھولنے پر مجبور کرتی ہے۔ اور خود مذہب اس میں استقلال پیدا کرتا ہے جس کی بدولت وہ قوم کی شاہراہ کے خلاف اپنی کٹھن منزل طے کرتا ہے۔

یہیں سے اس چیز کا سراغ چلتا ہے جس نے سرسید سے تمام ملکی اور قومی خدمتیں سرانجام کرائی ہیں ہمارے نزدیک جہاں تک کہ اُن کی لائف شہادت دیتی ہے اور جس قدر کہ اُن کے حالات، افعال اور اقوال سے ظاہر ہوتا ہے، ان کی تمام ترقیات کا منبع، ان کے کُل مقاصدِ عالیہ کا محرک اور ان کی ہر منزل کا

رہبر مذہب کے سوا اور کوئی چیز قرار نہیں پا سکتی۔

اسلام کی حقیقت کا یقین اور بانیٔ اسلام کی محبت اور عقیدت گویا سرسیّد کی گھٹی میں پڑی تھی...... مگر جب تک قدیم سوسائٹی کا رنگ ان پر غالب رہا، مذہبی خیالات میں کوئی بڑا انقلاب واقع نہیں ہوا۔ وہ اُنھیں سنّت و بدعت و تقلید و عدم تقلید کے جھگڑوں میں اُلجھے رہے اور اسلام کے اشرف و اعلیٰ مقاصد کو صرف انھیں شخصی کاموں میں منحصر جانتے رہے، جن کا نفع یا تو خود کام کرنے والے کی ذات کو اور یا خاص شخص کو پہنچتا ہے۔ مگر آخر کار زمانہ کی ضرورتوں نے ان کی آنکھیں کھولیں اور خود اس یقین نے جو اسلام کی حقیقت کی نسبت ان کی گھٹی میں پڑا تھا۔ اُن کو اسلام کی حقیقت اور اُس کے اعلیٰ مقاصد تک پہنچا دیا۔ جو باتیں دینِ حق کی پاکیزگی اور تقدّس کے خلاف معلوم ہوئیں ان کو چھوڑا اور جو اس کے مطابق پائیں اُن کو پکڑا۔ اور زید و عمرو کی مخالفت کا خوف یک قلم دل سے اُٹھا دیا۔ ہر ایک معاملے میں خود مذہب کو نہ کہ زید و عمرو کو اپنا رہبر بنایا۔ جو سوال پیش آیا اس کو بلا واسطہ مذہب ہی سے پوچھا اور جو کچھ وہاں سے جواب ملا اُس کو سر پر رکھا۔"

"حیاتِ جاوید" کے ایسے ہی مقامات ہیں، جن کو لوگوں نے "سرسیّد کی مدلل مداحی" سے تعبیر کیا ہے۔ ہم نے یہ حصّہ اسی لئے انتخاب کیا ہے کہ تصنیف

ومصنف اور سیرت وصاحبِ سیرت کا کمزور پہلو سامنے آجاتے۔ مولانا حالی نے جو کچھ لکھا ہے، یہی ان کا اعتقاد تھا۔ انھوں نے سرسید کا محرکِ عمل متعین کرنے میں اپنے نزدیک بالکل صداقت سے کام لیا ہے۔ مولانا کی رائے ہیں "سرسید کی تمام ملکی وقومی خدمتوں کا محرک مذہب کے سوا اور کوئی چیز قرار نہیں پا سکتی"۔ لیکن اصل میں سرسید کی ملکی وقومی خدمتوں کا محرک اسلام نہیں بلکہ مسلمان تھے۔ بظاہر ان دو باتوں میں کچھ ایسا فرق نہیں ہے، لیکن غور کیجئے تو بڑا فرق ہے۔ سرسید غدر کے بعد مسلمانوں کی تباہی سے نہایت متاثر تھے، ان کو زیادہ تباہ ہونے سے بچانا چاہتے تھے۔ گورنمنٹ کے دل سے مسلمانوں کی طرف سے بدگمانی دُور کرنا چاہتے تھے۔ مسلمانوں کو انگریزی زبان وعلوم، انگریزی تہذیب ومعاشرت، انگریزی اخلاق وآداب سکھا کر ترقی یافتہ قوموں کے دوش بدوش کھڑا کرنا چاہتے تھے۔ غرض مسلمانوں کی دنیا سرسید کے پیش نظر اور مقصودِ عمل تھی۔ لیکن اِن اصلاحوں اور ترقیوں کی راہ میں مسلمانوں کے قدیم وراسخ عقائد واعمال اور علمائے اسلام کا اثر حائل تھا۔ اِس لئے ضروری تھا کہ ہر اصلاح، ہر تحریک، ہر ترقی کے لئے اسلام کا حکم یا اجازت ثابت کی جائے۔ سرسید نے یہی کیا۔ یہ کام صرف ایک حد تک بجا ودرست تھا۔ لیکن سرسید حد کے اندر رہنے والے آدمی نہ تھے۔ ایک آندھی اور طوفان کی کیفیت تھی اس لئے انھوں نے مسلمانوں کے عقائد واعمال میں مکمل انقلاب پیدا کرنے کا تہیّہ کرلیا تھا۔

اِس میں کلام نہیں کہ " اسلام وبانیِ اسلام کی محبت سرسید کی

گھٹی میں پڑی تھی۔" انھوں نے بہت سے کام خالص اسلام کی محبت سے کئے۔ سر ولیم میور کی "سیرتِ محمدی" کا جواب "خطباتِ احمدیہ" کے اکثر مضامین، کسی پادری کی "امہات المومنین" کا رَدّ وغیرہ محض اسلام کے اعلانِ صداقت و احقاقِ حق کے لئے تھا جس میں "دنیا" شامل نہ تھی لیکن اور بہت سی باتوں میں ان کی لغزش کا سبب بقول مولانا حالی کے یہ تھا کہ "آخر عمر میں سرسید کی خودرائی یا وثوق کہ ان کو اپنی رایوں پر تھا، وہ حدِ اعتدال سے متجاوز ہو گیا تھا۔"

حیاتِ جاوید کے پہلے حصہ میں سرسید کے حالات اور دوسرے میں اُن کے قومی و ملکی کارنامے ہیں۔ سرسید کی راست بازی اور اخلاقی جرأت کے چند واقعات لکھے ہیں۔ ایک واقعہ کا خلاصہ یہ ہے کہ سرسید نے کسی دیہاتی مدرسہ کا معائنہ کیا۔ وہاں گائے بندھی ہوئی دیکھی، اور مدرّس وطلبا کو غیر حاضر پایا۔ رپورٹ میں یہ واقعہ لکھ دیا اور یہ نتیجہ نکالا کہ ہندوستان کے عام دیہاتی مدرسوں کی یہی حالت ہے۔ سر ولیم میور لفٹنٹ گورنر نے سرسید کی رپورٹ پڑھ کر ان کی رائے سے اختلاف کیا سرسید کو یہ بات ناگوار ہوئی اور مسٹر بریملی سشن جج علی گڑھ سے شکایت کی۔ جج صاحب نے لفٹنٹ گورنر کو لکھ بھیجا۔ انھوں جج صاحب کو جواب لکھا کہ ان کو سرسید کے معائنہ کی صداقت سے انکار نہیں بلکہ اُن کے نتیجہ نکالنے سے اختلاف ہے۔ اِس کے بعد سرسید اپریل ۱۸۶۹ء میں ولایت چلے گئے اور چونکہ لفٹنٹ گورنر کی طرف سے دل صاف نہ تھا اِس لئے اُن سے مِل کر نہ گئے۔ جب اکتوبر ۱۸۷۰ء میں لندن سے واپس آئے، اُس وقت بھی سر ولیم سے جا کر نہ ملے۔ کچھ عرصہ کے بعد اُن کے

پرائیوٹ سکرٹری کا خط سرسیّد کے پاس آیا کہ "نواب لفٹنٹ گورنر آپ کے مع الخیر ہندوستان میں پہنچنے سے خوش ہوئے اور آپ کی خیریت اور سیّد محمود کی تعلیم کا حال معلوم کرنے کے خواہشمند ہیں اور اب تک انتظار کر رہے ہیں۔"

باقی حال مولانا حالی کی زبانی سُنیئے:

سرسیّد نے اس کے جواب میں نہایت صفائی سے تمام وجہ اپنے خط نہ بھیجنے اور مل کر نہ آنے کی اور سیّد محمود کی تعلیم کی کیفیت مفصل لکھ بھیجی۔ یہ چٹھی ۷ نومبر کی تھی۔ سر ولیم نے نویں نومبر کو اس کا جواب اپنے ہاتھ سے لکھا۔ جس کا ترجمہ یہ ہے:

مائی ڈیر سیّد احمد! آپ کی ساتویں نومبر کی چٹھی نے مجھ کو اس قدر حیران اور رنجیدہ کیا کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ اس بات کے کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ میں نے خواب میں بھی آپ پر کسی خلافِ واقع بات کہنے کا الزام لگانے کا خیال نہ کیا ہوگا۔ میں اُن نتائج سے جو آپ نے نکالے ہیں، اب بھی اختلاف رکھتا ہوں۔ مگر اس سے آپ پر کوئی الزام لگانا ظاہر نہیں ہوتا۔

مجھ کو نہایت افسوس ہے کہ آپ نے فوراً مجھ کو براہِ راست کیوں نہ لکھا۔ آپ کے ایسا نہ کرنے سے مجھ کو اور بھی رنج ہوتا ہے۔ گویا آپ نے اس قدر اعتبار اور بھروسہ نہ کیا جس کی میں آپ سے اُمید کرتا تھا اور شاید امید کرنے کا حق بھی رکھتا تھا۔

مسٹر برکلی نے اردو الفاظ کا مطلب مجھ پر ظاہر کیا تھا اور میں نے ایک نوٹ لکھا تھا جس میں ظاہر کر دیا تھا کہ میں نے ایک لمحہ بھی کسی ایسے مطلب کا خیال نہ کیا تھا اور میں نے اپنی تحریر کو جس طرح پر ضرورت ہو استعمال کرنے کی اجازت دیدی تھی۔ چونکہ اِس معاملہ کا اِس سے زیادہ کوئی تذکرہ نہیں ہوا، میں نے خیال کیا کہ وہ اظہار کافی تھا اور گزٹ سرکاری میں اس کے شائع کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔

کپتان ملنگسٹن آپ کو اِس مضمون کے متعلق مندرجۂ بالا خط وکتابت کے حوالہ سے آئندہ لکھیں گے۔ اِس وقت میں صرف اتنا کہوں گا کہ میں آپ کے بیٹے کے ایسے عمدہ حالات سُننے سے نہایت خوش ہوا ہوں اور آپ کو اس طرف یا جب کبھی میرا کیمپ بنارس میں پہنچے تو وہاں دیکھ کر خوش ہونگا۔"

سرسید نے اِس چِٹھی کا فوراً شکریہ ادا کیا اور لکھا کہ: "آپ کے عنایت نامہ سے تمام بوجھ میرے دل پر سے اُٹھ گیا۔"

کرنل گریہم یہ تمام واقعہ اپنی کتاب میں نقل کرکے لکھتے ہیں کہ "سر ولیم نے سید احمد خاں کو اجازت دیدی تھی کہ میری چِٹھی کو جس طرح چاہیں شائع کردیں۔ اگر کوئی اور دیسی جنٹلمین ہوتا تو فوراً ایسا کرتا مگر سید نے اس کو پڑھ کر ڈال دیا اور مجھ کو بڑی تلاش سے وہ چِٹھی ملی۔"

کرنل موصوف کا یہ خیال ہندوستانیوں کے کیرکٹر سے

ناواقفیت پر مبنی ہے۔ بے شک ایسی طبیعت اور ایسے رُتبے کے ہندوستانی جیسے کہ سرسید تھے بہت کم نکلیں گے کہ ایک موہوم شبہہ پر صوبہ کے گورنر سے ناراضی کا اظہار کر بیٹھے اور گورنر کی طرف سے ایسی مہربانی کے ساتھ اُن کی دلجوئی کی گئی۔ مگر ہندوستانی شرفا میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جو محض اپنی نمود کے لئے حکام کی ایسی تحریروں کا شائع کرنا جیسی کہ سر ولیم کی تحریر سرسید کے نام تھی نہایت سُبک اور حقیر بلکہ ایک کمینہ حرکت سمجھتے ہیں۔

اسی طرح کا ایک معاملہ ولیم صاحب کمشنر میرٹھ کے ساتھ گذرا جب سائنٹفک سوسائٹی علی گڈھ کا مکان بنکر تیار ہوا تو صاحب ممدوح کو اُس کے افتتاح کی رسم ادا کرنے کے لئے بلایا گیا تھا۔ اُن کے دل میں عنایت اللہ خاں مرحوم رئیس بھیکن پور ضلع علی گڈھ کی طرف سے ایامِ غدر کے متعلق کچھ شبہات تھے اِس لئے وہ افتتاح کی رسم میں اُن کا شریک ہونا نہیں چاہتے تھے۔ انھوں نے سرسید سے کہا کہ "اِس جلسہ میں اگر عنایت اللہ شریک ہوئے تو ہم نہیں آنے کے" سرسید نے کہا "یہ کیوں کر ہوسکتا ہے کہ جس شخص نے نہایت فیاضی سے سوسائٹی کی امداد کی ہے اور جو اُس کا پریسیڈنٹ بھی ہے، اس کو شریک نہ کیا جائے" انھوں نے ہرگز اس بات کو گوارا نہ کیا کہ عنایت اللہ خاں مرحوم کی عدم موجودگی میں افتتاح کی رسم ادا کی جائے۔ آخر مسٹر بریملی نے جو علی گڈھ میں سشن جج

تھے اور سوسائٹی کے بڑے معاون اور سرسیّد کے دوست تھے بڑی مشکل سے صاحب کمشنر کو راضی کیا اور اُن کو عنایت اللہ خاں کی موجودگی میں یہ رسم ادا کرنی پڑی۔ سرسیّد کا اِس باب میں اصرار کرنا زیادہ تر اِس وجہ سے تھا کہ اُن کے نزدیک صاحب کمشنر کے شبہات محض بے اصل تھے اور وہ خود عنایت اللہ خاں کو ہر ایک الزام سے پاک وصاف جانتے تھے۔"

(۶) مضامینِ حالی: مولانا کی مقالہ نگاری کا سلسلہ سرسیّد کے رسالہ "تہذیب الاخلاق" (۱۸۷۰ء) کے ساتھ جاری ہوا۔ غالباً ان کا پہلا مضمون وہ ہے جو "مولوی سیّد احمد خاں بہادر، سی ایس آئی" کے عنوان سے "اخبار علی گڈھ انسٹی ٹیوٹ" میں ۱۸۸۱ء میں شائع ہوا ہے۔ اِس کے بعد سرسیّد کے رسالہ و اخبار میں اور ہندوستان کے مختلف پرچوں میں آخر عمر تک لکھتے رہے۔ مولانا کے مجموعۂ مقالات میں ہر نوع کے خیالی، اخلاقی، اصلاحی، مذہبی، تنقیدی مضامین موجود ہیں۔ ان کی روشِ تحریر یہاں بھی "موج نرم خیز" کی طرح جاری ہے۔ ہر مسئلہ کی تحقیق اور ہر مطلب کی تشریح نہایت وسعتِ نظر کے ساتھ کرتے ہیں۔ بہت سی کتابوں پر ریویو کئے ہیں۔ مولانا ذکاء اللہ کی "تاریخ ہندوستان"، مولانا آزاد کی "آبِ حیات" اور "نیرنگِ خیال"، مولانا شبلی کی "سیرۃ النعمان"، مولوی سیّد احمد کی "فرہنگِ آصفیہ" وغیرہ سب کتابوں پر نہایت کشادہ دلی کے ساتھ تنقید لکھتے ہیں۔ ان کے عیوب کو قابلِ گرفت اور اپنے اختلافات کو لائقِ ذکر نہیں سمجھتے۔ مثلاً نیرنگِ خیال میں کچھ خامیاں دیکھتے ہیں، لیکن پانچ صفحے

اس کی تعریف میں لکھ کر اتنا لکھ دیتے ہیں :

"اگرچہ اس عام قاعدے کے موافق کہ الصفو والکدر توأمان انسان کا کوئی کام خوبی اور عیب سے مبرّا نہیں ہو سکتا، خصوصاً تصنیف اور تالیف کا دشوار کام، جس کا بے عیب ہونا محال ہے، لیکن ایسے ملک میں جہاں ترقّی ابتدائی حالت میں ہو، نئے اسلوب کی کتابوں کا کم عیب ہونا بھی بے عیب ہونے کے برابر ہے .... اس وقت ایسی کتابوں میں خوردہ گیری کی نظر سے خوض کرنا، کیا باعتبار ترقی کی حالت کے اور کیا باعتبار مصنّفوں کی امیدوں کے، اور کیا باعتبار خوردہ گیروں کی نیت کے، ایک ایسا کام ہے جس کا شاید ابھی وقت نہیں آیا۔"

(ریویو نیرنگِ خیال، مطبوعہ اخبار علی گڈھ انسٹی ٹیوٹ ۱۸۸۰ء)

معلوم ہوتا ہے "آبِ حیات" شائع ہونے کے بعد علّامہ آزاد نے اس کی کوئی جلد مولانا حالی کو نہیں بھیجی اور انھوں نے بطورِ خود کہیں سے لے کر اس کو پڑھا۔ ریویو میں لکھتے ہیں :

"ہم کو اس بے مثل کتاب کے مطالعہ سے مستفید ہونے کا موقع اُس وقت ملا جب کہ بہت سے اُردو اخباروں میں اُس پر ریویو لکھے جا چکے تھے۔"

اِس کے بعد بہت طویل مضمون میں "آبِ حیات" اور اس کے مصنّف کی بجد مدح کرتے ہیں اور اپنی فراخ حوصلگی سے علّامہ آزاد کی ایک بہت بڑی فروگذاشت کی اِس طرح تاویل کرتے ہیں :

"اگرچہ بعض طبقات میں ایک آدھ ایسے شاعر کا حال
قلم انداز کیا گیا ہے جو اپنے طبقہ میں مستند سمجھا جاتا
تھا، جیسے طبقۂ پنجم میں مومن خاں مومن، یا میر نظام الدین
ممنون۔ لیکن اِس کا یہ عذر ہو سکتا ہے کہ مصنف نے کہیں
یہ دعویٰ نہیں کیا کہ کسی دَورہ کا کوئی مستند شاعر فروگذاشت
نہیں کیا جائے گا۔ بلکہ اس نے ہر دَورہ میں سے چند شاعر
بطور نمونہ کے انتخاب کر لئے ہیں اور اِس سے اُن تغیرات کا
دکھانا منظور ہے جو ہر ایک دَورہ میں زبانِ اردو پر واقع
ہوئے ہیں۔ البتہ اگر مصنّف تمام شعرائے اُردو کا حال۔
بالاستیعاب لکھتا تو چند نامی شاعروں کا ذکر نہ کرنا محلِ
اعتراض ہوتا۔"

(ریویو آبِ حیات، مطبوعہ اخبار علی گڈھ انسٹی ٹیوٹ ۱۸۸۱ء)

اِسی طرح علاّمہ شبلی کی "سیرۃ النعمان" کی تعریف ایسے شرحِ صدر
اور وسعتِ قلب کے ساتھ کرتے ہیں کہ اِس سے بڑھ کر ممکن نہیں۔
اور اگر کوئی محلِ اعتراض پاتے ہیں، تو یہ کہہ کر گذر جاتے ہیں:

"جب ہم کسی کتاب پر ریویو لکھ رہے ہیں، ہم کو یہ نہ
دیکھنا چاہیئے کہ مصنّف کی رائے جزئیاتِ مسائل میں فی نفسہٖ
کیسی ہے، کیونکہ اِس کا فیصلہ کرنا پبلک کا کام ہے، نہ
ریویو لکھنے والے کا۔ بلکہ یہ دیکھنا چاہیئے کہ کتاب کا عنوانِ
بیان کیسا ہے؟ ترتیب کیسی ہے؟ طریقۂ استدلال
مذاقِ وقت کے موافق ہے یا نہیں؟ اور کتاب لکھنے کی جو

غایت مقتضائے وقت کے موافق ہونی چاہیے، یا جو مصنف نے
اپنے ذہن میں ملحوظ رکھی ہے، وہ اس سے حاصل ہو سکتی
ہے یا نہیں؟"

یعنی مولانا حالی بعض مسائل میں علامہ شبلی کی رائے کو درست نہیں سمجھتے لیکن اس کا ذکر کرنا نہیں چاہتے۔ حالانکہ مولانا حبیب الرحمٰن خانصاحب شروانی وغیرہ نے "سیرۃ النعمان" پر بڑے اعتراضات کئے۔ مولانا "سیرۃ النعمان" میں کچھ کمی بھی پاتے ہیں لیکن اُس کی طرف صرف ایک اشارہ بڑی خوبصورتی کے ساتھ کر دیتے ہیں:

"باین ہمہ جس طرح دریائے نیل کا اصل منبع ایک ہی
سفر میں دریافت نہیں ہوا، اسی طرح ممکن ہے کہ اس
باب (ترجیحِ فقہِ حنفی) کی تکمیل کے لئے مصنّف کو اپنی پوری
توجہ سے ایک آدھ بار پھر ہمّت مصروف کرنی پڑے۔"

"مضامین حالی" میں سے مختلف موضوعوں کے چند نمونے درج کئے جاتے ہیں:

(۱) یہ مضمون تمثیلی رنگ کا لکھا ہے، اور اِس طرح کا یہ ایک ہی مضمون ہے:

"زبانِ گویا" اے میری بلبلِ ہزار داستان! اے
میری طوطیِ شیریں بیان! اے میری قاصد! اے میری
ترجمان! اے میری وکیل! اے میری زبان! سچ بتا تو
کس درخت کی ٹہنی اور کس چمن کا پودا ہے کہ تیرے ہر
پھول کا رنگ جُدا اور تیرے ہر پھل میں ایک نیا مزا ہے!

کبھی تُو ایک ساحرِ فسوں ساز ہے جس کی سحر کاری نہ جادُو کا اُتار۔ کبھی تو ایک افعیِ جاں گداز ہے جس کے زہر کی دارُو، نہ کاٹے کا منتر۔ تو وہی زبان ہے کہ بچپن میں کبھی اپنے ادھورے بولوں سے غیر کا جی لُبھاتی تھی اور کبھی اپنی شوخیوں سے ماں باپ کا دل دُکھاتی تھی تُو وہی زبان ہے جو جوانی میں کہیں اپنی نرمی سے دلوں کو شکار کرتی تھی اور کہیں اپنی تیزی سے دلوں کو فگار.....

اے زبان! تُو دیکھنے میں ایک پارۂ گوشت کے سوا کچھ نہیں، مگر طاقت تیری نمونۂ قدرتِ الٰہی ہے۔ دیکھ اس طاقت کو رائگاں نہ کھو۔ اور اس قدرت کو خاک میں نہ ملا۔ راستی تیرا جوہر ہے اور آزادی تیرا زیور۔ دیکھ اس جوہر کو برباد نہ کر اور اس زیور کو زنگ نہ لگا تُو دل کی امین ہے اور رُوح کی ایلچی۔ دیکھ دل کی امانت میں خیانت نہ کر اور رُوح کے پیغام پر حاشیے نہ چڑھا۔ اے زبان! تیرا منصب بہت عالی ہے اور تیری خدمت ممتاز۔ کہیں تیرا خطاب کاشفِ اسرار ہے اور کہیں تیرا لقب محرمِ راز۔ علم ایک خزانۂ غیبی ہے اور دل اس کا خزانچی۔ حوصلہ اس کا قفل ہے اور تو اُس کی کنجی۔ دیکھ اس قفل کو بے اجازت نہ کھول اور اس خزانہ کو بے موقع نہ اٹھا۔ وعظ و نصیحت تیرا فرض ہے اور تلقین و ارشاد تیرا کام ناصحِ مشفق تیری صفت ہے اور مرشدِ برحق تیرا نام۔ خبردار! اس نام کو عیب نہ لگانا اور اس فرض سے جی نہ چُرانا ورنہ یہ منصبِ عالی تجھ سے چھن جائے گا اور تیری بساط وہی ایک

گوشت کا چھچھڑا رہ جائے گی۔ کیا تجھ کو یہ امید ہے کہ تو جھوٹ بھی بولے اور طوفان بھی اٹھائے، تو غیبت بھی کرے اور تہمت بھی لگائے، تو فریب بھی دے اور چغلیاں بھی کھائے اور پھر وہی زبان کی زبان کہلائے؟ نہیں ہرگز نہیں! اگر تو سچی زبان ہے تو زبان ہے ورنہ زبون ہے بلکہ سراسر زیان ہے۔ اگر تیرا قول صادق ہے تو شہد فائق ہے ورنہ تھوک دینے کے لائق ہے۔ اگر تو راست گفتار ہے تو ہمارے منہ میں اور اوروں کے دلوں میں جگہ پائے گی ورنہ گدی سے کھینچ کر نکالی جائے گی .... الٰہی اگر ہم کو رخصتِ گفتار ہے تو زبانِ راست گفتار دے اور اگر دل پر تجھ کو اختیار ہے تو زبان پر ہم کو اختیار دے۔ جب تک دنیا میں رہیں سچے کہلائیں اور جب تیرے دربار میں آئیں تو سچے بن کر آئیں؟

(۲) ذیل کا مضمون بھی مولانا کے قدیم مقالات میں ہے اور خوب لکھا ہے۔ اپنے موضوع کو مختلف تاریخی، مذہبی، معاشرتی مثالوں سے واضح کیا ہے۔ ہم مختلف مقامات کو مسلسل کر کے مختصر طور پر درج کرتے ہیں:

"جب زمانہ بدلے تم بھی بدل جاؤ" زمانہ کی نیرنگیاں مشہور اور اس کی تلوّن مزاجیاں ضرب المثل ہیں۔ وہ سدا ایک حال پر نہیں رہتا، وہ ہمیشہ ایک چال نہیں چلتا۔ وہ گرگٹ کی طرح برابر رنگ بدلتا رہتا ہے۔ وہ اس بحر

کی طرح جو پہاڑ کی چوٹی سے لڑھکا یا جاتے، ہزاروں پلٹے کھاتا چلا جاتا ہے۔ وہ جو رُوپ بھرتا ہے اُس کے چہرہ پر کھل جاتا ہے۔ وہ جو ٹھاٹھ بدلتا ہے اس کا رنگ ساری مجلس پر چھا جاتا ہے .... مبارک وہ ہیں جنھوں نے اس کے تیور پہچانے، اور اس کی چال ڈھال کو نگاہ میں رکھا۔ جدھر کو وہ چلا اس کے ساتھ ہو لئے اور جدھر سے اُس نے رُخ پھیرا اس کے ساتھ پھر گئے۔ گرمی میں گرمی کا سامان کیا اور جاڑے میں جاڑے کی تیاری کی۔ دن کو دن کی طرح بسر کیا اور رات کو رات کی طرح کاٹا۔ اور بد نصیب وہ ہیں جنھوں نے اس کی پیروی سے جی چرایا اور اس کی ہمراہی سے ناک چڑھائی۔ گرمی چمکی، پر انھوں نے جاڑے کے کپڑے نہ اُتارے اور ہلکے پھلکے نہ بنے۔ دن نکلا، پر اُنھوں نے کروٹ نہ بدلی اور خوابِ شیریں سے بیدار نہ ہوئے۔ اب وہ بہت جلد دیکھیں گے کہ پیچھے کون رہا، اور منزل تک کون پہنچا۔

جو لوگ زمانہ کی پیروی نہیں کرتے، وہ گویا زمانہ کو اپنا پیرو بنانا چاہتے ہیں۔ مگر یہ اُن کی سخت خام خیالی ہے۔ چند مچھلیاں دریا کے بہاؤ کو نہیں روک سکتیں، اور چند جھاڑیاں ہوا کا رُخ نہیں پھیر سکتیں۔ اسی لئے ایک پختہ کار شاعر نے کہا ہے کہ "زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ بساز" اور عرب کے ایک حکیم کا قول ہے کہ "دُرْ مَعَ الدَّهْرِ كَيْفَ مَا دَارَ" یعنی زمانہ جدھر کو پھرے اُس کے ساتھ پھر جاؤ۔

شیخ اکبر فرماتے ہیں کہ مِنْ هَيُولَى الْكُلِّ صُوَرَةٍ یعنی اپنی
ذات میں ایسی قابلیت پیدا کر کہ جس رنگ کو چاہے فوراً قبول
کرلے۔ یہ اس لئے فرمایا کہ زمانہ کبھی انقلاب سے خالی نہیں رہتا
اور اس کا مقابلہ انسان نسیجُ الْبُنْيَانُ سے نہیں ہو سکتا
پس انسان میں ایسی قابلیت ہونی ضرور ہے کہ جیسی ضرورت
دیکھے ویسا بن جائے۔ تاکہ زمانہ کا کوئی انقلاب اس کو سخت
نقصان نہ پہنچائے۔

اے مسلمانو! تم کو یہ بھی معلوم ہے کہ جو شے تم کو ابھرنے
نہیں دیتی، وہ کیا ہے؟ اور جس کے سبب تم جنبش نہیں کر سکتے
وہ کونسی بندش ہے؟ یاد رکھو وہ تمھاری بیہودہ تقلید ہے
تم صرف انھیں لوگوں کی تقلید نہیں کرتے جن کے ساتھ تم کو
حُسنِ عقیدت ہے، بلکہ طب میں جالینوس کی، منطق میں
ارسطو کی، ہندوستان کی رسموں میں ہندوؤں کی تقلید
کو بھی اسی قدر ضروری جانتے ہو جس قدر مذہب میں امامِ
اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی تقلید تمھارے نزدیک واجب و
لازم ہے۔ اگر کسی کو اس بات میں تأمل ہو تو نکاحِ بیوگان
کے معاملہ میں غور کرے اور دیکھے کہ اس کا مجوز کون ہے؟
اور مانع کون ہے؟ اور ہندوستان کے عام مسلمانوں
نے مجوز کے حکم کی تعمیل کی ہے یا مانع کا کہنا مانا ہے؟[1] اسی

---

[1] یعنی اسلام نے بیوہ عورتوں کے نکاح کی اجازت دی ہے۔ لیکن ہندوؤں کے مذہب میں جائز نہیں ہے، ہندوستان کے مسلمانوں نے اسلام کی اطاعت چھوڑ کر ہندوؤں کی پیروی کی۔

تقلید کی بدولت تم میں ایک اور مرض پیدا ہو گیا ہے جس نے تمہاری رہی سہی ہمت خاک میں ملا دی اور تم کو بالکل اپاہج کر دیا! وہ بیہودہ کیا ہے؟ وہ خانہ خراب وضع داری ہے جس کی ہدایت سے تم ترقی کرنے والوں کو متلون المزاج سمجھتے ہو اور ڈھور ڈنگروں کی طرح سدا ایک حالت پر رہنے والوں کو کمالِ نفسِ انسانی قرار دیتے ہو۔

ہندوستان کے وضع داروں کی یہ رائے ہے کہ آدمی اپنی زندگی میں جو طریقہ یا جو حالت اختیار کرے اُس کو آخر عمر تک ترک کرنا نہیں چاہیے۔ جوانی میں اگر داڑھی چڑھانے کی عادت ہو جائے تو سنِ شیخوخت تک اس وضع کو نباہنا ضرور ہے اور بچپن میں اگر کامدار ٹوپی پہننے کا لپکا پڑ جائے تو بڑھاپے کے خجر پائے چہرہ کو بھی اُس سے محروم رکھنا نہیں چاہیے۔ چنانچہ معتبر راویوں سے سُنا گیا ہے کہ دو بزرگوار نجف خانی جن کا سنِ شریف ساٹھ پینسٹھ سے متجاوز ہو گیا تھا۔ اور نہایت متقی اور متورع آدمی تھے، جو ہر جمعہ کو شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے درس میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ شاہ صاحب بھی ان کی کمال تعظیم کرتے تھے۔ بایں ہمہ تقدس دونوں حضرات داڑھی گھٹواتے تھے۔ بعضے مُنہ پھٹ آدمیوں نے جو اُن پر اعتراض کیا تو یہ فرمایا کہ ہم خود اِس حرکت سے منفعل ہیں مگر کیا کریں جو وضع قدیم سے چلی آتی ہے اُس کے خلاف کرتے ہوئے شرم آتی ہے۔ اسی طرح ایک شریفوں

کی بستی میں ایک صاحب سِن رسیدہ، بڑے نمازی اور پرہیزگار رہتے۔ مگر عشا کی نماز کبھی نہ پڑھتے تھے۔ لوگوں نے سبب پوچھا تو یہ فرمایا کہ "بچپن میں تو اس سبب سے نہ پڑھی کہ کھانا کھاتے ہی شام سے سو رہتے تھے۔ جوانی میں لہو و لعب مانع رہا، اب بڑھاپے میں نئی بات کرتے ہوئے جی ہچکچاتا ہے۔" (مطبوعہ تہذیب الاخلاق $\frac{۱۸۷۵ء}{۱۲۹۲ھ}$)

(۳) مولانا کی تحریر میں کہیں کہیں لطیف ظرافت بھی ہے۔ اوپر کا مضمون (زمانہ) بھی اس سے خالی نہیں۔ ایک اور مضمون "اخبار نویسی اور اُس کے فرائض" میں لکھتے ہیں:

"ایک شخص نے گدھوں کے سوداگر سے جاکر کہا کہ 'مجھ کو ایک ایسا گدھا مطلوب ہے جو نہ زیادہ چھوٹے قد کا ہو نہ بہت بڑے قد کا۔ جب رستہ صاف ہو تو اُچھلتا کُودتا چلے اور جب رستہ میں بھیڑ ہو تو آہستہ قدم اُٹھائے نہ دیوار و دَر سے اَڑتا چلے نہ گنجان درختوں میں سوار کو لیکر گھُس جائے۔ اگر چارہ کم دیا جائے تو صبر کرے اور پیٹ بھر کر دیا جائے تو شکر کرے۔ جب اس پر سوار ہوں تو چالاک بَن جائے اور جب تھان پر باندھ دیں تو کان نہ ہلائے' سوداگر نے کہا 'چند روز صبر کر۔ اگر خدا تعالےٰ نے اپنی قدرتِ کاملہ سے قاضی شہر کو گدھا بنا دیا، تو تیرا سوال پورا کرسکوں گا۔'"

اگر آج کل کوئی کسی سے ایسا سوال کرے تو اس کو

قاضی کی جگہ "اخبار نویس" کا نام لینا چاہیے۔ کیونکہ قاضی میں دو صفتیں ہونی ضرور ہیں۔ ایک قانون کی واقفیت جس کی رُو سے وہ فیصلے کرتا ہے۔ دوسرے انصاف۔ بخلاف اخبار نویس کے کہ اس میں اپنے کام کے فرائض ادا کرنے کے لئے بے شمار لیاقتوں کی ضرورت ہے۔ ہمارے نزدیک کسی کی نسبت یہ کہنا کہ وہ اخبار نویسی کی پوری لیاقت رکھتا ہے، گویا اس بات کا تسلیم کر لینا ہے کہ اُس کی ذات میں ہر قسم کی لیاقت اور فضیلت موجود ہے......." (مطبوعہ اخبار رفیقِ ہند، ۱۵ اکتوبر ۱۸۹۲ء)

مولانا نے چند مذہبی مضامین سرسید کی حمایت میں لکھے ہیں۔ چونکہ مولانا کی تحریر سے یہ بات معلوم ہوتی ہے، اِس لئے ہم نے بھی لکھدی، ورنہ حمایت سے قطع کر کے بھی وہ مضامین خود نہایت ضروری مسائل پر بہترین اسلوب کے ساتھ لکھے گئے ہیں۔ ان میں ایک مضمون "اَلدِّیْنُ یُسْرٌ" (مذہبِ اسلام میں آسانی ہی آسانی ہے) کے عنوان سے بہت طویل لکھا ہے۔ اِس کو الگ کتابی صورت میں بھی شائع کیا گیا تھا۔ ایک اور طویل مضمون کا عنوان ہے "قرآن مجید میں اب نئی تفسیر کی گنجائش باقی ہے یا نہیں؟" یہ پہلے مضمون سے بھی زیادہ کاوش و تحقیق کے ساتھ لکھا ہے۔ اِن مضامین کے نمونے بخوفِ طوالت ترک کئے جاتے ہیں۔

(۴) ذیل کا مضمون ایک کتاب پر ریویو ہے۔ مولانا نے تنقید بھی خوب کی ہے اور اصل کتاب تو ایسی عجیب ہے کہ اردو لٹریچر میں ایک ہی ہو گی۔ اسی نُدرت و جدّت کے سبب سے اُس کے مختلف اقتباسات

درج کئے جاتے ہیں:

"کلیاتِ دلمیر، پر ریویو" کلیاتِ دلمیر ایک نئی قسم کا دیوان ہے، جس سے غالباً خاص خاص شخصوں کے سوا بہت کم لوگ واقف ہوں گے۔ صاحبِ دیوان ایک بزرگ منور خاں نام دلمیر تخلص، رئیسِ میرٹھ ہیں۔ ۱۸۵۰ء میں انھوں نے کچھ نظمیں گنواری زبان میں جو درمیانہ دوآب و ہریانہ کے دیہات میں عموماً بولی جاتی ہے، لکھ کر مرحوم ابوظفر سراج الدین بہادر شاہ کے دربار میں پیش کی تھیں۔ وہاں ان نظموں کی بہت داد ملی اور بادشاہ نے انعام اور خلعت عنایت کیا۔ اس قدردانی نے دلمیر کے خیالات پر وہی اثر کیا جو سلطان سنجر کے ملک الشعراء کا تزک و احتشام دیکھ کر اوحد الدین انوری کے دل پر ہوا تھا۔ انھوں نے اسی گنواری زبان پر اپنی شاعری کی بنیاد رکھی اور رفتہ رفتہ ایک نئی قسم کا دیوان مرتب کر لیا، جو اس وقت ہمارے سامنے موجود ہے۔

جس زبان میں یہ دیوان مرتب ہوا ہے وہ درحقیقت ایک قسم کی بگڑی ہوئی اُردو ہے، جیسا کہ ہر ملک میں دیہاتیوں اور گنواروں کی زبان شہر والوں کی بگڑی ہوئی زبان ہوتی ہے۔ پس اس دیوان میں زیادہ تر وہی الفاظ جو فصیح اردو میں صحیح طور پر مستعمل ہوتے ہیں، کسی قدر تغیر کے ساتھ گنواری بول چال میں استعمال ہوتے ہیں، جیسے

خالق اور کھالک۔ باپ اور باپو۔ ہمارے اور ھمارے۔ چیتے چیتے
اور چیاں چیاں۔ تونے اور تیں نے۔ کیا اور کینا۔ دیا اور
دینا وغیرہ وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ ایک موزوں طبع آدمی کو جس
کی مادری زبان شہری فصیح اردو نہ ہو، بگڑی ہوئی اردو
کا سیکھ لینا اور اس میں اشعار موزوں کرنا زیادہ
دشوار نہیں، مگر جو بات دشوار اور سخت دشوار ہے،
اور جس پر سوا اس شخص کے جو ماں کے پیٹ سے
شاعر پیدا ہوا ہو، کوئی قادر نہیں ہو سکتا۔ وہ یہ کہ جو مضمون
ایک گنواری زبان میں بیان کیا جائے، اُس کا پیرایۂ بیان
بھی گنواروں کے محدود خیالات کی حد سے متجاوز نہ ہو۔
.... اس دیوان میں یہی وہ چیز ہے جو دلمیر کے اصلی اور
قدرتی شاعر ہونے پر بہ آوازِ بلند گواہی دیتی ہے۔ جس طرح
اس کی زبان گنواری ہے، اسی طرح اس میں ہر ایک مضمون
گنواروں کے خیالات کے موافق ادا کیا گیا ہے۔ وہ خدا
کی تعریف اس طرح شروع کرتا ہے۔

ہے مرے کھالک ہے مرے مالک　　　تو باپو ہم تیرے بالک

(ہے، حرفِ ندا یعنی اے = کھالک، خالق = باپو، باپ)
خدا کی عظمت کا بیان، گنواروں کے خیالات کے موافق
اس سے بہتر کسی پیرایہ میں نہیں ہو سکتا کہ اس کو باپ اور
اپنے تئیں اس کے بچے قرار دیں۔

ھمارے حاکم، ھمارے سوائی　　　چیاں چیاں تیری دُہائی

معارے ، ہمارے ، سوائی ، مرداز ۔

تیں پانی سوں مانس کینا سوجھ بوجھ مت سدھ بدھ دینا
تونے سے آدمی بنایا دیا

تیرے سانچے انیک نرالے جن سانچوں لکھ کایا ڈھالے
بے شمار لاکھ جسم

خدا تعالےٰ کی حکمتِ بالغہ کو جو قرآن میں اِن لفظوں سے بیان کی گئی ہے کہ قَدْ خَلَقَکُمْ اَطْوَاراً اِس طرح بیان کرتا ہے کہ تیرے سانچے بے شمار اور اَن گنت ہیں کہ ایک سانچے کی ڈھلت دوسرے سانچے کی ڈھلت سے نہیں ملتی۔

انبر۔ دھرتی۔ سورج۔ چندر دی۔ دیوتا۔ پیر پگمبر
آسمان اوتار پیغمبر

سب تری ڈوڈھی سیس نِواویں تجھے نے پوجیں۔ تجھے نے گاویں
ڈیوڑھی سر جھکائیں تجھی کو تیرا ہی نام لیں

جے تو اپنا چھوہ دکھانے انبر دھرتی چھو ہو جاوے
اگر غصہ

توں ہی مالے۔ توں ہی نواجے تیرا دُھونسا انبر باجے
نوازے نقارہ آسمان پر بجتا ہے

چونکہ بادشاہوں اور امیروں کے نقار خانے بہت بلندی پر بنائے جاتے ہیں تاکہ نوبت کی آواز دور دور پہنچے اور سُننے والوں کو ان کی زیادہ شان شوکت معلوم ہو، اِس لئے عوام کے

خیال کے موافق عظمت وجلالتِ الٰہی کو اس پیرایہ میں بیان کرتا
ہے کہ تیرا نقارہ آسمان پر بجتا ہے ....

(حمد و نعت کے بعد) اس مطلب کو کہ آپ کے چاروں
یاروں نے دنیا میں اسلام کو پھیلایا، اس طرح بیان کرتا ہے۔

نبی صاحب کے چار سپائی   جنھاں نے ملکوں دھوس مچائی
سپاہی   جنھوں نے   دھوم مچائی
کر دیے لکھوں نیم کے بندے   نرل ہو گئے مانس گندے
ایمان   پاک   آدمی

پھر اس مطلب کو کہ جس نے آں حضرت صلعم کی پیروی نہ
کی وہ تباہ ہوا، اس طرح ادا کرتا ہے۔

جو کوئی واکی گیل نہ چالا   واہ کا دو جگ مہرا کالا
اس کے ہمراہ   دونوں جہاں میں منہ
ڈوب گیو واہ کرموں ہینا   جن حجرت کا سنگ نہ دینا
وہ نصیبوں کا ہیٹا   جس نے حضرت ساتھ

ایک شخص اپنے وطن اور اہل وعیال سے دُور جا پڑا ہے،
گویا وہ خدا کی طرف مخاطب ہو کر اپنی مصیبت بیان کرتا ہے
اور کہتا ہے:

ہے مرے صاحب، تُو کے کینا   مجھ نے دیس نکالا دینا
(اے میرے مالک یہ کیا کیا   مجھے دیس نکالا یعنی جلاوطنی دے دی)
میں کے تیری بھوری کھیدیں   جے مرے کالجے برچھی چھیدیں
(میں نے کیا تیری بھوری بھینس نکال لی ہے   کہ تو نے میرے کلیجے میں برچھی چبھو دی ہے)

اپنے صاحب یعنی خدا سے کہتا ہے کہ کیا میں نے تیری بھوری بھینس چھین لی ہے جو تو نے مجھ پر یہ مصیبت ڈالی ہے۔ چونکہ گنوار لوگ بھوری بھینس کو بہت عزیز رکھتے ہیں اس لئے انھیں کے خیالات کے موافق خدا تعالےٰ سے کہتا ہے کہ کیا میں نے تیری بھوری بھینس چھین لی ہے جس کا تو نے مجھ سے یہ بدلا لیا ہے (اس کے بعد) کہیں جستی حقّہ اور چوپاڑ کے ساتھیوں کو یاد کرتا ہے، کہیں بھابڑ کے بانوں سے بُنی ہوئی کھاٹ کھٹولی، گوبر کی ڈھیریوں، سانی کی ناندوں، دودھ دہی کی کوری ٹکیوں، سرسوں کے ساگ اور مکّا کی روٹی اور اسی قسم کی اور چیزوں کا جو دہقانی زندگی کے مناسب ہیں، حسرت کے ساتھ ذکر کرتا ہے۔

سب سے زیادہ لحاظ کے قابل اس دیوان میں یہ بات ہے کہ ظاہراً جعفر سے پہلے کسی نے گنواری زبان میں دیوان مدوّن نہیں کیا اور نہ اتنے مختلف مضامین جتنے کہ اس دیوان میں ہیں، کبھی اس زبان میں بیان کئے گئے۔ اس میں حمد، نعت، منقبت اخلاق، ہزل، عشق، ہجر، وصل، رشک غرض کہ وہ تمام بیانات جو اردو کے عام دیوانوں میں پائے جاتے ہیں، موجود ہیں۔ پس اردوے معلّےٰ کے شعرا، جو کئی سو برس سے اسی ایک ہڈی کو چچوڑتے چلے آتے ہیں اُن میں اور جعفر میں وہی فرق ہے جو مقلّد اور موجد میں ہوتا ہے۔ وہ لوگ جب مضامینِ مذکورۂ بالا میں سے کسی مضمون کو باندھنا چاہتے ہیں تو اس کے ادا کرنے کے لئے سینکڑوں اسلوبِ بیان

اور الفاظ و محاورات اور تراکیب اردو لٹریچر میں مہیا پاتے ہیں
اُن کے سامنے مختلف مقدار کے بندھے ہوئے موتیوں کا انبار
موجود ہے، جیسے موتی کی ضرورت ہوتی ہے، بے تکلف لڑی
میں پرو لیتے ہیں۔ برخلاف اُس شخص کے جس کو اوّل غوطہ
لگا کر دریا میں سے سیپیاں بہم پہنچائی، پھر ان میں سے موتی
نکالنے ہیں، پھر اُن کو جلا کرتا ہے، پھر بیندھنا ہے۔ پھر
لڑی میں پرونا ہے۔

اس سے زیادہ مشکل یہ بات ہے کہ گنواری زبان ایک جاہل
قوم کی زبان ہے، جس کا دائرہ نہایت تنگ اور محدود ہے باوجود
اس کے دلگیر نے اس میں بہت سے ایسے مضامین بیان
کئے ہیں، جن کا ایک گنواری زبان میں سمانا بہت مشکل ہے
مثلاً انگریزی عملداری کی تعریف میں نوایجاد توپوں اور
بندوقوں کا بیان۔ ریل۔ تار برقی۔ سڑکوں اور نہروں
کا بیان۔ برف کی کل۔ واٹر ورکس کا بیان۔ دیاسلائی گیس
اور برقی روشنی کا بیان وغیرہ وغیرہ۔ مذکورہ بالا بیان
میں سے چند اشعار یہاں لکھے جاتے ہیں:

جُگ جُگ رہے پھرنگی راج   یو راجہ۔ راجوں سر تاج
ہمیشہ ہمیشہ   فرنگی   یہ بادشاہ بادشاہوں کے سرتاج ہیں

راجا راجی سکھی کسان   یو راجا پرجا کی جان
راضی خوش

بڈے بادچھا۔ بڑے نیاپھ   بڑے اکل ور۔ بڈے سراپھ
بادشاہ   انصاف   عقل ور   اشراف

انگریجاں کا ملکوں راج راجا بڈے گریب نواج
غریب نواز
انگریجاں کی باکی بھوج جابد چڑھے سمندر موج
جس طرح
پڑے سمندر دل گھنے جہاج جامیں راکھیں بھر بھر ناج
جن میں
کھاوے بھوج۔ انگھاوے بھوج میٹھی باجے بجاوے بھوج
سیر میں
توپاں چلیں گھٹا گھنگھور کاسوں ہو سرکار کی ہور
کس سے برابری
تورا لگے نہ دارو موکھ آپو آپو چلیں بندوکھ
توڑا بارود بندوق
ہند بندوکھاں لمبی نال داگی دگیں نہ دو دو سال
ہندوستانی بندوقیں داغنے سے نہیں دغتیں
ہند راج کھوٹی ترودار گاجر کٹے نہ سو سو مار
تلوار
راج پھرنگی رہے آنند جدلگ انبر۔ سورج۔ چند
جب تک
ریل نکاڑی، کاڈھے تار دن میں چالے میل ہجار
نکالی
تار کھبر سوں راتوں رات لاکھ لوکس سوں کر لو بات

اچرج بڑی برچھ کی کل | دائے گھومادے کونسا کَلَن
اچنبھا برف | اسکو پہلوان
کاگج دام چلادے کون؟ | ایسا ٹھاڈا آدے کون؟
کاغذ کے دام یعنی نوٹ

سڑک بنادیں کھودیں نہر | کھیت کھیت پانی کی لہر
جاسے ہو لکھوں من ناج | کدھیں رہیں ناٹھالی چھاج
جس سے | کبھی بیکار

ببے دیے دھرتی ماں گال | تلے تلے پانی کی چال
پانی کے نل زمین میں گلادیئے

نگرنگر ماں لائے نل | جامیں آدے نرمل جل
گاؤں گاؤں میں

یاہی برسوں جلیں چراگ | ناباتی۔ ناتیل۔ ناآگ
ناکوئی دیا بالن وارا | آپو آپو ہو اُجیارا
اُجالا

آپو تڑکے جادیں بجھ | اچرج ناہیں مجھ اور تجھ
پڑے پڑے پرجا نوسکھ | ناہیں رہے اب دھرتی دُکھ
بڑے بڑے رعایا کو آرام میں

(مطبوعہ رسالہ معارف ۱۹۰۱ء)

مولانا حالی کے مضامین میں مسدس کا دیباچہ بھی ان کے ادب وانشا
کا نادر نمونہ ہے۔ مولانا کتابوں کی طرح مضامین میں بھی انگریزی کے الفاظ

لکھنے لگے تھے، مثلاً:

"جو اسٹائل[1] انھوں نے ابتدا سے اختیار کیا ہے
اُس کا مقتضیٰ یہی ہے کہ رائٹر[2] اور ریڈر[3] دونوں کے لئے روز
بروز زیادہ صاف اور زیادہ ہموار ہونا چاہئے۔"

(ریویو سیرۃ النعمان ۱۸۹۳ء)

حیاتِ جاوید اور اُس کے بعد کے مضامین میں مولانا حالی کا اسلوبِ تحریر اور پیرایۂ بیان بہت رواں اور پختہ ہو گیا تھا۔

(۷) مکتوباتِ حالی: مولانا کے خطوط ۱۹۲۵ء میں دو جلدوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان کی تعریف اس سے بہتر نہیں ہو سکتی جو مولوی عبدالحق صاحب نے مقدمہ مکتوبات میں کی ہے۔ لکھتے ہیں:

"خطوں سے انسان کی سیرت کا جیسا اندازہ ہوتا ہے وہ کسی دوسرے ذریعہ سے نہیں ہو سکتا۔ خطوں میں کاتب مکتوب الیہ سے بلکہ اکثر اوقات اپنے آپ سے باتیں کرنے لگتا ہے۔ جو خیال جس طرح اس کے دل میں ہوتا ہے اسی طرح قلم سے ٹپک پڑتا ہے۔ نہیں، بلکہ وہ اپنا دل کاغذ کے ٹکڑے پر نکال کر رکھ دیتا ہے اور اگر وہ دل ایسا ہو جو سراسر درد سے لبریز ہو، جس میں ہمدردیِ بنی نوع انسان کوٹ کوٹ کر بھری ہو، جو پریم کے رس سے سینچا

---

[1] اسٹائل، طرزِ تحریر۔

[2] رائٹر، لکھنے والا یعنی مصنف۔

[3] ریڈر، پڑھنے والا یعنی کتاب کا مطالعہ کرنے والا۔

گیا ہو، تو بتاؤ کہ اس دل کی تراوش کیسی ہوگی؟ اگر تم ایسے دل
کی زیارت کرنی چاہتے ہو تو آؤ اور دیکھو کہ وہ پاک دل اِن
خطوں میں لپٹا ہوا ہے"

ایسے پاک دل کی تراوش کا ایک ذرا سا نمونہ یہ ہے:

ا۔ مولانا اپنی پوتی (اہلیۂ غلام الثقلین) کو لکھتے ہیں:

"تمہارا خط عین انتظار میں پہنچا۔ اس کو پڑھ کر سب کا
جی بے انتہا خوش ہوا اور تمہاری پھپّی کی آنکھوں سے خوشی
اور محبت کے جوش میں بے اختیار آنسو ٹپک پڑے۔ تم نے
اتنی دُور جاکر اپنی محبت سب کے دل میں بہت بڑھادی ہے
تمہاری دادی ہر وقت تمہاری صحت و سلامتی کی دُعا کرتی رہتی
ہیں۔ مجھے امید ہے کہ وہاں رہنے سے تمہاری صحت اچھی ہو جائے
گی۔ کیا اچھی بات ہو کر تم وہاں سے ایسی موٹی تازی ہو کے
آؤ کہ یہاں تمھیں کوئی پہچان نہ سکے اور تم قسمیں کھا کھا کر
یقین دلاؤ کہ میں وہی .... ہوں۔

ایک خط بھائی فیاض حسین کے مکان کے پتے سے دادی
بہو کے نام بھی بھیجا اور اس میں یہ لکھا کہ مجھے چلتے وقت آپ سے
نہ ملنے کا بہت افسوس ہے۔ روانگی کے دن میرا ارادہ آپ
کے پاس آنے کا تھا، مگر مجھے اتنی فرصت کسی نے نہ لینے دی"

پہلے پیراگراف کا آخری جملہ محبت، لطافت، ظرافت کا عجیب دلکش و مؤثر
نمونہ ہے، دوسرے پیراگراف میں ازراہِ شفقت تعلیم اخلاق فرماتے ہیں۔ پوتی
ایک بزرگ خاندان سے مِل کر نہیں آئیں، ان کو شکایت ہو سکتی ہے اور ممکن ہے

ان کو اس کا خیال بھی نہ آئے۔ مولانا رفعِ شکایت کی صورت بتاتے ہیں؛
ب۔ بعض خطوں میں علمی و ادبی مسائل بھی ہیں۔ ان کا نمونہ یہ مختصر خط ہے جو مولانا نے مولوی حبیب الرحمٰن خاں شیروانی (نواب صدر یار جنگ) کو لکھا ہے:

"جنابِ من! لفظ "ہاتھ" میں بلا شبہ ہائے مخلوط ہے، لیکن رات اور بات کا قافیہ بھی شعرا نے باندھا ہے قافیے کی ضرورت ایسی ایسی خفیف فروگذاشتوں کو جائز کر دیتی ہے۔ مرزا غالب کبھی اور کسی کی جگہ کبھو اور کسو کو غیر فصیح سمجھتے تھے، لیکن اُن کے اُردو دیوان میں قافیے کی جگہ کسو اور کبھو بندھا ہوا ہے۔ میں بھی ہمیشہ ہاتھ کو ہائے مخلوط کے ساتھ لکھتا ہوں، مگر قافیے میں ہات باندھنا جائز سمجھتا ہوں، زیادہ نیاز۔

خاکسار الطاف حسین حالی، از پانی پت محلہ انصاریاں

۲ر فروری ۱۸۹۰ء

ڈاکٹر مولوی سیّد علی بلگرامی

مولوی سیّد[1] علی صاحب ۱۰ر نومبر ۱۸۵۱ء کو بلگرام کے ایک شریف و معزز خاندان میں تولد ہوئے۔ ان کے بزرگ چھٹی صدی ہجری (بارھویں صدی عیسوی) میں شہر واسطہ سے جو عراقِ عرب میں واقع ہے ہندستان آئے اور اودھ میں سکونت اختیار کی۔ آپ کے جدِّ امجد مولوی سیّد کرم حسین صاحب[2] گورنر جنرل کے دربار میں شاہ اودھ کے سفیر تھے۔ والد اور چچا بھی انگریزوں کی ملازمت میں اعلیٰ عہدوں پر ممتاز تھے۔

ان کے والد سیّد زین الدین حسین خاں اور چچا سیّد اعظم الدین حسن خاں، دونوں علوم مشرقی کے فاضل و ماہر تھے اور یہ پہلے مسلمان تھے جنھوں نے باقاعدہ مدرسۂ عالیہ کلکتہ میں تعلیم پائی۔ دراصل یہ خاندان مسلمانوں کے ان چند خاندانوں میں سے ہے، جنھوں نے سب سے پہلے زمانے کی بدلتی ہوئی فضا کو پہچانا اور ضرورتِ زمانہ پر عمل کرکے مسلمانوں میں جدید تعلیم کا شوق پیدا ہوا۔

مولوی سیّد علی صاحب اپنے باپ کے سب سے چھوٹے بیٹے تھے۔ شمس العلماء سیّد حسن بلگرامی اور نواب عماد الملک سیّد حسین بلگرامی ان کے بڑے بھائی تھے۔ مولوی صاحب بڑے ذہین اور ہونہار تھے، حافظہ نہایت عمدہ تھا

---

[1] یہ حالات ڈاکٹر مولوی عبدالحق کے مضمون مطبوعہ "چند ہم عصر" سے لیے گئے ہیں۔

[2] سیّد کرم حسین صاحب مرزا غالب کے دوست تھے۔ "چکنی ڈلی" والے قطعہ میں صاحب سے مراد یہی مولوی کرم حسین ہیں۔

جو بات ایک دفعہ پڑھتے یا سُنتے پھر کبھی نہ بھولتے۔ پندرہ برس کی عمر تک علوم عربیہ و فارسی کی تعلیم مکمل کرلی۔ ۱۸۶۶ء میں انگریزی تعلیم شروع کی دو سال کے بعد کیننگ کالج لکھنؤ میں داخل ہوئے اور ۱۸۷۴ء میں پٹنہ کالج سے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ بی اے میں آپ کی اختیاری زبان سنسکرت تھی۔ بعد ازاں تین سال تک و۔ قانون ملکی کا مطالعہ کرتے رہے اور ایک سال بعد امتحان ڈپٹو سول سروس میں تمام صوبے میں اوّل آئے اس کے بعد طامس اسکالرشپ پاکر وہ رڑکی کے انجینرنگ کالج میں داخل ہوئے لیکن چھ مہینہ بعد ہی حیدر آباد کے مشہور وزیر نواب مختار الملک سر سالار جنگ بہادر اوّل نے وہاں سے بلاکر اپنے پرسنل اسٹاف میں شامل کرلیا اور جب ولایت گئے تو انھیں بھی ساتھ لیتے گئے۔ وہاں وہ شاہی مدرسہ معدنیات میں داخل ہوئے اور دو ہی سال میں ایسوشی ایٹ کا امتحان پاس کیا اور "علم طبقات الارض" میں تمغہ حاصل کیا۔ اس سے قبل وہ لنڈن یونیورسٹی کا امتحان میٹریکولیشن بدرجۂ اعلیٰ پاس کرچکے تھے۔ اس امتحان میں ان کی اختیاری زبانیں جرمن اور فرانسیسی تھیں۔

انگلینڈ سے واپسی پر اُنھوں نے فرانس۔ اسپین۔ جرمنی اور اٹلی کی سیاحت کی۔ اطالوی زبان اور علوم سیکھنے کے لئے کچھ عرصہ اٹلی میں قیام بھی کیا۔ حیدر آباد واپسی پر ریاست نے انھیں انسپکٹر جنرل معدنیات مقرر کیا۔ کچھ عرصہ ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم اور ہوم سکرٹری بھی رہے۔

مولوی سید علی عجیب قابلیت کے آدمی تھے، لاطینی۔ انگریزی جرمنی

فرانسیسی۔ عربی۔ فارسی۔ اُردو۔ سنسکرت۔ بنگالی۔ ہندی۔ تلنگی۔ مرہٹی اور گجراتی زبانوں کے ماہر تھے۔ سنسکرت نہایت عمدہ اور فصیح بولتے تھے مدراس یونیورسٹی کے ایم اے سنسکرت کے امتحان کے ممتحن کئی سال تک رہے۔

مولوی صاحب آخر زمانہ تک معتمدِ تعمیرات وریلوے ومعدنیات رہے۔ ۱۸۹۱ء میں سر آسمان جاہ بہادر کے زمانۂ وزارت میں بعض انقلابات سے دل برداشتہ ہوکر انھوں نے امتحانِ وکالت کی تیاری شروع کی اور باوجودیکہ امتحان میں صرف چار مہینے باقی تھے۔ کلکتہ یونیورسٹی کے امتحان بی ایل میں اوّل نمبر پاس ہوئے، اِس سے ان کی خداداد قابلیت کا پتہ چلتا ہے۔ ۱۸۹۳ء میں سرکار نے آپ کو شمس العلماء کا خطاب عنایت کیا۔

۱۹۰۱ء میں حیدرآباد سے پنشن لے کر انگلستان چلے گئے۔ وہاں ۱۹۰۲ء میں کیمبرج یونیورسٹی میں مرہٹی زبان کے ریڈر مقرر ہوئے اسی سال انڈیا آفس کے عربی فارسی قلمی کتابوں کی فہرست مرتب کرنے پر مامور ہوئے۔ یہ نہایت مشکل کام خیال کیا جاتا تھا۔

مولوی سیّد علی صاحب مختلف علومِ مشرقی ومغربی کے ماہر تھے لیکن وہ طبعاً محنت کے کاموں سے جی چُراتے تھے۔ چنانچہ علمی میدان میں ان کے کارنامے بہت کم ہیں اور جو ہیں وہ تقریباً سب ترجمہ ہی تک محدود ہیں۔ گو اُس زمانے میں دوسری زبانوں سے ترجمہ کرنا ہی علم وادب کی کافی خدمت تھی۔

اُن کے تراجم کی فہرست حسب ذیل ہے:

(۱) میڈیکل جورِسں پروڈنس یعنی اصول قانون طب (ڈاکٹر ہیر کی انگریزی کتاب کا ترجمہ) سرکار نے اس پر چھ ہزار روپے انعام دیا۔ اس میں انگریزی اصلاحات کا ترجمہ خوب کیا ہے۔

(۲) رسالہ در تحقیق تالیف کتاب کلیلہ و دمنہ: اس میں مرحوم نے بڑی تحقیق سے اس بات کا پتہ لگانے کی کوشش کی ہے کہ یہ کتاب اصل میں کس نے اور کہاں لکھی اور پھر کہاں کہاں پہنچی اور ترجمے ہوئے اور اس میں کیا کیا تبدیلیاں ہوئیں؟ یہ رسالہ مرحوم نے آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس میں پڑھا تھا۔

(۳) فارسی کی تعلیمی قدر و قیمت بمقابلہ سنسکرت پر ایک نوٹ۔

(۴) غارہائے الورا کا گائڈ۔

(۵) حیدرآباد کے اقتصادی و طبقاتِ ارضی معدنیات۔

(۶) تمدنِ عرب۔ ڈاکٹر گستاولی بان کی فرانسیسی کا اردو ترجمہ جو ہندوستان میں بہت مقبول ہوا۔

(۷) تمدنِ ہند۔ یہ کتاب بھی اسی مصنف موسیو لیبان کی فرانسیسی کتاب کا ترجمہ ہے۔

(۸) انھوں نے موسیو سدیو کی کتاب تمدنِ عرب کا ترجمہ بھی فرانسیسی سے اردو میں کیا تھا۔ لیکن جب انھیں معلوم ہوا کہ اس کا ترجمہ عربی میں ہو گیا ہے تو اس کو طبع نہیں کرایا۔

مولوی سید علی صاحب نے "الحقائق" نامی ایک سہ ماہی رسالہ عربی میں نکالا۔ اس رسالہ میں ملک کے نامور عالموں اور ادیبوں نے اچھے اچھے مضمون لکھے۔ دوسرا قابل قدر کام جو مرحوم نے کیا وہ نواب سر وقار الامراء

بہادر کے عہد میں ایک سررشتہ علوم و فنون کا قیام تھا۔ مرحوم خود اُس کے نگراں مقرر ہوئے۔ اس کا مقصد اردو میں کتابیں تصنیف و تالیف و ترجمہ کرنا تھا۔ مولانا شبلی اس سررشتہ کے ناظم مقرر ہوئے۔ ان کی اور کئی کتابیں اسی سلسلہ میں شائع ہوئیں لیکن بدقسمتی سے یہ سررشتہ قائم نہ رہ سکا گو ضرورت اس کی ہنوز باقی ہے۔

مرحوم کو کتابوں کا بہت شوق تھا۔ تقریباً ہر علم و فن کی کتابیں آپ کے کتب خانہ میں تھیں لیکن اسلامی علوم و علمِ ادب سے خاص شغف تھا۔ چنانچہ اس کے متعلق جتنا لٹریچر ولایت میں چھپا، سب انھوں نے اپنے کتب خانہ کے لئے فراہم کیا۔ مولوی صاحب کو بیش قیمت اور نایاب کتابوں کے جمع کرنے کا نہایت شوق تھا۔ چنانچہ بعض نادر الوجود کتابیں بڑی کوشش سے حاصل کیں۔ الوصایا لابی حاتم السجستانی کا صرف ایک قلمی نسخہ جس پر شہاب الدین خفاجی مصنف ریحانۃ الادب و امام عبدالقادر بغدادی مصنف خزینۃ الادب کے دستخط تھے، کیمبرج میں تھا۔ کتاب بوسیدہ تھی اس لئے اُس کا فوٹو لیا گیا اور دس کاپیاں تیار کی گئی تھیں، اور سب تقسیم ہو گئی تھیں۔ مولوی سید علی نے یونیورسٹی کے پروفیسر سے جن نے اس کا عکس لیا تھا، بڑی کوشش سے اس کی ذاتی لائبریری کا نسخہ حاصل کیا۔ انھوں نے جمہرۃ اللغۃ لابن دُرید، جو لغت کی ایک نایاب کتاب ہے، پانسو روپے میں خریدی۔ ایک مرتبہ حیدر آباد کے ایک معزز رئیس یہ کتاب ان سے مانگ کر لے گئے اور کتب خانۂ آصفیہ حیدر آباد میں ڈیڑھ دو ہزار روپے کو فروخت کر دی۔

سید علی صاحب اِس بات کو بھول گئے تھے۔ کئی سال کے بعد

ایک روز معلوم ہوا کہ اس کتاب کا ایک نسخہ کتب خانہ میں ہے، منگا کر دیکھا تو ان کا اپنا نسخہ تھا۔ جب اس کی فروخت کا حال سُنا تو بہت رنج ہوا۔ آخر اُس کی نقل اپنے لئے لے لی۔ اس کے بعد جب برلن (جرمنی) گئے تو ایک پروفیسر کو دکھائی۔ اُس کو بہت پسند آئی۔ ان کو روپے کی ضرورت تھی پندرہ ہزار روپے میں اس کے ہاتھ فروخت کر دی۔

تزک بابری کا ترکی زبان کا نسخہ انھوں نے سر سالار جنگ بہادر کے کتب خانہ میں دیکھا، اس کو اپنے ساتھ ولایت لے گئے۔ وہاں لوگوں نے بہت پسند کیا اور گب میموریل فنڈ کی طرف سے اس کے عکسی نسخے شائع کئے گئے۔ انھوں نے اصل کتاب مع عکسی نسخے کے واپس کر دی۔

ان کو مطالعہ میں آسانی پیدا کرنے کی وجہ سے حاجی خلیفہ کی کتاب کشف الظنون کی ترتیب بدلنے کا خیال پیدا ہوا۔ کشف الظنون کی ترتیب یہ ہے کہ کل کتابوں کو حروفِ تہجی پر تقسیم کیا ہے۔ یہ چاہتے تھے کہ مصنفوں کے ناموں کو حروفِ تہجی پر تقسیم کیا جائے اور ہر مصنف کے ذیل میں اس کی تمام تصنیفات درج کی جائیں تاکہ جس مصنف کا مطالعہ مقصود ہو اس کا تمام کارنامہ سامنے آجائے۔ اِس کام کے لئے انھوں نے ایک آدمی ملازم رکھا جسے تقریباً دس برس تک پندرہ روپے ماہوار دیتے رہے۔ لیکن افسوس یہ کام پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔

اسی طرح وہ آگسٹس فلوجل کے مرتبہ انڈکس قرآن میں ترمیم کرنا چاہتے تھے۔ آگسٹس نے ہر صورت کے لئے ہندسوں کا نشان رکھا ہے سید علی صاحب سورتوں کے نام لکھنا چاہتے تھے۔ یہ کام پورا ہو گیا تھا لیکن طبع کی نوبت نہیں آئی۔

مولوی سید علی صاحب عالموں کی بڑی قدر کرتے تھے اور ان سے ملنے میں کبھی عذر نہ کرتے بلکہ اس کے درمیان میں کسی بڑے آدمی سے بھی ملنا پسند نہ کرتے۔ وہ اہلِ علم کے کاموں کی بھی بڑی وقعت کرتے اور کبھی تعریف و توصیف میں بخل نہ کرتے۔ مولانا حالی کی بڑی قدر کرتے تھے۔ جب "حیاتِ جاوید" چھپی تو فوراً منگائی اور ختم کرکے چھوڑی۔

تمدنِ ہند کا ترجمہ کرنے سے پہلے چند صفحہ حیاتِ جاوید کے پڑھ لیتے پھر ترجمہ شروع کرتے۔ مولوی نذیر احمد صاحب کے ترجمہ قرآن کو بہت پسند کرتے اور وہی ترجمہ اپنے حوالوں میں لکھتے۔

شملہ میں مولوی سید احمد مؤلف فرہنگِ آصفیہ نے اپنی کتاب "ارمغانِ دہلی" کے بعض حصے پیش کئے، مرحوم نے بہت پسند کئے اور سفارش کرکے پچاس روپے وظیفہ مقرر کرادیا۔ مولوی سید احمد موصوف پر ایک دفعہ کئی ہزار روپے کی ڈگری ہوئی، آپ نے فوراً روپیہ ان کے پاس بھجوا دیا۔

مولوی صاحب بڑے بامروت آدمی تھے۔ جب کبھی کسی دوست کا کام پڑتا، مقدور بھر کوشش کرتے۔ اگر کوئی دوست کچھ مانگتا تو کبھی انکار نہ کرتے، بڑے مہمان نواز تھے۔ عالموں کی مہمان نوازی سے ہمیشہ خوش ہوتے۔

مولوی صاحب اگرچہ شیعہ خاندان میں پیدا ہوئے تھے اور شیعہ تھے لیکن تعصب سے بالکل بری تھے۔ وہ شیعہ سنی جھگڑے کو پولٹیکل جھگڑا خیال کرتے تھے۔ ان کے نہایت وسیع کتب خانہ میں شیعہ مذہب کی کوئی کتاب نہ تھی۔ شیعہ کتب کے متعلق ان کا خیال تھا کہ وہ محض بیکار ہیں

اور ہرگز قابلِ استدلال نہیں۔

ایک مرتبہ مولوی سید علی کی کیمبرج یونی ورسٹی میں ایران کے ایک شیعہ عالم سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے پوچھا کہ "تم حضرت عمر رضؓ سے کیوں عداوت رکھتے ہو؟" ایرانی نے کہا: "ہم حضرت علی رضؓ کی پیروی کرتے ہیں۔" اِس پر مولوی صاحب نے کہا کہ: "حضرت عمر رضؓ اور حضرت علی رضؓ میں تو کوئی عداوت نہ تھی، اگر عداوت ہوتی تو اپنی بیٹی امّ کلثوم کا نکاح حضرت عمر رضؓ سے کبھی نہ کرتے۔" ایرانی نے تعجب سے پوچھا کہ: "اِس واقعہ کی تصدیق کی آپ کے پاس کیا دلیل ہے؟" مرحوم نے اپنے کتب خانہ سے "تاریخِ یعقوبی مصنفہ ابن واضح کاتب عباسی جو شیعہ عالم تھا، لاکر دکھائی۔ ایرانی عالم اس واقعہ کو دیکھ کر تائب ہوا اور کہا۔ اَب کبھی میں حضرت عمر رضؓ کو بُرا نہ کہوں گا۔ اور تعجب کیا کہ ہمارے عالم اِس واقعہ کو کیوں چھپاتے ہیں۔

جب آپ سے آل انڈیا شیعہ کانفرنس کی صدارت قبول کرنے کو کہا گیا۔ تو آپ نے انکار فرمایا اور کہا کہ میں سلمہ ہجری کا شیعہ ہوں اِس قسم کی کانفرنس کو ہرگز پسند نہیں کرتا جب کہ آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس موجود ہے۔

مولوی صاحب صحیح بخاری اور ہدایہ کے بڑے مدّاح تھے اور کہتے تھے یہ عربی سیکھنے کے لئے بہترین کتابیں ہیں۔

مولوی صاحب غیر متعصب اور وسیع المشرب تھے لیکن غیرت و حمیّتِ قومی ان میں بہت تھی اور مولویوں کی جاہلانہ اور متعصب باتوں سے بڑے خفا ہوتے تھے۔ ہندوستان کے مروجہ پردہ کو بھی پسند نہیں کرتے تھے اور تعدّدِ زوجات کے حامیوں کو بھی اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ ان کے

مزاج میں مزاح بھی بہت تھا۔ ایک مرتبہ مولوی محمد سورتی نے جو عربی کے بڑے عالم اور قدیم کتابوں کے شوقین تھے، ان سے ایک کتاب نقل کرنے کے لئے مانگی۔ کتاب نادر تھی، دینا نہ چاہتے تھے۔ مگر مروت کے سبب سے انکار کرنا بھی مشکل تھا۔ کتاب نکال کر لائے اور مولوی سورتی صاحب کے ہاتھ میں دیدی، لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ "مولوی صاحب یہ خیال رہے کہ کتاب تو بے شک نہایت عمدہ ہے مگر اس کی جلد سور کے چمڑے کی ہے۔" مولوی صاحب نے یہ سنتے ہی فوراً لاحول ولا قوۃ کہہ کر کتاب وہیں میز پر پٹک دی۔

مولوی سید علی صاحب نے انگلستان میں ایک مدت گذاری تھی لیکن انگریزی تہذیب و اخلاق کو بہت برا سمجھتے تھے۔ انگریزوں کے متعلق ان کی رائے تھی کہ انھیں روپیہ کھانا اور صرف کرنا آتا ہے۔ ان کے متعلق اچھی رائے نہ رکھتے تھے۔

اخیر زمانہ میں انھیں حیدرآباد چھوڑنا پڑا جس کا انھیں بڑا قلق تھا۔ اُنھوں نے ہردوئی میں سکونت اختیار کی۔ لیکن جب وہاں سے علی گڈھ آنے جانے لگے اور مسلم یونیورسٹی کے کاموں میں دلچسپیاں لینے لگے تو پھر اُن کی آنکھیں کھلیں اور معلوم ہوا کہ کام کا وقت اب آیا ہے۔ چنانچہ یونیورسٹی کا نسٹیٹیوشن مرتب کرنے میں انھوں نے بڑا حصہ لیا۔

آخر ہردوئی میں دفعۃً قلب کی حرکت بند ہو جانے سے ۳ مئی سنہ ۱۹۱۱ء (مطابق سنہ ۱۳۲۹ھ) کو انتقال کیا۔ نیازمند راقم نے قرآن مجید کی آیت سے تاریخ نکالی: إِنَّ أَصْحَابَ الْجَنَّةِ الْيَوْمَ فِي شُغُلٍ فَاكِهُونَ ؕ (سورۂ یٰسین) ۱۹۱۱ء اس

آیۂ کریمہ میں قرآن کا املا اَصۡحٰب اور فَکِهُوۡنَ ہے۔ میں نے دونوں جگہ الف لکھ کر اعداد نکالے ہیں۔

اَدبی خدمات

مولوی سید علی صاحب کی قلمی خدمت صرف ترجمہ کی صورت میں ہے اور وہ بھی صرف دو کتابوں کا شائع و مشہور ہوا: "تمدنِ عرب" اور "تمدنِ ہند" لیکن صرف ایک تمدنِ عرب کے ترجمہ نے ان کو امتیازی جگہ دلوادی۔ فرنچ مورخ و عالم لی بان کی کتاب اپنے زمانے میں بہترین مکمل و مستند تصنیف تھی۔ سید صاحب نے اُس کا ترجمہ بھی بہت اچھا کیا، اور تمدنِ عرب کو جیسے حُسنِ طباعت کے ساتھ باتصویر شائع کیا، وہ بھی "اردو چھپائی" میں شاید پہلی چیز تھی۔ پہلی بار سنہ ۱۸۹۸ء میں طبع ہوئی۔ پچاس روپے فی جلد قیمت تھی۔ مصنف کی زندگی ہی میں پہلی اشاعت ختم ہوگئی۔ اور ۲۵ برس تک دوبارہ طبع نہ ہوسکی۔ اب چند سال ہوئے سلطان العلوم نظام دکن کے "جشنِ سیمیں" (۲۵ سالہ مسند نشینی) کے موقع پر شائع ہوئی ہے۔

سید صاحب کی جن کتابوں کا پہلے ذکر آچکا ہے، ان کے علاوہ بعض رسالوں میں انھوں نے مضامین بھی لکھے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے انھوں نے ویدک لٹریچر اور فنِ طب وغیرہ کے متعلق سلسلۂ مضامین جاری رکھنے کا ارادہ کیا تھا۔ لیکن طبیعت کے عدمِ استقلال کی وجہ سے ایک ایک دو دو مضمون لکھ کر رہ گئے۔

تصانیف مولوی سید علی کے نمونے

(۱) تمدنِ عرب کا مختصر نمونہ یہ ہے:

" ہارون رشید کے عہد میں عربوں کا تمدن: جس کے زمانہ

کی تصویر ہمیں "الف لیلہ" میں نظر آتی ہے (۷۸۶ تا ۸۰۹ء) اور اُس
کے بیٹے مامون کا وہ زمانہ (۸۱۳ تا ۸۳۳ء) جس میں بغداد نے اعلےٰ
سے اعلےٰ ترقی اور سرسبزی حاصل کی اور مشرق کے تمام شہروں
میں سب سے نامآور بن گیا۔ اس وقت ہارون الرشید کا نام کُل
رُبعِ مسکون میں مشہور ہو گیا تھا۔ چین و تاتار و ہندوستان
سے سفیر اس کے پاس آتے تھے اور شارل مَین شہنشاہِ فرانس
نے بھی جو حقیقت میں تمام یورپ کا مالک تھا اور جس کا ملک
بحرِ اٹلانٹک سے دریائے ایلپ تک وسیع تھا۔ لیکن فی الواقع
جس کی حکومت وحشیوں کی سی حکومت تھی ہارون الرشید
کے پاس سفیر بھیجے اور نہایت ادب سے خواہش کی کہ زائرینِ
بیت المقدس کی حفاظت کا بندوبست کیا جائے۔ خلیفہ نے
اس درخواست کو قبول کیا اور سفیروں کو بیش بہا تحائف
دے کر رخصت کیا۔ منجملہ اِن تحائف کے ایک ہاتھی تھا جس
کی جھول بہت ہی بیش قیمت تھی اور یہ جانور اس سے پہلے کبھی
یورپ میں نہیں آیا تھا۔ علاوہ اس کے موتی جواہرات۔ ہاتھی
دانت لوبان اور ریشمی انواع اقسام کے کپڑے تھے اور اِن
سب پر مافوق ایک گھڑی تھی جو وقت بتاتی تھی اور گھنٹوں
پر بجتی تھی۔ اس گھڑی نے شارل مَین اور اُس کے نیم وحشی
مصاحبین کو جن کے ذریعہ سے وہ بے چارہ بے فائدہ تمدنِ روما
کی تجدید کی کوشش کر رہا تھا۔ نہایت چکر میں ڈالا۔ اس
کے دربار میں کوئی شخص بھی اس لائق نہ تھا جو اِس گھڑی

کے کھیل کا نٹے کو سمجھ سکتا........

ملک کا مالی انتظام نہایت ہی باقاعدہ تھا۔ آمدنی کے ذرائع حسب ذیل تھے:

اوّل: ذاتی اور شخصی محصول۔

دوم: خفیف سا محصول مقبوضہ زمینوں پر۔

سوم: چنگی کا محصول۔

چہارم: غیر مزروعہ اراضی کا محصول۔

پنجم: معدنیات کا محصول۔

مورخینِ عرب نے لکھا ہے کہ خلافت کی مجموعی سالانہ آمدنی تقریباً دس کروڑ روپے تھی جو اس زمانے کے لیے بہت ہی خطیر رقم تھی۔

اِس مال گذاری کی نگرانی ایک مجلسِ وزرا کے سپرد تھی جسے "دیوان" کہتے تھے۔

ابن خلدون لکھتا ہے کہ: "انتظامِ مال گذاری کا دیوان اِس غرض سے قائم کیا گیا ہے کہ آمدنی کی نگرانی اور بادشاہی حقوق کی حفاظت کرے اور مداخل و مخارج میں تناسب قائم رکھے اور فوج کی تعداد اور اس کی تنخواہ مقرر کرے، اس دیوان میں بہت ہی لائق محاسب رکھے جاتے ہیں اور انھیں منشیانِ دیوان کہتے ہیں۔ دیوان کے لفظ کا اطلاق اس عمارت پر بھی ہے جس میں وزرا جمع ہوتے ہیں۔

ملک کا انتظام چار صیغوں میں منقسم تھا جو فی الواقع ہماری موجودہ وزارتوں سے مطابقت رکھتے ہیں۔ اوّل صیغۂ حرب، دوم صیغۂ مال گذاری، جس کا کام محصولات کا قرار دینا تھا سوم صیغۂ شخصی، جو محصولات کے وصول کرنے والوں کو مقرر کیا کرتا تھا۔ چہارم صیغۂ انتظامی، جس کا کام مداخل مخارج کی نگرانی کرتا تھا۔ خلیفہ کے کُل احکام لکھے جاتے تھے اور اس غرض سے دفتر میں رکھے جاتے تھے کہ خلفائے مابعد اُن کی طرف بآسانی رجوع کر سکیں۔ اِس ساری کل کی کنجی ایک وزیر کے ہاتھ میں رہتی تھی جو بطور مدار المہام ہوا کرتا تھا اور اکثر خلفا کُل اموراتِ ملکی کو اسی کے اختیار میں چھوڑ دیا کرتے تھے۔

شہروں کی کوتوالی کا انتظام ویسی ہی عمدگی کے ساتھ تھا جیسا ڈاک اور مداخل و مخارج کا۔ تاجروں کی مجلسیں قائم کردی گئی تھیں، جن کا فرض یہ تھا کہ معاملاتِ تجارتی کی جانچ اور فریب و دغا بازی کا انسداد کریں۔

خلفائے عباسیہ کے مداخل و مخارج کے انتظام نے اُنھیں بہت بڑے بڑے رفاہِ عام کے کام کرنے کا موقع دیا تھا۔ ملک میں سڑکیں بن گئی تھیں اور کارواں سرائیں مساجد، شفاخانے اور مدارس ہر طرف علی الخصوص بغداد و بصرہ و موصل میں بکثرت قائم ہو گئے تھے۔

کاشتکاری اور حرفت نے بھی بڑی ترقی کی تھی، شیراز اور اصفہان کی شرابوں نے بڑی شہرت حاصل

کی تھی اور دُور دُور تک جاتی تھیں باریک اور عمدہ کپڑوں کے کارخانے موصل اور حلب و دمشق میں قائم تھے۔ نمک۔ گندھک۔ سنگِ مرمر لوہے اور سیسے کی کانیں بہت ہی باقاعدہ طور پر کھودی جاتی تھیں۔ اور اُن کی پیداوار مصرف میں آتی تھی تعلیم عام کا صیغہ بھی ایک بہت وسیع اصول پر قائم ہوا تھا۔ تمام حصۂ عالم سے مشہور فضلا۔ اور اساتذہ بُلائے گئے تھے۔ علمِ ہیئت کی اس درجہ ترقی ہوئی تھی کہ وہ کام جس کو یورپ کی اقوام نے بالکل زمانۂ حال میں کیا ہے اُس وقت ہوچکا تھا یعنی دائرۂ نصف النہار کے ایک قوس کی پیمائش کی جا چکی تھی قدمائے یونان و روم کا کلام علی الخصوص وہ کلام جو فلسفہ اور ریاضیات سے متعلق تھا ترجمہ ہوچکا تھا اور کُل مدارس میں پڑھایا جاتا تھا۔ زمانۂ قدیم کی تحقیقات بھی جو یورپ میں کئی صدی بعد شروع ہوئی عربوں میں عام طور سے جاری تھی۔"

(۲) تمدّنِ ہند:

یونانیوں کے تعلقات ہند سے	ہند کے تعلقات یونانیوں

کے ساتھ بلخ کی یونانی حکومتوں کے ذریعہ سے مدت تک باقی رہے، جیسا کہ مگستھنیز کی سفارت سے ثابت ہوتا ہے۔ اِس یونانی سفیر کو سلوکس نیکوٹار شام کے حاکم نے تقریباً تین سو سال قبلِ مسیح پاٹلی پتر کو بھیجا تھا اور یہ پہلا موقعہ تھا جب کہ یورپیوں نے ہند کے اندرونی

حصّے میں نفوذ کیا۔ اس زمانے کی تاریخ کے لئے صرف ہمارے
پاس اسی یونانی سفیر کے بیانات رہ گئے ہیں، ظاہرا ایسا معلوم
ہوتا ہے کہ میگستھنیز کی سفارت سے سیلوکس کی غرض یہ تھی کہ
عربوں نے جو تجارت یورپ سے قائم کی ہے، اس کا راستہ
بدل کر بلورہ اور انطاکیہ سے ہوکر مصر کو کر دیا جائے۔ یہ وہ
تجارت تھی جس نے مصر کے خاندان بطلیموس کو دولت مند
بنا دیا تھا اور آگے چل کر قاہرہ کے خلفائے اسلام نے بھی
اسی تجارت کی بدولت بہت کچھ مال و دولت حاصل کیا
بلخ کی یونانی حکومت کے تعلقات ہندوستان کے ساتھ
مدت تک قائم رہے جیسا کہ ہمیں شمال و مشرقِ ہند کی
عمارات کے مطالعہ سے معلوم ہوگا۔

جہاز کا براہِ راست ہندوستان کو پہنچنا | ۳۰ سنہ قبل مسیح
میں جس وقت مصر حکومت روما کا ایک صوبہ ہو گیا، شہنشاہ آگسٹس
نے اس خیال سے کہ عرب جو مصالح وغیرہ لاتے ہیں اور جس کو
فی الواقع وہ ہند سے لایا کرتے تھے، خود اُن کے ملک کی
پیداوار ہے، ایک فوج کشی عربستان پر کی، لیکن کامیاب
نہ ہوا۔ شاہنشاہ کلاڈیس کے وقت میں حسب اتفاق
مخالف ہواؤں نے ایک جہاز کو جزیرۂ سیلون کے کنارے
جا پھینکا اور اس وقت یہ بات معلوم ہوئی کہ بعوض کنارے
کنارے جانے کے جہاز بخوبی براہِ راست ہند کو آسکتے
ہیں۔ اس کے بعد رومی تجار مصر سے براہِ راست گویا

یا کیالیکٹ یا میانگلور کو آنے لگے، اور پلینی لکھتا ہے کہ
اِس سفر میں صرف دو مہینے دس دن لگتے تھے۔ اس زمانے کے
ایک تاجر نے اپنا سفرنامہ لکھا جس کا نام ایرتھرین سمندر کا پیریپلس
تھا۔ یہ کتاب آرین کے پیریپلس کے نام سے مشہور ہوئی اور
اس میں بہت سی جغرافی اطلاعات پائی جاتی ہیں۔

بطلیموس کا جغرافیہ | بطلیموس کا جغرافیہ سے ہمیں
قدیم اقوام کی ان اطلاعات کا اندازہ ہو سکتا ہے، جو
انھوں نے ہند کے متعلق حاصل کی تھیں، یہ اطلاعات
نہایت ہی ناقص اور زیادہ تر ساحل کے بیانات پر
محدود ہیں۔

عرب اور چینی سیاح | سلطنتِ رُوما کے زمانۂ انحطاط
میں ہندوستان سے تعلقات اور بھی کم ہو گئے تھے اور
بالآخر جس وقت عربوں نے خلفائے راشدین کے زمانہ میں
سلطنتِ بزنطیہ کو فتح کر لیا تو ان تعلقات کا خاتمہ ہو گیا
مسلمانوں نے ایک ہزار سال تک اقوامِ نصاریٰ کے راستہ
ہندوستان کی طرف بند رکھا اور اس زمانے کے حالات
ہمیں صرف عرب سیاحوں کے بیانات سے معلوم ہوتے ہیں
مسعودی دسویں صدی عیسوی میں ہندوستان آیا اور
ابن بطوطہ تقریباً ۱۳۳۰ء میں، لیکن ان عرب سیاحوں
سے بہت پہلے بدھ مذہب کے چینی زوّار اس ملک میں
آچکے تھے اور ہیون تسانگ کا سفرنامہ ہمارے لئے بیش

بڑا ذخیرہ اس زمانے کی معلومات کا ہے۔

(۳) تاریخ عرب اس کے ترجمہ کا پہلے ذکر آچکا ہے کہ جب سید صاحب کو علم ہوا کہ موسیو سدیو کی اس تاریخ کا ترجمہ عربی زبان میں ہوگیا ہے، تو انھوں نے اپنے اردو ترجمہ کو چھپوانے کا خیال چھوڑ دیا۔ لیکن شیخ عبد القادر صاحب بیرسٹر اڈیٹر "مخزن" لاہور کی فرمائش سے رسالہ میں شائع کرنے کے لئے اپنا ترجمہ لندن سے بھیجنا شروع کیا تھا۔ لیکن اس کی بھی تکمیل نہ ہوسکی۔

اگست ۱۹۰۷ء کے "مخزن" سے چند سطریں نقل کی جاتی ہیں:

"عربوں نے اپنے آباؤ اجداد کی قدیم رسوم درواج کو قائم رکھا ہے۔ ان میں اوصافِ اضداد جمع ہیں وہ خونخوار بھی ہیں اور غایت درجہ فرماں بردار بھی۔ وہمی ہیں اور مغرور بھی اور انہیں پوچ اعتقادات اور کہانیوں سے بے انتہا شوق ہے۔ وہ گویا سدا جوان ہیں اور جب کوئی نیا خیال ان کے ذہن میں بیٹھ جاتا ہے تو ان میں بڑے بڑے کام کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے ایک طرف تو وہ آزاد اور فیاض ہیں اور دوسری طرف مغلوب الغضب اور بیباکی سے بھرے ہوتے۔ خاندانِ تیمیا طیقی کے کل اوصاف اور کل معائب اس ایک عرب میں موجود ہیں اپنی کل مایحتاج کو مہیا کرنے کی ضرورت نے اُسے پھرتیلا اور چالاک بنایا۔ ہر قسم کی تکالیف کو برداشت کرنے کی مجبوری نے اسے صبر دیا، آزادی کا وہ اس وجہ سے عاشق ہے کہ یہی ایک نعمت ہے جو اس کے حصہ میں آئی ہے۔ اور چونکہ

اُسے ہر قسم کے تحکم سے نفرت ہے، اس لئے لڑ پڑنا اُس کی فطرت کا جزو ہو گیا ہے، خود اپنے اوپر سختی کی عادت نے اُسے دوسروں کے لئے بے رحم بنا دیا ہے اور اس میں انتقام کی خواہش پیدا کر دی ہے۔

ملک اور خیالات کے متحد ہونے نے کُل قوم میں ایک ہی معیارِ عزتِ و آبرو قائم کر دیا ہے۔ اُس کی ساری نام آوری تلوار اور مہمان نوازی اور فصاحت ہے۔ تلوار تو اپنے حقوق حاصل کرنے کی ضمانت ہے اور مہمان نوازی ان کے لئے سارے قانون انسانیت کا لبِ لباب اور تحریر اور کتاب کی جگہ پر فصاحت ان تمام باہمی نااتفاقیوں کو ختم کرنے والی چیز ہے جس کا فیصلہ ہتھیار سے نہیں ہو سکتا ہے۔"

(۴) ویدک لٹریچر: سید صاحب کی یہ یادگار بھی شیخ عبدالقادر صاحب کی وساطت سے باقی ہے۔ یہ مضمون مولوی سید علی صاحب نے اڈیٹر مخزن کی استدعا پر لکھا تھا اور کیمبرج سے "مخزن" کے لئے بھیجا تھا۔ ستمبر ۱۹۰۵ء کے پرچے سے تھوڑا سا نمونہ دیا جاتا ہے:

"اگرچہ رگ وید کا بہت بڑا حصہ عبادت اور خدا کی ستائش سے بھرا ہوا ہے لیکن بعض بھجن ایسے ہیں کہ جن سے تاریخی واقعات اور قدیم آریاؤں کی تمدنی حالت کا استنباط ہو سکتا ہے۔ مثلاً ندیوں کا جو بھجن ہے، اُس سے آریہ لوگوں کا وسط ایشیا سے بتدریج پنجاب میں آنا معلوم ہوتا ہے اسی طرح دسویں کتاب کے بھجن نمبر نوّے میں جس کا نام

"پرش سوکت" ہے۔ چاروں ذاتوں کا یعنی برہمن، کھتری، ویش، شودر کا علیحدہ ہونا معلوم ہوتا ہے۔ اسی طرح شادی اور موت کے متعلق بھجن ہیں۔ غرض جدید تحقیقات سے نتیجہ یہی پیدا ہوتا ہے کہ رگ وید نہ صرف ہندوؤں کی بلکہ کل طبقہ آریہ کی، جس میں ایران اور یورپ کی بہت سی اقوام شامل ہیں، سب سے قدیم کتاب ہے۔

رگ وید کی زبان کی نسبت ایک امر اور بھی نہایت تعجب انگیز ہے۔ یعنی یہ زبان اشد درجے میں ژند وستا کی زبان سے مشابہ ہے۔ یہ اس درجے تک ہے کہ محض چند حروف کے تغیر اور تبدل سے رگ وید کے بعض بھجنوں کو ژند وستا زبان میں اور ژند وستا کے بھجنوں کو قدیم سنسکرت میں تبدیل کر سکتے ہیں اور اس وقت جرمنی کے مدارس میں جہاں وید کی تعلیم اعلےٰ درجہ پر ہے۔ رگ وید اور ژند وستا کا سبق ساتھ ساتھ ہوتا ہے۔

(۵) طلسم اعضائے انسانی | مولوی سید علی صاحب کا یہ مضمون پہلی مرتبہ رسالہ حسن حیدر آباد میں ۱۸۸۸ء میں شائع ہوا تھا۔ پھر ۲۰ برس بعد ۱۹۰۸ء میں اڈیٹر مخزن نے سید صاحب کی نظر ثانی کے بعد شائع کیا۔ یہ مضمون ترجمہ نہیں بلکہ تالیف اور آزاد عبارت ہے۔ اس کا اسلوب اور زبان اس قدر خوبصورت اور دلکش ہے کہ "تمدن" اور "تاریخ" کی عبارتیں اس کو نہیں پہنچتیں۔ وہاں باوجود ترجمہ کی خوبی کے کہیں نہ کہیں معلوم ہو جاتا ہے کہ "ترجمہ" ہے۔ لیکن یہاں ایسی اردو ہے کہ اس

سے بہتر مشکل سے لکھی جا سکتی ہے۔ سید صاحب فزیالوجی (خواص الاعضا) کی پوری کتاب اسی انداز سے لکھ دیتے تو عجیب چیز نکلتی۔ نمونہ یہ ہے:

"اَلْعِلْمُ[1] عِلْمَانِ عِلْمُ الْاَبْدَانِ وَعِلْمُ الْاَدْیَانِ

اگر اس حدیث کے مضمون کو ایک لفظ میں بیان کیا چاہیں تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ اَلْعِلْمُ عِلْمُ الْاِنْسَانِ کیونکہ جس طرح علم الابدان میں انسان کی صورتِ ظاہری اور محسوساتِ جسمانی سے بحث کی جاتی ہے اسی طرح علم الادیان میں انسان کے محسوسات و کیفیاتِ روحانی سے بحث ہوتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اوّلیت اور اوّلویت دونوں میں علم الابدان کو علم الادیان پر فوقیت ہے۔ کیونکہ اوّل محسوسات جن کا ادراک انسان کو ہوا وہ محسوساتِ جسمانی ہی تھے اور انھیں محسوسات کے ذریعے سے انسان کو اس حکیمِ مطلق کا پتہ لگا۔ ہر ایک عضو اور ہر بُن مُو ہمارا جس کی قدرتِ تامّہ کا نمونہ ہے۔ اس کے بعد علم الادیان کی نیو پڑی۔ غرض علم الانسان عجیب جامع علم ہے جس کے مطالعہ اور تحقیق میں تمامی دُنیوی و اُخروی فوائد مجتمع ہو گئے ہیں۔

علم الانسان کے بے انتہا شعبے ہیں، بلکہ ایسا کم کوئی علم ہوگا جس کو انسان سے تعلق نہ ہو، کیونکہ اکثر علوم کی بنا خود انسان کی ذاتی ضروریات کی وجہ سے پڑی ہے

---

[1] علم دو ہیں، علم طب اور علم دین (ابدان، بدن کی جمع۔ ادیان، دین کی جمع)۔

اس تحریر میں صرف علم الحیات کے کچھ مسائل بیان کئے جائیں
گے جو علم الانسان کا ایک شعبہ ہے۔ علم الحیات وہ علم ہے،
جس میں اعضائے انسانی کے افعال سے بحث ہے اور چونکہ
یہ افعال حد درجہ تعجب خیز اور حیرت انگیز ہیں۔ اس تحریر کا نام
طلسمِ اعضائے انسانی رکھا گیا۔........

جسمِ انسانی کی تشریح کرتے وقت پہلا جزوِ بدن جو چاقو
کے نیچے آتا ہے جلد ہے۔ ظاہرا جلد ایک چیز ہے لیکن
اُس کی دُو تہیں ہیں۔ اوپر والی تہہ سانپ کی کینچلی کی طرح
ہمیشہ خشک ہو کر گرتی رہتی ہے۔ اس کو عربی میں بشرہ کہتے
ہیں۔ نیچے والی تہہ جلد حقیقی ہے اور سارا حِس اسی میں ہے
اور اس میں سیکڑوں باریک عروق ہیں جن کو ادنےٰ سا
صدمہ پہنچتے ہی خون نکل آتا ہے۔ جلد کی دونوں تہوں
کی تفریق حجامت میں خوب معلوم ہوتی ہے۔ جب تک
اُسترہ بشرہ کو چھیل رہا ہے کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوتی
لیکن جہاں ہاتھ ذرا بھی بہکا، نیچے کی تہہ کو خبر ہو جاتی ہے
اور خون نکل آتا ہے۔ جب کبھی ہاتھ زور سے چھل جاتا ہے
تو یہ دونوں تہیں الگ الگ دکھائی دینے لگتی ہیں، اور
حمام جانے والوں کے جسم سے جو بتیاں مَیل کی نکلتی
ہیں وہ بھی اوپر کی کینچلی ہے۔

علامہ شبلی نعمانی

"غدرِ[۵۱] ہندی" کے زمانہ ۱۸۵۷ء میں ضلع اعظم گڈھ کے ایک گاؤں بندول میں پیدا ہوئے۔ علامہ محمد شبلی نعمانی کے والد شیخ حبیب اللہ اعظم گڈھ میں وکیل تھے۔ خاندان عزت و جاہ اور علم و دینداری میں ممتاز تھا۔ علامہ نے ابتدائی تعلیم اعظم گڈھ میں مولوی شکر اللہ سے حاصل کی۔ پھر غازی پور جا کر مولانا محمد فاروق صاحب چریا کوٹی سے فیضِ تعلیم حاصل کیا۔ مولانا فاروق صاحب وہاں مدرسۂ چشمۂ رحمت میں صدر مدرس تھے اور علومِ عقلیہ و ادبیاتِ عربی و فارسی کے فاضلِ اجل تھے۔ استاد کو اس شاگرد سے اس قدر انس ہو گیا کہ وہ اپنے آپ کو "عرین دانش کا شیر" اور شاگرد کو بچۂ شیر" کہتے تھے، اور سجع کہا تھا[۵۲] "اَنَا اَسَدٌ وَ اَنتَ شِبلی"۔

شوقِ تعلیم اور تبحرِ علمی

مولانا فاروق کے چشمۂ علم سے سیراب ہو کر علامہ شبلی نے تکمیلِ علوم کے لئے دور دراز سفر کرنے شروع کئے۔ وہ خود فرماتے تھے کہ "میں اس خصوصیت میں منفرد تھا کہ ہر فن مثلاً ادب، منطق، حدیث، اصولِ فقہ کے لئے انہی علما کے پاس سفر کر کے گیا، جو اُن علوم میں تمام ہندوستان میں ممتاز تھے" چنانچہ غازی پور و اعظم گڈھ میں مولانا فاروق سے منطق و فلسفہ

---

[۵۱] یہ مادۂ تاریخ مرزا غالب نے نکالا تھا غدر کا سنہ ہجری ۱۲۷۳ نکلتا ہے۔ سنہ عیسوی کی یہ تاریخ ہے: "غدر ناگاہ ہندوستان" ۱۸۵۷ء۔

[۵۲] "میں شیر ہوں اور تو بچۂ شیر ہے" شِبل (بالکسر) بچۂ شیر کو کہتے ہیں۔ مولانا فاروق زمانی صفحہ ۹؛ ۷؛

کی تکمیل کے بعد رام پور گئے۔ اور مولانا ارشاد حسین صاحب مجددی رحمۃ اللہ علیہ سے فقہ کی اعلیٰ کتابیں پڑھیں۔ علم فقہ میں ان کے فضل و کمال کے بڑے مداح تھے۔ رام پور سے لاہور پہنچے، وہاں مولانا فیض الحسن صاحب سہارنپوری اورینٹل کالج میں ادبیات عربی کے پروفیسر تھے، اپنے زمانہ کے بہترین فاضل و نقاد تھے اور عربی شاعری کے صحیح مذاق اور نکتہ سنجی میں یکتا تھے۔ علامہ شبلی نے چھ مہینے ان کی صحبت میں رہ کر "حماسہ" پڑھا۔ مولانا کو فرصت نہ ہوتی تو کالج کے راستے میں آتے جاتے پڑھا دیتے۔ لاہور سے سہارنپور کا سفر کیا اور مولانا احمد علی صاحب محدث سے حدیث پڑھی۔ ان کے اخلاق و سادگی طبع اور اتباع سلف کی بڑی تعریف کرتے تھے۔

علامہ شبلی نے عربی سے پہلے فارسی پڑھی تھی۔ اکثر فارسی میں خطوط لکھتے تھے فکر رسا اور ذوق سلیم فطری رکھتے تھے۔ ابتداء سے شعر و شاعری کا شوق تھا۔ پھر مولانا محمد فاروق اور مولانا فیض الحسن جیسے ادیب و نقاد استاد ملے۔ ان کے اساتذہ میں یہ دونوں بزرگ شاعر بھی تھے۔ مولانا فیض الحسن بڑے صاحب ذوق، زندہ دل، بذلہ سنج، ظریف طبع تھے۔ سخن فہمی و نکتہ سنجی میں اپنا نظیر نہ رکھتے تھے۔ عربی، فارسی، اردو تینوں زبانوں کے شاعر تھے۔ قصائد عربی شائع ہو چکے ہیں۔ اردو میں غزلوں اور نعتیہ[۱] قصائد کے علاوہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۷۱۰) صاحب کے فقرہ میں شبلی کے معنی ہیں "میرا بچہ" اور حضرت شیخ ابوبکر شبلی رحمۃ اللہ علیہ کے نام میں دجی کے نام پر مولانا شبلی کا نام رکھا گیا تھا) شبلی ان کے وطن آبائی موضع قصبہ سے منسوب ہے۔

[۱] مولانا فیض الحسن صاحب کے ایک قصیدۂ نعتیہ کے دو تین شعر مجھے زبانی یاد ہیں۔ وہی نمونہ کے لئے لکھتا ہوں پورا قصیدہ میرے پاس نہیں ہے۔ مولانا نے شہیدی کے مشہور قصیدہ کی زمین میں قافیہ بدل کر کہا ہے:

(باقی بر صفحہ ۷۲۰)

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۷۱۹):

تمنا ہے کہ ایک ایک بال کی سو سو بلائیں لوں ۔۔۔ جو نقشہ ہاتھ آجائے تری زلفِ معنبر کا

تمنا ہے کہ کانٹوں پر ترے صحرا کے جا لوٹوں ۔۔۔ رگِ مجنوں کو کچھ سودا ہوا ہے نوکِ نشتر کا

یہ جوشِ بیقراری ہے کہ مرغِ نیم بسمل بھی ۔۔۔ یہ کہتا ہے چلو دیکھیں تماشا فیضِ مضطر کا۔

۵۱ مثنوی "صبحِ عید" مولانا فیض الحسن صاحب کی وفات کے بعد ۱۸۹۲ء میں لاہور میں چھپی ہے۔ تقریباً ۶۰۰ سو شعر ہیں۔ ایک داستانِ عشق نظم کی ہے۔ قصہ کچھ نہیں لیکن نظم کے اکثر حصے بہت لطیف ہیں۔ ایک بھولی ہوئی چیز کی یاد باقی رکھنے کے لئے چند شعر درج کئے جاتے ہیں، مثنوی کو "تعریفِ عشق" سے شروع کرتے ہیں:

عشق کیا اک بلا ہے آفت ہے ۔۔۔ شور ہنگامہ قیامت ہے

ننگ و ناموس کو سیاہ کرے ۔۔۔ زہد و سالوس کو تباہ کرے

یہ کسی کو جیتے جی نہ لگے ۔۔۔ دوست کیا دشمنوں کو بھی نہ لگے

مختصر یہ کہ ہے یہ وہ جو کھٹ ۔۔۔ گھر کے گھر ہو گئے جہاں چوپٹ

عشق عاشق ہے اپنی چالوں کا ۔۔۔ اس کو کیا درد پائمالوں کا

درد ہے پر دوا ہے دردوں کی ۔۔۔ عشق قلت ہے شیر مردوں کی

دیکھ کر عشق کے نئے دھندے ۔۔۔ جی چراتے ہیں جین کے بندے

عشق ہے اک بلائے شور انگیز ۔۔۔ خانماں سوز و خانہ برہم ریز

اس کا مصداق ہے یہ افسانہ ۔۔۔ جس کا سامع ہو سن کے دیوانہ

گرم ہوں شورشوں کے ہنگامے ۔۔۔ چاک ہوں جیب کس طرح جامے

کیوں نہ ہو یہ مری زبانی ہے ۔۔۔ گو یہ خود ہی غضب کہانی ہے

میں ہوں اک سینہ ریش تفتہ درون ۔۔۔ سر بسر جوشِ عشق و شورِ جنوں

(باقی بر صفحہ ۷۲۱)

"تحفۂ صدیقیہ" "روضۃ الفیض" ان کے علم وفضل کی یادگاریں ہیں۔ ۱۸۸۶ء یا ۱۳۰۴ھ
میں وفات پائی۔ لائق شاگرد شبلی نے مرثیہ کہا۔ جس کے دو تین شعر یہ ہیں:

بہ تحسین صبوری چند لفریبی مرا ناصح	دمے بگذار، تا در ماتم فیض الحسن گریم
بمرگش علم وفن در نالہ با من ہمنوا باشد	ہنر بر خویشتن گرید، چو من بے خویشتن گریم
دو تا غم دارم و ہر یک ز دیگر حسرت افزا تر	بمرگش گریم و آنگاہ بر مرگ سخن گریم

اسی کم عمری و نوجوانی کے زمانے میں ان بزرگوں کی صحبت نے علامہ شبلی کے اندر وہ ذوق اور وہ نظر پیدا کردی جس نے ان کو اپنے زمانے کا بہترین نقاد و سخن سنج بنا دیا۔

(بقیہ صفحہ ۲۰) گرم ہوں شورشوں کے ہنگامے	چاک ہوں جیب کی طرح جامے
میں ہوں اک سینہ ریش نغمہ درد	سر بسر جوشِ عشق و شورِ جنوں
دل یہاں درد کا ٹھکانا ہے	سینہ یاں نشتروں کا خانہ ہے
ہیں یہ سب درد کی کراماتیں	ورنہ کس کو نصیب یہ باتیں

داستان کے چند شعر یہ ہیں:

یہی دو چار رہ گئے باقی	شیشہ و جام و مطرب و ساقی
کہ یکایک بتانِ گل رخسار	آگئے سامنے سے مثلِ بہار
ہوگیا حسنِ تازہ محوِ ظہور	بام و در سے لگا برسنے نور
روشنی سے ہوئی نظر خیرہ	نور سے ہوگیا مکاں تیرہ
یاں تو بیٹھے نکالے دمِ پھول	واں گلوں کی وہ شِ زمول نہ تول
گورے گورے وہ پھول سے چہرے	پھول کانوں کے پھولوں کے سہرے
ایک تو سب کے پھول سے بر و دوش	اس پہ پھولوں کی مار تا بُن گوش
بسکہ اپنی بہار پاتے تھے	پھول پھولے نہیں سماتے تھے

سفرِ حجاز

علامہ شبلی کی ۱۹ برس کی عمر تھی کہ ۱۸۷۶ء میں انھوں نے اپنے بعض اعزہ کے ساتھ حرمین شریفین کا سفر کیا۔ حج کے بعد مدینہ طیبہ حاضر ہوئے اور بڑے ذوق و شوق کے ساتھ نعتیہ قصیدہ کہا۔ مدینہ منورہ میں کتب خانوں کی سیر کی۔ فرماتے تھے کہ فنونِ حدیث کا جو سامان وہاں نظر آیا کہیں پھر نہ دیکھا۔

شوقِ شعر و ادب اور شغفِ مذہبی

مولانا کی طالب علمی کا زمانہ سفرِ حجاز کے ساتھ ختم ہو گیا۔ وہاں سے آ کر کتب بینی اور شعر و ادب کا شغل شروع کر دیا۔ لکھنؤ کا مشہور ظریف اخبار "اودھ پنچ" اور طرحی غزلوں کا ماہوار گلدستہ "پیامِ یار" جاری تھا۔ مولانا بڑے شوق سے اُن کا مطالعہ کرتے اور خود بھی غزلیں کہتے تھے، مشاعرے منعقد کرتے تھے۔

مولانا کا دوسرا محبوب شغل غیر مقلدوں کی تردید تھی۔ حنفیت کا رنگ غالب تھا۔ ان کا قول تھا کہ "آدمی عیسائی ہو سکتا ہے، لیکن غیر مقلد نہیں ہو سکتا۔" اِس موضوع پر چند رسالے لکھے، جن میں سے عربی کا رسالہ "اسکات المعتدی" ہندوستان سے باہر بھی مقبول ہوا۔ جب مولانا سفرِ شام و عراق کے لئے گئے تو وہاں کے ایک عالم نے اسکات المعتدی کے مصنف کی مولانا شبلی کے سامنے تعریف کی۔ اس کو خبر نہ تھی کہ وہ مصنف یہی ہیں۔ مولانا کو اس "تحسینِ سخن شناس" سے بڑی مسرت ہوئی۔

اس زمانے میں علامہ شبلی مذہب کے نہایت پابند تھے۔ درس و تدریس کا شغل بھی جاری تھا۔ شاگردوں کو نماز کی سخت تاکید کرتے

تھے۔ بعض اوقات شاگردوں کو نماز نہ پڑھنے پر اور پابندی کا وعدہ لینے کے لئے دو دو گھنٹے مارا ہے۔

وکالت و ملازمت علامہ شبلی کے والد اور استاد مولانا فاروق صاحب وکیل تھے۔ والد نے ان سے بھی امتحانِ وکالت پاس کرنے کا اصرار کیا۔ علامہ بالطبع اِدھر متوجہ نہ تھے، کہنے سُننے سے امتحان پاس کیا اور وکالت شروع کی۔ لیکن ابتدا ہی میں اِس پیشہ کے کذب و افترا سے بددل ہو گئے۔ اس زمانہ کا ایک لطیفہ ہے کہ علامہ کے والد کے پاس کوئی ٹھاکر موکّل آیا۔ اُس نے اپنی لڑکی کی شادی کمسنی میں کردی تھی۔ داماد جوان ہو کر خسر کو پسند نہ آیا۔ اُدھر رخصتی کا تقاضا ہوا، اِدھر سے انکار کیا گیا۔ شوہر نے مقدمہ دائر کر دیا۔ ٹھاکر نے جوابدہی کے لئے علامہ شبلی کے والد کو وکیل کیا۔ انھوں نے اِن سے کہا کہ اِس کا جوابِ دعویٰ لکھ دو۔ مولانا ٹھاکر سے قصہ سُن کر بولے کہ جب تم اقرار کرتے ہو کہ لڑکی اس سے بیاہی جا چکی ہے تو اَب کیا ہو سکتا ہے، جاؤ لڑکی کو رخصت کر دو۔ وہ ہنستا وکیل صاحب کے پاس آیا۔ انھوں نے صاحبزادے سے فرمایا کہ "بس آپ وکیل بن چکے"۔ آخر انھوں نے خود مقدمہ لڑایا اور جیتا۔

علامہ شبلی نے بالآخر وکالت ترک کر دی اور "امین دیوانی" کی ملازمت اختیار کر لی۔ یہ دَورہ کا کام تھا۔ علامہ شدید گرمی میں روزہ کی حالت میں گھوڑے پر سوار گاؤں گاؤں پھرتے تھے۔ آخر یہ کام بھی مزاج کے موافق نہ نکلا۔ چھوڑ کر گھر بیٹھ رہے اور مضمون نگاری اور شاعری پھر شروع کر دی۔

علی گڑھ کالج کی پروفیسری علامہ کے چھوٹے بھائی مہدی مرحوم علیگڈھ

میں پڑھتے تھے۔ ۱۸۸۲ء میں یہ بھی وہاں گئے۔ سرسید سے ملے۔ باہم مبادلۂ خیال ہوا۔ دونوں ایک دوسرے کے گرویدہ ہو گئے۔ اتفاق سے وہاں پروفیسری خالی تھی۔ علامہ شبلی نے اپنے استاد مولانا فیض الحسن کی سفارش سے درخواست دی۔ سرسید نے فوراً چالیس روپے ماہوار تنخواہ پر اُن کو رکھ لیا۔ اس زمانے کا ذکر مولوی عبدالحلیم شرر لکھنوی اپنے ایک مضمون[1] میں کرتے ہیں:

"علی گڑھ میں سید صاحب نے انھیں اپنی کوٹھی کے احاطے کے اندر ایک چھوٹے سے مکان میں جگہ دی، جو سب سے الگ، بالکل باہمہ اور بے ہمہ تھا، اور ایک خاموش مقام تھا۔ ان میں جستجو و تحقیق کا سچا مذاق دیکھ کر سید صاحب نے اُن سے ربط و ضبط بڑھایا۔ اکثر کھانا ایک ساتھ کھاتے اور روزانہ بلا ناغہ مولانا اور سید صاحب میں گھنٹوں صحبت رہتی۔ سید صاحب ہمیشہ اعتقادی و کلامی مسائل اور مورخانہ تحقیق کے غور و خوض میں رہتے اور تحقیق و تدقیق کے لئے انھیں اکثر حدیث و فقہ و تاریخ و سیر کی کتابوں کی ضرورت پڑتی۔ اس کام کو انھوں نے مولانا شبلی سے لینا شروع کیا۔ اور

---

[1] "سیر المصنفین" میں مولوی محمد یحییٰ صاحب تنہاؔ نے علامہ شبلی کے حالات کے متعلق تین صاحبوں کی تحریریں نقل ہیں، مولوی حبیب الرحمن خاں صاحب شیروانی، خواجہ غلام الثقلین، اور مولوی عبدالحلیم شرر کی۔ ہم سیرت مولانا کے مختلف عنوانوں میں ان تحریروں کے اقتباسات مختصر طور پر نقل کرتے ہیں۔ مولانا کے باقی حالات میں بھی "سیر المصنفین" سے مدد لی گئی ہے۔

مولوی شبلی نے اس خدمت کو ایسی خوبی و قابلیت سے انجام
دیا کہ جس قدر سید صاحب کی دقیقہ رسی اور وسعتِ نظر کے
مولانا شبلی قائل ہوتے جاتے تھے، اس سے زیادہ سید صاحب
ان کی تلاش اور جستجو اور جلبِ روایات کے معتقد و معترف
ہو گئے تھے۔"

مولانا سید صاحب کا کتب خانہ دیکھ کر باغ باغ ہو گئے۔ مصر و یورپ کی تمام جدید و قدیم مطبوعات الماریوں میں بالترتیب سجی ہوئی تھیں۔ مولانا کئی کئی گھنٹے الماریوں کی پاس کھڑے رہتے اور کبھی تھک کر انھیں الماریوں کے پاس زمین پر بیٹھ جاتے تھے۔ کالج کے زمانۂ قیام میں مولانا نے ایک مضمون "مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم" لکھا۔ یہ بہت پسند کیا گیا۔ اس کے بعد انھوں نے قومی نظمیں لکھیں اور "المامون"، "الجزیہ"، "سیرۃ النعمان" تالیف کیں۔ پروفیسر آرنلڈ سے فرانسیسی زبان سیکھی، ان کو فارسی پڑھائی۔

مولانا کا سفرِ روم و مصر و شام

۱۸۹۲ء میں علامہ شبلی نے مسٹر آرنلڈ پروفیسر علی گڈھ کالج کے ساتھ قسطنطنیہ کا سفر کیا۔ جدید اسلامی ہندوستان کا یہ پہلا علمی سفر تھا۔ چنانچہ خود ایک قصیدۂ فارسی میں کہتے ہیں:

بہرِ تکمیلِ فن و ہم پئے تحصیلِ عبر	روزگاریست کہ میداشتم آہنگ سفر
فارغ از حج و زیارت چو مرا کرد خدائے	خواستم تا بسوے روم شوم راہ سپر
آرنلڈ آنکہ رفیق است و ہم استاد مرا	ہم دریں عرصہ بہ انگلنڈ ہمی خواست سفر
گفتم این صحبت و این واقعہ نادر افتد	پس بعزمِ سفر از جاے بجستم مضطر

چھ مہینے بلادِ اسلامیہ کی سیاحت کی۔ علماء و فضلا سے ملے۔ کتب خانے

دیکھے۔ اپنی زیر تجویز تالیف "الفاروق" کے لئے بھی مواد تلاش کیا، لیکن کچھ نہ ملا۔ واپس آکر سفرنامہ مرتب و شائع کیا۔

علی گڑھ کے بعد سرسید کی وفات کے بعد علامہ شبلی نے استعفا دے دیا۔ اور ۱۸۹۸ء سے اعظم گڈھ میں قیام کیا۔ یہاں نیشنل اسکول قائم کیا۔ اس کی ترقی کی کوشش کی۔ الفاروق مرتب کر رہے تھے کہ کشمیر جانا ہوا۔ وہاں علیل ہو گئے اور کئی مہینے علالت کا سلسلہ رہا۔ سخت علالت کی حالت میں الفاروق کی آخری سطریں لکھیں۔ اسی زمانے میں یہ کتاب شائع ہوئی۔ اس کے بعد صحت ہوئی تو مولوی سید علی بلگرامی نے اُن کو حیدرآباد بلالیا اور "نظامتِ علوم و فنون" کا عہدہ دلوا دیا۔ اس زمانے میں الغزالی سوانح مولانا روم، علم الکلام، الکلام اور موازنۂ انیس و دبیر تالیف کرکے شائع کیں۔

سید علی صاحب نے ایک محکمۂ تصنیف و تالیف قائم کیا تھا اُس کی کتابیں "سلسلۂ آصفیہ" کے نام سے شائع ہوتی تھیں۔ مولانا شبلی کی بعض کتابیں بھی اسی سلسلے میں چھپیں۔ حیدرآباد میں مولانا کا مشاہرہ تین سو روپے ماہوار تھا۔ چار سال وہاں رہے۔

ندوۃ العلماء سے تعلق بعض اہل الرائے ذی علم بزرگوں نے ۱۸۹۴ء (۱۳۱۱ھ) میں علما کی ایک انجمن "ندوۃ العلماء" کے نام سے قائم کی تھی۔ اِس جماعت کا مقصد یہ تھا کہ عربی مدارس کے نصاب تعلیم اور طریقۂ تعلیم کی اصلاح کی جائے عام مسلمانوں کی اصلاح کے لئے تدابیر اختیار کی جائیں۔ علمائے ہند کے باہمی اختلاف و نزاع کو رفع کیا جائے اور ایک ایسا دارالعلوم

قائم کیا جائے جس میں علومِ قدیمہ کے علاوہ فنونِ جدیدہ اور صنعت و حرفت کی بھی تعلیم دی جائے۔

سب سے پہلے مولوی عبدالغفور صاحب ڈپٹی کلکٹر نے (جو بعد کو مدار المہام ریاست رام پور ہو گئے تھے) یہ تجویز پیش کی۔ اکثر علما نے تائید کی، اور مولانا سیّد محمد علی صاحب کانپوری (خلیفہ حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب گنج مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ) کے مبارک ہاتھوں سے اس کی بنیاد رکھی گئی۔ مختلف شہروں میں ہر سال اُس کے جلسے ہوتے تھے۔ مولانا عبدالحق صاحب دہلوی مؤلف "تفسیرِ حقانی" اور مولانا شبلی نے اس کے قواعد مُرتّب کئے۔ ۱۸۹۰ء میں مولانا شبلی کی رائے کے مطابق ایک مدرسہ بھی جاری کر دیا گیا۔ رفتہ رفتہ اس میں ترقی ہوتی رہی۔ کتب خانہ بھی اس کے ساتھ قائم کیا گیا۔ اس کے ناظمِ اوّل مولوی سیّد محمد علی صاحب تھے۔

علامہ شبلی علی گڑھ سے قطع تعلق کرنے کے بعد ندوۃ العلمار سے خاص دلچسپی لینے اور اس کی خدمت کرنے لگے تھے۔ مولوی سیّد محمد علی صاحب کی وفات کے بعد حیدر آباد سے آکر اُس کے ناظم ہو گئے ندوہ کی حالت اس زمانے میں نہایت سقیم تھی۔ گورنمنٹ بدگمان تھی ٹوٹ جانے کا اندیشہ ہو چلا تھا۔ مولانا نے ایسی سخت محنت اور ایسی اعلیٰ خدمت کی کہ ندوہ کو از سرِ نو زندہ کر دیا۔ لیکن علما مولانا کے مذہبی خیالات و عقائد سے مطمئن نہ تھے، ہمیشہ مخالفت کرتے رہے۔ آخر ان کو بد دل ہو کر ۱۹۱۳ء میں ندوہ سے دستکش ہونا پڑا۔ مولانا شرر لکھنوی اسی مضمون میں لکھتے ہیں:

"میں نے بار ہا اُن کو اس خیال سے روکا، اور اسی زمانے

ہیں اُن سے کہہ دیا تھا کہ ملمّا بس میں آنے والے نہیں ہیں۔

ان مرحومین امّت میں سے ہر ایک پریسیڈنٹ کی حیثیت رکھتا ہے اور جس زمانے میں فقط پریسیڈنٹ ہی پریسیڈنٹ ہوں، اس پر آیۂ کریمہ لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا[۱] پوری پوری صادق آتی ہے۔ ان کے بہت سے دوستوں نے بھی روکا اور کہا کہ آپ کی ترقی کا میدان علیگڈھ کالج ہی ہے۔ مگر انھوں نے نہ مانا اور نتیجہ یہ ہوا کہ گو انھوں نے ندوہ کو بیحد فائدہ پہنچایا اور ندوہ کو ندوہ بنا دیا۔ مگر آخر ندوہ والے مرحومین امّت ہی کے ہاتھ سے مار کھا گئے، جس کا اُن کے دوستوں کو بیحد ملال ہوا اور وہ بھی اپنی اِس محنت کے اکارت جانے پر کفِ افسوس ملتے ہوئے مرے۔"

ایک المناک حادثہ نظامتِ ندوہ کے زمانے میں اتفاقیہ بندوق چل جانے سے علامہ شبلی کا پاؤں زخمی ہو گیا اور ڈاکٹروں کو ٹانگ کاٹنی پڑی۔ اس کے متعلق وہ خود شعر العجم حصّہ اوّل کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

"جب موازنہ سے بالکل فارغ ہو کر ہمہ تن اِس کام میں مصروف ہوا اور فردوسی کے حال تک پہنچا تو، ار مئی ۱۹۰۷ء کو صدمہ پا کا واقعہ پیش آیا۔ یعنی اتفاق سے میرے پاؤں میں گولی لگی اور پاؤں کاٹ ڈالا گیا۔ یہ بھی فردوسی کی کرامت تھی کہ واقعہ سے ذرا پہلے شاہنامہ کا یہ مصرع

---

[۱] اگر آسمان و زمین میں ایک اللہ کے سوا دو خدا ہوتے تو یہ دونوں ہی تباہ ہو جاتے۔

" دیدہ و بریدہ شکست و بست "

قلم کی زبان پر تھا"

اس حادثہ پر تمام ملک میں افسوس کیا گیا۔ لیکن خود انھوں نے اس تکلیف کو بڑے صبر و سکون کے ساتھ برداشت کیا۔ ۱۵ر جولائی کو مولانا اپنے خط میں شیخ عبدالقادر صاحب ایڈیٹر " مخزن " لاہور کو لکھتے ہیں:

" اب تک ہاتھ پر قابو نہیں۔ خط سے اندازہ ہو سکتا ہے۔ ایک غزل[1] حاضر ہے، لیکن اپریل ۱۹۰۶ء کی ہے ورنہ آج کل یہ خیالات کہاں "

اس پر ایڈیٹر صاحب لکھتے ہیں کہ: " ہم مولانا کی ہمت و استقلال کی داد دیتے ہیں کہ ایسے جرّاحی عمل کے بعد اتنی جلدی انھوں نے علمی مشاغل کی طرف رجوع کیا، اور تمام زمانۂ علالت میں ماتھے پر بل نہیں آنے دیا۔"
علامہ شبلی نے اس حادثہ کے متعلق ایک شعر عجیب دلگداز کہا تھا:

شبلی نامہ سیہ را بجزائے عملش
یا بُریدند و ندانست کہ سر می بایست

---

[1] یہ علامہ شبلی کی طبعی زندہ دلی تھی کہ اس کرب و اذیت کی حالت میں جو غزل اشاعت کے لئے ارسال فرمائی وہ نہایت رنگین ہے۔ سات شعر کی غزل ہے، چار یہ ہیں:

من کہ در سینہ دلے دارم و شیدا چکنم | میل بالالہ رخاں گر نہ کنم تا چکنم
ہست پنجاہ و نہ سال کہ بیہودہ نگہ داشتمش | گر نہ بر سنگ زنم شیشۂ تقوےٰ چکنم
مایۂ تقویٰ سی سالہ فراہم شدہ است | ارمغانش بہ نگارے بدہم؟ یا چکنم
شاہد و بادہ و طرفِ چمن و جوشِ بہار | شبلیا خود تو بفرما کہ با اینہا چکنم

(از مخزن۔ لاہور، بابت جولائی ۱۹۰۶ء)

مؤلف احقر نے مولانا روم کے مشہور شعر میں ترمیم و تتمیہ کے ساتھ اس واقعہ کی تاریخ کہی:

یافتم در شعر رومی حالِ آں	از سرِ الہام گفتم سالِ آں
پائے استدلالیاں چوبیں بود	پائےؔ چوبیں پائے بے تمکیں بود
۶۸۳	۶۴۱ — ۱۳۲۴+۱=۱۳۲۵ھ

دارالمصنفین ترکِ "ندوۃ العلماء" کے بعد لکھنؤ سے اعظم گڈھ آ گئے اور وہاں ایک ادارۂ علمی "دار المصنفین" کے نام سے قائم کیا۔ اور اس کے لئے اپنا باغ، مکان اور کتب خانہ وقف کر دیا۔ افسوس کہ مولانا شبلی اس کی تکمیل و ترقی نہ دیکھ سکے۔ ہندوستان میں تالیف و اشاعت کے بہت سے بڑے بڑے ادارے جاری ہیں اور اپنی اپنی جگہ سب نہایت اعلیٰ پیمانہ پر علم و ادب اور ملک و قوم کی خدمت کر رہے ہیں لیکن یہ خصوصیت صرف "دار المصنفین" کو حاصل ہے کہ وہ اسلام و اسلامیات کا علمبردار ہے "اسلامی کلچر" کا اتنا عظیم الشان لٹریچر کوئی جماعت پیدا نہ کر سکی۔ یہ بھی علامہ شبلی کی نیک نیتی کا ثمرہ ہے کہ ان کو علامہ سید سلیمان ندوی اور ان کے رفقا جیسے جانشین مِل گئے۔ جن کے قالب میں علامہ شبلی کو ایک زندگی کھو کر کئی زندگیاں مِل گئیں۔

آخری تصنیف اور وفات شعر العجم کے بعد علامہ شبلیؒ نے "سیرۃ النبی" کا عظیم الشان کام شروع کیا۔ یہ کام ہی اتنا بڑا تھا کہ وہ سمجھتے تھے کہ اسی میں زندگی ختم ہونی ہے۔ چنانچہ خود فرمایا تھا:

عجم کی مدح کی عباسیوں کی داستاں لکھی	مجھے چندے مقیمِ آستانِ غیر ہونا تھا

[۱] اصل مصرع یہ ہے: "پائے چوبیں سخت بے تمکیں بود"۔

مگر اب لکھ رہا ہوں سیرتِ پیغمبرِ خاتم　　خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

ایک جلد مکمل اور دوسری نامکمل چھوڑ کر ۱۸ نومبر ۱۹۱۴ء (۲۸ ذی الحجہ ۱۳۳۲ھ) کو رہگرائے ملکِ بقا ہوئے۔ ۵۷ سال کی عمر پائی۔ راقم احقر نے قرآن مجید سے تاریخ نکالی:

"تاریخ از کلامِ ایزد"	لَنِعۡمَ دَارُ الۡمُتَّقِیۡنَ جَنّٰتُ[1] عَدۡنٍ یَّدۡخُلُوۡنَهَا
۱۳۳۲ھ	۱۹۱۴ء
	(سورۂ نحل۔ رکوع ۴)

علامہ شبلی کے اخلاق و عادات

علامہ شبلی کے مزاج و عادات کے متعلق بہترین بیان مولوی حبیب الرحمٰن خاں صاحب شیروانی کا ہے۔ ہم اس کا اقتباس درج کرتے ہیں:

"میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ علّامہ مرحوم سچے اور با اخلاص دوست تھے اس زمانہ کی سوسائٹی کی بہت سی کمزوریوں سے پاک اور صاف تھے۔ اُن کے اخلاق کا معیار بہت بلند تھا۔ نظر میں بلندی تھی، مزاج میں استغنا حوصلے میں عزم تھا، مزاج میں نفاست تھی۔ دوستی اور مخالفت دونوں شدید تھیں۔ لیکن دوستوں کی مروّت کبھی اُن کو رسمی تملق و چاپلوسی پر آمادہ نہیں کرتی تھی۔ عزیز سے عزیز دوست کی خاطر وہ اپنی رائے سے نہیں ہٹتے تھے۔ مخالفین کی مخالفت سے رُو برُو نہیں رُکتے تھے مگر ان کے پس پشت بیانِ اختلاف میں بھی ان کی زبان

---

[1] قرآن مجید کا املا جنّت ہے، میں نے ۵ عدد لینے کے لئے ۃ لکھدی ہے۔

سے ایسے الفاظ نہیں نکلتے تھے جو نفسانیت اور معاندانہ عیب جوئی پر دلالت کرتے۔ مخالف کی رائے کی تردید سختی کے ساتھ کرتے تھے، اپنی رائے کے دلائل کا زور شور سے اظہار کرتے۔ باوجود اِس کے یہ کبھی نہیں ہوتا تھا کہ مخالف کے ذاتی یا صفاتی عیوب پیش کر کے اس کو ذلیل و رُسوا کرتے۔

صحبت نہایت پاکیزہ و شگفتہ تھی۔ انسان خواہ کسی درجہ کا ہو، ان کی باتوں سے محظوظ ہوتا تھا جس مسئلے پر گفتگو کرتے ان کے کمال کی خوبیاں نظر آتی تھیں۔ عقلی پیرا، مورخانہ انداز، شاعرانہ نکتہ سنجی، ان کے بیان کی رفیق و ہمدم تھی۔ جب کبھی کسی علمی مسئلہ پر گفتگو ہوئی، بعض نادر اور نازک پہلو ضرور بیان کئے۔ فضول باتیں میں نے اُن سے کبھی نہیں سُنیں۔

اعزہ کے ساتھ بہت الفت تھی۔ اپنے بھائی مہدی مرحوم کا ذکر برسوں دلگیری کے ساتھ کیا۔ دوسرے بھائی کی موت تو اُن کی جان ہی لے گئی۔ احساس بہت شدید تھا اس لئے رنج والم سے بہت متاثر ہوتے تھے۔ ۱۹۰۲ء میں کانفرنس کے اجلاس کے زمانے میں وہ اور میں ایک مکان میں مقیم تھے ایک روز ایک نیم مُردہ بھڑ نے ان کے پاؤں پر ڈنک مار دیا، اِس قدر بیتاب ہوئے کہ مجھ کو حیرت ہو گئی۔ اس قدر زمانہ گذرنے پر آج تک اس اضطراب کی تصویر آنکھوں میں ہے۔ یہ احساس شاعری کا لوازمہ تھا۔ ہر ذوق میں شدت چاہتے تھے۔ نمک تیز کھاتے تھے۔ دسترخوان پر نمک رکھ لیتے اور کھانے میں ڈالتے

جاتے۔ شیرینی بھی گلوسوز مرغوب تھی۔ یہ عام منظر تھا کہ کاغذ پر قند رکھا ہوا ہے، باتیں کرتے جاتے ہیں اور قند کے دانے مُنہ میں ڈالتے جاتے ہیں۔ وہ قند سے اور سامع اُن کے کلام سے شیریں کام ہے۔

سخنہائے شیریں بہ از قند ہست

ایک مرتبہ جلسۂ ندوۃ العلماء کے سلسلے میں بریلی اُن کا میرا ساتھ ہوا۔ اس زمانے میں تندرست تھے، تقریباً ہر اسٹیشن پر شیرینی خریدی اور چکھی بلکہ کھائی۔ محض شیریں ہونا کافی تھا۔ اُس کے حُسن و قبح سے بحث نہ تھی۔ پانی تیز سرد پیتے تھے، جاڑوں میں بھی یہی ہوتا تھا اسی کے ساتھ سردی اور گرمی بہت محسوس کرتے۔ ایک مرتبہ جاڑوں میں حبیب گنج تشریف لائے۔ متعدد رضائیاں اوڑھیں تسلی نہ ہوئی، دوسرے روز خاص اہتمام سے لحاف خوب روئی بھروا کر تیار کیا گیا۔ گرمیوں میں ہندوستان چھوڑ کر سرد یا کم گرم مقام پر چلے جاتے تھے۔ اِس سلسلے میں بمبئی کے سفر شعر و سخن کے لئے یادگار رہیں گے۔ چائے سادہ اور کڑی پیتے تھے۔ صبح کو نماز کے اوّل وقت چائے پی کر فارغ ہو جاتے تھے۔ عادت میں سادگی تھی، لباس عمدہ اور نفیس پہنتے تھے غذا بہت کم کھاتے تھے، آخر میں اس کی قلت سے حیرت ہوتی تھی۔"

(اقتباس مضمون مولانا شروانی منقول از سیر المصنفین)

مولوی عبدالحلیم شرر علامہ شبلی کے خصائصِ طبع کے متعلق لکھتے ہیں:

"ان میں باوجود انتہا درجے کے اخلاق کے، خودداری کا خیال بہت بڑھا ہوا تھا سید صاحب کی صحبت، علی گڈھ کالج کی شرکت اور ان کی ذاتی قابلیت نے انھیں ابتداءً اس حیثیت سے پبلک میں متعارف کرایا کہ سید صاحب کے گروہ کے ایک نامور بزرگ اور اُن کی فوج کے ایک نامی پہلوان ہیں۔ خصوصاً جب وہ سید صاحب کے ہمراہ حیدرآباد گئے تو مسلمانوں میں اس خیال کو اور پختگی ہو گئی، مگر خود مولانا شبلی کی خودداری کو ٹھیس لگی۔ اس حیثیت کو اور اپنی ان تصنیفوں اور نظموں کو تو وہ مٹا نہ سکتے تھے، جن میں خود ہی اپنی حیثیت کو آشکارا کر چکے تھے، لیکن اب اِس بات کو ناقابلِ برداشت دیکھ کے علی گڈھ کالج سے علیحدگی اختیار کر کے ندوۃ العلماء میں شرکت کی اور سمجھے کہ اس ذریعہ سے علما کا سرتاج اور شیخ الکل بن کے اس درجہ پر پہنچ جاؤں گا جو سید صاحب کے درجے سے بھی مافوق ہے۔"

خود علامہ شبلی ایک خط میں لکھتے ہیں:

"جب راجہ کشن پرشاد وزیر ہوئے اور حسب دستور نذر دینے گیا تو اُن کے اے ڈی کانگ نے کہا کہ آپ نے تو تہنیت کا قصیدہ لکھا ہو گا؟ میں نے کہا۔ یہ اوروں کا پیشہ ہے میں یہ کام نہیں کرتا۔ اِس پر ردوبدل ہوئی اور میں نے ناگواری کے ساتھ جواب دیا کہ میں کسی کی مدح نہیں کرتا۔"
(مورخہ ۲۴ ستمبر ۱۹۱۲ء از سیر المصنفین)

علامہ شبلی کے مذہبی خیالات

پہلے لکھا گیا ہے کہ علامہ شبلی بڑے سخت حنفی، مقلد اور پابندِ شرع تھے۔ اِن خیالات میں جو انقلاب جس طرح ہوا اس کو ہم مولوی عبدالحلیم شرر لکھنوی کی زبانی بیان کرتے ہیں:

"اِس موقع پر ان کے خیالات کے متعلق اس نازک انقلاب کا بیان کر دینا بھی لطف سے خالی نہ ہوگا کہ سر سید در اصل غیر مقلد اور اہلِ حدیث کے گروہ میں سے تھے لیکن مسائلِ کلامی اور انگریزی اثر نے غیر مقلد سے ایک بڑی حد تک انھیں معتزلی بنا دیا تھا۔ سید صاحب کی صحبت کا مولانا شبلی پر کوئی اثر نہ ہونا غیر ممکن تھا مگر اہلِ حدیث کی طرف سے ان کے دل میں جو بھڑک تھی، وہ بھی ممکن نہ تھا کہ انھیں نعمانیت اور حنفیت کے دائرے سے باہر نکلنے دیتی۔ لہٰذا بغیر اس کے کہ غیر مقلدی کا کچھ بھی رنگ چڑھنے پائے، وہ بلا واسطہ نعمانی سے معتزلی بننے لگے۔ اور آخر میں اِس بات کی کوشش شروع کی کہ خود حنفیت کو اصلی اعتزال ثابت کریں اور بخلاف متاخرین حنفیہ کے جو حنفیت کو اشعری کی طرف کھینچنا چاہتے ہیں۔ انھوں نے اپنی حنفیت کو اشعریت کا سخت دشمن اور فقہ کے پردے میں چھپی ہوئی معتزلیت ثابت کرنا چاہا، جس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ انگریزی طلب ان کی باتوں سے خوش ہو ہو کر دینداری اور خوش اعتقادی کے

دھوکے میں "معتزلی" ہونے لگے۔ اور موجودہ علمائے حنفیہ سے ان کو سخت عناد ہو گیا۔۔۔۔۔ اسی جوشش کا تقاضا یہ بھی تھا کہ امام صاحب کی سوانح عمری انھوں نے "سیرت النعمان" لکھی تو امام المحدثین محمد بن اسمٰعیل بخاری پر جا بجا حملے کئے، اور علی العموم گروہ محدثین کے اصول سے اختلاف کیا کرتے۔ یہاں تک کہ امام ابو الحسن اشعری بھی محض اتباعِ حدیث کے باعث ان کے مورد سہام بن گئے[1]"

خواجہ غلام الثقلین صاحب اپنے مضمون میں علامہ شبلی کے متعلق لکھتے ہیں:

"انسانوں کی تین قسمیں ہوتی ہیں: ایک وہ جو مذہبی تخیلات رکھتے ہیں۔ دوسرے وہ جو مذہب سے بالکل بیگانہ و بے پروا رہتے ہیں اور ایک آزاد دماغ رکھتے ہیں تیسرے وہ جن کے دماغ میں مذہب و آزادی مرکب صورت میں پائی جاتی ہے۔ اس گروہ کی دو شاخیں ہیں۔ اول جن میں مذہب غالب ہے۔ دوم وہ جن میں آزادی، قومیت اور مدنیت کا خیال مذہب پر غالب ہے میرے خیال میں مولانا شبلی کا شمار آخری گروہ میں ہے۔"

سیاسی خیالات اور قومی خدمات

علامہ شبلی مذہب کی طرح سیاست میں بھی آزاد خیال اور دلیر طبع

[1] اصل مضمون میں یہ دونوں عبارتیں مقدم و مؤخر ہیں۔ یہ ترتیب ہم نے قائم کردی ہے۔

تھے۔ سر سید کے سیاسی خیالات کو دُور اندیشی اور فلاحِ ملکی کے منافی سمجھتے تھے۔ خواجہ غلام الثقلین صاحب مندرجہ بالا فقروں کے بعد لکھتے ہیں:

> "لیکن وہ آزاد خیالی مذہب ہی کے دائرے میں محدود نہ رکھتے تھے۔ بلکہ اس کو پالیٹکس تک پہنچاتے تھے۔ چنانچہ آخری عمر میں انھوں نے اپنے پولیٹکل خیالات کو پوشیدہ نہیں رکھا۔ سر سید احمد خاں مرحوم مذہب میں کچھ کم آزاد خیال نہ تھے، لیکن سیاسی معاملات میں وہ زیادہ تر قدامت پسند یا کنسرویٹو واقع ہوئے تھے اس لئے کالج کی پروفیسری کے زمانے ہی میں مولانا شبلی کو سر سید کے سیاسی خیالات سے سخت کراہت تھی۔"

اُن کے خیالاتِ سیاسی کا خلاصہ یہ ہے کہ، مسلم لیگ سے بیزار تھے، اس کو بیکار سمجھتے تھے اور کانگرس کے حامی تھے۔ اِس نوع کے مقالاتِ شبلی الگ شائع ہو گئے ہیں۔ اِن خیالات کا اظہار نظموں میں بھی کیا ہے۔ ایک نظم کو اس طرح شروع کرتے ہیں:

معترض ہیں مجھ پہ میرے مہربانِ قدیم — جرم یہ ہے، میں نے کیوں چھوڑا وہ آئینِ کہن
میں نے کیوں لکھے مضامینِ سیاست پے بہ پے — کیوں نہ کی تقلیدِ طرزِ رہنمایانِ زمن
کانگرس سے مجھ کو اظہارِ برارت کیوں نہیں — کیوں حقوقِ ملک میں ہوں ہندوؤں کا ہم سخن

مسلم لیگ کے متعلق بڑی دلچسپ نظمیں لکھی ہیں۔ ایک نظم میں لیگ کے مسلک پر طنز کرتے ہیں:

جن مہمّات میں درکار ہے ایثارِ نفوس — ان میں طرزِ عملِ بوسۂ پیغام بھی ہے

اِسی نظم میں مسلم لیگ کے دفتر کا ساز و سامان بیان کر کے آخر میں صدرِ مسلم لیگ سے کہتے ہیں:

مجھ سے آہستہ مرے کان میں ارشاد ہو یہ　　　　سال بھر حضرتِ والا کو کوئی کام بھی ہے

علامہ شبلی کی قومی خدمات بھی خواجہ صاحب موصوف بیان کرتے ہیں:

"مولانا شبلی نے تین اہم کام انجام دینے کی کوشش کی، اور ان میں ایک بڑی حد تک کامیابی بھی حاصل کی۔ ایک وقف علی الاولاد کا مسئلہ جس کو پہلے بھی لوگوں نے مختلف طریقے سے چھیڑا تھا۔ انھیں کی کوشش سے سرسبز ہوا۔

دوم، مولانا کی یہ کوشش تھی کہ حالاتِ زمانہ سے باخبر، روشن دماغ اور مفید دینی عالم پیدا ہوں۔ اس کی بنیاد پڑ گئی ہے، اور کچھ لوگ جو مولانا کے نام لیوا ہیں اور انھیں کے طرز کا تحریر میں اتباع کرتے ہیں، اُن میں تاریخ نویسی اور قومی عصبیت کے ساتھ روحانیت کا بھی مساوی پہلو ملا، تو ہم کہیں گے کہ یہ دوسری کوشش بھی کامیاب ہوئی۔

سوم، وہ چاہتے تھے کہ مسلمان بادشاہوں پر سے تاریخی الزامات رفع کئے جائیں۔ مولانا کو اِس معاملہ میں بھی خاص کامیابی ہوئی۔ ایک شخص کی زندگی میں ایسے عظیم الشان کارنامے اس کو سیکڑوں برس تک زندہ رکھنے کے لئے کافی ہیں۔"

خطابات اور اعزازات

علامہ شبلی ۱۸۹۲ء میں قسطنطنیہ گئے تو سلطان عبدالحمید خاں شہنشاہِ ترکی نے "تمغائے مجیدی" عطا کیا۔ ۱۸۹۴ء میں حکومتِ ہند سے "شمس العلماء" کا خطاب ملا۔ سنہ ۱۹۰۰ء میں امیر عبدالرحمٰن خاں بادشاہِ کابل نے "محکمۂ ترجمہ" قائم کیا۔ اس کے لئے علامہ کا انتخاب کیا۔ لیکن انھوں نے جانے سے انکار کر دیا۔

سنہ ۱۹۱۰ء میں گورنمنٹ اورینٹل کانفرنس شملہ میں شریک ہوئے سنہ ۱۸۹۹ء میں اٹلی کی اورینٹل کانفرنس کی شرکت کے لئے مدعو ہوئے، لیکن بوجہ علالت شریک نہ ہو سکے۔ سنہ ۱۹۱۳ء میں سلطنتِ ترکی کی طرف سے مدینہ یونی ورسٹی کا قیام تجویز ہوا تھا (جو بوجہ جنگِ عظیم عمل میں نہ آسکا) اس کا نصابِ تعلیم مرتب کرنے کے لئے علامہ شبلی کا بھی انتخاب ہوا تھا۔

تمام بلادِ اسلامیہ مصر و روم و شام وغیرہ اور ممالکِ یورپ سے اُن کے پاس علمی سوالات آتے تھے۔ مسٹر آرنلڈ (انگلستان)، موسیو آ (پیرس)، ڈاکٹر محمود لبیب (برلن) بذریعہ مراسلت علمی استفادہ کرتے رہتے تھے عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد کا نصابِ تعلیم تجویز کرنے کے لئے بھی علامہ شبلی منتخب ہوئے تھے۔

حمایت و ترقی اردو علامہ شبلی کی یہ خدمات علیحدہ تذکرہ کے قابل ہیں کہ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی ایک تجویز کے مطابق انجمنِ ترقیِ اُردو قائم ہوئی تو اس کے پہلے سکرٹری علامہ منتخب ہوئے۔ یہ اس وقت حیدر آباد میں تھے۔ وہیں انجمن کا دفتر کھولا گیا۔ ان کے زمانے میں بعض بے نظیر کتابیں انگریزی و عربی سے ترجمہ کرا کے شائع کی گئیں مثلاً، ہربرٹ اسپنسر کی مشہور کتاب ایجوکیشن کا ترجمہ "فلسفۂ تعلیم" کے نام سے خواجہ غلام الحسنین صاحب پانی پتی نے کیا۔ اور علامہ ابن مسکویہ کے رسالہ فلسفۂ الٰہیات الفوز الاصغر کا مولانا الحکیم محمد محسن صاحب فاروقی بجبرایونی نے "القول الاظہر" کے نام سے ترجمہ کیا۔

اُردو کی ایک اہم خدمت علامہ شبلی کے ہاتھ سے یہ سرانجام ہوئی کہ سنہ ۱۹۱۲ء میں گورنمنٹ نے الہ آباد میں ایک ورنیکولر اسکیم کمیٹی اِس

غرض سے قائم کی کہ اسکولوں اور کالجوں کے لئے دیسی زبان کا نصابِ تعلیم ایسی زبان میں مرتب کیا جائے کہ ایک ہی عبارت کے ساتھ اردو، ہندی دونوں زبانوں میں پڑھا جا سکے۔ اور اس کے علاوہ اردو پڑھنے والوں کے لئے ہندی پڑھنا بھی لازم قرار دیا جائے، اور راماین تلسی داس کو نصاب امتحان میں شامل کر دیا جائے۔

اِس کمیٹی کے ممبر علامہ شبلی بھی تھے انھوں نے اپنے بے نظیر دلائل سے یہ تمام تجویزیں مسترد کرا دیں۔ کمیٹی کے بعد مولوی حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی کو یہ خط لکھا تھا:

"مکرمی! تسلیم۔ میں اُردو ورنیکولر اسکیم کمیٹی کی شرکت کی غرض سے الہ آباد گیا تھا۔ مسٹر برن نے چند نہایت مضر تجویزیں اُردو کے حق میں پیش کی تھیں۔ ایک یہ بھی تھی کہ، راماین بھاشا انٹرنس کے امتحان میں لازمی کر دی جائے۔ اور اُردو جو اس میں ہے وہ ایسی کر دی جائے کہ ہندی بن جائے عجیب منطقی دلائل گھڑے تھے۔ پنڈت سندر لال وغیرہ کمیٹی کے ممبر تھے۔ تیسرے جلسے میں کامل فتح ہوئی۔ تمام تجویزیں اُڑ گئیں، اگرچہ افسوس ہے کہ مسلمان ممبروں نے کوئی مدد مجھکو نہ دی اور دیتے کیا، دینے کے قابل بھی نہ تھے۔" (شبلی)

اُردو زبان و ادب کے جس بقا و تحفظ کی آج کوشش ہو رہی ہے، اس کا راستہ علامہ شبلی نے پہلے ہی کھول دیا تھا۔ ورنہ یہ دروازہ ۳۰ سال پہلے ہی بند ہو چکا ہوتا۔ ورنیکولر اسکیم کمیٹی کی یہ تجویز نامناسب نہ تھی کہ اُردو کے طالب علموں کو ہندی سے بھی واقف ہونا چاہئے۔ چنانچہ بعد کو اس پر عمل

کیا گیا اور آٹھویں درجے تک اردو والوں کے لئے ہندی اور ہندی والوں کے لئے اُردو پڑھنی ضروری ہوگئی۔ لیکن پہلی تجویز نہ قابلِ عمل تھی، نہ اب ہے، جس کو علامہ شبلی نے اِن الفاظ میں بیان کیا ہے کہ:

"اردو جو مدارس میں ہے وہ ایسی کردی جائے کہ ہندی بن جائے"

اِس قدر البتہ ممکن تھا اور کیا گیا کہ عام بول چال کی آسان زبان میں کتابیں تیار کی گئیں اور ان کو ایک ہی عبارت اور الفاظ کے ساتھ اردو، ہندی دونوں رسمِ خط میں چھاپا گیا۔ لیکن یہ اُردو ہندی والوں کو ہندی اردو سکھانے کے لئے تھیں۔ اس سے آگے اسکولوں کالجوں، یونیورسٹیوں میں جو اُردو کی تعلیم ہے اس کو بجنسہ باقی و جاری رکھنا لازم ہے۔ ورنہ زبان، علم و ادب، قومیت، کلچر کوئی چیز باقی نہیں رہتی۔

علامہ شبلی کی تصانیف

علامہ شبلی کے شغلِ تصنیف اور عادتِ تحریر کے متعلق خواجہ غلام الثقلین صاحب لکھتے ہیں:

"باوجود نہایت ضخیم کتابیں تالیف کرنے کے اور کثیر التصانیف ہونے کے، وہ کسی دن بھی فلسکیپ کے دو یا تین صفحے سے زیادہ نہیں لکھتے تھے۔ زیادہ وقت مطالعہ میں اور زیادہ سے زیادہ دو ڈھائی گھنٹے لکھنے میں صرف کرتے تھے۔ لکھتے دیر میں اور سوچ کر، مگر اس میں کاٹ چھانٹ بہت کم ہوتی تھی۔ ہمیشہ ایک دو سطر بیچ میں چھوڑ کر کھلا کھلا لکھتے تھے۔ خط نہایت صاف اور باقاعدہ ہوتا تھا۔ آخر عمر تک خوش نویسی کی شان اس قدر تھی کہ شاید ہی کوئی اتنا بڑا مصنف حروف کی خوبصورتی کی

اس قدر پرداکرتا ہو۔"

علامہ شبلی کی تصانیف ضخامت میں ان کے بعض ہم عصروں سے کچھ بہت زیادہ نہیں۔ لیکن عظمت و اہمیت میں بہت گراں پایہ ہیں۔ انھوں نے پہلے یہ تجویز کی تھی جیسا کہ المامون کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ "نامور فرماں روایانِ اسلام کی سوانح عمریاں مرتب کریں۔ اس سلسلے کا نام انھوں نے سرسید کے "شوقِ انگریزی" کی تقلید میں" رایل ہیروز آف اسلام" رکھا تھا۔ دس خاندانِ حکومت کے دس بہترین فرماں روا منتخب کرلئے تھے، مثلاً:

(۱) خلافتِ راشدہ میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ
(۲) خلافتِ بنی اُمیہ میں ولید بن عبدالملک
(۳) خلافتِ بنی عباس میں مامون الرشید
(۴) بنو امیۂ اندلس میں عبدالرحمٰن ناصر
(۵) سلجوقیہ ایران میں ملک شاہ

اسی طرح سلاطینِ ایوبی و سلاطینِ روم وغیرہ میں سے پانچ اور تھے سلسلۂ تصنیف کو نمبر اول سے شروع کرنا چاہتے تھے۔ لیکن حضرت عمر فاروق رض کی سیرت کے لئے مسالہ جمع نہ ہوا، اس لئے پہلے خلیفہ مامون رشید عباسی بغداد کے حالات "المامون" کے نام سے مرتب کئے۔ اس کے بعد الفاروق شروع کی۔ لیکن یورپ سے بعض کتابوں کے چھپ کر آنے کا انتظار تھا، اس لئے بقولِ خود "چند روز کے لئے خاندانِ حکومت کو چھوڑ کر علمی سلسلہ کی طرف توجہ کرنی پڑی۔ فقہ، حدیث، ادب، منطق، فلسفہ ریاضی، مختلف خاندان سامنے تھے۔ بعض وجوہ سے فقہ کو ترجیح دی اور امام ابو حنیفہ رح کو جو فقہ کے بانی ہیں، اس کا ہیرو قرار دیا۔"

دیباچہ سیرت النعمان۔

امام صاحبؒ کے سوانح (سیرۃ النعمان) لکھنے میں علمِ کلام کی بحث اور امام ابوحنیفہؒ کا اس سے تعلق سامنے آگیا، جس کا خود علامہ شبلی کو بھی اِس سے پہلے اندازہ نہ تھا۔ علامہ بالطبع "عقلیات" (فلسفہ و کلام) کی طرف راغب تھے۔ علی گڑھ میں سرسیّد کی صحبت نے "آزاد خیالی" پیدا کردی تھی۔ لیکن اس کے لئے تقلید چھوڑنے کی ضرورت تھی۔ سرسیّد غیر مقلد تھے۔ شبلی کے لئے یہ مسلک اختیار کرنا ممکن نہ تھا۔ اب انھوں نے دیکھا کہ امام صاحبؒ خود بڑے آزاد خیال اور تاویل پسند تھے، بڑا سہارا مل گیا۔ علّامہ شبلی نے تمام "کلام" اور "کلامیوں" کا مطالعہ کرنا شروع کردیا۔ اِس دلچسپی میں وہ سلسلۂ فرماں روایانِ اسلام ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ الفاروق بہت سی لکھ چکے تھے، وہ تو پوری کردی۔ پھر اس طرف توجہ کرنے کی فرصت نہ ملی۔ اور یہ بہت اچھا ہوا۔ "ملک شاہ سلجوقی" اور "نورالدین زنگی" وغیرہ کو لکھ بھی دیتے، تو بجز "تالیفِ شبلی" کے اور کوئی قدر و قیمت نہ رکھتے۔ یہ بات اسی سے معلوم ہوتی ہے کہ علّامہ کی تمام تصانیف میں المامون سب سے کم پڑھی جاتی ہے۔

علّامہ شبلی کی تصانیف علوم و فنون کے لحاظ سے اِس طرح مرتّب ہوسکتی ہیں:

سیرت و سوانح : المامون، سیرۃ النعمان، الفاروق، سیرۃ النبی (۲ جلد)۔

فلسفہ و کلام ــــــ : علم الکلام، الکلام، الغزالی، سوانح مولانا روم۔

ادبیات ــــــ : موازنۂ انیس و دبیر، شعر العجم ۵ حصّے۔

سفرنامہ ــــــ : سفرنامہ مصر و روم و شام۔

تاریخ ــــــــــ : تاریخ اسلام، مضامین عالمگیر۔

تعلیمات ــــــــــ : مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم۔

تقریرات ــــــــــ : ندوۃ العلماء، اور ایجوکیشنل کانفرنس کی تقریریں۔

خطوط ــــــــــ : مکاتیب شبلی تین حصے۔

مقالات ــــــــــ : مقالات شبلی آٹھ حصے۔ جن میں علمی، ادبی، تنقیدی، تاریخی، تعلیمی، سوانحی مضامین الگ الگ مرتب کئے گئے ہیں۔

نظم اردو ــــــــــ : مثنوی صبح اُمید، قومی مسدس، مجموعۂ کلامِ اُردو۔

عربی تصانیف ــــــــــ : الانتقاد علی التمدن الاسلامی (مصر کے عیسائی مصنف جرجی زیدان کی کتاب "التمدن الاسلامی" کی تنقید) بدر الاسلام، اسکات المعتدی۔

فارسی نظم ــــــــــ : دیوانِ شبلی (جس میں دستۂ گل، بوئے گل وغیرہ مختصر مجموعے شامل ہیں)۔

علامہ شبلی کا طرزِ تحریر

علامہ شبلی اپنے زمانہ کے پہلے شخص جنھوں نے اسلوبِ تحریر کی اہمیت کو سمجھا۔ علامہ آزاد اور ڈپٹی نذیر احمد کے طرزِ تحریر کی کوتاہیاں بیان ہو چکی ہیں۔ مولانا حالی اپنے اسلوب کی متانت اور ہمواری سے مختلف موضوعات کو نباہ لے گئے لیکن علامہ شبلی کے مقابلے میں ان کا طرز بھی بے مزہ معلوم ہوتا ہے۔ موقع و مقام اور موضوع و بیان کے مطابق اسلوب اختیار کرنے کے لئے صرف وجدان و ذوق کی رہنمائی شرط ہے۔ قواعدِ صرف و نحو اور اصولِ معانی و بیان بھی بغیر ذوقِ سلیم اور ذہنِ متوازن کے کام نہیں دیتے۔ علامہ شبلی ایسا ہی مذاقِ

صحیح اور طبعِ لطیف رکھتے تھے۔ ہر موقع و محل کے لئے اسی کے مناسب طرزِ تحریر اختیار کیا ہے۔ لطیف و نازک استعارہ و تشبیہ سے بھی کام لیتے ہیں لیکن اس کے بغیر بھی الفاظ کے انتخاب، مرکبات اور جملوں کی ساخت میں اس قدر حُسنِ تناسب ملحوظ رکھتے ہیں کہ ان کی عبارت میں نہایت دِل کشی و دل آویزی پیدا ہوجاتی ہے۔ اس کے ساتھ لطافتِ خیال، دقتِ نظر، وسعتِ تحقیق، قوتِ استدلال سے مضمون میں نُدرت و جدّت اور تاثیر و دلفریبی پیدا کر دیتے ہیں۔ عظمت و اہتمام کے موقع پر شاندار الفاظ اور موزوں ترکیبوں سے شان و شوکت دکھاتے ہیں۔ دلائل اور مثالوں کے انتخاب و ترتیب میں اُن کا حُسنِ نظر اور ذوقِ سلیم نمایاں ہے جس موقع پر دوسرے مصنّف معمُولی سامنے کی مثالوں پر قناعت کرتے ہیں، وہاں علّامہ شبلی نادر و عجیب مثالیں تلاش کرکے لاتے ہیں۔

ان کی تحریر کے متعلق سرسیّد "دیباچۂ المامون" میں لکھتے ہیں:

"ایسی صاف و شستہ اور برجستہ عبارت ہے کہ دِلّی والوں کو بھی اِس پر رشک آتا ہوگا۔"

علّامہ شبلی کی اوّلیات اور ان کا مرتبہ

مولانا حالی کے حال میں لکھا گیا ہے کہ اُردو میں سیرت اور تنقید دو چیزیں با اصول و مستند لکھی گئی تھیں۔ حالی نے ان کا آغاز کیا۔ شبلی کی بھی اکثر تصانیف انہی دُو موضوع پر ہیں۔ چھ سیرت و سوانح (مع غزالی و رومی کے) اور دُو تنقیدیں (موازنہ و شعر العجم) "شعر العجم" کی پانچ جلدوں میں تذکرۂ شعرا بھی ہے اور تنقیدِ شعر و سخن بھی۔

آزاد کی "دربار اکبری" اور حالی کی "حیات سعدی" شبلی کی "المامون" وغیرہ سیرتوں سے پہلے ہیں۔ اسی طرح آزاد کی "آبِ حیات" اور "سخندانِ پارس" اور حالی کا "مقدمۂ شعر و شاعری" شبلی کے "موازنہ" و "شعر العجم" سے قدیم ہیں۔ اِس لئے آزاد و حالی کی اوّلیت مسلّم ہے۔ با اصول تذکرۂ شعرا سب سے پہلے آزاد نے لکھا۔ جامع سیرت سب سے پہلے حالی نے مرتب کی۔ اصول تنقید و نمونۂ تنقید سب سے پہلے حالی نے پیش کئے۔ لیکن جب شبلی نے ان چیزوں پر قلم اُٹھایا تو اس زمین کو آسمان کر دیا۔ اُردو میں پہلی مرتبہ یہ بات نظر آئی کہ ذوقِ سلیم "سیرت" اِس طرح مرتب کرتا ہے اور "تنقید" اس طرح لکھتا ہے۔

اس عیارِ کامل کے لحاظ سے سیرت و تنقید بھی گویا علّامہ شبلی کی "اوّلیات" میں شامل ہیں۔ آزاد، حالی اور شبلی کی کتابیں مقابل رکھ کر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ شبلی کو پہلے نمونوں سے کوئی مدد نہیں ملی۔ "سیرۃ النبیؐ" اور "الفاروق" کے لئے "دربار اکبری" اور "حیاتِ سعدی" نمونہ کا کام نہیں دے سکتیں۔ اسی طرح "شعر العجم" کے پہلے تین حصے (تذکرۂ شعراء) "آبِ حیات" کی تقلید سے بے نیاز ہیں۔ اور چوتھا، پانچواں حصہ "(حقیقتِ شاعری اور اصنافِ شاعری کی تنقید) "مقدمۂ شعر و شاعری" کے اتباع سے بالاتر۔

علّامہ شبلی کی "علم الکلام"، "الکلام" اور اِس فن سے متعلق۔۔۔ "الغزالی" اور "سوانح مولانا روم" اردو زبان کی وہ اوّلیات ہیں کہ اِن چالیس برس میں "آخریات" بھی یہی ہیں۔ اِس میں شک نہیں کہ علمِ کلام کی طرف توجہ اور اس کا شوق علّامہ شبلی کے اندر سرسید

کے اثر سے پیدا ہوا تھا۔ سب سے پہلے سرسیّد نے، اور ان کی تقلید میں مولوی چراغ علی نے اسلام کے عقائد و اعمال اور احکام و شرائع کو عقل کے مطابق اور مصلحتِ زمانہ پر مبنی ثابت کرنے کے لئے علمِ کلام کے اصول برتے تھے۔ لیکن اِس فن کی تاریخ و اصول اور اہلِ فن کا طریقۂ عمل سب سے پہلے علّامہ شبلی نے پیش کیا۔

مثنوی مولانا روم سے علمِ کلام کے مسائل مرتب کرنا علّامہ شبلی کی بے نظیر جودتِ طبع اور فکرِ رسا کا ثبوت ہے۔ مثنوی کا یہ وصف بالاجمال شارحین و شائقینِ مثنوی کی نگاہوں سے مخفی نہ تھا۔ عقائد و الٰہیات کے مباحث میں "مثنویِ مولوی" کے اشعار پہلے بھی پیش کئے گئے ہیں۔ لیکن مسائل کی ترتیب جو "سوانح مولانا روم" میں ہے۔ علّامہ شبلی کا کارنامہ ہے۔

تاریخِ اسلام کے مختلف واقعات کی تحقیق اور ان کے متعلق غلط فہمیوں کی اصلاح جس کاوش و جامعیت کے ساتھ علّامہ شبلی نے کی اس کی نظیر پہلے موجود نہ تھی۔ "جزیہ" "کتب خانۂ اسکندریہ" اور "مضامینِ عالمگیر" وغیرہ متعدد رسالے اور مضامین اپنی نوعیت کی پہلی چیزیں ہیں۔

اِن تمام تصانیف میں "بلاغتِ کلام" جس حد تک ہے، اس میں کوئی ہمعصر علّامہ شبلی کو نہیں پہنچتا۔ اِس لئے وہ ادیب و نقّاد، اور مورّخ و سیرت نگار، ہر حیثیت سے رفعتِ مرتبت میں بالکل منفرد ہیں۔

علّامہ شبلی کی شاعری | علّامہ فارسی و اردو کے شاعر تھے۔ فارسی سے طبعاً مناسبت تھی، کثرت سے مطالعہ کیا تھا۔ فارسی زبان اور

شاعری کے نکتوں اور لطافتوں پر عبور حاصل تھا۔ اس لئے "فارسی گویان ہند" میں کم سے کم اپنے معاصرین میں وہ کسی سے کم نہیں۔ خود ایک خط میں اپنے متعلق لکھتے ہیں: "فارسی شاعری میں زبان کو اصول پر برتنا" یہ "اصول پر برتنا" غیر زبان والوں کو مشکل سے میسّر آتا ہے۔ اہلِ ہند چھ سو، سات سو برس سے فارسی میں شاعری کرتے ہیں۔ امیر خسرو سے فیضی کے زمانے تک ہندوستان کے فارسی شاعروں کی بول چال بھی فارسی میں تھی، تصنیف و تالیف بھی، خط کتابت بھی، اور ایرانی شاعروں کی آمد و رفت بھی جاری تھی۔ اس لئے اُس زمانے میں یہاں کا شعر و ادب بھی بڑی حد تک ایرانی اسلوب پر رہا۔ اس کے بعد جب سے اردو بول چال، تصنیف اور شاعری میں داخل ہوئی، ہندوستانی طرزِ ادا، اور فارسی الفاظ و محاورات کا ہندوستانی استعمال فارسی شاعری میں آگیا، جس کو اہلِ ایران "سبک ہندی" کہتے ہیں۔ پھر اہلِ ہند کے لئے اِس طرزِ ہندی سے بچنا اور "سبک ایرانی" برتنا دشوار ہوگیا۔ اور اس کے لئے خاص ذوقِ سلیم اور نگاہِ تنقید کی ضرورت ہونے لگی۔ اِس "ذوق و نظر" کا متاخرین میں مرزا غالب پر خاتمہ ہوگیا۔ غالب کے بعد پھر کسی کو یہ بات کمال کے ساتھ نصیب نہ ہوئی۔ تاہم کثرت سے اور اچھا کہنے والوں نے بے عیب بھی کہا۔ اور "اسلوبِ ایرانی" میں بھی کہا۔ اسی وجہ سے اہلِ ذوق ایرانیوں نے بھی پسند کیا۔

علامہ شبلی کا زمانۂ علی گڈھ تک فارسی کلام سبک ہندی سے خالی نہیں، پھر بھی ان کی لطافتِ طبع اور حسنِ مذاق کا شاہد ہے۔ آخری زمانے کا کلام بہت منجھا ہوا اور معیار سے نہایت قریب ہے۔ الفاظ ترشے ہوئے اور مصرعے ڈھلے ہوتے ہیں۔ خصوصاً بمبئی کی غزلوں میں بڑی دلآویزی

ہے۔ اس زمانے میں ان سے زیادہ پُرگو اور بھی تھے، زیادہ شیریں کلام کوئی نہ تھا۔

فارسی شاعری سے مناسبت و شوق رکھنے کے علاوہ علامہ شبلی "دلِ زندہ" اور "شیوۂ اہلِ نظر" بھی رکھتے تھے۔ پہلے کی زندگی اور دوسرے کی "آبرو" کی خاطر فارسی غزل کہنے سے بہتر کوئی شغل نہ تھا۔[1]

---

[1] بقول مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی "بمبئی کے سفر فارسی شاعری کے لیے یادگار ہیں"۔ اس یادگار کو باقی رکھنے کے لیے بمبئی کے متعلق علامہ شبلی کا کچھ کلام درج کیا جاتا ہے۔ یہ غزل بمبئی میں ستمبر ۱۹۰۶ء میں کہی تھی:

غزل

نثارِ بمبئی کن ہر متاعِ کہنہ و نو را — طرازِ مسندِ جمشید و فرِ تاجِ خسرو را

بہر سو از ہجومِ دلبرانِ شوخِ بے پروا — گذشتن از سرِ رہ مشکل افتادست رہرو را

فغاں از گرمیٔ ہنگامۂ خوبانِ زردشتی — بہم آمیختہ از زلف و عارض ظلمت و نو را

بدہ ساقی مے باقی کہ در جنت نخواہی یافت — کنارِ آب چوپاٹی و گلگشتِ اپالو را

بیا شبلی بہ یاد پنجۂ گیرائے مژگانش
دگر رہ پارہ سازم ایں قبائے زہد صد تو را

تیسرے شعر کے (ظلمت و ضو) پر علامہ نے فارسی میں اس مضمون کا نوٹ لکھا ہے کہ پارسی لوگ دو خدا مانتے ہیں، یزداں و اہرمن، اور ان کو نور و ظلمت سے تعبیر کرتے ہیں۔ چوتھا شعر خواجہ حافظ شیرازی کے اس شعر سے ماخوذ ہے:

بدہ ساقی مے باقی کہ در جنت نخواہی یافت — کنارِ آب رکناباد و گلگشتِ مصلّیٰ را

اسی ماہ ستمبر کی لکھی ہوئی چوتھی غزل تمام کلام میں سب سے زیادہ طویل ہے چند شعر یہ ہیں: (باقی بر صفحہ ۷۵۰)

اُن کا اُردو کلام بہت مختصر ہے۔ "مثنوی صبحِ اُمید" اور "قومی مسدس" قیامِ علی گڈھ کی نظمیں ہیں۔ ۔۔ن چیزیں تھیں۔ اُس زمانے میں چند بار شائع ہوئیں۔ اَب مجموعۂ کلام میں شامل ہیں۔ اُن کے بعد سالہا سال کوئی اُردو نظم نہیں لکھی۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۷۴۹)

گردم از مدحتِ شیراز و صفاہاں زدہ ام ‏ شرم بادم کہ نوا ہاے پریشاں زدہ ام

بمبئی بود مرا منزلِ مقصود عبث ‏ پیش ازیں گام طلب در رہِ حرماں زدہ ام

آں نگار عجمی چہرہ بدانساں افروخت ‏ کآتش آوردم و در خرمنِ ایماں زدہ ام

آں شدلے دوست کہ آراستمے پیکرِ فن ‏ نقش زیبا صنمے بر ورقِ جاں زدہ ام

آں شدلے دوست کہ در ندوہ بہ بینی بازم ‏ کہ دم از صحبت آں دشمن ایماں زدہ ام

ہاں وہاں، دست بدارید ز من لے احباب ‏ کہ بہ زیبا صنمے دست بہ پیماں زدہ ام

جاے آنست کہ گلشن دَمد از کنج لبم ‏ بوسہ ہا بسکہ بر آں عارض خنداں زدہ ام

اس مضمون کے دو ایک شعر اور بھی ہیں۔ ایسے ہی مضامین کے متعلق میر ممنون دہلوی کہتے ہیں:

اس ذوق سے کہتے ہیں حدیث لب شیریں ‏ گویا ترے ہونٹوں ہی سے لیتے ہیں مزا ہم

شبلی کی اِس غزل کے دو شعر یہ بھی خوب ہیں:

تا دگر آں بت خود کام ز یادم نہ برد ‏ گرہے چند دراں زلفِ پریشاں زدہ ام

پے نواں برد کہ ایں زمزمہ بے چیزے نیست

شبلی ایں تازہ نوا ہا نہ چوستاں زدہ ام

بمبئی سے واپسی میں ۲۷ ستمبر ۱۹۰۶ء کو غزل کہی ہے۔ مطلع و مقطع یہ ہے۔ مقطع کیا خوب فرمایا ہے:

(باقی بر صفحہ ۷۵۱)

۱۹۱۱ء میں تقسیم بنگالہ کی منسوخی اور اس کے بعد جنگ بلقان کا ہیجان پیدا ہوا تو علامہ شبلی نے "پولٹیکل کروٹ" بدلی۔ اور مضامین کے ساتھ سیاسی نظمیں بھی لکھیں۔ جن میں سے بعض ایسی تیز و تند تھیں کہ "قابلِ ضبطی" سمجھی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۷۵۰)

دوش کاں دلدار با من ہم وثاق افتادہ بود — غلغلۂ در گنبد فیروزہ طاق افتادہ بود

از دل صد پارہ ات آگہ نیم شبلی، دلے — شیشۂ دیدم کہ از بالائے طاق افتادہ بود

۱۳ اپریل ۱۹۰۶ء کو الہ آباد میں بیٹھے بمبئی کو یاد کر رہے ہیں:

نہ جاں بخشی آب و ہوائے بمبئی شبلی — مرا از خلق و نوشاد زفرخارست پنداری

دو چار شعر اور بھی قابلِ دید ہیں:

دامن عیش زدستم نرود، تا شبلی — دامنِ بمبئی از کف ندہم تا باشم

شبلی عناں گسستہ مرد سوئے بمبئی — مانیز با تو ہم سفریم، ایں شتاب چیست

ز ذوقِ طبع شبلی من از اول روز دانستم — کہ در آشوب گاہِ بمبئی در بازد ایماں را

بیا اینجا کہ ہر سو کارواں در کارواں بینی — بتانِ آذری را، دلبرانِ شام و ایراں را

یہ غزلیں شائع ہو جاتی تھیں، اور ان مضامین کے چرچے ہوتے تھے۔ اس لئے ایک غزل میں اپنے مخاطبِ غزل سے کہتے ہیں:

چشمِ لطف از تو باندازۂ آں می دارم — کہ من از نامِ نکو بہرِ تو نقصاں کردم

اِس غزل کا مقطع ہے:

شبلی ایں فن نہ بایں شیوہ و آئیں بودہ است — پیش ازیں کالبدے بود کہ من جاں کردم

فنِ شعر گوئی یا فنِ عشقبازی؟ (باقی بر صفحہ ۷۵۲)

گئیں۔ ان کے علاوہ تاریخ اسلام کے چند واقعات نظم کئے ہیں۔ اکبر و جہانگیر کے واقعات کی نظمیں نہایت مشہور مقبول ہوئیں۔ یہ سب کلام شاعری کے کانٹے میں تلا ہوا اور نہایت پُرلطف ہے۔ سیاسی نظموں میں تو وہ بہا نہیں تو ایک دو کے ساتھ "پیش رَو اور پیشوا" کا مرتبہ رکھتے ہیں۔ اس زمانے کے "سیاسی شعرا" میں مولوی ظفر علی خاں ایڈیٹر "زمیندار" سے بہتر کوئی نہ تھا۔

عَلامہ شبلی پر اعتراضات

(۱) علّامہ کے خیالات اور تالیفات پر ان کی زندگی میں اور بعد کو مختلف اعتراضات کئے گئے۔ تردید میں مضامین لکھے گئے، تصانیف کے جواب میں کتابیں چھاپی گئیں۔ تاریخی غلطیاں بتائی گئیں، تالیفی کمزوریاں دکھائی گئیں۔ لیکن باوجود اس کے ان کے مصنّف اور انشا پرداز کے مرتبے سے کسی نے انکار نہیں کیا۔ اعتراضات کی بڑی بنیاد ان کے مذہبی خیالات و اجتہادات تھے۔ جہاں ان کے کمال کا یہ اعتراف کیا گیا:

> "آپ کی تصانیف کے مطالعہ سے دنیائے اسلام کی وسعت و عظمت اور خوبیوں اور ترقیوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ غیر اقوام پر ان کے پڑھنے سے اسلام کی حقیقی عظمت اور خوبیاں منکشف ہوتی ہیں۔ یہ کتابیں سہل پسندی، عام فہمی اور دلآویزی میں اپنی آپ نظیر ہیں۔" (مولوی ظفر الملک اڈیٹر الناظر، از سیر المصنّفین)

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۷۵۲) اس مجموعہ "بوئے گل" کی آخری غزل کا مقطع کیا خوب ہے:

شاعری از من مجو دور از سوادِ بمبئی
حالیا شبلی شدم رندِ غزل خوان نیستم

وہاں یہ بھی کہا گیا:

"ہمارے مولانا پرستارانِ عقلیت کی رایوں کے مطابق اسلام کی تاریخِ گذشتہ اور قرآنی تعلیم کو ایسے سانچے میں ڈھال دیتے ہیں کہ خواہ مذہب کا منشا پورا نہ ہو۔ لیکن متبعینِ یورپ کی تشفی ہو جائے۔"

"مولانا کی ایسی تحریروں نے اگر ایک طرف حاملانِ شریعت اور علمائے مذہب کو برافروختہ اور کبیدہ خاطر کیا، تو دوسری طرف خود اسلام کی قوت کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا دیا ہے"

(وہی مضمون)

اس اعتبار سے ان کی حیثیت تقریباً سرسید کی سی تھی۔ فرق یہ تھا کہ سرسید باقاعدہ عالم، محدّث، فقیہ نہ تھے اور علامہ شبلی سب کچھ تھے۔ سرسید کی رایوں کو تو "دخل در معقولات" سمجھا گیا تھا، لیکن علامہ شبلی کے "اجتہادِ نَو" کی حمایت میں ان کے جُبّہ و دستار تھے، علمائے ملّت کی برہمی و برافروختگی کا یہی باعث تھا۔ سب سے پہلے اور سب سے زیادہ سیرۃ النعمان پر اعتراض کیے گئے۔ وجوہِ اعتراض کا پہلے ذکر آچکا ہے۔ معترضین میں مولوی حبیب الرحمٰن خاں صاحب شیروانی رئیس بھیکن پور (نواب صدر یار جنگ بہادر) بھی تھے، اور علمائے معترضین میں شاید سب سے کم عمر، لیکن فہم و فراست اور مذہبی جوش و پاسداری میں کسی سے کم نہ تھے۔ علی گڈھ کالج سے قریب کا تعلق رکھتے تھے۔ علامہ شبلی نے تمام مخالفانہ مضامین میں سے مولوی صاحب موصوف ہی کے اعتراضات کا جواب لکھا۔ اُس میں یہ شعر بھی لکھا تھا:

رسی آنگہ بدردِ ما کہ چو ما   خامہ گیری و حرف بنگاری

۲۔ "سیرۃ النعمان" کے بعد الفاروق پر اعتراض ہوئے۔ یہ دوسری قسم کے تھے جن کا خلاصہ یہ تھا کہ "مصنف نے اسلام کی تاریخ کو اپنے سانچے میں ڈھال لیا ہے۔ الفاروق پڑھ کر یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ موجودہ زمانے کی شائستگی اور اس زمانے کے تمدن میں کچھ زیادہ فرق نہ تھا۔ جو محکمے اور دفاتر موجودہ طرزِ حکومت کے لازمی عناصر ہیں، کم و بیش وہ سب دربارِ خلافت کے ارکان پائے جاتے ہیں، جن کو درایت کبھی تسلیم نہیں کر سکتی" (اڈیٹر الناظر) اور اس پر یہ فیصلہ کیا گیا ہے:

"جو درجہ حزم و احتیاط تاریخ کی کسی مستند کتاب کا طرۂ امتیاز ہونا چاہئے الفاروق اس سے محروم ہے۔" (اڈیٹر الناظر)

علامہ شبلی کی رجحان پسندی اور ہیرو پرستی سے ہمیں انکار نہیں لیکن اُن کا صرف مبالغہ یا اہتمام ہم کو تسلیم ہے، ورنہ

تا نباشد چیزکے شبلی نگوید چیز ہا

علامہ نے "الفاروق" کی ترتیب میں اِس قول پر عمل کیا ہے کہ اثباتِ فضائل میں حدیث کا بالکل صحیح ہونا شرط نہیں۔ البتہ کسی صحیح قول کی تردید نہ ہو اور کسی دوسرے کی مضرت و منقصت نہ ہو۔ اس لئے انھوں نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے انتظامِ حکومت کے متعلق جو بات جس تاریخ میں پائی لکھ دی۔ وہ تحقیق و تنقیح نہیں کی جو بعد کو سیرۃ النبی کے لئے کی۔ لیکن۔ الفاروق میں بھی کثرت سے واقعات صحیح بخاری و صحیح مسلم سے اور قاضی ابو یوسف کی "کتاب الخراج" سے اور اس طرح کی بعض اور مستند کتابوں سے لئے ہیں۔

معترضین نے کم سے کم یہ اعتراض سمجھ کر نہیں کیا کہ مصنفِ الفاروق

نے موجودہ طرزِ حکومت اور دربارِ خلافت میں کچھ زیادہ فرق نہیں رکھا۔ جس چیز سے ان کو دھوکا ہوا وہی علامہ شبلی کا کمالِ تالیف ہے۔ علامہ نے حصہ دوم میں جلی عنوانوں کی تفصیل کے لئے حاشیوں پر ذیلی سرخیاں قائم کرکے موجودہ طرزِ حکومت کے سب نہیں تو اکثر ضروری عناصر خلافتِ فاروقی رضہ میں دکھائے ہیں۔ فہرستِ مضامین پر نظر ڈالنے سے یہ عنوان نظر آتے ہیں:

صوبوں کی تقسیم، محکمۂ بندوبست، قانونِ مالگذاری، محکمۂ آب پاشی، مختلف قسم کے رجسٹر، مردم شماری، محکمۂ جاسوسی، پولیٹیکل تنخواہیں، پرچہ نویسی، فنِ جنگ، فوج کے خزانچی و محاسب، قلعہ شکن آلات، سفر مینا وغیرہ۔

لیکن اُن کو پڑھ کر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب چیزیں بالکل ابتدائی حالت میں اور وقت و موقع کے مطابق تھیں۔ مثلاً فوجیں تھیں تو وہ کہیں رہتی بھی تھیں۔ ان مکانوں کا نام فوجی بارکیں لکھ دیا۔ معترض بے پڑھے یہ کیوں تصور کرلے کہ انگریزی فوجوں کے سے قطار در قطار باقاعدہ دیکھا کمرے، ہال، کلب گھر، اصطبل تھے۔ مردم شماری کے متعلق لکھا ہے:

"زکوٰۃ اور جزیہ کی تشخیص کی ضرورت سے ہر مقام کی مردم شماری کرائی گئی تھی...... خاص صفتوں کے لحاظ سے بھی نقشے تیار کرائے تھے۔ مثلاً سعد بن وقاص رضہ کو حکم بھیجا تھا کہ جس قدر آدمی قرآن پڑھ سکتے ہیں، ان کی فہرست تیار کی جائے۔ شاعروں کی بھی فہرست طلب کی تھی۔" (الفاروق ص۱۱)

ظاہر ہے کہ ہندوستان میں ابھی آغاز ۱۹۴۱ء میں جیسی مردم شماری ہوئی ہے ایسی جب نہ تھی، نہ ایسی دکھائی گئی ہے۔

اس کے علاوہ معترضین نے یہ امر بھی فراموش کر دیا ہے کہ خلافتِ فاروقی عراق، شام، مصر، ایران دُور دُور تک تھی۔ مصر و ایران وغیرہ پہلے سے متمدن و شائستہ ملک تھے۔ وہاں یہ تمام اصولِ حکومت اور طرزِ سلطنت رائج تھے۔ فتح اسلام کے بھی جاری رہے۔ اور اب یہ عہدِ فاروقی کے کارنامے اور الفاروق میں لکھنے کے واقعات ہو گئے۔

(۴) موازنۂ انیس و دبیر پر بھی اعتراض ہوئے اور اس کے جواب میں المیزان اور ردّ الموازنہ وغیرہ لکھی گئیں۔ اردو کتابوں میں اضافہ کے لحاظ سے تو بہت اچھا ہوا کہ یہ کتابیں لکھ دی گئیں۔ خصوصاً "المیزان" کہ وہ بڑی ضخیم کتاب ہے "موازنہ" سے دُگنی۔ اور مرزا دبیر کے حالات، خصوصیاتِ کلام، انتخابِ مراثی کے اعتبار سے نہایت کار آمد۔ لیکن اس میں جوابِ موازنہ کی سعی لاحاصل ہے۔ "موازنۂ شبلی" لاجواب تھا۔ علامہ شبلی کی طبیعت میں بعض باتیں مورّخ و نقاد کی شان کے خلاف تھیں۔ ان کا ظہور "موازنہ" میں بھی ہے۔ صرف ان چند باتوں پر نظر ڈالنے کی ضرورت تھی۔ اس کام کے لئے چند صفحے یا ایک دو جزو کافی تھے۔ ورنہ وہ شاعری میں اس قدر صحیح مذاق اور نظرِ انتقاد رکھتے تھے کہ ان کی تنقیدوں میں مشکل سے کلام ہو سکتا ہے۔ بعض قابلِ اعتراض باتوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

(۱) علامہ شبلی کی عادت تھی کہ جس مسئلے کو جتنا اہم سمجھتے تھے اُتنی ہی اس کی تحقیق کیا کرتے تھے۔ معمولی قرینِ قیاس باتوں میں صرف شہرت و سماعت کو کافی سمجھتے تھے۔ انھوں نے "موازنہ" میں مرزا دبیر کے بعض شعروں اور مصرعوں کو خلافِ بلاغت بتایا ہے، اُن میں یہ بھی ہیں:

حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے مرزا دبیر نے یہ مضمون

اَدا کیا ہے۔

محبوب ہوں خدائے ذوی الاحترام کا   نانا ہوں میں حسین علیہ السّلام کا

آنحضرتؐ کی زبان سے امام صاحب کے لئے "علیہ السلام" کا لفظ کس قدر ناموزوں ہے۔ ایک اور مشہور مصرع ہے:

"زیرِ قدمِ والدہ فردوسِ بریں ہے"   (دبیر)

مصنّف "المیزان" کہتے ہیں کہ یہ دونوں مرزا دبیر کے نہیں ہیں۔ ان کے نام سے غلط مشہور کر دیئے گئے ہیں۔ یہاں علامہ پر اعتراض صرف عدم تحقیق کا ہو سکتا ہے۔ یہ کوئی بڑی بات نہیں۔ اصل مسئلہ مرزا دبیر کی عدم رعایتِ بلاغت ہے۔ وہ اور بہت سے مصرعوں سے ثابت ہے جو علامہ نے پیش کئے ہیں

(۲) علامہ نے صنعتِ "تنسیق الصّفات" کی یہ تعریف بیان کی ہے:

"جب کسی موقع پر چند الفاظ ایک وزن یا ایک قسم کے پے در پے آتے ہیں تو ایک خاص لطف پیدا ہو جاتا ہے۔"

(موازنہ ص۲۵)

اور اس کی مثالوں میں یہ شعر بھی لکھا ہے:

کوفہ میں بھی معرکہ دن بھر نظر آیا   شمر آیا۔ سنان آیا۔ حُر آیا۔ عمر آیا

یہ تعریف اور مثال دونوں غلط ہیں۔ اس کے نام میں صفات کا لفظ ہے اسی سے تعریف نکلتی ہے کہ کسی شے کی صفتیں پے در پے لائی جائیں۔ اسماء، افعال یا جملے پے در پے آنے سے "تنسیق الصفات" نہیں بنتی۔ "موازنہ" میں یہ مثال صحیح لکھی ہے:

اک گھاٹ پہ تھی آگ بھی، پانی بھی، ہوا بھی   امرت بھی، ہلاہل بھی، مسیحا بھی، قضا بھی

(۳) علامہ شبلی پر سب سے اہم اعتراض یہ ہے کہ انھوں نے کتاب کا نام

تو "موازنۂ انیس و دبیر" رکھا ہے۔ لیکن اُس سے مقصد تحسین انیس اور تنقیص دبیر ہے۔ موازنہ میں طرفین کے محاسن و معائب دکھلانے ضروری ہیں۔ علّامۂ ممدوح نے برائے نام میر انیس کی خامیاں بھی بتائی ہیں لیکن اکثر جگہ اُن کی یہ تاویل کی ہے کہ کاتب کی غلطی ہے۔ اور مرزا دبیر کے اغلاط میں کہیں یہ احتمال ظاہر نہیں کیا۔ "المیزان" میں بتایا گیا ہے کہ یہاں یہاں کاتب کی غلطیاں ہیں۔ اِس لئے علّامہ شبلی کا اعتراض درست نہیں۔

علّامہ موصوف میں یہ وصف بھی ہے کہ وہ ایک کو اعلیٰ اور ایک کو اَدنیٰ سمجھ لیتے ہیں تو پھر یہ تلاش نہیں کرتے کہ ان کے ناپسندیدہ شخص میں کتنی خوبیاں ہیں، خواہ وہ پسندیدہ شخص کے مقابلے میں کتنی ہی کم ہوں ترجیح کے لئے یہ ضروری نہیں کہ غیر مرجّح شخص میں کوئی خوبی نہ ہو، یا اُس کی خوبیوں سے چشم پوشی کی جائے یا ان کو کم کرکے دکھایا جائے۔ انھوں نے مرزا دبیر کے متعلق لکھا ہے:

> "فصاحت اُن کے کلام کو چھو نہیں گئی، بلاغت نام کو نہیں کسی چیز یا کسی کیفیت یا کسی حالت کی تصویر کھینچنے سے وہ بالکل عاجز ہیں۔"

اور اس کے بعد فرماتے ہیں:

> "ہماری یہ غرض نہیں ہے کہ ان کے کلام میں سرے سے یہ باتیں پائی ہی نہیں جاتیں، لیکن گفتگو قلّت اور کثرت میں ہے۔"

جب قلّت و کثرت میں گفتگو تھی تو یہی بات کہنی چاہئے تھی۔ یہ الفاظ "چھو نہیں گئی، نام کو نہیں، بالکل عاجز ہیں" لکھنے ہی مناسب نہ تھے۔ اِس لئے کہ خلافِ واقع ہیں۔ علّامہ شبلی نے صرف ایک واقعہ کے متعلق

مرزا دبیر کے پانچ بند نقل کئے ہیں اور لکھا ہے :

"مرزا دبیر صاحب نے اس واقعہ کے بیان میں جو بلاغت صرف کی ہے اور
جو درد انگیز سماں دکھایا ہے، کسی سے آج تک نہ ہو سکا"

لیکن ہم نے اپنی تالیف "تاریخِ مرثیہ گوئی" میں مرزا دبیر کے مختلف مرثیوں سے طویل و مسلسل اقتباسات لکھ دیئے ہیں، جن میں وہ "فصاحت و بلاغت" جس کو علامہ ممدوح کہتے ہیں کہ دبیر کو چھو بھی نہیں گئی، ایسی اعلیٰ ہے کہ اگر ان بندوں کو میر انیس کے کلام میں ملا دیا جائے تو پہچان مشکل ہے۔ موازنہ کا حق یہ تھا کہ علامہ مرزا صاحب کے کلام کا بالاستیعاب مطالعہ کر کے بجائے ایک دو واقعات یا چند اشعار کے وہ تمام یا اکثر حصّے پیش کرتے، جہاں دبیر انیس سے بڑھ کر یا برابر کامیاب ہوئے ہیں۔ یہ ہوتا تو پھر ان سے کوئی شکایت نہ ہوتی، اور "ترجیحِ انیس" کے متعلق ان کی رائے پھر بھی درست ہی رہتی۔

(۴) "شعر العجم" بھی موردِ اعتراض رہی مختلف لوگوں نے مضامین اور رسالے لکھ کر اس کی تاریخی و تنقیدی غلطیاں دکھائیں۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ علامہ شبلی "مورخ" سے زیادہ "نقاد" تھے۔ شعر العجم کی تالیف کا مقصد یہ تھا کہ فارسی شاعری کی وسعت و جامعیت ثابت کی جائے اور تنقید و موازنہ کر کے شاعروں کے کمالات دکھائے جائیں۔ اِس کام کے لئے فی الجملہ ملکی تاریخ اور شاعری کا ارتقا بھی بیان کرنے کی ضرورت تھی اور شاعروں کے حالات بھی۔ لیکن ذاتی حالات یا ملکی تاریخ مقصود بالذات نہ تھی۔ اور علامہ کی یہ عادت پہلے بیان ہو چکی ہے کہ وہ صرف اپنے کام اور ضرورت کی قدر تحقیق کیا کرتے تھے۔ ان کی جن تصانیف یا

مضامین کا موضوع تحقیق ہے، وہاں انھوں نے کوئی پہلو اور کوئی ذریعہ فروگذاشت نہیں کیا۔ اور جہاں تاریخ و تحقیق ضمنی چیز ہے، وہاں وہ ہر روایت اور ہر تحریر کو معتبر سمجھ لیتے ہیں۔ اِس بنا پر شعر العجم میں شعرار کے سالِ ولادت و وفات، ان کا وطن، حسب و نسب، کتابوں کا سالِ تصنیف، ان کا انتساب، تاریخِ ایران کے سنہ اور اس قسم کی مختلف معلومات کہیں کہیں غلط لکھدی گئی ہیں۔ اس لیے کہ ان کو شاعر اور اس کے گرد و پیش سے اتنی بحث و تعلق نہیں، جتنی شاعری اور اس کے ماحول سے ہے۔

شعر العجم میں ان باتوں کی تحقیق بھی جا بجا نظر آتی ہے، لیکن سرسری ہے۔ کسی بات کے متعلق چند کتابوں میں اختلاف نظر آیا۔ انھوں نے دو اقوال نقل کر دیئے۔ کبھی کسی قول کو ترجیح دیدی، کبھی بغیر فیصلہ کے چھوڑ دیا اس لئے علامہ شبلی پر مورخ و تذکرہ نویس کی حیثیت سے یہ اعتراضات ہو سکتے ہیں۔ جن لوگوں کو یورپ کے طرزِ تحقیق کی عادت ہے ان کی نظر میں علامہ کی یہ کمزوری زیادہ کھٹکتی ہے۔[1]

علامہ شبلی کی طبیعت میں یہ بات بھی عجیب تھی کہ وہ اپنے معاصرین کی تصانیف کے متعلق اچھی رائے نہ رکھتے تھے۔ خصوصاً جن لوگوں کو وہ اپنا حریف سمجھتے تھے اور جن کی کتابیں اُن کی تالیفات کے ہم موضوع ہوتی تھیں اُن کی کھلے دل سے داد نہ دیتے تھے۔

شعر العجم حصۂ پنجم کے دیباچے میں علامہ سید سلیمان ندوی رحمہ لکھتے ہیں کہ:

---

[1] پروفیسر محمود شیرانی کا مضمون مطبوعہ رسالہ "اردو" (۱۹۲۶ء) دیکھنا چاہیے۔

"عجب اتفاق کہ اس وقت اسی عنوان پر ہندوستان اور یورپ کے دو اور اکابر مصنفین بھی قلم اُٹھا چکے تھے، شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد لاہور میں اور پروفیسر براؤن انگلینڈ میں ۱۹۰۷ء میں اِدھر لاہور سے سخندانِ پارس نکلی، اور اُدھر انگلینڈ سے لٹریری ہسٹری آف پرشیا شائع ہوئی۔ لیکن شعر العجم کے مصنف کا معیارِ تخیل ان دونوں سے الگ رہا۔ ۶ر مئی ۱۹۰۷ء کے خط میں مولانا لکھتے ہیں:

"آزاد کا سخندانِ پارس حصہ دوم نکلا، سبحان اللہ لیکن الحمد للہ کہ میرے شعر العجم کو ہاتھ نہیں لگایا۔"

(مکاتیب شبلی حصہ اوّل ص ۱۲۵)

اِس کے بعد سید صاحب لکھتے ہیں:

"اپریل ۱۹۰۷ء میں مولینا کو ایک دوست کے خط سے براؤن کی تصنیف کا حال معلوم ہوا۔ چنانچہ انھیں کے ذریعہ سے کتاب منگوائی اور پڑھوا کر سُنی، اس کا جو اثر ہوا، وہ حسب ذیل ہے:

بلا مبالغہ اور بلا تصنع کہتا ہوں کہ براؤن کی کتاب دیکھکر سخت افسوس ہوا، نہایت عامیانہ اور سوقیانہ ہے۔ برادر اسحاق سے پڑھوا کر سنی، خود بھی اُلٹ پلٹ کر دیکھی۔ فردوسی کی نسبت صرف ڈیڑھ تین صفحے لکھے ہیں، جس میں اس کے اقتباسات بھی شامل ہیں۔ مذاق اتنا صحیح ہے کہ آپ فردوسی کا درجہ "سبعہ معلقہ" کے برابر بھی نہیں مانتے، اور فرماتے

ہیں کہ کسی حیثیت سے یہ کتاب اور شعرائے فارسی کے کلام کے
برابر نہیں۔ میں مع سود درجہ کے آپ سے دام واپس
لوں گا۔"

پروفیسر براؤن کی "ادبی تاریخِ ایران" کو "عامیانہ وسوقیانہ" کہنا علامہ شبلی کی سخن فہمی کی عجیب وغریب مثال ہے۔ براؤن کی تاریخ اس درجہ کی کتاب ہے کہ علامہ شبلی اگر کوشش کرتے تو ایسی نہ لکھ سکتے "المامون" اور "الفاروق" میں تحقیق و تلاش کی نوعیت اور تھی کسی ملک و قوم کی تہذیب و تمدن اور اس کی روشنی میں زبان و ادب کی تاریخ جن اصول پر یورپ میں لکھی جاتی ہے، وہ علامہ موصوف کے فہم و دسترس سے بالاتر تھے جس کا ایک ثبوت یہی ہے کہ وہ "برادر اسحاق سے پڑھوا کر" اور "خود اُلٹ پلٹ کر" یہ نہ دیکھ سکے کہ اس میں کیا ہے، بلکہ یہ دیکھا کہ کیا نہیں ہے۔ علامہ شعر فہمی و نکتہ سنجی کے مرد میدان تھے۔ اس وقت فردوسی زیرِ مطالعہ تھا (جس پر پچھتر صفحے لکھے ہیں)۔ اس لئے براؤن کے ہاں اسی کو دیکھا اور یہ دیکھ کر اطمینان کر لیا کہ اس نے دو تین صفحے لکھے ہیں۔ ساری کتاب پر ریویو کرنے کے لئے گویا یہ نظر ہی کافی تھی۔ پروفیسر براؤن نے علامہ شبلی کی یہ رائے دیکھی ہو گی تو مزہ لیا ہو گا۔

اس کے مقابلے میں پروفیسر صاحب کی انصاف پسندی اور کشادہ دلی قابلِ دید ہے۔ تاریخِ براؤن اور تذکرہ شبلی کی پہلی جلدیں ساتھ نکلیں۔ اس کے بعد دونوں اپنی اپنی کتابیں آگے لکھ رہے تھے۔ علامہ نے اپنی تصنیف پہلے ختم کر دی۔ پروفیسر بعد تک لکھتے رہے۔ انہوں نے شعر العجم دیکھی اور اپنی بعد کی جلدوں میں اس کی بڑی تعریف لکھی۔ اور علامہ کی سخن سنجی کی بہت

داد دی. تیسری جلد میں جہاں فیضی، عرفی، نظیری، صائب وغیرہ کا پروفیسر صاحب نے تذکرہ لکھا ہے، ہر شاعر کے بیان میں سب سے پہلے علامہ شبلی اور شعر العجم کا حوالہ دیا ہے۔ ایک جگہ مقابلۂ شعرا کے موقع پر لکھا کہ یہ کام شبلی نے نہایت عمدہ کیا ہے۔ چنانچہ بعض شاعروں کا موازنہ جو علامہ نے کیا تھا، اسی کو اعتراف و حوالہ کے ساتھ بجنسہٖ اپنی کتاب میں درج کر دیا۔ علامہ شبلی نے جو کام کیا، یعنی شعرا کا موازنہ، خصوصیاتِ کلام کا احاطہ، بہترین کلام کا انتخاب اور تنقید، یہ پروفیسر براؤن کے بس کا نہ تھا۔

"ہر کسے را بہر کارے ساختند"

براؤن کیا، کوئی یورپین ہو، فارسی شاعری کی لطافتوں اور نزاکتوں کو مشکل سے سمجھ سکتا ہے۔ یہ لوگ صرف شاعری کے موضوع، نظم کے مضمون، اسلوب کے ظاہری محاسن، صنائع و بدائع کو سمجھ سکتے اور ان پر بحث کر سکتے ہیں۔ علمِ معانی سے جو خوبیاں متعلق ہیں ان کا سمجھنا ان کے لئے بہت دشوار ہے، الفاظ کی موزونیت، لفظ و معنی کا تناسب، روزمرہ کی نزاکت، محاورہ کی لطافت، بلکہ خیال کی پاکیزگی اور طرزِ ادا کی نُدرت کو بھی مستشرقین یورپ میں سب نہیں سمجھ سکے۔

اس لئے اگر پروفیسر براؤن "شاہنامہ" کی شاعرانہ خوبیوں کی داد نہ دے سکے، تو اس پر علامہ شبلی کو طعنہ دینے کا محل نہ تھا۔ باقی علامہ نے یہ بات غلط لکھی کہ براؤن نے فردوسی پر دو تین صفحے لکھے ہیں۔ ان کی ہسٹری کی پہلی جلد میں شاہنامہ کے تاریخی مضامین اور مآخذ ۱۰ صفحے میں لکھے ہیں، اور شاہنامہ کا منظوم انگریزی ترجمہ لکھا ہے۔ اور پھر دوسری جلد میں فردوسی و شاہنامہ کا ذکر بارہ[۱۲] صفحوں میں کیا ہے۔ یہ بائیس[۲۲] صفحے وسعت میں شعر العجم

کے چالیس اصفحوں سے کم نہیں ہیں۔

تصانیفِ شبلی کے نمونے

(۱) "المامون" علامہ کی مستقل تصانیف میں سب سے پہلی ہے۔ اس کا سببِ تالیف پہلے بیان ہو چکا ہے۔ رایل ہیروز آف اسلام (نامور فرماں روایانِ اسلام) کا سلسلہ اس کتاب سے شروع ہوا۔ علی گڈھ کالج کے زمانۂ ملازمت میں لکھی گئی اور ۱۸۸۹ء کے شروع میں کالج کی طرف سے چھاپ کر شائع کی گئی۔ اس قدر مقبول ہوئی کہ چند مہینے میں سب جلدیں فروخت ہو گئیں اور اسی سال اکتوبر میں دوبارہ چھاپی گئی۔ سرسید نے دوسرے ایڈیشن کا دیباچہ ۱۲ر اکتوبر ۱۸۸۹ء کو لکھا ہے۔ اس کی زبان کے متعلق سرسید کی رائے پہلے لکھی جا چکی ہے۔ دیباچہ میں اُس کے طرزِ بیان کے متعلق لکھتے ہیں:

> "اُردو زبان نے بہت کچھ ترقی کی ہے، مگر اس بات کا بہت کم لحاظ رکھا گیا ہے کہ ہر فن کے لئے زبان کا طرزِ بیان جُدا گانہ ہے۔ تاریخ کی کتابوں میں ناول اور ناول میں تاریخانہ طرز کو کیسی ہی فصاحت و بلاغت سے برتا گیا ہو، دونوں کو برباد کرتا ہے۔
>
> ہمارے لائق مصنف نے اِس کا بہت کچھ خیال رکھا ہے اور باوجود تاریخانہ مضمون ہونے کے ایسی خوبی سے اس کو ادا کیا ہے کہ عبارت بھی فصیح اور دلچسپ ہے اور تاریخانہ اصلیت بدستور اپنی اصلی صورت پر موجود ہے۔ جو خوبصورت ہے خوبصورت ہے۔ جو بھونڈی ہے بھونڈی ہے، نہ خوبصورتی کو زیادہ خوبصورت بنایا ہے اور نہ بھونڈی کو زیادہ بھونڈا

اور در حقیقت یہی کمال تاریخ نویسی کا ہے۔"

(سیّد احمد خاں سکریٹری مدرسۃ العلوم)

"المامون" کے دو حصے یکجا ہیں۔ پہلے حصہ میں خلافتِ عباسیہ کے قیام کا حال اور مامون الرشید خلیفۂ ششم کے زمانے تک کی خانہ جنگیاں بیان کی ہیں، اور وہ اسباب لکھے ہیں جن سے (بقول سرسید) "امین اس کا بھائی محروم اور مقتول اور خود مامون تمام مملکتِ اسلامی کا مالک الملک لاشریک لہٗ بن گیا۔" دوسرے حصے میں (بالفاظِ سرسید) "انتظامِ سلطنت اور اس کی جزئیات کو جہاں جہاں سے ملیں، چن چن کر ایک جگہ جمع کیا ہے اور مامون کی خصلت اور اس کی سوشیل حالت اور اس کی پرائیویٹ زندگی، اس کے مشغلوں اور اس کی مجلسوں کا ذکر کیا ہے۔"

مولانا حالی کی "حیاتِ سعدی" اس سے پہلے شائع ہوئی ہے۔ اور تاریخی تحقیق اور سیرت کی خوبیِ ترتیب کے لحاظ سے بلاشبہ وہ اردو میں پہلی تصنیف ہے۔ لیکن علامہ شبلی کا یہ پہلا کارنامہ تحقیق و ترتیب دونوں میں کچھ کم وقیع نہیں ہے۔ سرسید "المامون" کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

> "اس قدر جزئیات کو تلاش کرنا اور نظم اسلوب سے ایک جگہ جمع کرنا کچھ آسان کام نہ تھا۔ اس کے حاشیوں پر جس قدر کتابوں کے حوالے ہیں ان کو دیکھ کر اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس کتاب کے لکھنے میں کس قدر جانکاہی ہوئی ہوگی اور مصنف کو کتنے ہزار دل ورق تاریخوں کے اُلٹنے پڑے ہوں گے اور اسی کے ساتھ جب یہ خیال کیا جائے کہ مصنف نے ان جزئیات کو ایسی کتابوں سے تلاش کرکے نکالا ہے جن کی نسبت خیال

بھی نہ ہوتا تھا کہ ان میں مامون کے حالات ہوں گے، تو اس
محنت کی وقعت و قدر اور بھی زیادہ ہو جاتی ہے۔"

یہ کام حقیقت میں نہایت دشوار ہے، لیکن علامہ شبلی نے اپنے علم و فضل، وسعتِ مطالعہ سے اور اس سے زیادہ اپنے ذوقِ صحیح اور دقّتِ نظر سے ایسی خوبی کے ساتھ انجام دیا کہ اُردو میں اس سے بہتر نمونہ موجود نہ تھا۔ یہ اقلیم تحقیق "المامون" سے شروع ہو کر پھر علامہ کے قلم و سے نہ نکلی اور اسی دشت کی سیاحی میں عمر گذر گئی۔ اِس کے بعد جس کتاب کے لکھنے کو قلم اُٹھایا وہ تحقیق ہی کا ایک نیا میدان تھا۔ "سیرۃ النبی" تک یہی جولانی جاری رہی۔
المامون کی زبان و بیان کے متعلق سر سیّد کی جو رائے لکھی گئی وہ بالکل درست ہے لیکن خود علامہ کی بعد کی تصانیف کے مقابلے میں اس کتاب کا اسلوب زیادہ پختہ اور منجھا ہوا نہیں ہے۔ "الفاروق" اور اس کے بعد کی کتابوں میں، خصوصاً موازنہ، شعر العجم اور سیرۃ النبیؐ میں، اور اس زمانہ کے مضامین میں ایسا زور، صفائی اور الفاظ و مضمون کا باہمی تناسب (یعنی بلاغت) ہے کہ ان کے اسلوب میں ایک تڑپ اور چمک پیدا ہو گئی ہے، اور اسی وصف کے سبب سے وہ اپنے زمانے کے بہترین انشا پرداز ہیں۔

جس زمانے میں "المامون" لکھی گئی، علامہ شبلی پر سر سیّد کا اثر نیا نیا تھا۔ اِس لئے اِس کتاب میں انگریزی کے الفاظ کہیں کہیں پائے جاتے ہیں ورنہ جیسا ہم نے پہلے لکھا ہے، انھوں نے اِس روش کی نازیبائی کو سمجھ لیا۔ اور شروع کے مضامین و تصانیف کے بعد بے ضرورت انگریزی الفاظ نہیں لکھے۔ المامون سے دو ایک مثالیں لکھی جاتی ہیں:

(۱) "یہی ایک چیز ہے جو قومی فیلنگ اور قومی خوشی کو

زندہ رکھ سکتی ہے" (دیباچہ مصنف)

(۲) "ماموں کی فیاضی و لعف پر اگر کچھ نکتہ چینی ہو سکتی ہے"

(المامون ص۱۱۳)

(۳) "تاہم ماموں نے وہی کیا جو بچے کانشنس کی رو سے اس کو کرنا چاہیئے تھا" (ص۱۱۱)

المامون کے نمونے یہ ہیں،

(الف) طاہر ذوالیمینین خلیفہ ماموں الرشید کا معتمد علیہ تھا۔ اسی نے ماموں کے بھائی امین سے جنگ کر کے اس کو گرفتار کیا تھا اور پھر قید خانہ میں قتل کیا تھا۔ اس طرح اسی شخص کے ذریعہ سے ماموں کو سلطنت ہاتھ آئی تھی۔ اس کا ایک واقعہ علامہ شبلی لکھتے ہیں:

طاہر کا خراسان کی حکومت پر مقرر ہونا (۲۰۵ھ)

اس سال ایک عجیب تقریب سے طاہر کو اپنے کارہائے نمایاں کا مناسب صلہ ملا۔ یعنی وہ کل مشرقی حکومت پر جس کی حد دارالخلافہ بغداد سے شروع ہو کر سندھ تک منتہی ہوتی ہے، نائبُ السلطنت مقرر ہوا۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ایک رات طاہر ماموں کی بزم عیش میں حاضر ہوا۔ ماموں بادہ نوشی کے مزے لے رہا تھا۔ بے تکلفی سے اس نے دو پیالے طاہر کو بھی مرحمت کئے اور اپنے سامنے بیٹھنے کی اجازت دی۔ طاہر نے باادب عرض کیا کہ "میرا منصب اس عزت کا مستحق نہیں ہے" ماموں نے کہا "یہ قیدیں دربارِ عام کے لئے مخصوص ہیں۔ بے تکلفی کے جلسوں

میں اس قسم کی قواعد کی پابندی ضروری نہیں"۔ طاہر آداب بجالا کر
بیٹھ گیا۔ مامون نے اس کی طرف نگاہ کی تو آنکھوں میں آنسو بھر
آئے۔ طاہر نے عرض کی کہ "اب کیا آرزو باقی رہی ہے، جس کا
حضور رنج کر سکتے ہیں؟" مامون نے کہا "کچھ ایسی بات ہے،
جس کے پوشیدہ رکھنے میں تکلیف اور ظاہر کرنے میں ذلت ہے"
طاہر اُس وقت تو چپ ہو رہا مگر دل میں خلش پیدا ہوئی، کہ
آخر کیا بات ہے۔ حسین جو مامون کا ساقی اور ندیم خاص تھا،
طاہر نے اسے دو لاکھ درہم نذر بھیجے اور درخواست کی کہ اس
دن کے واقعہ کا سبب دریافت کر دے۔ حسین نے موقع پاکر
پوچھا۔ مامون نے کہا "اگر یہ بات آگے بڑھی تو سر اڑا دونگا
سچ یہ ہے کہ جب طاہر میرے سامنے آتا ہے تو بھائی امین کا
ذلت و بیکسی سے مارا جانا یاد آتا ہے۔ میرے ہاتھ سے ضرور کسی
دن طاہر کو گزند پہنچے گا"۔ طاہر کو یہ بات معلوم ہوئی تو احمد
بن ابی خالد الاحول کے پاس گیا (حسن بن سہل کے بعد وزیر
مقرر ہوا تھا) اور کہا کہ تم جانتے کہ میں احسان فراموش
نہیں ہوں اور میرے ساتھ بھلائی کرنی فائدے سے خالی
نہیں۔ میں تم سے صرف اتنا چاہتا ہوں کہ مامون کی آنکھ سے
دُور رہوں۔ احمد بن ابی خالد نے اِس کا ذمہ لیا۔ اور دوسرے
دن صبح کے وقت مامون کے پاس حاضر ہوا۔ چونکہ چہرے سے
تردد اور پریشانی نمایاں تھی۔ مامون نے پوچھا: کیوں کوئی
نئی بات ہے؟

احمد : حضور مجھے تو ساری رات نیند نہیں آئی۔

مامون : آخر کیوں؟

احمد : میں نے سُنا ہے کہ حضور نے خراسان کی حکومت غسّان کو دیدی، جس کے ساتھ مٹھی بھر سے زیادہ آدمی نہیں ہیں۔ اگر ترکوں نے سرحد پر حملہ کیا تو کیا غسّان اُن کو روک سکے گا؟

مامون : یہ خیال تو مجھ کو بھی تھا، اچھا تم کس کو تجویز کرتے ہو؟

احمد : طاہر ذوالیمینین سے بہتر کون شخص انتخاب ہو سکتا ہے۔

مامون، مگر اس کے خیالات تو باغیانہ ہیں اور وہ نقضِ بیعت پر آمادہ ہے۔

احمد : اِس کا ذمّہ دار میں ہوں۔

مامون : اچھا تم اپنی ذمّہ داری پر مقرر کر دو۔

طاہر طلب ہوا اور سندِ حکومت کے ساتھ ایک کروڑ درہم بھی جو عموماً خراسان کے گورنروں کو ملتے تھے، عطا ہوئے طاہر نے ایک مہینے میں ساز و سامانِ سفر درست کیا۔ اور ۲۹ ذی قعدہ ۲۰۵ھ کو خراسان روانہ ہوا۔ طاہر کا بیٹا اس کے بعد صاحب الشرطہ مقرر ہوا۔ لیکن تھوڑے ہی دنوں میں اس کی ذاتی لیاقت نے مصر کی گورنری تک پہنچا دیا۔ تقرر کے وقت مامون نے اُس کو اپنے سامنے بلایا اور کہا "یوں تو ہر شخص اپنی اولاد کی نسبت حسنِ ظن رکھتا ہے، لیکن طاہر نے جو کچھ تمھاری تعریف میں کہا اُس سے کم تھا جس کے تم مستحق تھے۔" طاہر نے جب یہ مژدہ

سنا تو بیٹے کو ایک نہایت مفصل خط لکھا جو آئین حکومت، انتظام ملکی، رفاہِ رعایا کے متعلق ایک نہایت مدبرانہ دستور العمل تھا۔ یہ خط اِس قدر مقبول ہوا کہ تمام لوگوں نے اس کی نقلیں لیں۔ خود مامون نے اس کی باضابطہ نقلیں عموماً حکام سلطنت کے پاس بھجوائیں اور کہا کہ طاہر نے دنیا و دین و تدبیر و رائے و سیاست و اصلاحِ ملک و حفاظتِ سلطنت و قیامِ خلافت کے متعلق کوئی بات اٹھا نہیں رکھی۔

(ب) مامون کے عیش و طرب کے جلسوں میں گو عیاشانہ رنگینی پائی جاتی ہے۔ مگر انصاف یہ ہے کہ یہ جلسے علمی مذاق سے بالکل خالی بھی نہ تھے۔ اِس قسم کے جلسے جوش انجذبات کو پورے جوش کے ساتھ اُبھار دیتے ہیں۔ اگر متانت اور تہذیب کے ساتھ ہوں تو لٹریچر پر نہایت وسیع اور عمدہ اثر پیدا کرتے ہیں۔ مامون خود سخن سنج اور موسیقی کا بڑا ماہر تھا۔ یارانِ مجلس بھی عموماً نازک خیال اور نکتہ شناس تھے بات بات پر شاعرانہ لطیفے ایجاد ہوتے۔ کبھی موسیقی کی بحث چھڑ جاتی۔ کسی وقت مامون کے فی البدیہہ مصرعوں یا شعروں پر شعرا کی طبع آزمائیوں کا امتحان ہوتا۔ ایک دن بزم عیش آراستہ تھی، بادہ و جام کا دور تھا۔ بیس عیسائی کنیزیں دیبائے رومی کے لباس پہنے، گردنوں میں سونے کی صلیبیں، کمر میں زریں زنّار، ہاتھوں میں گلدستہ لئے ہوئے بزم میں جلوہ آرا تھیں۔ یہ سماں ایسا نہ تھا کہ مامون دل پر

قابو رکھ سکتا۔ بے ساختہ چند اشعار زبان سے نکلے۔ اور احمد بن صدقہ ایک مغنی کو بلا کر شعروں کے گانے کی فرمائش کی۔ احمد کی نغمہ سرائی کے ساتھ کنیزیں ناچنی شروع ہو گئیں۔ ان کی مخمور آنکھیں اور جام شراب مامون کو بدمست کرنے میں یکساں کام دے رہے تھے۔ وہ بالکل سرشار ہو گیا اور حکم دیا کہ ان نازنینوں کے نام پر تین ہزار اشرفیاں نثار کی جاویں۔ مامون کا چچا ابراہیم جس کے ادعائے خلافت کا حال پہلے حصہ میں گذر چکا ہے اور جو موسیقی کا بڑا استاد اور اس فن میں اسحٰق موصلی کی ہمسری کا دعویٰ رکھتا تھا ایک دن بزم عیش میں حاضر تھا۔ مامون کے دائیں بائیں حوروش کنیزیں ایک سُر میں عود چھیڑ رہی تھیں۔ اسحٰق بھی حاضر ہوا۔ اور آنے کے ساتھ ہی ٹھٹک سا گیا۔

مامون: "کیوں اسحٰق! کوئی بے اصول آواز کان میں آ رہی ہے؟"

اسحٰق: "حضور، ہاں۔"

مامون: (ابراہیم کی طرف مخاطب ہو کر) "تم اس سوال کا جواب کیا دیتے ہو؟"

ابراہیم: "نہیں۔"

مامون نے اسحٰق کی طرف دیکھا۔ اس نے کہا "اب میں بہ تعین بتا دیتا ہوں کہ اس صف میں کس تار پر غلط مضراب پڑ رہی ہے۔" ابراہیم نے اس طرف کان لگا کر سنا، مگر پھر تمیز نہ ہوئی۔ اسحٰق نے ایک خاص کنیز کی طرف اشارہ کیا کہ وہ تنہا بجائے اور سب ہاتھ روک لیں۔ اب

ابراہیم سمجھ گیا اور اپنی ناواقفیت پر نادم ہوا۔

مامون نے کہا "ابراہیم! اتنی تاروں کی یکساں اور مشتبہ گونج میں ایک غلط صدا جس کے کان میں کھٹک جائے اور اس کو بہ تعین بتا دے، تم اس کی ہمسری کا کیوں کر دعویٰ کر سکتے ہو؟"

شاید یہ پہلا دن تھا کہ ابراہیم نے صریح لفظوں میں اسحٰق کی فضیلت کو تسلیم کر لیا۔

(۲) سیرۃ النعمان: امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح عمری ہے۔ ۱۵ دسمبر ۱۸۹۳ء کو علامہ شبلی نے علی گڈھ میں اس کو ختم کیا۔ تقریبِ تصنیف پہلے بیان ہوئی ہے۔ اس کے بھی دو حصّے یکجا ہیں۔ پہلے میں امام صاحب کے ذاتی حالات و فضائل ہیں اور دوسرے میں ان کے اصولِ فقہ اور علمِ کلام سے بحث کی ہے۔ یہی حصّہ علامہ کا اصلی کارنامہ ہے۔ یہ مسائل اِس ترتیب سے اردو کیا فارسی و عربی میں بھی نہ تھے۔ ترتیب و تالیف میں علامہ کی جدّت اور مسائل کے فیصلہ و محاکمہ میں ان کا اجتہاد شامل ہے، یہی اجتہاد علامہ اور علما کے درمیان اختلاف کا باعث ہوا تھا۔

دونوں حصوں سے ایک ایک اقتباس درج کیا جاتا ہے:

(الف) ذہانت و طبّاعی: امام صاحب کی ذہانت اور طبّاعی عموماً ضرب المثل ہے۔ یہاں تک کہ اُن کا اجمالی ذکر بھی کہیں آجاتا ہے۔ تو ساتھ ہی یہ صفت بھی ضرور بیان کی جاتی ہے۔ علامہ ذہبی نے "عبر فی اخبار من غبر" میں ان کا ترجمہ نہایت اختصار کے ساتھ لکھا ہے۔ تاہم اس فقرے کو نہ چھوڑ سکے کہ "کان من اذکیاء بنی آدم" یعنی، اولادِ آدم میں جو

نہایت ذکی گذرے ہیں، امام ابو حنیفہ ان میں شمار ہوتے ہیں
مشکل سے مشکل مسئلوں میں ان کا ذہن اِس تیزی سے لڑتا تھا
کہ لوگ حیران رہ جاتے تھے۔ اکثر موقعوں پر ان کے ہم عصر جو
معلومات کے لحاظ سے ان کے ہمسر تھے، موجود ہوتے تھے۔ ان کو اصل
مسئلہ بھی معلوم ہوتا تھا۔ لیکن جو واقعہ درپیش ہوتا تھا اس کے مطابق
کرکے فوراً جواب بتا دینا امام صاحب ہی کا کام تھا۔

ایک شخص کسی بات پر اپنی بیوی سے ناراض ہوا اور قسم کھا کر
کہا "جب تک تو مجھ سے نہ بولے گی، میں بھی تجھ سے کبھی نہ بولوں
گا" عورت تند مزاج تھی اُس نے بھی قسم کھالی اور وہی الفاظ
دُہرائے جو شوہر نے کہے تھے۔ اُس وقت تو غصہ میں کچھ نہ سوجھا
مگر پھر خیال آیا تو دونوں کو بہت افسوس ہوا۔ شوہر امام
سفیان ثوری کے پاس گیا اور صورتِ واقعہ بیان کی۔ سفیان نے
کہا "قسم کا کفارہ دینا ہوگا، اِس میں کوئی چارہ نہیں" مایوس
ہوکر لوٹا اور امام ابو حنیفہ رح کی خدمت میں حاضر ہوا کہ للہ آپ
کوئی تدبیر بتائیے۔ امام صاحب نے فرمایا "جاؤ شوق سے باتیں کرو
کسی پر کفارہ نہیں" امام سفیان ثوری رح کو معلوم ہوا تو نہایت
برہم ہوئے اور امام ابو حنیفہ رح سے جاکر کہا کہ آپ لوگوں کو غلط
مسئلے بتادیا کرتے ہیں۔ امام صاحب نے اسی شخص کو بلا بھیجا اور کہا
کہ تم دوبارہ واقعہ کی صورت بیان کر جاؤ۔ اس نے اعادہ کیا
امام صاحب، سفیان رح کی طرف مخاطب ہوئے اور کہا کہ میں نے
جو پہلے کہا تھا، اب بھی کہتا ہوں۔ سفیان نے کہا "کیوں؟"

فرمایا "جب عورت نے شوہر کو مخاطب کر کے وہ الفاظ کہے تو عورت کی طرف سے بولنے کی ابتدا ہو چکی، پھر قسم کہاں باقی رہی" سفیان نے کہا "حقیقت میں آپ کو جو بات وقت پر سوجھ جاتی ہے ہم لوگوں کا وہاں خیال تک نہیں پہنچتا۔

کوفہ میں ایک شخص نے بڑی دھوم دھام سے ایک ساتھ اپنے دو بیٹوں کی شادی کی۔ ولیمہ کی دعوت میں تمام اعیان و اکابر کو مدعو کیا۔ مسعر بن کدام، حسن بن صالح، سفیان ثوری امام ابو حنیفہ شریکِ دعوت تھے۔ لوگ بیٹھے کھانا کھا رہے تھے کہ دفعۃً صاحب خانہ بدحواس گھر سے نکلا اور کہا غضب ہو گیا! لوگوں نے کہا "خیر ہے؟" بولا کہ زفاف کی رات عورتوں کی غلطی سے شوہر اور بیبیاں بدل گئیں۔ جو لڑکی جس کے پاس رہی وہ اُس کا شوہر نہ تھا۔ اب کیا کیا جائے؟ سفیان نے کہا "امیر معاویہؓ کے زمانے میں بھی ایسا ہی اتفاق ہوا تھا، اس سے نکاح میں کچھ فرق نہیں آتا، البتہ دونوں کو مہر دینا لازم ہو گا۔" مسعر بن کدام حضرت امام ابو حنیفہ کی طرف مخاطب ہوئے کہ آپ کی کیا رائے ہے؟ امام صاحب نے فرمایا کہ "شوہر خود میرے سامنے آئیں تو جواب دوں۔" لوگ جا کر بلا لائے۔ امام صاحب نے دونوں سے الگ الگ پوچھا کہ رات کو جو عورت تمہارے ساتھ رہی، وہی تمہارے نکاح میں رہے تو تم کو پسند ہے؟ دونوں نے کہا "ہاں" امام صاحب نے کہا تو تم اپنی بیبیوں کو جن سے تمہارا نکاح بندھا

تھا، طلاق دیدو اور ہر شخص اُس عورت سے نکاح پڑھا لے جو اُس کے ساتھ ہمبستر رہ چکی۔ سفیان نے جو جواب دیا اگرچہ فقہ کی رُو سے وہ بھی صحیح تھا۔ کیونکہ یہ صورت وطی بالشبہ کی ہے، جس سے نکاح نہیں ٹوٹتا۔ لیکن امام صاحب نے مصلحت کو پیشِ نظر رکھا۔ وہ جانتے تھے کہ موجودہ صورت میں نکاح کا قائم رکھنا غیرت و حمیت کے خلاف ہوگا۔ کسی مجبوری سے زوجین نے تسلیم بھی کرلیا تو دونوں میں وہ خلوص و اتحاد نہ پیدا ہوگا۔ جو تزویج کا مقصودِ اصلی ہے اس کے ساتھ مہر کی بھی تخفیف ہے۔ کیونکہ خلوتِ صحیحہ سے پہلے طلاق دی جائے تو صرف آدھا مہر لازم آتا ہے۔

لیث بن سعد جو مصر کے مشہور امام تھے اُن کا بیان ہے کہ "میں ابوحنیفہ کا ذکر اکثر سنا کرتا تھا اور اُن کے دیکھنے کا مشتاق تھا۔ حج کی تقریب سے مکہ معظمہ جانا ہوا۔ اتفاق سے ایک مجلس میں پہنچا۔ دیکھا تو بڑا ہجوم ہے۔ ایک شخص صدر کی جانب بیٹھا ہے اور لوگ اس سے مسئلے پوچھ رہے ہیں ایک شخص نے بڑھ کر کہا 'یا اباحنیفہ!' (یہ پہلا موقعہ تھا کہ میں نے اُن کو پہچانا) امام ابوحنیفہ اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ اس نے کہا "میرا ایک بدمزاج بیٹا ہے، اس کی شادی کر دیتا ہوں تو بیوی کو طلاق دے دیتا ہے، لونڈی خرید دیتا ہوں تو آزاد کر دیتا ہے، فرمائیے کیا تدبیر کروں؟" امام ابوحنیفہ نے برجستہ کہا کہ "تم اس کو ساتھ

ملکر بازار میں جہاں لونڈیاں بکتی ہیں جاؤ۔ جو لونڈی پسند آئے خرید کر اُس کا نکاح پڑھا دو۔ اب اگر وہ اُسے آزاد کر دے گا تو نہیں کر سکتا کیونکہ لونڈی اس کی ملک نہیں۔ طلاق دے گا تو تمہارا کچھ نقصان نہیں تمہاری لونڈی کہیں گئی نہیں۔ سعد کہتے ہیں کہ مجھ کو جواب پر تو کم مگر حاضر جوابی پر بہت تعجب ہوا۔

ربیع جو خلیفہ منصور کا عرض بیگی تھا، امام ابوحنیفہ سے عداوت رکھتا تھا۔ ایک دن امام صاحب حسب الطلب دربار میں گئے ربیع بھی حاضر تھا منصور سے کہا کہ حضور! یہ شخص امیر المومنین کے جدِ بزرگوار (عبداللہ بن عباس) کی مخالفت کرتا ہے اُن کا قول ہے کہ اگر کوئی شخص کسی بات پر قسم کھائے اور دو ایک روز کے بعد انشاء اللہ کہہ لے تو وہ قسم میں داخل سمجھا جائے گا اور قسم کا پورا کرنا کچھ ضرور نہ ہوگا۔ ابوحنیفہ اِس کے خلاف فتویٰ دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ انشاء اللہ کا لفظ قسم کے ساتھ ہو تو البتہ جزوِ قسم سمجھا جائے گا، ورنہ لغو اور بے اثر ہے۔" امام صاحب نے کہا "امیر المومنین! ربیع کا خیال ہے کہ لوگوں پر آپ کی بیعت کا کچھ اثر نہیں۔" منصور نے کہا "کیوں کر؟" امام صاحب نے کہا "ان کا گمان ہے کہ جو لوگ دربار میں آپ کے ہاتھ پر بیعتِ خلافت کرتے ہیں اور قسم کھاتے ہیں، گھر پر جاکر انشاء اللہ کہہ لیا کرتے ہیں جس سے قسم بے اثر ہو جاتی ہے اور اُن پر شرعاً کچھ مواخذہ نہیں رہتا۔" منصور ہنس پڑا اور ربیع سے کہا کہ "تم ابوحنیفہ کو نہ چھیڑا کرو، اُن پر تمہارا داؤ نہیں چل سکتا۔" امام

صاحب دربار سے نکلے تو ربیعؔ نے کہا "آج تو آپ میری جان ہی لے چکے تھے"۔ فرمایا " یہ تو تمھارا ارادہ تھا میں نے صرف مدافعت کی ۔"

(ب) ان عام مباحث کے بعد اب ہم اُن خصوصیتوں کا ذکر کرتے ہیں جن کی وجہ سے حنفی فقہ کو اور فقہوں کے مقابلہ میں ترجیح حاصل ہے ۔

۱۔ سب سے مقدم اور قابلِ قدر خصوصیت جو فقہِ حنفی کو حاصل ہے وہ مسائل کا اسرار اور مصالح پر مبنی ہونا ہے۔ احکامِ شرعیہ کے متعلق اسلام میں شروع ہی سے دو فرقے قائم ہو گئے ایک گروہ کی یہ رائے ہے کہ یہ احکام تعبدی احکام ہیں یعنی ان میں کوئی سِرّ اور مصلحت نہیں ۔ مثلاً شراب خوری یا فسق و فجور صرف اس لئے ناپسندیدہ ہیں کہ شریعت نے ان سے منع کیا ہے ۔ اور خیرات و زکاۃ صرف اس لئے مستحسن ہیں کہ شارع نے ان کی تاکید کی ہے ورنہ فی نفسہٖ یہ افعال بُرے یا بھلے نہیں ہیں ۔ امام شافعی کا اسی طرف میلان پایا جاتا ہے اور شاید اسی کا اثر تھا کہ ابوالحسن اشعری نے جو شافعیوں میں علم کلام کے بانی ہیں علم کلام کی بنیاد اسی مسئلہ پر رکھی ۔

دوسرے فرقہ کا یہ مذہب ہے کہ شریعت کے تمام احکام مصالح پر مبنی ہیں ۔ البتہ بعض مسائل ایسے بھی ہیں جن کی مصلحت عام لوگ نہیں سمجھ سکتے ۔ لیکن درحقیقت وہ مصلحت سے خالی نہیں ہیں ۔ یہ مسئلہ اگرچہ بوجہ اس کے کہ اُس کے دونوں

پہلو بڑے بڑے علماء نے اختیار کئے ہیں، ایک معرکۃ الآرا مسئلہ بن گیا ہے۔ لیکن انصاف یہ ہے کہ وہ اس قدر بحث و اختلاف کے قابل نہ تھا۔ تمام مہمات مسائل کی مصلحت اور غایت خود کلام الٰہی میں مذکور ہے۔ کفار کے مقابلہ میں قرآن کا طرز استدلال عموماً اسی اصول کے مطابق ہے۔ نماز کی مصلحت خدا نے خود بتائی کہ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ۔ روزہ کی فضیلت کے ساتھ ارشاد ہوا لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ۔ جہاد کی نسبت فرمایا حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ ۔ اسی طرح اور احکام کے متعلق قرآن و حدیث میں جا بجا تصریحیں اور اشارے موجود ہیں کہ اُن کی غرض و غایت کیا ہے۔

امام ابوحنیفہ کا یہی مذہب تھا اور یہ اصول اُن کے مسائل فقہ میں عموماً مرعی ہے۔ اسی کا اثر ہے کہ حنفی فقہ جس قدر اصول عقل کے مطابق ہے اور کوئی فقہ نہیں۔ امام طحاوی نے جو محدث اور مجتہد دونوں تھے، اس بحث میں ایک کتاب لکھی ہے جو "شرح معانی الآثار" کے نام سے مشہور ہے اور جس کا موضوع یہ ہے کہ مسائل فقہ کو نصوص و طریق نظر سے ثابت کیا جائے محدث مذکور نے فقہ کے ہر باب کو لیا ہے اور اگرچہ انصاف پرستی کے ساتھ بعض مسئلوں میں امام ابوحنیفہ کی مخالفت کی ہے لیکن مسائل کی نسبت مجتہدانہ طرز استدلال سے ثابت کیا ہے کہ امام ابوحنیفہ کا مذہب احادیث اور طرق نظر دونوں کے موافق ہے۔ امام محمد نے بھی "کتاب الحج" میں اکثر مسائل میں عقلی وجوہ سے استدلال کیا ہے، یہ دونوں کتابیں چھپ گئی ہیں اور ہر جگہ

ملتی ہیں جس کو تفصیل مقصود، ان کتابوں کی طرف رجوع کرے
اِس دعوے سے کہ امام ابوحنیفہ کا مذہب عقل کے موافق ہے
شافعیہ کو بھی انکار نہیں اور وہ انکار کیوں کرتے، ان کے
نزدیک احکام شرعیہ خصوصاً عبادات بھی جس قدر عقل سے
بعید ہوں اسی قدر ان کی خوبی ہے۔
امام رازی نے زکوٰۃ کی بحث میں لکھا ہے کہ امام شافعی
کا مذہب امام ابوحنیفہ سے زیادہ صحیح ہے۔ جس کی دلیل یہ ہے
کہ امام شافعی کا مذہب عقل و قیاس سے بعید ہے اور یہی اس
کی صحت کی دلیل ہے۔ کیونکہ زکوٰۃ کے مسائل زیادہ تعبدی احکام
ہیں جن میں عقل درائے کو دخل نہیں۔
بخلاف اور ہمعصروں کے امام ابوحنیفہ کا اس اصول کی طرف
مائل ہونا ایک خاص سبب سے تھا۔ دوسرے ائمہ جنہوں نے
فقہ کی تدوین و ترتیب کی۔ اُن کی علمی ابتدا فقہی مسائل سے
ہوئی تھی، بخلاف اس کے امام ابوحنیفہ کی تحصیل علم کلام سے
شروع ہوئی۔ جس کی ممارست نے ان کی قوتِ فکر اور
حدِ نظر کو نہایت قوی کر دیا تھا۔ معتزلہ وغیرہ جن
سے ان کے معرکے رہتے تھے عقلی اصول کے پابند تھے۔
اس لئے امام صاحب کو بھی ان کے مقابلہ میں انھیں اصول سے
کام لینا پڑتا تھا اور متنازع فیہ مسئلوں میں مصالح و
اسرار کی خصوصیتیں دکھائی پڑتی تھیں، اس غور تدقیق مشق
و مہارت سے ان کو ثابت ہو گیا تھا کہ شریعت کا ہر مسئلہ

اصولِ عقل کے مطابق ہے۔ علم کلام کے بعد وہ فقہ کی طرف
متوجہ ہوئے تو ان مسائل میں بھی وہی جستجو رہی۔ حنفی فقہ
کے مسائل کا دوسری فقہوں کے مسائل سے مقابلہ کیا جائے تو
یہ تفاوت صاف نظر آتا ہے۔ معاملات تو معاملات عبادات
میں بھی جس کی نسبت ظاہر بینوں کا خیال ہے کہ اس میں عقل
کو دخل نہیں۔ امام صاحب کے مسائل عموماً عقل کے
موافق معلوم ہوتے ہیں۔

اگر اس بات پر غور کیا جائے کہ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ،
شریعت میں کن مصلحتوں سے فرض کیے گئے ہیں اور ان مصالح
کے لحاظ سے ان احکام کی بجا آوری کا کیا طریقہ ہونا چاہیے، تو
وہی طریقہ موزوں ثابت ہوگا جو حنفی فقہ سے ثابت ہوتا ہے۔
مثلاً نماز چند افعال کے مجموعہ کا نام ہے۔ لیکن اس لحاظ سے
کہ نماز کی اصل غرض کیا ہے؟ (یعنی خضوع، اظہارِ تعبد،
اقرارِ عظمتِ الٰہی، دُعا) اور اس کے حاصل ہونے میں افعال
کو کس نسبت سے دخل ہے، ان افعال کے مراتب مختلف
ہیں، بعض لازمی اور ضروری ہیں کیونکہ اُن کے نہ ہونے
سے نماز کی اصل غرض فوت ہوتی ہے۔ ان افعال کو شریعت
کی زبان میں فرض سے تعبیر کیا جاتا ہے بعض افعال
ایسے ہیں جو طریقۂ ادا میں ایک حسن و خوبی پیدا
کر دیتے ہیں، لیکن ان کے فوت ہونے سے اصل غرض فوت
نہیں ہوتی۔ ان افعال کا رتبہ پہلی قسم سے کم ہے اور ان کو

سنت و مستحب سے تعبیر کرتے ہیں

(۳) **الفاروق**: فاروقِ اعظم حضرت عمر بن خطاب خلیفۂ ثانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی سیرت ہے۔ "نامور فرماں روایانِ اسلام" کے سلسلے کی پہلی کتاب تھی لیکن المامون کے بعد لکھی گئی۔ ۱۰ اگست ۱۸۹۴ء کو علامہ نے مستقل طور پر الفاروق کی تالیف شروع کی اور کشمیر میں ۱۵ جولائی ۱۸۹۸ء کو (بقولِ علامہ) "پورے چار برس کے بعد یہ منزل طے ہوئی اور قلم کے مسافر نے کچھ دنوں کے لئے آرام لیا۔" اس زمانے میں مصنف سخت علیل تھے۔ بیماری اور ضعف کی حالت میں اس کی آخری سطریں لکھیں۔ علامہ کی تمام سیرت کی کتابوں کے دو دو حصے ہیں ایک عام حالات کا، دوسرا کمالاتِ خصوصی کا۔ اس میں بھی ایسا ہی ہے، پہلے حصہ میں حضرت عمرؓ کی زندگی کے واقعات اور فتوحاتِ ملکی کے حالات، دوسرے میں ملکی انتظامات اور ذاتی کمالات، علامہ لکھتے ہیں کہ "یہی دوسرا حصہ مصنف کی سعی و محنت کا تماشاگاہ ہے۔" اور حقیقت یہ ہے کہ باوجود اعتراضات کے، جن کا ذکر کیا گیا، الفاروق ایسی جامع و مکمل کتاب تالیف ہوئی ہے کہ کسی زبان میں اس کا جواب موجود نہ تھا۔ اس کے بعد اردو میں حضرت عمرؓ فاروق کی تین چار ضخیم اور متعدد مختصر سوانح عمریاں لکھی ہیں اور وہ سب علامہ شبلی کی خوشہ چینیاں ہیں۔ ایک دو کتابیں علماء نے لکھیں، اور اچھی لکھیں، لیکن تحقیق کا گر علامہ شبلی ہی کا سکھایا ہوا تھا۔ اسلوبِ بیان کی خوبی میں کسی کی تصنیف اس کو نہیں پہنچتی۔ خود علامہ کی ادبیت "الفاروق" میں پہلی سب کتابوں سے بہتر ہے۔

"الفاروق" علی گڑھ کی ملازمت کے زمانہ میں شروع ہوئی تھی، اور حیدرآباد کی ملازمت کے زمانے میں ختم ہوئی۔ اور "سلسلۂ آصفیہ" رقائم

کردۂ مولوی سید علی بلگرامی بسرپرستی سروقار الامرا، مدار المہام دولتِ آصفیہ) کی ایک کڑی قرار پائی۔ دونوں حصّوں کے نمونے یہ ہیں :

(الف) یہ حصّہ خاصکر بیانِ رزم میں علّامہ کا زورِ قلم دکھانے کے لئے انتخاب کیا گیا ہے۔ عراقِ عرب کے مشہور شہر قادسیہ پر مسلمانوں نے ایرانیوں سے چند بار جنگ کی، اس کا ایک معرکہ یہ تھا:

"تیسرا معرکہ یوم العماس کے نام سے مشہور ہے اس میں قعقاع نے یہ تدبیر کی کہ رات کے وقت چند رسالوں اور پیدل فوجوں کو حکم دیا کہ پڑاؤ سے دور، شام کی طرف نکل جائیں۔ پو پھٹے سو سو سوار میدانِ جنگ کی طرف گھوڑے اڑاتے ہوئے آئیں اور رسالے اِسی طرح برابر آتے جائیں، چنانچہ صبح ہوتے ہوئے پہلا رسالہ پہنچا۔ تمام فوج نے "اللہ اکبر" کا نعرہ مارا اور غل پڑ گیا کہ نئی امدادی فوجیں آگئیں۔ ساتھ ہی حملہ ہوا۔ حسنِ اتفاق یہ کہ ہشام جن کو ابو عبیدہ نے ہشام سے مدد کے لئے بھیجا تھا عین موقع پر سات سو سواروں کے ساتھ پہنچ گئے۔ یزدجرد کو دم دم کی خبریں پہنچتی تھیں۔ اور برابر فوجیں بھیجتا تھا۔ ہشام نے فوج کی طرف خطاب کیا اور کہا "تمہارے بھائیوں نے شام کو فتح کر لیا۔ فارس کی فتح کا جو خدا کی طرف سے وعدہ ہوا ہے وہ تمہارے ہاتھ سے پورا ہوگا۔" معمول کے موافق جنگ کا آغاز یوں ہوا کہ ایرانیوں کی فوج سے ایک پہلوان شیر کی طرح ڈکارتا ہوا میدان میں آیا۔ اُس کا ڈیل ڈول دیکھ کر لوگ اس کے مقابلہ سے جی چُراتے تھے۔ لیکن عجیب اتفاق سے وہ ایک

کمزور سپاہی کے ہاتھ سے مارا گیا۔ ایرانیوں نے تجربہ اُٹھا کر
ہاتھیوں کے دائیں بائیں پیدل فوجیں قائم کر دی تھیں۔ عمرو
معدی کرب نے رفیقوں سے کہا کہ "میں مقابل کے ہاتھی پر حملہ
کرتا ہوں تم ساتھ رہنا۔ ورنہ عمرو معدی کرب مارا گیا تو پھر معدی
کرب پیدا نہ ہوگا۔" یہ کہہ کر تلوار میان سے گھسیٹ لی اور ہاتھی
پر حملہ کر دیا۔ لیکن پیدل فوجیں جو دائیں بائیں تھیں، دفعۃً اُن پر
ٹوٹ پڑیں اور اِس قدر گرد اُٹھی کہ یہ نظر سے چھپ گئے۔ یہ دیکھ کر
اُن کی رکاب کی فوج حملہ آور ہوئی اور بڑے معرکے کے بعد
دشمن پیچھے ہٹے۔ عمرو بن معدی کرب کا یہ حال تھا کہ تمام
جسم خاک سے اٹا ہوا تھا۔ بدن پر جا بجا برچھیوں کے زخم تھے
تاہم تلوار قبضے میں تھی اور ہاتھ چلتا جاتا تھا۔ اسی حالت میں
ایک ایرانی سوار برابر سے نکلا۔ انھوں نے اُس کے گھوڑے
کی دُم پکڑ لی۔ ایرانی نے بار بار مہمیز کیا لیکن گھوڑا جگہ سے نہ
ہل سکا۔ آخر سوار اُتر کر بھاگ نکلا اور یہ اچھل کر گھوڑے
کی پیٹھ پر جا بیٹھے۔

سعد نے یہ دیکھ کر کہ ہاتھی جس طرف رُخ کرتے ہیں
دَل کا دَل پھٹ جاتا ہے۔ ضخم وسلم وغیرہ کو جو پارسی تھے
اور مسلمان ہو گئے تھے، بُلا کر پوچھا کہ اِس بلائے سیاہ کا کیا
علاج ہے؟ انھوں نے کہا کہ ان کی سُونڈ اور آنکھیں بیکار
کر دی جائیں۔ تمام غول میں دو ہاتھی نہایت مہیب اور
کوہ پیکر اور گویا کل ہاتھیوں کے سردار تھے۔ ایک ابیض

اور دوسرا اجرب کے نام سے مشہور تھا۔ سعد نے قعقاع، عاصم، حمال، ربیل کو بلا کر کہا کہ یہ مہم تمھارے ہاتھ ہے۔ قعقاع نے پہلے کچھ سوار اور پیادے بھیج دیئے کہ ہاتھیوں کو نرغہ میں کرلیں۔ پھر خود برچھا ہاتھ میں لے کر پیل سفید کی طرف بڑھے۔ عاصم بھی ساتھ تھے۔ دونوں نے ایک ساتھ برچھے مارے کہ آنکھوں میں پیوست ہو گئے۔ ہاتھی جھرجھری لے کر پیچھے ہٹا۔ ساتھ ہی قعقاع کی تلوار پڑی اور سونڈ مستک سے الگ ہو گئی۔

ادھر ربیل و حمال نے اجرب پر حملہ کیا۔ وہ زخم کھا کر بھاگا تو تمام ہاتھی اُس کے پیچھے ہو لئے اور دم کے دم میں یہ سیاہ بادل بالکل چھٹ گیا۔

اب بہادروں کو حوصلہ آزمائی کا موقع ملا اور اس زور کا رن پڑا کہ نعروں کی گرج سے زمین دہل دہل پڑتی تھی۔ چنانچہ اسی مناسبت سے اس معرکے کو لیلۃ الہریر کہتے ہیں۔ ایرانیوں نے فوج نئے سرے سے ترتیب دی۔ قلب میں اور دائیں بائیں تیرہ تیرہ صفیں قائم کیں۔ مسلمانوں نے بھی تمام فوج کو سمیٹ کر یک جا کیا اور آگے پیچھے تین پرے جمائے۔ سب سے آگے سواروں کا رسالہ۔ ان کے بعد پیدل فوجیں اور سب سے پیچھے تیر انداز۔ سعد نے حکم دیا تھا کہ تیسری تکبیر پر حملہ کیا جائے۔ لیکن ایرانیوں نے جب تیر برسانے شروع کئے تو قعقاع سے ضبط نہ ہو سکا اور اپنے رکاب کی فوج لے کر دشمن پر ٹوٹ پڑے۔ فوجی اصول

کے لحاظ سے یہ حرکت نافرمانی میں داخل تھی۔تاہم لڑائی کا ڈھنگ اور قعقاع کا جوش دیکھ کر سعد کے منہ سے بے اختیار نکلا کہ اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلَہٗ وَانْصُرْہٗ یعنی اے خدا قعقاع کو معاف کرنا اور اس کا مددگار رہنا۔قعقاع کو دیکھ کر بنو اسد اور بنو اسد کی دیکھا دیکھی۔ نخع۔ بجیلہ۔کندہ سب ٹوٹ پڑے۔سعد ہر قبیلے کے حملے پر کہتے جاتے تھے کہ خدا اس کو معاف کرنا اور یاور رہنا اول اول سواروں کے رسالے نے حملہ کیا۔لیکن ایرانی فوجیں جو دیوار کی طرح جمی کھڑی تھیں۔اس ثابت قدمی سے لڑیں کہ گھوڑے آگے نہ بڑھ سکے۔یہ دیکھ کر سب گھوڑوں پر سے کود پڑے اور پیادہ حملہ آور ہوئے۔

ایرانیوں کا ایک رسالہ سراپا لوہے میں غرق تھا۔قبیلۂ جعفہ نے اس پر حملہ کیا۔لیکن تلواریں زرہوں پر اچٹ اچٹ کر رہ گئیں۔سردار قبیلہ نے للکارا۔سب نے کہا زرہوں پر تلواریں کام نہیں دیتیں۔اس نے غصے میں آکر ایک ایرانی پر برچھے کا وار کیا کہ کمر کو توڑ کر نکل گیا۔یہ دیکھ کر اوروں کو بھی ہمت ہوئی اور اس بہادری سے لڑے کہ رسالہ کا رسالہ برباد ہو گیا۔

تمام رات ہنگامۂ کارزار گرم رہا۔لوگ لڑتے لڑتے تھک کر چور ہو گئے تھے اور نیند کے خمار میں ہاتھ پاؤں بیکار ہوئے جاتے تھے اس پر بھی جب فتح اور شکست کا فیصلہ نہ ہوا تو قعقاع نے سرداران قبائل میں سے چند نامور بہادر انتخاب کئے اور سپہ سالار فوج (رستم) کی طرف رخ کیا۔ساتھ ہی قیس، اشعث، عمر (معدی کرب)، ابن ذی البردین نے جو اپنے قبیلے کے سردار تھے ساتھیوں کو للکارا کہ "دیکھو! یہ لوگ خدا کی راہ میں تم سے آگے نکلنے نہ پائیں" اور اور سرداروں نے بھی جو بہادری کے ساتھ زبان آور بھی تھے اپنے قبیلوں

کے سامنے کھڑے ہو کر اس جوش سے تقریریں کیں کہ تمام لشکر میں آگ لگ گئی۔ سوار گھوڑوں پر سے کود پڑے اور تیر و کمان پھینک کر تلواریں گھسیٹ لیں اس جوش کے ساتھ تمام فوج سیلاب کی طرح بڑھی اور فیرزان و ہرمزان کو دباتے ہوئے رستم کے قریب پہنچ گئی۔ رستم تخت پر بیٹھا فوج کو لڑا رہا تھا۔ یہ حالت دیکھ کر تخت سے کود پڑا اور دیر تک مردانہ وار لڑتا رہا۔ جب زخموں سے بالکل چور ہو گیا تو بھاگ چلا۔ ہلال نام کے ایک سپاہی نے تعاقب کیا۔ اتفاق سے ایک نہر سامنے آ گئی۔ رستم کود پڑا کہ تیر کر نکل جائے۔ ساتھ ہی ہلال بھی کودے اور ٹانگیں پکڑ کر باہر کھینچ لائے۔ پھر تلوار سے کام تمام کر دیا۔ ہلال نے لاش خچروں کے پاؤں میں ڈال دی اور تخت پر چڑھ کر پکارے "رستم کا میں نے خاتمہ کر دیا" ایرانیوں نے دیکھا کہ سپہ سالار تخت پر نہیں ہے تو تمام فوج میں بھاگڑ مچ گئی۔ مسلمانوں نے دور تک تعاقب کیا اور ہزاروں لاشیں میدان میں بچھا دیں۔

افسوس کہ اس واقعہ کو ہمارے ملک الشعرأ نے قومی جوش کے اثر سے بالکل غلط لکھا ہے۔

بر آمد خروشے بکردار رعد	ز یک سوے رستم ز یک سوے سعد
چو دید آمد رستم بخوں تیرہ گشت	جوان مرد تازی بر او چیرہ گشت

ہمارے شاعر کو یہ بھی معلوم نہیں کہ سعد اس واقعہ میں سرے سے شریک ہی نہ تھے۔

"ہمارے ملک الشعرا" یعنی فردوسی پر قومی جوش کا نشہ کچھ یہیں نہیں چڑھا، بلکہ ہر ایسے موقع پر چڑھ جاتا ہے جہاں ایرانیوں اور

عربوں کا مقابلہ ہو۔ شاہنامہ لکھتے میں فردوسی کو صرف یہ یاد رہتا ہے کہ وہ ایرانی الاصل ہے، یہ بھول جاتا ہے کہ مسلمان ہے۔"

علامہ شبلی کے اس بیانِ معرکہ کے ساتھ علامہ آزاد کا وہ بیان جنگ بھی پڑھ کر دیکھا جائے جو صفحات ۴۹۹ تا ۵۰۲ پر "دربار اکبری" سے اقتباس کیا گیا ہے۔ آزاد نے بھی اپنے رنگ میں خوب لکھا ہے۔ ان کے استعارے ایک لطف پیدا کر رہے ہیں، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ آزاد "داستان" بیان کر رہے ہیں اور شبلی تاریخ لکھ رہے ہیں۔

(ب) حضرت عمرؓ کی حیثیتِ اجتہاد اور محدث و فقیہ ہونا

حدیث و فقہ کا فن درحقیقت تمام تر حضرت عمرؓ کا ساختہ و پرداختہ ہے۔ صحابہ میں اور لوگ بھی محدث و فقیہ تھے، چنانچہ ان کی تعداد ۲۰ سے متجاوز بیان کی گئی ہے۔ لیکن فن کی ابتدا حضرت عمرؓ سے ہوئی اور فن کے اصول و قواعد اول انہی نے قائم کئے۔

حدیث کے متعلق پہلا کام جو حضرت عمرؓ نے کیا یہ تھا کہ روایتوں کی تفحص و تلاش پر توجہ کی۔ آنحضرتؐ کے زمانے میں احادیث کے استقصاء کا خیال نہیں کیا گیا تھا۔ جس کو کوئی مسئلہ پیش آتا تھا، خود آنحضرتؐ سے دریافت کر لیتا تھا۔ اور یہی وجہ تھی کہ کسی ایک صحابی کو فقہ کے تمام ابواب کے متعلق حدیثیں محفوظ نہ تھیں۔ حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں زیادہ ضرورتیں پیش آئیں۔ اس لئے مختلف صحابہ سے استفسار کرنے کی ضرورت پیش آئی اور احادیث سے استقرار کا

راستہ نکلا۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں چونکہ زیادہ کثرت سے واقعات پیش آئے کیونکہ فتوحات کی وسعت اور نو مسلموں کی کثرت نے سیکڑوں نئے مسائل پیدا کر دئے تھے۔ اس لحاظ سے انھوں نے احادیث کی زیادہ تفتیش کی تاکہ یہ مسائل آنحضرت کے اقوال کے موافق طے کئے جائیں۔ اکثر ایسا ہوتا کہ جب کوئی نئی صورت پیش آتی تو حضرت عمرؓ مجمع عام میں جس میں اکثر صحابہ موجود ہوتے تھے، پکار کر کہتے کہ اس مسئلے کے متعلق کسی کو کوئی حدیث معلوم ہے ؟۔ تکبیر جنازہ، غسل جنابت، جزیۂ مجوس، اور اس قسم کے بہت سے مسائل ہیں، جن کی نسبت کتب احادیث میں نہایت تفصیل سے مذکور ہے کہ حضرت عمرؓ نے مجمع صحابہ سے استفسار کر کے حدیث نبوی کا پتہ لگا لیا۔ ......

یہ تمام بحث تدوین مسائل کی حیثیت سے تھی۔ لیکن فن فقہ کے متعلق حضرت عمرؓ کا اصلی کارنامہ اور چیز ہے۔ انھوں نے صرف یہ نہیں کیا کہ جزئیات کی تدوین کی بلکہ مسائل کی تفریع و استنباط کے اصول اور ضوابط قرار دئے جس کو آج کل اصول فقہ کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ سب سے پہلا مرحلہ یہ تھا کہ آنحضرتؐ سے جو اقوال و افعال منقول ہیں، وہ کُلیتہً مسائل کا ماخذ ہو سکتے ہیں یا ان میں کوئی تفریق ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحب نے اس بحث پر "حجۃ اللہ البالغہ" میں ایک نہایت مفید مضمون لکھا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے جو منصب نبوت سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کی نسبت خدا کا ارشاد ہے کہ

مَا اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا

پیغمبر جو چیز تم کو دے وہ لو اور جس چیز سے روکے اس سے باز رہو۔ دوسری وہ

جن کو منصب رسالت سے تعلق نہیں۔ چنانچہ ان کے متعلق خود آنحضرت نے

ارشاد فرمایا:۔

انما انا بشر اذا امرتکم بشئ	یعنی میں آدمی ہوں، اس لئے جب
من دینکم فخذوا به واذا	میں دین کی بابت کچھ حکم دوں تو اسکو لو
امرتکم بشئ من رأیی	اور جب میں اپنی رائے سے کچھ کہوں تو
فانما انا بشر۔	میں ایک آدمی ہوں۔

اس کے بعد شاہ ولی اللہ صاحب لکھتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے طب کے متعلق جو کچھ ارشاد فرمایا جو افعال، آنحضرت سے عادۃً صادر ہوئے نہ عبادۃً یا اتفاقاً واقع ہوئے نہ قصداً جو باتیں آنحضرتؐ نے مزعومات عرب کے موافق بیان کیں۔ مثلاً اُم زرع کی حدیث اور خرافہ کی حدیث جو باتیں کسی جزئی مصلحت کے موافق اختیار کیں۔ مثلاً لشکر کشی اور اس قسم کے اور بہت سے احکام، یہ سب دوسری قسم میں داخل ہیں۔ شاہ ولی اللہ صاحب نے احادیث کے مراتب میں جو فرق بتایا اور جس سے کوئی صاحب نظر انکار نہیں کرسکتا۔ اس تفریق مراتب کے موجد دراصل حضرت عمرؓ ہیں۔ کتب سیر اور احادیث میں تم نے اکثر پڑھا ہوگا کہ بہت سے ایسے موقعے پیش آئے کہ جناب رسول اللہ صلعم نے کوئی کام کرنا چاہا کوئی بات ارشاد فرمائی تو حضرت عمرؓ نے اس کے خلاف رائے ظاہر کی، مثلاً صحیح بخاری میں ہے کہ جب آنحضرتؐ نے عبداللہ بن اُبی کے جنازے کی نماز پڑھنی چاہی تو حضرت عمرؓ نے کہا کہ آپ منافق کے جنازے پر نماز پڑھتے ہیں۔ قیدیان بدر کے معاملے میں ان کی رائے بالکل آنحضرت کی تجویز سے الگ تھی۔

صلح حدیبیہ میں انھوں نے آنحضرت کی خدمت میں عرض کیا کہ اس طرح دب کر کیوں صلح کی جائے۔ ان تمام مثالوں سے تم خود اندازہ کرسکتے ہو کہ حضرت عمرؓ ان باتوں کو منصبِ نبوّت سے الگ سمجھتے تھے، ورنہ اگر باوجود اس امر کے علم کے کہ وہ باتیں منصب رسالت سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان میں دخل دیتے تو بزرگ ماننا درکنار ہم ان کو اسلام کے دائرے سے بھی باہر سمجھتے۔

اسی فرق مراتب کے اصول پر بہت سی باتوں میں جو مذہب سے تعلق نہیں رکھتی تھیں اپنی رایوں پر عمل کیا مثلاً حضرت ابو بکرؓ کے زمانے تک اُمہاتِ اولاد یعنی وہ لونڈیاں جن سے اولاد پیدا ہو جائے برابر خریدی اور بیچی جاتی تھیں۔ حضرت عمرؓ نے اس کو بالکل رد کردیا۔ آنحضرتؐ نے جنگ تبوک میں جزیہ کی تعداد فی کس ایک دینار مقرر کی تھی۔ حضرت عمرؓ نے مختلف ملکوں میں مختلف شرحیں مقرر کیں۔ آنحضرتؐ کے عہد میں شراب کی کوئی خاص حد مقرر نہ تھی۔ حضرت عمرؓ نے اسّی کوڑے مقرر کیے۔

یہ ظاہر ہے کہ ان معاملات میں آنحضرتؐ کے اقوال و افعال اگر تشریعی حیثیت سے ہوتے تو حضرت عمرؓ کی کیا مجال کہ ان میں کمی بیشی کرسکتے۔ اور خدانخواستہ وہ کرنا چاہتے تو صحابہ کا گروہ ایک لحظہ کے لیے بھی مسندِ خلافت پر ان کا بیٹھنا کب گوارا کرسکتا تھا

حضرت عمرؓ کو اس امتیاز مراتب کی جرأت اس وجہ سے ہوئی کہ آنحضرتؐ کے متعدد احکام میں انھوں نے دخل دیا تو آنحضرتؐ نے اس پر ناپسندیدگی نہیں ظاہر کی، بلکہ متعدد معاملات میں حضرت عمرؓ

کی رائے کو اختیار فرمایا اور بعض موقعوں پر تو خود، وحی الٰہی نے حضرت عمرؓ کی رائے کی تائید کی۔ قیدیانِ بدر، حجاب ازواجِ مطہرات، نمازِ بر جنازہ منافق، ان تمام معاملات میں وحی جو آئی وہ حضرت عمرؓ کی رائے کے موافق آئی۔

اس تفریق اور امتیاز کی وجہ سے فقہ کے مسائل پر بہت اثر پڑا، کیونکہ جن چیزوں میں آنحضرتؐ کے ارشادات، منصبِ رسالت کی حیثیت سے نہ تھے ان میں اس بات کا موقع باقی رہا کہ زمانے اور حالاتِ موجودہ کے لحاظ سے نئے قوانین وضع کئے جائیں۔ چنانچہ معاملات میں حضرت عمرؓ نے زمانے اور حالات کی ضرورتوں سے بہت سے نئے نئے قاعدے وضع کئے جو آج حنفی فقہ میں بکثرت موجود ہیں، برخلاف اس کے امام شافعی کو یہاں تک کدّ ہے کہ ترتیبِ فوج، تعیین شعار، محاصل وغیرہ کے متعلق بھی وہ آنحضرتؐ کے اقوال کو تشریعی قرار دیتے ہیں اور حضرت عمرؓ کے افعال کی نسبت لکھتے ہیں کہ رسول اللہؐ کے سامنے کسی کے قول و فعل کی کچھ اصل نہیں۔

(۴) **سفرنامۂ روم و مصر و شام** "الفاروق" کے بعد شائع ہوا یہ کوئی علم و فن کی کتاب نہیں، اس لئے علاّمہ کی تصانیف میں خاص طور پر قابلِ ذکر نہیں ہے لیکن اس حیثیت سے کہ (بقول مصنف) ایک طالب العلمانہ سفر تھا" اور اس نوع کا شاید پہلے ہندوستانی کا سفر تھا، یادگار چیز ہے۔ مصنف دیباچے میں لکھتے ہیں:-

علاوہ اُن جزئی دلچسپ واقعات کے جو سلسلۂ بیان میں آگئے
ہیں۔ قسطنطنیہ، بیروت، بیت المقدس، قاہرہ وغیرہ کے متعلق واقعات
ذیل یعنی شہر کی عام اجمالی حالت، قابل دید مقامات، مشہور عمارات
سررشتہ تعلیم، دارالعلوم اور مدارس، بورڈنگ اور طلباء کی تربیت،
تعلیم نسواں، مصنفین اور تصنیفات، کتب خانے، اخبارات اور
رسالے، مشہور پاشاؤں اور ارباب کمال کی ملاقات، ترکوں اور
عربوں کے اخلاق و عادات کو تفصیل کے ساتھ لکھا ہے"

علامہ شبلی نے رمضان ۱۳۰۹ھ میں ۲۶ اپریل ۱۸۹۲ء کو سفر
شروع کیا تھا۔ ۶ مہینے میں واپس آئے۔ راستہ میں کچھ دور تک علی گڈھ کالج
کے پروفیسر آرنلڈ رفیق سفر رہے۔ ہم نمونے کے طور پر بجائے کسی عمارت
یا دارالعلوم یا کتب خانہ کی سیر کے، تمام کتاب میں، جگہ جگہ سے ڈھونڈھ کر
صرف وہ باتیں لکھتے ہیں جن کو مصنف نے "جزئی دلچسپ واقعات" قرار دیا ہے
اور جو "سلسلہ بیان میں آگئے ہیں"

چونکہ عام طور پر یہ مشہور ہے کہ جہاز پر پرند جانور ذبح نہیں کئے
جاتے اور مولوی سمیع اللہ خاں صاحب نے اپنے سفرنامہ میں تجربہ سے
اس کی تصدیق بھی کی ہے۔ میں نے دو تین روز تک پرندے کے
گوشت کھانے سے پرہیز کیا۔ مسٹر آرنلڈ نے مجھ سے اس کا سبب
دریافت کیا۔ میں نے کہا کہ ہمارے مذہب میں منخنقہ حرام ہے۔ بولے
کہ اس جہاز پر پرند جانور ذبح کئے جاتے ہیں۔ گردن مروڑ کر مارے نہیں
جاتے۔ چونکہ شرعاً ان کی تنہا شہادت کافی نہ تھی، میں خود گیا اور اس کی
تصدیق کی۔ ذبح کرنے والا عیسائی تھا۔ وہ ذبح کرنے کے وقت کچھ

پڑھتا نہ تھا۔ صرف گردن پر چھری پھیر دیتا تھا۔ اگرچہ حنفیوں کے ہاں یہ ذبیحہ حلال نہیں، لیکن اس مسئلہ میں چند دنوں کیلئے میں شافعی بن گیا جن کے ہاں ہر طرح کا ذبیحہ جائز ہے۔

عدن سے چونکہ دلچسپی کے نئے سامان پیدا ہو گئے تھے، اس لئے ہم بڑے لطف سے سفر کر رہے تھے۔ لیکن دوسرے ہی دن ایک پُرخطر واقعہ پیش آیا، جس نے تھوڑی دیر کے لئے مجھ کو سخت پریشان رکھا۔ ۱۰ رمئی کی صبح کو میں سوتے سے اٹھا تو ایک ہم سفر نے کہا کہ جہاز کا انجن ٹوٹ گیا۔ میں نے دیکھا تو واقعی کپتان اور جہاز کے ملازم گھبرائے پھرتے تھے، اور اس کی درستی کی تدبیریں کر رہے تھے۔ انجن بالکل بیکار ہو گیا تھا اور جہاز نہایت آہستہ ہوا کے سہارے چل رہا تھا۔ میں سخت گھبرایا اور نہایت ناگوار خیالات دل میں آنے لگے۔ اس اضطراب میں اور کیا کر سکتا تھا۔ دوڑا ہوا مسٹر آرنلڈ کے پاس گیا۔ وہ اس وقت نہایت اطمینان کے ساتھ کتاب کا مطالعہ کر رہے تھے۔ میں نے ان سے کہا آپ کو کچھ خبر بھی ہے! بولے کہ ہاں انجن ٹوٹ گیا ہے۔ میں نے کہا کہ آپ کو کچھ اضطراب نہیں، بھلا یہ کتاب دیکھنے کا کیا موقع ہے؟

فرمایا کہ جہاز کو اگر برباد ہی ہونا ہے تو یہ تھوڑا سا وقت اور بھی قدر کے قابل ہے، اور ایسے قابل قدر وقت کو رائگاں کرنا بالکل بے عقلی ہے۔

ان کے استقلال اور جرأت سے مجھ کو بھی اطمینان ہوا۔
آٹھ گھنٹے کے بعد انجن درست ہوا اور بدستور چلنے لگا"

پورٹ سعید پر سفر کی حالت میں جو تجدّد ہوا وہ
یہ تھا کہ بمبئی سے پورٹ سعید تک جہاز پر کوئی مسلمان
نہ تھا۔ یہاں پہونچ کر دو ایک مسلمان نظر آئے۔ اور
بیروت میں تو سارا جہاز شامی عربوں سے بھر گیا۔
میں بڑے شوق سے ان کے پاس گیا لیکن وہ مطلقاً
متوجہ نہوے۔ جس شخص کے پاس کھڑا ہوا اس نے
ایک بار آنکھ اٹھا کر میری طرف دیکھا اور گردن نیچی کرلی
مجکو اس بد اخلاقی پر سخت تعجب ہوا۔ دل میں کہتا تھا
کہ عربوں کی مہمان نوازی کی یہ کچھ تعریفیں سنی تھیں!
ان کو تو بات چیت میں بھی مضائقہ ہے۔ ان میں مدرسہ
حربیہ کے چند طلبا تھے جو رخصت لیکر وطن میں آئے
تھے اور اب قسطنطنیہ جا رہے تھے وہ کبھی دل بہلانے
کے لئے عربی دیوان پڑھا کرتے تھے۔ میں نے خیال
کیا کہ ہم فنی کے ذریعہ سے تعارف پیدا کروں۔ چنانچہ
ان کے پاس گیا اور دخل در معقولات کے طور پر اپنی
مولویت اور علمیت جتانی شروع کی۔ وہ اس پر بھی
متوجہ نہ ہوئے۔ میں اپنا سا منہ لیکر چلا آیا لیکن مجھ کو
یقین تھا کہ اس واقعہ کا ضرور کوئی سبب ہے۔ اتفاقاً
ایک موقع پر ایک شخص نے میرا مذہب پوچھا۔ میں نے

کہا "اسلام" بولا لا واللّٰہ اھذا طربوش المسلم یعنی ہرگز نہیں کہیں مسلمان بھی ایسی ٹوپی اوڑھتے ہیں۔ بدقسمتی سے میرے سر پر ایرانی ٹوپی تھی، اور اس وجہ سے تمام عرب مجکو مجوسی سمجھتے تھے۔ یہ معما جب حل ہوا تو میں نے ان لوگوں کے دل سے اس بدگمانی کو رفع کر دیا۔ اور پھر وہ ایسے خیر و شکر ہوتے کہ ایک دم کو مجھ سے جدا ہونا نہیں چاہتے تھے۔"

"(قسطنطنیہ کا ذکر ہے) ایک دن شیخ علی ظبیان جن کے والد ایک مشہور صوفی ہیں۔ شیخ عبدالفتاح سے ملنے آئے میں بھی اس وقت موجود تھا۔ اور اتفاق سے رسالہ **اسکات المعتدی** جو میری قدیم تصنیف ہے اور عربی زبان میں ہے، سامنے رکھا ہوا تھا۔ انھوں نے اٹھا کر دیکھا اور کہا کہ آہا یہ رسالہ مدت ہوئی میں نے دمشق میں اپنے شیخ کے پاس دیکھا تھا۔ اور انھوں نے اس مصنف کی نسبت کہا تھا شکر اللّٰہ مُسَاعِیَہٗ شیخ علی ظبیان کو معلوم ہوا کہ وہ رسالہ میری ہی تصنیف ہے تو اٹھ کر بڑی گرم جوشی سے ملے اور نہایت لطف و مہربانی سے پیش آئے۔ مجکو اس بات سے کہ میری ناچیز تصنیف یہاں تک پونہچی اور لوگوں نے اس کو نگاہِ قبول سے دیکھا۔ نہایت مسرت ہوئی، اور سفر کی کس مپرسی میں اتنا ذریعۂ تعارف بہت غنیمت معلوم ہوا۔"

"(قسطنطنیہ کے احباب کا ذکر کرتے ہیں) شام کو ہم

تین چار آدمی ایک قہوہ خانے میں جو عین لب دریا ہے، ساتھ بیٹھا کرتے تھے اور عجب لطف و مزہ کی صحبت رہتی تھی۔ کبھی کبھی مغرب کے بعد کشتی کرایہ کرتے اور سمندر کی سیر کرتے پھرتے۔ فواد کو گانا آتا تھا۔ مزے میں آکر عربی گیت گایا کرتے ایک دن مجھ سے فرمائش کی کہ کوئی ہندی چیز سناؤ میں نے بہتیرا کہا کہ بھائی میں مولوی آدمی ہوں۔ مجکو گانے سے کیا واسطہ۔ لیکن وہ کب مانتے تھے۔ آخر مجبور ہوکر میں نے اردو کے دو شعر آواز کو گھٹا بڑھا کر پڑھے اور کہا ہندی میں یوں ہی گاتے ہیں۔"

غازی عثمان پاشا کی ملاقات اور تمغۂ* مجیدی کا عطا ہونا

یہ وہی نامور جنرل ہے جس نے پلونا میں چو بیس ہزار روسی مجروح اور آٹھ ہزار تہ تیغ کئے تھے، جس کے مقابلے میں شہنشاہِ روس نے اپنی کل فوجی قوت صرف کردی تھی۔ اور خود سپہ سالار بن کر گیا تھا، جس نے باوجود فوج کی کمی اور رسد کی قلت کے روس کی مجموعی طاقت کا مدت تک مقابلہ کیا اور میدانِ جنگ میں زخمی ہوکر گرفتار ہوا تو خود شہنشاہِ روس نے اس کی کمر میں تلوار باندھی، اور مہینوں تک اپنا مہمان رکھا........

---

* اس لفظ کا صحیح املا تمغا ہے۔ علامہ شبلی نے شاید سہواً تمغہ لکھدیا ہے۔ ہم نے اسی طرح رہنے دیا ہے

میں ایک مترجم کو ساتھ لیکر ان کے مکان پر گیا۔
گھنٹی بجانے پر دروازہ کھلا۔ دربان نے اندر جانے کی اجازت
دی...... تھوڑی دیر کے بعد پاشائے موصوف تشریف لائے
جن صاحب کو میں نے مترجمی کے لئے ساتھ لے لیا تھا، سررشتہ
تعلیم کے ایک افسر تھے۔ انھوں نے حسب قاعدہ آگے بڑھکر
پاشائے موصوف کے دامن کا کنارہ چوما، اور مودبانہ طور سے
پیچھے ہٹے۔ میں نے طریقۂ سنّت کے موافق سلام کیا پاشائے
موصوف نے سلام کا جواب دیا۔ اور مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا
مزاج پرسی کے بعد نام اور مقام پوچھا۔ مترجم نے کہا کہ
ہندوستان کے علماء میں سے ہیں اور تحقیقات علمی کی غرض
سے آئے ہیں۔ یہ سن کر نہایت مہربانی اور توجہ ظاہر کی اور
دیر تک مسلمانوں کے حالات پوچھتے رہے۔ رخصت ہوکر
میں اٹھا تو خود بھی اُٹھے اور کہا آپ دوبارہ تشریف لائیں
تو مجکو خوشی ہوگی ......

دوسری دفعہ ملاقات کو گیا تو پہلے سے کمرے میں آبیٹھے ہیں
اندر داخل ہوا تو کرسی سے اُٹھ کر دو ایک قدم بڑھے اور پہلے
دن کی طرح ہاتھ ملایا۔ اس کے بعد میں جب ان سے ملا تو اسی
طریقے سے ملے۔ پاشائے موصوف مجھ پر نہایت مہربان ہوگئے
تھے۔ جب میری روانگی کا زمانہ قریب آیا اور میں نے ان سے
کہا کہ اب میں یہاں دو چار روز کا مہمان ہوں، تو فرمایا ایک دو
دن جانے سے پہلے مجھ سے مل لینا۔ اسی اثنا میں انھوں نے

سلطان سے میرے لئے تمغہ مجیدی عطا ہونے کی درخواست
کی اور منظور ہو گئی، لیکن مجکو اس کی کچھ اطلاع نہ تھی۔
ایک دن دوپہر کے وقت میں اپنے مکان میں سو رہا تھا
کہ میرے ایک دوست دوڑے ہوئے آئے۔ اور جگا کر کہا کہ
یا شبلی واللہ لقد طلع لک النیشان مجکو ایک گونہ تعجب ہوا،
اور میں نے کہا یوں ہی کہتے ہو۔ آخر تم کو معلوم کیونکر ہوا؟
بولے کہ تمام اخبارات میں چھپ گیا ہے۔ میں اسی وقت
اٹھا اور ایک قرأت خانے میں جا کر اخبار دیکھے تو واقعی وہ خبر
صحیح تھی۔ اسی وقت مجکو خیال پیدا ہوا کہ میں انگریزی رعیت
ہوں۔ اس لحاظ سے انگلش سفیر کو اس کی اطلاع دینی ضرور
ہے۔ دوسرے دن میں سفیر کے پاس گیا اتفاق سے وہ مکان
پر نہ تھے۔ میں اپنا کارڈ چھوڑ آیا۔ دوسرے دن تمام احباب
مبارک باد کو آئے۔ میں نے ایک مختصر جلسہ دعوت ترتیب
دیا۔ شیخ علی ظبیان، عبد السلام آفندی، فواد، شامی، شریف
اور دیگر احباب شریک جلسہ تھے۔ دعوت کی صبح کو عثمان پاشا کی دعی
ملاقات کو گیا۔ تمغہ کی خبر ایسی عام ہو گئی تھی کہ پاشائے
موصوف کے مکان پر پہنچا تو سب سے پہلے دربان نے
کہا، "تمغۂ مجیدی مبارک" مجکو تعجب ہوا کہ اس کو کیونکر خبر ہوئی
معلوم ہوا کہ یہاں اُمرا اور پاشاؤں کے نوکر چاکر عموماً
پڑھے لکھے ہوتے ہیں۔ اور فرصت کے اوقات میں اخبارات
پڑھا کرتے ہیں۔ پاشائے موصوف نے ملاقات کے ساتھ

تمغہ کی مبارکباد دی۔ تمغہ سامنے میز پر رکھا ہوا تھا۔ بکس سے
نکال کر پہلے انھوں نے آنکھوں سے لگایا، پھر مجکو حوالے کیا
میں سرد قد کھڑا ہو گیا اور سلطان کو دعا دی۔

تمغائے مجیدی

تمغا کے ساتھ ایک فرمان سلطانی بھی عطا ہوا تھا۔ "شیر پلونا"
عثمان پاشا نے اپنا فوٹو بھی اپنے قلم سے تہدیہ لکھ کر علامہ کو دیا
تھا۔ علامہ شبلی تمغائے مجیدی کو کبھی استعمال نہ کر سکے اس لئے کہ
انگریزی قانون کی رُو سے کسی غیر سلطنت کا تمغا قبول یا استعمال کرنا

ممنوع تھا۔ سفرنامہ میں بعض دلچسپ واقعات اور بھی ہیں۔

(۵) الغزالی۔ دسمبر ۱۹۰۱ء میں بمقام حیدر آباد لکھ کر ختم کی اور "سلسلۂ آصفیہ" میں چھپی۔ اس کے بھی حسب معمول دو حصے ہیں۔ اس کی وجہ تالیف خود علامہ بیان کرتے ہیں:-

علم کلام جو مسلمانوں کی خاص ایجادات میں سے ایک مہتم بالشان علم اور ان کا سرمایۂ ناز ہے، میں آج کل اس کی نہایت مبسوط تاریخ لکھ رہا ہوں اور اس کے چار حصے قرار دئے ہیں۔

(۱) علم کلام کی ابتدا، اس کی مختلف شاخیں، عہد بعہد کی تبدیلیاں اور ترقیاں۔

(۲) علم کلام نے اثبات عقائد اور ابطال فلسفہ کے متعلق کیا کیا اور کس حد تک کامیابی حاصل کی۔

(۳) آئمۂ کلام کی سوانح عمریاں۔

(۴) جدید علم کلام۔

پہلا حصہ بقدر معتدبہ لکھا جا چکا تھا کہ بوجوہ رک گیا اور تیسرا حصہ شروع ہو گیا۔ اس حصے میں امام غزالی کی سوانح عمری شروع ہوئی تو بڑھتے بڑھتے ایک مستقل کتاب بن گئی۔ چونکہ پوری کتاب کی تیاری کو عرصہ درکار تھا۔ مناسب معلوم ہوا بلا انتظار باقی یہ حصہ الگ شائع کر دیا جائے۔ امام صاحب کے حالات میں ان کے اصول عقائد اور طرز استدلال کی تفصیل بھی ہے، اس طرح علم کلام کے اکثر مہتم بالشان مسائل بھی اس کتاب میں آ گئے ہیں۔

امام غزالی کی اکثر تصنیفات اور اُن کے موضوع اور عظمتِ شان بیان کرنے کے بعد علامہ شبلی لکھتے ہیں :

"امام صاحب نے یوں تو بہت سے علوم و فنون میں کتابیں لکھیں، لیکن تخصیص کے ساتھ جن علوم کو ترقی دی، وہ فقہ، اصولِ فقہ، کلام اور اخلاق ہیں........ اِس لحاظ سے اگرچہ ہمارا فرض تھا کہ ہم امام صاحب کی ان ایجادات اور استنباطات کو بہ تفصیل لکھتے جو ان علوم میں ان سے یادگار ہیں۔ لیکن ہمارے ناظرین کو شافعی فقہ اور اصولِ فقہ سے دلچسپی نہیں ہو سکتی۔ اس لئے ہم امام صاحب کے ان علمی کارناموں کے بیان کرنے پر اکتفا کرتے ہیں جو علمِ کلام اور علمِ اخلاق کے متعلق ان سے ظہور میں آئے ملک کا مذاق اور ملک کی حالت بھی اسی کی مقتضی ہے کہ فلسفہ آمیز علوم کے مسائل قوم کے سامنے پیش کئے جائیں۔"

چنانچہ حصہ دوم میں سے اخلاق اور کلام کے متعلق دو اقتباسات درج کئے جاتے ہیں :

(الف) احیاء العلوم کو جن خصوصیتوں نے تمام قدیم و جدید تصنیفات سے ممتاز کر دیا ہے۔ ہم ان کو بترتیب لکھتے ہیں :

(۱) بڑی خصوصیت جس نے عام و خاص، عارف و جاہل، سب میں اُسے مقبول بنا دیا ہے، یہ ہے کہ حکمت و موعظت دونوں کو ساتھ ساتھ نباہا ہے۔ تحریر و تقریر کا سب سے مشکل پہلو وہاں پیدا ہوتا ہے جہاں دو مختلف طبیعتوں کے آدمیوں سے خطاب کرنا پڑتا ہے۔ واعظ اپنی جادو بیانی سے ایک جمِ غفیر کو

وجد میں لاسکتا ہے۔ لیکن حکیمانہ طبیعت کا آدمی اس سے متاثر نہیں ہوسکتا۔ برخلاف اس کے ایک حکیم جب معارف وحقائق پر تقریر کرتا ہے تو عوام پر اس کا جادو نہیں چلتا۔ احیاء العلوم میں یہ خاص کرامت ہے کہ جس مضمون کو ادا کیا ہے، باوجود سہل پسندی، عام فہمی اور دلاویزی کے فلسفہ وحکمت کے معیار سے کہیں اُترنے نہیں پایا۔ یہی بات ہے کہ امام رازی سے لیکر ہمارے زمانہ کے سطحی واعظ تک اُس سے یکساں لطف اُٹھاتے ہیں۔

(۲) امام صاحب کے زمانہ تک یہ دستور تھا کہ فلسفہ اور متعلقاتِ فلسفہ پر جس قدر کتابیں لکھی جاتی تھیں، عموماً پیچیدہ اور دقیق عبارت میں لکھی جاتی تھیں۔ اور بوعلی سینا نے تو فلسفہ کو گویا طلسم بنادیا تھا۔ اس کی وجہ کچھ تو یہ تھی کہ فلسفہ کے مسائل خود دقیق ہوتے تھے۔ کچھ یہ کہ یونانیوں کے زمانے سے یہ خیال چلا آتا تھا کہ فلسفہ کو عام فہم نہ کرنا چاہیئے، کچھ یہ کہ اکثر لوگ یہ قابلیت ہی نہ رکھتے تھے کہ پیچیدہ مطالب کو آسان عبارت میں ادا کرسکیں۔ فلسفہ کے اور اقسام کی بہ نسبت فلسفۂ اخلاق آسان اور سریع الفہم ہے۔ تاہم اخلاق پر جو بھی کتابیں لکھی گئی تھیں، مثلاً کتاب الطہارت لابن مسکویہ اشکال سے خالی نہ تھیں۔ امام صاحب پہلے شخص ہیں جنھوں نے فلسفۂ اخلاق کے مسائل اِس طرح اَدا کئے کہ دقیق سے دقیق نکتے افسانہ اور لطائف بن گئے۔ ایک ہی مضمون کو کتاب الطہارت اور

احیاء العلوم دونوں میں دیکھو، کتاب الطہارۃ میں غور و فکر اور خوض سے کام لینا پڑے گا اور باوجود اس کے زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ کتاب کا مطلب تمہاری سمجھ میں آجائے۔ احیاء العلوم میں یہ معلوم بھی نہ ہوگا کہ تم کوئی علمی کتاب پڑھ رہے ہو۔ تم قصہ کی طرح اس کو پڑھتے چلے جاؤ گے اور مضمون کی نسبت صرف یہی نہیں ہوگا کہ تم اس کو سمجھ جاؤ، بلکہ دل پر اس کی کیفیت طاری ہو گی اور تم سراپا اثر میں ڈوب جاؤ گے۔

(۳) اخلاق کی تعلیم میں ایک بہت بڑی غلطی ہمیشہ یہ ہوتی آئی ہے کہ اختلافِ طبائع و اَمزِجہ کا لحاظ نہیں کیا جاتا۔ کسی بانیِ مذہب کے نزدیک اگر تجرّد اور ترکِ اختلاط پسندیدہ ہے تو وہ چاہے گا کہ تمام عالم تارک الدنیا ہو جائے۔ دوسرے کے نزدیک اگر حُسنِ معاشرت اور فیض رسانی عام زیادہ مفید ہے تو اس کی خواہش ہو گی کہ سب اسی قالب میں ڈھل جائیں۔ لیکن چونکہ انسانی طبیعتیں مختلف ہیں، اس لئے اس قسم کی یک طرفہ تعلیم کا اثر خاص طبائع تک محدود رہ کر باقی ہزاروں آدمیوں کے حق میں بیکار ہو جاتا ہے۔ اس نکتہ کو سب سے پہلے امام صاحب نے سمجھا۔ ان کے اصول کے مطابق اخلاق کی تعلیم، اختلافِ طبائع کے لحاظ سے ہونی چاہئے۔ جس شخص کا مزاج قدرتی طور سے معاشرت پسند واقع ہوا ہے، اس کو ہرگز تجرّد اور ترکِ تعلقات کی تعلیم نہیں کرنی چاہئے بلکہ معاشرت کے وہ اصول اور قواعد بتانے چاہئیں جس کے

ذریعے اُس سے وہ نیکیاں ظہور میں آئیں جو معاشرت کے ساتھ مخصوص ہیں۔ مثلاً صلۂ رحم، حاجت روائیِ خلق، ہدایتِ عام، اسی طرح جس کا مزاج تجرد پسند ہے اُس کو ہرگز معاشرت کی ہدایت نہیں کرنی چاہیے، بلکہ گوشہ گیری اور ترکِ تعلقات کے ایسے اصول سکھانے چاہئیں جن سے وہ اعتدال سے متجاوز نہ ہونے پائے۔

(۴) امام صاحب نے معاشرت اور اخلاق کی بنیاد اگرچہ تمام تر مذہب پر رکھی ہے اور اسی وجہ سے ہر عنوان کی ابتدا میں روایاتِ شرعیہ سے استنباط کرتے ہیں۔ لیکن اس نکتہ کو ہر جگہ ملحوظ رکھا ہے کہ شارع کے کونسے افعال رسالت کی حیثیت سے تعلق رکھتے ہیں اور کونسے معاشرت اور عادت کی حیثیت سے آدابِ طعام پر جو مستقل مضمون لکھا ہے اس میں جہاں کھانا کھانے کے قاعدے لکھے ہیں۔ ایک قاعدہ یہ لکھا ہے کہ کھانا دسترخوان پر چن کر کھانا چاہیے، میز یا صندلی پر رکھ کر کھانا نہ چاہیے۔ اس کی سند میں حضرت انس رض کی ایک حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی صندلی پر رکھ کر نہیں کھایا۔ پھر قدمائے سلف کا یہ مقولہ نقل کیا ہے کہ دو چار چیزیں بدعت ہیں، جو آں حضرت کے بعد رائج ہوئیں کھانے کی میز یا صندلیاں۔ اشنان۔ پیٹ بھر کھانا۔ ان اقوال کے بعد لکھتے ہیں، گو دسترخوان پر کھانا اچھا ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ میز یا صندلی پر کھانا مکروہ یا حرام ہے کیونکہ

اس قسم کا کوئی حکم شریعت میں وارد نہیں۔ باقی یہ امر کہ یہ چیزیں آنحضرتؐ کے بعد ایجاد ہوئیں۔ تو یہ کوئی کلیہ نہیں کہ ہر ایجاد بدعت ہے۔ بدعت ناجائز صرف وہ ہے جو کسی سنت کی مخالف ہو یا جس سے شریعت کا کوئی حکم باوجود بقائے علت کے باطل ہو جائے۔ ورنہ حالات کے اقتضاء کے موافق بعض ایجادات مستحب اور پسندیدہ ہیں سندلی پر کھانے میں صرف یہ بات ہے کہ کھانا زمین سے ذرا اونچا ہو جاتا ہے اور کھانے میں آسانی ہوتی ہے اور یہ کوئی ممنوع امر نہیں۔ جن چار چیزوں کو بدعت کہا گیا ہے، سب یکساں نہیں ہیں۔ اشنان (ایک گھانس کا نام ہے) سے جو صابن کے بجائے ہاتھ دھونے کے وقت استعمال کی جاتی تھی۔ ہاتھ دھونا تو اور اچھی بات ہے کیونکہ اس میں صفائی اور نفاست ہے۔ کھانے کے بعد ہاتھ دھونے میں تو اور صفائی ہے۔ اگلے زمانے میں اگر اس کا استعمال نہیں کیا جاتا تھا تو اس کی وجہ یہ ہوگی کہ اس زمانے میں اس کا رواج نہ تھا۔ یا وہ میسر نہ آتی ہوگی۔ یا وہ لوگ ایسی مہمات میں مشغول تھے جو صفائی پر مقدم تھے۔ یہاں تک کہ وہ ہاتھ بھی نہیں دھوتے تھے اور تلووں میں ہاتھ پونچھ لیا کرتے تھے۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ ہاتھ دھونا مستحب نہیں۔

یہ بات بھی لحاظ کے قابل ہے کہ امام صاحب نے معاشرت کے جو آداب لکھے ہیں وہ ایشیائی طریقہ کی بہ نسبت زیادہ تر مہذب ممالک کے طریقہ سے ملتے ہیں۔ مثلاً کھانے کے آداب

میں لکھتے ہیں۔ کھانا کسی اونچی چیز پر (عربی میں اس کو خوان کہتے ہیں) کھانا چاہیے۔ کھانے باری باری سے آنے چاہئیں۔ کھانے کے بعد میوے یا کوئی شیرینی آنی چاہیے۔ اسی مضمون میں لکھتے ہیں کہ بعض لوگوں کے ہاں یہ طریقہ تھا کہ تمام کھانوں کے نام پرچہ پر لکھ کر مہمانوں کے سامنے پیش کئے جاتے تھے۔ اس سے قیاس ہوتا ہے کہ کارڈ آف ٹیبل کا طریقہ یورپ نے ہمیں سے سیکھا ہے۔"

(ب) امام صاحب کا خاص علم کلام (الٰہیات) خدا کے اثبات پر امام صاحب نے کوئی نئی دلیل نہیں قائم کی۔ اُن کے نزدیک یہ مسئلہ نہایت واضح و صاف ہے متکلمین جو استدلال کرتے آتے تھے کہ عالم حادث ہے اور حادث خود بخود پیدا نہیں ہو سکتا اس لئے اس کی کچھ علت ہوگی اور وہی خدا ہے امام صاحب اسی استدلال کو کافی سمجھتے ہیں۔

صفاتِ باری تنزیہ و تشبیہ اس بحث کے متعلق جو نزاعیں تھیں اگرچہ درحقیقت لفظی تھیں۔ یعنی جو لوگ تشبیہ کے الفاظ استعمال کرتے تھے۔ مثلاً خدا عرش پر ہے۔ آسمان پر اتر کر آتا ہے، وہ بھی حقیقت میں تنزیہ کے قائل تھے۔ تاہم دونوں فرقے ایک دوسرے کے ہم زبان نہ ہوتے تھے اور اختلاف کا پردہ درمیان سے نہ اُٹھتا تھا۔ امام صاحب نے اس بحث پر ایک مستقل رسالہ الجام العوام کے نام سے لکھا ہے جس نے بہت کچھ اس اختلاف کو کم کر دیا اور تقریباً دونوں ڈانڈے

ملا دیئے۔ اس کے بعض نکتے یہاں درج کرنے کے قابل ہیں تنزیہ کے متعلق بڑی کھٹک یہ تھی کہ اگر اسلام کا مقصد محض تنزیہ اور تجرید تھا، تو قرآن مجید اور احادیث میں کثرت سے تشبیہ کے الفاظ کیوں آئے، قیامت کے دن خدا فرشتوں کے جھرمٹ میں آئے گا۔ آٹھ فرشتے اس کا تخت اُٹھائے ہوں گے۔ دوزخ کی تسکین کے لئے خدا اپنی ران دوزخ میں ڈال دے گا اس قسم کی بیسیوں باتیں ہیں، جو قرآن مجید یا احادیثِ صحیحہ میں وارد ہیں۔ جن سے یہ گمان ہوتا ہے کہ شریعتِ اسلامی خدا کی طرف سے نہیں ہے بلکہ انسان نے اپنے خیال کے پیمانے کے موافق خدا کی ذات و صفات ٹھہرا لئے ہیں۔ امام صاحب نے اس عقدے کو اِس طرح حل کیا کہ بے شبہ قرآن و حدیث میں اِس قسم کے الفاظ موجود ہیں، لیکن یکجا نہیں بلکہ جستہ جستہ متفرق مقامات پر ہیں، اور چونکہ تنزیہ کے مسئلے کو شارع نے نہایت کثرت سے بار بار بیان کر کے دلوں میں جانشین کر دیا تھا۔ اس لئے تشبیہ کے الفاظ سے حقیقی تشبیہ کا خیال نہیں پیدا ہو سکتا تھا۔ مثلاً حدیث میں آیا ہے کہ کعبہ خدا کا گھر ہے۔ اِس سے کسی شخص کو یہ خیال پیدا نہیں ہوتا کہ خدا درحقیقت کعبہ میں سکونت رکھتا ہے۔ اسی طرح قرآن کی آیتوں سے بھی جن میں عرش کو خدا کا مستقر کہا ہے، خدا کے استقرار علی العرش کا خیال نہیں آ سکتا، کسی کو آئے تو اس کی وجہ یہ ہو گی کہ اس نے تنزیہ کی آیتوں کو نظر انداز

کر دیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان الفاظ کو جب استعمال فرماتے
تھے تو ان ہی لوگوں کے سامنے فرماتے تھے جن کے ذہن میں تنزیہ
و تقدیس خوب جاگزیں ہو چکی تھی۔

اس جواب پر یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ شارع نے صاف
صاف کیوں نہیں کہہ دیا کہ خدا نہ متصل ہے نہ منفصل، نہ جوہر
ہے نہ عرض، نہ عالم میں ہے نہ عالم سے باہر۔ اس قسم کی تصریحات
موجود ہوتیں، تو کسی کو سرے سے تشبیہ کا خیال ہی نہ آسکتا امام
صاحب نے اس شبہ کو یوں رفع کیا کہ اس قسم کی تقدیس عام
لوگوں کے نزدیک کسی چیز کی نسبت یہ کہنا کہ نہ وہ عالم میں ہے
نہ عالم سے باہر۔ گویا یہ کہنا ہے کہ وہ شے سرے سے موجود ہی
نہیں۔ بے شبہ خواص کے ذہن میں یہ تقدیس آسکتی ہے لیکن
شارع کو تمام عالم کی اصلاح مقصود تھی، جن میں بڑا حصہ
عوام ہی کا تھا۔

لطیفہ علّامہ ابن تیمیہ بظاہر تشبیہ کے قائل تھے۔ لوگوں
نے ان سے کہا کہ اس عقیدہ کی رُو سے خدا کا
ممکنُ الوجود ہونا لازم آتا ہے حالانکہ خدا واجبُ الوجود ہے
انھوں نے کہا کہ میرے عقیدہ کے موافق خدا موجود تو ہوگا
گو ممکنُ الوجود سہی، تمہارے اعتقاد کے موافق تو وہ ممکن
بھی نہیں رہتا بلکہ ناممکن اور محال بن جاتا ہے، کیونکہ ایسی
شے جو ہر جگہ ہو اور کہیں نہ ہو، عالم سے خارج بھی نہ ہو اور
عالم میں بھی نہ ہو، نہ متصل ہو نہ منفصل، نہ ذو مکان ہو نہ

ذوجہتہ امرے سے ہو ہی نہیں سکتی، کیونکہ یہ ارتفاع النقیضین ہے اور ارتفاع النقیضین محال ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں اور جس قدر مذاہب ہیں، سب میں خدا کو بالکل انسانی اوصاف کے ساتھ مانا گیا ہے۔ توراۃ میں یہاں تک ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام ایک رات ایک پہلوان سے کشتی۔ لڑے اور اس کو زیر کیا، چنانچہ پہلوان کی ران کو صدمہ بھی پہنچا۔ صبح کو معلوم ہوا کہ وہ پہلوان خود خدا تھا۔ اسلام چونکہ دنیا کے تمام مذاہب سے اعلیٰ و اکمل ہے، اس کا خدا انسانی اوصاف سے بالکل بری ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ۔ لَا تَجْعَلُوْا لِلّٰہِ اَنْدَادًا۔ جہاں کہیں اس کے خلاف تشبیہ کے الفاظ پائے جاتے ہیں، وہ حقیقت میں مجازات اور استعارات ہیں۔"

(۶) علم الکلام: جس ضخیم کتاب زیرِ تالیف کا اوپر ذکر آیا ہے، اس کا یہ "علم الکلام" پہلا حصہ ہے۔ اس میں علامہ شبلی نے مختصر طور پر "علم کلام" کی تاریخ بیان کی ہے کہ یہ علم کیوں ایجاد ہوا، اس کا بانیِ اوّل کون تھا؟ پھر کیا کیا ایجادیں ہوئیں، علمائے کلام کون کون تھے، انھوں نے کیا کیا، اس علم سے کیا فائدہ ہوا؟

علامہ کی یہ کتاب بھی اردو میں اپنی نوعیت کی "نئی اور پہلی" ہے لیکن اب اردو داں طبقے کو اس علم کے ساتھ کم سے کم دلچسپی ہے اس لئے مختصر اقتباس بطور نمونہ پیش کیا جاتا ہے:

علم کلام کا یہ احسان ہمیشہ یادگار رہے گا کہ اس کی بدولت
یونانیوں کی غلامی سے آزادی ملی۔ یونانی فلسفہ نے دنیا میں اس
قدر رواج و قبول حاصل کیا تھا کہ اُن کے مسائل وحی کی
طرح تسلیم کئے جاتے تھے، مسلمانوں نے بھی ان کے فلسفہ
کو اسی نگاہ سے دیکھا اور ارسطو و افلاطون کو علم کا دیوتا
سمجھے۔ فارابی سے کسی نے پوچھا کہ "آپ کو ارسطو سے کیا نسبت
ہے؟" اس نے جواب دیا کہ "میں اگر ارسطو کے زمانہ میں ہوتا
تو اُس کا ایک لائق شاگرد ہوتا۔" بوعلی سینا نے "شفا"
میں ایک ضمنی موقع پر لکھا ہے کہ اتنا مدید زمانہ گذر چکا لیکن
ارسطو کی تحقیقات پر ایک ذرہ بھر اضافہ نہ ہو سکا۔

یونانیوں کی یہ حلقہ بگوشی اس وقت تک قائم رہی جب
تک علمائے کلام نے فلسفہ کو نکتہ چینی کی نگاہ سے نہیں
دیکھا۔ سب سے پہلے نظام نے ارسطو کی "کتاب الطبائع"
کا رَد لکھا۔ پھر جبائی نے ارسطو کی کتاب "کون و فساد"
کے رَد میں ایک کتاب لکھی۔ اِس مذاق کو برابر ترقی ہوتی
گئی، یہاں تک کہ امام غزالی نے "تہافۃ الفلاسفہ" لکھی
اور ابوالبرکات نے "کتاب المعتبر" میں فلسفہ کے بہت
سے مسائل کی غلطی ثابت کی۔ امام رازی نے اِس پر ایک
دفتر کا دفتر تیار کر دیا۔ علامہ ابن تیمیہ نے خاص فلسفہ
کی رَد میں چار جلدوں میں ایک کتاب لکھی۔ یہ تصنیفات
اگرچہ جس غرض کے لئے لکھی گئی تھیں (یعنی علم کلام) اس

سے تو ان کو کچھ علاقہ نہ تھا۔ لیکن اس کی بدولت فلسفہ کا رُعب دلوں سے اُٹھ گیا۔ اہلِ نظر فلسفہ کی تنقید پر آمادہ ہو گئے اور سیکڑوں مسائل کی غلطیاں کھل گئیں۔

اکثر یورپین مصنفوں نے لکھا ہے کہ مسلمان عموماً ارسطو کی کورانہ تقلید کرتے تھے، یہاں تک کہ ایک زبان دراز نے لکھا ہے کہ مسلمان، ارسطو کی گاڑی کے قلی تھے۔ ان کوتاہ نظروں کو چاہیے کہ وہ فارابی اور ابن سینا کے بجائے ابوالبرکات، امام غزالی، امام رازی، آمدی اور ابن تیمیہ کی تصنیفات پڑھیں۔ فلسفہ تو فلسفہ مسلمانوں نے تو یونانی منطق کی بھی غلطیاں ثابت کیں، جن کی غلطی کا احتمال بھی کبھی کسی کو پیدا نہیں ہو سکتا تھا.......

علمِ کلام کی تاریخ میں سب سے زیادہ عجیب و غریب چیز ـــ دولتِ عباسیہ کی آزادی اور آزاد پسندی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ یہی چیز ہے جس نے علمِ کلام کو اس رتبہ پر پہنچایا۔ ورنہ اگر ان بزرگوں کی ہدایت پر عمل کیا جاتا، جو ہر موقع پر اَلسُّوالُ بِدعَۃٌ سے کام لیتے تھے تو آج علمِ کلام کا سرے سے وجود ہی نہ ہوتا۔ یہ اسی آزادی کا اثر تھا کہ ایک ہی صدی کے اندر، گوناگوں خیالات کا سیلاب سا آگیا، جو لحظہ بہ لحظہ بڑھتا جاتا تھا اور جس کی بدولت بیسیوں نئے نئے فرقے قائم ہوتے جاتے تھے۔ یہ فرقے اگرچہ اعتقادات میں باہم مختلف تھے، تاہم ہر فرقہ کو عام آزادی حاصل تھی۔ ہر فرقہ جس طرح اور جس تدبیر سے اپنے اعتقادات اور خیالات

کو پھیلانا چاہتا تھا، پھیلا سکتا تھا۔......

عباسیہ کے دربار میں پارسی، مانوی، یہودی، عیسائی ہر فرقہ اور ملت کے علما، موجود تھے۔ دربار ہی میں مناظرہ کی مجلسیں منعقد ہوتی تھیں۔ اکثر اوقات خلیفۂ وقت خود مناظرہ کا ایک فریق ہوتا تھا۔ باوجود اس کے لوگ نہایت آزادی، بیباکی اور دلیری سے اپنے خیالات ظاہر کرتے تھے، اور اس کی کچھ پروا نہیں کرتے تھے کہ خلیفہ کا کیا مذہب اور کیا اعتقادات ہیں۔

علمِ کلام نے اگرچہ بارہ[۱۲] سو برس کی عمر پائی، لیکن کمال کے رتبہ تک نہ پہنچ سکا۔ پیدا ہونے کے ساتھ ہی اس کو سخت مخالفت سے سامنا ہوا، تمام محدثین بلکہ ائمۂ مجتہدین (بجز امام ابوحنیفہ کے) اس کے دشمن بن گئے۔ دولتِ عباسیہ کی حمایت کی بدولت وہ برباد ہونے سے بچ گیا، لیکن مقبولِ عام نہ ہو سکا جو مخصوص فرقہ اس کا طرفدار تھا اور اس کو ترقی دینا چاہتا تھا، وہ اعتزال کے نام سے بدنام تھا۔ اہلِ سنت وجماعت مدت کے بعد اس کی طرف متوجہ ہوئے، لیکن وہ فلسفہ وعقلیات سے آشنا نہ تھے۔ کیونکہ اس گروہ میں اب تک فلسفہ تو فلسفہ، منطق کا سیکھنا بھی ناجائز تھا۔ امام غزالی نے جرأت کر کے منطق کو مذہبی گروہ میں روشناس کیا۔ اتنے تعلق سے فلسفہ کو بھی اس بزم میں باریابی ہوئی۔ فلسفہ اور عقلیات کی آمیزش سے علمِ کلام نے ایک دوسرا قالب اختیار کرنا شروع کیا تھا اور

امام رازی و آمدی جیسے لوگ پیدا ہونے شروع ہوئے تھے کہ دفعۃً تاتار کی طرف سے اس زور کی آندھی اُٹھی کہ اسلام کا تمام دفتر پراگندہ ہوگیا۔ مشرق نے تو سنبھالا ہی نہیں لیا، شام و روم میں ملکی طاقت سنبھل گئی۔ لیکن وہاں کی خاک مشرق کے سے دل و دماغ کہاں پیدا کر سکتی تھی۔ اشاعرہ کی فرسودہ عمارت کے کچھ آثار باقی رہ گئے تھے۔ متاخرین اسی پر رقبے رکھتے تھے۔ وہی عمارت آج پرستش گاہِ عام بن گئی ہے۔ امام غزالی اور ابن رشد نے جو میناکاریاں اور جواہرنگاریاں کی تھیں اس کی کسی کو خبر بھی نہیں۔

(۷) **الکلام**: یہ اس مجوزہ کتاب کا چوتھا حصہ تھا، لیکن چونکہ وہ تصنیف تجویز کے مطابق مکمل نہ ہوسکی، اس لئے علم الکلام حصہ اوّل رہا اور یہ الکلام حصہ دوم ہوا۔ اس میں "جدید علمِ کلام" بیان کیا گیا ہے۔

اب سے بارہ سو برس پہلے اس فن کی ایجاد کا سبب یہ تھا کہ مسلمان فلسفہ یونانی پڑھ کر عقائدِ اسلامی سے برگشتہ ہوتے جاتے تھے۔ ان کی حقیقت بیان کرنے اور حقانیت ثابت کرنے کے لئے یہ علم نکالا گیا۔ یہ ضرورت ہمارے زمانے میں پہلے سے بھی زیادہ ہے۔ آج کل گمراہی کے دوگونہ اسباب پیدا ہوگئے ہیں۔ ایک یہ کہ بیدینی وراثت بنتی جاتی ہے، اس زمانے کے اکثر نوجوان سائنس داں اور ماہرِ فلسفہ اس لئے مذہب سے بے تعلق ہیں کہ خود اُن کے بزرگ جن کی مثالیں اُن کے سامنے ہیں اسلامی عقائد میں راسخ اور اعمال کے پابند نہیں ہیں۔ آگے اپنی اولاد کے سامنے یہ خود نمونہ ہوں گے۔

دوسرے اپنے ملک اور بیرونِ ملک سے مادّیت اور انکارِ خدا

اور بے سود ہی مذہب کی صدائیں اُن کے کان میں آرہی ہیں۔ یونی ورسٹیوں اور کالجوں میں تعلیم پاتے ہیں کہ (بالفاظ علامہ شبلی) "روح[1]، مادہ ہی کی ایک قوت کا نام ہے، جو اعصاب سے پیدا ہوتی ہے" (ڈاکٹر شفلر) "روح ایک قسم کی میکانکل حرکت ہے" (وبرشو) "انسان صرف مادہ کا ایک نتیجہ ہے" (بوشر) "زندگی فطرت کا کوئی اصلی قاعدہ نہیں، بلکہ ایک اتفاقی استثنا ہے جو مادہ کے عام اصولوں کے مخالف ہے" (دوترشیہ)۔ ایک فلاسفر کہتا ہے کہ خدا کا وجود ہی نہیں۔ دوسرا کہتا ہے کہ ہے تو سہی، لیکن ظالم ہے۔

یورپ و امریکہ کا تو یہ حال ہے۔ جاپان اُن سے کچھ کم نہیں ہے۔ سر راس مسعود مرحوم (متوفی ۱۹۳۷ء) نے اپنی تالیف "نظم و نسق جاپان" میں لکھا ہے کہ "انھوں نے جاپان کے وزیر اعظم سے جاپان کے مذہبی رجحانات کے متعلق سوال کیا۔ وزیر اعظم نے جواب دیا کہ "ہم خدا کو اپنے ملک میں نہیں گھسنے دیتے"۔ ہندوستان میں پنڈت جواہر لال نہرو فرماتے ہیں کہ "سارا فساد خدا کا ہے۔ اس کو نکال دو"۔ منشی پریم چند، معاد اور حیاتِ ثانی کے قائل نہ تھے۔ کہتے تھے کہ مجھے مرنے کے بعد کی کچھ فکر نہیں۔ خواجہ حسن نظامی صاحب نے ایک عرصہ ہوا کسی مسلمان پروفیسر کے متعلق لکھا تھا (مجھے نام یاد نہیں رہا) کہ وہ عمر بھر خدا کے منکر اور مذہب سے بے نیاز رہے۔ خواجہ صاحب سے خاص تعلق تھا۔ جب شملہ پر مرنے لگے تو خدا یاد آیا اور تار دے کر خواجہ صاحب کو دہلی بلایا۔ یعنی (بقول اکبر الٰہ آبادی) "خدائے بزورِ موت" ماننی پڑی۔

قلب و روح کی یہ تباہیاں اور مذہب کی یہ بربادیاں دیکھ کر علامہ شبلی نے چاہا تھا کہ "الکلام" لکھ کر نوجوانوں کے لئے موافقتِ فلسفہ و مذہب کی راہ

---

[1] یہ سب اقتباسات "الکلام" سے لئے گئے ہیں۔

نکالیں۔ کتاب کے شروع میں انھوں نے اس "جنگ زرگری" کی صلح کے اصول بتائے ہیں، اسی کے مختلف حصّے نقل کئے جاتے ہیں:

علوم جدیدہ اور مذہب: یونان میں فلسفہ ایک مجموعہ کا نام تھا، جس میں طبیعیات، عنصریات، فلکیات، الٰہیات، مابعد الطبیعیات، سب کچھ شامل تھا۔ لیکن یورپ نے نہایت صحیح اصول پر اس کے دو حصّے کر دیے۔ جو مسائل مشاہدہ اور تجربے کی بنا پر قطعی اور یقینی ثابت ہو گئے اُن کو سائنس کا لقب دیا جو مسائل تجربہ اور مشاہدہ کی دسترس سے باہر تھے، اُن کا نام فلسفہ رکھا۔

مسائل جدیدہ کی نسبت یہ عام خیال جو پھیلا ہوا ہے کہ وہ قطعی اور یقینی ہیں۔ اس میں پہلی غلطی یہ ہے کہ جو چیزیں قطعی اور یقینی ہیں، وہ صرف سائنس کے مسائل ہیں اور یہی وجہ ہے کہ یورپ میں ان کی نسبت طبقۂ علماء میں کسی قسم کا اختلاف نہیں۔ لیکن فلسفہ کی یہ حالت نہیں ہے۔ یورپ میں آج فلسفہ کے بیسیوں اسکول ہیں اور انھیں شدت سے اختلاف ہے اگر ان سب کو صحیح تسلیم کیا جائے تو یہ ماننا پڑے گا کہ ایک ہی چیز سفید بھی ہو سکتی ہے اور سیاہ بھی۔

اب دیکھنا چاہیے کہ سائنس کو مذہب سے کیا تعلق ہے؟ سائنس جن چیزوں کا اثبات یا ابطال کرتا ہے، مذہب کو اُن سے مطلق سروکار نہیں۔ عناصر کس قدر ہیں؟ پانی کن چیزوں سے مرکب ہے؟ ہوا کا کیا وزن ہے؟ نور کی کیا رفتار ہے؟ زمین

کے کس قدر طبقات ہیں؟ یہ اور اس قسم کے مسائل ہیں، مذہب کو
اُن سے کچھ سروکار نہیں۔

مذہب جن چیزوں سے بحث کرتا ہے وہ یہ ہیں۔ خدا موجود ہے
یا نہیں؟ مرنے کے بعد اور کسی قسم کی زندگی ہے یا نہیں؟ خیر و
شر یا نیکی و بدی کوئی چیز ہے یا نہیں؟ ثواب وعقاب ہے یا
نہیں؟ ان میں سے کونسی چیز ہے جس کو سائنس ہاتھ لگا سکتا ہے؟
سائنس کے اساتذہ نے جب کہا ہے تو یہ کہا ہے کہ ہم کو ان چیزوں
کا علم نہیں یا یہ کہ یہ چیزیں مشاہدہ اور تجربہ کے احاطہ سے باہر ہیں
یا یہ کہ ہم ان باتوں کا یقین نہیں کرتے کیونکہ ہم صرف ان باتوں کا
یقین کرتے ہیں جو تجربہ و مشاہدہ سے ثابت ہو سکتی ہیں، کوتاہ نظر
عدم علم سے علمِ عدم سمجھ جاتے ہیں۔ سائنس والے کہتے ہیں کہ ہم
کو یہ چیزیں معلوم نہیں کوتاہ بیں اس کے یہ معنی لیتے ہیں کہ ہم کو
ان چیزوں کا نہ ہونا معلوم ہے۔ حالانکہ ان دونوں باتوں میں
زمین و آسمان کا فرق ہے........

خلطِ مبحث اس وقت پیدا ہوتا ہے جب سائنس اور مذہب
دونوں میں کوئی اپنی حد سے بڑھ کر دوسرے کی حد میں قدم رکھتا
ہے اور یہی خلطِ مبحث تھا جس نے ملاحدہ اور منکرینِ مذہب
کے خیال کو قوت دی، بلکہ درحقیقت اسی خلطِ مبحث نے الحاد
اور بد دینی کے خیالات پیدا کر دیئے۔ یورپ میں پہلے مذہب
کو اس قدر وسیع کر دیا گیا تھا کہ کسی قسم کا کوئی علمی مسئلہ مذہب
کی دست اندازی سے بچ نہیں سکتا تھا۔ چنانچہ خاص اس

مقصد کی غرض سے اسپین میں مجلس انکوزیشن (محکمۂ احتساب عقائد) قائم ہوئی تھی جس کا کام یہ تھا کہ جو لوگ مذہب کے خلاف کچھ کہتے ہوں ان کی تحقیقات کرے اور ان پر کفر اور ارتداد کا الزام لگائے۔ چنانچہ اٹھارہ برس میں یعنی ۱۴۸۱ء سے لیکر ۱۴۹۹ء تک دس ہزار دو سو بائیس آدمی، ارتداد کے الزام میں زندہ آگ میں جلائے گئے۔ اس مجلس نے ابتدائے قیام سے اخیر زمانہ تک تین لاکھ چالیس ہزار آدمیوں کو کافر اور ملحد قرار دیا جن میں سے کئی لاکھ آگ میں جلا دیئے گئے۔

جس قسم کی باتوں پر کفر کا الزام لگایا جاتا تھا اس کا اندازہ ذیل کے واقعات سے ہوگا۔ کوپرنیکس نے نظام بطلیموس سے انکار کرکے یہ ثابت کیا کہ زمین اور چاند وغیرہ آفتاب کے گرد گھومتے ہیں۔ اس پر مجلس انکوزیشن نے فتوے نافذ کئے کہ یہ رائے کتاب مقدس کے مخالف ہے اور اس بنا پر کوپرنیکس مرتد اور کافر ہے۔

گلیلیو نے جو دوربین کا موجد گذرا ہے، ایک کتاب کوپرنیکس کی حمایت میں لکھی۔ جس میں ثابت کیا کہ زمین آفتاب کے گرد گھومتی ہے۔ اس پر مجلس انکوزیشن نے فتویٰ دیا کہ وہ مستوجب سزا ہے چنانچہ اس کو گھٹنوں کے بل کھڑا کر دیا اور یہ حکم دیا گیا کہ وہ اس مسئلہ سے انکار کرے لیکن جب وہ اپنے عقیدہ پر ثابت قدم رہا تو قید خانہ بھیجدیا گیا اور دس سال محبوس رہا۔

کولمبس نے جب کسی نئے جزیرے کے دریافت کرنے کی امید پر سفر کرنا چاہا، تو کلیسا نے فتویٰ دیا کہ اس قسم کا ارادہ مذہب

کے خلاف ہے۔

زمین کے کُروی ہونے کا خیال جب اوّل ظاہر کیا گیا تو پادریوں نے سخت مخالفت کی کہ یہ اعتقاد کتابِ مقدس کے خلاف ہے۔

غرض ہر قسم کے علمی ایجادات اور انکشافات پر پادریوں نے کفر و ارتداد کے الزام لگائے، تاہم چونکہ علمی ترقی کا اٹھان تھا ان کی کوششیں بیکار گئیں۔ اور علوم و فنون تکفیر ہی کے سایے میں پھولے اور پھلے۔

پادریوں کے تعصبات اور وہم پرستی اگرچہ علم کو دبا نہ سکے لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ علمی گروہ نے پادریوں ہی کے خیالات اور اوہام کو مذہب سمجھا اور اس بنا پر نہایت مضبوطی سے ان کی رائے قائم ہوگئی کہ مذہب جس چیز کا نام ہے وہ علم اور حقیقت کے خلاف ہے۔ یہی ابتدائی خیال ہے جس کی آوازِ بازگشت آج تک یورپ میں گونج رہی ہے۔

بے شبہ اگر مذہب اسی چیز کا نام ہے تو سائنس کے مقابلے میں کسی طرح نہیں ٹھہر سکتا۔ لیکن اسلام نے پہلے دن کہہ دیا تھا کہ اَنتُم اَعلَمُ بِاُمُورِ دُنیَاکُم۔ یعنی تم لوگ دُنیا کی باتیں خود خوب جانتے ہو۔ یہ ظاہر ہے کہ سائنس اور تمام علومِ جدیدہ اسی دُنیا سے متعلق ہیں۔ معاد اور آخرت سے اُن کو کچھ واسطہ نہیں۔

اِس موقع پر یہ نکتہ لحاظ کے قابل ہے کہ اسلام میں سیکڑوں فرقے پیدا ہوئے اور ان میں اِس قدر اختلاف رہا کہ ایک نے دوسرے کی تکفیر کی۔ یہ تکفیر بڑے بڑے مسائل پر محدود نہ تھی،

بلکہ نہایت چھوٹی چھوٹی باتوں پر ایک دوسرے کو اسلام کے دائرہ سے خارج کر دیتا تھا ۔ یہ سب کچھ ہوا لیکن علمی تحقیقات اور اکتشافات کی بنا پر کبھی کسی شخص کی تکفیر نہیں کی گئی ۔

قدمائے مفسرین کا خیال تھا کہ پانی آسمان سے آتا ہے، یعنی آسمان پر ایک دریا ہے، بادل اس سے پانی لیتے ہیں اور برساتے ہیں ۔ آفتاب پانی کے ایک چشمہ میں غروب ہوتا ہے زمین مسطح ہے گُردی نہیں ستارے جو ٹوٹتے ہیں شیاطین کے شعلہ ہائے آتشیں ہیں مفسرین ان تمام باتوں کو قرآن کے نصوص سے ثابت سمجھتے تھے ۔ چنانچہ امام رازی نے مفسرین قدیم کے یہ تمام اقوال تفسیر کبیر میں نقل کئے ہیں ۔

لیکن جب عباسیوں کا علمی دَور آیا اور فلسفہ اور طبیعیات نے ترقی کی تو لوگوں نے ان خیالات کی مخالفت کی ۔ باوجود اس کے خود مفسرین کے گروہ میں سے ایک شخص نے بھی ان لوگوں کو کافر اور منکرِ قرآن نہیں کہا ۔ معتزلہ کو محدثین اِس بنا پر کافر کہتے ہیں کہ وہ قرآن کے مخلوق ہونے کے قائل ہیں لیکن اِس بنا پر کوئی ان کو کافر نہیں کہتا کہ وہ جادو کی حقیقت سے منکر ہیں ۔ غرض جس حد تک تحقیق و تفتیش کی جائے، عموماً ثابت ہوگا کہ مسلمانوں نے علمی تحقیقات اور ایجادات کو کبھی مذہب کا حریف مقابل نہیں سمجھا ۔ بلکہ محققین نے صاف تشریح کر دی کہ اسبابِ کائنات اور مسائلِ ہیئت وغیرہ نبوت کی سرحد سے بالکل الگ ہیں اور انبیاء کو تہذیبِ اخلاق

کے سوا اور کسی چیز سے غرض نہیں۔

(۸) سوانح مولانا روم: علامہ شبلی اس کے دیباچہ میں فرماتے ہیں:

"سلسلۂ کلامیہ کا یہ چوتھا نمبر ہے۔ تین حصے (علم الکلام، الکلام، الغزالی) پہلے شائع ہو چکے ہیں۔ مولانا روم کو دنیا جس حیثیت سے جانتی ہے، وہ فقر و تصوف ہے اور اس لحاظ سے متکلمین کے سلسلہ میں ان کو داخل کرنا اور اس حیثیت سے ان کی سوانح عمری لکھنا، لوگوں کو موجبِ تعجب ہو گا۔ لیکن ہمارے نزدیک اصلی علم کلام یہی ہے کہ اسلام کے عقائد کی اس طرح تشریح کی جائے اور اس کے حقائق و معارف اس طرح بتائے جائیں کہ خود بخود دلنشین ہو جائیں۔ مولانا نے جس خوبی سے اس فرض کو ادا کیا ہے مشکل سے اس کی نظیر مل سکتی ہے۔ اس لئے اُن کو زمرۂ متکلمین سے خارج کرنا سخت ناانصافی ہے۔"

یہ علامہ کی بڑی نادر جدت ہے اور وسعتِ فکر و نظر کا نتیجہ ہے کہ مولانا روم کو "اہلِ کلام" اور مثنویِ مولوی معنوی کو "تصانیفِ علمِ کلام" میں شامل کیا ہے۔ "مثنوی کے علمِ کلام" سے بحث کرتے وقت علمائے علمِ کلام کی تصانیف کے متعلق لکھتے ہیں:

"ان تمام تصنیفات کے پڑھنے سے اس قدر ضرور ثابت ہوتا ہے کہ اُن کے مصنفین غلط کو صحیح، دن کو رات، زمین کو آسمان ثابت کر سکتے ہیں، لیکن ایک مسئلہ میں بھی یقین اور تشفی کی کیفیت نہیں پیدا کر سکتے۔ بخلاف اس کے مولانا روم جس طریقہ سے استدلال کرتے ہیں، وہ دل میں اثر کر جاتا ہے، اور گو وہ شک و شبہات

کے تیر باراں کو کلیۃً نہیں روک سکتا، تاہم طالبِ حق کو اطمینان کا حصار ہاتھ آجاتا ہے، جس کی پناہ میں وہ اعتراضات کے تیر باراں کی پروا نہیں کرتا۔ نمونے میں ایک ایسا ہی مختصر سا مقام پیش کیا جاتا ہے:

معجزہ دلیلِ نبوت ہے یا نہیں؟ اوپر گذر چکا کہ مولانا کے نزدیک نبوت کی تصدیق کے لئے معجزہ شرط نہیں جس کے دل میں ایمان کا مزہ ہوتا ہے پیغمبر کی صورت اور اس کی باتیں اس کے حق میں معجزہ کا کام دیتی ہیں۔

دردلِ ہرکس کہ از دانش مزہ است ... روئے و آوازِ پیمبر معجزہ است

لیکن مولانا نے اسی پر قناعت نہیں، بلکہ صاف صاف تصریح کی کہ معجزہ ایمان کا سبب نہیں ہوتا۔ اور اس سے ایمان پیدا بھی ہوتا ہے تو جبری ایمان پیدا ہوتا ہے، نہ ذوقی۔ چنانچہ فرماتے ہیں:-

موجبِ ایمان نباشد معجزات ... معجزات ایمان کا سبب نہیں ہوتے
بوئے جنسیت کند جذبِ صفات ... جنسیت کی بو صفات کو جذب کرتی ہے

معجزات از بہرِ قہرِ دشمن است ... معجزے اس لئے ہوتے ہیں کہ دشمن
بوئے جنسیت سوئے دل بردن است ... دب جائیں لیکن جنسیت کی بو اس غرض کے لئے ہے کہ دل تک پہنچ جائے۔

قہر گردد دشمن اما دوست نے ... دشمن دب جاتا ہے لیکن دوست نہیں ہوتا
دوست کے گردد بہ بستہ گردنے ... وہ بھلا کیا دوست ہوگا جو گردن پکڑ کر لایا گیا ہے۔

مولانا نے اس بحث میں ایک اور دقیق نکتہ کی طرف اشارہ کیا ہے،
اس کی تفصیل یہ ہے :

معجزہ سے نبوت پر جو استدلال کیا جاتا ہے اُس کی منطقی ترتیب یہ
ہوتی ہے :

اس شخص سے یہ فعل (معجزہ) صادر ہوا ہے،

اور جس شخص سے یہ فعل صادر ہو، وہ پیغمبر ہے،

اس لئے یہ شخص پیغمبر ہے۔

اس صورت میں پیغمبر کا اثر بالذات خارجی چیز ہوتا ہے، مثلاً
دریا کا پھٹ جانا، سنگریزوں کا بولنا وغیرہ وغیرہ۔ اِس اثر سے پھر
بواسطہ قلب پر اثر پڑتا ہے۔ یعنی آدمی اِس بنا پر ایمان لاتا ہے کہ
جب اِس شخص نے دریا کو شق کر دیا تو ضرور پیغمبر ہے۔

لیکن بجائے اِس کے کہ معجزہ کسی پتھر یا دریا یا اور جمادات پر
اثر کرے، یہ زیادہ آسان ہے کہ پہلے پہل دل پر اثر کرے۔ خدا
جب یہ چاہتا ہے کہ پیغمبر پر لوگ ایمان لائیں، تو یہ زیادہ آسان
اور زیادہ دل نشین طریقہ ہے کہ بجائے جمادات کے خود لوگوں کے
دلوں کو متاثر کر دے کہ وہ ایمان قبول کر لیں، اور یہی اصلی معجزہ کہا
جا سکتا ہے۔ مولانا اِس نکتہ کو اِن الفاظ میں ادا کرتے ہیں :

معجزہ کاں بر جمادے گرد اثر — یا عصا یا بحر یا شق القمر
گر اثر بر جاں زند بے واسطہ — متصل گردد بہ پنہاں رابطہ
بر جمادات آں اثر عاریہ است — آں پے روح خوش متواریہ است
تا ازاں جامد اثر گیرد ضمیر — حبذا ناں بے ہیولائے خمیر

برزند از جانِ کامل معجزات　　　بر ضمیرِ جانِ طالب چوں حیات

اخیر شعر میں معجزہ کی اصل حقیقت بتائی ہے، یعنی پیغمبر کا رُوحانی اثر خود طالب کی رُوح پر پڑتا ہے۔ کسی واسطہ اور ذریعہ کی ضرورت نہیں ہوتی۔"

اصل میں مولانا کی مثنوی علمِ کلام کی نہیں، بلکہ تصوف کی کتاب ہے، مولانا صوفی تھے اور صوفی بھی زاہد اور مجاہد، مجذوب و مستغرق۔ انھوں نے "علمِ ظاہر" کی کتابوں کو آگ لگانے کے بعد مثنوی لکھی ہے۔ اِس لئے اُن کو مثنوی میں "کلام" کیا، قرآن و حدیث کی تعلیم سے بھی بحث نہیں، صرف تصوف سے تعلق ہے، اسی کے مسائل، مسائل کی طرح نہیں، بلکہ وارداتِ قلبی کے طور پر بیان کئے ہیں۔ اسی لئے مثنوی میں شاعری نہیں، بلکہ الہام ہے۔ اور اسی لئے نظامی نے یہ کہا ہے:

مثنویِ مولویِ معنوی　　　ہست قرآں در زبانِ پہلوی

من چہ گویم وصفِ آں عالیجناب　　　نیست پیغمبر ولے دارد کتاب

لیکن اس میں شک نہیں کہ مثنوی شریف کے اندر "علم کلام" بھی ہے۔ لیکن "متکلمین" کے بیان میں نہیں، کتبِ کلامیہ کی زبان میں نہیں، بلکہ عارف حقائق کی طرز میں، کاشفِ اسرار کے اسلوب میں، صاحبِ وجد و حال کے طور پر، قطب ارشاد کے انداز سے، اس کا سبب یہ تھا کہ مثنوی فتنۂ تاتار کے زہر کا تریاق بن کر وجود میں آئی تھی۔ سنہ ۶۵۶ ہجری میں چنگیز کے پوتے ہلاکو نے خلیفہ مستعصم باللہ کو ہلاک، خلافتِ عباسیہ کو تباہ، بغداد کو برباد کیا۔ اور سنہ ۶۷۲ ہجری میں مولانا روم نے وفات پائی۔ ان درمیانی سولہ سال میں مثنوی تصنیف ہوئی۔ تاتاریوں کے مظالم مولانا روم نے دیکھے تھے۔ ان کے نتائج و عواقب مولانا کے سامنے تھے۔ جن کا خلاصہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے عقائد و اعمال، فکر و نظر، قلب و

رُوح کی جڑیں ہِل گئی تھیں۔ اضطراب طاری تھا، اضطرار کی کیفیت تھی، دُنیا نظروں میں تاریک تھی۔ سکون و قرار مفقود تھا۔ ایسے طوفان میں اگر کوئی کشتی وقار اور اطمینان کے ساتھ تیرتی ہے تو وہ اولیاء اللہ کا قلب ہے۔ اگر کہیں روحانی تسکین ملتی ہے تو اولیاء اللہ کی صحبت میں۔

اس کے ساتھ ہی یہ بھی پیشِ نظر رکھنا چاہیئے کہ اس فتنۂ تاتار سے پہلے "فتنۂ اعتزال" ظہور میں آچکا تھا۔ متکلمین کا گروہ پیدا ہو چکا تھا اور اسلامی عقائد و اعمال کی عقلی توجیہات میں نزاع و جدال کا ہنگامہ برپا ہو چکا تھا۔ مولانا روم اس مرحلے سے بھی گزر چکے تھے۔ ان کے دل پر ان تمام حالات کا اثر تھا۔ اب جو انھوں نے "مثنوی" لکھنی شروع کی تو اس میں زخمِ تاتار کا بھی مرہم تھا۔ امراضِ روحانی کی بھی تشفی تھی اور اضطرابِ یقین و ایمان کی بھی تسلّی۔ چنانچہ مثنوی کا یہ اثر فوراً ظاہر ہونے لگا۔ تصنیف ہوتے ہی مقبول ہو گئی اور دلچسپ بات یہ ہے کہ جب کوئی فتنہ پیدا ہوا۔ مثنوی کی مقبولیت میں اضافہ ہو گیا اور اس کی نئی نئی شرحیں وجود میں آگئیں۔ تیمور کے حملے، اکبر و جہانگیر کی بے دینی، نادر شاہ کی غارت گری نے مسلمانوں کے قلب و رُوح کو مضطر و مضطرب کیا اور مثنوی نے اپنے پیام سے تسکین بخشی۔

اسی وجہ سے مثنوی کی بے شمار شرحیں لکھی گئیں۔ لیکن سب میں طریقت، حقیقت اور معرفت کے نکات کی توضیح تھی۔ اس لئے کہ شارحین کے عہد میں اسی کی ضرورت تھی۔ لیکن علامہ شبلی نے جس زمانے میں "سوانح مولانا روم" لکھی، سرسید نے علمِ کلام کے مسائل چھیڑ رکھے تھے اور اسلامی عقائد کی عقلی و "کلامی" توجیہ و تاویل شروع کر دی تھی۔ شبلی، سرسید کی صحبت میں رہ چکے تھے۔ وہیں سے علم کلام کا ذوق لے کر آئے تھے۔ اس لئے "الغزالی"

کے بعد جب نظر دوڑائی تو ایک شکلِ زدمی بھی نظر آئے۔ چنانچہ مثنوی میں سے علمِ کلام کے مسائل اخذ کرکے دکھانے کی غرض سے ہی شبلی نے یہ کتاب لکھی اسی لئے مثنوی کے تصوف سے زیادہ، مثنوی کے کلام پر ہمت صرف کی۔ بہر حال یہ —
"دریافت" علامہ کی فضیلت پر دال ہے۔

(۹) **موازنۂ انیس و دبیر** : یہ بھی حیدر آباد میں لکھی گئی اور "سلسلۂ آصفیہ" میں شامل ہوئی۔ علامہ شبلی نے جتنی کتابیں لکھیں، عرب و ایران کی تاریخ، مشاہیر اور علم و ادب کے متعلق لکھیں۔ صرف یہ "موازنہ" ہندوستان اور اردو زبان سے متعلق ہے۔ بظاہر "علمائے کلام" اور "شعرائے عجم" کے درمیان میں "انیس و دبیر" کے آجانے کا کوئی قرینہ نہ تھا، لیکن حسنِ اتفاق سے اس زمانے میں علامہ شبلی حیدر آباد میں مقیم تھے۔ وہاں تعزیہ داری اور مرثیہ خوانی کا ہمیشہ سے بڑا اہتمام تھا۔ علامہ کے دورانِ قیام میں لکھنؤ کے مشاہیر مرثیہ، مرزا اوج (خلف مرزا دبیر) میر نفیس، عارف، رشید، حیدر آباد آئے۔ بڑی دھوم کی مجلسیں ہوئیں: بڑے زور کے مرثیے پڑھے گئے۔ ان کو دیکھ کر، اور سن کر علامہ شبلی کو بھی "موازنۂ انیس و دبیر" کا خیال آیا۔ لیکن اس طرح کی تصنیف کی تجویز بہت پہلے سے ان کے ذہن میں تھی۔

"موازنہ" کے ساتھ ساتھ ایک اور کتاب لکھی گئی ہے جو بعد کو شائع ہوئی یعنی مولوی امجد علی اشہری کی "حیاتِ انیس"۔ اشہری صاحب اپنی کتاب کے دیباچے میں لکھتے ہیں :

> ۱۳۱۵ھ مطابق ۱۸۹۰ء میں جس سال مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے مشہور بانی سر سید احمد خاں بہادر کا انتقال ہوا، راقم کو نواب محسن الملک بہادر کی خدمت میں علی گڑھ جانے

کا اتفاق ہوا۔ جو سر سیّد کی کوٹھی میں فروکش تھے۔ اس کوٹھی
کے عالی شان کمرے میں سر سیّد کا کتب خانہ علامہ شبلی صاحب
نعمانی کے سپرد تھا۔ میں اکثر جی بہلانے کو وہاں جا بیٹھتا۔ ایک روز
علامہ شبلی نے مجھ سے کہا کہ اُردو میں میر انیس کا درجہ ایسا ہے
جیسے فارسی میں فردوسی کا درجہ......... مگر تعجب ہے کہ ان
کے حالاتِ زندگی پر اب تک کوئی کتاب نہیں لکھی۔ اگر تم سے
ہو سکے تو یہ کام کرنے کا ہے، میں بھی کچھ مدد دوں گا۔"

(دیباچہ حیاتِ انیس صا-۲)

اشہری صاحب نے اپنی تالیف کے متعلق ایک طویل نظم لکھ کر رسالہ "مخزن"
لاہور میں چھپوائی تھی جس میں میر انیس کے جاننے والوں سے کتاب کے لئے مواد
مہیا کرنے کی درخواست کی تھی۔ اس نظم میں بھی علامہ شبلی کی فرمائش کا حوالہ دیا ہے:

کہا یہ مجھ سے مکرر جناب شبلی نے
کہ میں انیس کی لائف لکھوں برسم کبار

اس کے بعد اشہری صاحب لکھتے ہیں:

"اس پر بھی بجز عدمِ فرصت کسی صاحب نے کچھ نہ لکھا.....
مولانا شبلی صاحب نے کچھ مدد دینے کا وعدہ کیا تھا۔ وہ خود
"موازنۂ انیس و دبیر" لکھنے پر آمادہ ہو گئے۔"

یہ وہ زمانہ تھا جب علامہ شبلی علی گڑھ سے مستعفی ہو کر حیدر آباد آگئے تھے یہاں
انھوں نے بجائے اشہری صاحب کو مدد دینے کے خود "موازنہ" لکھنا زیادہ
مناسب سمجھا۔ اور اس میں شک نہیں کہ اردو اور مرثیہ دونوں کی خوش قسمتی تھی
کہ علامہ کو اس طرف توجہ ہوئی۔ ان کے ذہنِ رسا اور دقتِ نظر نے کلامِ انیس

کا جیسا تجزیہ و تبصرہ کیا ہے، جو نکتے نکالے ہیں، جو موازنے کئے ہیں، وہ دوسرے
مشکل تھے۔ اشہری صاحب نے اپنی "حیاتِ انیس" پہلے لکھنی شروع کردی تھی،
اور "موازنہ" کے شائع ہونے سے پہلے تقریباً مکمل کرچکے تھے۔ لیکن "حیات"
سے پہلے "موازنہ" چھپ گیا تو اشہری صاحب نے جہاں مولانا حالی، علامہ
آزاد، مولوی امداد امام اثر کی رائیں کلامِ انیس کے متعلق لکھیں، علامہ شبلی کی رائے
پیش کرنے کے لئے "موازنہ" سے بھی بارہ صفحے نقل کئے۔ اِن صفحات میں علامہ
شبلی کے وہ فقرے بھی ہیں جن میں مرزا دبیر کے متعلق لکھا ہے کہ فصاحت اُن کے
کلام کو چھو بھی نہیں گئی، بلاغت نام کو نہیں۔ اِس پر اشہری صاحب نے یہ نوٹ
لکھا ہے:

"میر انیس اور مرزا دبیر کے مقابلہ کی بحث ان چند سطروں
پر تمام نہیں ہو سکتی۔ اس کے لئے دونوں صاحبوں کے مجامیع
تصنیفات پر نظر کرنا اور بات بات کو ایک دوسرے کے مقابل
دیکھنا اور دکھلانا ہوگا۔"

یہ بحث اعتراضات کے سلسلے میں پہلے آچکی ہے۔ "موازنہ" کی خوبیوں کے مقابلے
میں اِن چند اعتراضات کی کوئی حقیقت نہیں۔ علامہ شبلی کی یہ تصنیف بھی
اُردو میں اپنی نوعیت کی پہلی اور بہترین ہے۔ دو ایک نمونے یہ ہیں:

(الف) فصاحت کے متعلق ایک بڑا دھوکا یہ ہوتا ہے
کہ چونکہ فصاحت کے یہ معنی ہیں کہ لفظ سادہ، آسان، کثیر
الاستعمال ہو، اِس لئے لوگ مبتذل اور سوقی الفاظ کو بھی صحیح
سمجھ لیتے ہیں، حالانکہ ان دونوں میں سفید و سیاہ کا فرق ہے
میرزا دبیر صاحب جہاں واقعہ نگاری اور معاملہ بندی میں

میر انیس کی تقلید کرتے ہیں، اکثر ان کے کلام میں مبتذل الفاظ آجاتے ہیں۔

مثلاً جہاں حضرت شہر بانو نے حضرت عباس کی لاش پر نوحہ کیا ہے، شہر بانو کی زبان سے فرماتے ہیں: "ہے ہے مرے دیور، مرے دیور، مرے دیور" ایک اور جگہ فرماتے ہیں:

"ناڑہ تو ان کی سالگرہ کا نکال لا"

ابتذال کی صاف اور بین مثال نظیر اکبر آبادی کا کلام ہے اگر یہ تمیز نہ ہو تو سادگی اور صفائی میں نظیر کا کلام میر انیس یا میر تقی سے ٹکر کھاتا۔

ابتذال کے معنی عام طور پر یہ سمجھے جاتے ہیں کہ جو الفاظ عام لوگ استعمال کرتے ہیں، وہ مبتذل ہیں۔ لیکن یہ صحیح نہیں سیکڑوں الفاظ عوام کے مخصوص الفاظ ہیں، لیکن سب میں ابتذال نہیں پایا جاتا۔ ابتذال کا معیار مذاقِ صحیح کے سوا اور کوئی چیز نہیں مذاقِ صحیح خود بتا دیتا ہے کہ یہ لفظ مبتذل، پست اور سوقیانہ ہے۔

میر صاحب کو اگرچہ واقعہ نگاری کی وجہ سے نہایت چھوٹی چھوٹی چیزوں اور ہر قسم کے جزئی جزئی واقعات اور حالات کو بیان کرنا پڑتا ہے، لیکن یہ ان کی انتہا درجہ کی قادر الکلامی ہے کہ پھر بھی ان کی شاعری کے دامن پر ابتذال کا دھبہ نہیں آنے پاتا۔

کلام کی فصاحت: یہ بحث مفرد الفاظ سے متعلق تھی لیکن کلام کی فصاحت میں صرف الفاظ فصیح ہونا کافی نہیں

بلکہ یہ بھی ضرور ہے کہ جن الفاظ کے ساتھ وہ ترکیب میں آئیں، اُن کی ساخت، ہیئت، نشست، سُبکی اور گرانی کے ساتھ اُس کو خاص تناسب اور توازن ہو، ورنہ فصاحت قائم نہ رہے گی۔ قرآن مجید میں ہے "مَاکَذَبَ الْفُؤَادُ مَارَأیٰ" فواد اور قلب دو ہم معنی الفاظ ہیں اور دونوں فصیح ہیں۔ لیکن اگر اس آیت میں فواد کی جگہ قلب کا لفظ آئے تو خود یہی لفظ غیر فصیح ہو جائے گا۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ گو "قلب" کا لفظ بجائے خود فصیح ہے، لیکن ماقبل اور مابعد کے جو الفاظ ہیں، ان کی آواز کا تناسب، قلب کے لفظ کے ساتھ نہیں ہے۔

میر انیس کا مصرعہ ہے ؎ "فرمایا آدمی ہے کہ صحرا کا جانور" صحرا اور جنگل ہم معنی ہیں اور دونوں فصیح ہیں۔ میر انیس نے جا بجا ان دونوں لفظوں کو استعمال کیا ہے اور ہم معنی ہونے کی حیثیت سے کیا ہے۔ لیکن اگر اس مصرعہ میں "صحرا" کے بجائے "جنگل" کا لفظ استعمال کیا جائے تو یہی لفظ غیر فصیح ہو جائے گا۔

میر صاحب کا ایک شعر ہے:

طائر ہوا میں مست، ہرن سبزہ زار میں
جنگل کے شیر گونج رہے تھے کچھار میں

یہاں جنگل کے بجائے صحرا لاؤ تو مصرعہ پھس پھسا ہوا جاتا ہے۔ شبنم اور اوس ہم معنی ہیں اور برابر درجہ کے فصیح ہیں لیکن میر صاحب کے اس شعر میں:

کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا تھا موتیوں سے دامنِ صحرا بھرا ہوا

اگر اوس کے بجائے "شبنم" کا لفظ لایا جائے تو فصاحت خاک میں مل جائے گی۔ لیکن یہی اوس کا لفظ جو اس موقع پر اس قدر فصیح ہے، اِس مصرعہ میں:

"شبنم نے بھر دیے تھے کٹورے گلاب کے"

شبنم کے بجائے لاؤ تو فصاحت بالکل ہوا ہو جائے گی۔

اس میں نکتہ یہ ہے کہ ہر لفظ چونکہ ایک قسم کا سُر ہے، اس لئے یہ ضرور ہے کہ جن الفاظ کے سلسلے میں وہ ترکیب دیا جائے، اُن آوازوں سے اُس کو خاص تناسب بھی ہو، ورنہ گویا دو مخالف سُروں کو ترکیب دینا ہوگا۔ نغمہ اور راگ مفرد آوازوں یا سُروں کا نام ہے ہر سُر بجائے خود دلکش اور دلآویز ہے۔ لیکن اگر وہ دو مخالف سُروں کو باہم ترکیب دیا جائے تو دونوں مکروہ ہو جائیں گے۔ راگ کے دلکش اور مؤثر ہونے کا گر یہی ہے کہ جن سُروں سے اس کی ترکیب ہو اُن میں نہایت تناسب اور توازن ہو۔

الفاظ بھی چونکہ ایک قسم کی صوت اور سُر ہیں اِس لئے ان کی لطافت، شیرینی اور روانی اُسی وقت قائم رہتی ہے جب گرد و پیش کے الفاظ بھی لَے میں اُن کے مناسب ہوں[1]

---

[1] علامہ شبلی کا یہ نکتہ اصولاً صحیح ہے کہ متناسب آواز اور لَے کے الفاظ کو ترتیب دینے سے لطافت اور روانی پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن میر انیس کا یہ شعر اس کی درست مثال نہیں ہے۔ بلاشبہ (اوس) اور (اور) کی آوازیں متناسب ہیں، اس لئے اوس کا لفظ شبنم سے زیادہ بھلا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اصل میں اوس کا لفظ اس تناسب

(باقی بر صفحہ ۸۳۱)

کتاب کے آخر میں انیس و دبیر کے متحد المضمون اشعار کا موازنہ کرتے ہیں، اس کی مثال یہ ہے:

(ب) دبیر:

دہشت سے جواں بھاگتے تھے تیر کے مانند
تھا نیزدل کو رعشہ قدم پیر کے مانند

انیس:

چلنے میں نیزے کانپتے تھے مثل پائے پیر

میر صاحب کا مصرع زیادہ فصیح اور صاف ہے۔ ان الفاظ سے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۸۳۰) کی خاطر نہیں لایا گیا، بلکہ محاورے کی وجہ سے لایا گیا ہے "اوس کھانا" محاورہ ہے "شبنم کھانا" نہیں ہے۔ "کھا کھا کے" لکھا تھا تو لامحالہ "اوس" ہی لکھا جاتا۔ "شبنم" نہیں لکھا جا سکتا تھا۔ یہ البتہ میر انیس کا کمال ہے کہ الفاظ کو اس طرح مرتب کیا کہ محاورے کی صحت کے ساتھ آواز کا تناسب بھی پیدا ہو گیا۔ اور مصرع میں لطافت، شیرینی اور روانی آگئی۔

دوسری مثال میں شبنم کی جگہ اوس کا لفظ وزن میں نہیں سماتا۔ اس لئے اس کے لانے نہ لانے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اگر آ سکتا تب بھی کوئی عدم تناسب پیدا نہ ہوتا۔ اس مصرع کے الفاظ کو شبنم یا اوس کسی سے کوئی خاص تناسب نہیں ہے۔ مثلاً اگر کہیں:

"رکھ دے گی اوس بھر کے کٹورے گلاب کے"

تو اوس کا لفظ مطلق غیر متناسب نہیں معلوم ہوتا۔ ہاں اگر اس طرح کہیں:

"بھر دے گی اوس آج کٹورے گلاب کے"

تو اگرچہ (شبنم) اور (اوس) دونوں اس مصرع میں موزوں رہتے ہیں، لیکن اوس فصیح تر معلوم ہوتا ہے اس لئے کہ اس کی آواز (آج) کی آواز سے تناسب رکھتی ہے۔

"کانپتے تھے" جو تصویر خیال میں کھنچ جاتی ہے، وہ رعشہ کے لفظ سے پیدا نہیں ہوتی۔ سب سے بڑھ کے یہ کہ جب تک چلنے کی قید نہ مذکور ہو، پوری تشبیہ نہیں ہوتی۔ کیونکہ بوڑھے آدمی کے پاؤں چلنے ہی میں کانپتے ہیں۔ اس کے ساتھ چونکہ چلنے کا اطلاق پاؤں اور نیزہ دونوں پر ہوتا ہے، اس لئے یہ لفظ اس موقع پر نہایت موزوں ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ نیزہ چلانے کی حالت میں نیزہ کو لچک ہوتی ہے۔ اس لئے اُس کو کانپنے سے تعبیر کر سکتے ہیں اور اس لحاظ سے یہ کہنا کہ نیزہ چلنے کی حالت میں خوف سے کانپتا تھا، نہایت لطیف حسن التعلیل ہے۔ بخلاف اس کے مرزا صاحب نے چونکہ نیزہ کی جنبش اور حرکت کا ذکر نہیں کیا، اس لئے رعشہ کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔

دبیر: چلّائے ہات مل کے جلاجل کہ الاماں

انیس: ہو گیا جوڑ کے ہاتوں کو جلاجل خاموش

جلاجل کے دونوں حصے جو بجانے میں مل جاتے ہیں۔ اِن کی تعبیر دونوں بزرگوں نے دو طرح پر کی ہے۔ مرزا صاحب کہتے ہیں کہ جلاجل چلّا کر الاماں کہتا تھا اور ہاتھ ملتا تھا۔ لیکن چلّانے کو ہاتھ ملنے سے کوئی تعلق نہیں۔ اِس لئے گو تشبیہ صحیح ہے، لیکن ہاتھ ملنے کی کوئی توجیہ نہیں ہو سکتی۔ میر صاحب کہتے ہیں کہ حضرت امام حسینؑ کا رعب اِس قدر غالب ہوا کہ جلاجل ہاتھ جوڑ کے چُپ ہو گیا۔ رعب اور خوف کی حالت میں ہاتھ جوڑنا اکثر ہوتا ہے اور چونکہ جلاجل کے دونوں حصے جب مِل جاتے ہیں تو

پھر جب تک جدا نہ ہوں، آواز نہیں دے سکتے۔ اس لئے یہ کہنا
بالکل صحیح ہے کہ وہ ہاتھ جوڑ کر چپ ہو گیا۔"

(۱۰) شعر العجم : فارسی شاعری اور شاعروں کا ضخیم تذکرہ ہے۔ پانچ جلدیں ہیں اور گیارہ سو سے زیادہ صفحے۔ آغازِ تصنیف کا مادۂ تاریخ "تاریخ عجم" (۱۳۲۴ھ) ہے اور اختتامِ تصنیف کی تاریخ "تذکرہ" (۱۳۲۵ھ) ہے یعنی ۱۹۰۶ء اور ۱۹۰۷ء میں لکھا گیا۔ علامہ سید سلیمان ندوی حصۂ پنجم کے دیباچہ میں لکھتے ہیں :

"شعر العجم کا تخیل مولینا کے دل میں ایک مدت سے موجود تھا۔ اُن کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے ۱۸۹۹ء میں ان کو اس موضوع کا خیال آیا۔"

لیکن علامہ شبلی نے حصہ اول کا جو دیباچہ لکھا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خیال اس سے بھی بہت پہلے کا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں :

"شعراء کے تذکرے بہت ہیں۔ لیکن وہ درحقیقت بیاضِ اشعار ہیں جن میں شعراء کے عمدہ اشعار انتخاب کر کے لکھ دیئے ہیں۔ شعراء کے حالات اور واقعات کم اور نہایت کم ہیں۔ اور شاعری کے عہد بعہد کے انقلابات اور اس کے اسباب کا تو مطلق ذکر نہیں۔ میں اس کمی کو مدت سے محسوس کر رہا تھا، اور اکثر اس اُدھیڑ بُن میں رہتا تھا۔ مئی ۱۸۹۴ء میں میرے معزز دوست اور استاد مسٹر آرنلڈ نے مجھ کو اطلاع دی کہ جرمنی کے ایک پروفیسر جیمس ڈارمسٹیٹر نے اس موضوع پر فرنچ میں ایک کتاب لکھی ہے۔ میں اس زمانے میں فرنچ زبان سیکھ رہا تھا۔ بڑے شوق

سے کتاب منگوائی۔ لیکن وہ اٹھاسی صفحوں کا رسالہ تھا جس میں شعرا
کے نہایت معمولی حالات تھے۔ ایک مدت کے بعد اس مصنف کی
ایک اور ضخیم کتاب شائع ہوئی۔ جو تحقیق اور تدقیق کے لحاظ سے
نہایت حیرت انگیز تھی۔ لیکن وہ زبان کی تاریخ ہے، جس میں ژند،
پہلوی وغیرہ زبانوں پر نہایت محققانہ بحث کی ہے، اور اسلام
کے قبل کی تصنیفات کا سراغ لگایا ہے۔ شاعری کی تاریخ سے
اُس کو لگاؤ نہیں۔"

علامہ اس کے آگے "شعر العجم" کے آغازِ تصنیف کا ذکر کرتے ہیں :

۶ مارچ ۱۹۰۶ء کو میں نے اِس عمارت کا سنگِ بنیاد رکھا
لیکن بیچ بیچ میں "موازنۂ انیس" اور "الندوہ" سدِّ راہ ہوتے
رہے .... یہاں تک کہ ستمبر ۱۹۰۷ء کی چھٹی تاریخ کو دورِ
اوّل کا پہلا حصہ انجام پذیر ہوا۔

باقی حصوں کی تالیف واشاعت کے متعلق سید سلیمان ندوی صاحب حصہ پنجم
کے دیباچہ میں لکھتے ہیں :

"۱۹۰۸ء میں شعر العجم کی پہلی جلد زیرِ طبع تھی، دوسری
اور تیسری زیرِ تصنیف۔ ۱۹۰۹ء کے آخر میں دوسری، اور
۱۹۱۰ء میں تیسری جلد شائع ہوئی۔"

علامہ نے جنوری ۱۹۱۲ء کے "الندوہ" میں یہ نوٹ لکھا تھا :

"شعر العجم کا چوتھا حصہ زیرِ تالیف ہے، لیکن وہ اِس قدر
بڑھ گیا ہے کہ اس کے دو حصے کر دینے پڑے، ایک حصہ مطبع
میں جا چکا ہے اور چھپ رہا ہے، لیکن دوسرے کو میں نے

روک لیا کہ آپ مجکو سب سے مقدم اور مہتم بالشان کام یعنی سیرۃ نبوی کی تالیف میں مصروف ہونا چاہیے۔ اگر یہ کام انجام پاگیا تو شعر العجم ہوتی رہے گی، اس کی کیا جلدی ہے۔"

سید سلیمان صاحب اس نوٹ کا حوالہ دے کر لکھتے ہیں:

"اب یہی 'اوراقِ ممنوعہ' چھ برس کے بعد دسمبر ۱۹۱۸ء میں شائع ہو رہے ہیں اور اس طرح سمجھنا چاہیے کہ شریعتِ حُسن و عشق کے یہ پانچوں صحیفے تقریباً تیرہ برس کے عرصہ میں تدریج تکمیل کو پہنچے .... پانچویں حصہ کی تصنیف سے درحقیقت مولانائے مرحوم تمام فارغ نہیں ہوئے تھے بہت سے مسودات ان کی نظرِ ثانی کے محتاج تھے .... تاہم یہی مناسب سمجھا گیا کہ ان موتیوں کی لڑی میں پوت نہ ملایا جائے۔ چنانچہ فصول و ابواب کی ترتیب کے علاوہ اصل متن میں کسی قسم کی مداخلت جائز نہیں رکھی گئی ہے۔ مولینا اپنی ہر تصنیف بار بار کی حک و اصلاح، تکرارِ نظر اور کاٹ چھانٹ کے بعد شائع کرتے تھے۔ اس کتاب سے معلوم ہوگا کہ بے ساختگی کے ساتھ اول وہلہ میں ان کے دماغ سے کیا خیالات اور ان کے قلم سے کیا الفاظ نکلتے تھے۔"

اِس حساب سے معلوم ہوتا ہے کہ اختتامِ تصنیف کی تاریخ "تذکرہ" (جس میں ۱۳۲۵ھ ہجری نکلتے ہیں) بطور تفاؤل و پیشین گوئی پہلے سے نکال لی ہوگی ورنہ کتاب ۱۳۳۱ھ تک مرتب ہوتی رہی۔ اس لئے اختتام کا مادۂ تاریخ "تاریخِ ادبِ عجم" (۱۳۳۱ھ) ہوسکتا ہے۔

شعر العجم حصۂ اوّل کے آغاز میں علّامہ نے فارسی شاعری کے آغاز کا زمانہ متعین کرنے کی کوشش کی ہے اور سب سے قدیم اشعار لکھے ہیں۔ علامہ اس حصۂ تاریخ کو کچھ اہمیت نہ دیتے تھے۔ ان کا اصل مقصود تنقیدِ شاعری تھا اور ضمناً تاریخ شاعری۔ اس لئے انھوں نے آغازِ شاعری کے متعلق ذاتی تحقیق نہیں کی۔ بلکہ مجمع الفصحار، تذکرۂ دولت شاہ وغیرہ کی مفروضہ و "سفینہ بہ سفینہ" روایات دُوسر سری طور پر بیان کر دیا۔ لیکن اس میں علامہ شبلی تنہا قابلِ الزام نہیں ہیں۔ ان کا تو یہ مقصُود اصلی ہی نہ تھا۔ پروفیسر براؤن وغیرہ مستشرقینِ یورپ جن کا کام ہی کُریدا اور چھان بین ہے ان کی بھی وہاں تک رسائی نہ ہو سکی۔

ایران والوں نے "کتاب الوزرار"۔ "تاریخِ سیستان" وغیرہ کے حوالے سے اس مسئلہ پر روشنی ڈالی ہے۔ رضا زادہ شفق نے "تاریخ ادبیات ایران لکھی ہے۔ اس نے ثابت کیا ہے کہ عہد اسلام میں فارسی شاعری کی بنیاد حکومتِ بنی امیہ کے ابتدائی زمانے میں پڑ گئی تھی۔ چنانچہ یزید بن معاویہؓ کے عہدِ حکومت (۶۰ھ / ۶۷۹ء تا ۶۴ھ / ۶۸۳ء) میں یزید بن مُفرّغ نے زیاد کی ماں سُمیّہ پر ان موزوں فقروں میں طعن کیا تھا:

آبست نبیذاست   عصارات زبیب است   سمیہ روسپیذاست

اس کے بعد دوسری صدی ہجری کے آغاز (۱۰۸ھ / ۷۲۶ء) میں جب اسد بن عبداللہ القصاری الختلانی نے خاقان ہاتھ شکست کھائی تو خراسان کے بچّوں نے ان موزوں الفاظ میں ان کا مذاق اڑایا:

از ختلان آمدیہ   بر وتباہ آمدیہ

آبار باز آمدیہ   خشک نزار آمدیہ

پھر ابو الینبغی عباس بن ترخان جو جعفر برمکی اور فضل برمکی (وزرائے خلیفہ ہارون رشید) کا درباری شاعر (۱۹۲ھ / ۸۰۲ء میں) تھا۔ اُس نے شہر سمرقند کے متعلق یہ شعر کہے تھے:

سمرقند کند مند — بزینت کے افگند
از شاش نہ بہی — ہمی شہ نہ جہی

"شعر العجم" کی پہلی تین جلدوں میں فارسی شاعری کی ابتدا یعنی شعرائے طاہریہ (تیسری صدی ہجری اور نویں صدی عیسوی) سے شعرائے شاہجہانی (گیارھویں صدی ہجری اور سترھویں صدی عیسوی) تک کا تذکرہ ہے۔ لیکن دوسرے تذکروں کی طرح تمام شاعروں کا احاطہ نہیں کیا، بلکہ صرف چوبیس[۲۴] شاعر چُن کر ان کے تذکرہ و تبصرہ کو تین جلدوں کے سات سو اٹھائیس صفحوں پر پھیلایا ہے، بعض ممتاز شعرا، پر ساٹھ ساٹھ، ستر ستر صفحے لکھے ہیں۔ فردوسی پر پہلی جلد میں ۵۰ صفحے لکھے ہیں، اور پھر شاہنامہ پر چوتھی جلد میں ۷۰ صفحے۔ گویا پانچ جلدوں میں سے تقریباً ایک جلد اکیلے فردوسی پر ہے۔ حقیقت میں تذکرہ لکھنے کا یہی حق تھا۔ اور تذکرے اس مقابلہ میں (بقول علامہ) "بیاضِ اشعار" ہیں۔ علامہ کے حُسنِ انتخاب اور خوبیِ نقد و نظر کو قدیم و جدید کوئی تذکرہ نہیں پہنچتا۔ چوتھی جلد میں شاعری کی حقیقت اور فارسی شاعری کے محاسن و معائب سے بحث کی ہے۔ آخری جلدیں جن میں مضامین شاعری کے مختلف اصناف عشق و حُسن، اخلاق، فلسفہ، تصوّف، مدح و ثنا پر ریویو کیا ہے، "فنِ تنقید میں ایجادِ نَو" ہے۔ اس کی نظیر فارسی لٹریچر میں موجود نہ تھی چنانچہ طہران میں آقائے محمد تقی فخر داعی گیلانی نے "فارسی جدید" میں ان کا ترجمہ شائع کیا ہے۔

شعر العجم کے متعلق یہ دعوےٰ ہے کہ جن شاعروں کا اس میں تذکرہ لکھا گیا ہے، ان سے بہتر کوئی شاعر باقی نہیں رہا۔ یہی جواب ہے اس اعتراض کا کہ علامہ شبلی نے خاقانی، ظہیر فاریابی اور جامی کو مستقل تذکرہ کے قابل نہیں سمجھا۔ قصیدہ میں خاقانی و ظہیر کی عظمت علامہ کو تسلیم ہے، جیساکہ انھوں نے پانچویں جلد میں ریویو کیا ہے، لیکن خاقانی کا ذہن قصیدہ کے لئے صحیح طور پر متوازن نہ تھا۔ اس کے قصائد میں "بھاری بھرکم" ہونے کے سوا کوئی وصف نہیں۔ ظہیر نے قصیدہ میں جو محاسن پیدا کئے، ان کو سلمان ساوجی نے بہت بڑھا دیا تھا۔ جب انتخاب ٹھیرا تو ظہیر و سلمان میں سے سلمان بہتر تھا۔ نظامی و خسرو کی مثنویوں کے سامنے جامی کی مثنویوں کا یقیناً تیسرا درجہ ہے۔ اور غزل میں خسرو، حافظ، نظیری وغیرہ کے مقابلے میں جامی کا تیسرا درجہ بھی نہیں ہے۔

شعر العجم کے چند نمونے یہ ہیں:

(الف) حضرت امیر خسرو دہلویؒ کا تذکرہ و تبصرہ "بہتر صفحوں" میں لکھا ہے۔ ان کی جامعیت اور کمالات بیان کرتے ہیں:

"ہندوستان میں چھ سو برس سے آج تک اس درجہ کا جامع کمالات نہیں پیدا ہوا۔ اور سچ پوچھو تو اس قدر مختلف اور گوناگوں اوصاف کے جامع ایران و روم کی خاک نے بھی ہزاروں برس کی مدت میں دو ہی چار پیدا کئے ہوں گے۔ صرف ایک شاعری کو لو، تو اُن کی جامعیت پر حیرت ہوتی ہے۔ فردوسی، سعدی، انوری، حافظ، عرفی، نظیری بے شبہ اقلیم سخن کے "جم وکے" ہیں۔ لیکن اُن کی حدودِ حکومت

ایک ایک اقلیم سے آگے نہیں بڑھتے۔ فردوسی مثنوی سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ سعدی قصیدہ کو ہاتھ نہیں لگا سکتے۔ انوری مثنوی اور غزل کو چھو نہیں سکتا۔ حافظ، عرفی، نظیری غزل کے دائرہ سے باہر نہیں نکل سکتے۔ لیکن خسرو کی جہانگیری میں غزل، مثنوی، قصیدہ، رُباعی، سب کچھ داخل ہے اور چھوٹے چھوٹے خطہ ہائے سخن، یعنی تضمین، مستزاد اور صنائع و بدائع کا تو شمار نہیں۔ تعداد کے لحاظ سے دیکھو تو اس خصوصیت میں کسی کو ان کی ہمسری کا دعویٰ نہیں ہو سکتا۔ فردوسی کے اشعار کی تعداد کم و بیش ستر ہزار ہے صائب نے ایک لاکھ شعر سے زیادہ کہا ہے۔ لیکن امیر خسرو کا کلام کئی لاکھ سے کم نہیں۔ اکثر تذکروں میں خود امیر خسرو کے حوالہ سے لکھا ہے کہ ان کا کلام تین لاکھ سے زیادہ اور چار لاکھ سے کم ہے۔ اس میں غالباً ایک غلط فہمی ہے۔ امیر نے ابیات کا لفظ لکھا ہے اور قدما کے محاورے میں بیت ایک سطر کو کہتے ہیں چنانچہ نثر کی کتابوں کے متعلق یہ تصریحیں جا بجا نظر آتی ہیں کہ اس میں اس قدر بیتیں ہیں۔

ان سب پر مستزاد یہ کہ اوحدی نے تذکرۂ "عرفات" میں لکھا ہے کہ امیر کا کلام جس قدر فارسی میں ہے، اسی قدر برج بھاکا میں ہے۔ کس قدر افسوس ہے کہ اس مجموعہ کا آج نام و نشان بھی نہیں۔

مختلف زبانوں کی زبان دانی کا یہ حال ہے کہ ترکی اور فارسی اصلی زبان ہے۔ عربی میں اُدبائے عرب کے ہمسر ہیں۔ سنسکرت کے

ماہر ہیں۔ چنانچہ مثنوی " نہ سپہر " میں تواضع کے لہجے میں اس کا ذکر کیا ہے۔

" من قدرے بر سرِ ایں کار شدم "

شاعری کے بعد نثاری کا نمبر ہے۔ اُس وقت تک کسی نے نثر لکھنے کے اصول اور قاعدے نہیں مرتب کئے تھے۔ انھوں نے ایک مستقل کتاب " اعجازِ خسروی " تین جلدوں میں لکھی ' اور اگرچہ افسوس ہے کہ زیادہ تر زور صنائع و بدائع پر بیکار کیا لیکن ان کی طبّاعی اور ذہانت سے کون انکار کر سکتا ہے۔

موسیقی میں یہ کمال پیدا کیا کہ نایک کا خطاب ان کے بعد آج تک پھر کوئی شخص حاصل نہ کر سکا .....

اِن مختلف الحیثیات مشغلوں کے ساتھ فقر و تصوّف کا یہ رنگ ہے کہ عالمِ قدس کے سوا دنیائے فانی کو نظر اُٹھا کر نہیں دیکھا ......

ان سب باتوں کے ساتھ جب اس پر نظر کی جاتی ہے کہ اُن کو ان کاموں میں مشغول ہونے کے لئے وقت کس قدر ملتا تھا تو سخت حیرت ہوتی ہے۔ وہ ابتدا سے ملازمت پیشہ تھے اور درباروں میں تمام تمام دن حاضری دینی پڑتی کام جو سپرد تھا وہ شاعری نہ تھی، بلکہ اور اشغال تھے .....

اِن حالات کے ساتھ اگر صانعِ قدرت اُن کے پیدا کرنے پر ناز کرے تو چنداں ناموزوں نہ ہوگا "

امیر خسرو کی غزل پر تبصرہ کرتے ہیں :

جدتِ اسلوب "غزل کی ترقی کا نوروز لطفِ ادا اور جدتِ اسلوب ہے۔ جس کے موجد شیخ سعدی ہیں لیکن پھر وہ نقشِ اوّلین تھا۔ امیر کی بوقلموں طبیعت نے جدتِ اسلوب کے سیکڑوں نئے نئے پیرایے پیدا کر دیئے، جو اگلوں کے خواب و خیال میں بھی نہ آئے تھے۔ مثلاً: یہ مضمون کہ معشوق ظلم و ستم کرنے کے ساتھ بھی محبوب ہے، یوں ادا کرتے ہیں:

جاں زتن بُردی و در جانی ہنوز
دَردہا دادی و دَرمانی ہنوز

یا مثلاً معشوق کی گراں قدری کو اس پیرایے میں اَدا کرتے ہیں:

ہر دو عالم قیمتِ خود گفتۂ　　نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

معشوق کی آنکھ کو سب مخمور اور مے آلود باندھتے ہیں۔ اِسی مضمون کو دیکھو امیر نے کس انداز سے کہا ہے:

مے حاجت نیست مستیم را　　در چشمِ تو تا خمار باشد

معشوق کا عاشقوں کے رنج و غم سے بے خبر ہونا، عام مضمون ہے۔ اِس کو کس لطف سے اَدا کیا ہے:

گل چہ داند کہ دردِ بلبل چیست
او ہمیں کارِ رنگ و بُو داند

معشوق معشوقانہ اداؤں کو چھوڑنا چاہتا ہے، اُس کو یوں باز رکھتے ہیں:

ہنوز ایمان و دل بسیار غارت کردنی دارد
مسلمانی میاموز آں دو چشم نامسلماں را

لطف اور قہر کی نگاہ کی تاثیر کا فرق:

گفتم چگونہ می کشی و زندہ می کنی　　　از یک نگاہ کشت و نگاہِ دگر زندہ کرد

سعدی کا شعر ہے:

دوستاں منع کنندم کہ چرا دل بتو دادم
باید اوّل بہ تو گفتن کہ چنیں خوب چرائی

یہ مضمون اگرچہ نیچرل ہونے کی حیثیت سے اس قدر اعلیٰ درجہ کا تھا کہ اس پر ترقی نہیں ہوسکتی تھی. لیکن امیر نے ایک اور جدید اسلوب پیدا کیا:

جراحت جگر خستگاں چہ می پرسی!
زغمزہ پرس کہ ایں شوخی از کجا آموخت

غالب نے اسی خیال کو اور زیادہ بدیع اور شوخ کر دیا ہے:

نظر لگے نہ کہیں ان کے دست و بازو کو
یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں

معشوق کی زیادتیِ لطف کو اِس انداز سے بیان کرتے ہیں:

جاں زنظارہ خراب و ناز ہم از اندازہ بیش
ما بہ بوئے مست و ساقی پُر دہد پیمانہ را!

وحشی یزدی نے اِسی خیال سے ایک اور لطیف خیال پیدا کیا

شراب لطف پُر در جام میریزی ولی ترسم
کہ زود آخر شود ایں بادہ و من در خمار افتم

(شعر العجم، حصہ دوم)

شعر العجم حصہ چہارم کے آغاز میں علامہ شبلی لکھتے ہیں:

"شعر العجم کا یہ چوتھا یعنی آخری حصّہ ہے اور حقیقت یہ
ہے کہ اگلے تینوں حصّے اِسی حصّہ کے دیباچے اور تمہید تھے۔
اس حصّہ میں ایران کی عام شاعری پر تنقید ہے۔"

چونکہ وہی مضامین جو تین حصوں میں تبصرۂ شعرا کے ذیل میں لکھے تھے، اب اصنافِ سخن و خصائصِ شاعری کے تحت میں لکھتے ہیں، اس لئے اس مضمون کے مناسب و برمحل اپنا یہ شعر عنوان پر درج کیا ہے:

حدیثِ دلکش وافسانہ از افسانہ می خیزد
دگر از سر گرفتم قصّۂ زلفِ پریشاں را

اِس چوتھے حصّے کے طویل ہو جانے کے سبب سے دو حصّے کر دیئے تھے، جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے۔ پانچواں حصّہ اسی کا سلسلہ ہے۔ چوتھے میں مثنوی پر ریویو ہے، پانچویں میں قصیدہ، غزل وغیرہ پر۔ چوتھے حصّہ میں پہلے "نفسِ شاعری کی حقیقت" سے بحث کی ہے، پھر ایران کی شاعری کی تدریجی رفتار دکھائی ہے۔ پھر صنف وار تنقید کی ہے۔

شاعری کے یہ مباحث اور اس طرح کے تبصرے عربی، فارسی، اُردو کسی زبان میں علامہ شبلی سے پہلے نہیں لکھے گئے۔

(ب) بطور نمونہ ایک مضمون "محاکات" کو درمیان میں سے کچھ حصّے حذف کر کے نقل کیا جاتا ہے:

مُحاکات | محاکات کے معنی کسی چیز یا کسی حالت کا اِس طرح اَدا کرنا کہ اُس شے کی تصویر آنکھوں میں پھر جائے۔

تصویر اور محاکات میں یہ فرق ہے کہ تصویر میں اگرچہ مادّی اشیاء کے علاوہ، حالات یا جذبات کی بھی تصویر کھینچی جا سکتی

ہے، چنانچہ اعلیٰ درجہ کے مصوّر، انسان کی ایسی تصویر کھینچ سکتے ہیں کہ چہرہ سے جذباتِ انسانی مثلاً رنج، خوشی، تفکر، حیرت، استعجاب، پریشانی اور بیتابی ظاہر ہو، جہانگیر کے سامنے ایک مصوّر نے ایک عورت کی تصویر پیش کی تھی، جس کے تلوے سہلائے جا رہے ہیں۔ تلووں کے سہلاتے وقت چہرے پر گدگدی کا جو اثر طاری ہوتا ہے وہ تصویر کے چہرہ سے نمایاں تھا تاہم تصویر ہر جگہ محاکات کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ سیکڑوں گوناگوں واقعات، حالات اور واردات ہیں جو تصویر کی دسترس سے باہر ہیں۔

خیالات، جذبات اور کیفیات کا ادا کرنا اور زیادہ مشکل ہے، تصویر اس سے کیونکر عہدہ برآ ہو سکتی ہے مثلاً اس شعر میں

نسب نامۂ دولتِ کیقباد

ورق بر ورق، ہر سوئے بُرد باد

یہ خیال ادا کیا گیا ہے کہ دارا کے مرنے سے کیانی خاندان بالکل برباد ہو گیا۔ یہ خیال تصویر کے ذریعہ سے کیونکر ادا ہو سکتا ہے۔

ایک بڑا فرق عام مصوّری اور شاعرانہ مصوّری میں یہ ہے کہ تصویر کی اصلی خوبی یہ ہے کہ جس چیز کی تصویر کھینچی جائے اس کا ایک ایک خال و خط دکھایا جائے، ورنہ تصویر ناتمام اور غیر مطابق ہوگی۔ بخلاف اس کے شاعرانہ مصوّری میں یہ التزام ضروری نہیں، شاعر اکثر صرف اُن چیزوں کو

لیتا ہے اور ان کو نمایاں کرتا ہے، جن سے ہمارے جذبات پر اثر
پڑتا ہے، باقی چیزوں کو وہ نظر انداز کرتا ہے یا اُن کو دھندلا رکھتا
ہے کہ اثر اندازی میں ان سے خلل نہ آئے۔ فرض کرو ایک پھول
کی تصویر کھینچنی ہو، تو مصوّر کا کمال یہ ہے کہ ایک ایک پنکھڑی
اور ایک ایک رگ و ریشہ دکھائے، لیکن شاعر کے لئے یہ ضروری
نہیں، ممکن ہے کہ وہ ان چیزوں کو اجمالی اور غیر نمایاں صورت
میں دکھائے تاہم مجموعے سے وہ اثر پیدا کر دے جو اصلی پھول
کے دیکھنے سے پیدا ہوتا۔

ایک اور بڑا فرق، مصوّری اور محاکات میں یہ ہے کہ
مصوّر کسی چیز کی تصویر کھینچنے سے زیادہ سے زیادہ وہ اثر پیدا
کر سکتا ہے جو خود اس چیز کے دیکھنے سے پیدا ہوتا لیکن
شاعر باوجود اس کے کہ تصویر کا ہر جزو نمایاں کر کے نہیں دکھاتا
تاہم اُس سے زیادہ اثر پیدا کر سکتا ہے، جو اصل چیز کے
دیکھنے سے پیدا ہو سکتا۔ سبزہ پر شبنم دیکھ کر وہ اثر نہیں
پیدا ہو سکتا جو اس شعر سے ہو سکتا ہے:

کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا
تھا موتیوں سے دامنِ صحرا بھرا ہوا

تصویر کا اصلی کمال یہ ہے کہ اصل کے مطابق ہو اور اگر مصوّر
اس امر میں کامیاب ہو گیا تو اس کو کاملِ فن کا خطاب مل سکتا
ہے، لیکن شاعر کو اکثر موقعوں پر دو مشکل مرحلوں کا سامنا
ہوتا ہے، یعنی نہ اصل کی پوری پوری تصویر کھینچ سکتا ہے؛

کیونکہ بعض جگہ اس قسم کی پوری مطابقت احساسات کو برانگیختہ نہیں کر سکتی، نہ اصل سے زیادہ دُور ہو سکتا ہے ورنہ اس پر اعتراض ہو گا کہ صحیح تصویر نہیں کھینچی، اِس موقعہ پر اس کو تخییل سے کام لینا پڑتا ہے، وہ ایسی تصویر کھینچتا ہے جو اصل سے آب و تاب اور حسن و جمال میں بڑھ جاتی ہے لیکن وہ قوتِ تخییل سے سامعین پر یہ اثر ڈالتا ہے کہ یہ وہی چیز ہے لوگوں نے اس کو امعانِ نظر سے نہیں دیکھا تھا اس لئے اس کا حُسن پورا نمایاں نہیں ہوا تھا۔

شاعر کے سامنے (قوتِ تخییل کی بدولت) تمام بے حس اشیاء جاندار چیزیں بنجاتی ہیں۔ اس کے کانوں میں ہر طرف سے خوش آیند صدائیں آتی ہیں۔ زمین، آسمان، ستارے، بلکہ ذرہ ذرہ اس سے باتیں کرتا ہے۔

قوتِ تخییل کے ذریعہ سے اکثر شاعر ایک نیا دعوٰے کرتا ہے، اور خیالی دلائل پیش کرتا ہے، ممکن ہے کہ ایک منطقی اُس کی دلیل نہ تسلیم کرے، لیکن جن لوگوں کو وہ قوتِ تخییل کے ذریعہ سے معمول کر لیتا ہے، وہ اس کے تسلیم کرنے میں مطلق تامل نہیں کر سکتے۔ مثلاً ایک شاعر کہتا ہے ؎

دوش از برم چو رفتی آگہ نگشتم آرے
عمری در رفتنِ عمر آوازِ پا ندارد

یعنی معشوق جو گودی سے نکل کر چلا گیا تو مجھ کو خبر نہیں ہوئی، کیونکہ معشوق عاشق کی زندگی ہے اور زندگی کے جانے کے وقت جانے

کی آہٹ نہیں معلوم ہوتی۔ اِس دلیل کے دو مقدمے ہیں۔
"معشوق، عاشق کی زندگی ہے"۔ "زندگی کے جانے کی آہٹ
نہیں معلوم ہوتی"۔ اِن دونوں میں سے تم کس کا انکار کر سکتے ہو۔

محاکات کا اصلی کمال یہ ہے کہ اصل کے مطابق ہو یعنی
جس چیز کا بیان کیا جائے، اِس طرح کیا جائے کہ خود وہ شے مجسّم
سامنے آجائے۔ شاعری کا اصلی مقصد طبیعت کا انبساط ہے،
کسی چیز کی اصلی تصویر کھینچنا خود طبیعت میں انبساط پیدا کرتا
ہے (وہ شے اچھی یا بری ہے اس سے بحث نہیں) مثلاً چھپکلی
ایک بدصورت جانور ہے جس کو دیکھ کر نفرت ہوتی ہے لیکن اگر ایک
استاد مصوّر چھپکلی کی ایسی تصویر کھینچ دے کہ بال برابر فرق نہ ہو
تو اس کو دیکھنے سے خواہ مخواہ لطف آئے گا، اِس کی یہی وجہ ہے
کہ نقل کا اصل سے مطابق ہونا خود ایک مؤثر چیز ہے، اب
اگر وہ چیزیں جن کی محاکات مقصود ہے، خود بھی دلآویز اور
لطف انگیز ہوں تو محاکات کا اثر بہت بڑھ جائے گا۔

اب جب کسی چیز کی محاکات مقصود ہو تو ٹھیک وہی الفاظ
استعمال کرنے چاہئیں جو ان خصوصیات پر دلالت کرتے ہیں ___
ساودی نے ایک نظم لکھی تھی جس کا شانِ نزول یہ ہے کہ اس سے
کم سن بچے نے پوچھا کہ "سیلاب کیونکر آتا ہے؟" ساودی نے
اس کے جواب میں یہ نظم لکھی اور دکھایا کہ سیلاب کس طرح آہستہ
آہستہ شروع ہوتا ہے اور کس طرح بڑھتا جاتا ہے، اِس نظم
میں تمام الفاظ اس قسم کے آئے ہیں کہ پانی کے گرنے، بہنے

پھیلنے، بڑھنے (وغیرہ وغیرہ) کے وقت جو آوازیں پیدا ہوتی ہیں، الفاظ کے لہجے سے اُن کا اظہار ہوتا ہے یہاں تک کہ اگر کوئی شخص خوش ادائی سے اِس نظم کو پڑھے تو سننے والے کو معلوم ہوگا کہ زور شور سے سیلاب بڑھتا ہوا چلا آتا ہے۔

میرا طالب العلمی کا زمانہ تھا کہ ایک دن ایک صحبت میں کسی نے کلیم کا یہ شعر پڑھا۔

سر بہ بستاں چو دہد جلوۂ یغمائی را

اوّل از سرو کند جامۂ رعنائی را

والد مرحوم بھی تشریف رکھتے تھے، میں نے کہا کپڑا اُتارنے کو جامہ کشیدن بھی کہتے ہیں اس لئے شاعر اگر کند کے بجائے "کشد" کہتا تو زیادہ فصیح ہوتا۔ جامہ کندن گو صحیح ہے لیکن فصیح نہیں۔ سب چپ ہوگئے۔ والد مرحوم نے ذرا سوچ کر کہا کہ "نہیں" یہ لفظ "کند" شعر کی جان ہے، شعر کا مطلب یہ ہے کہ معشوق باغ میں جب غارت گری کی شان دکھاتا ہے تو پہلے سرو کی رعنائی کا لباس اُتار لیتا ہے"

لباس اُتارنے کے دو معنی ہیں۔ ایک یہ کہ مثلاً کوئی شخص گرمی وغیرہ کی وجہ سے کپڑا اُتار کر رکھدے یا اس کا نوکر اُتار لے۔ دوسرے یہ کہ سزا کے طور پر کسی کے کپڑے اُتروا لئے جائیں یا نچوائے جائیں، فارسی میں ان کے لئے دو مختلف لفظ ہیں "جامہ کشیدن" اور "جامہ کندن" چونکہ یہاں مقصود یہ ہے کہ معشوق ذلت کے طور پر سرو

کا کپڑا اتار لیتا ہے۔ اس لئے یہاں جامہ کندن کا لفظ جامہ کشیدن سے زیادہ موزوں ہے"۔ تمام حاضرین نے اس توجیہہ کی بے ساختہ تحسین کی۔

علی قلی کا شعر ہے:

بگذشت زپیشِ من وغیرش بہ حکایت
پیچید کہ ہرگز نتواند بہ قفا دید

شعر کا مطلب یہ ہے کہ معشوق سامنے سے جا رہا تھا، رقیب بھی ساتھ تھا، اس نے اس طرح اس کو باتوں میں لگا لیا کہ معشوق مڑ کر پیچھے نہ دیکھ سکا (ورنہ شاید میری طرف بھی اس کی نگاہ پڑتی) "پیچید" کے لفظ سے واقعہ کی صورت جس طرح ذہن میں آجاتی ہے اور کسی لفظ سے نہیں آسکتی۔

(ج) "شاعری کی تدریجی رفتار: اس قدر ہر شخص کو نظر آتا ہے کہ فارسی شاعری کے مختلف دَور ہیں اور ہر دَور کا جُدا انداز ہے۔ اب ایک نکتہ سنج کا یہ فرض ہے کہ ہر دَور کی تمام خصوصیتوں کا پتہ لگائیے، نہ صرف ان کا جو سطح پر نظر آتی ہیں بلکہ ان کا بھی جو تہہ میں ہیں، اور جن پر عام نگاہیں نہیں پڑ سکتیں اس کے ساتھ ان خصوصیتوں کے وجوہ اور اسباب بتائیے، یعنی کیونکر پیدا ہوئیں، اور کس طرح ایک رنگ دوسرے رنگ سے بدلتا گیا۔

شاعری اگرچہ غیر مادی چیز ہے، لیکن وہ مادیات کے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ عام قاعدہ یہ ہے کہ جب کوئی قوم ترقی

کرتی ہے، تو ابتدا میں تمام چیزیں، خوراک، پوشاک، مکان، اسباب، آرائش، وضع قطع، بے تکلف اور سادہ ہوتی ہیں رفتہ رفتہ نفاست، لطافت اور تکلف پیدا ہوتا ہے، اور روز بروز ترقی کرتا جاتا ہے، یہاں تک کہ حد سے بڑھ جاتا ہے، اور اس وقت ترقی رُک کر قوم برباد ہو جاتی ہے۔

شاعری کی یہی حالت ہے، ابتدا میں سیدھے سادے، صاف صاف اور بے تکلف خیالات ہوتے ہیں، تشبیہات اور استعارے کہیں کہیں آجاتے ہیں، الفاظ میں تراش خراش نہیں ہوتی جس مضمون کو بیان کرنا چاہتے ہیں، بغیر کسی ایچ پیچ کے بے تکلف اَدا کرتے ہیں۔ اس سے آگے قدم بڑھتا ہے تو خیالات میں بلندی شروع ہوتی ہے، استعارے رنگین ہو جاتے ہیں، تشبیہوں میں نزاکت آجاتی ہے، مبالغوں میں زور پیدا ہو جاتا ہے۔ الفاظ میں تراش خراش شروع ہوتی ہے۔ جس مضمون کو اَدا کرتے ہیں استعاروں کے رنگ میں اَدا کرتے ہیں۔ اس کے بعد دقّت آفرینی اور باریک بینی شروع ہوتی ہے، مبالغے آسمان تک پہنچ جاتے ہیں۔ بال کی کھال نکالی جاتی ہے۔ استعارہ میں استعارہ پیدا کرتے ہیں۔ محسوسات سے گذر کر صرف خیالی چیزوں پر مدار رہ جاتا ہے۔ یہ ترقی کی آخری منزل ہے جو تنزل سے ہمدوش اور ہم آغوش ہے۔

اِس اصول پر فارسی شاعری کے دَورِ اوّل کی سب سے پہلی خصوصیت، سادگی اور بے تکلفی ہے۔ ایران میں جب شاعری

شروع ہوئی تو تمدن اور معاشرت کا اَوج شباب پر تھا شاعری کا جو نمونہ سامنے تھا، وہ متنبی، ابونواس، ابن المعتز، بحتری ابو تمام کی رنگینی بیان اور طلسم کاریاں تھیں۔ باوجود اس کے فارسی شاعری میں ابتداءً ایسے سادے بے تکلف اور سرسری خیالات نظر آتے ہیں کہ گویا قوم میں کسی طرح کا تمدن پیدا نہیں ہوا ہے، یہ وہی بات ہے کہ ہر چیز ابتدا میں نہایت سادہ اور بے تکلف ہوتی ہے

ہماری زبان کو دیکھو۔ ولی دکنی نے اردو شاعری کی بنیاد ڈالی۔ وہ ناصر علی اور بیدل کا معاصر تھا، جو مضمون بندی اور خیال آفرینی میں بال کی کھال نکالتے تھے۔ ولی اِن لوگوں سے راہ ورسم رکھتا تھا۔ اس کے ساتھ فارسی شاعری کا ماہر تھا تاہم اُردو میں شاعری شروع کی تو اس کا یہ انداز ہ ہے۔

جسے عشق کا زخم کاری لگے ہے
تو پھر زندگی اس کو بھاری لگے ہے

سادگی کا یہ وصف قدما کے اخیر دَور تک قائم رہا، لیکن مدارج میں فرق آتا گیا، کیونکہ جس قدر زمانہ گذرتا تھا سادگی کے بجائے آورد اور تکلّف آتا جاتا تھا۔

اس مضمون کو کہ کمینہ آدمی تربیت سے شریف نہیں ہو سکتا، ابوشکور بلخی نے اِس طرح اَدا کیا تھا:

درختے کہ تلخش بود گوہرا اگر چرب و شیریں دہی مر ورا	جس درخت کی اصل تلخ ہے، اگر اس کو چرب اور شیریں غذا دو

ہماں میوہ تلخت آرد پدید	تب بھی وہی کڑوا پھل پیدا کریگا
از و چوب و شیریں نخواہی مزید	اس سے شیریں پھل نہیں پیدا ہوسکتا

اسی مضمون کو فردوسی یوں ادا کرتا ہے:

درختے کہ تلخست ویرا سرشت — گرش برنشانی بہ باغ بہشت
ورا از جوئے خلدش بہ ہنگام آب — بہ بیخش شکر ریزی و شہد ناب
سرانجام، گوہر بہ کار آورد — ہماں میوۂ تلخ بار آورد

بات وہی ہے، لیکن بندش کی چستی اور نشستِ الفاظ نے مضمون کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے۔

شعرا "دل" کو "آگ" سے مشابہت دیتے ہیں، اور یہ عام مضمون ہے۔ لیکن اوّل جب یہ خیال ادا کیا گیا تو اس کی یہ صورت تھی:

احوالِ دلم مپرس کاں بیچارہ	میرے دل کا حال نہ پوچھو،
چوب است اور وفتادہ آتش سوزی نسبتی	وہ ایک لکڑی ہے جس میں آگ لگ گئی ہے۔

اسی خیال کو متاخرین نے یوں ادا کیا۔ ع

یک پارہ آتشے ست، دلش نام کردہ اند

ایک ذرا سے تغیر سے مصرعہ چست ہوگیا۔ "چوب" کا لفظ بھدا تھا وہ نکل گیا۔ اس کے بجائے "پارۂ آتش" نے لطافت پیدا کردی۔ "نام کردہ اند" نے لطافت کو اور بڑھا دیا۔

یہ مضمون کہ "معشوق گو نامہربان اور دشمن ہو، تاہم اُس کی محبت دل سے نہیں جاتی" اوّل اوّل فرخی نے اس

کو یوں ادا کیا تھا:

ہمہ دشمنی از تو دیدم ولیکن نگویم کہ تو دوستی را نشائی	میں نے تجھ سے ہمیشہ دشمنی کا برتاؤ دیکھا، تاہم میں نہیں کہتا کہ تو دوستی کے ناقابل ہے۔

اسی خیال کو سعدیؔ ادا کرتے ہیں:

بلطف و خوبیِ او در جہاں ندیدم کس کہ دشمنی کند و دوستی بیفزاید	میں نے معشوق کی لطافت اور خوبی کے برابر دُنیا میں کسی کو نہیں دیکھا کہ دشمنی کرتا ہے اور باوجود اس کے محبت اور بڑھتی ہے۔

شعرا معشوق کی کمر اور عاشق کے جسم کو لاغر کہتے ہیں، اسی طرح معشوق کے دہن اور عاشق کے دل کو تنگ باندھتے ہیں یہ مضمون قدما کے ہاں ابتدائی حالت سے ادا ہوتا ہے متاخرین نے اس کو صرف بندش سے نہایت خوبصورت کر دیا۔ فرخیؔ کا شعر ہے ؎

گفتم بتا، تن و دل من چیست خود ترا گفتا، کہ میانِ من است آں دیگے دہن	یعنی میں نے پوچھا کہ میرا جسم اور میرا دل کیا چیز ہے؟ معشوق نے کہا، جس کو تم اپنا جسم سمجھے ہو، وہ میری کمر ہے اور جس کو اپنا دل کہتے ہو، وہ میرا دہن ہے۔

اسی بات کو سعدیؔ یوں کہتے ہیں:

دہانِ تنگِ تو آموخت تنگی از دلِ من — وجودِ من ز میانِ تو لاغری آموخت

(۱۱) سیرۃ النبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم): علامہ شبلی کی یہ آخری تصنیف ہے، اور "قامت" و "قیمت" دونوں میں بہتر ہے۔ صاحبِ سیرت علیہ الصلوٰۃ والسلام کی شانِ پاک میں کسی نے کہا ہے:

پیش از ہمہ شاہانِ غیور آمدۂ
ہر چند کہ آخر بظہور آمدۂ

"سیرۃ النبی" کے متعلق میں کہتا ہوں:

پیش از ہمہ جلوہ ہائے نور آمدہ است
ہر چند اگر آخر بظہور آمدہ است

حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام پاک "محمد"[۱] (ستودہ، سراپا ہوا تعریف کیا گیا) جس قدر صادق اور موزوں ثابت ہوا ہے، کسی دوسرے انسان کو یہ فضیلت حاصل نہیں ہے۔ قیامِ عالم اور وجودِ آدم سے تا این دم کسی زمانے کسی ملک، کسی قوم، کسی مذہب کے کسی پیغمبر یا بڑے سے بڑے شخص کی اتنی کثرت سے اور ایسی اعلیٰ مدح وثنا کی گئی؟ اور چیزوں کو چھوڑ کر صرف اردو اور فارسی کی نعتیہ شاعری پر نظر ڈالنے سے ثابت ہو جاتا ہے کہ اس قدر کثیر و عظیم سرمایہ

---

[۱] دوسرا اسم مبارک "احمد" بھی ایسا ہی صادق آتا ہے۔ اس کے معنی ہیں بہت حمد و ثنا کرنے والا" آنحضرت صلعم نے بذاتِ خود جس قدر عبادتِ الٰہی کی وہ عالم کے ہر فردِ بشر سے زیادہ تھی، پھر اس کے ساتھ ان کی اُمت کی عبادت کو شامل کرنا چاہیے جو گویا خود اسی ذاتِ اقدس کی عبادت ہے۔ تمام پیروانِ مذاہب میں مسلمانوں کی کثرتِ عبادت مسلّم ہے۔ دنیا میں اہلِ اسلام کی تعداد دوسرے مذاہب والوں سے زیادہ نہیں ہے۔ باوجود اس کے مسلمانوں کے اوقات و اشغالِ عبادات کی تعداد و مقدار سب سے زیادہ ہے۔ پابندیِ عبادت میں مسلمان تمام اہلِ مذاہب سے بڑھ کر ہیں۔

مدح وستائش دُنیا کے کسی دوسرے انسان کے لئے موجود نہیں ہے۔ اس کے علاوہ تمام عالم کے کروڑوں مسلمان دن رات اُٹھتے بیٹھتے اور اوقات نماز و عبادت میں جس کثرت سے صلوٰۃ وسلام پڑھتے ہیں، وہ بجائے خود تاریخِ عالم کا عظیم الشان واقعہ یہی حال "سیرتِ پاک" کی کتابوں کا ہے۔ قرآن مجید، تفاسیر، احادیث، سیر، مغازی، فضائل، شمائل کی کثرتِ تعداد اور عظمتِ ضخامت، کاوشِ تالیف اور کوششِ تحقیق کو تمام عالم کے کسی دوسرے انسان کی لائف نہیں پہونچتی۔

اُردو میں بااصول، محقق اور مکمل "سیرۃ النبی" لکھنے کی سعادت علامہ شبلی کے حصّے میں آئی، اور سچ یہ ہے کہ ایسی جامع سیرت دنیا کی کسی زبان میں موجود نہیں۔ علامہ سید سلیمان ندوی نے حصۂ اوّل میں جو دیباچہ لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف مرحوم کو ۱۳۲۳ھ (۱۹۰۶ء) میں سیرۃ نبوی لکھنے کا خیال پیدا ہو گیا تھا اور "غزوۂ اُحد" تک لکھ بھی لیا تھا۔ اس کے بعد ۱۳۳۰ھ (۱۹۱۲ء) میں "اس بارِ امانت کے اُٹھانے کا آخری فیصلہ کر لیا" اس کام کے لئے مالی سرمایہ کی ضرورت تھی۔ چنانچہ نواب سلطان جہاں بیگم فرماں فرمائے بھوپال نے "سوانح نگارِ نبوّت کو دوسرے آستانوں سے بے نیاز کر کے اس سرمایۂ سعادت کو اپنے خزانۂ عامرہ میں شامل کر لیا"۔

علامہ شبلی نے اس کے پانچ حصّے تجویز کئے تھے:

(۱) عرب وکعبہ کی تاریخ، اور آں حضرتؐ کے حالات، غزوات، اخلاق اولادِ اطہار اور ازواجِ مطہرات۔

(۲) منصبِ نبوّت، فرائض واحکام۔

(۳) قرآن مجید کی تاریخ اور حقائق واسرار۔

(۴) معجزات کی حقیقت و تحقیق۔

(۵) یورپین تصانیفِ سیرت پر تنقید۔

علامہ اپنی تجویز کا صرف پہلا حصہ لکھ سکے، جس کو اعتدالِ ضخامت کے خیال سے ڈو حصوں میں شائع کیا گیا۔ پہلے میں غزوات و فتحِ مکہ تک اور دوسرے میں حجۃ الوداع، وفات، اخلاق، ازواجِ مطہرات، تاسیسِ خلافت، سالہ تک۔ باقی چار حصے علامہ سید سلیمان ندوی نے معجزات، منصبِ نبوت، مفہومِ عبادت کے متعلق لکھے۔

پہلا حصہ مصنف کی وفات کے بعد ۱۹۱۸ء / ۱۳۳۶ھ میں شائع ہوا۔ "سرنامہ" کس قدر مؤثر و دلکش لکھا ہے:

سرنامہ

ایک گدائے بے نوا، شہنشاہِ کونین کے دربار میں اخلاص و عقیدت کی نذر لے کر آیا ہے،

زچشم آستیں بردار و گوہر را تماشا کن

شبلی، شوال ۱۳۳۰ھ

(۱) ولادت باسعادت کا حال جس اسلوب کے ساتھ لکھا ہے اُس کا جواب نہیں۔

ظہورِ قدسی

چمنستانِ دہر میں بارہا روح پرور بہاریں آچکی ہیں، چرخِ نادرہ کار نے کبھی کبھی بزمِ عالم اس سرو سامان سے سجائی ہے کہ نگاہیں خیرہ ہو کر رہ گئی ہیں۔

لیکن آج کی تاریخ وہ تاریخ ہے جس کے انتظار میں

پیرِ کہن سال دہر نے کروڑوں برس صرف کر دیئے، سیارگانِ فلک اسی دن کے شوق میں ازل سے چشم براہ تھے، چرخِ کہن مدت ہائے دراز سے اسی صبحِ جاں نواز کے لئے لیل و نہار کی کروٹیں بدل رہا تھا، کارکنانِ قضاو قدر کی بزم آرائیاں، عناصر کی جدت طرازیاں، ماہ و خورشید کی فروغ انگیزیاں، ابر و باد کی تردستیاں عالمِ قدس کے انفاسِ پاک، توحیدِ ابراہیمؑ، جمالِ یوسفؑ، معجز طرازیِ موسیٰؑ، جاں نوازیِ مسیحؑ سب اسی لئے تھے کہ یہ متاع ہائے گراں ارز، شاہنشاہِ کونینؐ کے دربار میں کام آئیں گے۔

آج کی صبح وہی صبحِ جاں نواز، وہی ساعتِ ہمایوں، وہی دَورِ فرخ فال ہے۔ اربابِ سیَر اپنے محدود پیرایۂ بیان میں لکھتے ہیں کہ آج کی رات ایوانِ کسریٰ کے ۱۴ کنگرے گر گئے، آتش کدۂ فارس بجھ گیا، دریائے ساوہ خشک ہو گیا۔ لیکن سچ یہ ہے کہ ایوانِ کسریٰ نہیں، بلکہ شانِ عجم، شوکتِ روم، اَوجِ چین کے قصر ہائے فلک بوس گر پڑے۔ آتشِ فارس نہیں، بلکہ جحیمِ شر، آتش کدۂ کفر، آذر کدۂ گمرہی سرد ہو کر رہ گئے۔ صنم خانوں میں خاک اُڑنے لگی، بُت کدے خاک میں مِل گئے، شیرازۂ مجوسیت بکھر گیا، نصرانیت کے اَوراقِ خزاں دیدہ ایک ایک کر کے جھڑ گئے۔

توحید کا غلغلہ اُٹھا، چمنستانِ سعادت میں بہار آگئی، آفتابِ ہدایت کی شعاعیں ہر طرف پھیل گئیں، اخلاقِ انسانی

کا آئینہ پرتوِ قدس سے چمک اُٹھا۔

(۲) غزوۂ اُحد ۳ھ کے بیان میں سے اقتباسات درج کیے
تے ہیں:

"آں حضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اُحد کو پشت پر رکھ کر صف
آرائی کی۔ مصعب بن عمیر کو علَم عنایت ہوا، زبیر بن العوام رسالے
کے افسر مقرر ہوئے۔ حضرت حمزہ رضؓ کو اس حصّہ فوج کی کمان
لی جو زرہ پوش نہ تھے۔ پشت کی طرف احتمال تھا کہ دشمن
اُدھر سے آئیں، اس لیے پچاس تیر اندازوں کا ایک دستہ
متعین فرمایا اور حکم دیا کہ گو لڑائی فتح ہو جائے، تاہم وہ جگہ
سے نہ ہٹیں۔ عبد اللہ بن جبیر رضؓ ان تیر اندازوں کے افسر
مقرر ہوئے۔......

سب سے پہلے طبلِ جنگ کے بجائے خاتونانِ قریش دف پر اشعار
پڑھتی ہوئی بڑھیں، جن میں کُشتگانِ بدر کا ماتم اور انتقام
خون کے رجز تھے۔ ہند (ابو سفیان کی بیوی) آگے آگے اور چودہ
عورتیں ساتھ ساتھ تھیں۔ اشعار یہ تھے:

نَحْنُ بَنَاتُ طَارِق	ہم آسمان کے تاروں کی بیٹیاں ہیں
نَمْشِی عَلَی النَّمَارِق	ہم قالینوں پر چلنے والیاں ہیں
إِنْ تُقْبِلُوا نُعَانِق	اگر تم بڑھ کر لڑو گے تو ہم تم سے گلے ملیں گے
أَوْ تُدْبِرُوا نُفَارِق	اور پیچھے قدم ہٹایا تو ہم تم سے الگ ہو جائیں گے

لڑائی کا آغاز اس طرح ہوا کہ ابو عامر جو مدینہ منورہ کا ایک
مقبولِ عام شخص تھا اور مدینہ چھوڑ کر مکہ میں آباد ہو گیا تھا۔ ڈیڑھ سو

آدمیوں کے ساتھ میدان میں آیا۔ اسلام سے پہلے زہد اور پارسائی کی بنا پر تمام مدینہ اُس کی عزت کرتا تھا۔ چونکہ اس کو یہ خیال تھا کہ انصار جب اُس کو دیکھیں گے تو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ساتھ چھوڑ دیں گے، میدان میں آکر پکارا "مجھ کو پہچانتے ہو؟ میں ابو عامر ہوں۔" انصار نے کہا "ہاں، او بدکار! ہم تجھ کو پہچانتے ہیں، خدا تیری آرزو بر نہ لائے۔"

قریش کا علمبردار طلحہ صف سے نکل کر پکارا "کیوں مسلمانو! تم میں کوئی ہے کہ مجھ کو جلد دوزخ میں پہنچا دے یا خود میرے ہاتھوں بہشت میں پہنچ جائے؟[۵]" علی مرتضیٰ نے صف سے نکل کر کہا "میں ہوں" یہ کہہ کر تلوار ماری اور طلحہ کی لاش زمین پر تھی۔ طلحہ کے بعد اس کے بیٹے عثمان نے جس کے پیچھے پیچھے عورتیں اشعار پڑھتی آتی تھیں، علم ہات میں لیا اور رجز پڑھتا ہوا حملہ آور ہوا۔

اِنَّ عَلٰی اَھْلِ اللِّوَاءِ حَقًّا	نیزہ بردار کا فرض ہے کہ نیزہ کو خون
اَنْ تَخْضِبَ الصَّعْدَۃَ اَوْ تَنْدَقَّا	میں رنگ دے یا وہ ٹکرا کر ٹوٹ جائے

حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ مقابلے کو نکلے اور شانہ پر تلوار ماری کہ کمر تک اُتر گئی، ساتھ ہی اُن کی زبان سے نکلا "میں ساقیِ حجاج کا بیٹا ہوں۔"

اب عام جنگ شروع ہو گئی۔ حضرت حمزہ، حضرت علیؓ

---

۵ یہ اس بات پر طنز تھا کہ مسلمان ایسا سمجھتے ہیں۔ (حاشیۂ سیرۃ النبیؐ)

ابو دجانہ فوجوں کے دل میں گھسے اور صفیں کی صفیں صاف کردیں
ابو دجانہ عرب کے مشہور پہلوان تھے۔ آں حضرت (صلی اللہ علیہ وسلم)
نے دست مبارک میں تلوار لے کر فرمایا۔ "کون اس کا حق
اَدا کرتا ہے؟" اِس سعادت کے لئے دفعۃً بہت سے ہاتھ
بڑھے۔ لیکن یہ فخر ابو دجانہ کے نصیب میں تھا۔ اِس غیر متوقع عزت
نے ان کو مغرور کر دیا۔ سر پر سُرخ رومال باندھا اور اکڑتے
تنتے ہوئے فوج سے نکلے۔ آں حضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے
ارشاد فرمایا کہ "یہ چال خدا کو سخت ناپسند ہے، لیکن اِس
وقت پسند ہے" ابو دجانہ فوجوں کو چیرتے، لاشوں پر لاشے
گراتے بڑھتے چلے جاتے تھے، یہاں تک کہ ہند سامنے آگئی
اُس کے سر پر تلوار رکھ کر اُٹھالی کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم)
کی تلوار اِس قابل نہیں کہ عورت پر آزمائی جائے۔

حضرت حمزہ رض دو دستی تلوار مارتے جاتے تھے اور جس
طرف بڑھتے تھے صفیں کی صفیں صاف ہو جاتی تھیں۔ اِسی
حالت میں سباغ غبشانی سامنے آگیا۔ پکارے "او ختانۃ
النسا کے بچے! کہاں جاتا ہے؟" یہ کہہ کر تلوار ماری۔ وہ
خاک پر ڈھیر تھا۔

وحشی جو ایک حبشی غلام تھا، اور جس سے جبیر بن مطعم اُس
کے آقا نے وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ حمزہ کو قتل کر دے تو آزاد
کر دیا جائے گا۔ وہ حضرت حمزہ رض کی تاک میں تھا۔ حضرت حمزہ
برابر آئے تو اُس نے چھوٹا سا نیزہ جس کو "حربہ" کہتے ہیں اد

جو حبشیوں کا خاص ہتھیار ہے، پھینک کر مارا جو ناف میں لگا اور پار ہو گیا۔ حضرت حمزہ نے اس پر حملہ کرنا چاہا، لیکن لڑکھڑا کر گر پڑے اور رُوح پرواز کر گئی۔

ابو عامر کفار کی طرف سے لڑ رہا تھا، لیکن اُس کے صاحبزادے حضرت حنظلہ اسلام لا چکے تھے۔ انھوں نے آں حضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) سے باپ کے مقابلہ میں لڑنے کی اجازت مانگی لیکن رحمتِ عالم نے گوارا نہ کیا کہ بیٹا باپ پر تلوار اُٹھائے۔ حنظلہ نے کفار کے سپہ سالار (ابو سفیان) پر حملہ کیا اور قریب تھا کہ اُن کی تلوار ابو سفیان کا فیصلہ کر دے۔ دفعۃً پہلو سے شدّاد بن اَسوَد نے جھپٹ کر اُن کے وار کو روکا اور اُن کو قتل کر دیا۔ تاہم لڑائی کا پلہ مسلمانوں ہی کی طرف بھاری تھا۔ علَم برداروں کے قتل اور حضرت علی رضؓ اور ابو دجانہ کے بے پناہ حملوں سے فوج کے پاؤں اُکھڑ گئے۔ بہادر نازنینیں جو رجز سے دلوں کو اُبھار رہی تھیں، بد حواسی کے ساتھ پیچھے ہٹیں، اور مطلع صاف ہو گیا۔ لیکن ساتھ ہی مسلمانوں نے لُوٹ شروع کر دی۔ یہ دیکھ کر تیر انداز جو پشت پر متعین کیے گئے تھے، وہ بھی غنیمت کی طرف جھکے۔

عبد اللہ بن جبیر نے بہت روکا لیکن وہ رُک نہ سکے۔ تیر اندازوں کی جگہ خالی دیکھ کر خالد نے عقب سے حملہ کیا۔ عبد اللہ بن جبیر رضؓ چند جانبازوں کے ساتھ جم کر لڑے، لیکن سب کے سب شہید ہوئے۔ اب راستہ صاف تھا۔ خالد نے سواروں کے

دستے کے ساتھ نہایت بے جگری سے حملہ کیا۔ لوگ لوٹنے میں مصروف تھے، مُڑ کر دیکھا تو تلواریں برس رہی ہیں۔ بدحواسی میں دونوں فوجیں اس طرح رل گئیں کہ خود مسلمان، مسلمانوں کے ہاتھ سے مارے گئے۔ مصعب بن عمیر جو آں حضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) سے صورت میں مشابہ اور علمبردار تھے، ابن قمیئہ نے اُن کو شہید کر دیا اور غل مچ گیا کہ آں حضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے شہادت پائی۔ اِس آواز سے عام بدحواسی چھا گئی بڑے بڑے دلیروں کے پاؤں اُکھڑ گئے۔ بدحواسی میں اگلی صفیں پچھلی صفوں پر لوٹ پڑیں، اور دوست دشمن کی تمیز نہ رہی حضرت حذیفہ کے والد (یمانؓ) اِس کشمکش میں آگئے اور ان پر تلواریں برس پڑیں اور حضرت حذیفہ رضہ چلّاتے رہے کہ "میرے باپ ہیں" لیکن کون سُنتا تھا۔ غرض وہ شہید ہو گئے، اور حضرت حذیفہ رضہ نے ایثار کے لہجے میں کہا "مسلمانو! خدا تمھیں معاف کرے" رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے مُڑ کر دیکھا تو صرف گیارہ جان نثار پہلو میں تھے جناب علی مرتضیٰ، حضرت ابوبکر، حضرت سعد بن وقاص، حضرت زبیر بن العوام، حضرت ابودجانہ، طلحہ کا نام بتخصیص معلوم ہے۔ صحیح بخاری میں یہ روایت ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ صرف طلحہ اور سعد رہ گئے تھے.....

جان نثارانِ خاص برابر لڑتے جاتے تھے، لیکن نگاہیں سرورِ عالم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ڈھونڈھتی تھیں سب سے

پہلے کعب بن مالک کی نظر آپ پر پڑی۔ چہرۂ مبارک پر مغفر تھا
لیکن آنکھیں نظر آتی تھیں۔ کعب نے پہچان کر پکارا "مسلمانو!
رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ ہیں" یہ سُن کر ہر طرف سے
جان نثار ٹوٹ پڑے۔ کفار نے اب ہر طرف سے ہٹ کر اسی
رُخ پر زور دیا۔ دَل کا دَل ہجوم کرکے بڑھتا تھا، لیکن ذوالفقا
کی بجلی سے یہ بادل پھٹ پھٹ کر رہ جاتا تھا۔ ایک دفعہ ہجوم
ہوا تو آں حضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا "کون مجھ پر
جان دیتا ہے؟" زیاد بن سکن پانچ انصاری لے کر اس
خدمت کے ادا کرنے کے لئے بڑھے اور ایک ایک نے جانبازی
سے لڑکر جانیں فدا کردیں۔ زیاد کو یہ شرف حاصل ہوا کہ
آں حضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے حکم دیا کہ ان کا لاشہ
قریب لاؤ۔ لوگ اُٹھا کر لائے۔ کچھ کچھ جان باقی تھی، قدموں پر منہ رکھ دیا
اور اسی حالت میں جان دی ؎

"بچہ ناز رفتہ باشد زجہاں نیازمندے
کہ بوقتِ جاں سپردن بسرش رسیدہ باشی"

علامہ نے "سیرۃ" میں واقعات کی تحقیق و تصحیح بھی کی ہے۔ جہاں بیانات
میں اختلاف ہے یا غلط فہمی پیدا ہوئی ہے یا مخالفانِ اسلام کی حاشیہ آرائی ہے وہاں
علامہ نے روایت و درایت (نقل و عقل) سے جانچ کر فیصلہ کر دیا ہے۔

(۱۲) رسائل و مقالات: علامہ نے سب سے پہلا مضمون "مسلمانوں کی
گذشتہ تعلیم" لکھا تھا۔ اس کے بعد تصانیف کے ساتھ چھوٹے بڑے مقالات
بھی مختلف رسالوں میں لکھتے رہے۔ پھر ندوۃ العلماء کی طرف سے ماہوار رسالہ

"الندوہ" جاری کیا۔ اس میں کثرت سے ہر قسم کے مضامین لکھے۔ طویل مضامین "رسائلِ شبلی" کہلاتے ہیں۔ اسی نام سے شائع ہوئے تھے۔ اب دار المصنفین نے مقالاتِ شبلی آٹھ جلدوں میں اس ترتیب سے شائع کر دیئے ہیں:

جلد اوّل: مذہبی مضامین جلد دوم: ادبی مضامین

جلد سوم: تعلیمی مضامین جلد چہارم: تنقیدی مضامین

جلد پنجم: سوانحی مضامین جلد ششم: تاریخی مضامین

جلد ہفتم: فلسفیانہ مضامین جلد ہشتم: قومی مضامین

یہ تمام مضامین علامہ شبلی کے زورِ قلم، قوتِ استدلال، وسعتِ تحقیق اور دقتِ نظر کے شاہد ہیں۔ بعض جگہ ان کی رائے و نظریہ سے اختلاف ہو سکتا ہے، کہیں تحقیق میں جانب داری بھی پائی جاتی ہے۔ لیکن یہ جزئی باتیں ہیں، اس لئے لائقِ اعتنا نہیں۔ علامہ نے بعض ایسے مضامین (مثلاً تاریخی) پر قلم اُٹھایا ہے، جن کی طرف اُن سے پہلے کسی کی توجہ نہ ہوئی تھی۔ اور جن کی اہمیت آج بھی مسلّم ہے۔ علامہ کے معاصرین میں سب سے بڑے "مقالہ نگار" مولوی عبدالحلیم شرر لکھنوی ہیں۔ ان کے مضامین کے مجموعے علامہ شبلی کے مقابلے میں نہایت کثیر و ضخیم ہیں۔ "مقالاتِ شبلی" کے موضوعات میں سے چھ سات موضوع "مضامینِ شرر" میں بھی موجود ہیں۔ ان میں سے "تاریخ" میں دونوں کا مقابلہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ شرر اپنے مضمون کو نادر و دلچسپ بنانے کی کوشش کرتے ہیں، تحقیق کی کدو کاوش زیادہ نہیں کرتے، اور شبلی تاریخ و تحقیق کو مدِ نظر رکھتے ہیں۔

خواجہ غلام الثقلین علامہ کے تاریخی مضامین کے متعلق لکھتے ہیں:

"یہ عجیب بات ہے کہ مولانا شبلی کی حریتِ خیال جہاں

مذہب اور اپنے زمانے کے پالیٹکس میں حاوی تھی، وہاں تاریخی
معاملات میں خاص کر مطلق العنان اور جابر بادشاہوں کی تائید
میں وہ مفقود ہو جاتی تھی۔ انسانی دماغ اِس قسم کے متبائن
رُجحانات سے معمور ہے۔ اُن کے اِس میلان کی زیادہ تر یہی وجہ
تھی کہ یورپین اور عیسائی مؤرخوں اور آریہ مناظروں نے طریقۂ
اعتدال کو چھوڑ کر ہر مسلمان حکمران پر اعتراضات کی ناواجب
سختی روا رکھی تھی اور اِس بات کو عمداً نظر انداز کر دیا تھا کہ
قرآن کے افعال کو بدنیتی کی طرف محمول کرنا ایک غیر عاقلانہ
اور غیر فلسفیانہ فعل ہے۔ اِس بے اعتدالی کے جواب میں
مولانا شبلی بعض تاریخی مضامین و تصانیف میں اس غلطی
کے مرتکب ہوتے ہیں کہ عموماً مسلمان بادشاہ (لہٰذا ان کے
عام درباری اور اہلِ زمانہ) نہایت مفید اور اچھے کام
کرتے تھے۔ حالانکہ اگر کل تک یہ حالت تھی تو یہ کیوں کر ہو سکتا
ہے کہ مسلمانوں کی حالت آج اس قدر خراب نظر آتی ہے۔ لیکن یہ
رائے کا اختلاف ہے۔ مولانا شبلی کا خیال تھا کہ عالمگیر جہانگیر
یا عبدالحمید خان کی تائید سے اصل اسلام پر الزام تک کی
نوبت نہیں پہنچے گی۔ ہمارا خیال اس کے خلاف ہے۔ ع
ہر سخن موقع و ہر نکتہ مقامے دارد"

(مضمون مطبوعہ سیر المصنفین)

اِس مضمون کا مرکزی خیال بالکل درست ہے کہ علّامہ کبھی جانبداری
میں اعتدال کو چھوڑ دیتے ہیں، لیکن اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ تنا یانِ

جابر کے جن افعال سے انکار نہیں ہو سکتا، ان کی تاویل کیوں کرتے ہیں، ان کو ظالم و خاطی ہی کیوں نہیں رہنے دیتے۔ ورنہ علامہ ایسا کبھی نہیں کرتے کہ بادشاہوں، ان کے درباریوں یا اہلِ زمانہ کے ایسے کاموں کو جو منافیِ اسلام و مخالفِ شرع ہوں، جائز و مستحسن قرار دیں۔ اس لئے ان کے افعال کی ذمّہ داری خود انہیں بزرگوں پر رہتی ہے۔ اصل اسلام پر الزام کی نوبت نہیں آتی۔ علامہ کی تاویل صرف اِس بات کے کہنے کی گنجائش نکال دیتی ہے کہ:

"ناکردہ گناہ در جہاں کیست، بگو"

لیکن جہاں علامہ شبلی نے بے بنیاد الزامات کی تردید کی ہے۔ مشہور تاریخی مزخرفات کی بیخ کنی کی ہے اور مخالفانِ اسلام کا تعصب ثابت کیا ہے وہ اُن کا غیر فانی کارنامہ ہے۔

ہر مصنّف کی تصانیف میں مقالات و مضامین کا خاص مرتبہ ہوتا ہے۔ بعض مصنّف مضامین ہی کی بدولت زندہ ہیں اور رہیں گے۔ علامہ شبلی کے مقالات بھی ان کی اکثر تصنیفات سے زیادہ مقبول و دیرپا ہیں۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے اب سے تیس برس پہلے لکھا تھا کہ "مولانا شبلی کی تصانیف کو ابھی سے نونی لگنی شروع ہو گئی ہے۔" (مقدمہ خطوطِ شبلی" مطبوعہ ۱۹۲۶ء) یہ زمانہ کا "عملِ جرّاحی" ہے اور اس سے کسی کو مفر نہیں۔ اس حساب سے سر سیّد اور مولوی ذکاء اللہ کی دیواریں تو اس نونی سے ڈھے چکیں، باقی "عناصرِ اربعہ" کے آب و گِل میں ابھی جان باقی ہے۔ ان میں علامہ شبلی ابھی ایک مدّت زمانہ کا ساتھ دیں گے۔ لیکن مضامین و مقالات ان سب مصنفوں کے بڑے وقیع و جاندار ہیں۔ ان میں "بقائے اصلح" کا قانون جاری رہے گا، مگر فنا نہ ہوں گے۔

مقالاتِ شبلی کی جلدوں میں سو سے زیادہ چھوٹے بڑے مضامین ہیں بعض مضمون ۴۰، ۵۰ صفحوں کے ہیں۔ بعض مضامین عام دلچسپی کے نہیں ہیں، لیکن نہایت نادر و جدید ہیں۔ ہم ایک دو مقالوں کا اقتباس درج کرتے ہیں۔ ہر مقالے میں سے کچھ عبارتیں چھوڑ دی ہیں۔

(الف) زیب النسار کی ولادت زیب النسار اورنگ زیب کی سب سے پہلی اولاد تھی، اس کی ماں جس کا نام دلرس بانو بیگم تھا، شاہ نواز خاں صفوی کی بیٹی تھی۔ شاہ نواز کا اصلی نام بدیع الزماں ہے۔ جہاں گیر کے زمانے میں معزز عہدوں پر ممتاز ہوکر شاہ نواز خاں کے خطاب سے ملقب ہوا۔ شاہ جہاں کے زمانے میں بھی کارہائے نمایاں کئے، چونکہ لیاقتِ ذاتی کے ساتھ عالی خاندان بھی تھا۔ شاہ جہاں نے ۱۰۴۶ھ میں کہ اس کی سلطنت کا دسواں سال تھا اورنگ زیب کی شادی اس کی بیٹی سے کردی چار لاکھ مہر باندھا گیا۔ طالب کلیم نے مادۂ تاریخ کہا: ع

دو گوہر بیک عقد دوراں کشیدہ

زیب النسار شادی کے دوسرے سال شوال ۱۰۴۸ھ میں پیدا ہوئی۔ عالمگیری امرا میں عنایت اللہ خاں نہایت معزز عہدہ دار تھا۔ اس کی ماں حافظہ مریم قابل اور تعلیم یافتہ تھی، زیب النسار پڑھنے کے قابل ہوئی تو اورنگ زیب نے اس کی تعلیم کے لئے حافظہ مریم کو مقرر کیا۔ جس نے حسب دستور سب سے پہلے قرآن مجید کی تعلیم دی۔ زیب النسار نے قرآن مجید حفظ یاد کیا، جس کے صلے میں اورنگ زیب نے تیس ہزار اشرفی انعام دی۔

تمام تاریخیں اور تذکرے متفق اللفظ ہیں کہ زیب النساء نے عربی اور فارسی کی تعلیم نہایت اعلیٰ درجہ کی حاصل کی تھی اور بڑے بڑے علماء و فضلاء اس کی خدمت میں رہتے تھے لیکن اس کے اساتذہ میں سے زیادہ مقرب اور باریاب مُلّا سعید اشرف مازندرانی تھے، مُلّا سعید تقی مجلسی کے نواسے تھے۔ عالمگیر کے آغازِ جلوس میں ایران سے آئے اور عالمگیر نے اُن کو زیب النساء کی تعلیم کے لئے مقرر کیا، اُس وقت زیب النساء کی عمر تقریباً اکیس[21] برس کی تھی۔ اِس سے قیاس ہو سکتا ہے کہ تیموریوں میں مستورات کی تعلیم کا سلسلہ کس قدر ممتد ہوتا تھا۔ زیب النساء نظم و نثر میں مُلّا سعید ہی سے اصلاح لیتی تھی۔

مُلّا اشرف شاعر بھی تھے اور شاعری ہی کے وصف سے مشہور ہیں تقریباً تیرہ[13]۔ چودہ[14] برس، وہ تعلیم کے تعلق سے زیب النساء کی خدمت میں رہے۔ ۱۰۸۳ھ میں وطن جانا چاہا۔ زیب النساء کی خدمت میں ایک قصیدہ لکھ کر پیش کیا جس میں رخصت کی درخواست کو اِس طرح ادا کیا تھا:

یک بار از وطن نتواں برگرفت دل — در غربتم گرچہ فزوں است اعتبار
پیشِ تو قرب و بُعد تفاوت نمی کند — گو خدمتِ حضور نباشد مرا شعار
نسبت چو با طنی ست چہ دہلی چہ اصفہاں — دل پیش تست من چہ بکابل چہ قندہار

زیب النساء نے جس قسم کی تعلیم پائی تھی اور خود اس کا مذاقِ طبیعت جس قسم کا واقع ہوا تھا، اُس کے لحاظ سے وہ پالیٹکس سے بالکل نا آشنا تھی، تاہم عالمگیر کے پُر پیچ عہدِ حکومت

میں وہ بھی اس بدنامی سے نہ بچ سکی۔ سنہ ۱۰۹۱ھ میں راجپوتوں نے جب
عام بغاوت کی اور عالمگیر نے اُس کے دبانے کے لئے شہزادہ اکبر
کو فوجِ گراں دے کر جودھپور کی طرف روانہ کیا، تو راجپوتوں
کے بہکانے سے شہزادہ خود باغی ہو گیا اور عالمگیر کے مقابلے کو
بڑھا، زیب النساء اور شہزادہ اکبر حقیقی بھائی بہن تھے دونوں
میں خط کتابت بھی تھی۔ یہ خطوط پکڑے گئے اور عالمگیر نے اس کے
انتقام میں زیب النساء کی تنخواہ جو چار لاکھ سالانہ تھی بند کر دی
اس کے ساتھ تمام مال و متاع ضبط کر لیا گیا اور قلعہ سلیم گڈھ
میں رہنے کا حکم ہوا، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ بہت جلد
اس کی بے گناہی ثابت ہوئی اور عفوِ قصور کر دیا گیا۔

زیب النساء نے شادی نہیں کی، عام طور پر مشہور ہے
کہ سلاطینِ تیموریہ لڑکیوں کی شادی نہیں کرتے تھے۔ اِس غلط
روایت کو یورپین مصنفوں نے بہت شہرت دی ہے اور اس سے
ان کو شاہی بیگمات کی بدنامی پھیلانے میں بہت مدد ملی ہے، لیکن یہ
قصہ ہی سرے سے بے بنیاد ہے۔ خود عالمگیر کی دو بیٹیاں زبدۃ النساء
بیگم اور مہر النساء بیگم، سپہر شکوہ اور ایزد بخش (پسرِ شہزادہ
مراد) سے بیاہی تھیں۔ چنانچہ مآثرِ عالمگیری میں دونوں شادیوں
کی تاریخیں اور مختصر حالات لکھے ہیں اور خاتمۂ کتاب میں بھی
اس کا ذکر کیا ہے۔

عالمگیر، زیب النساء کی نہایت عزت کیا کرتا تھا، جب وہ
کہیں باہر سے آتی تھی تو اس کے استقبال کے لئے شہزادوں کو

بھیجتا تھا۔ سفر و حضر میں اس کو ساتھ رکھتا تھا، کشمیر کے دشوار سفر
میں بھی وہ ساتھ تھی۔ لیکن جب عالمگیر دکن گیا تو اس نے غالباً
اپنی علمی زندگی کی وجہ سے پائے تخت کو چھوڑنا مناسب نہ سمجھا
اس کی چھوٹی بہن زینت النساء عالمگیر کے ساتھ گئی۔ چنانچہ اس
کا نام بار بار واقعات میں آتا ہے۔ زیب النساء نے دلی میں قیام کیا
اور وہیں پیوندِ زمین ہو گئی۔ زیب النساء نے ۱۱۱۳ھ میں
جو عالمگیر کی حکومت کا اڑتالیسواں سال تھا، دلی میں انتقال
کیا۔ اُدخُلِی جَنَّتِی مادۂ تاریخ ہے۔

ہ اس فقرے میں یہ غلطیاں ہیں کہ (۱) ۱۱۱۳ھ عالمگیر کا اڑتالیسواں سالِ جلوس نہیں ہے
(۲) مادۂ تاریخ "اُدخُلِی جَنَّتِی" میں ۱۱۱۳ھ نہیں نکلتا۔

تاریخوں کے بیانات اس قدر مختلف ہوتے ہیں کہ سنینِ واقعات کا تعین و
مطابق کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔ ایسی حالت میں تاریخی مادے بڑے کار آمد ثابت ہوتے
ہیں، اگرچہ علامہ شبلی جیسے بے پروا مورخ تاریخی مادے بھی غلط نقل کر کے
دھوکے میں ڈال سکتے ہیں۔ مثلاً "مقالاتِ شبلی" جلد سوم (تعلیمی) کے ص۹۶ پر
ملا نظام الدین بانیٔ درسِ نظامیہ کا سالِ وفات ۱۱۶۱ھ لکھا ہے اور تاریخِ وفات
کا یہ مصرع لکھا ہے "مَلِکْ بود و بیک حرکت مَلَکْ گشت" لیکن اس میں سنہ
وفات سے کئی سو زائد نکلتے ہیں۔ اب اگر کسی کو ملا صاحب کا سنہ وفات یاد نہ ہو
اور علامہ کا لکھا ہوا مصرع یاد ہو، اور وہ سنہ دریافت کرنا چاہے تو نہیں کر سکتا
مزید لطف یہ کہ اس مضمون سے دس برس بعد علامہ نے ایک اور مضمون ——
"درسِ نظامیہ" لکھا ہے۔ اس میں ملا صاحب کی اسی تاریخِ وفات کا پورا قطعہ
درج کیا ہے۔ اس میں مصرعِ تاریخ یہ لکھا ہے "مَلِکْ بود و بیک حرکت مَلَکْ شد"

(بقیہ صفحہ ۸۷۱)

عالمگیر اس زمانے میں دکن کی فتوحات میں مصروف تھا۔
یہ خبر سُنکر سخت غمزدہ ہوا۔ بے اختیار آنکھوں سے آنسو نکلے اور
باوجود انتہا درجہ کے استقلالِ مزاج کے صبر کی تاب نہ لاسکا،
سید امجد خاں، شیخ عطاءاللہ اور حافظ خاں کے نام حکم صادر ہوا
کہ اس کے ایصالِ ثواب کے لئے زکوٰۃ و خیرات دیں اور
مرحومہ کا مقبرہ تیار کرائیں۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۸۷۰) یہ صحیح ہے، لیکن اس میں ذرا سا تغیر ہو گیا ہے۔ مصرع یوں ہونا چاہیئے "ملک بودہ بیک حرکت ملک شد"۔ اب ۱۱۶۱ھ پورے ہو جائیں۔

بہر حال ہم سنینِ "زیب النساء" میں تاریخ گوئی کی سند اختیار کرتے ہیں۔ کسی قدیم تاریخ گو نے عالمگیر کے متعلق یہ تاریخیں نکالی ہیں: تاریخ ولادت "آفتابِ عالم تاب" (۱۰۲۸ھ)۔ تاریخِ جلوس "آفتابِ عالم تابم" (۱۰۶۸ھ)۔ تاریخ وفات "آفتابِ عالم تاب من" (۱۱۱۸ھ)۔ اس حساب سے سالِ جلوس ۱۰۶۸ھ ہوتا ہے، تو اڑتالیسواں سال جلوس ۱۱۱۶ھ ہوا۔ تاریخوں سے بھی یہی ثابت ہے اور خود علامہ شبلی کی ایک اور تحریر سے بھی اسی کی تصدیق ہوتی ہے ملا نظام الدین صاحب مذکور الصدر کے حالات میں، صفحہ ۹۳ پر ملا صاحب کے بھائیوں کے نام عالمگیر کا فرمان نقل کیا ہے اس میں یہ الفاظ ہیں "۳۷ھ جلوس والا موافق ۱۱۰۵ھ" اس کے مطابق بھی اڑتالیسواں سالِ جلوس ۱۱۱۶ھ ہوتا ہے۔

زیب النساء کا انتقال ۲۹ ذی الحجہ ۱۱۱۲ھ کو ہوا ہے لیکن مادہ تاریخ "اُدخلی جنتی" میں ۱۱۰۸ھ نکلتا ہے۔ اگر یہ تاریخ اسی زمانے میں نکالی گئی ہے تو اتنا بڑا فرق نہیں ہو سکتا۔ اس کی ایک ہی تاویل و تطبیق ہمارے ذہن

(باقی بر صفحہ ۸۷۲)

خافی خاں نسخہ مطبوعہ کلکتہ میں زیب النساء کا نام اور اس کے واقعات سنہ ۱۱۲۲ھ تک آتے ہیں، لیکن یہ صریحی غلطی ہے کاتبوں کی غلطی سے زینت النساء کو زیب النساء سے بدل دیا ہے۔

کمالات علمی اور عام اخلاق و عادات

تمام مورخین نے یہ تصریح لکھا۔ زیب النساء علوم عربیہ اور فارسی زبان دانی میں کمال رکھتی تھی نستعلیق نسخ اور شکستہ خط نہایت عمدہ لکھتی تھی لیکن اسکی تصنیفات سے آج کوئی چیز موجود نہیں، عام طور پر مشہور ہے کہ وہ مخفی تخلص کرتی تھی اور دیوان مخفی جو چھپ کر شائع ہو چکا ہے، اسی کا ہے لیکن یہ صحیح نہیں، کسی تاریخ یا تذکرہ میں اس کے تخلص یا دیوان کا تذکرہ نہیں۔

اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ وہ شاعر تھی، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس کا کلام ضائع ہو گیا، اسی تذکرہ میں ملا سعید اشرف

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) میں آئی ہے۔ وہ یہ کہ ۲۹ ذی الحجہ کو انتقال ہوا ہے سنہ ۱۱۱۳ھ کے ختم ہونے میں ایک دن باقی تھا۔ ایسی صورت میں تاریخ گو سال آئندہ کا مادہ تاریخ کہہ سکتا ہے۔ چنانچہ اس تاریخ گو نے بھی سنہ ۱۱۱۴ھ کا مادہ نکالا ہے۔ وہ اس طرح سے کہ اس آیت کے شروع میں (و) بھی ہے۔ اس نے "واو" سمیت تاریخ نکالی ہے' وَادْخُلِی جَنَّتِی میں سنہ ۱۱۱۴ھ نکلتے ہیں۔ تاریخوں میں نقل ہوتے ہوئے واو عطف چھوٹ گیا، ویسے ہی علامہ شبلی نے نقل کر دیا۔ ان کو اعداد نکالنے سے بڑی کوفت ہوتی ہے۔ اپنی یہ عادت عطیہ بیگم کو ایک خط میں لکھ چکے ہیں۔ ان کی والدہ کی تاریخ وفات نکالنے سے معذرت کی تھی، مرثیہ کہہ دیا تھا۔ (قادری)

کے حال میں لکھا ہے کہ زیب النسار کی بیاض خاص ایک خوشخص کے
ہاتھ سے جس کا نام ارادت فہم تھا حوض میں گر پڑی چنانچہ
سعید اشرف نے اس پر ایک قطعہ لکھا جو آگے آئے گا۔ غالباً
یہ اشعار کی بیاض ہوگی۔ تذکروں میں یہ دو شعر زیب النسار
کے نام سے منقول ہیں :

بشکند دستے کہ خم در گردنِ یارے نشد
کور بہ چشمے کہ لذت گیرِ دیدارے نشد

صد بہار آخر شد و ہر گل بہ فرقے جا گرفت
غنچۂ باغِ دلِ ما زیب دستارے نشد

زیب النسار کی تصنیفات و تالیفات سے زیب المنشآت
کا ذکر البتہ تذکروں میں آیا ہے، تذکرۃ الغرایب کے مصنف
نے لکھا ہے کہ "میں نے اس کو دیکھا ہے" یہ زیب النسار کے
خطوط اور رقعات کا مجموعہ ہے۔

علم پروری

زیب النسار نے خود کوئی تصنیف کی ہو یا نہ
کی ہو، لیکن اس نے اپنی نگرانی میں اہل فن
سے بہت سی عمدہ عمدہ کتابیں تصنیف کرائیں۔

زیب النسار کا دربار حقیقت میں ایک اکاڈمی (بیت العلم)
تھی۔ ہر فن کے علمار اور فضلار نوکر تھے جو ہمیشہ تصنیف و
تالیف میں مصروف رہتے تھے۔ یہ کتابیں عموماً اس کے نام
سے موسوم ہوتی تھیں، یعنی اُن کتابوں کے نام کا پہلا جز زیب
کا لفظ ہوتا تھا۔ اس سے اکثر تذکرہ نویسوں کو دھوکا ہوا ہے

اور انھوں نے وہ کتابیں زیب النسار کی تصنیفات میں شمار کیں۔

زیب النسار نے جو کتابیں تصنیف کرائیں، ان میں زیادہ قابلِ ذکر۔ تفسیر کبیر کا ترجمہ ہے۔ یہ مسلّم ہے کہ تفسیروں میں امام رازی کی تفسیر سے زیادہ جامع کوئی تفسیر نہیں۔ اس لئے زیب النسار نے ملّا صفی الدین اردبیلی کو جو کشمیر میں مقیم تھے، حکم دیا کہ اس کا فارسی میں ترجمہ کریں۔ چنانچہ اس کا نام زیب التفاسیر رکھا گیا۔ بعض تذکرہ نویسوں نے غلط لکھ دیا ہے کہ وہ زیب النسار کی مستقل تصنیف ہے۔

زیب النسار نے تصنیف و تالیف کا جو محکمہ قائم کیا تھا، اس کے ساتھ ایک عظیم الشان کتب خانہ کا ہونا بھی ضرور تھا جس سے مصنفین فائدہ اُٹھا سکیں۔ چنانچہ بیگم موصوف نے ایک نہایت عظیم الشان کتب خانہ قائم کیا۔ معنف مآثرِ عالمگیری کا بیان ہے کہ اِس کتب خانہ کی نظیر کسی کی نظر سے نہ گذری ہوگی۔ مصنف مذکور کے الفاظ یہ ہیں:

"در سرکارِ علیہ کتاب خانہ گرد آمدہ بود کہ بہ نظرِ ہیچ کجے درنیامدہ باشد" (صفحہ ۵۳۹)

زیب النسار کے حسنِ مذاق سے بڑا نفع یہ ہوا کہ عالمگیر کی خشک مزاجی نے جو نقصان پہنچایا تھا، اس کی تلافی ہوگئی۔ یاد ہوگا کہ دربار میں ملک الشعرائی کا خاص عہدہ ابتدائے سلطنت سے چلا آتا تھا۔ جس پر فیضی، طالب آملی، قدسی، کلیم مامور رہ چکے تھے، عالمگیر نے اِس عہدہ کو موقوف کر دیا

اور دفعۃً شعرا گویا بے خان ومان ہو گئے۔ لیکن زیب النسا کی قدر دانی نے پھر وہ دربار قائم کر دیا۔ مختلف تقریبوں پر شعرا قصیدے اور نظمیں لکھ کر پیش کرتے تھے اور گراں بہا انعام پاتے تھے۔ زیب النسا کی شعر دوستی کا یہ اثر ہوا کہ اہلِ سخن معمولی عرض و معروض بھی شعر ہی میں کرتے تھے۔

نعمت خاں عالی اُس زمانے کا مشہور شاعر تھا۔ ایک دفعہ اُس نے ایک مرصّع کلغی جو دستار پر لگاتے تھے زیب النسا کی خدمت میں فروخت کے لئے پیش کی، زیب النسا نے رکھ لی، لیکن جیسا کہ درباروں کا معمول ہے قیمت کے ملنے میں دیر ہوئی، نعمت خاں نے یہ رُباعی لکھ کر بھیجی:

اے بندگیت سعادتِ اخترِ من	در خدمت تو عیاں شدہ جوہرِ من
گر جیغہ خریدنی ست پس کو زرِ من	ور نیست خریدنی، بزن بر سرِ من
اگر خریدنا ہے تو دام دِلوائیے	اور نہ خریدنا ہو تو میرے سر ماریئے

بیگم نے پانچ ہزار روپے دلوائے، اور کلغی واپس کر دی۔

جہاں آرا بیگم (زیب النسا کی پھوپھی) ایک دفعہ باغ کی سیر کو نکلی۔ ہر طرف پردہ کرا دیا گیا۔ میر سعیدی طہرانی ایک مشہور شاعر تھا۔ وہ کسی حجرہ میں چھپ کر سواری کا تماشہ دیکھ رہا تھا بیگم کا ہاتھی پاس سے گذرا تو بے ساختہ سعیدی نے یہ مطلع پڑھا:

بُرقع برُخ افگنده برد ناز بہ باغش	تا نکہتِ گل بیختہ آید بہ دماغش
باغ میں برقع پہن کر اس لئے جاتی ہے	کہ پھول کی خوشبو چھنکر دماغ میں آئے

بیگم نے حکم دیا کہ شاعر کو کشاں کشاں سامنے لائیں۔ بیگم نے بار بار مطلع پڑھوا کر سنا اور پانچ ہزار روپے دلوا دیئے۔ لیکن ساتھ ہی حکم دیا کہ شہر سے نکال دیا جائے (یعنی یہ گستاخی کیوں کی؟) اس واقعہ سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ بیگمات کے لئے کس قسم کے آداب مقرر تھے۔

اخلاق و عادات زیب النساء اگرچہ درویشانہ اور منصفانہ مذاق رکھتی تھی، تاہم شاہجہاں کی پوتی تھی، اس لئے نفاست پسندی اور امارت کے سرد سامان بھی لازمی تھے۔ عنایت خاں جو اُمرائے عالمگیری میں مقربِ خاص تھا، زیب النساء کا میرِ خانساماں تھا۔ کشمیر میں جابجا جو خوشگوار اور خوش منظر چشمے ہیں، ان میں سے ایک چشمہ جس کا نام "احول" تھا۔ زیب النساء کی جاگیر میں تھا۔ زیب النساء نے اس کے متصل ایک نہایت پر تکلف باغ اور شاہانہ عمارتیں تیار کرائی تھیں۔ چنانچہ عالمگیر جب ۱۰۷۴ھ میں کشمیر کے سفر کو گیا ہے، تو اس مقام پر ایک دن قیام کیا، اور زیب النساء نے قاعدہ کے موافق نذر پیش کی اور روپے نچھاور کئے۔

۱۰۹۰ھ میں ابرک کا ایک بڑا خیمہ تیار کرایا تھا، جو تمام تر شیشہ معلوم ہوتا تھا۔ نعمت خان عالی نے اس کی تعریف میں ایک چھوٹی سی مثنوی لکھی۔

بھائیوں سے نہایت محبت رکھتی تھی، ۱۰۸۵ھ میں

جب اعظم شاہ مرضِ استسقا میں سخت بیمار ہوا تو زیب النسار نے اس کی تیمارداری اس محبت سے کی کہ تمام ایامِ مرض تک اُس پرہیزی غذا کے سوا جو خود شہزادہ کھاتا تھا، کوئی اور غذا نہ کھائی۔ محمد اکبر جس زمانے میں عالمگیر سے باغی ہو کر راجپوتوں سے مل گیا ہے، اُس زمانے میں بھی زیب النسار نے اُس سے برادرانہ راہ رسم اور خط و کتابت ترک نہ کی، جس کے صلے میں اُس کی تنخواہ اور جاگیر ضبط ہو گئی۔

زیب النسار کے متعلق جھوٹے قصّے

زیب النسار کے متعلق متعدد جھوٹے قصّے مشہور ہو گئے ہیں، جن کو یورپین مصنفوں نے اور زیادہ آب و رنگ دیا ہے، ان میں سے ایک یہ ہے کہ — زیب النسار اور عاقل خاں سے عاشقی اور معشوقی کا تعلق تھا اور زیب النسار اس کو چوری چھپے سے محل میں بلایا کرتی تھی ایک دن عالمگیر محل میں موجود تھا کہ اس کو پتہ لگا کہ عاقل خاں محل میں ہے اور حمام کی دیگ میں چھپا دیا گیا ہے، عالمگیر نے انجان بن کر اسی دیگ میں پانی گرم کرنے کا حکم دیا۔ عاقل خاں نے اخفائے راز کے لحاظ سے دم نہ مارا اور جل کر رہ گیا۔ مرنے کے وقت یہ مطلع کہا تھا:

بعدِ مردن زجفائے تو اگر یاد کنم   از کفن دست برون آدم و فریاد کنم

عاقل خاں کا مفصل تذکرہ مآثر الامرا میں موجود ہے اور چونکہ شاعر تھا۔ تمام تذکروں میں اس کے حالات مذکور ہیں۔ لیکن

اِس واقعہ کا کہیں نام و نشان نہیں، جن کتابوں میں اس کا حال
مِل سکتا تھا اور جو مستند اور معتبر خیال کی جاتی ہیں، حسب ذیل
ہیں: عالمگیر نامہ، مآثر عالمگیری، مآثر الامرار، تذکرہ سرخوش،
خزانۂ عامرہ، سروِ آزاد، یدِ بیضا، ان کتابوں میں ایک حرف
بھی اس واقعہ کے متعلق نہیں، حالانکہ اس کی وفات کا تذکرہ
سب نے لکھا ہے، جو سنہ ۱۱ھ میں واقع ہوئی۔

دوسرا واقعہ یہ مشہور ہے کہ ایک دفعہ زیب النسار نے یہ
مصرع کہا:

ازہم نمی شود زِ حلاوت جُدا لبم

چاہتی تھی کہ مطلع ہو جائے، لیکن دوسرا مصرع اس کی جوڑ
کا موزوں نہیں ہوتا تھا۔ ناصر علی کے پاس مصرع لکھ کر بھیجا
اُس نے برجستہ کہا:

ازہم نمی شود ز حلاوت جُدا لبم شاید رسید بر لبِ زیب النسا لبم

لیکن جو شخص تیموریوں کے جاہ و جلال اور آداب و آئین سے
واقف ہے، وہ سمجھ سکتا ہے کہ بیچارے ناصر علی کو خواب میں
بھی اِس گستاخی کی جرأت نہیں ہو سکتی تھی۔"

(الندوہ جلد ۶ نمبر ۹، اکتوبر سنہ ۱۹۰۹ء)

(ب) تحفۃ الہند

مسلمانوں کی توجہ برج بھاشا پر۔ برج بھاشا کا فن معانی و بیان
تحفۃ الہند جو ہمارے مضمون کا عنوان ہے، ایک کتاب کا نام

ہے، جو اورنگ زیب عالمگیر کے زمانے میں تصنیف ہوئی۔ مصنف کا نام میرزا خان بن فخرالدین محمد ہے۔ دیباچہ میں لکھا ہے کہ میں نے یہ کتاب شہنشاہِ عالمگیر کے زمانہ میں شہزادہ اعظم شاہ کے مطالعہ کے لئے تصنیف کی۔ کتاب کا موضوع ہندوؤں کا فنِ بلاغت اور عروض و قافیہ وغیرہ ہے۔ اس میں سات باب ہیں،

۱۔ پنگل، یعنی علمِ عروض ۲۔ تک، یعنی قافیہ

۳۔ النکار، یعنی علمِ بدیع ۴۔ سرنگار رس، یعنی عشق و محبت

۵۔ سامدرک، یعنی علمِ قیافہ ۶۔ کوک، یعنی علم النساء

۷۔ لغاتِ ہندی۔ اس میں برج بھاشا کے مفرد کثیر الاستعمال الفاظ لکھے ہیں اور اُن کے معنی بتائے ہیں۔

یہ کتاب عالمگیر کے زمانہ میں تصنیف ہوئی ہے اور اس کے سب سے چہیتے اور منظورِ نظر فرزند کے مطالعہ کے لئے تصنیف ہوئی ہے۔ عالمگیر کی نسبت اس کے مخالفوں کا دعویٰ ہے کہ وہ تعصّب کا دیوتا تھا اور اس نے ہندوؤں کی نہ صرف عمارات بلکہ اُن کے لٹریچر کو بھی مٹا دینا چاہا تھا، اور اس لئے ان کی تمام درس گاہیں اور پاٹ شالے بند کرا دیئے تھے۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ یہ تاریخ کا مسلّم مسئلہ ہے کہ عالمگیر ملک کے ایک ایک جزئی واقعہ سے اس قدر واقفیت رکھتا تھا کہ کسی حصّۂ ملک کا اَدنیٰ سا واقعہ بھی اس کی نگاہِ تجسس سے مخفی نہیں رہ سکتا تھا، باوجود اس کے برج بھاشا کو جس قدر اس کے زمانہ میں ترقی ہوئی، مسلمانوں نے جس قدر

اس زمانہ میں ہندی کتابوں کے ترجمے کئے، اور خود جس قدر بھاشا میں نظم و نثر لکھی کسی زمانہ میں، اس قدر ہندی کی طرف التفات نہیں ظاہر کیا گیا تھا، چنانچہ اس کی تفصیل ہم ایک مستقل مضمون میں لکھ چکے ہیں، یہ کتاب (تحفۃ الہند) اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

یہ ناممکن ہے کہ عالمگیر جو اپنے بیٹوں کی ایک ایک حرکت سے خبر رکھتا تھا۔ اس کی نظر سے ایک ایسی کتاب جو اس کے محبوب ترین شہزادہ کے لئے لکھی جائے، مخفی رہ جائے۔ نعمت خاں عالی نے "وقائع" لکھی اور عالمگیر سے چھپانے کی بے انتہا کوشش کی، لیکن چھپ نہ سکی۔

اس کتاب میں سے ہم صرف صنائع و بدائع کے حصہ کا اقتباس درج کرتے ہیں، جس سے اندازہ ہو گا کہ ہندی زبان کے فنِ بدیع کو عربی سے کیا نسبت ہے؟ اس موقع پر یہ بات بھی اظہار کے قابل ہے کہ مصنف نے ہندی صنائع و بدائع کی تفصیل لکھ کر، چند صنعتیں خود اضافہ کی ہیں، ان کے خود نام رکھے ہیں، اور ان صنعتوں میں خود ہندی اشعار کہہ کر درج کتاب کئے ہیں، جس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ مصنف کو خود اس زبان میں کہاں تک قدرت تھی۔ یہ صنائع اکثر بلکہ تقریباً کُل عربی سے لئے ہیں اور عربی ناموں کا ترجمہ بھاشا میں کر دیا، بھاشا میں علمِ بدیع کو النکار کہتے ہیں۔ چونکہ بلاغت کا اصلی کام جذبات اور احساسات پر اثر ڈالنا ہے، اس لئے

النکار کی تین قسمیں قرار دی ہیں۔

۱۔ نورس، اس میں تمام احساسات کا استقصار کیا ہے اور ان کی نو قسمیں قرار دی ہیں، جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

سرنگار رس، اس کی دو قسمیں ہیں، سنجوگ، بیوگ یعنی وصال و فراق۔

ہاسیہ رس۔ مسرت و خوشی	کرنا رس۔ رحم و ہمدردی
ویر رس۔ شجاعت و بہادری	رودر رس۔ غیظ و غضب
بھے رس۔ خوف و بیم	بی بھتس[۱] رس۔ نفرت و کراہت
شانت رس۔ سکون و اطمینان	ادبھت رس۔ استعجاب۔

عربی اور فارسی زبان میں اس قسم کی سائنٹفک تقسیم نہیں ہے اور اس لحاظ سے ہندی کو فارسی اور عربی پر ترجیح ہے۔

۲۔ وشے[۲] نیگ، کسی مضمون کو لطیف، نازک اور شوخ پیرایہ میں ادا کرنے کو کہتے ہیں۔ مثلاً عورت اپنے محبوب شوہر سے جو کسی اور عورت پر عاشق ہے، کہتی ہے کہ پیارے! تیری پیشانی پر جو سرخی ہے، یہ تیری سُرخ ٹوپی کا عکس ہے، یا رقیبہ کی حنا کا اثر ہے؟

سوال سے بظاہر صرف اس قدر مفہوم ہوتا ہے کہ عورت کو اپنے شوہر سے رقیبہ کے پاس جانے اور اُس سے ملنے کی شکایت ہے، لیکن در پردہ وہ یہ بات ثابت کرنا چاہتی ہے

---

[۱] یہ لفظ علامہ کے مضمون میں "بی بھبس" لکھا ہے۔ لیکن اصل میں "بی بھتس" ہے۔

[۲] اس کو علامہ نے "سے نیگ" لکھا ہے۔ لیکن "وشے نیگ" درست ہے۔

کہ شوہر نے رقیبہ کے پاؤں پر پیشانی رگڑی ہے، جس سے پیشانی میں سُرخی آگئی ہے۔ یہ وہ صنعت ہے جس کو عربی میں "تعریض" کہتے ہیں۔

سنسکرت کا انشاپرداز اِس صنعت کو اس قدر وسعت دیتا ہے کہ الفاظ اور عبارت کی ضرورت نہیں، صرف حالت کا دکھا دینا بھی اِس صنعت میں داخل ہے۔ مثلاً محبوب رات بھر کا جاگا ہوا کسی صحبت سے آیا ہے، جس کی وجہ سے بال پریشان ہیں، آنکھیں مخمور ہیں، انگڑائیوں پر انگڑائیاں آرہی ہیں، عاشق زبان سے کچھ نہیں کہتا، صرف آئینہ لاکر سامنے رکھ دیتا ہے کہ یہ سب کچھ کہہ دے گا۔ یہ بھی اسی صنعت میں داخل ہے۔

۳۔ **اُپمان**، اس کے معنی تشبیہ کے ہیں۔ تشبیہ ایک نہایت لطیف صنعت ہے، عربی میں اس کو نہایت وسعت دی ہے، اور اس کی بہت سی قسمیں کی ہیں۔ بھاشا میں بعض باتیں تو مشترک ہیں، مثلاً "کمہ اُپمان"، یعنی جب تشبیہ کے الفاظ مذکور ہوں، مثلاً چوں، مثل وغیرہ۔

"لپت اُپمان" حرفِ تشبیہ مذکور نہیں لیکن مقدر ہو جیسے "قندِ لب" یعنی لب چوں قند، اِس کو عربی میں استعارہ[۵] کہتے ہیں۔

۵ "قندِ لب" کو استعارہ نہیں کہتے بلکہ تشبیہ ہے بغیر حرفِ تشبیہ کے۔ جیسے لُجَینُ الماءِ (سیمِ آب، پانی کی چاندی) یعنی ماءٌ کاللُّجَینِ (آب چوں سیم، چاندی جیسا پانی) یا مثلاً "گلِ رُخسار" تشبیہ ہے، اور "رخسارِ گُل" استعارہ۔ استعارہ میں مشبّہ اور مشبّہ بہ میں سے صرف ایک مذکور ہوتا ہے اور تشبیہ میں دونوں ہوتے ہیں۔ "قندِ لب" میں دونوں ہیں، لب مشبّہ، قند مشبّہ بہ۔

"وردِ دّ ہابھاس النکار" یعنی عبارت کے معنی واقع میں صحیح ہوں، لیکن بظاہر غلط معلوم ہوں۔ جب ایک لفظ کے معنی مختلف ہوتے ہیں تو اس صنعت سے کام لیتے ہیں مثلاً بھاشا میں "سیام" سیاہ کو بھی کہتے ہیں، اور معشوق کو بھی، اسی طرح "لال" سُرخ کو بھی کہتے ہیں اور محبوب کو بھی۔ اب اگر یہ کہا جائے کہ "سیام" زرد ہے، تو بظاہر غلط ہو گا کیونکہ سیاہ چیز زرد نہیں ہو سکتی۔ لیکن اگر سیام کے معنی محبوب کے لئے جائیں تو یہ جملہ صحیح ہو سکتا ہے۔

عربی میں اس صنعت کو نہایت وسعت دی ہے، مقاماتِ حریری میں سّو فقہی سوال اور جواب ہیں، جواب تمامتر غلط معلوم ہوتے ہیں، لیکن واقع میں صحیح ہیں۔ مثلاً ایک سوال یہ ہے کہ اگر کوئی شخص وضو کے بعد، نعل کو چھوئے تو کیا حکم ہے؟ جواب دیا ہے کہ "وضو ٹوٹ جائے گا" نعل عربی میں جُوتی کو کہتے ہیں اور یہ معنی زیادہ متداول ہیں، لیکن نعل عورت کو بھی کہتے ہیں اور شافعیوں کے نزدیک عورت کے چھونے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔

"سکارن اُت پریچھا" حُسنِ تعلیل کو کہتے ہیں۔ یہ صنعت عربی اور فارسی میں بہت مستعمل ہے۔ بھاشا میں اس کے نہایت لطیف نئے نئے پیرایے ملتے ہیں۔ مثلاً چاند معشوق کا حُسن چُرا کر آسمان پر بھاگ گیا، اسی وجہ سے ہمیشہ چوروں کی طرح رات کو نکلتا ہے۔ فارسی کا شاعر کہتا ہے ؎

از شرمِ ابروانِ بلندِ تو ماہِ نَو
خود را چناں نمود کہ کس دید و کس نہ دید

یعنی معشوق کے ابرو کی شرم سے ماہِ نو اس طرح چھپ کر نکلا کہ کسی نے دیکھا کسی نے نہیں دیکھا۔

اس موقع پر یہ نکتہ خاص لحاظ کے قابل ہے کہ اگرچہ اُردو انشا پردازوں نے سنسکرت اور برج بھاشا کے علم ادب کے نکتہ نکتہ کو سمجھا اور اس سے بہت فائدہ اُٹھایا، لیکن اس کے فیض سے وہی محروم رہ گیا۔ جو سب سے زیادہ حقدار تھا۔ یہ ظاہر ہے کہ اُردو بھاشا سے نکلی اور اُس کے دامن میں پلی، لیکن بھاشا سے جو سرمایہ اُس کو ملا صرف الفاظ تھے۔ مضامین اور خیالات سے اُس کا دامن خالی رہا، بخلاف اس کے عربی زبان جس کو بھاشا سے کسی قسم کا تعارف نہ تھا، وہ سنسکرت اور بھاشا دونوں سے مستفید ہوئی۔

اس کی وجہ یہ ہوئی کہ آج سے پچاس برس پہلے مسلمان، اُردو کو کوئی علمی زبان نہیں سمجھتے تھے، خط کتابت تک فارسی میں تھی اُردو شعرا جس قدر گذرے، ان میں سے ایک بھی عربی کا فاضل نہ تھا یا یوں کہو کہ کوئی عالم اُردو کو اس قابل نہیں سمجھتا تھا کہ اس میں انشاپردازی یا شاعری کا کمال دکھائے، علمی زبان اُس وقت صرف عربی تھی، اس لئے جہاں سے جو سرمایہ ملتا تھا اسی کے خزانے میں جمع کیا جاتا تھا، بہر حال ہندی شاعری کے مضامین عربی زبان میں بعینہٖ نقل ہوئے، یعنی علمائے ادب نے سنسکرت اور

بھاشا کی نظموں کا بعینہٖ عربی میں ترجمہ کیا، ہم چند مثالیں ذیل میں لکھتے ہیں۔ یہ مثالیں سبحۃ المرجان سے لی گئی ہیں، مولوی غلام علی آزاد نے ہر جگہ تصریح کردی ہے کہ وہ ہندی سے ترجمہ کی گئی ہیں۔

لَقَدْ حُلْنَ فِی یَوْمٍ رَاحَ حَبِیْبُہَا   اِلٰی اَنْ ھَوٰی مِنْ سَاعِدَیْہَا نَضَارُھَا
وَلَمَّا اَتَاھَا مُخْبِرٌ عَنْ قُدُوْمِہٖ   عَلَی سَاعِدِ الْمِلْاٰنِ ضَاقَ سِوَارُھَا

(یہ یاد رکھنا چاہئے کہ ہندی میں عاشق عورت ہے، اور مرد معشوق ہے)۔

یعنی جس دن معشوق نے سفر کیا، میں[1] اس قدر دبلی ہوگئی کہ ہاتھ کے کڑے ڈھیلے ہوکر گر پڑے، لیکن جس دن قاصد نے آکر، معشوق کے آنے کی خبر دی اور میں نے کڑوں کو پہننا چاہا تو اب وہ تنگ ہوگئے اور چڑھتے نہ تھے۔

سَاَلَاحَ فِی شَفَتَیْکَ کُحْلٌ رَائِقٌ   اِنِّی اُبَیِّنُہٗ بِحُسْنِ بَیَانٍ
خَتَمَتْ عَلٰی شَفَتَیْکَ ذَاتُ تَدَلُّلٍ   کَیْلَا تُکَلِّمَنِی عَلَی الْاَحْیَانِ

واقعہ یہ ہے کہ شوہر، کسی اور محبوبہ سے مل کر آیا، اور چونکہ اس نے اس کی سرگیں آنکھوں کو چوما، اس لئے اس کے ہونٹوں پر سیاہی لگ گئی ہے۔ اب عورت شوہر سے کہنے آئی ہے کہ تیرے ہونٹوں پر جو سیاہی ہے، میں بتاؤں کیوں ہے اور کہاں سے آئی ہے، کسی کافر ادا نے تیرے ہونٹوں پر مہر کردی ہے کہ تو کبھی مجھ سے بات نہ

---

[1] عربی کے اشعار میں ضمیر متکلم نہیں بلکہ ضمیر غائب ہے، یعنی عورت خود اپنا حال نہیں بیان کرتی، بلکہ شاعر اس کا حال بیان کر رہا ہے۔ علامہ شبلی نے بے خیالی میں اس طرح ترجمہ کردیا ہے۔

کرے۔ (الندوہ، فروری سنہ ۱۹۱۱ء)

(۱۳) مکاتیب و خطوط: علامہ کے خطوط کے تین مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ دو حصے "مکاتیب شبلی" کے نام سے دار المصنفین نے شائع کئے ہیں۔ ایک میں علامہ کے عام مکتوبات ہیں، دوسرے میں خاص اُن کے تلامذہ کے نام۔ یہ خطوط ایسے ہی ہیں جیسے دوسرے مشاہیرِ علم و ادب کے ہیں۔ لیکن ایک تیسرا نادر مجموعۂ خطوطِ شبلی کے نام سے مولوی محمد امین صاحب زبیری مارہروی نے سنہ ۱۹۲۶ء میں شائع کیا ہے۔ یہ دو مشہور خاتونوں کے نام لکھے گئے ہیں، یعنی عطیہ فیضی بیگم اور زہرا فیضی بیگم کے نام۔ یہ دونوں نواب بیگم نازلی فیضی اہلیہ محترمہ ہز ہائی نس نواب صاحب جنجیرہ (بمبئی) کی بہنیں ہیں۔ بمبئی کے مشہور خاندان فیضی سے تعلق رکھتی ہیں۔ بمبئی میں علامہ شبلی کا اس خاندان سے تعارف ہوا۔ زبیری صاحب "خطوط" کے دیباچے میں لکھتے ہیں:-

"جس وقت بمبئی کے ممتاز خاندان فیضی سے اُن کا تعلق پیدا ہوا۔ اُس وقت عطیہ بیگم اپنی تعلیم کے لحاظ سے بہت کچھ شہرت رکھتی تھیں۔ انھوں نے آزادانہ تعلیم پائی تھی اور پہلی مسلمان خاتون تھیں جو یورپ کو تعلیم کے لئے گئی تھیں۔ بمبئی کے تعلیم یافتہ مسلمان خاندانوں کی طرح آزادانہ معاشرت تھی۔ یہ خاندان عرصہ تک استنبول میں بھی مقیم رہا تھا۔ اُن کے والد تاجر تھے اور بسلسلۂ تجارت وہاں قیام تھا۔

عطیہ بیگم صاحبہ کی دوسری بہنوں زہرا بیگم صاحبہ اور نازلی رفیعہ بیگم صاحبہ نے اگرچہ عطیہ بیگم صاحبہ کی طرح باقاعدہ تعلیم نہیں پائی، باایں ہمہ نہایت قابل ہیں۔ اُردو سے خاص

دلچسپی رکھتی ہیں، صاحبِ تصنیف و تالیف ہیں۔ اہلِ کمال کی قدر شناس ہیں۔ ان کی مجلس میں علمی تذکرے رہتے ہیں۔ زہرا بیگم صاحبہ کو واقعہ نگاری میں خاص ملکہ حاصل ہے۔ عطیہ بیگم صاحبہ سب سے چھوٹی ہیں، لیکن سب سے زیادہ تیز اور ذہین ہیں۔ مولانا نے ان میں وہ سب جوہر دیکھے، جن سے ایک خاتون قابلِ رشک مرتبہ حاصل کر سکتی ہے۔ اُن کے دل میں اُمنگ پیدا ہوئی کہ ان جوہروں کو جِلا دیں اور عطیہ بیگم کو ایک نمونہ بنا دیں۔ رفتہ رفتہ اِس خاندان سے اُن کے عزیزانہ تعلقات ہو گئے۔ پھر ندوہ کی امداد اور اتحادِ خیال نے ان میں اور مضبوطی پیدا کر دی۔ راقم کو بارہا ان بیگمات سے ملنے کا موقع ملا ہے۔ مولانا کی نسبت محبت و احترام کا جوش جو ان میں نظر آیا، وہ قریب ترین احباب اور تلامذہ میں بھی کم پایا گیا ہے۔"

عطیہ بیگم کے متعلق ایک نوٹ میں لکھتے ہیں :۔

"عطیہ بیگم صاحبہ کی شادی مسٹر رحمن سے ہوئی جو یہودی مذہب رکھتے تھے۔ انھوں نے شادی سے قبل اسلام قبول کر لیا تھا۔ وہ نہایت ممتاز و مشہور اور کامل الفن آرٹسٹ (مصوّر) ہیں، جن کے آرٹ کی یورپ میں خاص شہرت ہے۔ انھوں نے مولانا مرحوم کی بھی ایک تصویر بنائی تھی، جو گویا اُن کے کمالِ مصوّری کی تصویر ہے۔ فرانس کی نمائش منعقدہ ۱۹۱۲ء میں وہ رکھی گئی تھی، اور اس کی بے انتہا قدر ہوئی، نہایت معقول قیمت لگی۔ لیکن عطیہ بیگم صاحبہ نے اس کو فروخت کرنا گوارا نہ کیا۔"

اور ایوانِ رفعت (محل جناب نازلی بیگم صاحبہ واقع بمبئی) کی زینت بنے۔"

عطیہ بیگم کی شادی کے متعلق علامہ شبلی نے ایک شعر اور ایک قطعہ کہا تھا جو عطیہ بیگم کی بیاض سے زبیری صاحب نے دیباچۂ خطوط میں نقل کیے ہیں، وہ یہ ہیں:-

شعر

بتانِ ہند کافر کر لیا کرتے تھے مسلم کو
عطیہ کی بدولت آج اک کافر مسلماں ہے

قطعہ

[illegible] ہو نہ خاندانہ کو ہوتی اپنی طرف — اس لئے مجھ کو قرابت سے بہت دوری تھی
آرٹسٹ آپ ہیں اور حسن کی تصویر ہوں میں — آپ نے کھینچ لیا مجھ کو تو مجبوری تھی

علامہ نے یہ قطعہ عطیہ بیگم کو بھیجنے کے علاوہ اپنے احباب کو بھی سنایا ہوگا۔ اسی زمانے میں مشہور ہوگیا تھا۔ جب علی گڑھ کالج میں پہنچا تو ایک ذہین وظریف طالب علم، مولوی اقبال احمد صاحب سہیل[5] نے اس کے جواب میں یہ قطعہ کہا:

قطعہ

کب یہودی سے عطیہ عقد زیبا تھا تمہیں — بنتِ شیخی تم ہو، یہ رشتہ گوارا تھا تمہیں
میں یہ مانا وہ مانی ہے تو تم تصویرِ حسن — تم کو کھینچنا تھا مصور نے جو کھینچا تھا تمہیں

اور شوہرِ عطیہ کی زبانی یہ شعر کہا:

صفحۂ دل پر جو کھینچی آپ کی تصویرِ حسن — مستحق تھا جس "عطیہ" کا وہ میں نے پالیا

---

[5] سہیل، احمد صاحب ایم اے، ایل ایل بی کرنے کے بعد، اعظم گڑھ میں وکالت کرتے تھے۔ ۷ نومبر ۱۹۵۵ء کو انتقال کیا۔ فارسی و اردو کے نہایت پُرگو، زود گو، خوش گو شاعر تھے۔ ان کا لطیفہ یادگار رہے کہ جب یوپی اسمبلی کے ممبر تھے تو ایک مرتبہ ان کو ایک ریزولیوشن پیش کرنا تھا یا تائید کرنی تھی، کچھ خیال آیا تو وہیں بیٹھے بیٹھے اپنے مضمون کو اردو میں نظم کر لیا اور بجائے تقریر کے وہی نظم اسمبلی میں پڑھ دی۔

یہ شبلی و سہیل کے قطعات اسی زمانے میں شاہ دلگیر اکبرآبادی مرحوم گے رسالہ نقاد آگرہ میں شائع ہوئے تھے۔

"خطوطِ شبلی" چھوٹا سا مجموعہ ہے۔ نوّے [90] صفحوں میں بیاسی [82] خط ہیں۔ پچپن [55] عطیہ بیگم کے نام اور ستائیس [27] زہرا بیگم کے نام۔ سب خطوط ساڑھے تین سال کے عرصے میں لکھے گئے ہیں۔ پہلا خط ۱۰ ر فروری ۱۹۰۸ء کا ہے اور آخری ۲۸ ر مئی ۱۹۱۱ء کا۔ اس مجموعہ کے ساتھ مولوی محمد امین صاحب زبیری، جامع خطوط کا مختصر دیباچہ اور ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب سکریٹری انجمن ترقیِ اردو کا مفصل مقدمہ شامل ہے۔

اِن مکتوبات کی خصوصیت نہیں، جن جن بزرگوں کے خطوط شائع ہوئے ہیں، سرسید، آزاد، حالی وغیرہ، کسی کو لکھتے وقت یہ تصور بھی نہ آیا ہوگا کہ ان پرائیوٹ اور خانگی خطوں کو اُن کے مَرنے کے بعد شائع کیا جائے گا۔ یہ بعد کے لوگوں کی ستم ظریفی ہے کہ مرے ہوؤں کے گھر کے بھید اور دل کی باتیں سرِ بازار تشہیر کر دیتے ہیں اور "ستم ظریفی" کا لفظ اگر کہیں صادق آسکتا ہے تو اس کا بہترین محل یہ "خطوطِ شبلی" ہیں۔

"خطوطِ شبلی" کے دیباچہ اشاعت ثانی (۱۹۳۵ء) میں زبیری صاحب لکھتے ہیں:-

"بعض لوگوں نے مؤلف "سیرۃ النبی" صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان خطوط کی نسبت کو ناپسند کیا، بعض نے اُن کی اشاعت کو اس عقیدت و نیازمندی کے خلاف جانا جو راقم کو مولانا مرحوم کی ذات گرامی کے ساتھ ہے، بعض نے مولوی عبدالحق صاحب کے مقدمہ میں متعصبانہ جھلک دیکھی جو خود اُن کے اپنے خیالات نے پیدا کر دی۔"

ہمارے نزدیک ان تینوں قسم کے لوگوں نے اپنے اپنے خیالات کے اظہار میں عجلت

سے کام لیا، اور بقول زبیری صاحب کے، "یہ سب توہمات اور اپنے نفوس کے قیاسات تھے اور اپنی طبیعت کا رنگ" اِس لئے کہ عطیہ بیگم اور زہرا بیگم نے خوشی کے ساتھ ان کی اشاعت کی اجازت دیدی۔ اور علامہ شبلی خود ان جذبات و تعلقات میں کوئی بات ناقابلِ اشاعت نہ سمجھتے تھے۔ ان کے جواب میں ان بہنوں کے جو خطوط آتے تھے، ان کو علامہ اپنے دوستوں اور عزیزوں کو سُناتے تھے اپنی بیٹی کو دکھاتے تھے، ان کے اقتباسات الٰہ آباد و حیدرآباد بھیجتے تھے۔ ان بہنوں کے لئے خاص خاص موقعوں پر جو فارسی وار دو کی غزلیں اور قطعے کہتے تھے وہ خطوط میں لکھنے کے بعد سُنایا بھی کرتے تھے اور مجموعۂ کلام فارسی میں چھپوایا بھی کرتے تھے۔ علامہ کے خطوط، بمبئی و جنجیرہ کے سفر، فارسی کی غزلیں "معلوم عوام" تھیں۔ زبیری صاحب لکھتے ہیں کہ حالی مرحوم نے فارسی غزلوں کا ایک مجموعہ "دستۂ گل" دیکھ کر تحریر کیا تھا:۔

> "کوئی کیوں کر مان سکتا ہے کہ یہ اُس شخص کا کلام ہے جس نے "سیرۃ النعمان"، "الفاروق" اور "سوانح مولانا روم" جیسی مقدس کتابیں لکھی ہیں۔ غزلیں کاہے کو ہیں، شرابِ دو آتشہ ہے۔ جس کے نشہ میں خمارِ چشم ساقی بھی ملا ہوا ہے۔ غزلیاتِ حافظ کا جو حصّہ محض رندی و عیاشی کے مضامین پر مشتمل ہے، ممکن ہے کہ اُس کے الفاظ میں زیادہ دِلربائی ہو، مگر خیالات کے لحاظ سے تو یہ غزلیں اُس سے بہت زیادہ گرم ہیں۔"

اِس لئے درحقیقت "خطوطِ شبلی" کے چھاپنے میں "ستم" کچھ نہیں ہے، "ظریفی" سہی۔ ڈاکٹر عبدالحق صاحب نے جو مقدمہ لکھا ہے، وہ ان کے نوادر مقدمات میں ہے، ان خطوط کی اشاعت کی ضرورت بتاتے ہیں:۔

"ایک تو ان کا طرزِ بیان نہایت سادہ، بے تکلف اور دلچسپ ہے، جو اُن کی دوسری تصانیف اور رقعات میں نہیں پایا جاتا، دوسرے ان میں مولانا کے بعض ایسے خیالات پائے جاتے ہیں، جو اُن کی تصانیف میں کہیں نظر نہیں آتے، اور نہ شاید کبھی گفتگو میں ان کا ذکر انھوں نے فرمایا...... تیسرے ان خطوں سے محبت اور خلوص کی بُو آتی ہے، جو اُن کے دوسرے رقعات میں نہیں ہے، اور یہ ایک بہت بڑی وجہ اُن کی دلچسپی اور قدر کی ہے۔"

بعض لوگوں نے "مولوی عبدالحق صاحب کے مقدمہ میں متعصبانہ جھلک دیکھی" لیکن "شوخی" ہم کو بھی نظر آتی ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں :-

"مولانا کے ارشدِ تلامذہ[1] نے حال ہی میں شعرالعجم کے متعلق فرمایا ہے کہ وہ واقعات کی کھتونی نہیں، حُسن و عشق کی داستان ہے۔ گویا واقعات، شاعر کی زندگی اور اس کی شاعری پر کچھ اثر ہی نہیں رکھتے۔ حقیقت یہ ہے کہ "شعرالعجم" واقعات کی کھتونی بھی ہے اور حسن و عشق کی داستان بھی۔ لیکن اگر وہ اِن خطوط کو دیکھتے (تو معلوم ہوتا[2]) (اور اگر دیکھا ہے تو غور نہیں فرمایا) کہ جس داستان کا تصور اُن کے ذہن میں تھا، وہ شعرالعجم میں نہیں، ان خطوط میں ہے۔ اس کتاب میں مولانا نے دوسروں کے جذبات سے ایک دشتہ

---

[1] علامہ سیّد سلیمان ندوی۔

[2] یہ بریکیٹ ہم نے جملہ کو مربوط کرنے کے لئے بڑھادیا ہے۔ دوسرا بریکیٹ مولوی صاحب کی تحریر میں ہے۔

گی تیار کیا ہے' اور یہاں اپنے دلی جذبات کا اظہار فرمایا ہے۔ وہ
نقل ہے اور یہ اصل ہے' وہ جگ بیتی ہے یہ آپ بیتی۔ اور ظاہر ہے
کہ آپ بیتی میں جو مزہ ہے' وہ جگ بیتی میں کہاں "

ہم ان خطوط میں سے علامہ شبلی کے چند جذبات و خیالات کا اقتباس کرتے ہیں

محبت و خلوص

" اب تو تمھارے خطوط ایسے ہوتے ہیں کہ احباب کو مزے
لے لے کر سناتا ہوں اور لوگ سر دھنتے ہیں۔ پالیٹکس کے متعلق
تمھارے پچھلے خط کے اقتباسات (کومیشن) میں نے الہ آباد و حیدر آباد
بھیجے۔ ان باتوں کے ساتھ اگر تم موسیقی سے بھی واقف ہو تو تم اجازت
دو کر لوگ تم کو پوجیں " وَ اَنَا اَوَّلُ الْعَابِدِیْن[51]۔" (عطیہ بیگم کے نام)

" میں خود نہ آسکا لیکن عنقریب اپنی ایک تصویر جو تیس برس
کی عمر کی ہے' اتفاق سے ہاتھ آگئی ہے' بھیجتا ہوں۔ وہ میری
قائم مقامی کرے گی۔" (عطیہ بیگم کے نام)

" تمھارا خط جو مدت کے بعد ملا' تو بیساختہ میں نے آنکھوں
سے لگا لیا' اور دیر تک بار بار پڑھتا رہا۔"

(عطیہ بیگم کے نام)

" عطیہ! لکھنے پڑھنے کی کیا بات ہے۔ میرا ہر رونگٹا اور
ہر موئے بدن تمھاری توصیف اور تعریف کا ایک شعر ہے۔"

" خاتونوں کے نام سے بورڈنگ[52] کے کمرے بنیں گے' اور

---

۵۱ اور میں پہلا پوجنے والا ہوں گا۔

۵۲ یعنی ندوۃ العلماء بورڈنگ ہاؤس کے۔

بیگم صاحبہ سے کہہ دیجئے کہ کم از کم ایک ان کے نام کا بھی ہوگا۔ تمہارے
نام کا کمرہ ہوسکا تو خود اپنے صرف سے بنواؤں گا، لیکن اس سے
کتبہ پر اشارہ نہ ہوگا، صرف تمہارا نام ہوگا۔"

(عطیہ بیگم کے نام)

"اگر آپ لکھنؤ آکر کسی اور کی مہمان ہوئیں، تو میں اس
زمانہ میں لکھنؤ چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔" (عطیہ بیگم کے نام)

"میں چاہتا تھا کہ میرے کسی کام میں تمہارے نام کی شرکت
ہو۔ اس کا اصلی طریقہ تو یہ تھا کہ کوئی تصنیف تمہارے نام
ڈیڈیکیٹ کرتا، لیکن افسوس نہیں کر سکتا۔"

(عطیہ بیگم کے نام)

"میں آپ کی طرح آزاد ہوتا تو سال بھر جزیرہ[1] ہی میں
رہتا۔ لیکن "ندوہ" کی زنجیر غضب کی ہے۔ اب بھی تو "زنجیر"
میں ہوں۔" (زہرا بیگم کے نام)

فارسی پڑھانے کا شوق

"بار بار جی چاہتا ہے کہ تم کو اس طرح فارسی پڑھاؤں
کہ فارسی شاعری اور فارسی زبان کا ایک ایک نکتہ ذہن میں
آجائے .... لیکن یہ کیوں کر ممکن ہے۔ میں عرش
(جزیرہ) تک نہیں پہنچ سکتا، تم عرش سے اتر نہیں سکتیں،
تاہم ناامیدی نہیں، کبھی تو ندوہ کے جھگڑوں سے فرصت

---

[1] اصل میں یہی نام ہے لیکن لوگوں نے بگاڑ کر جنجیرہ کر لیا ہے۔ علامہ یہ دونوں نام لکھتے ہیں
(۲) ایک جگہ شاعرانہ اسلوب میں "زنجیرہ" بھی کر لیا ہے۔ یہ بھی بگاڑ یا نام کی ایک صورت ہے۔

ملے گی۔" (عطیہ بیگم کے نام)

"اگر یہ موقع پیش آیا، تو میں چاہوں گا کہ میں تمہاری کچھ علمی خدمت کرسکوں، تم کو فارسی پڑھاؤں اور اُردو کی انشاپردازی سکھاؤں۔ معلوم نہیں تم اس کو اپنی تحقیر تو نہ خیال کروگی؟"

(عطیہ بیگم کے نام)

"ولایت سے آجاؤ اور موقع ہو تو تم کو فارسی کا پورا استاد بنا دوں، گو خود شاگردی کے قابل نہیں۔" (عطیہ بیگم کے نام)

"افسوس یہ ہے کہ اتنا موقع نہیں ملتا کہ میں دو چار جزو کسی دیوان یا اپنے ہی کلام کے آپ کو پڑھا سکتا۔ اس سے یہ ہوتا کہ تمام ضروری فارسی اصطلاحات اور محاورات پر آپ کی نظر پڑ جاتی۔ اور فارسی شاعری کی خوبیاں ذہن نشین ہو جاتیں پھر آپ خود پڑھ لیتیں اور لطف اُٹھاتیں۔" (زہرا بیگم کے نام)

موسیقی سکھانے کا شوق

"گانے کے ذکر پر ایک بات یاد آئی جو مدتوں سے دل میں تھی، لیکن کہنے کی جرأت نہ تھی۔ میں نے تم سے ایک دفعہ خواجہ حافظ کے شعر سنے، تم کو خدا نے خوش آوازی عطا کی ہے اور نہایت مؤثر آواز ہے۔ لیکن افسوس ہوا کہ تم کو ہندوستانی موسیقی سے واقفیت نہیں، اس لئے تم بالکل بے سرا گا رہی تھیں۔ موسیقی کی معمولی معلومات ضرور ہیں، ورنہ بے لطفی پیدا ہوتی ہے۔ بارہا تم سے گانا سننے کو جی چاہا لیکن رک گیا، کہ تمہاری گٹ کری اور تانیں بے قاعدہ تھیں۔ بمبئی میں ایسی

فن کو لوگ مطلق نہیں جانتے، یہاں تک کہ جن کا پیشہ ہے وہ بھی محض جاہل ہیں۔" (عطیہ بیگم کے نام)

"گانا میں خود نہیں جانتا، لیکن سمجھ سکتا ہوں۔ یعنی جو گانا خلافِ فن ہو گا، میں بتا سکوں گا کہ خلافِ قاعدہ ہے۔ گراموفون میں پیارے صاحب کے جو گانے بند ہیں، ان کو سنو۔ پلیٹ پر گانوں کے نام بھی ہوتے ہیں۔ مثلاً دادرا، جھنجوٹی وغیرہ۔ ان سے اندازہ ہو سکے گا کہ گانے میں کس قسم کے سُر اور تان اور گٹکری ہیں۔ یوں بے قاعدہ گانے میں کتنی ہی عمدہ آواز ہو، بے کار ہو جاتی ہے۔ البتہ میں رواں طور پر مثنوی یا اور اشعار کے پڑھنے کا طرز بتا سکوں گا جو عام صحبتوں کے قابل ہے۔" (عطیہ بیگم کے نام)

"اگر بالفرض تم کبھی لکھنؤ آؤ تو موسیقی ایسے لوگوں سے سیکھ سکتی ہو، جن سے سیکھنا عیب میں داخل نہ ہو۔ بیشک پیارے صاحب وغیرہ سے سیکھنا شرم کی بات ہے، وہ لوگ سوسائٹی سے خارج ہیں۔" (عطیہ بیگم کے نام)

عورتوں کے اوصاف علامہ کی نظر میں

"میں چاہتا ہوں کہ آپ ان مشہور عورتوں کی طرح اسپیکر اور لیکچرار بن جائیں جو انگریز اور پارسی قوم میں ممتاز ہو چکی ہیں، لیکن اُردو میں تاکہ ہم لوگ بھی سمجھ سکیں۔ آپ میں ہر قسم کی قابلیت موجود ہے، صرف مشق کی ضرورت ہے۔ ہم پُرانے لوگ آزادی سے بے پردہ مجامعِ عام میں

عورتوں کا تقریر کرنا پسند نہیں کرتے۔ لیکن آپ تو اس میدان میں
آچکیں۔ اس لئے اب جو کچھ ہو کمال کے درجہ پر ہو۔"
(عطیہ بیگم کے نام)

" نصابِ تعلیم کے متعلق میں سرے سے اس کا مخالف ہوں،
کہ عورتوں کے لئے الگ نصاب ہو۔ یہ ایک اصولی غلطی ہے جس
میں یورپ مبتلا ہو رہا ہے۔ کوشش ہونی چاہئے کہ ان دونوں
صنفوں میں جو فاصلہ پیدا ہو گیا ہے، وہ کم ہو تا جائے نہ کہ
بڑھتا جائے۔ اور بات چیت، رفتار گفتار، نشست برخاست
مذاقِ زبان سب الگ ہو جائیں۔ یوں ہی تفرقہ بڑھتا رہا تو دونوں
دو مختلف نوع ہو جائیں گے۔" (عطیہ بیگم کے نام)

" عورتوں کے متعلق تمہاری رائے ہے کہ وہ دنیوی اور
معاشی علوم کم پڑھیں، اور تم اس کو پسند نہیں کرتیں کہ عورتیں
خود کمائیں اور کھائیں۔ لیکن یاد رکھو مردوں نے جتنے ظلم عورتوں
پر کئے اس بل پر کئے کہ عورتیں ان کی دست نگر تھیں۔ تم عورتوں کا
بہادر اور دلیر ہونا اچھا نہیں سمجھتی ہو۔ لیکن یہ تو پرانا خیال
تھا کہ عورتوں کو دھان پان، چھوٹی موئی اور روئی کا گالا ہونا چاہئے
جمال اور حسن، نزاکت پر موقوف نہیں۔ تنومندی، دلیری،
دلیری اور شجاعت میں بھی حسن و جمال قائم رہ سکتا ہے،
مردنما عورت زنانہ نزاکت سے زیادہ محبوب ہو سکتی ہے، ہاں
یہ اعتراض صحیح ہے کہ موجودہ طرزِ تعلیم سے بچے خاندان سے
اجنبی ہو جاتے ہیں، لیکن خاندان سے زیادہ دلچسپی بھی

کوئی مفید چیز نہیں۔ مہماتِ امور رک جاتے ہیں۔"
(عطیہ بیگم کے نام)

"عورتوں کی دیو پیکری پر تم نے اِس قدر طولانی تقریر لکھی، لیکن میری رائے میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ یہ تو مسلم ہے کہ صحت کے لئے، تندرستی کے لئے، جسم کی موزونی کے لئے، جامہ زیبی کے لئے، مردانہ ورزشیں مفید ہیں۔ جو کچھ بحث ہے یہ ہے کہ عورتوں کے زنانہ حُسن میں فرق آتا ہے، لیکن میں کہتا ہوں کہ اس سے جمال اور دوبالا ہو جاتا ہے۔ یہ صرف میری رائے نہیں، بڑے بڑے اہلِ نظر کا یہی فیصلہ ہے۔" (عطیہ بیگم کے نام)

"مردانہ تعلیم میں، میں ہارا اور تم جیتیں، لیکن یہ بھی مردانہ پَن ہے۔ اور عطیہ! میں تو تم میں تمام خوبیاں مردانہ ہی پاتا ہوں گو تم اس کو اپنی توہین سمجھو۔" (عطیہ بیگم کے نام)

اپنی تصانیف اور شاعری کے متعلق

"میرا چھوٹا سا فارسی دیوان یعنی حال کی غزلیں چھپ رہی ہیں اور میں نے "برعکس نہند نام زنگی کافور" اِن کانٹوں کا نام "دستۂ گل" رکھ دیا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ بھیج دوں۔ لیکن زیادہ شوخ اور آزاد اشعار قلم سے نکل گئے ہیں، اِس لئے اُن کا پردہ ہی میں رہنا مناسب ہے۔" (زہرا بیگم کے نام)

"بوئے گل" بھی اگر تم سمجھ کر پڑھ لو تو فارسی لٹریچر کی اُدائیں معلوم ہو جائیں۔" (عطیہ بیگم کے نام)

"بوئے گل" کہئے تو بھیج دوں۔ "دستۂ گل" کی نسبت

مہذب ہے۔" (عطیہ بیگم کے نام)

"چند غزلوں کا مجموعہ چھپ رہا ہے۔ تیاری پر بھیج دوں گا افسوس کہ فارسی لٹریچر کسی قدر غیر مستدل واقع ہوا ہے اور میں بھی اس کو سنبھال نہیں سکتا۔ بہر حال مضامین کچھ ہوں، لیکن زبان ایران کی ہوگی۔" (عطیہ بیگم کے نام)

"موازنۂ انیس و دبیر" اگر دیکھ سکو تو دیکھا کرو۔ اس سے اُردو میں بصیرت ہو سکتی ہے۔" (عطیہ بیگم کے نام)

"شعر العجم کا دوسرا حصہ جو زیر تحریر ہے، تمہارے دیکھنے کے قابل ہے۔" (عطیہ بیگم کے نام)

"مجھ کو بے انتہا مسرت ہوئی ہے کہ تم نے میری تشریح کو اور خود اشعار کو پسند کیا، ان اشعار کی داد دینے کا تم سے بڑھ کر کس کو حق ہو سکتا ہے۔" (عطیہ بیگم کے نام)

اس طویل تجزیہ اور کثیر اقتباسات کے بعد اور کسی نمونہ کی ضرورت نہ تھی تاہم ایک پورا خط عطیہ بیگم کے نام کا درج کیا جاتا ہے۔ اس میں وہ اشعار اور ان کی تشریح ہے جس کا ذکر اوپر کے اقتباس میں ہے۔

عزیزی!

آج جی چاہتا ہے کہ "بوئے گل" کے بعض اشعار لکھوں، اور تم کو اس کا مطلب سمجھاؤں، تاکہ رفتہ رفتہ فارسی اشعار کے سمجھنے کی قابلیت پیدا ہو جائے۔

ذوقِ نظر بہ لذتِ کاوش نمی رسد
داغم ازیں کہ دل نہ تواں کرد دیدہ را!

ذوقِ نظر: دیدار کا لطف۔ کاوش: محبوب کے دیکھنے سے جو دل کو بیتابی اور تڑپ پیدا ہوتی ہے۔ داغم: یعنی مجھ کو رنج ہے یا افسوس ہے۔ نمی رسد: یعنی برابر نہیں، یا اُس کو نہیں پہنچتا۔

اب یہ مطلب ہوا کہ دیدار میں بھی ایک لطف ہے، اور دل کی بیتابی اور تڑپ میں بھی ایک لطف ہے۔ لیکن دیدار کا لطف دل کی تڑپ کے لطف کے برابر نہیں ہو سکتا۔ اِس لئے مجھ کو افسوس ہے کہ آنکھوں کو دل نہیں بنایا جا سکتا، یعنی کاش اگر آنکھیں دل بن جائیں تو دونوں لطف ساتھ حاصل ہو سکتے۔

چشمش بسُوئے ما نگہِ ناتمام کرد
ساقی بجام ریخت مے نارسیدہ را

نارسیدہ شراب: جو خوب پختہ اور نشہ آور نہ ہو اُس کو نارسیدہ کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اُس کی آنکھوں نے میری طرف دیکھا لیکن خوب آنکھ بھر کر نہیں دیکھا، بلکہ یونہی سی اچٹتی نظر ڈالی، تو گویا ساقی نے جام میں شراب ڈالی لیکن شراب خام تھی، خوب تیار نہیں ہونے پائی تھی۔

با ما بہر معاملہ بدگماں نبود
خوش بود آنکہ رازِ محبت عیاں نبود

صاف ہے۔

از لذتِ ادائے ستم می تواں شناخت
کیں جور از تو بودہ و از آسماں نبود

آسمان بھی ظلم کرتا ہے اور محبوب بھی کرتے ہیں، لیکن فرق رہوتا

ہے کہ آسمان کے ظلم میں لطف نہیں آتا، اور محبوب کے ظلم میں لذت اور مزا ہوتا ہے۔ اس بنا پر شاعر کہتا ہے کہ، جب ہم پر ظلم ہوتا ہے اور یہ نہیں معلوم ہوتا کہ کس نے ظلم کیا، تو ہم یوں پہچان لیتے ہیں کہ اگر ظلم میں لذت ملی تو محبوب کا ظلم ہے۔

صد حرفِ راز بود نہاں در نگاہِ من
شادم کہ کارِ با صنمے نکتہ داں نبود

شادم: میں خوش ہوں؛ کار: یعنی معاملہ؛ صنم: یعنی محبوب۔ نکتہ داں: جو بات کی تہہ تک پہنچ جائے۔ مطلب یہ ہے کہ میری نگاہ میں سینکڑوں راز چھپے ہوئے ہیں، یعنی محبت، شوق، حسرت، آرزو، شکایت، گلہ وغیرہ۔ لیکن غنیمت یہ ہوا کہ محبوب نکتہ داں نہ تھا کہ میری نگاہ ہی سمجھ جاتا کہ اس کے دل میں کیا کیا خیالات ہیں۔

شبلی۔ ۲۲ رجون ۱۹۰۹ء۔ لکھنؤ

مولوی سید احمد دہلوی

۸ جنوری ۱۸۴۶ء (مطابق ۱۲۶۲ھ) کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام حافظ سید عبد الرحمن ہے۔ رسمی تعلیم مختلف مشہور اساتذہ سے اور پھر نارمل اسکول دہلی میں حاصل کی۔ ابتدائے تصنیف و تالیف کا شوق تھا۔ طالب علمی کے زمانہ میں ایک طویل فارسی نظم "طفل نامہ" لکھی تھی۔ پھر خط و کتابت کی تعلیم کے لئے "انشائے تقویۃ الصبیان" لکھی، جس میں اردو تلازمہ و ضلع قائم رکھا گیا تھا۔ یہ رسالہ ۱۸۶۹ء میں شائع ہوا۔ اسی زمانے میں ان کو اپنی عظیم الشان لغت "فرہنگِ آصفیہ" کی تالیف کا خیال پیدا ہوا۔ اور اس کی تیاری شروع کی۔ ۱۸۶۹ء میں انھوں نے مناظرۂ تقدیر و تدبیر "کنز الفوائد" کے نام سے شائع کی، اس پر سرکار نے ڈیڑھ سو روپے انعام دیا۔

اس زمانے میں مسٹر فیلن (انسپکٹر مدارس صوبہ بہار) اپنی مشہور "اردو لغت" مرتب کر رہے تھے۔ انھوں نے اس تالیف کی اعانت کے لئے مولوی سید احمد کو بلا لیا۔ یہ سات برس دانا پور رہے اور ان کی کتاب کو مکمل کیا۔ اس کے ساتھ ہی اپنا کام بھی کرتے رہے۔ یعنی وہاں سے "انشائے ہادی النساء" شائع کی، اور فرہنگِ آصفیہ کا کام بھی جاری رکھا۔ ۱۸۸۰ء میں فیلن صاحب کا کام تکمیل کو پہنچا، تو اسی وقت مہاراجہ الور نے اپنا "سفر نامہ" مرتب کرنے کے لئے طلب کر لیا۔ چھ مہینے میں وہ کام پورا کیا اور معقول تنخواہ اور انعام لے کر واپس آئے۔ اس کے بعد گورنمنٹ بک ڈپو پنجاب میں نائب مترجم ہو کر چلے گئے۔

مولوی سید احمد نے دہلی اور شملہ کے اسکولوں میں سرکاری ملازمت کی اور پنشن پائی۔ گورنمنٹ نے "خان صاحب" کا خطاب دیا۔ پنجاب یونیورسٹی کے فیلو اور ممتحن بھی رہے۔ ۱۹۰۵ء میں جب پرنس آف ویلز دہلی تشریف لائے تو مولوی صاحب نے ایک نظم خیر مقدم اور اپنی ایک تالیف "رسوم دہلی" پیش کی۔ ۱۹۱۱ء کے دربارِ تاجپوشی کے زمانے میں مولوی صاحب کے ہاں لڑکا پیدا ہوا، تو انھوں نے اس کا نام دربار احمد رکھا۔ ایک بار ان کے مکان میں آگ لگی اور تمام کتب خانہ اور "فرہنگِ آصفیہ" کی جلدیں نذرِ آتش ہو گئیں۔ دولتِ آصفیہ نے اس موقع پر دستِ فیض بڑھایا اور اسی شاہانہ امداد سے دوبارہ کتاب شائع ہوئی۔ مولوی صاحب نے ۱۹۱۹ء میں انتقال کیا۔

مولوی سیّد احمد کی تصانیف

مولوی صاحب نے بڑی کثرت سے کتابیں تصنیف کیں اگرچہ ضخیم کتابیں کم ہیں۔ لیکن بعض تالیفات موضوع کے لحاظ سے مفید و جدید ہیں۔ فہرست یہ ہے:۔

(۱) تقویۃ الصبیان (۲) کنز الفوائد (مناظرۂ تقدیر و تدبیر) (۳) وقائع درّانیہ (تاریخ) (۴) انشاء ہادی النسا (۵) قصۂ راحت زمانی (عورتوں کے لئے اخلاقی فسانہ) (۶) تحریر النسار (لڑکیوں کی درسی کتاب) (۷) اخلاق النسا (۸) لغات النسار (عورتوں کے خاص الفاظ و محاورات) (۹) طبعی تعلیم۔ (۱۰) قواعدِ اردو (۱۱) علم اللسان (اُردو زبان دانی اور اس کی ترقی)۔ (۱۲) رسومِ دہلی (۱۳) تکمیل الکلام (پیشہ وروں کی اصطلاحات) (۱۴) تحقیق الکلام (اردو زبان کی خوبیاں) (۱۵) محاکمہ مرکز (دہلی کو مرکزِ اردو قرار دینے کے دلائل) (۱۶) رس کھان (ہندی زبان کے دوہے، گیت، پہیلیاں) (۱۷) ریت بکھان (ہندوؤں کے رسم و رواج) (۱۸) ناری کتھا (ہندی عورتوں کے محاورات)۔

(۱۹) سیر شملہ (مع تاریخ شملہ) (۲۰) روزمرہ دہلی (۲۱) رسوم اعلیٰ ہندوان دہلی۔
(۲۲) اردو ضرب الامثال۔

(۲۳) فرہنگِ آصفیہ: اس کا نام سب سے آخر میں لیا گیا ہے، لیکن اہتمام وعظمت میں سب پر مقدم ہے۔ مولوی صاحب اپنے نام سے زیادہ اِس کتاب کے نام سے "مؤلفِ فرہنگِ آصفیہ" مشہور ہیں۔ آغازِ تالیف میں بھی بہت قدیم ہے۔ ۱۸۶۸ء سے اس کی ترتیب شروع کی۔ ۱۸۷۸ء میں "ارمغان دہلی" کے نام سے بطور نمونہ شائع کی، لیکن تکمیل جاری رہی۔ چوبیس سال کی محنت کے بعد ۱۸۹۲ء میں تکمیل کو پہنچائی۔ مولوی صاحب کے پاس اتنا سرمایہ نہ تھا کہ اس قدر ضخیم کتاب کو شائع کر سکیں۔ اتفاق سے ۱۸۸۸ء میں جب وہ شملہ کے اسکول میں مدرس تھے، سر آسمان جاہ وزیرِ اعظم حیدر آباد، شملہ آئے۔ مولوی صاحب نے حاضر ہو کر اپنی تالیف کا مسودہ پیش کیا۔ وہ اُس کو ساتھ لے گئے۔ مولوی سید علی بلگرامی کو دکھایا۔ انھوں نے بہت پسند کیا اور منظوری کی سفارش کی۔ چنانچہ دربارِ دکن سے انعام کا وعدہ کیا گیا۔ ۱۸۹۲ء میں جب بعد تکمیل فرہنگِ آصفیہ نام رکھا گیا تو دولتِ آصفیہ سے پانچ ہزار روپے انعام ملا اور پچاس روپے ماہوار وظیفہ مقرر ہوا۔ گورنمنٹ پنجاب نے پانچ سو روپے انعام دیئے اور ایک ہزار روپے کی کتابیں خریدیں۔

"اردو لغات" کی مختصر تاریخ اِس "داستانِ اُردو" میں صفحہ ۲۰۳ کے حاشیوں پر لکھی گئی ہے۔ لغاتِ اُردو کی آغازِ تالیف سے تقریباً دو سو برس بعد "فرہنگِ آصفیہ" مرتب ہوئی ہے، لیکن اس سے پہلے اِس سے زیادہ ضخیم، مکمل اور مستند فرہنگِ اردو موجود نہ تھی۔ مولوی سید احمد صاحب دہلوی نے چار جلدوں میں پچپن ہزار الفاظ و محاورات تحقیق و تشریح

اور سند و حوالہ کے ساتھ درج کئے ہیں۔ اب اگر اس میں کچھ خامیاں اور غلطیاں بھی واقع ہو گئیں تو ایسی فردگذاشتوں سے اور کوئی لغت بھی خالی نہیں ہے۔ نور اللغات فرہنگ کے ۲۵ سال بعد شائع ہوئی۔ اس میں بھی صرفی ولسانی، تحقیقی و استنادی غلطیاں بہت ہیں۔ بہر حال تقدیم تکمیل کی فضیلت مولوی سید احمد کو حاصل ہے۔ افسوس کہ یہ کتاب اب نایاب ہے، صرف پہلی اور دوسری جلد ملتی ہے۔

فرہنگِ آصفیہ، امیرُ اللغات اور نورُ اللغات کا مقابلہ

مولوی سید احمد صاحب نے فرہنگِ آصفیہ کے دیباچے میں لکھا ہے :-

"جس طرح جامع امیر اللغات نے "ارمغانِ دہلی" مطبوعہ ۱۸۸۵ء میں سے لفظ (آنکھ) لے کر اُس کے مشتقات اور معانی کی ہوبہو نقل بطور نمونہ چھاپی تھی، اِسی طرح مؤلف نور اللغات نے بھی ان کی پیروی کر کے سنہ اشاعت سے پورے تین قرن بعد فرہنگِ آصفیہ میں سے لفظ (بات) اور اس کے مشتقات کی ہو بہو نقل بطور نمونہ شائع فرمائی ہے۔"

یہ بڑا سخت اعتراض ہے حضرت امیر مینائی اور مولوی نور الحسن نیر کاکوروی ایسے آدمی نہ تھے کہ کسی کی کتاب ہو بہو نقل کر کے اپنے نام سے چھپوا دیں۔ ہمارے سامنے فرہنگِ آصفیہ، امیر اللغات اور نور اللغات تینوں موجود ہیں اور ہم نے لفظ (آنکھ) اور لفظ (بات) کو ان میں پڑھا ہے۔ بات یہ ہے کہ الفاظ اور محاورات کسی خاص مصنف کی ملکیت نہیں ہوتے، ہر شخص ان کو تلاش کر سکتا ہے۔ البتہ پہلی مرتبہ جمع کر کے مرتب کر دینا مؤلف کا کارنامہ ہوتا ہے، لیکن لغات کی تشریح اور سند کے اشعار بلاشبہ جامع و مؤلف کی ملکیت ہوتے ہیں۔ اُن کی ہو بہو نقل

بیشک سرقہ اور قابلِ الزام ہے۔

مولوی سید احمد کی اِس فضیلت میں شک نہیں کہ انھوں نے اُردو کی سب سے بڑی اور مکمل لغت سب سے پہلے مرتب کی اور ۱۸۷۸ء میں "ارمغانِ دہلی" شائع کی۔ منشی امیر احمد مینائی کو "امیر اللغات" کا خیال بعد کو آیا اور انھوں نے ۱۸۸۱ء میں لفظ (آنکھ) کا نمونہ مرتب کیا۔ امیر مینائی کے سامنے فرہنگ کا نمونہ موجود تھا۔ یقیناً اس سے استفادہ کیا، لیکن اس کی ہو بہو نقل نہیں کی بلکہ سید احمد کے لغات کو خود جانچا، غیر ضروری اندراجات کو ترک کیا، ضروری محاورے جو رہ گئے تھے، ان کا اضافہ کیا، سند کے اشعار الگ تلاش کر کے لکھے۔ چند مثالیں یہ ہیں :

آنکھوں کی سوئیاں : اِس کی مثال فرہنگ میں نہیں ہے۔ امیر نے سند میں داغ کا شعر لکھا ہے۔

آنکھوں میں پھرنا : فرہنگ میں سند کے "سولہ" شعر ہیں، جن میں سے دو چار بھی کافی تھے۔ اِس لئے کہ اس محاورے کے صرف ایک معنی ہیں۔ امیر مینائی نے "چار" شعر لکھے ہیں۔ جن میں سے صرف ناسخ کا شعر مشترک ہے۔ ظفر، آتش اور رشک کے اشعار امیر نے الگ لکھے ہیں۔

آنکھوں میں تنکے چبھونا : اس کی سند فرہنگ میں نہیں ہے امیر نے داغ کا شعر لکھا ہے۔

آنکھوں میں تلنا، تولنا :- یہ محاورے فرہنگ میں بالکل نہیں ہیں۔ امیر نے مع اسناد لکھے ہیں۔

آنکھوں میں جہاں اندھیر ہونا، تاریک ہونا، سیاہ ہونا : اِن سب

کی مثالیں امیر نے بالکل الگ لکھی ہیں۔

آنکھوں میں باتیں ہونا، آنکھوں میں بہار پھولنا، آنکھوں میں خاک لگانا: فرہنگ میں نہیں ہیں۔ امیر نے مع مثال لکھے ہیں۔

آنکھوں میں آنکھیں ڈالنا، آنکھوں میں ٹھہرنا، آنکھوں میں چڑھنا: امیر اللغات میں نہیں ہیں۔ فرہنگِ آصفیہ میں ہیں۔ یہ سب محاورے ہیں، ان کو شامل نہ کرنا امیر اللغات کی خامی ہے۔

آنکھوں میں آنسو بھر آنا: فرہنگ میں بطور محاورہ درج ہے، اور اس کی یہ مثال لکھی ہے:

"آنسو شہِ مظلوم کی آنکھوں میں بھر آئے" (انیس)

اصل میں یہ کوئی محاورہ نہیں ہے، سیدھی سی بات ہے حقیقی معنی مراد ہیں۔ اِس کو محاورہ گردانا غلطی ہے۔

آنکھوں میں آنا: اِس محاورے کے دو پہلو ہیں۔ دونوں لغت والوں کو دونوں مفہوم لکھنے ضروری تھے۔ لیکن سیّد صاحب اور امیر صاحب نے ایک ایک پہلو لیا ہے۔ امیر اللغات میں اس کے معنی ہیں: نظر دل میں سمانا۔ اور مثال یہ ہے:

مری آنکھوں میں تم آؤ، اگر شمشاد قامت ہو
شجر رہتا ہے اکثر سبز دریا کی ترائی میں (امیر لکھنوی)

یہاں انسان کا مجسم آنکھوں میں آنا مفہوم ہوتا ہے۔ یہ صرف شاعرانہ تخئیل ہے۔ اسی لئے امیر مینائی نے اِس خصوصیت کی تصریح کر دی ہے۔

فرہنگِ آصفیہ میں اِس محاورہ (آنکھوں میں آنا) کے یہ

معنے بتائے ہیں، بچنا، سمانا، نظر پر چڑھنا، خیال میں آنا، دھیان
میں آنا۔ اور سند میں یہ شعر لکھا ہے؛

نہیں آتے کسو کی آنکھوں میں — ہو کے عاشق بہت حقیر ہوئے (میرؔ)

یہاں نگاہ میں بچنا مراد ہے :۔

اسی طرح نور اللغات پر بھی یہ اعتراض غلط ہے۔ مولوی نور الحسن صاحب
نیرؔ کے سامنے بھی فرہنگ تھی، اور انھوں نے اس سے فائدہ اُٹھایا، لیکن ہوبہو
نقل نہیں کی۔ فرہنگ میں "بات" کے ۶۴ معنی ہیں۔ نور اللغات میں ۲۸ ہیں۔
ان کی اسناد کے چند شعر نیرؔ صاحب نے سید صاحب سے لئے ہیں، باقی بطورِ خود
تلاش کئے ہیں۔

فرہنگِ آصفیہ میں یہ کمی ہے کہ بات کے ۱۰۰ سے زیادہ محاورے لکھے ہیں،
لیکن سند کے اشعار خال خال کہیں لکھے ہیں۔ کالم کے کالم اشعار سے خالی ہیں
فقروں کی مثالیں بھی کم ہیں۔ لفظ بات کے دس دس معنی نمبروار یک جا لکھ دیئے
ہیں اور مثال کہیں نہیں لکھی۔ نور اللغات میں اکثر سندیں اشعار میں ہیں کہیں
فقرے لکھ دیئے۔ دونوں پر مختصر تبصرہ کیا جاتا ہے :۔

> فرہنگِ آصفیہ میں لفظ (بات) کے معنی بتانے کے بعد اس کے
> مشتقات اور محاورے لکھے ہیں۔ ان میں (الف) سے شروع ہونے
> والے محاورات صرف تین ہیں: یعنی بات اٹھانا، بات اُلٹنا، بات
> آنا۔ ان کے بعد کا محاورہ (بات بات میں) لکھا ہے۔ لیکن نور اللغات
> میں ان تین محاوروں کے علاوہ ۲۷ محاورے اور لکھے ہیں۔ مثلاً
> بات آن پڑھنا، بات آگے آنا، بات آئی گئی ہونا، بات اٹکا رکھنا،
> بات اٹکنا، بات اڑنا، بات اُڑانا وغیرہ۔ یہ سب محاورے ہیں

فرہنگ میں آن کا نہ ہونا نقصِ تالیف ہے۔

نور اللغات میں بھی تالیف کی خامیاں بہت ہیں۔ لغات کی تحقیق و تشریح میں غلطیاں کی ہیں، مفہوم اور مثالوں میں سہو ہوا ہے۔ مثلاً بات کے متعلق ایک محاورہ لکھا ہے، "بات آنکھوں سے سُننا" اس محاورے کو بات سے کچھ تعلق نہیں، بلکہ آنکھوں کا محاورہ ہے اس میں "بات سُننا" اصلی معنوں میں ہے (آنکھوں سے) کا مفہوم ہے، خوشی سے یا ادب سے۔ اسی طرح ایک محاورہ بتایا ہے "بات کا اعادہ۔ بات کو دُہرانا، بات کو پھر کہنا" یہ بھی محاورہ نہ ہوا، معمولی بات ہوئی۔

"ک" کے متعلق لکھا ہے کہ "آخر کلمات میں معنی مصدری کا فائدہ دیتا ہے، جیسے بیٹھک، روک، ٹوک" حالانکہ اِن الفاظ میں "ک" یکساں نہیں ہے، بیٹھک میں معنی مصدری کے لئے بڑھایا گیا ہے، لیکن روک اور ٹوک میں اصلی ہے اضافہ نہیں ہے۔ "پرواز اُڑانا" (طرز سیکھنا) اس کی مثال میں قلق کا یہ شعر لکھا ہے:

سیکھ لے نالۂ جانکاہ سے طرزِ نالہ
رنگِ رُخ سے مرے پرواز اُڑائے بلبل

حالانکہ یہاں پرواز (دال سے) نہیں ہے بلکہ پرواز اُڑنے کے معنی میں ہے، یعنی میرے رنگِ رُخ سے اُڑنا سیکھے۔ اگر پرداز (بمعنی طرز) ہو تو مضمون ناتمام رہتا ہے، کس چیز کی طرز؟

غرض، امیر اللغات اور نور اللغات دونوں پر سید احمد صاحب کا یہ الزام

غلط ہے کہ فرہنگِ آصفیہ کی ہو بہو نقل کی گئی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ سیّد صاحب نے سالہا سال کی محنت سے فرہنگ تیار کی تھی، اور چاہتے تھے کہ :-

اقلیمِ لغت میری قلمرو سے نہ جائے[1]

اس لئے انھوں نے حضرات آمیر و نیّر کے لغات کو اپنی ملک پر دست درازی تصوّر کیا۔ شکر ہے سیّد صاحب نے اپنی زندگی میں اپنے ریاض کو سرسبز دیکھ لیا اور اپنی دیاضت کا پھل پالیا۔ اب یہ زمانے کی ستم کارستانی نہ رہی کہ امیر اللغات تمام نہ ہو سکی، فرہنگِ آصفیہ باوجود مکمل و شائع ہونے کے، اب نایاب ہے، اور نور اللغات بازار میں سب ملکیتوں پر قبضہ کئے ہوئے ہے۔

مولوی سیّد احمد کا طرزِ تحریر | مولوی صاحب نے دو درجن کتابیں مختلف عنوانوں اور موضوعوں پر لکھی ہیں۔ ان میں دو چیزیں نہایت نمایاں ہیں :- ایک[1] عورتوں کی تعلیم و تربیت۔ دوسرے[2] زبانِ اردو اور محاورۂ دہلی کی اشاعت۔ اہلِ دہلی کو ایک تو اپنی زبان و محاورہ سے فطری گرویدگی تھی، دوسرے ہر ہر تصنیف میں اس کی اشاعت کا شوق، تیسرے اس کے تحفظ و حمایت کی ضرورت۔ لکھنؤ اور پنجاب کی طرف سے دہلی کی مرکزیت پر حملے ہو رہے تھے اور دہلی والے لکھنو کی بولی کو بھی ٹکسال سے باہر سمجھتے تھے۔ اس لئے دہلی کے ادبی مصنّفین نے اپنی کتابوں اور مقالوں میں مقامی بول چال اور محاورے کثرت سے استعمال کئے۔ جن لوگوں نے علوم و فنون کی کتابیں لکھیں، انھوں نے موضوع و مضمون کے مطابق زبان اختیار کی۔

ڈپٹی نذیر احمد کی زبان و اسلوب کا ذکر آچکا ہے۔ اُن کے ہم عصروں میں میر ناصر علی خاں نے کم اور مولوی سیّد احمد اور میر ناصر نذیر فراق نے زیادہ دہلی کا

---

[1] میر انیس کا مصرع ہے :- "اقلیمِ سخن میری قلم رَو سے نہ جائے"

روزمرہ لکھا۔ پھر آغا شاعر اور راشد الخیری نے اسی پر اپنی تحریر کی بنیاد رکھی۔ راشد الخیری نے ایک اسلوبِ خاص ایجاد کر کے اپنا انفرادی رنگ پیدا کر لیا۔ اب عصرِ حاضر کے "قدیم دہلوی" آغا حیدر حسن اور مرزا فرحت اللہ بیگ، اور "جدید دہلوی" خواجہ محمد شفیع اسی طرز میں لکھتے ہیں۔

یہ وصف اہلِ دہلی کے ساتھ خاص نہیں، اہلِ لکھنؤ بھی اُن کے ہم پلہ ہیں۔ مولوی عبد الحلیم شررؔ، پنڈت سرشار، مرزا ہادی رسوا، منشی سجاد حسین مضمون نگارِ "اودھ اخبار" و "اودھ پنچ" خواجہ عبد الرؤف عشرت وغیرہ نے لکھنؤ کا روزمرہ و محاورہ برتا۔

یہ اسلوب بلا شبہہ، نہایت دلکش و دل آویز اور ضروری و ناگزیر ہے۔ زبان و محاورہ کی رفتار، ترقی، اشاعت اور استناد کے لئے اِس کے سوا کوئی تدبیر نہیں۔ لیکن موجودہ "لامرکزیت" کے دور میں یہ نکتہ پیشِ نظر رکھنے کے لائق ہے کہ زبان و محاورہ تحریر و طباعت میں آ کر جمہوری حیثیت اور اِفادی شان پیدا کر لیتا ہے۔ صرف "مقامی" نہیں رہتا، بلکہ "بین الاقوامی" بن جاتا ہے اور اب اس کا مقصد حظِ نفس سے زیادہ نشاطِ عام ہو جاتا ہے۔ ایسی حالت میں وہ الفاظ، محاورات اور اَمثال جو مقامی طور پر بھی کم استعمال ہوتے ہیں، باہر بالکل نہیں سمجھے جاتے اور پنجاب و دکن کے لوگ ان سے محظوظ نہیں ہو سکتے اس لئے ان میں باوجود صحت و فصاحت کے، ایک قسم کی "غرابت" پیدا ہو جاتی ہے اور ان کی کثرت پسندیدہ نہیں رہتی۔

مولوی سیّد احمد دہلوی نے بھی دہلی کی زبان بہتر سے بہتر لکھی ہے۔ محاورے برمحل، فقرے برجستہ، عبارت سلجھی ہوئی، مضمون واضح و مدلّل لکھتے ہیں۔ اُن کی تحریروں کے دو ایک نمونے پیش کئے جاتے ہیں:

اُ۔ فرہنگِ آصفیہ کے مندرجہ لغات کے متعلق کتاب کے دیباچے میں لکھتے ہیں:۔

"تذکیر و تانیث کی تمیز اہلِ دہلی و لکھنؤ کے موافق اس میں موجود ہے، زبانوں کا فرق اور ان کی اصلیت کا پتا اس سے لگتا ہے، عام محاورے اس میں درج ہیں، خاص خاص محاورے اس میں داخل ہیں، فقیروں کی صدائیں اس میں سن لو، سودے والے کی آوازیں اس میں دیکھ لو، دل لگی اس میں ہے، ظرافت اس میں ہے، بعض بعض موقعوں پر مجاوریوں، ٹھگوں، دلالوں، چابک سواروں، بدمعاشوں، مختلف پیشہ وروں کے وہ ملتے جلتے روزمرے، جن کے نہ جاننے سے اکثر انسان دھوکا کھاتا ہے، بہ ترتیبِ حروف اس کتاب میں شامل ہیں، جو الفاظ جس درجے کے آدمیوں میں مروّج ہیں، وہ انھیں کے نام سے لکھا گیا ہے۔ عورتوں کی بولی اس میں نہیں چھوڑی، جاہلوں کی باتوں سے اس میں پرہیز نہیں کیا۔ ہاں اگر چھوڑا ہے تو مغلّظات اور فحش چھوڑا ہے........

قصّہ مختصر، ہم نے نہ عیب چینوں کا خوف کیا، نہ خردہ بینوں کی پروا، جیسی بُری یا بھلی اپنی پیاری مادری زبان کی خدمت بَن پڑی وہ کر دی۔ آئندہ جو اس کام کے اہل اور سچّے ہوا خواہ ہوں گے وہ ترقی دے لیں گے۔

قطعہ

اے اہلِ خیر کچھ تو ادھر بھی کرم ہی ہیں کب سے دُعائے خیر کے امیدوار ہم

جو کچھ بنا کسی سے وہی چھوڑا بہر یاد   اپنی لغات چھوڑ چلے یادگار ہم

۲۔ محاکمۂ مرکزِ اُردو مولوی سید احمد صاحب نے یہ طویل مضمون ۱۲ ، فروری ۱۹۱۱ء کو لکھا تھا۔ جو کتابی صورت میں شائع ہوا۔ وجہ تحریر یہ تھی کہ منشی وجاہت حسین جھنجانوی، اڈیٹر رسالہ "اصلاحِ سخن" نے دہلی کے بعض محاوروں پر اعتراض کر کے اس کو مرکز تسلیم کرنے سے انکار کیا تھا۔ اس کے جواب میں مولوی صاحب نے یہ "محاکمہ" لکھا تھا۔ نہایت دلچسپ تحریر ہے۔ دہلی کی مرکزیت کے سلسلے میں دہلی و لکھنؤ کے محاوروں کا فرق، اس کی مثالیں اور لطیفے، اردو زبان کی مختصر تاریخ۔ دہلی، لکھنؤ، لاہور کے مصنفوں اور ان کی تصانیف کا ذکر، بہت سی دلچسپ باتیں دورانِ کلام میں آگئی ہیں۔ اگرچہ طولِ کلام اور تکرارِ بیان سے ذرا سی اُلجھن پیدا ہوتی ہے۔ نمونے کے طور پر جواب اعتراض کا ایک حصہ درمیانی تفصیلات کو حذف کر کے درج کیا جاتا ہے :

"انھوں نے لکھا ہے کہ اہلِ دہلی زیادہ محبت کے واسطے "جان چھڑکنا" بولتے ہیں، اور آگ لگ جانے کے واسطے "پھول پڑنا" استعمال کرتے ہیں۔ چنانچہ ان کی اصل عبارت یہ ہے کہ "وہ زمانہ دور نہیں کہ دہلی و لکھنؤ کے ایجاد کردہ الفاظ لوکل بولی سے زیادہ وقعت نہیں رکھیں گے۔ مثال کے طور پر دہلی کے ایک آدھ محاورے کا ذکر کیا جاتا ہے۔ جب کسی کو کسی سے زیادہ محبت ہو تو دہلی والے کہا کرتے ہیں کہ فلاں آدمی اس آدمی پر جان چھڑکتا ہے۔ جان کیا ہوئی گویا گلاب یا کیوڑے کا عرق ہے۔ اب علمی دنیا کو کوئی ضرورت نہیں کہ وہ دہلی یا لکھنؤ کے اتباع کی وجہ سے بے حد محبت کرنے

کا مفہوم جان چھڑکنے سے ادا کرے۔ سیدھی بات کیوں نہ کہی جائے کہ ہم اس آدمی سے بے انتہا محبت کرتے ہیں.....“

اِس محاورے کا لطف اور اُس کی عدم واقفیت تو ہم آگے چل کر بیان کریں گے۔ لیکن پہلے انھیں کی عبارت میں سے دو ایک فقرے پیش کر کے الزامی جواب دیتے اور ان کی طرف سے یہ مصرعہ پڑھتے ہیں:

”میں الزام ان کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا“

”کانوں کو مزا نہیں دیتے۔“ کان نہ ہوئے کوئی زبان ہوئی جو ذائقہ سے تعلق رکھے۔ ”صورتیں فسانہ ہو گئیں“ صورتیں نہ ہوئیں کوئی ذکر اذکار ہوئے، جو فسانہ سے نسبت دی گئی۔“ دنیا کی ہر چیز انقلاب پسند ہے۔“ لفظِ پسند کو ملاحظہ کیجیے اور ہر چیز کو جو ذی روح بن کر انقلاب پسند فرماتی ہے۔

خیر ان باتوں کو جانے دیجیے۔ ”جان چھڑکنا“ اوّل تو یہ فرمائیے کہ آپ نے اپنے کانوں سے سُنا ہے؟ کہاں سُنا ہے اور کس سے سُنا ہے؟ مردوں سے یا عورتوں سے، یا صرف کتبِ لغات میں دیکھا ہے یا کسی اُستاد کے کلام میں نظر پڑا ہے؟

بے شک جان چھڑکنا بولا جاتا ہے مگر عورتوں میں اور وہ بھی اولاد یا مثلِ اولاد کسی نہایت قریبی رشتہ دار کی محبت میں زکر عام محاورہ ہے اور ہر جگہ فرطِ محبت کے موقع پر بولا جاتا ہے۔ اگرچہ عورتیں اس کی اصلیت سے واقف نہیں مگر اس موقع کے واسطے اِس سے بہتر اور پُر اثر لفظ ملنا مشکل ہے۔

جان کے لغوی معنی رُوح ہیں اور اطبا، کی اصطلاح میں جوہرِ لطیف
یا بخارِ لطیف۔ اِن دونوں صورتوں میں جان کا سیال ہونا پایا جاتا
ہے اور سیال چیز کا چھڑکنا ممکنات سے ہے اور اس جگہ فرطِ محبت
سے جان نثار کرنے کے معنی ہیں۔ اَب ایک اور طرح سے سنئے !
اُردو محاورے میں جان بمعنی خون بھی آتا ہے۔ جیسے خوف کے
موقع پر جہاں دَم خشک ہونا بولتے ہیں، وہاں جان سُوکھنا بھی
استعمال کرتے ہیں اور دونوں کا مفہوم ایک ہی ہے۔ آپ نے
کام سے جی چُرانا بھی سنا ہوگا۔ بھلا اس جگہ جان نہ ہوئی کوئی
گٹھری یا جوکھوں ہوئی کہ کوئی چُرا کر لے جائے گا۔ حالانکہ صرف
اسی کی ذات کے متعلق بولتے ہیں، جو جان بوجھ کر کام سے بچتا ہے۔
اب دیکھئے یہ گلاب کا عرق ہے یا کیوڑہ۔ اور لیجئے جان فشانی فارسی
کا محاورہ ہے اور اسی کا یہ ترجمہ ہے۔ اہلِ فارس پر آپ کا اس
موقع کے لئے فرمائیے کیا اعتراض ہے اسی جگہ آپ فرماتے ہیں "اب
علمی دُنیا کو کوئی ضرورت نہیں کہ وہ دہلی یا لکھنؤ کے اتباع کی وجہ سے
بے حد محبت کرنے کا مفہوم "جان چھڑکنے" سے اَدا کرے۔ سیدھی
بات کیوں نہ کہی جائے کہ ہم اس آدمی سے بے انتہا محبت کرتے
ہیں" اگر آپ بے انتہا محبت یا صرف کسی کے ساتھ محبت کرنے کے
دوسرے معنی پر توجہ فرماتے تو ہرگز ہرگز یہ لفظ زبان پر لاتے۔ ایسی ہی
باتیں آدمی کو پابندیٔ زبان سے آزادی حاصل کرنے پر مجبور کرتی
ہیں۔ ہمارے نزدیک علمی دنیا کو سب سے زیادہ زبان دانی کی ضرورت
ہے ورنہ مفہوم کچھ ہوگا اور سمجھا کچھ جائے گا۔

آب دوسرے محاورے اور لفظ کو بھی ملاحظہ فرمائیے! آپ ارشاد کرتے ہیں کہ "اسی طرح کسی کے گھر میں آگ لگ جانے کا مفہوم اہلِ دہلی یوں اَدا کرتے ہیں کہ، فلاں شخص کے گھر میں پھول پڑا۔ آگ نہیں کہتے، اِس کو وہ لوگ بدشگونی سمجھتے ہیں یہ اچھا پھول پڑا کہ سارا گھر جل کر خاک ہو گیا اور یہاں خیر سے انگارے کو ابھی تک پھول ہی سمجھے بیٹھے ہیں۔ صاف بات کیوں نہ کہی جائے کہ فلاں آدمی کا گھر جل گیا" مہربانی فرما کر اول تو یہ ارشاد کیجیے کہ آپ کبھی دہلی میں آتے بھی ہیں یا نہیں؟ اگر آتے ہیں تو آپ کو بگوشِ خود اِس محاورے کے سننے کا اتفاق ہوا ہے یا نہیں؟ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے کسی کتاب یا کبھی کسی شعر میں دیکھ لیا ہے اور آپ کو یہ بھی معلوم نہیں کہ اس محاورے کو عورتیں بولتی ہوں گی یا مرد۔ اگرچہ آپ کا یہ فقرہ صاف ظاہر کر رہا ہے کہ اِس کو وہ لوگ بدشگونی سمجھتے ہیں یعنی یہ محاورہ مونث عورتوں کا ہے کیونکہ یہی فرقہ اپنی زبان سے ایسے الفاظ نہیں نکالتا جس سے بدشگونی ہو، مثلاً "خیر سے" آپنے ہی کئی جگہ برتا ہے۔ "خدا کی سنوار" بجائے خدا کی مار آپ نے سُنا ہی ہوگا۔ "تمھیں خدا کی نیکی" بھی گوش زد فرمایا ہوگا۔ "وہ جمی جَم گھر میں ہیں" یہ بھی کبھی نہ کبھی ضرور گوش آشنا ہوا ہوگا اسی طرح "پھول پڑنا" بھی ظاہر کر رہا ہے کہ اِس کو عورتیں بولتی ہوں گی۔ مگر آپنے اپنے ثبوت میں مرد وزن سب کو لے لیا۔ اور بہت بڑی اپنی ناواقفیت ظاہر فرمائی۔ اب ہم سے

سُننے! دہلی میں کوئی بھی اِس محاورے کو اَب نہیں بولتا اور نہ پہلے یہ محاورہ شہر کے اندر بکثرت بولا جاتا تھا۔ البتہ قلعۂ معلّےٰ میں بیگماتوں نے اِس کا کسی قدر استعمال کر رکھا تھا لیکن عام اُگ لگنے کے واسطے نہ تھا۔ اگرچہ رنگینؔ کے ایک شعر میں یہ محاورہ موجود ہے، مگر اس میں جو لفظ "گوئیاں" آگیا ہے یہ اِس اَمر میں شُبہ ڈالتا ہے۔ کیونکہ گوئیاں خاص پوربی محاورہ ہے جو آج تک دہلی کیا اطرافِ دہلی میں بھی نہیں بولا جاتا۔ وہ شعر یہ ہے ؎

بھول کر بھی جو کسی اور کے گھر بھول پڑے
تو الٰہی کرے گوئیاں مرے گھر بھول پڑے

عجب نہیں جو یہ شعر انشاء اللہ خاں کا ہو اور اگر بالفرض رنگینؔ کا مانا جائے، تو اس زمانے کا ہوگا جس زمانہ میں سعادت یار خاں رنگینؔ لکھنؤ میں جا کر اپنے پگڑی بدل بھائی انشاء اللہ خاں کے ہاں ٹھیرا کرتے تھے۔ اور باہم دونوں کی ریختیوں کا موازنہ ہوا کرتا تھا۔ لیکن رشکؔ لکھنوی نے اِس کو صاف کر دیا ہے، چنانچہ اُس کا شعر ہے ؎

اہلِ جنّت کو ہو جنّت پہ جہنّم کا خیال
بھول اگر پڑ جائے میری آہِ آتشبار کا

اِس سے ہماری یہ غرض نہیں کہ کسی شاعر نے بھی نہیں باندھا۔ جن لوگوں نے مردانہ زبان کا نام ریختہ اور بیگماتی بول چال کا نام ریختی رکھ چھوڑا تھا، انھوں نے اُس زمانے میں شاذ و نادر باندھا ہے۔ اہلِ

لکھنؤ میں سے تجرؔ اور انشاؔ نے صرف ایک ایک شعر میں استعمال کیا ہے۔ اور اہلِ دہلی میں سے نکہتؔ اور رنگینؔ نے۔ ان کے سوا ذوقؔ ظفرؔ۔ مونسؔ۔ دردؔ۔ غالبؔ وغیرہ کسی نے بھی اِس کا استعمال نہیں فرمایا۔ اگر یہ محاورہ مروّجِ خاص وعام ہوتا تو کوئی بھی اسے نہ چھوڑتا۔ اہلِ لغت کو چونکہ ہر زمانے کا محاورہ دکھانا منظور تھا، انھوں نے بیشک داخلِ لغات کر دیا۔ محاورہ کی خوبی میں شبہہ نہیں، لیکن آپ نے بے وقت مثال دی۔

پھول کے لفظ پر آپ نے طعنہ مارا تھا، یہاں وہ طعنہ بیکار ہوا۔ بلکہ آپ نے جو لکھا ہے کہ "یہاں خیر سے انگارے کو ابھی تک پھول ہی سمجھے بیٹھے ہیں" سُبحان اللہ! کیا اچھا خیال ہے۔ انگارے کی تعریف بھی جناب کو معلوم نہیں۔ کیا انگارہ اُڑ کر جا سکتا ہے؟ یا انگارا اُڑ سکتا ہے؟ اگر آپ اِن الفاظ کے محل موقع سے واقف ہوتے تو اس جگہ چنگاری شرارہ یا آگ کا پتنگا تحریر فرماتے۔ دیکھیے اہلِ زبان اور مقلّدِ زبان میں کس قدر فرق ثابت ہوا۔ اَب دوسری طرح سے اِس کا جواب ملاحظہ فرمائیے۔ جب کوئلے جلتے وقت چٹخنے ہیں تو اُن کو آپ کیا فرمائیں گے؟ کیا ان کے روشن ذرّوں کو پھول یا چنگاری یا پتنگے سے تعبیر نہیں کریں گے؟ کبھی آپ نے چراغ کو بھڑکتے ہوئے دیکھا ہوگا تو اس وقت جو روشن پتنگا سا یا اس کی جلتی ہوئی ٹیم نیچے گرتی ہے تو اُسے بھی پھول کہتے ہیں یا نہیں؟ کیا تو اجس وقت جگمگ جگمگ کرتا ہے

تو اُسے تو اہنسا کسی وجہ سے کہتے ہیں یا نہیں۔ آتش بازی کے
پھُول تو آپ نے ضرور سُنے ہوں گے، ان کو انگار اکیوں نہیں کہا۔
پھُلجھڑی۔ بستہ پھُول۔ مہتابی۔ انار۔ جائی جوئی۔ بتاسے وغیرہ آتشبازی
میں نظرِ اقدس سے گذرے ہوں گے۔ ان میں سے انگارے اُچھلتے
ہیں یا پھول نکلتے ہیں۔ تیسری مثال اور لیجئے۔ مُنہ سے پھُول جھڑنا
کیوں بولتے ہیں، مُنہ نہ ہوا کسی باغ کا بوٹا یا گُلِ گلزارِ وجاہت
ہوا +

میر ناصر علی خاں دہلوی

۱۸۴۷ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے دادا ریاست بھوپال کی ریزیڈنسی میں میر منشی رہے۔ نانا فوج میں صوبہ دار تھے۔ والد مولوی ناصر الدین ابو المنصور اعلیٰ پایہ کے ادیب اور مناظر تھے۔ بڑے بھائی میر تصرف علی "نصرت الاخبار" کے مالک اور اڈیٹر تھے۔ میر ناصر علی نے دہلی کالج میں تعلیم پائی۔ اس کے بعد ۱۸۶۶ء میں نان پارہ ضلع بہرائچ میں مدرس ہو گئے۔ وہاں سے محکمۂ نمک میں لے لئے گئے۔ اس محکمہ میں چالیس ۴۰ سال نیک نامی کے ساتھ خدمت کر کے پنشن لی۔ خدمت سرکاری سے سبکدوش ہونے کے بعد ریاست پاٹودی ضلع گڑگاؤں میں دیوان ہو گئے۔ گورنمنٹ نے "خان بہادر" کا خطاب دیا۔ ۱۹۱۱ء دربارِ تاجپوشی کے موقع پر جب دہلی کے قلعۂ معلّیٰ میں عجائب خانہ مرتب کیا گیا تو اُس کے اہتمام میں میر ناصر علی خاں بھی شریک تھے۔ پھر ملکِ معظم جارج پنجم کی خدمت میں بھی باریاب ہوئے۔ طویل عمر پاکر ۱۹۳۳ء / ۱۳۵۲ھ میں رحلت فرمائی۔ اتفاق سے ان کا نام ہی ان کی تاریخِ وفات ہے "میر ناصر علی خاں" (۱۳۵۲ھ)

ادبی خدمات

میر ناصر علی خاں اُن ادیبوں میں ہیں جو صرف ایڈیٹری اور مضمون نگاری کے سبب سے نامور ہوئے۔ انھوں نے کوئی مستقل کتاب نہیں لکھی، لیکن زبان و ادب کا فطری ذوق رکھتے تھے: آغاز شباب سے مضمون نگاری شروع کر دی تھی۔ اردو اخبارات و رسائل میں مقالہ نگاری کا صحیح مذاق سر سید کے رسالہ "تہذیب الاخلاق" (جاری شدہ ۱۸۷۰ء) سے پہلے پیدا نہ ہوا تھا۔ سر سید کی تحریروں نے انشا پردازی میں نئی روح پھونکی میر ناصر علی خاں

نے اپنے لئے اخبارات رسائل کی ادارت کو اردو کی خدمت کا ذریعہ تجویز کیا۔ چنانچہ "تیرھویں صدی" "زمانہ" وغیرہ پرچے نکالے۔ اور ان کے ذریعہ سے صحیح زبان، دلکش اسلوب اور پاکیزہ خیالات کے نمونے پیش کئے۔ آخر میں "صلائے عام" کے نام سے ایک ماہانہ رسالہ جاری کیا، جو اُن کی وفات تک جاری رہا۔ اسی پرچہ سے اس کے مالک و مدیر کی ساری شہرت ہے۔ "صلائے عام" اور میر ناصر علی خاں کے مقالات کی تمام ادبی دنیا میں دھوم تھی۔

میر ناصر علی کے پوتے، میر انصار ناصری نے رسالہ "نقوش" لاہور کے "شخصیات نمبر" میں میر صاحب کے متعلق بہت طویل اور نہایت ادیبانہ مضمون لکھا ہے۔ اس میں میر ناصر علی کی سیرت و شخصیت بھی ہے اور ان کے متعلق دوسروں کی رائیں بھی ہیں۔ اس مقالے کے بعض مقامات سے کچھ اقتباسات درج کئے جاتے ہیں۔

خواجہ حسن نظامی نے اُن کے بارے میں لکھا تھا کہ :

> "ان کی صورت میں قدامت تھی، لباس میں قدامت تھی، بولنے میں قدامت تھی۔ اعلیٰ درجے کے انشاپرداز۔ تیزی سے لکھنے والے تیزی سے بولنے والے۔ استدلال میں کسی سے نہ دبنے والے۔ اپنے آگے کسی کو نہ گردانئے والے۔ نہایت وضعدار و خود دار۔ فاضل اور علم کے رسیا۔ عالی دماغ اور ہنس مکھ اور ایک روشن ضمیر، فقیر منش انسان تھے۔"

علامہ راشد الخیری کی رائے ہے کہ خان بہادر سید ناصر علی کی زندگی ہم کو اساتذہ کی جیتی جاگتی تصویر دکھا دیتی تھی۔ ان میں ذوق کی سنجیدگی، غالب کی تنک مزاجی اور داغ کی شوخیوں کی جھلکیں موجود تھیں۔

جامع مسجد دہلی کا روزانہ کا پھیرا، جب تک ہاتھ پاؤں نے ساتھ دیا، کبھی ناغہ نہ ہوا۔ ضعیفی کے باوجود ساری سیڑھیاں طے کرکے اوپر جاتے اور منبر کے پاس پہنچکر دعا کرتے۔ کتابوں سے عشق تھا۔ ان کا کتب خانہ دلی کے چند گرامی قدر کتب خانوں میں ایک تھا۔ ایک مرتبہ اپنے صاحبزادے میر انتصار علی کو خط لکھا تھا (جو اُن کی سیرت و شخصیت کا آئینہ ہے) فرماتے ہیں:

"بیٹا! —— میری ایک آرزو یہ ہے کہ کتب خانے والا مکان تکلف سے آراستہ ہو جائے اور میں دن رات وہیں پڑا رہوں۔ تم اگر ساتھ چار بیٹے آجاؤ تو کیا کہنا۔ مگر کوئی معمولی فکر کسی طرح کا نہ ہو۔ کھانا جب بھوک لگے پکا پکایا مل جائے اور لڑکیوں میں سے کوئی آکر کھلا جائے۔ کوئی نایاب کتاب یا چیز نظر آئے تو مجھے اتنا مقدور ہو کہ فوراً خرید لوں۔ رات کو بے فکر سوؤں، اور صبح خوش اُٹھوں۔ کوئی مسئلہ فلاسفی کا جو سمجھ میں نہ آتا ہو سے سمجھ لوں اور دوسروں کو سمجھا سکوں۔ دنیا کی جتنی کتابیں دل و دماغ کو خوش کر سکیں، سب میرے پاس ہوں۔ جاڑے میں انگیٹھی ہو اور گرمیوں میں برف ہو، برسات میں کمرے کے اندر بیٹھا ہوں اور وہ ٹپکتا نہ ہو۔ رات کو جلانے کے واسطے خوبصورت "کینڈل اسٹک" (موم بتی) کی روشنی ہو۔ اور جو کتاب مجھے پسند ہو، وہ میرے سامنے ہو۔ تم اتنا سامان میرے لئے کر دو تو "آئی ول ڈائی ہیپی" (میں خوش مروں گا)۔

تیرھویں صدی سنہ ۱۸۷۹ء (۱۲۹۶ھ) میں آگرہ اخبار، آگرہ کے دفتر سے شائع ہوا۔

اس میں دیگر محققانہ و حکیمانہ مضامین اور فقہ و حدیث کے مباحث کے علاوہ خاصے کی چیز وہ مضامین تھے جن میں میر ناصر علی، سر سید احمد خاں کے رشحاتِ قلم پر تنقید کرتے تھے۔ اسی زمانے میں سر سید کا اخبار "تہذیب الاخلاق" بھی نکلا تھا سر سید احمد خاں کے مشن سے میر صاحب کو کوئی تعرض نہ تھا۔ وہ محض اُن کے علمی و ادبی کارناموں پر سخن گسترانہ تنقید کرتے تھے اور اس طرح دادِ سخن دیتے تھے کہ سر سید علیہ الرحمۃ ہمیشہ انھیں "ناصح مشفق" کہتے رہے۔ اس کے متعلق مہدی حسن افادی نے خود میر ناصر علی کو لکھا تھا:

"تہذیب الاخلاق کے ساتھ ساتھ آپ نے جس ٹھاٹھ سے دُھواں دھار مضامین لکھے اور سر سید کے لٹریچر پر جس سلیقے اور سخن گسترانہ شوخیوں سے آپنے انتقادات کی ٹھیرائی، سچ یہ ہے کہ وہ اردو لٹریچر کی جان ہیں۔ آج سنجیدگی اس قدر بڑھ گئی ہے کہ میں نہیں جانتا ملک کے نامور اہلِ قلم آپ کے گذشتہ کمالات کی داد دیں گے۔ لیکن میں کھُل کر کہتا ہوں کہ آپنے اس وقت انشا پردازی کو چمکایا جب بہتوں نے قلم بھی ہاتھ میں نہیں لئے تھے۔ آپ کا ادبی مذاق اور خاص طرز کا مادّۂ اختراعی در اصل آپکے اوّلیات میں داخل ہونے کے لائق ہے۔ موجودہ نسل تمام تر تہذیب الاخلاق کے ادبی دَور کی پیدا کردہ ہے، جب آپکے لٹریچر کا شباب تھا اور یہیں سے اپنا مرتبہ دیکھ لیجئے۔"

پروفیسر سید وقارِ عظیم لکھتے ہیں:

"ان کی تحریریں مُردہ دلوں کے لئے شگفتگی کا سامان فراہم کرتی ہیں۔ وہ صحیح معنوں میں انشا پرداز ہیں۔ ان کی عبارتیں

جہاں ایک طرف آزاد کی طرح رنگین و مسرت افزا ہیں۔ وہاں شبلی کی طرح شگفتہ اور مدلل بھی، لیکن ان باتوں کے باوجود بھی بات کو آسان سے آسان زبان میں پیش کرتے ہیں، اس طرح کہ حسن بھی برقرار رہے اور علمیت میں بھی کمی نہ آنے پائے۔ میر ناصر علی مرحوم گو نثر میں شعر کہتے ہیں، مگر ایک ادیب کی طرح وہ اپنے مقصد کو کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ بات اگر شاعرانہ ہے تو بیان مدلل، بیان اگر شگفتہ و رنگین ہے تو نفسِ مضمون حکیمانہ جس کے ہر لفظ سے ادبیت اور علمیت ٹپکتی ہے۔ گویا شاعری اور فلسفے نے ایک شکل اختیار کر لی۔ لیکن زیادہ حیرت اُس وقت ہوتی ہے جب فلسفی اور شاعر دنثار اپنی تحریروں میں مزاح کی چاشنی ملا دیتا ہے۔......

"ان کی ایک خوش گوار خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ اپنے بیان کو کسی شعر پر ختم کرتے ہیں۔ یہ طرزِ تحریر گو پُرانا ہے لیکن میر صاحب نے اسے بادۂ کہن بنا دیا۔ اس میں اور زیادہ کیف اور سرمستی پیدا ہو گئی۔ لوگ اس رنگ پر سر دھننے لگے۔ اس کی خاص وجہ ان کے اشعار کا انتہائی موزوں انتخاب اور نہایت برجستہ استعمال ہے۔ انھوں نے قدیم اور جدید دونوں رنگوں کو اس طرح شیر و شکر کیا کہ اُردو انشا میں ایک نیا رنگ پیدا ہو گیا جو صرف ان ہی سے خاص تھا۔"

میر ناصر علی خاں لکھنؤ میں بھی رہے تھے اور وہاں کی زبان کا اپنی زبان سے مقابلہ کرنے کا موقع ملا تھا۔ دونوں کا فرق ایک مضمون میں بتاتے ہیں:

"دہلی اور لکھنؤ کی زبان میں جو فرق میرے ذہن میں آیا، یہ
ہے کہ دہلی میں سقّہ جو نل پر مشک بھر رہا ہے، دوسرے سقّہ سے
جس زبان میں باتیں کر رہا ہے، اسی زبان میں لال قلعہ تک باتیں
سُنتے چلے جائیے۔ اس لئے دہلی کی زبان میں بے تکلفی ہے۔ لکھنؤ
میں خاص کی زبان اور ہے عوام کی زبان اور۔"

میر صاحب شاعر نہ تھے، لیکن نثر میں شاعری کرتے تھے۔ یہ "نثر کی شاعری"
مولوی عبد الحلیم شرر نے ایسی کی کہ کمال کی حد ختم کر دی۔ لیکن اس کی ایجاد و ابتدا
کرنے والوں میں میر ناصر علی بھی تھے۔ شرر کا بڑا کمال یہ ہے کہ انھوں نے نئے خیالات
اور خیال آفرینی کے اسلوب، انگریزی انشا پردازوں سے لئے اور اُن کو اردو
زبان کے طرزِ ادا کے ساتھ اور شعرائے ہند کے مذاقِ ادب کے مطابق مرتب کر کے
پیش کیا۔ یہی کام میر ناصر علی اور عبد الحلیم شرر سے پہلے علّامہ محمد حسین آزاد نے
"نیرنگِ خیال" میں کیا تھا۔ لیکن وہ "تمثیلی رنگ" ہونے کے سبب سے ایک
صنفِ خاص تھا۔ شرر اور میر صاحب صرف تمثیل کے پابند نہ تھے۔ نئی بات
نئے انداز سے لکھنی چاہتے تھے۔ پاکیزہ خیالات پیدا کرنے چاہتے تھے۔ میر
ناصر علی خاں "صلائے عام" میں لکھتے ہیں:

"صلائے عام میں خاص بات یہ ہے کہ اس میں خیال
کی تلاش زیادہ رہتی ہے۔ زبان کے قائل تو ایسے لوگ بھی
ہیں جو لیاقتِ علمی سے خالی ہوں، مگر خیال کی داد دینے کے
لئے علم و لیاقت کی ضرورت ہے۔ اس لئے اہلِ علم و کمال
میں خیال کی خوبی کو زبان کی خوبی پر ترجیح دی جاتی ہے۔ زبان
کے سمجھنے والے زیادہ ہوتے ہیں کیونکہ زبان کا سمجھنا آسان

ہے۔ مضمون پیدا کرنے میں جو خونِ جگر کھانا پڑتا ہے، اس کے
سمجھنے کے لئے دل و دماغ چاہئے اور دل و دماغ بختِ عرفیؔ[5] کی طرح
ہر وقت بازار میں نہیں ملتے۔"

میر صاحب کا طرزِ تحریر بھی یہی ہے کہ زبان شستہ و صاف و سادہ و سلیس لکھتے ہیں۔
لفظوں اور ترکیبوں میں استعارے پیدا نہیں کرتے، بلکہ پوری بات یا سارے
مضمون کو خیالی و مجازی بنا دیتے ہیں۔ دو چار نمونے یہ ہیں:

ا۔ "عرس و سالگرہ" ملائے عام کا مضمون ہے۔ شروع میں تقریبِ
تحریر بیان کر دی ہے۔ مختلف حصے نقل کئے جاتے ہیں:

"اخبار والے، جن کو سخن گستری کا شوق ہے، سال کے
انجام و آغاز کے دو مضمون ذرا زور سے لکھتے ہیں۔ اتفاق سے
مجھے ان دنوں دو مضمون علیحدہ علیحدہ لکھنے کی فرصت نہیں،
ایک مضمون کی بچت نکال کر سال کے انجام و آغاز کو میں عرس و
سال گرہ سے تشبیہ دیتا ہوں۔ ۳۱ر دسمبر کو تو گویا پیرِ گردوں
کا عرس سمجھئے اور یکم جنوری کو گردشِ روزگار کی سال گرہ.....
ہر سال کا اخیر میری نگاہ میں زمانہ کا عرس ہے کہ جس طرح
اولیاء اللہ کو کہتے ہیں کہ فنا نہیں۔ اُن کا ہماری نظر سے غائب
ہونا "وصال" سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح ایک سال کا غائب
ہونا جزو کُل میں مل جاتا ہے، اسے وصال نہیں تو اور کیا

---

[5] اِس فقرے کے حوالے میں میر صاحب نے حاشیہ پر عرفیؔ کے قصیدہ کا یہ مطلع
درج کیا ہے:

جہاں بگشتم و دردا بہیچ شہر و دیار　　نیافتم کہ فروشند بخت در بازار

کہتے ؟ ورنہ زمانہ وہی ہے جو ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا۔ گئے
ہوئے زمانہ کو آپ فاتحہ خیر سے یاد کریں کہ حاصلِ عمرِ بزرگاں یہی ہے
اور گردشِ روزگار کی سال گرہ منائیں کہ دُنیا کا مدار اسی پر ہے۔

لو ابتداے ہم کہیں اب داستانِ عشق
آخر شبِ فراق کو تو انتہا نہیں

اتفاقاتِ زمانہ سے پیرِ گردوں کی سال گرہ کا دن بھی تھا جو گردشِ
روزگار کی سال گرہ کا دن ہے کہ آغازِ عالم میں تمام کائنات ایک ہی
وقت کُن فیکُون سے پیدا ہوئی۔ پیرِ گردوں کی سال گرہ کی یادگار
کہکشاں آسمان پر موجود ہے۔

دوستانِ رفتہ کی رُوداد کِس سے پوچھئے
بات کے لائق کوئی شہرِ خموشاں میں نہ تھا

سالگرہ دراصل کوئی عقدہَ لاینحل نہیں۔ حسین وعدہ کی گرہیں،
خضر کے رشتہَ عمر سے زیادہ لگاتے ہیں۔ گو قطرہَ اشک کی شکل گرہ
سے زیادہ مشابہ ہے۔

غفلت شریکِ حال تھی پہلے بھی حُسن کے
یوسف کنوئیں میں دیدہَ یوسف میں خواب تھا

بے ثباتیِ عالم کی مثالیں بیان کر کے مضمون کو اِن فقروں پر ختم کرتے ہیں:

انگریزی میں کسی شاعر کا مضمون ہے کہ حسن اس لئے دلفریب ہے
کہ ہماری ہستی کی طرح بے ثبات ہے اور علم کی قدر ہماری نگاہ میں
اِس لئے ہے کہ اس میں کمال مشکل ہے۔ مرنے کے بعد کسی چیز کو
کمال حاصل ہو تو عالمِ اسباب میں کمال کی قدر نقص سے ہے

اور ہنر کی قدر عیب سے۔ بیداری کی قدر غفلت سے اور زندگی کی قدر
موت سے۔ بچے جن کھلونوں پر جان دیتے ہیں جوان انھیں پھینک
دیتے ہیں۔ اور جوانوں کو جو باتیں عزیز ہیں، بوڑھے انھیں فضول
سمجھتے ہیں۔

لیکن مجھ سے پوچھئے تو اس عالم کی مختصر سے مختصر زندگی مرنے
کے بعد قیامت تک زندہ رہنے سے کہیں اچھی ہے اور اس دارِ
فانی کی انجمن عالمِ بقا کے وعدوں سے جن کے پورا ہونے کا حال
معلوم نہیں (آگے کیا عرض کروں؟) ؎

چھوٹی سے چھوٹی رات بھی اچھی ہے وصل کی
چھوٹے سے چھوٹا دن بھی ہے اچھا بہار کا

میر صاحب کے آخری خیال سے آجکل کے انقلاب پسندوں اور مادہ پرست
نوجوانوں کو سند ہاتھ آتی ہے۔

۲۔ "خیال بمقابلۂ زبان" اس مضمون کے بعض فقرے زبان و خیال
کے متعلق اوپر نقل کیے گئے ہیں۔ اس کے بعد میر ناصر علی خاں انگریزی انشا پردازوں
کے چند خیالات پیش کرتے ہیں:

اور ملکوں کی زبانوں میں خیال کی فکر زیادہ رہتی ہے کہ ہر بات
میں نیا مضمون پیدا ہو۔ آئینہ کو ہم حیران باندھنے سے زیادہ نہ کہہ
سکے۔ یونان کے کسی شاعر نے اس میں ایک نئی بات پیدا کی کہ کوئی
حسین جس کی جوانی کا انحطاط قریب ہے زہرہ کے مندر پر آئینہ
چڑھانے گئی، چڑھاتے وقت کہتی ہے کہ آئینہ کی اب مجھے ضرورت
نہیں، جیسی میں تھی وہ صورت تو اب آئینہ میں کاہکو نظر آئے

گی، جو شکل ہونے والی ہے اس کو دیکھ کر کیا کروں گی؟ جوانی کے بعد جو میری صورت ہو گی وہ مجھ سے نہیں دیکھی جائے گی، جیسی تھی پھر دکھائی دے چکی۔ اب آئینہ کو رکھ کر کیا ہو گا؟ یہی آئینہ جو حسینوں کے ہاتھ سے نہیں چھوٹتا، جوانی کے بعد اس کی شکل سے نفرت ہو جائے گی۔

ایک کم سن لڑکی جو اب تک گڑیوں سے کھیلتی رہی صغیر سنی کی شادی میں از روے رسم مندر میں پوجا کے لئے گئی۔ اور لوگ جہاں چڑھاوے کی چیزیں لے گئے تو یہ اپنی گڑیاں ساتھ لیتی گئی کہ اب اِن سے کھیل چکی، ان کو چڑھانے کے لئے لائی ہوں۔ دیبی جی جن کو گھر کے جھگڑوں سے فرصت ہے، گڑیوں سے کھیلیں گی۔ شادی کے بعد کھیلنا معلوم۔

عقل نے عشق سے کہا کہ اکیلے تو میں تجھ سے لڑنے کو تیار ہوں کہ ایک کی لڑائی ایک سے برابر کی لڑائی ہے مگر تیرے ساتھ اگر دخترِ رز ہو گئی تو پھر تیرا مقابلہ مشکل ہے۔

شکاری بھاگتے ہوئے شکار کے پیچھے پیچھے کوہ و بیابان میں دوڑتے ہیں مگر مارا ہوا جانور مل جائے تو اس کی طرف دیکھتے بھی نہیں۔ یہ حال عشقِ ہرجائی کا ہے جو گھر کی پارسا عورت کو چھوڑ کر بازار میں پھرتا ہے۔

ایک خونی کسی دیوار کے نیچے سو رہا تھا۔ خواب میں کیا دیکھتا ہے کہ کوئی اس سے کہہ رہا ہے کہ یہاں سے بھاگ، اس کی آنکھ کھل گئی:

وہاں سے اُٹھ کر بھاگا۔ اُس کے بھاگتے ہی دیوار گری۔ اُس نے اپنے دل میں کہا کہ خدا نے مجھ پر بڑا رحم کیا کہ گرتی دیوار سے بچا لیا۔ ورنہ دَب کر مر جاتا۔ آواز آئی کہ ہم نے اِس موت سے اِس وقت تجھے بچا لیا کہ یہ آسان تھی تجھے اس تکلیف کی مَوت سے سب کے سامنے مارنا منظور ہے جسے پھانسی کہتے ہیں۔ دیوار سے دب کر مرنا مرگِ ناگہاں میں سمجھا جاتا۔ تیرے اعمال کی سزا میں مارنے کے لئے تجھ کو چھوڑا ہے تاکہ جلاد کے ہاتھ سے مارا جائے۔

ایک بچّے کی قبر پر کندہ ہے کہ میرے ماں باپ میرے لئے نہ روئیں کہ اگر میں نے زندگی کا لطف نہیں دیکھا تو اس کی مصیبتیں بھی نہیں اُٹھائیں، اِدھر کی کسر اُدھر نکل گئی۔

کسی کے غم میں مَوت سے کوئی کہہ رہا ہے کہ تو مرنے والے کے ساتھ تو زبردستی کر گئی، بھلا میرے ساتھ تو کر کر مَرنے والے کی یاد چھین تو لے؟

یہ چند خیال میں نے اہلِ علم و کمال کی طبع آزمائی کے لئے جمع کر دیئے کہ ان پر مضمون لکھیں۔ یہ خیال نظم کی خوبیاں مانگتے ہیں، جن سے میں عاری ہوں۔ شعرائے اردو دان کو نظم میں ادا کریں تو ان کا لطف دوبالا ہو جائے۔ میں نے بری بھلی اردو میں ان کا مطلب ادا کر دیا۔ اب آپ جانیں اور آپ کی نازک خیالیاں ؎

کیوں خاک میں ملاتے ہو رفتارِ ناز سے
مٹّی میں لوٹتا ہے دوپٹہ اُٹھایئے

خواجہ سید ناصر نذیر فراق دہلوی

حضرت[۱] خواجہ میر درد رحمۃ اللہ علیہ کے نواسے ہیں۔ اگست ۱۸۶۵ء عیسوی —
(ربیع الاول ۱۲۸۲ھ) میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ خود ایک رباعی میں اپنا نسب بیان کرتے ہیں:

حمدِ حق لکھوں گا یا نعتِ نبیؐ لکھوں گا — وصفِ سبطین کا، تعریفِ علی لکھوں گا
زیدی النسل ہوں سید ہوں مجھے بھاتا نہ جاہ — مدح غیروں کی کبھی ہم نہ کبھی لکھوں گا

ان کے دادا منصب دار تھے، والد میر محسن علی بڑے عالم، درویش صفت بزرگ تھے۔ والدہ بھی علومِ ظاہر و باطن میں کامل تھیں۔ میر ناصر نذیر نے خواجہ میر درد کی سوانح عمری "میخانۂ درد" کے نام سے لکھی ہے اس میں اپنے حالات بھی لکھے ہیں ایک جگہ لکھتے ہیں:

"میں نے اپنے والدین ماجدین کی صحبت چالیس سال اٹھائی اور
ان دونوں حضرات نے ان کمالاتِ ظاہری و باطنی سے جو وراثۃً خواجہ
میر درد صاحب سے پہنچے تھے مالا مال کر دیا۔"

اس فیضان کے علاوہ میر فراق نے فارسی و عربی کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی اور درسِ نظامیہ ختم کر کے سند لی۔ پھر فنِ طب کی طرف توجہ کی۔ پہلے حکیم بدر الدین خاں دہلوی سے اس فن کو حاصل کیا۔ پھر حکیم محمود خاں دہلوی اور ان کے فرزند اکبر

---

[۱] ان حالات میں دوسری کتابوں کے علاوہ حضرت فراق کے فرزند ارجمند حکیم سید ناصر خلیق نگار دہلوی کے مضمون مطبوعہ یادگار لاہور (بابت اپریل ۱۹۳۳ء) سے بھی مدد لی گئی ہے۔

حاذق الملک حکیم عبدالمجید خاں سے طب کی تکمیل کی اور سند حاصل کی۔

غدر کے بعد میر فراق کے والد اور دادا کو رئیس دھرم پور (ضلع بلندشہر) نے اپنے پاس بلا لیا تھا۔ پھر فراق صاحب کو رئیس نے اپنا طبیب خاص اور اپنے صاحبزادوں کا اتالیق مقرر کیا۔ ایک عرصہ تک ان سے وابستگی رہی۔ اور علاج معالجہ میں خوب شہرت پائی۔ رئیس کے انتقال کے بعد فراق صاحب علی گڈھ کالج کی طرف سے سفیر بن کر بمبئی۔ بڑودہ۔ احمد آباد تشریف لے گئے۔ اس تعلق کے ختم ہونے کے بعد اپنے وطن دہلی میں مستقل قیام اختیار کیا اور کوچہ چیلان بارہ دری خواجہ میر درد میں باقی عمر گذار دی۔

میر فراق صاحب شاعری میں مولوی محمد حسین آزاد دہلوی کے شاگرد تھے ایک مرتبہ علامہ آزاد لاہور سے دہلی آئے اور خان بہادر مولوی ذکاء اللہ کے مکان پر قیام فرمایا۔ میر فراق کی جوانی کا آغاز تھا اور شاعری کا شوق تھا انہوں نے اپنے والد سے درخواست کی اور وہ ان کو ساتھ لے کر علامہ آزاد کی خدمت میں گئے۔ یہ غزل لے گئے تھے۔ آزاد کے ارشاد پر غزل سُنائی۔ انھوں نے سنکر فرمایا۔ ماشاء اللہ۔

این سعادت بزورِ بازو نیست   تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

بھئی کیوں نہ ہو، آپ حضرت درد کے خاندان سے ہیں اور کلام میں پورا پورا رنگ حضرتِ درد کا ہے، بھلا میں کیا اصلاح دے سکتا ہوں۔"

جب فراق صاحب کے والد نے اصرار کیا تو علامہ آزاد نے فرمایا "اچھا میر صاحب میں بھی دلّی میں ایک دوسرا آزاد بنائے دیتا ہوں، جاؤ میاں! مٹھائی لے آؤ" چنانچہ مٹھائی آئی اور آزاد نے ان کی غزل میں اصلاح دی۔

پھر یہ سلسلہ جاری ہو گیا۔

میرنا صر نذیر فراق کے خاندان میں قدیم سے سلسلۂ نقشبندیہ جاری تھا۔ خواجہ میر درد اسی سلسلہ کے درویش کامل تھے۔ لیکن میر فراق نے چشتیہ طریقہ میں حضرت شاہ سلیمان تونسوی قدس سرہٗ کے پوتے حضرت شاہ اللہ بخش تونسوی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت و اجازت حاصل کی۔ خود فرمایا کرتے تھے کہ "میرا سلوک پورا ہو گیا اور میں اپنے مقصد کو پہنچ گیا۔ مرض الموت میں بھی اپنے صاحبزادہ سے فرمایا کہ "تم کو معلوم نہیں ہے، میرا پاس انفاس ہر وقت جاری رہتا ہے۔" بعض رباعیوں میں اپنا مسلک بیان کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

سب ہیچ ہے تار و پود اِلّا اللہ | کچھ بھی نہیں یہ نمود اِلّا اللہ
لَا فَاعِلَ فِی الْوُجُوْدِ اِلّا اللہ | کہتے ہیں فراق، جن کے دل روشن ہیں

وفات سے ایک مہینہ قبل جنوری ۱۹۳۳ء میں فرمایا تھا کہ "ہمارا پیمانۂ عمر لبریز ہو چکا ہے، اللہ وہ فقیر کیا جو اپنی مرگ سے آگاہی نہ رکھتا ہو۔" انہی دنوں میں ان کے ایک دوست مزاج پرسی کے لئے آئے، تو ان سے فرمایا۔ بھائی اب روا روی ہے، میں نے یہ شعر اپنے حسب حال کہا ہے:

کرے گا اِس عالم کی تو سیر کب تک | منائے گی بکرے کی ماں خیر کب تک

چنانچہ دوشنبہ کی شب میں ۱۸ر فروری ۱۹۳۳ء (شوال ۱۳۵۱ھ) کو رحلت فرمائی۔ قرآن مجید سے تاریخ وفات ہے: "اَلْمُتَّقِیْنَ فِیْ جَنّٰتٍ وَّنَهَرٍ فِیْ مَقْعَدِ صِدْقٍ" ۱۹۳۳ء (سورۂ قمر۔ آخری آیت۔ پارہ ۲۰)

تصانیف اور طرزِ تحریر

میرنا صر نذیر فراق کی فہرستِ تصانیف یہ ہے:۔

۱۔ میخانۂ درد: حضرت خواجہ میر درد رحمۃ اللہ علیہ کے حالات۔

۲- دلّی کا آخری دیدار : دہلی و بادشاہِ دہلی، اہلِ شہر و اہلِ قلعہ کی معاشرت، رسم و رواج، اشغال، میلے، تہوار، سب کچھ بیان کئے ہیں۔

۳- لال قلعہ کی ایک جھلک : دہلی کے آخری تاجدار ابوظفر بادشاہ کے زمانے کا لال قلعہ پورا اِس کتاب میں منعکس ہے۔

۴- دلّی کا اُجڑا ہوا لال قلعہ : مختصر کتاب ہے۔ بہادر شاہ ظفر کے فرزند شاہرخ میرزا کے شکار کجلی بن کے حالات ہیں۔

۵- بیگموں کی چھیڑ چھاڑ : ایک شادی کی محفل کا نقشہ ایک بیگم کی زبانی پیش کیا ہے۔

۶- سات طلاقنوں کی کہانیاں : سات عورتیں ایک جگہ جمع ہوکر اپنی اپنی کہانی کہتی ہیں۔ کہ ان کو کس وجہ سے طلاق ملی۔

۷- دکن کی پری : ایک طویل افسانہ۔

۸- مضامینِ فراق : مصنف کے افسانوں کا مجموعہ۔

۹- چار چاند : مصنّف کے چند مضامین کا مجموعہ۔

میر ناصر نذیر فراقؔ، جس دلّی کی خود یادگار تھے اسی دلی کی یادگار ان کی زبان اور ان کی کتابیں ہیں ُانھوں نے کوئی علم و فن کی کتاب نہیں لکھی۔ ان کا قلمی کارنامہ لطفِ زبان اور حسنِ بیان کے ساتھ دہلی کی تہذیب و تمدن کا آخری نمونہ پیش کرتا ہے۔ اُن کے طرزِ تحریر کی داد ان کے ایک ہم پایہ اور ان سے بزرگ ادیب دیتے ہیں۔ فراق صاحب کے صاحبزادہ نے ان کے حالات میں لکھا ہے :-

"منشی سیّد احمد صاحب مؤلف فرہنگِ آصفیہ آپ سے ملاقات کے کے لئے تشریف لائے اور فرمایا بھائی صاحب! کمال کیا ہے اتنے

چھوٹے افسانہ "اختر محل" میں اتنے دلّی کے ٹھیٹھ محاورے آپ نے بھر دیئے کہ مجھ کو حیرت ہے۔ میں تو آپ کو سلطانِ زبانِ اُردو کہتا ہوں چنانچہ خطوط میں ان کو "سلطان زبان اردو" لکھا کرتے تھے۔"

دو ایک نمونے درج کئے جاتے ہیں۔

بیگموں کی چھیڑ چھاڑ: اس مضمون میں سیّد ناصر نذیر فراق نے دلّی میں بیاہ کی ایک محفل جمائی ہے۔

(۱) ایک بیوی کالے محل سے مہمان آئی تھیں، ان کا نام تھا حضرت بیگم وہ بڑی اکھل کھری اور مزاج کی بڑی کڑوی تھیں حسن جہاں کی باتیں سُن سُن کر بہت کُڑھتی تھیں اور بیٹھی کچھ مُنہ ہی مُنہ بڑبڑایا کرتی تھیں۔ بی دولت اپنے تیہے میں آپ ہی آپ کھولتی، کھانا پینا، پان چھالیہ، زردہ الائچی، چٹنی اچار، مُربہ مٹھائی ناشتہ سب کچھ حسن جہاں کے تحت میں تھا۔ سچ مچ خالہ جان نے انھیں کُل کلاں کا مالک کر دیا تھا۔ اس مارے بعض بیوقوفیں ان سے اور کھسیانی تھیں۔ ایک دن حضرت بیگم اور حسن جہاں کا مجبیٹہ ہو گیا حضرت بیگم کے دل میں حسن جہاں بیگم کی طرف سے ناحق کا بخار تو بھرا ہی ہوا تھا۔ انھیں دیکھ کر ایک بیوی سے کہنے لگیں۔ اے بُوا رضیہ سلطان! سُنتی بھی ہو، قلعہ کی بیگمیں آپی کو نکٹی کہا کرتی تھیں، یہ چھوٹی ناک بھی کیا بُری معلوم ہوتی ہے۔ کمبخت پیا پھرا ہوا۔ اور بہن مجھے تو زیادہ گوری رنگت سے بھی نفرت ہے، جیسے پھیکا شلجم۔"

حسن جہاں کی ناک بھی چھوٹی تھی اور رنگ بھی اُن کا ٹیکا بڑا تھا۔ سمجھ گئیں کہ پھبتی مجھ پر ہی ڈھالی گئی۔ وہ بھلا کب چُپ کرنے والی تھیں، بچنے

لگیں "پھیکا شلجم تماکو کے پنڈے سے تو ہر طرح اچھا ہوتا ہے اور مجھے بڑی ناک دیکھ کر گھن آتی ہے یہ معلوم ہوتا ہے رسل کا بڑ کسی نے چہرے پر دھر دیا ہے۔" اونچی ناک سو جھے کیا خاک چھوٹی ناک سہاگ کا بڑا اونچی ناک کو لاؤ چھرا! یہ مثل تم نے سنی ہو گی۔ حضرت بیگم کی رنگت بھی کالی بھٹ تھی اور ناک بھی ان کی بے ڈول اونچی تھی حسن جہاں کے اس کہنے پر سب بیویاں بیگمیں ہنس پڑیں۔ اور بی حضرت بیگم بگڑ گئیں۔ ہنسی میں کھسی ہو گئی اور بی حسن جہاں کی اور ان کی خوب دگمو دنگ ہوئی۔

(۲) رات کے بارہ بجے برات آئی۔ سمدھنیں بڑے جلوہ کے ساتھ اتریں چھڑال جال کے جوڑے کمخواب، زری۔ بوٹی پوتھ کی تہ پوشیاں، نیچے نیچے کرتے۔ ہمارے بچپن میں کوئی بیوی کرتہ پہنے آجایا کرتی تھی تو اس پر تیلن گھوسن کی پھبتیاں اڑا کرتی تھیں یا اب ساری بیگموں نے یہی وضع طرح لے لی، سچ ہے کبھی کے دن بڑے کبھی کی رات" سمدھنیں بڑے ٹھسے کے ساتھ مسند پر گاؤ تکیہ سے لگ کر بیٹھیں۔ شربت پلانے کے لئے بھی ہماری بجلی بسنت بی حسن جہاں اور لنکا مبارک نسا، کھڑی ہوئیں۔ مبارک نسا، کے ہاتھ میں چاندی کی کشتی اور اس میں شربت کا شیشہ بلور کی پیالی اور بی حسن جہاں کے ہاتھ میں ریشم کا رومال منہ پوچھنے کے لئے اللہ کی بندی رومال کا گھسا اس زور سے دیتی تھی کہ شربت پینے والی پھڑک جاتی تھی منہ اور ہاتھ چھل کر لال ہو جاتی تھیں بعض جلاتن کہدیتی تھیں " اے

پھٹکار یہ منہ پونچھتی ہو یا کبھی کا بیر نکالتی ہو؟"

آغائی بیگم۔ دولہ کی بہن کا جو منہ پونچھا تو رگڑ کے ساتھ ان کی ناک کی کیل الجھ کر ناک میں سے نکل گئی اور وہ بیچاری منہ پکڑ کر کہنے لگیں "شاباش بوا شاباش دیکھنے کی تو تم کامنی سی ہو مگر ہاتھ تو ماشاء اللہ لوہے کی میخیں ہیں دیکھو میری ناک کی کیل تمہارے رومال میں الجھ کر چلی گئی ہے۔"

حسن جہاں "بوا اوکھلی میں سر دیا تو دھمکوں سے کیوں ڈرتی ہو خدا رکھے بھائی کو بیاہنے آئی ہو نیگ جوگ کے روپے ڈھیر سارے تمہارے ٹڑ میں جائیں گے۔ سمدھن بننا ٹھٹھا ہے ابھی تو منہ ہی پچھوانے میں تولا گئیں۔ جب ڈومنیوں کی موٹی موٹی گالیاں کھاؤ گی اس وقت معلوم ہوگا کہ کیسی کا ساٹھ ہوتا ہے اور بوا ناک کی کیل تو ہم نے دیکھی بھی نہیں۔ سچ کہنا بہن گھر سے پہن کر بھی آئی تھیں یا مفتِ خدا میں مجھے لئے مرتی ہو۔"

رومال جھاڑا تو اس میں سے کیل نہ نکلی۔

آغائی بیگم "سچی اللہ جانتا ہے، ہماری کیل ڈھونڈو اس میں ترلی جڑی ہوتی ہے۔"

حسن جہاں "بہن آغائی بیگم، تم کیل کے مارے کیوں ہلکی جاتی ہو۔ مانگے کی تو پہن کر نہیں آئی تھیں۔ تمہاری نہ ملے گی تو میں اپنی ہیرے کی کیل تمہیں دیدوں گی۔ مگر تم ذرا اچھری تلے دم تو لو۔

اتفاق کی بات، کیل آغائی بیگم کی گود میں جا پڑی تھی۔ جب مل گئی تو حسن جہاں کی چڑھ بنی کہنے لگیں "واہ، بوا بغل میں بچہ

شہر میں ڈھنڈورا۔ کیسل تو آپ چرائے بیٹھی ہیں اور لوگوں کے اوپر ڈرے پکڑاتی ہیں۔"

اس دور کی نثر پر تبصرہ

۱۔ یہاں تک جن مصنفوں کا ذکر کیا گیا، یہ سب وہ ہیں جن کی کم سے کم نصف عمر انیسویں صدی میں گذری اور جو ختم صدی سے پہلے مستقل مصنف اور انشا پرداز کی حیثیت سے شہرت رکھتے تھے۔ ان میں سے چند ایسے ہی ممتاز مصنفوں کی کمی بیک نظر معلوم ہوتی ہے، مثلاً

(۱) پنڈت رتن ناتھ سرشار۔

(۲) مولوی عبد الحلیم شرر۔

(۳) مرزا محمد ہادی رسوا۔

(۴) منشی سجاد حسین اڈیٹر اودھ پنچ۔

لیکن ان کو بالقصد اس تاریخ میں شامل نہیں کیا گیا۔ اس لئے کہ ان کی سب سے پہلی اور بڑی حیثیت "ناول نگار" کی ہے۔ اگرچہ ناول نویسی کی بنیاد ان سے پہلے پڑ گئی تھی اور ان کے بھی اکثر ناول انیسویں صدی ہی کے ہیں۔ لیکن اس فن کا ارتقا بیسویں صدی میں ہوا ہے۔ اسی طرح ظرافت نگاری عصرِ حاضر میں کمال کو پہنچی ہے۔ شرر و رسوا اور سرشار و سجاد حسین ناول اور ظرافت کے پیش رَو ہیں۔ اس حیثیت سے جدید ناول نویسوں اور مزاحیہ نگاروں سے پہلے ان بزرگوں کا تذکرہ ہونا چاہیے اور اس کے لئے علیحدہ تالیف کی ضرورت ہے۔

۲۔ جس زمانے تک اس تالیف کو ختم کیا گیا ہے، اس میں تصانیف کی اتنی کثرت ہو گئی تھی کہ مصنفوں کے صرف ناموں کا شمار و احاطہ بھی محال ہے۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ جن مصنفوں کا ہم نے تذکرہ لکھا ہے، ان سے بہتر اور

مشہور تر کوئی مصنف نہ تھا (بجز مذکورۂ بالا ناول نگاروں کے)۔

۳- انیسویں صدی کے آخری ۳۰ سال کی ایک ممتاز خصوصیت یہ ہے کہ یہ "دورِ مشرقیت" اور "زمانۂ تصنیف و تالیف" ہے۔ اور بیسویں صدی "عصرِ مغربیت" اور "عہدِ ترجمہ" سر سید سے پہلے تو اس تفریق کا محل ہی نہ تھا سر سید سے شبلی تک اکثر مصنفوں نے یا کتابیں تصنیف کی ہیں یا عربی و فارسی سے تالیف۔ انگریزی ترجمے بہت کم ہوئے۔ ڈپٹی نذیر احمد کے قانونی ترجموں کو چھوڑ کر سب سے مشہور مولوی سید علی بلگرامی کے ترجمے ہیں ان کے علاوہ جو ترجمے ہوئے ان کو شہرت اور قبولِ عام حاصل نہ ہوا۔

۴- انیسویں صدی کی تصانیف میں مغربی علوم و فنون کا اثر کم اور انگریزی کے طرزِ ادا، اور جدتِ اسلوب کا اثر بہت کم ہے۔ سر سید اور اُن کے رفقاء نے شبلی تک یورپ کے خیالات سے فائدہ حاصل کیا لیکن بالواسطہ۔ اسی لئے ان کے ہاں یہ رنگ ہلکا ہے۔ ان کے دوسرے معاصرین، مولوی چراغ علی، مولوی سید علی بلگرامی جسٹس کرامت حسین، مرزا ہادی رسوا، مولوی عبدالحلیم شرر وغیرہ نے براہِ راست یورپ کی زبانوں سے فیض اٹھایا۔ اس لئے ان کی تصانیف کے موضوع، اسلوب، ترتیب، سب میں یہ اثر زیادہ نمایاں ہے۔ (مرزا ہادی رسوا کی خدماتِ دارالترجمہ اس وقت زیرِ بحث نہیں ہیں، وہ خالص بیسویں صدی کی چیزیں ہیں۔ ان کا تذکرہ الگ ہوگا۔)

۵- پرانی تعلیم کے زیرِ سایہ اور "نئی روشنی" کی صبحِ صادق میں جتنے بہتر سے بہتر اسالیبِ بیان پیدا ہو سکتے تھے، وہ سر سید سے شبلی و شرر تک پیدا ہو گئے۔ اس امر میں سر سید کی جامعیت حیرت انگیز ہے کیونکہ سر سید کی تحریر میں عالمانہ و فلسفیانہ، متین و مزاحی، نرم و گرم ہر طرح کا اسلوب موجود ہے۔ شبلی اپنے اسلوب کے

توازن وتناسب، صحت وپختگی میں سب معاصرین سے بڑھے ہوئے ہیں، لیکن سرسید کے جوش کی ان میں کمی ہے۔ حالی ان دونوں کے درمیان میں ہیں، اگرچہ جوش ان میں بھی نہیں ہے۔ حالی نے سرسید کی صحت وصفائی کو آگے بڑھایا، لیکن حسن وموزونیت میں شبلی سے پیچھے رہے۔ نذیر احمد اور آزاد اپنے اپنے رنگ کے موجد خاتم ہوئے، سرشار وسجاد حسین "پنچ" طرزِ ظرافت کے خداوند تھے۔

بیسویں صدی میں اقسام کے لحاظ سے پہلے سے زیادہ اسالیب بیان ایجاد ہوئے اور تقریباً سب انگریزی زبان وعلوم سے متاثر ہیں۔ عصرِ حاضر میں مغربی تعلیم سے اردو کو جو سب سے بڑا فیض پہنچا، اور زبان وادب کی اصلی خدمت ہوئی، وہ یہ ہے کہ فلسفہ وسائنس، تاریخ وسیرت، ادب وانشاء، تبصرہ وتنقید، ناول وافسانہ وغیرہ مختلف موضوعات کے لئے الگ الگ مناسب وموزوں اسالیب مخصوص ہوگئے۔ اب سے پہلے یہ بات نہ تھی یا خال خال تھی، جیسا کہ ہم تفصیل کے ساتھ لکھ چکے ہیں۔ لیکن ان دو زمانوں (انیسویں صدی کا آخری اور بیسویں کا ابتدائی زمانہ) کے مصنفوں میں عجیب ودلچسپ فرق یہ ہے کہ سرسید اور ان کے رفقاء ومعاصرین کو جو اسلوب پسند تھا وہ انھوں نے ابتدائے تحریر سے اختیار کرلیا، اور آخر تک اس پر قائم رہے۔ آزاد، نذیر احمد، حالی، شبلی کا انداز وطرز ان کی پہلی تصانیف سے موجود ہے، اس کی تکمیل وپختگی میں البتہ کچھ دیر لگی، لیکن اتنی ہی جتنی کسی اسلوب کے ہموار ہونے اور منجھنے میں لگتی ہے۔ برخلاف عصرِ حاضر کے کہ اس زمانے کے سب نہیں تو بہت سے مشہور اہلِ قلم اسلوبوں اور اندازوں کے پیچھے دوڑتے پھرے۔ پھر کہیں مدت کے بعد کوئی روش اختیار کرسکے۔

ابوالکلام آزاد کی "عالمانہ وشاندار نثر" الہلال سے شروع ہوکر تفسیر قرآن تک رہی، پھر ہلکی پڑگئی۔ نیاز فتحپوری کی نثر میں شاعری" اور "ٹیگوریت"

کچھ عرصہ جاری رہ کر ختم ہو گئی، اور "نثر میں نثر" لکھنے لگے۔ خواجہ حسن نظامی نے زبان میں چٹکلوں کا مزہ پیدا کیا، چٹکیاں لیں، گدگدیاں کیں۔ لیکن اُن کی بھی حد ہو لی۔ ملّا رموزی نے اُردو کو گلابی رنگ دیا، یعنی "گلابی اردو" کے نام سے ملّایانہ لفظی ترجمے کا طرز لکھا، لیکن یہ رنگ پختہ نہ تھا، دُھل گیا۔ پھر مزاحیہ شوخ رنگ اختیار کیا، آخر وہ بھی "بادامی" ہو گیا۔ رشید احمد صدیقی نے طنزیات میں انفرادی رنگ نکالا، شوخی میں ادبیت پیدا کی، لفظوں کے معنی اور معنوں کے لفظ ایجاد کئے لیکن یہ اسلوب تھکا دینے والا تھا، چنانچہ تھک کر بیٹھ رہے۔ اِس طرح کے تغیرات اور اُلٹ پھیر اور اسالیب اور اہلِ قلم میں بھی ہوتے، یہ چند نام مثال کے طور پر لکھے گئے ہیں۔

ان میں یک رنگی قائم نہ رہنے کا سبب یہ تھا کہ یہ سب روشیں اصل میں تحریر کی "جوانیاں" تھیں، لکھنے والوں کے شباب تک رہیں۔

۶۔ علوم و فنون، اور مضمون و موضوع کے اعتبار سے بھی انیسویں صدی کا آخری دَور کامیاب ہے۔ تعداد میں سب سے زیادہ مذہبی کتابیں لکھی گئیں، ان کے بعد داستانیں اور ناول، پھر تاریخ و سیرت کا نمبر ہے۔ تذکرۂ زبان و ادب دو چار سے زیادہ نہیں۔ تنقید کا صرف آغاز ہوا۔ فلسفہ، سائنس، معاشیات وغیرہ بہت کم ہیں۔ سیاسی تصانیف برائے نام۔ لغات کی کتابیں لکھی گئیں۔ "فرہنگِ آصفیہ" سب سے پہلی جامع تالیف ہے۔

یہ سرمایہ بعد کی تصانیف سے زیادہ وسیع و متنوع نہیں ہے۔ لیکن اس زمانے میں بڑی بات یہ تھی کہ مصنّف عالم ہوتے تھے فضل و کمال حاصل کرنے سے پہلے مصنف بننا اور شہرت حاصل کرنا نہ چاہتے تھے۔ اس لئے جس موضوع پر قلم اُٹھاتے تھے کمال و تبحّر کے ساتھ لکھتے تھے اور تصنیف کا حق ادا کر دیتے تھے۔

نام ونمود پیشِ نظر نہ تھا، علم وہنر مقصود تھا۔ اس معیار و مسلک کی اہمیت عام طور پر دلنشین تھی۔ اس لئے کم استعداد مصنفوں اور فرومایہ تصانیف کو قبولِ عام حاصل نہ ہوتا تھا۔

بیسویں صدی میں یہ بات بدل گئی، لیکن بتدریج بدلی۔ اس زمانے کے دو دَور ہیں، یعنی موجودہ صدی کے پہلے بیس سال، اور بعد کے بیس سال۔ پہلے دَور کے مصنف وہ ہیں جن کا شباب اُنیسویں صدی میں شروع ہوا، اسی صدی میں یا بیسویں کے آغاز میں تعلیم ختم کی اور پھر میدانِ تصنیف وتالیف میں قدم رکھا۔ ان اہلِ قلم میں قدیم وضعِ اخلاق، تعلیم، مذاق کا بہت کچھ اثر تھا۔ اِس لئے اُن کی تصانیف کا معیار بھی صحیح ہے۔ دوسرے دَور کے مصنف وہ ہیں جو بیسویں صدی میں پیدا ہوئے یا اُنیسویں صدی میں صرف پیدا ہوئے تھے۔ باقی ہر نشو ونما بیسویں صدی میں پایا۔ یہ زمانہ انقلاب در انقلاب اور پوری کایا پلٹ کا دَور ہے۔ معاشرت، اخلاق، تعلیم، مذاق، سب بدل گئے اور بدل رہے ہیں۔ آجکل دنیا چل نہیں رہی، دَوڑ رہی ہے۔ ہر کام میں عجلت بہت ہے، ذمہ داری کا احساس کم ہے اور پروا بالکل نہیں۔ "کسبِ کمال" سے پہلے "عزیزِ جہاں" بننے کی دُھن ہے۔ پھر شہرت کے ذرائع آسان اور بے شمار ہیں۔ انہی اسباب کا نتیجہ آج کل کا اکثر لٹریچر ہے۔

عصرِ حاضر کے مصنفوں میں جو لوگ فطری صلاحیت اور ذوقِ سلیم کے ساتھ اعلیٰ تعلیم، ذہنی تربیت اور بااصول علمی تحقیق سے فیضیاب ہیں، وہی ٹھوس اور اصلی کام کر رہے ہیں۔ باقی جہانِ علم وادب کے "حشرات الارض" ہیں اور ہر زمانے سے زیادہ ہمارے زمانے میں ہیں۔

یہ غنیمت ہے کہ (بقول اکبر الٰہ آبادی) "جی رہے ہیں ابھی کچھ اگلے زمانے

والے" ان بزرگ عالموں اور ادیبوں کی تصانیف عصرِ حاضر کی غیر فانی دولت ہے اور ان کی رہنمائی میں قابلِ فخر مصنّف و انشاپرداز پیدا ہو رہے ہیں۔

۷۔ انیسویں صدی کا یہ زمانۂ زیرِ تبصرہ اخبارات و رسائل کے لحاظ سے بھی گراں مایہ ہے۔ اودھ اخبار، لکھنؤ۔ اخبارِ عام، لاہور۔ پیسہ اخبار، لاہور — اودھ پنچ لکھنؤ۔ آگرہ اخبار۔ ریاض الاخبار گورکھپور۔ دبدبۂ سکندری رام پور۔ وکیل امرتسر۔ وطن لاہور۔ البشیر اٹاوہ۔ نیّرِ اعظم مراد آباد۔ ہندوستانی لکھنؤ۔ انسٹی ٹیوٹ گزٹ علی گڈھ۔ رہبر دکن وغیرہ اپنے اور اپنے زمانے کے رنگ میں نہایت پختہ تھے۔ ان سب نے زبان کی خدمت اور ملک کی قیادت، زمانہ کی ضرورت کے لحاظ سے بہتر سے بہتر کی۔ اگلے زمانے میں "سیاسی رائے" آزاد و بیباک نہ تھی، پھر بھی ان اخباروں کا لہجہ حسبِ موقع نرم و گرم رہا۔ اخباراتِ مذکورہ میں سے بجز وکیل اور وطن اور ہندوستانی کے، سب اب تک جاری ہیں — "اودھ اخبار" کی عمر ۸۲ سال کی ہے۔ بعض کی ۷۰ سے زیادہ۔ ۴۰ سال سے کم کسی کی نہیں۔ ماہوار رسائل بھی اس دور میں اعلیٰ پایہ کے تھے۔ تہذیب الاخلاق (بادارت سرسید) سب کا پیشرو اور سب سے بہتر تھا۔ دلگداز لکھنؤ (بادارت شرر لکھنوی) ادب و تاریخ میں اپنے رنگ کا موجد تھا۔ ان دو رسالوں نے فنِ مقالہ نگاری کے ارتقا میں سب سے زیادہ مدد دی۔ ادب و انشا اور فکر و تخئیل کو تھوڑے دنوں میں کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ پیامِ یار لکھنؤ (بادارت منشی نثار حسین) نے شعر و غزل کا جو صحیح معیار اور اعلیٰ نمونہ پیش کیا، وہ اپنی نوع میں منفرد تھا۔ مرقعِ عالم ہردوئی (بادارت حکیم محمد علی) حسن حیدر آباد۔ معارف علی گڈھ (بادارت مولوی وحید الدین سلیم) اپنی علمی و ادبی خدمات میں نہایت وقیع و ممتاز تھے۔ پھر بیسویں صدی کے آغاز

میں مخزن لاہور (بادارت شیخ عبدالقادر بیرسٹر)۔ زمانہ کانپور (بادارت منشی دیانرائن نگم)۔ اردوے معلےٰ (بادارت حسرت موہانی)۔ اور ان کے کچھ بعد دکن ریویو (بادارت ظفر علی خاں)۔ النّاظر لکھنؤ (بادارت ظفرالملک علوی) اور نقّاد آگرہ (بادارت شاہ دلگیر) نے اگلوں کی جگہ لے لی، ان کے نقشِ قدم پر چلے، اور ان کی "موجِ خرامِ ناز عجب گل کتر گئی" جن کی خوشبو سے آج تک مشامِ ادب معطّر ہے۔ الہلال کلکتہ (بادارت ابوالکلام آزاد) اخبار و رسالہ کی درمیانی جنس یعنی ہفتہ وار مجلّہ تھا جس کی وضع، معیار، ادبیت، صحافت سب کی تعریف میں ایک لفظ "شاندار" کافی ہے۔ یہ چند نام لئے گئے ہیں ان کے علاوہ اور بھی قابلِ قدر رسالے جاری اور بند ہوتے رہے۔

بیسویں صدی اخبار و رسائل میں دورِ سابق سے کم رتبہ نہیں ہے لیکن اس اعتبار سے بھی ان دونوں زمانوں میں وہی فرق ہے جو تصانیف کے سلسلے میں بیان کیا گیا۔ اگلے زمانے کے رسالوں کا معیار اور مذاق صحیح، پختہ اور ہموار تھا۔ جن رسائل کا نام لیا گیا، ان میں جو مضمون شائع ہوتا تھا، اعلیٰ یا اوسط درجہ کا ہوتا تھا، ادنیٰ درجہ کا کوئی نہ تھا۔ اب یہ امتیاز اٹھ گیا ہے۔ اکثر رسائل کی اکثر اشاعتوں میں اعلیٰ اور ادنیٰ مضامین پہلو بہ پہلو ہوتے ہیں۔ آج کل (بقول ایک ایڈیٹر کے) "سب کو خوش رکھنا پڑتا ہے"۔ سب میں بازاری عوام بھی ہیں، نوجوان طالبِ علم بھی، آزاد خیال و انقلاب پسند بھی، پرانے استاد بھی، بوڑھے فلسفی بھی، عالم و ادیب بھی۔ گویا "از شمار افزوں خداوندانِ او"۔ اس کا نتیجہ ہے کہ "شد پریشاں خوابِ من از کثرتِ تعبیر ہا"۔ صرف گنتی کے چند رسائل صحیح اصول اور اعلیٰ معیار رکھتے ہیں، اور انھیں سے "مجلّہ نگاری" کی لاج قائم ہے۔

اخبارات کا بھی یہی حال ہے۔ اس صدی کے پہلے پندرہ بیس سال میں

بعض روزانہ اخبار ایسے جاری ہوئے جن کو زبان وادب کا معیار بھی ملحوظ تھا ان میں
اوّل و افضل "زمیندار" تھا۔ مولوی ظفر علی خاں نے زمیندار میں ادارت و صحافت
کی جو خوبیاں اور جدّتیں پیدا کیں، وہ انھیں کی "اوّلیات" تھیں۔ بعد کے سب
روزنامے ان کے ناقل و متبع ہوئے۔ ادبیت اور صحیح ادارت میں سیّد جالب
دہلوی (اڈیٹر روزنامہ ہمدم، لکھنؤ)۔ قاضی عبدالغفار مرادآبادی (اڈیٹر روزانہ
جمہور و صباح کلکتہ)، مولانا محمد علی (اڈیٹر روزانہ ہمدرد دہلی) کی خدمات بھی
ممتاز ہیں۔ سیّد جالب ان سب کے کہن سال و کہنہ مشق اڈیٹر تھے۔ اب یہ سب
مرحوم و مغفور ہو گئے۔

ان کے بعد جو اخبار جاری ہوئے، ان کی نظر میں سیاسی جدّ و جہد تمام لوازمِ
صحافت پر مقدم ہے۔ پھر بھی اچھے اخبارات سے زمانہ خالی نہیں ہے۔

۸۔ مطابع کے حق میں پوری انیسویں صدی گویا "اجارہ دار" تھی۔
دہلی، لکھنؤ، کانپور، آگرہ، لاہور میں جس کثرت سے اور جیسے بڑے اور
اچھے چھاپہ خانے قائم ہوئے، اُن کا نظیر بیسویں صدی اب تک پیدا کر سکی بلکہ انھیں
میں سے بہت سے مطابع بیسویں صدی کی طباعت میں معقول حصّہ دار ہیں۔ ان
میں "مطبعِ نولکشور" سب سے ممتاز ہے۔ منشی نولکشور، سی، آئی، ای کے حُسنِ نیت،
خلوصِ ارادت، ذوقِ علم، شوقِ خدمت نے جو احسان کیا ہے اس سے ملک
و زبان اور علم و فن کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتے۔ اس کے ساتھ مطابع مجتبائی
مصطفائی، مجیدی، انتظامی، نامی، مفیدِ عام، آگرہ اخبار وغیرہ کی خدمات
و احسانات بھی کچھ کم گراں قدر نہیں ہیں۔

بیسویں صدی نے طباعت میں جو حسن و خوبی پیدا کی ہے، وہ بلاشبہ
نہایت دلکش و شان دار ہے۔ اِس زمانے کے نئے مطابع شمار و حصار سے

زیادہ ہیں۔ لیکن یہاں بھی وہی امتیاز کارفرما ہے کہ اگلے زمانے والے نفع سے زیادہ خدمتِ علم وفن مدِّ نظر رکھتے تھے اور اب تجارتی مقاصد کو اولیت حاصل ہے۔

۹- اُنیسویں صدی کی علمی انجمنوں کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ صدی کے آخر میں ان کے علاوہ ایک اور ممتاز انجمن یا ادارۂ تصنیف وتالیف قائم ہوا، یعنی حیدرآباد میں مولوی سید علی بلگرامی کی نگرانی میں، جس کی مطبوعات "سلسلۂ آصفیہ" کے نام سے شائع ہوئیں۔ ان میں علامہ شبلی کی بھی بعض تصانیف شامل تھیں۔ ان کے حالات میں چند بار اِس سلسلے کا ذکر آچکا ہے۔ اِس کے بعد بیسویں صدی کے آغاز میں انجمن ترقیِ اُردو قائم ہوئی جو اپنے ہر مرکز (اورنگ آباد، دہلی، کراچی، علی گڈھ) میں اردو زبان وادب کی بے پایاں خدمت کرتی رہی ہے۔ تالیفات وتراجم کے علاوہ دو بلند پایہ سہ ماہی رسالے "اردو" اور "سائنس" اور ایک پندرہ روزہ پرچہ "قومی زبان" اُس کے اہتمام میں جاری ہیں۔ یہ انجمن بابائے اردو مولوی عبد الحق کی طرح حرفِ مشدد کا خواص رکھتی ہے کہ ہماری تقسیمِ اَدوار کے لحاظ سے اس کا آغاز ہمارے اس دائرۂ تبصرہ کے اندر ہے اور اس کی ترقیاں زمانۂ بعد سے متعلق ہیں۔

بیسویں صدی کی ایک بڑی خصوصیت جس میں "حیاتِ اُردو" کا کوئی زمانہ مقابلہ نہیں کر سکتا، اُس کے عظیم الشان ادارے، مکتبے اور انجمنیں ہیں (۱) دارُ الاشاعت پنجاب۔ (۲) انجمن ترقیِ اُردو۔ (۳) دار المصنفین اعظم گڈھ (۴) مکتبہ جامعہ ملّیہ دہلی۔ (۵) دار الترجمہ دولتِ آصفیہ دکن۔ (۶) ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد۔ تقسیم ملک سے پہلے سب سے ممتاز اور وسیع تھے۔ ان کے علاوہ دہلی، لکھنؤ، الہ آباد، لاہور، حیدرآباد وغیرہ مقامات پر چھوٹے ادارے بھی بڑے کام کر رہے تھے۔ قیامِ پاکستان کے بعد کراچی اور لاہور میں کئی بڑے ادارے

قائم ہو گئے ہیں جو نہایت وسعت و جامعیت کے ساتھ زبان و ادب کی خدمت کر رہے ہیں۔

یہ تصنیفی حیثیت کا ذکر تھا، اسی کا لاحقہ ان سب اداروں کی "تجارتی" حیثیت و خدمت ہے۔ اس خصوصیت میں ان کے علاوہ اور بہت سی بک ایجنسیاں، بک ڈپو، مکتبے، کتاب گھر اور کتابستان شامل ہیں۔ یہ بجائے خود اس قدر اہم اور ضروری ہیں کہ ان کے بغیر اشاعت دشوار تھی اور تصنیف و تالیف بے کار۔

انیسویں صدی میں یہ شعبے بہت کم تھے اور ایسے وسیع و جامع نہ تھے۔ اُس زمانے کے مطابع اپنی اپنی مطبوعات فروخت کرتے تھے غالباً سب سے پہلے علی گڈھ کالج میں بک ڈپو قائم ہوا جس نے مطبوعاتِ غیر کی فروخت کا بھی انتظام کیا۔

۱۰۔ اس تبصرے میں "داستانِ تاریخِ اردو" کے آخری دور کا تذکرہ مقصودِ اصلی تھا۔ صرف موازنہ کی غرض سے زمانۂ حال کا مختصر حوالہ آگیا ہے کہ:

"اوّل باآخر نسبتے دارد"

تنقیدی تصورات

مرتبہ : پروفیسر عبد الحق
(صدر شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی)

شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی کا مجلّہ "اردو معلّٰی ۹۴ء" امسال "تنقیدی تصورات" کے نام سے منسوب ہے۔ تنقید کے حوالے سے اس مجلّے میں معتبر ناقدین کے وہ اہم مضامین شامل ہیں جن کا پڑھنا تنقید کے طلباء کے لئے ناگزیر ہے اس کتاب کا اجراء ۱۰ ر نومبر ۹۴ء کو دہلی یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں ہوا ہے

قیمت دو سو روپے

دہلی میں اردو افسانہ

ڈاکٹر ظل ہما

دہلی میں اردو افسانہ ۱۹ ویں صدی کے نصف اوائل تک دہلوی افسانے کی بکھری ہوئی کڑیوں کو جوڑنے کی ایک کامیاب ترین کوشش ہے یہ کتاب دہلوی افسانے پر کام کرنے والوں کے لئے اہم ترین کتاب ہے اس کے ساتھ ہی اردو نثر کے کسی بھی پہلو پر تحقیقی اور تنقیدی کام کرنے والوں کے لئے ایک روشن گوشے کی حیثیت رکھتی ہے

قیمت دو سو روپے

دکھ سکھ اپنے

نبیلہ گل

ادھر چند سالوں سے ہندوستان میں نئے ناولوں کی اشاعت میں بہت بڑی کمی آگئی تھی۔ محترمہ نبیلہ گل نے ۹۴ء میں ہندوستانی قارئین کی خدمت میں ایک ایسا لازوال ناول پیش کیا ہے جو بیک وقت عوامی ناول بھی ہے اور ادبی و فنی قدروں پر بھی پورا اترتا ہے انتہائی دلچسپ اور خوبصورت تحریر ہے

قیمت ایک سو روپے

خوابوں کا سویرا

عبد الصمد

عبد الصمد کا پہلا ناول "مہاتما" اس وقت سامنے آیا جب ان کے دوسرے ناول "دوگز زمین" کو ساہتیہ اکیڈمی کے عظیم الشان انعام کے لئے منتخب کیا گیا "خوابوں کا سویرا" عبد الصمد کا تیسرا ناول ہے جو تقسیم ملک کے حالات سے متاثر ہوکر اس نسل کے لئے لکھا گیا ہے جو تقسیم کے بعد پروان چڑھی ہے۔ مگر اس نسل کو وراثت میں تقسیم کی امانتیں ملی ہیں۔

قیمت دو سو روپے